

آب

حیات



عمیرہ احمد

New Era Magazine

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آب حیات

از قلم عمیرہ احمد

ہماری ویب میں شائع ہونے والے ناولز کے تمام جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہیں۔ ہمیں اپنی ویب نیو ایرا میگزین (New Era Magazine) کیلئے لکھاریوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہماری ویب پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل، شاعری، پوسٹ کروانا چاہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے مندرجہ ذیل ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔

(Neramag@gmail.com)

(انشا اللہ آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر اندر ویب پر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کیلئے اوپر دیئے گئے رابطے کے ذرائع کا استعمال کر سکتے ہیں۔

شکریہ ادارہ: نیو ایرا میگزین

☆☆☆☆☆

اس نے دور سے سالار کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سوفٹ ڈرنک کا ایک گلاس تھا۔۔

تم یہاں کیوں آکر بیٹھ گئی؟ امامہ کے قریب آتے ہوئے اس نے دور سے کہا۔

ایسے ہی۔۔۔۔۔ شال لینے آئی تھی۔۔۔۔۔ پھر یہی بیٹھ گئی۔۔۔ وہ مسکرائی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سالار نے سوفٹ ڈرنک کا گلاس اپنی ٹانگوں کے درمیان نچلی سیڑھی پر رکھ دیا۔ امامہ لکڑی کے ستوں سے ٹیک لگائے ایک گٹھنے پر کھانے کی پلیٹ رکائے کھاتے ہوئے دوران میں ایک کینوپی کے نیچے اسٹیج پر بیٹھے گلوکار کو دیکھ رہی تھی، جو نئی غزل شروع کرنے سے پہلے سازندوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ سالار نے کانٹا اٹھا کر اس کی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔ وہ بھی اب گلوکار کی طرف متوجہ تھا جو اپنی نئی غزل شروع کر چکا تھا۔

ہاں۔ اس نے مسکرا کر کہا وہ غزل سن رہی تھی۔

کسی کی آنکھ پر نم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

زبان پر قصہِ غم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

وہ بھی غزل سننے لگا تھا۔

کبھی ہنسنا کبھی رونا، کبھی ہنس ہنس کر رو دینا

عجب دل کا یہ عالم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

اچھا گارہا ہے۔۔ امامہ نے ستائشی انداز میں کہا۔ سالار نے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلادیا۔

خوشی کا حد سے بڑھ جانا بھی اب اک بے قراری ہے

نہ غم ہونا بھی اک غم ہے محبت ہو گئی ہوگی

سالار سو فٹ ڈرنک پیتے پیتے پڑا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جیسے کہیں اور پہنچا

ہوا تھا۔

تمھیں کچھ دینا چاہ رہا تھا میں۔۔۔۔ وہ جیکٹ کی جیب میں کچھ ڈھونڈ کر نکالنے کی

کوشش کر رہا تھا۔۔

میں بہت دنوں سے تمھیں کچھ دینا چاہ رہا تھا لیکن۔۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے رک گیا

۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی۔۔۔

امامہ کے چہرے پر بے حد مسکراہٹ آئی۔۔۔ اچھا تو اسے خیال آگیا۔۔۔۔ اس نے ڈبیا

لیتے ہوئے سوچا اور اسے کھولا۔۔۔ وہ ساکت رہ گئی۔۔۔ اندر ایرر نگز تھے۔۔۔۔۔ ان ایرر نگز سے ملتے جلتے جو وہ اکثر اپنے کانوں میں پہنے رہتی تھی اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔۔

میں جانتا ہوں یہ اتنے ویلیو ایبل نہیں ہوں گے جتنے تمہارے ابو کے ہیں لیکن مجھے اچھا لگے گا اگر تم کبھی انہیں بھی پہنواں ایرر نگز کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔

تم نہیں پہنا چاہتی تو بھی ٹھیک ہے میں ریپلیس کرنے کے لئے نہیں دے رہا ہوں۔۔۔ سالار نے اس کی آنکھوں میں ہوتی نمی دیکھ کر بے ساختہ کہا۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا۔۔۔ بہت ساری چیزیں پہلے ہی اپنی جگہ بدل چکی ہیں۔ اور وہ اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔۔۔ اس کی خواہش اور ارادے کے نہ ہونے کے باوجود۔۔۔

کچھ کہنے کے بجائے امامہ نے اپنے دائیں کان میں لٹکا ہوا جھمکا اتارا۔۔۔

میں پہنا سکتا ہوں؟؟ سالار نے ایک ایرر نگ نکالتے ہوئے پوچھا۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔۔ سالار نے باری باری اس کے دونوں کانوں میں وہ ایرر نگ پہنا دیئے۔۔

وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔۔ وہ بہت دیر تک کچھ کہے بغیر محبت سے اسے دیکھتا رہا۔
اچھی لگ رہی ہو۔۔ وہ اس کے کانوں میں لٹکے ہوئے ہلکورے کھاتے موتی کو چھوتے
ہوئے مدھم آواز میں بولا۔

تمہیں کوئی مجھ سے زیادہ محبت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے زیادہ خیال نہیں رکھ سکتا۔۔
میرے پاس ایک واحد قیمتی چیز تم ہو۔۔

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔۔ وعدہ کر رہا تھا۔۔ یاد دہانی
کر رہا تھا۔۔ یاں کچھ جتا رہا تھا۔۔ وہ جھک کر اب اس کی گردن چوم رہا تھا،،
مجھے نواز گیا ہے۔۔ سیدھا ہوتے ہوئے اس سرشاری سے کہا۔۔

رومانس ہو رہا ہے؟؟؟ اپنے عقب میں آنے والی کامران کی آواز پر دونوں ٹھٹکے تھے
۔۔ وہ سٹانڈ شارٹ کٹ کی وجہ سے برآمدے کے اس دروازے سے نکلا تھا۔۔
کوشش کر رہے ہیں۔۔ سالار نے پلٹے بغیر کہا۔۔

گڈ لک۔۔ وہ کہتے ہوئے ان کے پاس سیڑھیاں اترتا ہوا نہیں دیکھے بغیر چلا گیا۔۔ امامہ
کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی،، وہ جیھنپ گئی تھی سالار اور اس کی فیملی کم از کم ان

معاملات میں بے حد آزاد خیال تھے۔۔۔

کسی کو سامنے پا کر، کسی کے سرخ ہونٹوں پر

انوکھا سا تبسم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

امامہ کو لگا وہ زیر لب گلوکار کے ساتھ گارہا ہے۔۔۔

جہاں ویران راہیں تھیں، جہاں حیران آنکھیں تھیں

وہاں پھولوں کا موسم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

لکڑی کی ان سیڑھیوں پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھے وہ خاموشی کو توڑتی آس پاس
کے پہاڑوں میں گونج کی طرح پھیلتی گلوکار کی سریلی آواز سن رہے تھے۔۔ زندگی کے

وہ لمحے یادوں کا حصہ بن رہے تھے

دوبارہ نہ آنے کے لئے گزر رہے تھے ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر لگنے والی ان دونوں

کی پہلی اکھٹی تصویر اس فارم ہاؤس کی سیڑھیوں ہی کی تھی۔۔ سرخ لباس میں گولڈن

کڑھائی والی سیاہ پشمینہ شال اپنے بازوؤں کے گرد اوڑھے کھلے سیاہ بالوں کو کانوں کے

پچھے سمیٹے خوشی اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک نہیں بلکہ اس قرب میں

جھلک رہی تھی جو اس کے اور سالار کے درمیان نظر آ رہا تھا۔ سفید شرٹ اور سیاہ جیکٹ میں اسے اپنے ساتھ لگائے سالار کی آنکھوں کی چمک جیسے اس فوٹو گراف میں موجود دوسری ہر شے کو مات کر رہی تھی۔۔۔ کوئی بھی کیمرے کے لئے بنائے ہوئے اس ایک پوز میں نظر آنے والے جوڑے کو دیکھ کر چند لمحوں کے لئے ضرور ٹھٹکتا۔۔۔ سکندر نے اس فوٹو گراف کو فریم کروا کر انہیں ہی نہیں بھیجا تھا انہوں نے اپنے گھر کی فیملی وال فوٹوز میں بھی اس تصویر کا اضافہ کیا تھا۔۔۔

----- NEW ERA MAGAZINE -----
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poets | Interviews

وہ شخص دیوار پر لگی تصویر کے سامنے اب پیچھے پندرہ منٹ کھڑا تھا پلکیں جھپکائے بغیر ٹکٹکی لگائے اس لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہوئے۔۔۔ چہرے میں کوئی شبہات تلاش کرتے ہوئے۔۔۔ اس شخص کے شجرہ میں دبے آتش فشاں کی شروعات ڈھونڈتے ہوئے۔۔۔ اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا تو اسی ایک جگہ سے بنا سکتا تھا۔۔۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔۔۔ خود کلامی۔۔۔ ایک اسکینڈل کا تانا بانا تیار کرنے کے لئے ایک کے بعد ایک مکرو فریب کا جال۔۔۔ وجوہات۔۔۔ حقائق کو مخفی کرنے۔۔۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہدایت

دینے کے لئے مڑا تھا۔۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے اس کمرے کی دیواروں پر لگے بورڈ چھوٹے بڑے نوٹس
چارٹس فوٹو گرافس اور ایڈریسز کی چٹیوں سے بھرے ہوئے تھے۔۔

کمرے میں موجود چار آدمیوں میں سے تین اس وقت کمپیوٹر پر مختلف ڈیٹا کھنگالنے میں
لگے ہوئے تھے۔۔

یہ وہ کام پچھلے ڈیڑھ ماہ تک کر رہے تھے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ بڑے بڑے ڈبے
پڑے تھے جو مختلف فائلز ٹیپس میگزینز اور نیوز پیپر کے تراشوں اور دوسرے رکارڈ
سے بھرے ہوئے تھے کمرے میں موجود ریکارڈ کینٹنس پہلے ہی بھری ہوئی تھیں،
کمرے میں موجود تمام ڈیٹا ان کمپیوٹر کی ہارڈس میں بھی محفوظ تھا۔۔

کمرے میں موجود آدمی پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اس شخص کے بارے میں آن لائن آنے
والے تمام ریکارڈ اور معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ کمرے میں موجود تیسرا آدمی اس
شخص اور اس کی فیملی کے ہر فرد کی ای میلز کا رکارڈ کھنگالتا رہا تھا۔ چوتھا شخص اس فیملی
اور مالی معلومات چیک کرتا رہا تھا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ ان تصویروں اور شجرہ
نسب کی صورت میں ان بورڈ پر موجود تھا۔۔

وہ چار لوگ دعوا کر سکتے تھے کہ اس شخص اور اس کی فیملی کی پوری زندگی کار کارڈاگر خدا کے پاس موجود تھا تو اس کی ایک کاپی اس کمرے میں تھی۔۔ اس شخص کی زندگی کے بارے میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے علم میں نہیں تھی یا جس کے بارے میں وہ ثبوت نہ دے سکتے تھے۔۔۔

سی آئی اے کے شدید آپریشنز سے لے کر گرل فرینڈ تک اور اس کی مالی معاملات سے لے کر اسکی اولاد کی پرسنل اور پرائیویٹ لائف تک اس کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔۔۔

لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کئے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز نہیں نکال سکے تھے جس سے اس کی کردار کشی کر سکتے۔۔

وہ ٹیم جو پندرہ سال سے اسی مقاصد پر کام کرتی رہی تھی یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سر جوڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے حوالے سے کسی قسم کا بری حرکت عمل نشان دہی نہیں کر پائی تھی۔۔ دو سو پوائنٹس کی وہ لسٹ جو انہیں دی گئی تھی وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ ان سب کی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔۔۔

کسی حد تک سٹائش کے جذبات رکھنے کے باوجود ایک آخری کوشش کر رہے تھے۔۔
ایک آخری کوشش۔۔

کمرے کے ایک بورڈ سے دوسرے بورڈ اور دوسرے بورڈ سے تیسرے بورڈ تک
جاتے جاتے وہ آدمی اس کے شجرہ نسب کی اس تصویر پر رکا ہوا تھا۔ اس تصویر کے آگے
کچھ اور تصویریں تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلیٹ پوائنٹس۔۔ ایک دم بجلی سا جھٹکا لگا
۔۔ اس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے تاریخ پیدائش دیکھی۔۔ پھر مڑ کر کمپیوٹر کے
سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Interviews | Laws
دیکھو یہ سال یہ کہاں تھا؟

کمپیوٹر پر بیٹھے آدمی نے چند منٹوں کے بعد اسکرین دیکھتے ہوئے کہا۔۔

پاکستان میں۔۔ اس شخص کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی تھی۔۔

کب سے کب تک؟۔۔ اس آدمی نے اگلا سوال کرتے ہوئے کہا۔۔ کمپیوٹر پر بیٹھے

ہوئے آدمی نے تاریخیں بتائیں۔۔

آخر کار ہمیں کچھ مل ہی گیا۔۔ اس آدمی نے بے اختیار ایک سیٹی بجاتے ہوتے کہا تھا۔۔

انہیں جہاز ڈبونے کے لئے تارپیڈو مل گیا تھا۔۔۔

یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔۔ پندرہ منٹ بعد اب وہ جانتا تھا کہ اسے اس آتش
فشاں کا منہ کھولنے کے لئے کیا کرنا تھا۔۔۔

وہ یہاں کسی جذباتی ملاقات کے لئے نہیں آئی تھی۔۔ سوال و جواب کے لمبے چوڑے
سیشن کے لئے بھی نہیں۔۔ لعنت و ملامت کے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے
کے لئے بھی نہیں۔۔ وہ یہاں کسی کا ضمیر جنجھوڑنے آئی تھی۔۔ نہ ہی کسی سے
نفرت کا اظہار کرنے کے لئے۔۔ اور نہ ہی کسی کو بتانے آئی تھی کہ وہ اذیت کے
ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی تھی۔۔ نہ ہی وہ اپنے باپ کو گریبان سے پکڑنا چاہتی تھی۔۔
نہ اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی زندگی تباہ کر دی ہے۔۔۔
اس کے صحت مند ذہن اور جسم کو ہمیشہ کے لئے مفلوج کر دیا تھا۔۔
وہ یہ سب کچھ کہتی۔۔۔ یہ سب کرتی اگر اسے یقین ہوتا کہ یہ سب کرنے کے بعد اسے
سکون مل جائے گا۔۔۔

اس کا باپ احساس جرم یا پچھتاوے جیسی چیز کو پالنے لگا تھا،،،،

پچھلے کئی ہفتوں سے وہ آبلہ پا تھی۔۔۔ وہ راتوں کو سکون آور گولیاں لئے بغیر سو نہیں پارہی تھی اور اس سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ تھی وہ سکون آور ادویات لینا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ سوچنا چاہتی تھی اس بھیانک خواب کے بارے میں جس میں وہ چند ہفتے پہلے داخل ہوئی تھی اور جس سے اب وہ ساری زندگی نکل نہیں سکتی تھی۔۔

وہ یہاں آنے سے پہلے پچھلی پوری رات روتی رہی تھی۔۔۔ یہ بے بسی کی وجہ سے نہیں تھا۔۔۔ یہ اذیت کی وجہ سے بھی نہیں تھا۔۔۔ یہ اس غصے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ کے لئے اپنے دل میں اتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی ایک آتش فشاں تھا یا جیسے کوئی الاؤ جو اس کو اندر سے سلگا رہا تھا اندر سے جل رہا تھا۔۔۔

کسی سے پوچھے، کسی کو بتائے بغیر یوں اٹھ کر جانے کا فیصلہ جذباتی تھا احمقانہ تھا اور غلط تھا۔۔۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اک جذباتی احمقانہ اور غلط فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔۔۔ ایک اختتام چاہتی تھی وہ اپنی زندگی کے اس باب کے لئے جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس کی موجودگی کا انکشاف اس کے لئے دل دہلا دینے والا

تھا۔۔۔

اس کا ایک ماضی تھا وہ جانتی تھی لیکن اسے کبھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا ماضی بھی ہو سکتا ہے۔۔۔

ایک دفعہ کا ذکر تھا جب وہ خوش تھی اپنی زندگی میں۔۔۔۔۔ جب وہ خود کو باسعادت سمجھتی تھی۔۔ اور مقرب سے ملعون ہونے کا فاصلہ اس نے چند سیکنڈز میں طے کر لیا تھا چند سیکنڈز شاید زیادہ وقت تھا شاید اس سے بھی کم وقت تھا جس میں وہ احساس کمتری احساس محرومی احساس ندامت اور ذلت و بدنامی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوئی تھی۔۔۔

اور یہاں وہ اس کو دوبارہ وہی شکل دینے آئی تھی اس بوجھ کو اس شخص کے سامنے اتار پھینکنے آئی تھی جس نے وہ بوجھ اس پر لا دیا تھا۔۔ زندگی کسی کو اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں تھی۔۔۔ کسی کو پتا ہوتا تو وہاں آہی نہیں سکتی تھی۔۔ اس کا سیل فون پچھلے کئی گھنٹوں سے آف تھا۔۔ وہ چند گھنٹوں کے لئے خود کو اس دنیا سے دور لے آئی تھی جس کا وہ حصہ تھی۔۔ اس دنیا کا حصہ یا پھر اس دنیا کا حصہ جس میں وہ اس وقت موجود تھی۔۔ یا پھر اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔۔۔

وہ کہیں کی نہیں تھی۔۔۔ اور جہاں کی تھی۔ جس سے تعلق رکھتی تھی اس کو اپنا نہیں
سکتی تھی۔۔

انتظار لمبا ہو گیا تھا۔۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا ہے۔۔ کسی بھی چیز کا انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا
ہے۔۔ چاہے آنے والی شے پاؤں کی زنجیر بننے والی ہو یا پھر گلے کا ہار۔۔۔ سرکاتاج
بن کر سجنا ہو اس نے پاؤں کی جوتی۔۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہی لگتا ہے۔۔

وہ ایک سوال کا جواب چاہتی تھی اپنے باپ سے۔۔۔ صرف ایک چھوٹے سے سوال کا
۔۔ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا؟؟

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

گرینڈ حیات ہوٹل کا پال روم اس وقت اسکرپ نیشنل اسپینگ بی کے ۹۲ ویں ما بلے
کے فائنل میں پہنچنے والے فریقین سمیت دیگر شرکا ان کے والدین بہن بھائیوں اور
اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے موجود لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہونے کے باوجود ایسا
خاموش تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جاسکے۔۔

وہ دو افراد جو فائنل میں پہنچے تھے ان کے درمیان چودھواں راؤنڈ کھیلا جا رہا تھا۔ تیرہ سالہ نینسی اپنے لفظ کے جج کرنے کے لئے اپنی جگہ پر اچکی تھی۔۔ پچھلے بیانوں سے اس ہال روم میں دنیا کے بیسٹ اسپیلر کی تاج پوشی ہو رہی تھی۔۔ امریکا کی مختلف ریاستوں کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں اسپیلنگ بی کے مقامی مقابلے جیت کر آنے والے پندرہ سال سے کم عمر کے بچے اس آخری راؤنڈ کو جیتنے کے لئے سردھڑکی بازی لگا رہے تھے۔۔ ایسی ہی ایک بازی کے شرکاء آج بھی اسٹیج پر موجود تھے۔۔۔۔

سفر اس نینسی نے رکی ہوئی سانس کے ساتھ پروناؤنسر کا لفظ سنا۔۔ اس نے پروناؤنسر کو لفظ دہرانے کے لئے کہا۔۔ پھر اس نے لفظ کو دہرایا۔۔ وہ چیمپین شپ ورڈ میں سے ایک تھا لیکن فوری طور پر اسے وہ یاد نہیں آسکا۔۔ بہر حال اس کی ساؤنڈ سے وہ اسے بہت مشکل لگا تھا اور اگر سننے میں اتنا مشکل نہیں تھا تو اس مطلب تھا وہ ترکی لفظ ہو سکتا تھا۔

نوسالہ دوسرا فائنلسٹ اپنی کرسی پر بیٹھے گلے میں لٹکے اپنے نمبر کارڈ کے پیچھے انگلی سے اس لفظ کی جج کرنے میں لگا ہوا تھا۔۔ وہ اس کا لفظ نہیں تھا لیکن وہاں بیٹھا ہر بچہ ہی

لا شعوری طور پر اس وقت یہی کرنے میں مصروف تھا۔ جو مقابلے سے آؤٹ ہو چکا تھا

--

نینسی کا ریگولر ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

ایس۔ اے۔ ایس۔ ایس۔ اس نے رک رک کر الفاظ کی جج کرنا شروع کی وہ پہلے
چار حروف بتانے کے بعد ایک لمحہ کے لئے رکی۔ زیر لب اس نے باقی کے پانچ حروف
دہرائے پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

اے۔ ایف۔ آر۔ وہ ایک بار پھر رکی۔ دوسرے فائنلسٹ نے بیٹھے بیٹھے زیر لب آخری
دو حروف دہرائے۔

یو۔ ایس۔۔ مائیک کے سامنے کھڑی نینسی نے بھی بالکل اس وقت یہی دو حروف بولے
اور پھر بے یقینی سے اس گھنٹی کو بجتے سنا جو اسپیلنگ کے غلط ہونے پر بجتی تھی۔۔ شاک
صرف اس کے چہرے پر نہیں تھا۔۔ دوسرے فائنلسٹ کے چہرے پر بھی تھا۔۔
پروناؤ نسراب سسافر اس کے درست اسپیلنگ دہرا رہا تھا۔۔ نینسی نے بے اختیار
آنکھیں بند کیں۔۔

آخری لیٹر سے پہلے اے ہونا چاہیے تھا۔۔۔ میں نے یو کیا سوچ کر لگا دیا؟

اس نے خود کو کوسا۔۔۔ تقریباً فق رنگت کے ساتھ نینسی گراہم نے مقابلے کے شرکا کے لئے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔۔

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔۔۔ یہ ممکنہ رنراپ کو کھڑے ہو کر دی جانے والی داد و تحسین تھی۔۔۔ نو سالہ دوسرا فائنل میں پہنچنے والا بھی اس کے لئے کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔۔۔ نینسی کے قریب پہنچنے پر اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔۔۔

نینسی نے ایک مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور اپنی سیٹ سنبھال لی۔۔۔ ہال میں موجود لوگ دوبارہ اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور دوسرا فائنلسٹ مائیک کے سامنے آچکا تھا۔۔۔ نینسی اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔

اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ اگر وہ بھی اپنے لفظ ججے غلط کرتا ہے تو وہ دوبارہ فائنل میں آسکتی ہے۔۔۔

دیٹ واز آ کیچ 22 اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی وہ اس کے لئے کیا کہہ رہا تھا یا وہ اس لفظ کو واقعی اپنے لئے کیچ 22 ہی سمجھ رہا تھا۔۔۔ وہ چاہتی

تھی ایسا ہوتا۔۔ ہر کوئی چاہتا۔۔ سینئر اسٹیج پر ان نو سالہ فائنلسٹ تھا۔۔ اپنی اسی شرارتی مسکراہٹ اور گہری چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے اسٹیج سے نیچے بیٹھے چیف پروناؤ سر کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا جو نا تھن جو اب مسکرایا تھا اور صرف جو نا تھن ہی نہیں وہاں کے سب کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ تھی۔ وہ نو سالہ فائنلسٹ اس چیمپئن شپ کو دیکھنے والے حاضرین کا سویٹ ہارٹ تھا۔۔

اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔۔ چمکتی ہوئی تقریباً گول آنکھیں جو کسی کارٹون کریکٹر کی طرح پر جوش اور جان دار تھیں اور تقریباً گلابی ہونٹ جن پر وقتاً فوقتاً زبان پھیر رہا تھا اور جن پر آنے والا ذرا سا خم بہت سے لوگوں کو بلا وجہ مسکرانے پر مجبور کر رہا تھا۔۔ مو معصوم فتنہ تھا یہ صرف اس کے والدین جانتے تھے جو دوسرے بچوں کے والدین کے ساتھ اسٹیج پر بائیں کی جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھے دوسرے فائنلسٹس کے والدین کے برعکس وہ بے حد سکون تھے۔۔ اس کے چہرے پر تھی تو وہ ان سات سالہ بیٹی کے چہرے پر تھی جو دو دن پر مشتمل اس پورے مقابلے کے دوران ہلکا رہی تھی اور وہ اب بھی آنکھوں پر گلاسز ٹکائے پورے انہماک کے ساتھ اپنے نو سالہ بھائی کو دیکھ رہی تھی جو پروناؤ نسر کے لفظ کے لئے تیار تھا۔۔ Cappelletti

جو نا تھن لفظ ادا کیا۔۔ اس فائنلسٹ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی جسے وہ بمشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کر رہا ہو۔۔ اس کی آنکھیں پہلے کلاک وائز اور پھر اینٹی کلاک وائز گھوم رہی تھیں۔۔ ہال میں کچھ کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں۔۔ اس نے چیمپین شپ میں اپنا ہر لفظ سننے کے بعد ایسے ہی ریٹنگ کیا تھا کمال کی خود اعتمادی تھی اس میں کئی دیکھنے والوں نے اسے داد دی اس کے حصے میں آوالے الفاظ دوسروں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتے تھے یہ اس کے لئے مشکل وقت ہوتا تھا لیکن بے حد روانی اور بغیر اٹکے بغیر گھبرائے اسی پر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہر پہاڑ سر کرتا رہا تھا اور اب اس کی آخری چوٹی سامنے آگئی تھی۔۔

ڈیفینیشن پلیز اس نے اپنا ریگولر ٹائم استعمال کرنا شروع کیا۔۔۔

اس کی بہن اسے بے چینی سے دیکھ رہی تھی اس کے والدین اب بھی سکون میں تھے اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ یہ لفظ اس کے لئے آسان تھا وہ ایسے ہی تاثرات کے ساتھ پچھلے تمام الفاظ جے کرتا تھا۔۔

پلیز اس لفظ کو کسی جملے میں استعمال کرو وہ اب پروناؤ نسر سے کہہ رہا تھا پروناؤ نسر کا بتایا ہوا جملہ سننے کے بعد گلے میں لٹکے ہوئے کارڈ نمبر کی پشت پر انگلی سے وہ لفظ کو لکھنے لگا

اب آپ کا ٹائم ختم ہونے والا ہے اسے آخری تیس سیکنڈز کے شروع ہونے کی اطلاع دی گئی جس میں اس نے اپنے لفظ کی جج کرنا تھا اس کی آنکھیں گھومنا بند ہو گئی۔۔

سی اے پی پی ای ٹی آئی وہ جج کرتے ہوئے ایک لفظ کے لئے رکا پھر ایک سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ جج کرنا شروع کیا۔۔

ای ٹی ٹی آئی۔۔

ہال تالیوں سے گونگ پڑا اور بہت دیر تک گونجتا رہا۔۔

اسپیلنگ بی کا نیا چیمپئن صرف ایک لفظ کے فاصلے پر رہ گیا تھا،،

تالیوں کی گونج تھمنے کے بعد جو نا تھن نے اسے آگاہ کیا کہ اسے اب ایک اضافی لفظ کے حروف بتانے ہیں۔۔

اس نے سر ہلایا۔۔ اس لفظ کی جج نہ کر سکنے کی صورت میں نینسی دوبارہ مقابلے میں آسکتی ہے۔۔ Weissnichtwo اس کے لئے لفظ پروناؤنس کیا گیا ایک لمحے کے

لئے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی پھر اس کا منہ کھلا اور اس کی آنکھیں

پھیل گئی اوہ مائی گاڈ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا وہ سکتہ میں تھا پوری چیمپین
شپ میں یہ پہلی بار تھا کہ اس کی آنکھیں اور وہ خود اس طرح جامد ہوا تھا۔۔۔

نینسی بے اختیار اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی تو کوئی ایسا لفظ آگیا تھا جو اسے دوبارہ چیمپین
شپ میں لے جاسکتا تھا۔۔۔

اس کے والدین کو پہلی بار اس کے تاثرات نے کچھ بے چین کیا تھا اس کا بیٹا اب اپنے
نمبر کارڈ سے اپنا چہرہ حاضرین سے چھپا رہا تھا حاضرین اس کی انگلیوں اور ہاتھوں کی
کپکپاہٹ بڑی آسانی سے اسکرین پر دیکھ سکتے تھے۔۔۔

اور ان میں سے بہت سوں نے اس بچے کے لئے واقعی بہت ہمدردی محسوس کی وہاں
بہت کم تھے جو اسے جیتنے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھے۔۔۔

ہال میں بیٹھا ہوا صرف ایک شخص مطمئن اور پرسکون تھا۔۔۔ پرسکون۔۔۔ یا پر جوش
۔۔۔؟۔۔۔ کہنا مشکل تھا اور وہ اس بچے کی سات سالہ بہن تھی جو اپنے ماں باپ

کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے اپنے بھائی کے تاثرات پر پہلی بار بڑے
اطمینان کے ساتھ کرسی کی پشت کے ساتھ مسکراتے ہوئے ٹیک لگائی گو د میں رکھے
ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو بہت آہستہ آہستہ اس نے تالی کے انداز میں بجانا شروع کیا

اس کے ماں باپ نے بیک وقت اس کے تالی بجاتے ہاتھوں اور اس کے مسکراتے چہرے کو الجھے انداز میں دیکھا پھر اسٹیج پر اپنے لرزتے کانپتے کنفیوز بیٹے کو جو نمبر کارڈ کے پیچھے اپنا چہرہ چھپائے انگلی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا

اس کے پیروں کے نیچے وہ زمین جیسے سبز مٹھل کی تھی... مٹھل... یا کچھ اور تھا... تا حد نظر زمین پر سبزے کی طرح پھیلا ہوا... درختوں پر اُگنے جوالی پیلی کو نیلوں جیسا سبز... اور پھر ایک دم سمندر کے اندر پیدا ہونے والی کائی جیسی رنگ لیے... نمی کے ننھے ننھے قطرے اپنے وجود پر لیے سبزے کی پتیاں معطر ہوا کے جھونکوں سے ہلتی جیسے کسی رقص میں مصروف تھیں... پانی کے ننھے شفاف موتی سبز پتیوں کے وجود پر پھسل رہے تھے، سنبھل رہے تھے یوں جیسے مخمور ہو کر بہک رہے ہوں... پتیوں کے وجود سے لپٹتے، ڈگمگاتے، سنبھلتے، پھسلتے... تیز ہوا کا ایک جھونکا چلتا، سبزے میں ایک لہر اُٹھتی، سمندر میں جوار بھاٹا کی پہلی لہر کی طرح اُٹھتی، رقص کرتی، لہراتی وہ سبزے کو سہلاتی، بہلاتی ایک عجیب سی سرشاری میں مبتلا کرتی ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتی۔ زمین جیسے رقص کرتے میں مصروف تھی۔

سبزے کا وجود ننھے ننھے پھولوں سے سجا ہوا تھا... ہر رنگ کے پھولوں سے... اتنے رنگ اور ایسے رنگ جو نظر کو ششدر کر دیں۔ سبزے کے وجود پر بکھرے وہ ننھے ننھے پھول یہاں سے وہاں ہر جگہ تھے۔ سبزے میں ہوا سے پیدا ہونے والی ہر لہر اور ہر موج کے ساتھ وہ بھی عجیب مستی تھا۔

سرشاری سے رقص کرنے لگتے۔

آسمان صاف تھا... آنکھوں کو سکون دینے والا ہلکانیلا اور اب بھی کسی گنبد کی طرح پھیلا ہوا... گہرا اونچا... بہت اونچا... یہاں سے وہاں تک ہر طرف۔

ہوا معطر تھی، مخمور تھی، گنگنارہی تھی۔ وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ ہنستی، چھیڑ کر جاتی پھر پلٹ کر آتی... کبھی تھپکتی... کبھی تھمتی... پھر چلتی... پھر گنگناتی... پھر لہراتی... وہاں تھی، نہیں تھی... کہاں تھی؟

وہ کسی راستے پر تھا... کیاراستہ تھا...! وہ کسی انتظار میں تھا۔ کیا انتظار تھا...! اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس راستے کے دونوں طرف دورویہ درختوں کی قطار کے ایک درخت کے ساتھ وہ ٹکا کھڑا تھا۔ سہارا لیے یا سہارا دیے۔

وہ آگئی تھی... اس نے بہت دور اس راستے پر اُسے نمودار ہوتے دیکھ لیا۔

وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔ بہت مہین، بہت نفیس... وہ ریشم تھا...؟ اطلس تھا...؟ کم خواب یا وہ کچھ اور تھا؟ اتنا ہلکا... اتنا نازک کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس سفید گاؤن نما لباس کو اڑانے لگا... اس کی دودھی پنڈلیاں نظر آنے لگتیں۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور سبز پر دھرے اس کے خوب صورت پاؤں جیسے سبزے کی نرمی کو برداشت نہیں کر پارہے تھے۔ وہ پاؤں رکھتی چند لمحوں کے لیے لڑکھراتی... جیسے مخمور ہو کر ہنستی... پھر سنبھل جاتی... پھر بڑے اشتیاق سے ایک بار پھر قدم آگے بڑھا دیتی۔

اس کے سیاہ بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے شانوں اور اس کی کمر تک ہلکورے کھا رہے تھے۔ اس کے گالوں اور چہرے کو چومتے آگے پیچھے جارہے تھے... اس کے چہرے پر آتے... اس کے سینے سے لپٹتے... اس کے کندھے پر، پھر ہوا میں لہرا کر ایک بار پھر نیچے چلے جاتے۔ وہ خوب صورت سیاہ چمک دار ریشمی زلفیں جیسے اس کے سفید لباس کے ساتھ مل کر اس کے وجود کے ساتھ رقص کرنے میں مصروف تھیں۔

اس کے مرمریں وجود پر وہ سفید لباس جیسے پھسل رہا تھا... سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا... ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ وہ اس کے جسم کے خدو خال کو نمایاں جکرتا، اسے

پیروں سے کندھوں تک چومتا... اس کے وجود کے لمس سے مخمور ہوتا... ہوش کھوتا...
دیوانہ وار اس کے وجود کے گرد گھومتا... کسی بھنور کی طرح اس کے جسم کو اپنی گرفت
میں لیتا اس سے لپٹ رہا تھا۔ ہوا کا دوسرا جھونکا اس کے سیاہ ریشمی زلفوں کو بھی اس
رقص میں شامل کر دیتا... وہ اس کے کندھوں اور کمر پر والہانہ انداز میں پھسلتیں... ہوا
میں ہلکا ساڑتیں پھر نرمی اور ملائمت سے اس کے چہرے اور سینے پر گرتیں... اس کے
وجود سے پھوٹی خوشبو سے یک دم سرشار ہوتیں... پھر اس کے جسم کو جیسے اپنے وجود
سے چھپانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ ہوا کا ایک اور جھونکا نہیں ہولے سے اٹھا کر پھر
پچھے پھینک دیتا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اس رقص میں اب پھر اس کے سفید لباس کی باری تھی... وہ آگے بڑھ آیا۔ وہ اس کی
طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ عجیب سی حیرت میں مبتلا وہاں کی ہر شے کو سحر زدہ انداز میں
دیکھ رہی تھی... بچوں جیسی حیرت اور اشتیاق کے ساتھ۔

اس راستے پر چلتے چلتے اس نے اسے دیکھ لیا... اس کے قدم تھمے، دونوں کی نظریں ملیں
پھر اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی... پہلے مسکراہٹ پھر ہنسی... اس نے
اسے پہچان لیا تھا... وہاں موجودہ واحد وجود تھا، جسے وہ پہچانتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے قریب آگئی۔ دونوں ایک عجیب سی سرشاری میں ایک دوسرے کے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔

اس کی گہری سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھیں، ہیرے کی کنپوں کی طرح چمک رہی تھیں اور یہ چمک اسے دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گلابی ہونٹوں پر نمی کی ہلکی سی تہہ تھی، یوں جیسے وہ ابھی کچھ پی کر آئی ہو... اس کی ٹھوڑی ہمیشہ کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنی گرفت میں لے لیا... اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی... وہ جیسے اس لمس سے واقف تھی، پھر وہ دونوں بے اختیار ہنسے۔

”تم میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”ہاں۔“

”بہت دیر کر دی؟“

”نہیں... بہت زیادہ نہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اس راستے پر چلنے لگا۔

ہوا ابھی ابھی ان دونوں کے وجود کے ساتھ اور وہاں موجود ہر شے کے ساتھ

اٹھکھیلیاں کرنے میں مصروف تھی۔

وہ اب بھی بچوں جیسی حیرت اور خوشی کے ساتھ وہاں موجود ہر شے کو کھوجنے میں مصروف تھی۔ اس کی کھلکھلاہٹ اور شفاف ہنسی وہاں فضا کو ایک نئے رنگ سے سجانے لگے تھے۔ فضا میں یک دم ایک عجیب و لفریب سے ساز بننے لگا تھا... وہ ٹھٹھکی، پھر بے اختیار کھلکھلائی... اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے اس راستے پر قدم آگے بڑھائے، پھر مردنے اسے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے رقص کے انداز میں گھومتے دیکھا... وہ بے اختیار ہنسا۔ وہ اس راستے پر کسی ماہر پہلے رینا کی طرح رقص کرتی دور جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر موجود سفید لباس اس کے گھومتے جسم کے گرد ہوا میں اب کسی پھول کی طرح رقصاں تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنے لگی تھی... ہوا کے معطر جھونکے بڑی نرمی سے اسے جیسے اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہنستی، رقص کے انداز میں بازو پھیلائے گھوم رہی تھی۔ وہ سحر زدہ اسے دیکھتا رہا... وہ اب کچھ گنگنا رہی تھی، فضا میں یک دم کوئی ساز بننے لگا تھا۔ پہلے ایک... پھر دوسرا... پھر تیسرا... پھر بہت سارے... پوری کائنات یک دم جیسے کسی سمفنی میں ڈھل گئی تھی اور وہ اب بھی ہوا میں رقصاں تھی۔ کسی مٹھلیں پر کی طرح ہوا کے دوش پر اوپر

نیچے جاتے، وہ سحر زدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی رقص کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی، پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا یوں جیسے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ وہ ہنس پڑا وہ ہاتھ بڑھاتی اور وہ کھنچانہ چلا آتا۔

وہ بھی اس کا ہاتھ پکڑے اب فضا میں رقصاں تھا... زمین سے دور... اس کے قریب... اس کے ساتھ... یک دم دور کی، جیسے کائنات ٹھہر گئی ہو۔ وہ اب آسمان کو دیکھ رہی تھی پھر یک دم آسمان تاریک ہو گیا... دن رات میں بدل گیا تھا... اور رات دن سے بڑھ کر خوب صورت تھی... سیاہ آسمان خوب صورت چمکتے ہوئے ستاروں سے سجا ہوا تھا... ہر رنگ کے ستاروں سے... اور ان سب کے درمیان چاند تھا... کسی داغ کے بغیر، روشنی کا منبع۔

دن کی روشنی اجلی تھی... سکون آور تھی... مدہوش کر دینے والی تھی۔ رات کی روشنی میں بے شمار رنگ تھے، کائنات میں ایسے رنگ انہوں نے کب دیکھے تھے... کہاں دیکھے تھے۔ زمین جیسے ہر رنگ کی روشنی میں نہا رہی تھی۔ ایک ستارہ ٹمٹماتا... پھر دوسرا... پھر تیسرا... اور زمین پر کبھی ایک رنگ بڑھتا، کبھی دوسرا، کبھی تیسرا... آسمان کو جیسے کسی نے روشنیوں میں پرو دیا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑے جیسے سرشاری کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی... اس کی حیرت، اس کی سرشاری جیسے اسے محفوظ کر رہی تھی... گدگدار ہی تھی۔

وہ اب پھر زمین پر آگئے تھے۔ رات ایک بار پھر دن میں بدل گئی تھی... سبزہ، پھول، پتے، مہکتی معطر ہوا، سب وہیں تھے۔

اس کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اپنے پیروں کے نیچے جاتے مٹھلیں سبزے پر سجے پھولوں کو دیکھا پھر ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں وہ پھول آگیا، پھر دوسرا، پھر تیسرا... پھر دور دور تک پھیلے سبزے کے سارے پھول جیسے کسی مقناطیس کی طرح اس کی طرف آئے تھے۔ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں... لا تعداد، بے شمار، اتنے کہ اس کے ہاتھ سنبھال نہیں پائے تھے۔ وہ اب اس کے ہاتھوں پر... اب اس کے بالوں پر، اب اس کے لباس پر، اب اس کے جسم پر... وہ خوشی سے بے خود ہو رہی تھی، سرشار ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہوا میں اچھالا... وہ پلک جھپکتے میں آسمان کی طرف گئے... پورا آسمان پھولوں سے بھر گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے پھر پھولوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ پھولوں کو بارش کے قطروں کی طرح مٹھیوں میں بھرتے اور چھوڑتے، بھاگتے، کھلکھلاتے وہ سب پھول زمین پر گر کر ایک

بار پھر سبزے میں اپنی اپنی جگہ سج گئے تھے... وہاں جہاں وہ تھے... وہیں جہاں انہیں
ہونا چاہیے تھا۔

وہ ایک بار پھر آسمان کو دیکھ رہے تھے، وہاں اب بادل نظر آرہے تھے۔ روئی کے
گالوں جیسے حرکت کرتے بادل، وہ سب بادل وہاں جمع ہو رہے تھے، جہاں وہ کھڑے
تھے... پھر اس نے آسمان پر بارش کا پہلا قطرہ دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی
ہتھیلی پر لیا۔ اس قطرے کو دیکھ کر دوبارہ ہنستے ہوئے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ اس بار
وہ قطرہ اوپر جا کر اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ وہ بہت سارے دوسرے قطروں کو ساتھ لے
کر آیا تھا... بہت سارے نرم لمس کے گدگانے والے قطرے... بارش برس رہی تھی
اور وہ دونوں بچوں کی طرح ہنستے، کھلکھلاتے پانی کے ان قطروں کو ہاتھوں سے پکڑ کر
ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے... وہ بارش تھی۔ پانی تھا مگر وہ قطرے ان کے
بالوں، ان کے جسم کو گیلا نہیں کر رہے تھے۔ وہ جیسے شفاف موتیوں کی بارش تھی، جو
ان کے ہاتھ اور جسم کی ایک جنبش پر ان کے بالوں اور لباس سے الگ ہو کر دور جا
گرتے... سبزے اور پھولوں کے اوپر اب بارش کے شفاف موتی جیسے قطروں کی
ایک تہہ سی آگئی تھی، یوں جیسے کسی نے زمین پر کوئی شیشہ پھیلا دیا ہو... اور وہ اس شیشے

پر چل رہے تھے۔ ان کو اپنے سائے میں لیے وہ رکتے، ہاتھ ہلاتے، آسمان پر بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے پھر اپنی طرف بلاتے وہ آسمان پر جیسے پانی سے مصوری کر رہے تھے۔

پھر جیسے وہ اس کھیل سے تھک گئی... وہ رکی... بارش تھمی... زمین سے پانی کے قطرے غائب ہونے لگے پھر بادل... چند ساعتوں میں آسمان صاف تھا۔ یوں جیسے وہاں کبھی بادل نام کو کوئی شے آئی ہی نہ ہو۔

وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”تمہیں کچھ دکھانا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”کچھ اور بھی بھی؟“ اس کی خوشی کچھ اور بڑھی۔

”ہاں، کچھ اور بھی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا؟“ اس نے بے ساختہ اس سے پوچھا تھا... وہ خاموسی سے مسکرا دیا۔

”کیا...؟“ اس نے بچوں کی طرح اصرار کیا۔

وہ پہلے سے زیادہ پُر اسرار انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسی نئے راستے کی

طرف جارہا تھا۔ پھر ان دونوں کو دور سے کچھ نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆☆

سالار نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی سماعتوں نے دور کہیں کسی مسجد سے سحری کے آغاز کا اعلان سنا۔ اس کمرے کے گھپ اندھیرے کو کھلی آنکھوں سے کھوجتے ہوئے اسے اگلا خیال اس خواب اور امامہ کا آیا تھا... وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا، جس سے وہ بیدار ہوا تھا۔ مگر خواب میں وہ امامہ کو کیا دکھانے والا تھا، اسے کچھ یاد نہیں آیا... ”امامہ!“ اس نے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کے لیے رکی... وہ کہاں تھی؟ کیا پچھلی رات ایک خواب تھی؟

وہ یک دم جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا۔ اپنی رکی سانس کے ساتھ اس نے دیوانہ وار اپنے بائیں جانب بیڈ ٹیبل لیمنٹ کا سوئچ آن کیا۔ کمرے کی تاریکی جیسے یک دم چھٹ گئی۔ اس نے برق رفتاری سے پلٹ کر اپنی داہنی جانب دیکھا اور پر سکون ہو گیا۔ اس کی رکی سانس چلنے لگی۔ وہ وہیں تھی۔ وہ ”ایک خواب“ سے کسی ”دوسرے خواب“ میں داخل نہیں ہوا تھا۔

یک دم آن ہونے والے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیپ کی تیز روشنی چہرے پر پڑنے پر امامہ نے نیند میں بے اختیار اپنے ہاتھ اور بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو ڈھک دیا۔

سالار نے پلٹ کر لیپ کی روشنی کو ہلکا کر دیا۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے

چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گہری پرسکون نیند میں۔ اس کا ایک ہاتھ تکیے پر اس کے

چہرے کے نیچے دبا ہوا تھا اور دوسرا اس وقت اس کی آنکھوں کو ڈھانے ہوئے تھا۔

اس کی ادھ کھلی ہتھیلی اور کلائی پر مہندی کے خوب صورت نقش و نگار تھے۔ مٹتے ہوئے

نقش و نگار، لیکن اب بھی اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو خوب صورت بنائے ہوئے

تھے۔

سالار کو یاد آیا، وہ مہندی کسی اور کے لیے لگائی گئی تھی... اس کے ہونٹوں پر ایک

مسکراہٹ آئی۔ اس نے بے اختیار چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔

کسی اور کے لیے؟

پچھلی ایک شام ایک بار پھر کسی فلم کی طرح اس آنکھوں کے سامنے سیکنڈ کے ہزاروں

حصے میں گزر گئی تھی۔ اس نے سعیدہ اماں کے صحن میں اُس چہرے کو نو سال کے بعد

دیکھا تھا اور نو سال کہیں غائب ہو گئے تھے۔ وہ ذرا سا آگے جھکا اس نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ کو اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی میں اس سے چند انچ دور وہ اس پر جھکا، اسے مبہوت دیکھتا رہا۔ وہ گہرے سانس لیتی جیسے اسے زندگی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ جیسے کسی طلسم میں پہنچا ہوا تھا۔ بے حد غیر محسوس انداز میں اس نے امامہ کے چہرے پر آئے کچھ بالوں کو اپنی انگلیوں سے بڑی احتیاط سے ہٹایا۔

☆☆☆☆

”میں لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا۔“ امامہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے سالار کو سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے لیے کہا تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے... اگر وہ لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا تھا تو وہ لائٹ آن رکھ کر نہیں سو سکتی تھی، لیکن وہ یہ بات اسے اتنی بے تکلفی سے نہیں کہہ سکتی تھی، جتنے اطمینان سے وہ اسے کہہ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ الارم سیٹ کر کے سیل فون کو بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے دیکھ کر ٹھٹھکا۔ وہ کمبل لپیٹے اسی طرح بیڈ پر بیٹھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ سالار کے گھر اس

کی پہلی رات تھی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ اپنے بال لپیٹتے ہوئے اپنا تکیہ سیدھا کرنے لگی۔

”تم شاید لائٹ آف کر کے سوتی ہو۔“ سالار کو اچانک خود ہی احساس ہو گیا تھا۔ وہ بستر

پر لیٹتے لیٹتے رک گئی۔

”ہمیشہ۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”پھر کچھ کرتے ہیں۔“ سالار نے بے ساختہ گہرا سانس لے کر سر کھجاتے ہوئے کچھ

سوچنے والے انداز میں کمرے کی لائٹس کا جائزہ لیا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”میں دیکھتا ہوں، دوسرے بیڈروم میں زیرو کا بلب ہے اگر وہ...“ وہ بات کرتے

کرتے رک گیا۔ امامہ نے تاثرات سے اسے لگا کہ یہ حل بھی اس کے لیے قابل قبول

نہیں تھا۔

”زیرو کے بلب کی کتنی روشنی ہوتی!“ سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھ کر کہا۔

”کمرے میں تھوڑی سی بھی روشنی ہو تو میں نہیں سو سکتی۔ میں ”اندھیرے“ میں

سوتی ہوں۔“ اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنا مسئلہ بتایا۔

”عجیب عادت ہے۔“ وہ بے ساختہ کہہ کر ہنسا۔

اس کی بات سے زیادہ اس کی ہنسی امامہ کو کھلی۔

”ٹھیک ہے لائٹ آن رہنے دو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں... نوپر ابلیم میں اسے آف کر رہا ہوں۔“

دونوں بیک وقت اپنے اپنے موقف سے دست بردار ہوئے تھے۔

سالار نے لائٹ آف کر دی اور پھر سونے کے لیے خود بھی بستر پر لیٹ گیا لیکن وہ جانتا

تھا، یہ اس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ مارگلہ کی پہاڑی پر آٹھ سال پہلے گزارا ہوئی

اس ایک رات کے بعد وہ کبھی کمرے کی لائٹ بند کر کے نہیں سو سکا تھا، لیکن اس

وقت اس نے مزید بات نہیں کی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے دوبارہ سحری کے لیے اٹھ

جانا تھا۔ وہ یہ چند گھنٹے بستر میں چپ چاپ لیٹ کر گزار سکتا تھا۔ ویسے بھی ”اندھیرا“

تھا، پر آج وہ ”اکیلا“ نہیں تھا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز

کیسے کریں... سالار کے لیے خاموشی کا یہ وقفہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔

تاریکی میں امامہ نے سالار کو گہرا سانس لے کر کہتے سنا۔

”اب اگر اتنی بڑی قربانی دے رہا ہوں میں لائٹ آف کر کے تو ”کوئی“ ہاتھ ہی پکڑ لے۔“ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اندھیرے میں اس کے کچھ قریب ہوئی اور سالار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟“ اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

”اگر ہاں کہوں گا تو کیا کرو گی؟“ سالار نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

”تسلی دوں گی اور کیا کروں گی۔“ وہ مجبور ہوئی تھی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”جیسے اب دے رہی ہو؟“ اسے امامہ کو تنگ کرنے میں مزا آ رہا تھا لیکن یہ جملہ کہنے

سے پہلے اس نے اپنے سینے پر دھرے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس

کے متوقع جوابی عمل کو سالار سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ امامہ واقعی ہاتھ ہٹانے

ہی والی تھی۔

”ڈر کیوں لگتا ہے تمہیں؟“ امامہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ڈر نہیں لگتا، بس صرف سو نہیں سکتا۔“

”کیوں؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ فوری جواب نہیں دے سکا۔ مارگلہ کی وہ رات سالار کی نظروں میں گھومنے لگی تھی۔
امامہ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی پھر بولی۔

”بتانا نہیں چاہتے...؟“ سالار کو حیرانی ہوئی۔ وہ کیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھی؟

”اور ایسا کب سے ہے؟“ امامہ نے اپنے سوال کو بدل دیا تھا۔

”آٹھ سال سے۔“ سالار نے جواب دیا۔

وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکی۔ اسے بھی بہت کچھ یاد آنے لگا تھا... آٹھ سال، آٹھ سال... وہ آٹھ سال سے اندھیرے سے خوف زدہ تھا... اور وہ نو سال سے روشنی سے خوف کھاتی پھر رہی تھی... دنیا سے چھپتی پھر رہی تھی۔ اس نے سالار سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک دوسرے کے وجود میں پیوست کانٹوں کو نکالنے کے لیے ایک رات ناکافی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم کر اسے اپنی بند آنکھوں پر رکھ رہا تھا۔ امامہ بے اختیار رنجیدہ ہوئی۔

”میں لائٹ، آن کر دیتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں... اندھیرا اچھا لگنے لگا ہے مجھے۔“ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ آنکھوں پر رکھے

بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆☆

بہت نرمی سے جھک کر اس نے امامہ کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ اس سے باتیں کرتا کس وقت سویا تھا، اسے اندازہ نہیں ہوا اور اب وہ جاگا تو اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سونا اتنا مشکل اور اتنا ہولناک ثابت نہیں ہوا تھا، جتنا وہ سمجھتا رہا تھا۔

کمبل کو کچھ اوپر کھینچتے ہوئے اس نے اسے گردن تک ڈھانپ دیا اور پھر لیمپ آف

کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے وہ اپنے سیل فون پر لگا الارم آف کر گیا۔

واش روم میں اس نے واش بیسن پر امامہ کے ہاتھ سے اتری کالنج کی کچھ چوڑیاں اور اس کے ایر رنگز دیکھے۔ اس نے ایر رنگز اٹھالیے۔ وہ دیر تک انہیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوب صورت جتھے مگر اب پرانے ہو رہے تھے۔

جس وقت وہ نہا کر باہر نکلا، وہ تب بھی گہری نیند میں تھی۔ کمرے کی لائٹ آن کیے بغیر وہ دبے پاؤں بیڈروم سے باہر آگیا۔ بہت دور کسی مسجد میں کوئی نعت پڑھ رہا تھا یا محمد... آواز اتنی مدہم تھی کہ سمجھنا مشکل تھا۔ اس نے سٹنگ ایریا کی لائٹ آن کر دی۔ لائٹ آن کرتے ہی اس کی نظر سینٹر ٹیبل پر پڑے کافی کے دو گنز پر پڑی۔

وہ دنوں رات کو وہیں بیٹھے کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔ صوفے پر اس کی اونی شال پڑی تھی، جس میں وہ اپنے پاؤں چھپائے بیٹھی رہی تھی۔ رات ایک بار پھر جیسے کسی خواب کا قصہ لگنے لگی تھی... بے یقینی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی... خوش قسمتی تھی کہ اب بھی گمان بنی ہوئی تھی۔

وہ بھول گیا کہ وہ بیڈروم سے یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ واقعی سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس ”وہ“ تھی اور ”وہ“ تھی تو سب کچھ تھا۔

اس کے سیل پر آنے والی فرقان کی کال نے یک دم اسے چونکا دیا تھا۔ کال ریسپونڈ کیے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ وہ اسے سحری دینے آیا تھا۔

☆☆☆☆

اس کی آنکھ الارم کی آواز سے کھلی تھی۔ مندھی آنکھوں کے ساتھ اس نے لیٹے لیٹے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس الارم کو بند کرنے کی کوشش کی، لیکن الارم کلاک بند ہونے کے بجائے نیچے کارپٹ پر گر گیا۔ امامہ کی نیند یک دم غائب ہو گئی۔ الارم کی آواز جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ جھلا کر اٹھی تھی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیپ آن کر کے وہ کمبل سے نکلی اور بے اختیار کپکپائی۔ سردی بہت تھی۔ اس نے کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ کی پانٹی کی طرف اپنی اونی شمال ڈھونڈنے کی کوشش کی... وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے جھک کر کارپٹ پر دیکھا اب بھی بج رہا تھا۔ مگر نظر اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ تب ہی اس نے اچانک کوئی خیال آنے پر سالار کے بستر کو دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اسے جیسے یک دم یاد آیا کہ وہ ”کہاں“ تھی۔ جھنجھلاہٹ یک دم غائب ہوئی تو اور ساتھ ہی الارم کی آواز بھی... یہ سحری کا وقت تھا۔

امامہ، سالار کے گھر پر تھی اور یہ اس کی نئی زندگی کا پہلا دن تھا۔

وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کمبل کے ایک کونے سے اس نے اپنے کندھے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ کچھ کم ہوئی۔ اس نے پہلی بار اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں کو غور سے دیکھا۔ وہاں رات کو سالار نے گھڑی رکھی تھی... لیکن اب

وہاں نہیں تھی۔ ایک چھوٹا رائٹنگ پیڈ اور پین بھی تھا۔ پاس ہی کارڈ لیس فون تھا۔ پانی کی ایک چھوٹی بوتل بھی وہیں تھی اور اس کے پاس اس کا سیل پڑا تھا۔ اسے ایک بار پھر الرام کلاک کا خیال آیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے الارم نہیں لگایا تھا۔ یہ کام سالار کا تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے الارم لگایا تھا۔

پھر جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔ بیڈ کی وہ سائیڈ جو رات کو اس نے سونے کے لیے منتخب کی تھی، وہ سالار کا بستر تھا۔ وہ عادتاً دائیں طرف گئی تھی اور سالار اسے روک نہیں سکا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر اس نے بے حد ڈھیلے انداز میں اپنے سیل فون اٹھا کر رٹائم دیکھا اور جیسے کرنٹ کھا کر اس نے کمبل اتار پھینکا۔ سحری ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے اور سالار وہ الارم یقیناً اسے بیدار کرنے کے لیے لگا کر گیا تھا۔ اسے بے ساختہ غصہ آیا، وہ اسے خود بھی جگا سکتا تھا۔

جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں گئی، اس کا غصہ غائب ہو چکا تھا۔ کم از کم آج وہ اس سے خوش گوار موڈ میں ہی سامنا چاہتی تھی۔ سٹنگ ایریا کے ڈائمنگ ٹیبل پر سحری کے لیے کھانا رکھا تھا۔ وہ بہت تیزی سے کچن میں کھانے کے برتن لینے کے لیے گئی تھی لیکن سنک میں دو افراد کے استعمال شدہ برتن دیکھ کر اسے جیسے دھچکا لگا

تھا۔ وہ کھانا یقیناً فرقان کے گھر سے آیا تھا اور وہ فرقان کے ساتھ ہی کھا چکا تھا۔ اسے خواہ مخواہ خوش فہمی ہوئی تھی کہ آج اس کے گھر میں پہلی سحری تو وہ ضرور اسی کے ساتھ کرے گا... بو جھل دل کے ساتھ ایک پلیٹ لے کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آگئی، لیکن چند لقموں سے زیادہ نہیں لے سکی۔ اسے کم از کم آج اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا... اس کے ساتھ کھانا کھانا چاہیے تھا... امامہ کو واقعی بہت رنج ہوا تھا۔

چند لقموں کے بعد ہی وہ بڑی بے دلی سے ٹیبل سے برتن اٹھانے لگی۔

برتن دھوتے دھوتے اذان ہونے لگی تھی، جب اسے پہلے بار خیال آیا کہ سالار گھر میں نظر نہیں آ رہا۔

اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ دھوتے دھوتے وہ اسے اسی طرح سنک میں چھوڑ کر باہر آگئی۔ اس نے سارے گھر میں دیکھا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔

پھر کچھ خیال آنے پر وہ بیرونی دروازے کی طرف آئی۔ دروازہ مقفل تھا لیکن ڈور چین ہٹی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً گھر پر نہیں تھا... کہاں تھا؟ اس نے نہیں سوچا تھا۔

اس کی رنجیدگی میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی شادی کے دوسرے دن اسے گھر پر اکیلا چھوڑ

کر کتنی بے فکری سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے پچھلی رات کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگی تھیں۔ واپس کچن میں آکر وہ کچھ دیر بے حد دل شکستگی کی کیفیت میں سنک میں پڑے برتنوں کو دیکھتی رہی۔ وہ ”محبوبہ“ سے ”بیوی“ بن چکی تھی مگر اتنی جلدی تو نہیں۔ ناز برداری نہ سہی خیال تو کرنا چاہیے۔ اس کی آزر دگی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ ”چند گھنٹوں کے اندر کوئی اتنا بدل سکتا ہے، مگر رات کو تو وہ...“ اس کی زنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

”یقیناً سب کچھ جھوٹ کہہ رہا ہو گا ورنہ میرا کچھ تو خیال کرتا۔“ وہ زنجیدگی اب صدمے میں بدل رہی تھی۔

وہ نماز پڑھ چکی تھی اور سالار کا بھی بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ اگر وہ فجر کی نماز کے لیے بھی گیا تھا تو اب تک اسے آجانا چاہیے تھا۔ پھر اس نے اس تشویش کو سر سے جھٹک دیا۔

☆☆☆☆

سالار جس وقت دوبارہ اپارٹمنٹ میں آیا، وہ گہری نیند میں تھی۔ بیڈروم کی لائٹ آف تھی اور ہیٹر آن تھا۔ وہ اور فرقان فجر کی نماز سے بہت دیر پہلے مسجد میں چلے جاتے اور

قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ دونوں وہیں سے بلڈنگ کے جم میں چلے جاتے اور تقریباً ایک گھنٹے کے ورک آؤٹ کے بعد وہاں سے آتے اور آج یہ دورانہ ”آمنہ“ کے امامہ ہونے کی وجہ سے کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ فرقان سحری کے وقت ان دونوں کے لیے کھانالے کر آیا تھا اور وہ بھونچکا بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ رات کو سالار کے جس بیان کو صدمے کی وجہ سے ذہنی حالت میں ہونے والی کسی خراب کا نتیجہ سمجھ رہا تھا، وہ کوئی ذہنی خرابی نہیں تھی۔

وہ اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھا سحری کر رہا تھا اور فرقان اسے رشک سے دیکھ رہا تھا۔ رشک کے علاوہ کوئی اس پر کبھی کیا سکتا تھا۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے سحری کرتے ہوئے اس کی اتنی لمبی خاموشی پر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔ فرقان اس کے سامنے بیٹھا ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم آج اپنی نظر اتروانا۔“ فرقان نے بالآخر اس سے کہا۔

”اچھا...؟“ وہ ہنس پڑا۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات کم از کم اس گفتو کے بعد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا۔“ فرقان نے اپنے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

جو کچھ ہوا تھا، اسے سمجھنے سے زیادہ اسے ہضم کرنے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔ کسی کو بھی ہو سکتی تھی سوائے سامنے بیٹھے ہوئے اس شخص کے، جو اس وقت کانٹے کے ساتھ آلیٹ کلا آخری ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ رہا تھا۔

”اور اگر کوئی صدقہ جو غیرہ دے سکو تو وہ بھی بہتر ہے۔“ فرقان نے اس کے ردِ عمل کو مکمل طور پر نظر انداز جکرتے ہوئے کہا۔ سالار اب بھی خاموش رہا۔

”آمنہ سحری نہیں کرے گی؟“ فرقان کو یک دم خیال آیا۔

”سورہی ہے وہ ابھی... میں الارم لگا آیا ہوں، ابھی کافی وقت ہے سحری کا ٹائم ختم ہونے میں۔“ سالار نے کچھ لاپرواہی سے اس سے کہا۔

”فرقان! اب بس کرو...“ اس سے بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر فرقان کی نظروں سے جھنجھلایا۔ وہ پھر اسے ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا بند کرو۔“ اس نے اس بار کچھ خفگی سے فرقان

سے کہا۔

”تم... تم بہت نیک آدمی ہو سالار...! اللہ تم سے بہت خوش ہے...“ وہ آملیٹ کا ایک اور ٹکڑا لیتے لیتے فرقان کی بات پر ٹھٹھک گیا۔

اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی۔ مزید ایک لفظ کہے بغیر اس نے پلیٹ پیچھے ہٹادی اور اپنے برتن اٹھا کر اندر کچن میں لے گیا۔ وہ خوشی، سرشاری، اطمینان اور سکون جو کچھ دیر پہلے جیسے اس کے پورے وجود سے چھلک رہا تھا، فرقان نے پلک جھپکتے اسے دھواں بن کر غائب ہوتے دیکھا۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے فرقان نے بالآخر اس سے پوچھا تھا۔

”اتنے چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ وہ اسی طرح خاموشی سے چلتا رہا۔

”میری کوئی بات بری لگی ہے؟“

وہ اب بھی خاموش رہا۔ مسجد کے دروازے پر اپنے جو گرز اتار کر اندر جانے سے پہلے

اس نے فرقان سے کہا۔

”مجھے تم سب کچھ کہہ لینا فرقان! لیکن کبھی نیک آدمی مت کہنا۔“

فرقان کچھ بول نہیں سکا۔ سالار مسجد میں داخل ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

امامہ کی آنکھ گیارہ بجے سیل فون پر آنے والی ایک کال سے کھلی تھی، وہ ڈاکٹر سبط علی تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی اس کا دل بھر آیا تھا۔

”میں نے آپ کو نیند سے جگھورا۔

؟“

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔ انہوں نے اس کی رندھی ہوئی آواز پر غور نہیں کیا تھا۔

”نہیں، میں اٹھ گئی تھی۔“ اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے جھوٹ بولا۔

وہ اس کا حال احوال پوچھتے رہے۔ وہ بڑے بوجھل دل کے ساتھ تقریباً خالی الذہنی کے عالم میں ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

چند منٹ اور بات کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔ کال ختم کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے سیل فون میں چمکتے ہوئے نام پر پڑی تھی۔ وہ چونک اٹھی، اسے فوری طور

پر یاد نہیں آیا کہ اس نے سالار کا نام اور فون نمبر کب محفوظ کیا تھا۔ یقیناً یہ بھی اسی کا کارنامہ ہوگا۔ اس نے اس کا ایس ایم ایس پڑھنا شروع کیا۔

”پلیز جاگنے کے بعد مجھے میسج کرنا۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے۔“ اسے نجانے کیوں اس کا میسج پڑھ کر غصہ آیا۔

”بڑی جلدی یاد آگئی ہیں۔“ وہ میسج کا ٹائٹل چیک کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ وہ شاید دس، پچاس پر آیا تھا۔ ”اگر آفس جاتے ہوئے اسے میں یاد نہیں آئی تو آفس میں بیٹھ کر کیسے آسکتی ہوں۔“ وہ اس وقت اس سے جی بھر کر بدگمان ہو رہی تھی اور شاید ٹھیک ہی ہو رہی تھی۔ وہ پچھلی رات کے لیے ”چیف گیسٹ“ تھی اور اگلی صبح وہ اس کے ساتھ بن بلائے مہمان جیسا سلوک کر رہا تھا۔ کم از کم امامہ اس وقت یہی محسوس کر رہی تھی وہ اس وقت وہ باتیں جسوچ رہی تھی جو سالار کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔

وہ کچھ عجیب انداز میں خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے کمبل تہہ کرتے ہوئے بستر ٹھیک کیا اور بیڈروم سے باہر نکل آئی۔ اپارٹمنٹ کی خاموشی نے اس کی ادا سی میں اضافہ کیا تھا۔ کھڑکیوں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ کچن کے سنک میں وہ برتن ویسے ہی موجود تھے جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

”ہاں، وہ بھلا کیوں دھوتا، یہ سارے کام تو ملازموں کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں تو نہیں دھوؤں گی، چاہے ایک ہفتہ ہی پڑے رہیں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں۔“ ان برتنوں کو دیکھ کر اس کی خفگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت وہ ہر بات منفی انداز میں لے رہی تھی۔

وہ بیڈ روم میں آئی تو اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو خیال آیا کہ شاید سالار کی کال ہو، لیکن وہ مریم کی کال تھی۔ امامہ کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے بڑے اشتیاق کے عالم میں امامہ سے پوچھا۔

”سالار نے منہ دکھائی میں کیا دیا تمہیں؟“ امامہ چند لمحے بول نہیں سکی۔ اس نے تو کوئی تحفہ نہیں دیا تھا اسے، سالار کے نامہ اعمال میں جا یک اور گناہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ امامہ نے کچھ دل شکستہ انداز میں کہا۔

”اچھا...؟ چلو کوئی بات نہیں، بعد میں دے دے گا، شاید اسے خیال نہیں آیا۔“ مریم نے بات بدل دی تھی، لیکن اس کا آخری جملہ امامہ کو چبھا۔ اسے خیال نہیں آیا... ہاں واقعی اسے خیال نہیں آیا ہو گا۔ وہ بے حد خفگی کے عالم میں سوچتی رہی۔

سالار سے اس کے گلے شکوے اس گھر میں آنے کے دوسرے دن ہی شروع ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لا شعوری طور پر اس کی کال کی منتظر تھی۔ کہیں نہ کہیں اسے اب بھی امید تھی کہ جوہ کم از کم دن میں ایک بار تو اسے کال کرے گا۔ کم از کم جابیک بار... ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اسے میسج کر کے اسے اپنے ہونے کا احساس تو دلانا چاہیے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ بے حد بے دلی سے اپنے کپڑے نکال کر نہانے کے لیے چلے گئی۔ واش روم سے باہر نکلتے ہی اس نے سب سے پہلے سیل فون چیک کیا تھا وہاں کوئی میسج تھا اور نہ کوئی مسڈ کال۔

چند لمحے وہ سیل فون پکڑے بیٹھی رہی پھر اس نے اپنی ساری انا اور سارے غصے کو بالائے طاق رکھ کر اسے مسیج کر دیا۔

اس کا خیال تھا، وہ اسے فوراً کال کرے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ پانچ منٹ... دس منٹ... پندرہ منٹ... اس نے اپنی انا کا کچھ اور مٹی کرتے ہوئے اسے میسج کیا۔ بعض دفعہ میسج بھی تو نہیں ہیں، اس نے اپنی عزت نفس کی ملامت سے بچنے کے لیے بے حد کمزور تاویل تلاش کی۔

”آج کل ویسے بھی نیٹ ورک اور سگنلز کا اتنا زیادہ مسئلہ ہے۔“

”عزت نفس“ نے اسے جو ابا ڈوب مرنے کے لیے کہا تھا۔ فون اب بھی نہیں آیا تھا، لنچ بریک کے باوجود۔ ماہ رمضان نہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت اپنی ”عزت نفس“ کو اس کے لنچ میں مصروف ہونے کا بہانہ پیش کرتی۔

اب وہ واقعی ناخوش تھی بلکہ ناخوش سے بھی زیادہ، اب اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سالار کے سیل پر کال کی۔ دو بیلز کے بعد کال کسی لڑکی نے ریسیو کی۔ ایک لمحے کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سالار کے بجائے کسی لڑکی کی آواز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”میں آپ کی کیا ہیلپ کر سکتی ہوں میم؟“ لڑکی نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”مجھے سالار سے بات کرنی ہے۔“ اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔

”سالار سکندر صاحب تو ایک میٹنگ ہیں میں۔ اگر آپ کوئی کلائنٹ ہیں اور آپ کو بینک سے متعلقہ کوئی کام ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں یا آپ میسج چھوڑ دیں ان

کے لیے... میٹنگ میں بریک آئے گی تو میں انہیں انفارم کر دوں گی۔ ”اس لڑکی نے بے حد پرو فیشنل انداز میں کہا۔ امامہ خاموش رہی۔

”ہیلو... مس امامہ!“ اس لڑکی نے یقیناً سالار کے سیل پر اس کی آئی ڈی پڑھ کر اس کا نام لیا تھا۔ وہ اب اسے متوجہ کر رہی تھی۔

”میں بعد میں کال کر لوں گی۔“ اس نے بددلی کے ساتھ فون بند کر دیا۔

”تو وہ میٹنگ میں ہے اور اس کس سیل تک اس کے پاس نہیں... اور مجھے کہہ رہا تھا کہ میں جاگنے کے بعد اسے انفارم کروں... کس لیے؟“ وہ دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

☆☆☆☆

”ارے بیٹا! میں تو کب سے تمہارے فون کے انتظار میں بیٹھی ہو۔ تمہیں اب یاد آئی سعیدہ اماں کی۔“ سعیدہ اماں نے اس کی آواز سنتے ہی گلہ کیا۔

اس نے جواباً بے حد کمزور بہانے پیش کیے۔ سعیدہ اماں نے اس کی وضاحتوں پر غور نہیں کیا۔

”سالار ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ؟“

انہوں نے اس سوال کے مضمورات کا اس صورت حال میں سوچے بغیر پوچھا اور امامہ کے صبر کا جیسے پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سعیدہ اماں بری طرح گھبرا گئی تھیں۔

”کیا ہوا بیٹا؟... ارے اس طرح کیوں رو رہی ہو...؟ میرا تو دل گھبرانے لگا ہے... کیا ہو گیا آمنہ؟“ سعیدہ اماں کو جیسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

”سالار نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟“ سعیدہ اماں کو سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔

”مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ امامہ نے ان کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔

سعیدہ اماں کی حواس باختگی میں اضافہ ہوا۔

”میں نے کہا بھی تھا آپ سے۔“ وہ روتی جا رہی تھی۔

”کیا وہ اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے تم سے؟“

سعیدہ اماں نے سالار کے حوالے سے واحد خدشے کے بے اختیار ذکر کیا۔

”پہلی بیوی...؟“ امامہ نے روتے روتے کچھ حیرانی سے سوچا۔

لیکن سالار کے لیے اس وقت اس کے دل میں اتنا غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس نے بلا سوچے سمجھے سعیدہ اماں کے خدشے کی تصدیق کی تھی۔

”جی...!“ اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

سعیدہ اماں کے سینے پر جیسے گھونسا لگا۔ یہ خدشہ تو نہیں تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ اپنے گھر لے جاتے ہی پہلے دن تو وہ کم از کم اپنی اس کئی سال پرانی منکوہہ کا ذکر نہیں کرے گا۔ امامہ کو سالار پر کیا غصہ آنا تھا جو سعیدہ اماں کو آیا تھا، انہیں یک دم پچھتاوا ہوا تھا۔ واقعی کیا ضرورت تھی یوں راہ چلتے کسی بھی دو ٹکے کے آدمی کو پکڑ کر یوں اس کی شادی کر دینے کی۔ انہوں نے پچھتاتے ہوئے سوچا۔

”تم فکر نہ کرو... میں خود سبٹ علی بھائی سے بات کروں گی۔“ سعیدہ اماں بے حد غصے میں کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں اماں! بس میری قسمت ہی خراب ہے۔“

سعیدہ اماں کے پاس آنے والی عورتوں کے منہ سے کئی بار سنا ہوا گھسا پٹا جملہ کس طرح اس کی زبان پر آگیا، اس کا اندازہ امامہ کو نہیں ہوا لیکن اس جملے نے سعیدہ اماں کے دل

پر جیسے آری چلا دی۔

”ارے کیوں قسمت خراب ہے... کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں رہنے کی... تم ابھی آ جاؤ اس کے ہر سے... ارے میری معصوم بچی پر اتنا ظلم... ہم نے کوئی جہنم میں تھوڑا پھنکنا ہے تمہیں۔“

امامہ کو ان کی باتوں پر اور رونا آیا۔ خود ترسی کا اگر کوئی ماؤنٹ ایورسٹ ہوتا تو وہ اس وقت اس کی چوٹی پر جھنڈا گاڑ کر بیٹھی ہوتی۔

”بس! تم ابھی رکشہ لو اور میری طرف آ جاؤ۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر بیٹھے رہنے کی۔“

سعیدہ اماں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

یہ گفتگو مزید جاری رہتی تو شاید امامہ بغیر سوچے سمجھے روتے ہوئے اسی طرح وہاں سے چل بھی پڑتی۔ وہ اس وقت کچھ اتنی ہی جذباتی ہو رہی تھی لیکن سالار کے ستاروں کی گردش اس دن صرف چند لمحوں کے لیے اچھی ثابت ہوئی۔ سعیدہ اماں سے بات کرتے کرتے کال کٹ گئی تھی، اس کا کریڈٹ ختم ہو گیا تھا۔ امامہ نے لینڈ لائن سے

کال کرنے کی کوشش کی لیکن کال نہیں ملی۔ شاید سعیدہ اماں نے فون کارڈ یسور کریڈٹل پر ٹھیک سے نہیں رکھا تھا۔ وہ بری طرح جھنجھلائی۔

سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی بار بہت اچھا محسوس کر رہی تھی، یوں جیسے کسی نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ اسے اس وقت جس ”متعصب“ جانب داری کی ضرورت تھی، انہوں نے اسے وہی دی تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے روانی اور فراوانی سے بہنے والے آنسو اب یک دم خشک ہو گئے تھے۔

وہاں سے دس میل کے فاصلے پر اپنے بینک کے بورڈ روم میں بیٹھی evaluation team کو دی جانے والی پریزینٹیشن کے اختتامیہ سوال و جواب کے سیشن پر credibility and trust factors سے متعلقہ کسی سوال کے جواب میں بولتے ہوئے سالار کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر پر موجود اس کی ایک دن کی بیوی اور نو سالہ ”محبوبہ“ گھر پر بیٹھی اس کی ”ساکھ“ اور ”نام“ کا تیا پانچہ کرنے میں مصروف تھی۔ جس کو اس وقت اس وضاحت کی اس ایویلیویشن ٹیم سے زیادہ ضرورت تھی۔

سونہا ہو گیا... رونا بھی ہو گیا... اب اور کیا رہ گیا تھا... اماں نے ٹشو پیپر سے آنکھیں اور

ناک رگڑتے ہوئے بالآخر ریسپورر رکھتے ہوئے سوچا۔ اسے کچن کے سنک میں پڑے برتنوں کا خیال آیا، بڑی نیم دلی سے وہ کچن میں گئی اور ان برتنوں کو دھونے لگی۔ وہ شام کے لیے اپنے کپڑے نکالنے کے لیے ایک بار پھر بیڈ روم میں آگئی اور تب ہی اس نے اپنا سیل فون بجھتے سنا۔ جب تک وہ فون کے پاس پہنچی، فون بند ہو چکا تھا۔ وہ سالار تھا اور اس کے سیل پر یہ اس کی چوتھی مسڈ کال تھی۔ وہ سیل ہاتھ میں لیے اس کی اگلی کال کا انتظار کرنے لگی۔ کال کے بجائے اس کا میسج آیا۔ وہ اسے اپنے پروگرام میں تبدیلی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر سبط علی کا ڈرائیور ایک گھنٹے تک اسے وہاں سے ڈاکٹر صاحب کے گھر جائے گا اور وہ افطار کے بعد آفس سے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر آنے والا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس کا دل چاہا، وہ فون کو دیوار پر دے مارے لیکن وہ اس کا اپنا فون تھا۔ سالار کو کیا فرق پڑتا۔

وہ اس سے رات کو اتنا لمبا چوڑا اظہار محبت نہ کرتا تو وہ آج اس سے توقعات کا یہ انبار لگانہ بیٹھی ہوتی لیکن سالار کے ہر جملے پر اس نے لاشعوی طور پر پچھلی رات اپنے دامن کے ساتھ ایک گرہ باندھ لی تھی اور گرہوں سے بھر اوہ دامن اب اسے بری طرح تنگ

کرنے لگا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی گھر پر نہیں تھے۔ آنٹی کلثوم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور وہ بھی جس حد تک مصنوعی جوش و خروش اور اطمینان کا مظاہرہ کر سکتی تھی، کرتی رہی۔ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ مل کر افطار اور ڈنر کی تیاری کرواتی رہی۔

ڈاکٹر سبط علی افطار سے کچھ دیر پہلے آئے تھے اور انہوں نے امامہ کی سنجیدگی نوٹ کی تھی۔ مگر اس کی سنجیدگی کا تعلق سالار سے نہیں جوڑا تھا۔ وہ جوڑ بھی کیسے سکتے تھے۔ سالار افطار کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد آیا تھا۔

اور امامہ سے پہلی نظر ملتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرائی تھی، نہ ہی اس نے ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کی طرح گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ بس نظریں چرا کر لاؤنج سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ آخر وہ اس سے کس بات پر ناراض ہو سکتی ہے۔

وہ ڈاکٹر سبٹ علی کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا ہوا اپنے ذہن میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے واقعات کو دہراتا اور کوئی ایسی بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا جو امامہ کو خفا کر سکتی تھی۔ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں آئی۔ ان کے درمیان آخری گفتگو رات کو ہوئی تھی۔ وہ اس کے بازو پر سر رکھے باتیں کرتی سوئی تھی۔ خفا ہوتی تو... وہ الجھ رہا تھا...

”کم از کم میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو اسے برا لگا ہو، شاید یہاں کوئی ایسی بات ہوئی ہو۔“ سالار نے خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے سوچا۔ ”لیکن یہاں کیا بات ہوئی ہو گی...؟... شاید میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس ہو کر سوچ رہا ہوں، غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے مجھے۔“

وہ اب خود کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کی چھٹی حس اسے اب بھی اشارہ دے رہی تھی۔ بے شک وہ اس سے نو سال بعد ملا تھا مگر نو سال پہلے دیکھے جانے والا اس کا ہر موڈ اس کے ذہن پر رجسٹرڈ تھا اور وہ امامہ کے اس موڈ کو بھی جانتا تھا۔

ڈنر ٹیبل پر بھی زیادہ تر گفتگو ڈاکٹر سبٹ علی اور سالار کے درمیان ہی ہوئی۔ وہ آنٹی کے ساتھ وقفے وقفے سب کو ڈنر سرور کرتی رہی، خاموشی اب بھی برقرار تھی۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنے آیا اور حفظ قرآن کے بعد آج پہلی بار تراویح کے دوران اٹکا۔ ایک بات نہیں دو بار... اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن وہ بار بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

وہ ساڑھے دس بجے کے قریب ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے سعیدہ اماں کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے اور سالار نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

”تم مجھ سے خفا ہو؟“

کھڑکی سے باہر دیکھتے وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اس نے کہا۔

”میں تم سے کیوں خفا ہوں گی؟“ وہ بدستور کھڑکی کی طرف گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ سالار کچھ مطمئن ہوا۔

”ہاں، میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی جس پر تمہارا موڈ آف ہوتا۔“

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ نے اس کی بات سنی اور اس کی برہمی کچھ اور بڑھی۔

”یعنی میں عقل سے پیدل ہوں جو بلا وجہ اپنا موڈ آف کرتی پھر رہی ہوں... اور اس نے

میرے رویے اور حرکتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا۔“

”میں تمہیں آج فون کرتا رہا لیکن تم نے فون ہی نہیں اٹھایا۔“ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

امامہ کو سوچتے ہوئے عجیب سی تسلی ہوئی۔

”اچھا ہوا نہیں اٹھایا یعنی اس نے محسوس تو کیا کہ میں جان بوجھ کر اس کی کال نہیں لیتی رہی۔“

”پھر میں نے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ وہ بھی انگیجڈ تھا، تم یقیناً اس وقت مصروف تھی اس لیے کال نہیں لے سکیں۔“ وہ بے حد عام سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہاں بے نیازی کی انتہا تھی۔

امامہ کے رنج میں اضافہ ہوا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے فون کا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔

”مجھے اپنے فون کے لیے کارڈ خریدنا ہے۔“

سالار نے اسے ایک دم کہتے سنا، وہ اپنا ہینڈ بیگ کھولے اس میں سے کچھ نکال رہی تھی اور جو چیز اس نے نکال کر سالار کو پیش کی تھی، اس نے چند لمحوں کے لیے سالار کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ ہزار روپے کا ایک نوٹ تھا۔ وہ اس کے تاثرات سے بے خبر اب وند

سکرین سے باہر کسی ایسی شاپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی جہاں پر وہ کارڈز دستیاب ہوتے۔ سالار نے اپنی طرف بڑھے ہوئے اس کے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”واپسی پر لیتے ہیں... اور اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تمہیں آنکھیں بند کر کے اپنے سیل فون تھما دیا تھا جب تم میری کچھ نہیں تھی تو اب

کیا پیسے لوں گا تم سے!“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

گاڑی میں کچھ عجیب سی خاموشی در آئی تھی۔ دونوں کو بیک وقت کچھ یاد آیا تھا اور جو یاد

آیا تھا اس نے یک دم وقت کو وہیں روک دیا تھا۔

بہت غیر محسوس انداز میں امامہ نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے اس ٹکڑے کو بہت سی

تہوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے اس کی ساری رقم لوٹا دی تھی، بلکہ اس سے زیادہ

ہی جتنی اس نے فون، فون کے بل اور اس کے لیے خرچ کی ہوگی۔ مگر احسان... یقیناً

اس کے احسانوں کا وزن بہت زیادہ تھا۔ اس نے کاغذ کی لپٹی تہوں کو دوبارہ بیگ میں

ڈال لیا۔ صبح سے اکٹھی کی ہوئی بدگمانیوں کی دھند بیکدم چھٹ گئی تھی یا کچھ دیر کے لیے امامہ کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

باہر سڑک پر دھند تھی اور وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ امامہ کا دل چاہا، وہ اس سے کچھ بات کرے لیکن وہ خاموش تھا۔ شاید کچھ سوچ رہا تھا یا لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔

”آج سارا دن کیا کرتی رہیں تم؟“

اس نے بالآخر گفت گو کا دوبارہ آغاز کرنے کی کوشش کی تھی۔ پورا دن فلیش کی طرح امامہ کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ امامہ کو ندامت ہوئی، وہ جو کچھ کرتی رہی تھی، اسے بتا نہیں سکتی تھی۔

”میں سوتی رہی۔“ اس نے پورے دن کو تین لفظوں میں سمیٹ دیا۔

”ہاں، مجھے اندازہ تھا، جاگ رہی ہو تیں تو میری کال ضرور ریسیدو کرتیں۔“ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”پاپا، ممی اور انتیا آ رہے ہیں کل شام۔“ سالار نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم سے ملنے کے لیے؟“ اس نے مزید اضافہ کیا اور بالآخر سسرال کے ساتھ اس کا

پہلا رابطہ ہونے والا تھا۔ امامہ کو اپنے پیٹ میں گرہیں لگتی محسوس ہوئیں۔

”تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا ہے؟“ اس نے بے حد نپے تلے الفاظ میں

پوچھا۔

”نہیں، فی الحال نہیں، لیکن آج بتاؤں گا پاپا کو فون پر۔“ وہ ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے

ہوئے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کوئی پریشانی، تشویش، اندیشہ،

خوشہ، خوف، کچھتا... وہ کچھ بھی پڑھنے میں ناکام رہی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور اگر

اس کے دل میں کچھ تھا بھی تو وہ اسے بڑی مہارت سے چھپائے ہوئے تھا۔

سالار نے اس کو کھوجتی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے امامہ کی طرف

دیکھا اور مسکرایا۔ امامہ نے بے اختیار نظریں ہٹائیں۔

”انیتا کی فلائٹ ساڑھے پانچ بجے اور پاپا کی سات بجے ہے... میں کل بینک سے جلدی

ایئرپورٹ چلا جاؤں گا، پھر ممی اور پاپا کو لے کر میرا خیال ہے نو یا ساڑھے نو بجے تک گھر

پہنچوں گا۔”

”یہ تم نے کہا پہنا ہوا ہے؟“ سالار نے یک دم اس کے لباس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

تین گھنٹے سینتالیس منٹ کے بعد بالآخر اسے یاد آ گیا کہ میں نے کچھ پہنا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر امامہ کی خفگی میں کچھ اضافہ ہوا۔

”کپڑے۔“ امامہ نے جواب دیا۔

سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ ”جانتا ہوں کپڑے پہنے ہیں، اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔“

امامہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی کہ اب وہ تعریف کرے گا۔ اس نے سوچا۔ دیر سے سہمی، لیکن اسے میرے کپڑے نظر تو آئے۔ اس کی خفگی میں کچھ اور کمی ہوئی۔

”کون سا کمر ہے یہ؟“ سالار نے اپنے پیروں پر پہلی کلبھاری ماری۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ کا دل چاہا، وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کود

جائے۔ پونے چار گھنٹے میں وہ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اسے غور سے دیکھا نہیں تھا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے اسی طرح کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بے حد سرد مہری سے کہا۔

”ہاں، میں بھی اندازہ نہیں کر سکا۔ آج کل خواتین پہنتی بھی تو بڑے عجیب عجیب کلر ہیں۔“ سالار نے اس کے لہجے پر غور کیے بغیر عام سے انداز میں کہا۔

وہ زنک اور کاپر کے سب سے زیادہ ان شیڈ کو ”عجیب“ کہہ رہا تھا۔ امامہ کورنج سارنج ہوا۔ سالار شوہروں کی تاریخی غلطیاں دہرا رہا تھا۔ اس بار امامہ کا دل تک نہیں چاہا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے، وہ اس قابل نہیں تھا۔ اسے یاد آیا، اس نے کل بھی اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی تھی۔ کپڑے...؟ اس نے تو اس کی بھی تعریف نہیں کی تھی... اظہار محبت کیا تھی اس نے... لیکن تعریف... ہاں، تعریف تو نہیں کی تھی اس نے... وہ جیسے پچھلی رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی، اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اُسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ، ایک لفظ، کچھ بھی نہیں، وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت

اور ستائش کو کبھی ”ہم معنی“ نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے سالار کو اندازہ نہیں ہوا کہ گفت گو کے لیے موضوعات کی تلاش میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے اس نے کس قدر سنگین موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جیسے ایک بارودی سرنگ کے اوپر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا جو اس کے پاؤں اٹھاتے ہی پھٹ جاتی۔

سعیدہ اماں کی گلی میں گاڑی پارک کرنے کے بعد سالار نے ایک بار پھر امامہ کے موڈ میں تبدیلی محسوس کی۔ اس نے ایک بار پھر اسے اپنا وہم گردانا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سبط علی کے گھر پہ بھی غلط فہمی کا شکار رہا۔ آخر ہو کیا گیا ہے مجھے...؟ وہ بھلا کیوں صرف چوبیس گھنٹے میں مجھ سے ناراض ہوتی پھرے گی۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔

سعیدہ اماں دروازہ کھولتے ہی امامہ سے لپٹ گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ آنسو بہا رہی تھیں۔ سالار جزبز ہوا۔ آخر اتنے عرصے سے وہ اکٹھے رہ رہی تھیں۔ یقیناً دونوں ایک دوسرے کو مس کر رہی ہوں گی۔ اس نے بالآخر خود کو سمجھا۔

سعیدہ اماں نے سالار کے سلام کا جواب دیا، نہ ہی ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے امامہ کو گلے لگایا، اس سے لپٹ کر آنسو بہائے اور پھر اسے لے کر اندر چلی

گئیں۔ وہ ہکا بکا دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ انہیں کیا ہوا؟ وہ پہلی بار بری طرح کھٹکا تھا۔ اپنے احساس کو وہ سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش اس بار کامیاب نہیں ہوئی۔ کچھ غلط تھا مگر کیا...؟ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اس نے پلیٹ کر بیرونی دروازہ بند کیا اور اندر چلا آیا۔

وہ دونوں کچھ باتیں کر رہی تھیں، اسے دیکھ کر یک دم چپ ہو گئیں۔ سالار نے امامہ کو اپنے آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر ڈسٹرب ہوا۔

”میں چائے لے کر آتی ہوں... بادام اور گاجر کا حلوہ بنایا ہے آج میں نے۔“ سعیدہ اماں یہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔ سالار نے بے اختیار نہیں ٹوکا۔

”سعیدہ اماں! کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں اور چائے بھی پی لی ہے۔ صرف آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا، اسے احساس ہوا کہ وہ پیش کش سرے سے اسے کی ہی نہیں گئی تھی۔ سعیدہ اماں مکمل طور پر امامہ کی طرف متوجہ تھیں اور امامہ اسے کچھ کھانے پینے میں متامل نظر نہیں آئی۔

”میں کھاؤں گی اور میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آپ کس طرح اٹھائیں گی برتن۔“
 امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا اور پھر ان کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئی۔ سالار ہونقوں کی
 طرح وہاں بیٹھا رہ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ وہ اس صورت حال پر غور کرتا، وہیں بیٹھا کمرے کی چیزوں کو دیکھتا
 رہا۔

بالآخر پندرہ منٹ کے بعد امامہ اور سعیدہ اماں کی واپسی ہوئی۔ اسے امامہ کی آنکھیں پہلے
 سے کچھ زیادہ سرخ اور متورم لگیں، یہی حال کچھ اس کی ناک کا تھا۔ وہ یقیناً کچن میں
 روتی رہی تھی مگر کس لیے؟ وہ اب الجھ رہا تھا۔ کم از کم اب وہ آنسو سے سعیدہ اماں اور
 اس کی باہمی محبت و یگانگت کا نتیجہ نہیں لگ رہے تھے۔ سعیدہ اماں کے چہرے اور
 آنکھوں میں اسے پہلے سے بھی زیادہ سرد مہری نظر آئی۔

اسے اس وقت چائے میں دلچسپی تھی نہ کسی حلویے کی طلب... کچھ بھی کھانا اس کے
 لیے بد ہضمی کا باعث ہوتا لیکن جو ماحول یک دم وہاں بن گیا تھا، اس نے اسے ضرورت
 سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ کسی انکار کے بغیر اس نے خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑا سا حلویہ
 نکالا۔ امامہ نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرح یہاں بھی اس سے پوچھے بغیر اس کی

چائے میں دو چمچ چینی ڈال کر اسے کے سامنے رکھ دی، پھر اپنی پلیٹ میں لیا حلوہ کھانے لگی۔

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سعیدہ اماں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے تیز نظروں سے سالار کو گھورا۔

اپنی پلیٹ میں ڈالے حلوے کو چمچ سے ہلاتے سالار ٹھٹھکا۔ اس نے پہلے سعیدہ اماں کو دیکھا، پھر اماں کو... وہ بھی ٹھٹھکی تھی... اور کچھ گڑ بڑائی بھی... سالار کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی اور اس کے گلے شکوے کرنا اور بات تھی مگر اس کے سامنے بیٹھ کر وہی کچھ دہرانا، خاص طور پر جب ان الزامات کا کچھ حصہ کسی جھوٹ پر مبنی ہو۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی۔

سالار کو یہ سوال نہیں، تبصرہ لگا۔

”جی۔“ اس نے ان کی تائید کی۔

”وہ مرد دوزخ میں جاتے ہیں جو اپنی بیویوں کو تنگ کرتے ہیں۔“ سعیدہ اماں نے اگلا

جملہ بولا۔

اس بار سالار فوری طور پر تائید نہیں کر سکا۔ وہ خود مرد تھا اور شوہر بھی، لاکھ وہ امامہ پر مرتا ہو لیکن ”بیوی“ کی موجودگی میں اس تبصرہ کی تائید اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق تھا۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن اتنی فرماں برداری نہیں دکھا سکتا تھا جس پر وہ بعد میں ساری عمر پچھتا تا۔

اس بار کچھ کہنے کے بجائے اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی خاموشی نے سعیدہ اماں کو کچھ اور پتا دیا۔

”دوسروں کے دل دکھانے والے کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔“ سالار نے حلوہ کھاتے کھاتے اس جملے پر غور کیا، پھر تائید میں سر ہلا دیا۔

”جی بالکل۔“ سعیدہ اماں کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔

”شریف گھرانے کے مردوں کا وتیرہ نہیں ہے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو پہلے بیاہ کر لے جائیں اور پھر انہیں پہلی بیویوں کے قصے سنانے بیٹھ جائیں۔“

امامہ کی جیسے جان پر بن گئی۔ یہ کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔

”آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اماں!“ اس نے صورتِ حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

سالار نے باری باری ان دونوں کو دیکھا، اسے اس جملے کا سر پیر سمجھ میں نہیں آیا تھا اور پہلے جملوں سے ان کا کیا تعلق تھا، وہ بھی سمجھ نہیں پایا لیکن تائید کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی کیوں کہ بات مناسب تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ“ اس نے بالآخر کہا۔

اس کی سعادت مندی نے سعیدہ اماں کو مزید پتا دیا۔ شکل سے کیسا شریف لگ رہا ہے۔ اسی لیے تو سب بھائی بھی دھوکا کھا گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر سبط علی کو غلطی کرنے پر چھوٹ دی۔

”آمنہ کے لیے بہت رشتے تھے۔“ سعیدہ اماں نے سلسلہ کلام جوڑا۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک غلط آدمی کو امامہ کی قدر و قیمت کے بارے میں غلط لیکچر دے رہی تھیں۔ حلوے کی پلیٹ ہاتھ میں لیے سالار نے ایک نظر امامہ کو دیکھا پھر سعیدہ اماں کو، جو بے حد جوش و خروش سے کہہ رہی تھیں۔

”یہ سامنے والے ظہور صاحب کے بڑے بیٹے نے آمنہ کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ ماں باپ کو صاف صاف کہہ دیا اس نے کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے۔ خالہ کی بیٹی کے ساتھ بچپن کی منگنی بھی توڑ دی۔“

اس بار سالار نے حلوے کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ کم از کم امامہ کے کسی ایسے رشتے کی تفصیلات مزے سے حلوہ کھاتے ہوئے نہیں سن سکتا تھا۔ امامہ نے اس بار سعیدہ اماں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بڑی ہی عامیانہ بات تھی لیکن وہ بھی جیسے چاہتی تھی کہ کوئی سالار کو بتائے کہ وہ ”قابل قدر“ ہے، وہ اسے صرف ”بیوی“ سمجھ کر برتاؤ نہیں کر سکتا۔

”جو تے گھس گئے لڑکے کی ماں کے یہاں کے چکر لگا لگا کر، محلے کے ہر معزز آدمی سے کہلوایا اس نے، میرے بیٹے تک کو انگریڈ فون کرایا اس رشتے کے لیے۔“ سعیدہ اماں بول رہی تھیں۔

سالار اب بے حد سنجیدہ تھا اور امامہ قدرے لا تعلقی کے انداز میں سر جھکائے حلوے کی پلیٹ میں چیچ بلا رہی تھی۔

”اس کے ماں باپ نے کہا کہ جو چاہیں حق مہر میں لکھو لیں، بس اپنی بچی کو ہماری بیٹی بنا

”دیں۔“

سالار نے بے حد جتانے والے انداز میں اپنی رسٹ واپس لے لی جیسے اسے دیر ہو رہی تھی۔ سعیدہ اماں کو اس کی اس حرکت پر بری طرح تاؤ آیا۔ اس گفت گو کے جواب میں کم از کم وہ اس سے اس بے نیازی کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔

”ابھی آج بھی اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ بہت افسوس سے کہہ رہی تھی کہ بڑی زیادتی کی ان کے بیٹے کے ساتھ میں نے... ایک بار نہیں، دو بار... کہہ رہی تھی کہ ہمیں چھوڑ کر کسی ایرے غیرے کے ساتھ پکڑ کر بیاہ دیا۔ میرا بیٹا کیوں نظر نہیں آیا آپ کو... رانیوں کی طرح رکھتا آمنہ کو... دیکھ دیکھ کر جیتا اسے۔“

سعیدہ اماں اب مبالغہ آمیزی کی آخری حدود کو چھونے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر اب بھی مرعوبیت نام کی کوئی چیز نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ انہیں یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ سعیدہ اماں کو لگا، انہوں نے اس کے ساتھ شادی کر کے واقعی آمنہ کی قسمت پھوڑی تھی۔

بے حد خفگی کے عالم میں انہوں نے سردی کے موسم میں بھی پانی کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ میں پیاتھا۔ اس کی یہ خاموشی امامہ کو بھی بری طرح چبھی تھی۔ وہ رات کو اس

سے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور اب یہاں سعیدہ اماں کو بتانے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے اہم ہے... یا وہ اُس کا خیال رکھے گا... یا کوئی اور وعدہ... کوئی اور تسلی... کوئی اور بات... کچھ تو کہنا چاہیے تھا اسے سعیدہ اماں کے سامنے... اسے عجیب بے قدری اور بے وقعتی کا احساس ہوا تھا... رنج کچھ اور سوا ہو... فاصلہ کچھ اور بڑھا تھا... اس نے کسی دوسرے کے سامنے بھی اسے تعریف کے دو لفظوں کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ اکیلے میں تعریف نہ کرے لیکن یہاں بھی کچھ کہہ دیتا... کچھ تو... اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ سالار اس سے روایتی شوہروں والا رویہ رکھے لیکن خود وہ اس سے روایتی بیوی والی ساری توقعات لیے بیٹھی تھی۔

”بہت دیر ہو گئی، میرا خیال ہے، ہمیں اب چلنا چاہیے۔ مجھے صبح آفس جانا ہے، آج کل کام کچھ زیادہ ہے۔“ سالار کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔

اس نے بڑے تحمل کے ساتھ سعیدہ اماں سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب امامہ کے کھڑے ہونے کا منتظر تھا لیکن امامہ نے ٹیبل پر رکھے برتن اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بڑی سرد مہری کے ساتھ کہا۔ ”میں آج یہیں رہوں گی سعیدہ اماں کے پاس“

سالار چند لمحوں کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے پاس رات گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اب یک دم بیٹھے بیٹھائے یہ فیصلہ...

”ہاں، بالکل یہیں چھوڑ جاؤ اسے۔“ سعیدہ اماں نے فوری تائید کی۔ امامہ اس کے انکار کی منتظر تھی۔

”ٹھیک ہے، یہ رہنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ سالار نے بڑی سہولت سے

کہا۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 برتن سمیٹتی امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس نے ایک منٹ کے لیے بھی اسے

ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا، وہ اتنا تنگ آیا ہوا تھا اس سے...

اس سے پہلے کہ سالار کچھ اور کہتا، دو ایک جھپا کے کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

سعیدہ اماں نے بے حد قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا، سالار نے جیسے امامہ کے ہر الزام

کی تصدیق کر دی تھی۔ سالار کو امامہ کے یوں جانے کی وجہ سمجھ میں آئی، نہ سعیدہ اماں

کی ان ملامتی نظروں کا مفہوم سمجھ سکا وہ۔ وہ گفت گو جتنی اپ سیٹ کرنے والی تھی اتنا

ہی امامہ کا یک دم کیا جانے والا یہ اعلان تھا کہ وہ آج وہیں رہے گی۔ اسے برا لگا تھا لیکن

اتنا برا نہیں لگا تھا کہ وہ اس پر اعتراض یا خفگی کا اظہار کرتا اور وہ بھی سعیدہ اماں کے سامنے۔

”او کے... میں چلتا ہوں پھر۔“ وہ سعیدہ اماں کے ساتھ باہر صحن میں نکل آیا۔

اس کا خیال تھا، امامہ کچن میں برتن رکھ کر اسے خدا حافظ کہنے تو ضرور جائے گی لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سعیدہ اماں سے بے مقصد باتیں کرتا صحن میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ سعیدہ اماں کے لہجے میں اتنی سرد مہری نہ ہوتی تو ان سے امامہ کو بلوانے کا کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس نہ ہوتی۔

سعیدہ اماں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے پہلی بار اس محلے اس کے سامنے والے گھر کو سراٹھا کر دیکھا تھا۔ وہاں سے اکیلے واپس آنا سے کھل رہا تھا۔ وہ اتنے سال اس کے بغیر ہی رہا تھا۔ اسے کبھی تنہائی نہیں چھبی تھی۔ اس نے ایک رات اس کے ساتھ گزار دی تھی اور تنہائی کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کی ڈرائیو کی زندگی کی سب سے طویل ڈرائیو تھی۔

☆☆☆☆

”کل بھائی صاحب کے ہاں چلیں گے۔ انہیں بتائیں گے یہ سب کچھ... وہی بات کریں گے سالار سے۔“ سعیدہ اماں اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھیں۔

امامہ نے ان کی بات کی تائید کی نہ تردید۔ اب اس کا دل کچھ بھی کہنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس اپنے بیڈ پر کنبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھی سعیدہ اماں کی باتیں سنتی رہی۔

”اچھا، چلو اب سو جاؤ بیٹا! صبح سحری کے لیے بھی اٹھنا ہوگا۔“

سعیدہ اماں کو اچانک خیال آیا۔ بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”لائٹ آف کر دوں؟“

پچھلی رات ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آئی تھی۔

”نہیں... رہنے دیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے لیٹ گئی۔

سعیدہ اماں دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔ کمرے کی خاموشی نے اسے سالار کے بیڈ روم کی یاد دلائی۔

”ہاں، اچھا ہے نا... میں نہیں ہوں، آرام سے لائٹ آن کر کے سو تو سکتا ہے۔ یہی تو

چاہتا تھا وہ... ”وہ پھر سے رنجیدہ ہونے لگی اور تب ہی اس کا سیل فون بجنے لگا۔ امامہ کے خون کی گردش پل بھر کے لیے تیز ہوئی، وہ اسے بالآخر کال کر رہا تھا۔ اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پھینک دیا۔

وہ اسے ساتھ لے کر نہیں گیا اور اب اسے اس کی یاد آرہی تھی۔ اس کی رنجیدگی، غصے میں بدل رہی تھی۔ وہ اس طرح کیوں کر رہی تھی کہ رائی کا پہاڑ بنا رہی تھی۔

اس نے جیسے اپنا تجزیہ کیا اور اس تجزیے نے بھی اسے اذیت دی۔ میں زودرنج ہو گئی ہوں یا وہ مجھے جان بوجھ کر بری طرح اگنور کر رہا ہے۔ یہ جتنا چہاتا ہے کہ میں اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے دوست، اس کا آفس، اس کی فیملی... بس یہ اہم ہیں اس کے لیے... دوبارہ کال نہیں آئی، چند سیکنڈ کے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یقیناً اس سے کہے گا وہ اسے مس کر رہا تھا۔

ٹیکسٹ میسج میں اس کے لیے ایک ری لوڈ کارڈ کا نمبر تھا اور اس کے نیچے دو لفظ... ”گڈ نائٹ سوئیٹ ہارٹ“!

پہلے اسے شدید غصہ آیا پھر بری طرح رونا۔ اسے پہلے بھی زندگی میں سالار سکندر سے برا کوئی نہیں لگا تھا اور آج بھی اس سے برا کوئی نہیں لگ رہا تھا۔



”آمنہ سے بات کروادو... میں اور طیبہ بھی اس سے بات کر لیں... شادی کر لی... اسے گھر بھی لے آؤ... اب کسی کام میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں۔“ سکندر نے ابتدائی سلام و دعا کے ساتھ چھوٹے ہی اس سے کہا۔

”وہ آج اپنے میکے میں ہے۔“ سالار نے کچھ سوچ کر کہا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سعیدہ اماں کے گھر سے واپس آیا تھا۔

”تو بر خوردار! تم بھی اپنے سسرال میں ہی ٹھہرتے، تم منہ اٹھا کر اپنے اپارٹمنٹ کیوں آگئے؟“ سکندر نے اسے ڈانٹا، وہ جواباً ہنسا۔

”مہی پاس ہی ہیں؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”ہاں... کیوں، بات کرنی ہے؟“

”نہیں، فی الحال تو آپ ہی سے بات کرنی ہے... بلکہ کچھ زیادہ سیریس بات کرنی ہے۔“

سکندر یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ”یہ سالار سکندر“ تھا، وہ اگر سیریس کہہ رہا تھا تو

بات یقیناً ”بہت سیریس تھی۔“

”کیا بات ہے؟“

”مجھے... اصل میں آمنہ کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا ہے۔“

سکندر الجھ گئے۔ وہ آمنہ کے بارے میں انہیں نکاح کے بعد بتا ہی چکا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی جس کے ساتھ اس نے اپنی کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر ایمر جنسی میں نکاح کیا تھا... سکندر عثمان، ڈاکٹر سبط علی کو جانتے تھے اور سالار کے توسط سے دو تین بار ان سے مل بھی چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی کے بجائے کسی بھی لڑکی سے اس طرح اچانک ان لوگوں کو مطلع کیے بغیر نکاح کرتا، تب بھی انہیں اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اور ان کی فیملی کچھ اتنی ہی لبرل تھی اور سالار تو بہر حال ”اسپیشل کیس“ تھا... یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شادی ”انسانوں“ کی طرح کرتا۔ یہ تبصرہ طیبہ کا تھا جو انہوں نے اس کے نکاح کی خبر ملنے پر قدرے خفگی لیکن اطمینان کے ساتھ کیا تھا اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ اسے آمنہ کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔

”کیا بتانا ہے آمنہ کے بارے میں؟“

سالار نے گلا صاف کیا۔ بات کیسے شروع کرے، سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

”آمنہ اصل میں امامہ ہے۔“ تمہید اس نے زندگی کبھی نہیں باندھی تھی، پھر اب کیسے باندھتا۔ دوسری طرف ایک دم خاموسی چھا گئی۔ سکندر کو لگا، انہیں سننے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

”کیا... کیا مطلب؟“ انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔

”امامہ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ وہ اتنے سالوں ان ہی کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کا نام چینیج کر دیا تھا اس کے تحفظ کے لیے۔ مجھے نکاح کے وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ امامہ ہے، لیکن وہ امامہ ہی ہے۔“

آخری جملے کے علاوہ اسے باقی تفصیل احمقانہ نہیں لگی۔

سکندر عثمان نے رکتی ہوئی سانس کے ساتھ برابر کے بیڈ پر بیٹھی بیوی کو دیکھا جو اسٹار پلس پر کوئی ٹاک شور دیکھنے میں مصروف تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔

وہ اسی طرح رکتی ہوئی سانس کے ساتھ، ننگے پاؤں اپنے بستر سے اتر کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر، بے حد عجلت کے عالم میں باہر نکل گئے۔ طیبہ نے کچھ حیرت سے

انہیں اس طرح اچانک جاتے دیکھا۔

”ایک تو ان باپ بیٹے کا رومانس ہی ختم نہیں ہوتا، اب دو گھنٹے لگا کر آئیں گے۔“ طیبہ نے قدرے خفگی سے سوچا اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

باہر لاؤنج میں سکندر عثمان کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ وہ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی طیبہ کے ساتھ اپنے آخری اولاد کے ”سیٹل“ ہو جانے پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ولیمہ پلان کر رہے تھے اور انہیں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ وہ آخری اولاد ”سالار سکندر“ تھا۔

دو گھنٹے تک لاؤنج میں اس کے ساتھ طویل گفت و شنید کے بعد وہ جب بالآخر واپس بیڈ روم میں آئے تو طیبہ سوچکی تھی لیکن سکندر عثمان کی نیند اور اطمینان دونوں رخصت ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆

سکندر عثمان اس سے ناراض نہیں ہوئے تھے لیکن وہ ان تمام خدشات کو سمجھ سکتا تھا جو یک دم ان کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے۔ اتنے سال سے ہاشم مبین کی فیملی کے

ساتھ ان کے تمام تعلقات مکمل طور پر منقطع تھے لیکن اس کے باوجود سب کچھ پر سکون تھا۔ امامہ کی اس فوری گمشدگی کے بعد شروع کے چند مہینے وہ انہیں تنگ کرتے رہے تھے لیکن جوں جوں انہیں یقین ہوتا گیا کہ سکندر عثمان اور سالار کا واقعی امامہ کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے تو ساری گرد جیسے آہستہ آہستہ بیٹھتی گئی۔ اس کے باوجود ہاشم مبین کو اب بھی یقین تھا کہ رابطہ نہ ہونے کے باوجود امامہ کو بھاگنے میں سالار کا کسی نہ کسی طرح ہاتھ ضرور تھا، مگر یہ بات ثابت کرنا مشکل تھا اور اب نو سال بعد یک دم جیسے ”ثبوت“ سامنے آ گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہاشم مبین اور اس کی فیملی کیا طوفان اٹھاتی، اس کے بارے میں سکندر کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ اگر پریشان تھے تو سالاران کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔

ان سے بات کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا اور اس وقت اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس خالی بستر اور تکیے کو دیکھا۔ اسے پچھلی رات اس تکیے پر بکھری زلفیں یاد آئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ وہیں تھی۔ اس تکیے سے اس کے کندھے اور اس کے کندھے سے اس کے سینے تک آتی ہوئی وہ سیاہ ریشمی زلفیں ایک بار پھر اس سے لپٹنے لگی تھیں۔

اس نے لائٹ آف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پچھلی رات نہیں تھی کہ اسے تاریکی میں بھی نیند آجاتی۔

☆☆☆☆

وہ ساری رات نہیں سوئی۔ غصہ، رنج، افسوس اور آنسو... وہ ایک کیفیت سے نکلتی، دوسری میں داخل ہوتی رہی۔

سحری کے وقت بھی اس کا دل بستر سے نکل کر سعیدہ اماں کا سامنا کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی اتری ہوئی شکل دکھانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سعیدہ اماں اسے مجبور نہ کرتیں تو وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھتی۔ واپس کمرے میں آنے پر اس نے ایک بار پھر اپنے سیل پر سالار کی مسڈ کال دیکھی۔ اس نے سیل آف کیا اور کمبل لپیٹ کر سو گئی۔

سالار نے دس بجے کے قریب آفس سے اسے کال کی، سیل آف تھا۔ گیارہ بجے کال کرنے پر ایک بار پھر سیل آف ملا۔ اس بار اس نے سعیدہ اماں کی لینڈ لائن پر کال کی۔ ”امامہ سو رہی ہے۔“ انہوں نے چھوٹے ہی سرد مہری سے اسے اطلاع دی۔

”اچھا، جب وہ اٹھے تو آپ اس سے کہیں کہ مجھے کال کر لے۔“ اس نے پیغام دیا۔

”دیکھوں گی، اگر اس کے پاس فرصت ہوئی تو کر لے گی۔“ سعیدہ اماں نے یہ کہہ کر

کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ وہ سیل ہاتھ میں پکڑے رہ گیا۔ اگلے پانچ منٹ وہ اسی

پوزیشن میں بیٹھا سعیدہ اماں کے جواب پر غور کرتا رہا۔

امامہ کو اس کا پیغام مل گیا تھا اور سعیدہ اماں نے سالار کو دیا جانے والا جواب اسے سنا دیا۔

وہ خاموش رہی۔

”آج بھائی صاحب کی طرف چلیں گے۔“ سعیدہ اماں نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔

”آج رہنے دیں، سالار کے گھر والے آرہے ہیں، بعد میں بات کر لیں گے۔“ امامہ

نے سعیدہ اماں سے کہا۔ سالار نے ڈیڑھ بجے کے قریب فون کیا اور اس کی آواز سنتے

ہی کہا۔

”تھینگ گاڈ! تمہاری آواز تو سننا نصیب ہوا مجھے...“ وہ جواباً خاموش رہی۔

”ڈاکٹر صاحب کا ڈرائیور پہنچنے ہی والا ہوگا، تم تیار ہو جاؤ۔“ سالار نے اس کی خاموشی

نوٹس کیے بغیر اسے اطلاع دی۔

”ڈنر کے لیے کیا بنانا ہے؟“ امامہ نے جواباً کہا۔

”کون سا ڈنر؟“

”تمہارے پیرنٹس کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟“

”نہیں، ڈنر فرقان کے گھر پر ہے۔“

”میں ڈنر خود تیار کر لوں گی۔“ اس نے اس اطلاع پر دو ٹوک انداز میں کہا۔

”یہ ڈنر وہ ہم دونوں کے لیے نہیں بلکہ مہی، ماما اور انیتا کے لیے کر رہا ہے۔“ وہ کچھ

خفیف سی ہو گئی۔

”لیکن سحری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔“

”میری فیملی میں روزے وغیرہ کوئی نہیں رکھتا، لیکن پوچھ لوں گا اور کر لیں گے کچھ نہ

کچھ... فریج میں بہت کچھ ہے۔ تم اس جھنجھٹ میں نہ پڑو۔“

”ہیلو!“ سالار نے جیسے لائن پر اس کی موجودگی کو چیک کیا۔

”میں سن رہی ہوں۔“ اس نے جواباً کہا۔

”امامہ! تم اور سعیدہ اماں کل رات کورویوں رہی تھیں...؟“

سالار نے بالآخر وہ سوال کیا جو پچھلی رات سے اسے تنگ کر رہا تھا۔

”ایسے ہی۔“ وہ کچھ دیر کے لیے جواب نہ دے سکی۔

”اور سعیدہ اماں کا موڈ بھی کچھ آف تھا؟“

”پتا نہیں... تم پوچھ لیتے۔“ اس نے اب بھی اسی انداز سے کہا۔

”چلو تم اب تیار ہو جاؤ، گھر پہنچ جاؤ تو مجھے ٹیکسٹ میسج کرنا۔ اگر میں فری ہوا تو تمہیں

کال کر لوں گا۔“ امامہ نے جو ابّا خداحافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کا دل چاہا تھا، اس

سے کہے۔ ”ضرورت نہیں۔“

☆☆☆☆

وہ تقریباً اڑھائی بجے ڈاکٹر صاحب کے ڈرائیور کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تھی

اور اس نے آتے ہی سب سے پہلے دونوں بیڈرومز چیک کیے تھے۔ بیڈرومز یا باتھ

رومز میں کچھ رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سالار آفس جانے سے پہلے یقیناً ہر کام خود ہی کر کے گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے

وجود کو ”بے مصرف“ محسوس کیا۔

ایک بیڈ روم شاید پہلے ہی گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، جب کہ دوسرا بیڈ روم وہ اسٹڈی کے طور پر بھی استعمال کر رہا تھا۔ وہاں ایک ریک پر کتابوں کے ڈھیر کے علاوہ اسی طرح کے ریکس پر سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کے انبار بھی نظر آئے سٹنگ روم میں موجود جریکس پر بھی ڈی وی ڈیز اور سی ڈیز تھیں لیکن ان کی تعداد اس کمرے کی نسبت بہت کم تھی۔ کمرے میں کچھ musical instruments بھی پڑے ہوئے تھے اور ایک اسٹڈی ٹیبل پر جس ایک ڈیسک ٹاپ تھا۔ وہ اسٹڈی ٹیبل اس کمرے کی وہ واحد چیز تھی جس پر پڑے کاغذ، فائلز اور desk organiser اسے بے ترتیب نظر آئے۔ وہ اٹھنے سے پہلے اسے ٹھیک کرنا بھول گیا تھا شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ ان پیپرز کو ٹھیک کر دے، اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے خدشہ تھا وہ یہ کام سالار جیسی پرفیکشن جکے ساتھ نہیں کر سکتی تھی اور اگر کوئی پیپر ادھر ادھر ہو گیا تو...؟

وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ فریج اور فریزر میں واقعی جکھانے کا بہت سا سامان تھا

اور اس کو یقین تھا کہ ان میں سے نوے پر سنٹ اشیاء فرقان ورنو شین کی مرہون منت تھی۔ جو چیزیں سالار کی اپنی خریداری کا نتیجہ تھیں ان میں پھلوں کے علاوہ ڈرنکس اور ٹن بیکڈ فوڈ آئٹمز کی ایک محدود تعداد تھی۔ اس نے چند ٹن نکال کر دیکھے، وہ تقریباً سب کے سب سی فوڈ تھے۔

امامہ کو کھانے میں صرف ایک چیز ناپسند تھی۔ سی فوڈ... روزے کی وجہ سے اس کا معدہ خالی نہ ہوتا تو وہ ان ڈبوں پر بنے ہوئے کریبز اور پرائز دیکھ کر اسے ووٹنگ شروع ہو جاتی۔ اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں ان ٹنز کو واپس فریج میں رکھ دیا۔ یقیناً وہ ڈیکوریٹن کے مقصد سے خرید کر نہیں رکھے گئے تھے۔ وہ خرید کر لاتا تھا تو یقیناً کھاتا بھی ہوگا۔ اس کا خراب موڈ کچھ اور برتر ہوا۔ ابھی اور کیا کیا پتا چلنا تھا اس کے بارے میں...

اس نے کچن کے کیبنٹس کھول کر دیکھے اور بند کر دیے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کچن میں فریج کے علاوہ صرف کافی کیبنٹس اور برتنوں کے ریکس کے علاوہ کہیں کچھ نہیں۔ وہ کچن صرف ناشتے اور سینڈویچ والے میلز کے علاوہ صرف چائے یا کافی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہاں اسے چند فرائنگ پیسز کے علاوہ کسی قسم کے پکانے کے برتن

نظر نہیں آئے۔ کچن میں موجود کراکری بھی، ایک ڈنر سیٹ اور چند واٹر اور ٹی سیٹس پر مشتمل تھی یا اس کے علاوہ کچھ مگز جتھے یا پھر بریک فاسٹ سیٹ۔ یقیناً اس کے گھر آنے والے افراد کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ کچن سے نکل آئی۔

اپارٹمنٹ کا واحد غیر دریافت شدہ حصہ بالکونی تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور وہ پہلی جگہ تھی جہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوا تھا۔ چھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ لمبی وہ ٹیرس نما بالکونی کو ٹیرس گارڈن کہنا زیادہ مناسب تھا۔ مختلف شکلوں اور سائزز کے گملوں میں مختلف قسم کے پودے اور بیلین لگی ہوئی تھیں اور شدید سرد موسم میں بھی ان کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر خاصی محنت اور وقت لگایا گیا تھا۔ وہاں آس پاس کی بالکونیوں سے بھی اسے سبز رنگ کے پودے اور بیلین جھانکتی نظر آرہی تھیں لیکن یقیناً سالار کی بالکونی کی حالت سب سے بہتر تھی۔

لاؤنج کی قد آدم کھڑکیاں بھی اسی بالکونی میں تھیں اور بالکونی میں ان کھڑکیوں کے پاس دیوار کے ساتھ زمین پر ایک میٹ موجود تھا۔ وہ شاید یہاں آکر بیٹھتا ہو گا یا دھوپ میں لیٹتا ہو گا۔ شاید ویک اینڈ پر... ورنہ سردی کے موسم میں اس میٹ کی وہاں موجودگی کا مقصد اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ بالکونی کی منڈیر کے قریب ایک اسٹول پڑا

ہوا تھا۔ وہ یقیناً وہاں آکر بیٹھتا تھا۔ نیچے دیکھنے کے لیے... منڈیر پر مگ کے چند نشان تھے۔ چائے یا کافی پیتا ہے یہاں بیٹھ کر... مگر کس وقت... یقیناً رات جکو... اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ وہ تیسری منزل تھی اور نیچے بلڈنگ کالان اور پارکنگ تھے۔ کچھ فاصلے پر کمپاؤنڈ سے باہر سڑک بھی نظر آرہی تھی۔ وہ ایک پورش ایریا تھا اور سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ وہ واپس اندر آگئی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے ابھی اپنے بال بنا رہی تھی کہ جب اسے ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر اسے نو شین ہی کا خیال آیا تھا۔

لیکن دروازے پر ایک ریسٹورنٹ کا ڈیلیوری بوائے چند پیکٹس لیے کھڑا تھا۔

”میں نے آرڈر نہیں کیا۔“ اسے لگا شاید وہ کسی غلط اپارٹمنٹ میں آ گیا ہے۔

اس نے جو اباً سالار سکندر کا نام ایڈریس کے ساتھ دہرایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ چپ سی ہو گئی۔ وہ کم از کم اتنا لا پرواہ نہیں تھا اس کے بارے میں کہ اس کے افطار کے لیے کچھ انتظام کرنا بھول جاتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے پیرنٹس کو لینے کے لیے آفس سے نکل چکا ہو گا اور ایریپورٹ پہنچنے کی بھاگ دوڑ میں اسے شاید وہ یاد بھی نہیں ہو گی۔

کچن میں ان پیکیٹس کو رکھتے ہوئے اس کا غصہ اور رنجیدگی کچھ کم ہوئی اور یہ شاید اس کا ہی اثر تھا کہ اس نے کال کر کے سالار کو مطلع کرنا اور اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ وہ اس وقت ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

اما نے اسے کھانے کے بارے میں بتایا۔

”میں رات کا کھانا کتر اس ریستورنٹ سے منگواتا ہوں۔ کھانا اچھا ہوتا ہے ان کا...“

اس نے جواباً بڑے معمول کے انداز میں کہا۔ میں نے سوچا ”میں جب تک ان لوگوں کو لے کر گھر آؤں گاتب تک بھوکی بیٹھی رہو گی۔“

وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر یک دم اسے احساس ہوا کہ یہ بہت مشکل کام ہے سالار سے یہ دو لفظ کہنا، ایک عجیب سی جھجک جو اسے محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆☆

وہ تقریباً سو انویسٹمنٹ کے قریب آیا اور ڈور بیل کی آواز پر وہ بے اختیار نروس ہو گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سالار کی فیملی کے رد عمل سے خائف تھی۔ ایک ہمسائے کے طور پر بھی دونوں فیملیز کے درمیان بے حد رسمی تعلقات تھے اور بعد میں ہونے

والے واقعات نے تو یہ فارمیسی بھی ختم کر دی تھی۔ اسے کئی سال پہلے سکندر عثمان سے فون پر ہونے والی گفت گو یاد تھی اور شاید اس کے خدشات کی وجہ سے بھی وہی کال تھی۔

بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ سکندر عثمان سمیت تینوں افراد اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے تھے۔ وہ ان کے رویوں میں جس روکھے پن اور خفگی کو ڈھونڈ رہی تھی، وہ فوری طور پر اسے نظر نہیں آئی۔ امامہ کی نروس نیس میں کچھ کمی آئی۔

فرقان کے گھر ڈنر کے دوران اس کی یہ نروس نیس اور بھی کم ہوئی۔

انیتا اور طیبہ دونوں بڑے دوستانہ انداز میں نوشین اور اس سے باتیں کرتی رہیں۔ نوشین اور فرقان سالار کے والدین سے پہلے بھی مل چکے تھے لیکن نوشین، انیتا سے پہلی بار مل رہی تھی اور دونوں کا موضوع گفت گو ان کے بچے تھے۔ وہ بے حد پرسکون انداز میں ایک خاموش سامع کی طرح ان لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فرقان کے گھر میں اس کی شادی یا اس کی ذات موضوع گفتگو بنے۔

اپنے اپارٹمنٹ میں واپسی کے بعد پہلی بار سکندر اور طیبہ نے سٹنگ روم میں بیٹھے، اس سے بات کی اور تب امامہ نے ان کے لہجے میں چھپی اس تشویش کو محسوس کیا جو امامہ کی فیملی کے متوقع جرد عمل سے انہیں تھی۔ اس کا اعتماد ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے کھلے عام امامہ کے سامنے ہاشم مبین یا ان کے خاندان کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی لیکن وہ لوگ اب ولیمہ کا فنکشن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں منعقد کرنا چاہتے تھے۔ وہ سالار کی رائے سننا چاہتی تھی لیکن وہ گفت گو کے دوران خاموش رہا۔ جب گفت گو کے دوران خاموشی کے وقفوں کی تعداد بڑھنے لگی تو یک دم امامہ کو احساس ہوا کہ گفت گو جمیں آنے والی اس بے ربطی کی وجہ وہ تھی۔ وہ چاروں اس کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر پارہے تھے۔

”بالکل، بیٹا! تم سو جاؤ تمہیں سحری کے لیے اٹھنا ہوگا۔ ہم لوگ تو ابھی کچھ دیر بیٹھیں گے۔“

اس کے نیند آنے کے بہانے پر سکندر عثمان نے فوراً کہا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ نیند آنا بہت مشکل تھی۔ دو دن پہلے جن خدشات کے

بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا، اب وہ ان کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ سکندر عثمان ان دونوں کی شادی کو خفیہ ہی رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی فیملی کو اس کے بارے میں پتہ نہ چلے۔

وہ بہت دیر تک اپنے بیڈ پر بیٹھے ان خدشات اور خطرات کے بارے میں سوچتی رہی جو انہیں محسوس ہو رہے تھے۔ اس وقت وہاں اکیلے بیٹھی پہلی بار اس نے سوچا کہ اس سے شادی کر کے سالار نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ جو بھی اس سے شادید کرتا، وہ کسی نہ کسی حد تک خود کو غیر محفوظ ضرور کر لیتا لیکن سالار سکندر کی صورت میں صورت حال اس لیے زیادہ خراب ہوتی کیوں کہ اس کے ساتھ اس کے اس رشتے کا انکشاف ہونے کے چانسز زیادہ تھے۔

وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے تھے... اس نے سوچا... مجھے یا سالار کو جان سے تو کبھی نہیں ماریں گے... اسے اب بھی اندھا اعتماد تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی فیملی اتنا لحاظ ضرور کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے اور پھر سالار سے طلاق دلو کر کہیں اور شادی کرنا چاہیں گے۔

اس اضطراب میں یک دم مزید اضافہ ہوا۔ سب کچھ شاید اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی یا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنے کا مسئلہ

نہیں تھا، یہ مذہب میں تبدیلی کا معاملہ تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں، وہ واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت پہلی بار سالار سے شادی کرنا سے ایک غلطی لگی۔ وہ ایک بار پھر اسی کھائی کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئی تھی جس سے وہ اتنے سالوں سے بچتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆☆

”اب کیا ہوگا؟“ طیبہ نے بستر پر لیٹے ہوئے کہا۔

”اب ہونے کو رہ کیا گیا ہے؟“ سکندر عثمان نے جواباً کہا۔ وہ جانتے تھے، طیبہ کا اشارہ کس طرف تھا۔

”ہاشم مبین کو پتا چل گیا تو...؟“

اسی لیے تو اس سے کہا ہے کہ امامہ کو وہیں رکھے لاہور میں۔ اسلام آباد نہیں لائے۔

ویسے بھی پی ایچ ڈی کے لیے تو اسے اگلے سال چلے ہی جانا ہے۔ تب تک تو

cover ہو سکتا ہے یہ سب کچھ...“ سکندر عثمان نے اپنے گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔

وہ بھی سونے کے لیے لیٹنے والے تھے۔

طیبہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا ”مجھے تو بڑی عام سی لگی ہے امامہ۔“
 ”تمہارے بیٹے سے بہتر ہے۔“ سکندر عثمان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ طیبہ کچھ ناراض
 ہوئیں۔

”کیوں... سالار سے کس طرح بہتر ہے، وہ اس کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ آپ خود
 ایمان داری سے بتائیں، ایسی کوئی بات ہے اس میں کہ نو سال بیٹھا رہا وہ اس کے
 لیے۔“

سکندر ہنس پڑے۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 ”اتنی ہنسی کس بات پر آرہی ہے آپ کو؟“ وہ چڑیں۔

سکندر واقعی بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔

”میں واقعی بہت خوش ہوں کیوں کہ میرا بیٹا بڑا خوش ہے۔ اتنے سالوں بعد اس طرح
 باتیں کرتے دیکھا ہے اسے۔ میں نے زندگی میں کبھی اس کے چہرے پر ایسی رونق
 نہیں دیکھی۔ امامہ کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی ہے، میرے نو کندھوں سے بوجھ اتر
 گیا ہے۔ اس کے سامنے کتنا شرمندہ رہتا تھا میں، تمہیں اندازہ بھی ہے۔“

طدیے۔

خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔

☆☆☆☆

نیند میں وہ اس کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر اسے کھینچ رہے تھے۔ رسیاں اتنی سختی سے باندھی ہوئی تھیں کہ اس کی کلائیوں سے خون رسنے لگا تھا اور اس کے ہر جھٹکے کے ساتھ وہ درد کی شدت سے بے اختیار چلاتی۔ وہ کسی بازار میں لوگوں کی بھینٹ کے درمیان کسی قیدی کی طرح لے جانی جا رہی تھی۔ دونوں اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ بلند آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے اس پر آوازے کس رہے تھے۔ پھر ان لوگوں میں سے ایک مرد نے جو اس کی کلائیوں میں بندھی رسیوں کو کھینچ رہا تھا... پوری قوت سے رسی کو جھٹکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پتھر یلے راستے پر گری۔

”امامہ... امامہ... Its me... اٹھ جاؤ... سحری ختم ہونے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔“

وہ ہڑ بڑا کراٹھی، بیڈ سائڈ ٹیبل لیپ آن کیا۔ سالار اس کے پاس کھڑا نرمی سے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے جگا رہا تھا۔

”سوری... میں نے شاید تمہیں ڈرا دیا۔“ سالار نے معذرت کی۔

وہ کچھ دیر تک خالی ذہن کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ گزرے ہوئے سالوں میں ایسے خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی اور خوابوں کا یہ سلسلہ اب بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

”کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟“

سالار نے جھک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اسے یوں لگا تھا، وہ ابھی بھی نیند میں تھی۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔ وہ اب نیند میں نہیں تھی۔

”تم کبیل لیے بغیر سو گئیں؟“ سالار نے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔ امامہ نے چونک کر بیڈ پر پڑے کبیل کو دیکھا۔ وہ واقعی اسی طرح پڑا تھا۔ یقیناً وہ بھی رات کو کمرے میں سونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کمرے کا ہیٹر آن رہا تھا، ورنہ وہ سردی لگنے کی وجہ سے ضرور اٹھ جاتی۔

”جلدی آ جاؤ، بس دس منٹ رہ گئے ہیں۔“

وہ اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب وہ سٹنگ ایریا میں آئی تو وہ سحری کرچکا تھا اور چائے بنانے میں مصروف تھا۔ لاؤنج یا کچن میں اور کوئی نہیں تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کے لیے پہلے ہی سے برتن لگے ہوئے تھے۔

”میں چائے بناتی ہوں۔“ وہ سحری کرنے کے بجائے مگ نکالنے لگی۔

”تم آرام سے سحری کرو، ابھی اذان ہو جائے گی۔ میں اپنے لیے چائے خود بنا سکتا ہوں، بلکہ تمہارے لئے بھی بنا سکتا ہوں۔“ سالار نے مگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے واپس بھیجا۔

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”یہ سب لوگ سو رہے ہیں؟“

”ہاں... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ ساری رات تو باتیں کرتے رہے ہم لوگ

اور شاید ہماری آوازوں جکی وجہ سے تم ڈسٹرب ہوتی رہیں۔“

”نہیں، میں سو گئی تھی۔“ اس کا لہجہ بہت بچھا ہوا تھا۔ سالار نے محسوس کیا، وہ اسے

بہت اپ سیٹ لگی۔

”کیا کوئی زیادہ برا خواب دیکھا ہے؟“

وہ چائے کے مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”خواب...“ وہ چونکی۔ ”نہیں... ایسے ہی...“ وہ کھانا کھانے لگی۔

”صبح ناشتا کتنے بچے کریں گے یہ لوگ۔“ اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

وہ بے اختیار ہنسا۔

”یہ لوگ... کون سے لوگ... یہ تمہاری دوسری فیملی ہے اب... مئی، پاپا کہوا نہیں اور

انیتا کو انیتا...“ وہ اس کی بات پر بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ وہ واقعی کل رات سے ان کے

لیے وہی دو لفظ استعمال کر رہی تھی۔

”ناشیا تو نہیں کریں گے۔ ابھی گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ تک اٹھ جائیں گے۔ دس بجے کی

فلائٹ ہے۔“ سالار نے اس کی شرمندگی کو بھانپتے ہوئے بات بدل دی۔

”صبح نو بجے کی... اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”صرف تم سے ملنے کے لیے آئے تھے یہ لوگ، پاپا کی کوئی میٹنگ ہے آج دو بجے اور

انیتا تو اپنے بچوں کو ملازمہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہے۔ چھوٹی بیٹی تو صرف چھ ماہ کی ہے اس کی۔ ”وہ بتا رہا تھا۔ ”چائے پیئیں گے ناشتے کے بجائے، وہ تم بنا دینا۔ میں ابھی نماز پڑھ کر آ جاؤں، پھر ان کے ساتھ ہی آفس کے لیے تیار ہوں گا اور انہیں ایر پورٹ چھوڑ کر پھر آفس چلا جاؤں گا۔“ سالار نے جمائی روکتے ہوئے چائے کا خالی مگ اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ امامہ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

”تم سوؤ گے نہیں؟“

”نہیں، شام کو آفس سے آنے کے بعد سوؤں گا۔“

”تم چھٹی لے لیتے۔“ امامہ نے روانی سے کہا۔

سنگ کی طرف جاتے ہوئے سالار نے پلٹ کر امامہ کو دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔

”سونے کے لیے آفس سے چھٹی لے لیتا؟ میرے پروفیشن میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”تم سوئے نہیں رات کو، اس لیے کہہ رہی ہوں۔“ وہ اس کی بات پر جھینپی جتھی۔

”میں اڑتا لیس، اڑتا لیس گھنٹے بغیر سوئے یو این کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ وہ بھی شدید

گرمی اور سردی میں۔ Disaster stricken areas میں اور رات کو تو ماں،

باپ کے پاس بیٹھا پرفیکٹ کنڈیشنز میں باتیں کرتا رہا ہوں، تھکتا کیوں؟”

اذان ہو رہی تھی۔

”اب پلیز مگ مت دھونا، مجھے اپنے برتن دھونے ہیں۔“ امامہ نے چائے کا گگ خالی

کرتے ہوئے اسے روکا۔ وہ ٹی بیگ نکال کر ویسٹ باسکٹ میں پھینکنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے... دھویے“

سالار نے بڑی خوش دلی کے ساتھ مگ سنک میں رکھا اور پلٹا۔ وہ کوڑے دان کا ڈھکن

ہٹائے ہوئے فق ہوتی رنگت کے ساتھ، ٹی بیگ ہاتھ میں پکڑ کسی بت کی طرح کھڑی

تھی۔ سالار نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر کوڑے دان کے اندر پڑا اس چیز کو جس نے

اسے یوں شاکڈ کر دیا تھا۔

نان الکو لک ڈرنک۔ ”وہ مدھم آواز میں کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ اسے یقین تھا۔ وہ اس کوڑے دان کے اندر بڑے جنجر بیئر

کے اس خالی کین کو وہاں سے نہیں دیکھ سکتا تھا، جہاں وہ کھڑا تھا، اس کے باوجود اس کو

پتا تھا کہ وہ کیا چیز دیکھ کر سکتہ میں آئی تھی۔

اس نے جنجر بعد میں پڑھا تھا، بیس پہلے... اور یہ سالار سکندر کا گھر نہ ہوتا تو اس کا ذہن پہلے نان الکھولک ڈرنکس کی طرف جاتا، مگر یہاں اس کا ذہن بے اختیار دوسری طرف گیا تھا۔ جھک کر ٹی بیگ پھینکتے ہوئے اس نے non alcoholic کے لفظ بھی کین پر دیکھ لیے تھے۔ کچھ دیر وہیں کھڑی وہ اپنی ندامت ختم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہوتا میرے بارے میں اور سالار کو بھی واقعی کرنٹ لگا تھا۔ وہ دونوں اپنے درمیان اعتماد کا جو پیل بنانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ کبھی ایک طرف سے ٹوٹ رہا تھا، کبھی دوسری طرف سے۔

اس نے آخری بار شراب آٹھ سال پہلے پی تھی، لیکن وہ انرجی اور non alcoholic drinks تقریباً ہر رات کام کے دوران پیتا تھا۔ امامہ کو ویسٹ باسکٹ کے پاس شاگڈ دیکھ کر اسے یہ جاننے میں سیکنڈز بھی نہیں لگے تھے کہ ویسٹ باسکٹ میں پڑی کون سی چیز اس کے لیے شاکنگ ہو سکتی ہے۔

وہ کارپوریٹ سکیٹر سے تعلق رکھتا تھا اور جن پارٹیز میں جاتا تھا وہاں ڈرنکس ٹیبیل پر شراب بھی موجود ہوتی تھی اور ہر بار اس ”مشروب“ سیانکار پر کسی کے پچھلے آٹھ سال کے دوران شاید ایک بار بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، کیوں کہ

ان میں سے کوئی بھی نو سال پہلے والے سالار سکندر سے واقف نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک فرد جو دو دن پہلے اس کے گھر میں آیا تھا، اس کے پاس سالار کی کسی بھی بات اور عمل پر شبہ کرنے کے لیے بڑی ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔

”یہ سب تو ہو گا ہی... ایسی حرکتیں نہ کرتا تب قابل اعتبار ہوتا۔ اب جب کہ ماضی کچھ اتنا صاف نہیں ہے تو اس پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔“ بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے بڑی آسانی کے ساتھ سارا الزام اپنے سر لے کر امامہ کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔

”تمہارے کپڑے پر لیس کر دوں؟“ اس نے بیڈ روم میں آ کر پوچھا۔ وہ ڈریسنگ روم میں وارڈ روم کھولے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔

”نہیں، میرے کپڑے تو پر لیس ہو کر آتے ہیں۔“ ایک ہینگر نکالتے ہوئے وہ پلٹ کر مسکرایا تھا۔

امامہ کو یک دم اپنے کانوں کے بندے یاد آئے۔

”تم نے میرے ایررنگنز کہیں دیکھے ہیں میں نے واش روم میں رکھے تھے، وہاں نہیں

”ملے مجھے۔“

”ہاں میں نے اٹھائے تھے وہاں سے۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل پر ہیں۔“ سالار دو قدم آگے بڑھا اور ایررنگز اٹھا کر امامہ کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ پرانے ہو گئے ہیں۔ تم آج میرے ساتھ چلنا، یہیں تمہیں نئے لے دوں گا۔“ وہ ایررنگز کانوں میں پہنتے ہوئے ٹھنگی۔

”یہ میرے ابو نے دیے ہیں جب مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن ملا تھا۔ میرے لیے پرانے نہیں ہیں۔ تمہیں ضرورت نہیں ہے اپنے پیسے ضائع کرنے کی۔“

اس کارڈ عمل دیکھنے کے لیے امامہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ وہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تھی۔ وہ اگلے کچھ سیکنڈز وہیں کھڑا رہا۔ وہ محبت سے کی ہوئی آفر تھی، جسے وہ اس کے منہ پر مار کر گئی تھی۔ کم از کم سالار نے یہی محسوس کیا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ محبت سے کی جانے والی اس آفر کو اس نے ضرورت پوری کرنے والی چیز بنا دیا تھا۔ وہ مرد تھا، ضرورت اور محبت میں فرق نہیں کر پاتا تھا۔ وہ عورت تھی ضرورت اور محبت میں فرق رکھتے رکھتے مر جاتی۔



ڈاکٹر سبط علی کو اس دن صبح ہی سعیدہ اماں سے طویل گفت گو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ دو دیا تین دن بعد ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا کرتے تھے اور آج بھی انہوں نے سعیدہ اماں کی طبیعت پوچھنے کے لیے ہی فون کیا تھا۔ وہ ان کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی بے یقینی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ انہیں سعیدہ اماں کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”آمنہ نے آپ سے یہ کہا کہ سالار اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے؟“ انہیں لگا کہ انہیں سعیدہ اماں کی بات سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

”وہ بے چاری تو روتی رہی ہے... فون پر بھی... اور میرے پاس بیٹھ کر بھی... سالار نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس سے ٹھیک طرح سے بات تک نہیں کرتا وہ۔ بھائی صاحب! آپ نے بڑا ظلم کیا ہے بچھی پر۔“ سعیدہ اماں ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو رہی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے، وہ دونوں تو پر سوں میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش تھے۔“ ڈاکٹر سبط علی پریشان کم اور حیران زیادہ ہو

رہے تھے۔

”اور آپ کے گھر سے واپسی پر وہ اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بے چاری ساری رات روتی رہی۔“

”آمنہ آپ کے ہاں رہی پر سوں؟“ وہ پہلی بار چونکے تھے۔

”تو اور کیا...؟ سالار تو اس کو لے جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کے ماں باپ آرہے تھے کل... تو اس لیے مجبوراً لے گیا اسے... اور آمنہ بھی بڑی پریشان ہے سارا دن چپ بیٹھی رہی۔ آپ تو بھائی صاحب بڑی تعریفیں کیا کرتے تھے، بڑانیک، صالح بچہ ہے لیکن یہ تو بڑا خراب نکلا۔ ابھی سے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے اس نے۔“

اس وقت ڈاکٹر سبط علی کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ امامہ اس رات ان کے گھر پر بھی خاموش بیٹھی رہی تھی، لیکن انہیں یہ شائبہ تک نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف ہوا ہے۔

”خیر، یہں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں، آپ میری طرف آجائیں۔ سالار کو بھی افطار پر بلوا لیتے ہیں، پھر میں اس سے بات کر لوں گا۔“

امامہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ اس وقت یہی ایک چیز تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

”وہ آج کل بہت دیر سے آفس سے آرہا ہے۔ کل رات بھی نوبے آیا، شاید آج نہ آسکے۔“ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”میں فون کر کے پوچھ لیتا ہوں اس سے۔“ ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

”جی۔“ اس نے بہ مشکل کہا۔ وہ ان کے کہنے پر آنکھیں بند کر کے کسی سے بھی شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا، وہ افطار کی دعوت پر نہ آنے کے لیے کسی مصروفیت کو جواز بناتا؟ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو کیا جواب ملنے والا ہے۔ فون بند کر کے وہ بے اختیار اپنے ناخن کاٹنے لگی... یہ درست تھا کہ اسے سالار سے شکایتیں تھیں، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ شادی کے چوتھے ہی دن اس طرح کی کوئی بات ہوتی۔

”ہیلو! سویٹ ہارٹ۔“ پانچ منٹ بعد اس نے اپنے سیل پر سالار کی چہکتی ہوئی آواز سنی اور اس کے ضمیر نے اسے بری طرح ملامت کیا۔

”بندہ اٹھتا ہے تو کوئی میسج ہی کر دیتا ہے... فون کر لیتا ہے... یہ تو نہیں کہ اٹھتے ہی میکے

جانے کی تیاری شروع کر دے۔ ”وہ بے تکلفی سے حالات کی نوعیت کا اندازہ لگائے بغیر اسے چھیڑ رہا تھا۔

امامہ کے احساس جرم میں مزید اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر سبط علی نے یقیناً اس سے فی الحال کوئی بات کیے بغیر اسے افطار پر بلا یا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب ابھی افطار کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہہ میں آج آفس سے جلدی آ جاؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔“ وہ اسے بتا رہا تھا۔ امامہ کو یک دم کچھ امید بندھی۔ وہ اگر پہلے گھر آ جاتا ہے تو وہ اس سے کچھ بات کر لیتی، کچھ معذرت کر کے اسے ڈاکٹر صاحب کے گھر متوقع صورت حال کے بارے میں آگاہ کر سکتی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاں، یہ ہو سکتا تھا۔

”لیکن اگر تم جانا چاہو تو میں تمہیں بھجوادیتا ہوں۔“ سالار نے اگلے ہی جملے میں اسے آفر کی۔

”نہیں... نہیں، میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ امامہ نے بے اختیار کہا۔

”اوکے... میں پھر انہیں بتا دیتا ہوں... اور تم کیا کر رہی ہو؟“

اس کا دل چاہا، وہ اس سے کہے کہ وہ اس گڑھے سے نکلنے کی کوشش کی رہی ہے جو اس نے سالار کے لیے کھودا تھا۔

”فرقان کی ملازمہ آئے گی آج صفائی کرنے کے لیے، عام طور پر تو وہ صبح میرے جانے کے بعد آکر صفائی کرتی ہے لیکن تم اس وقت سو رہی ہوتی ہو، تو میں نے اسے فی الحال اس وقت آنے سے منع کیا ہے۔ تم بھابھی کو کال کر کے بتا دینا کہ وہ اسے کب بھیجیں۔“

وہ شاید اس وقت آفس میں فارغ تھا اس لیے لمبی بات کر رہا تھا۔
 ”کچھ تو بولو یار... اتنی چپ کیوں ہو؟“

”نہیں... وہ... میں... ایسے ہی۔“ وہ اس کے سوال پر بے اختیار گڑ بڑائی۔ ”تم فری ہو اس وقت؟“ اس نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔
 اگر وہ فارغ تھا تو وہ ابھی اس سے بات کر سکتی تھی۔

”ہاں، ایو پیلو ایشن ٹیم چلی گئی ہے... کم از کم جان کا دن تو ہم سب بہت ریلیکسڈ ہیں۔ اچھے کمنٹس دے کر گئے ہیں وہ لوگ۔“ وہ بڑے مطمئن انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

وہ اس کی باتوں پر غور کیے بغیر اس ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ بات کیسے شروع کرے۔

”آج اگر ڈاکٹر صاحب انوائٹ نہ کرتے تو میں سوچ رہا تھا رات کو کہیں باہر کھانا کھاتے... فورٹریس میں انڈسٹریل ایگزیریٹیشن لگی ہوئی ہے... وہاں چلتے... بلکہ یہ کریں گے کہ ان کے گھر سے ڈنر کے بعد فورٹریس چلے جائیں گے۔“

چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا محاورہ آج پہلی بار امامہ کی سمجھ میں آیا تھا۔ یہ محاورتاً نہیں کہا گیا تھا۔ جو واقعی بعض سچویشنز جمیں چلو بھر پانی بھی ڈبونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ بات شروع کرنے کے جتن کر رہی تھی اور یہ کیسے کرے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

”ٹھیک ہے! پھر میں ذرا ڈاکٹر صاحب کو بتا دوں۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی، سالار نے بات ختم کرتے ہوئے کال بند کر دی۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆☆

وہ تقریباً چار بجے گھر آیا تھا اور وہ اس وقت تک یہ طے کر چکی تھی کہ اسے اس سے کس طرح بات کرنی ہے۔ سالار اوپر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون پر اسے نیچے آنے کے لیے کہا۔ وہ جب گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھی تو اس نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اس کا استقبال کیا۔ وہ فون پر اپنے آفس کے کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔

ہینڈ زفری کان سے لگائے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرف ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی کال میں مصروف رہا۔ امامہ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اگر وہ سارے راستے بات کرتا رہتا تو... ایک سگنل پر رکنے پر اس نے سالار کا کندھا تھپتھپایا اور بے حد خفگی کے عالم میں اسے کال ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ نتیجہ فوری طور پر آیا۔ چند منٹ مزید بات کرنے کے بعد سالار نے کال ختم کر دی۔

”سوری... ایک کلائنٹ کو کوئی پرابلم ہو رہا تھا۔“ اس نے کال ختم کرنے کے بعد کہا۔

”اسلام آباد چلو گی؟“ اس کے اگلے جملے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔

وہ سب کچھ جو وہ سوچ کر آئی تھی، اس کے ذہن سے غائب ہو گیا۔

”اسلام آباد؟“ اس نے بے حد بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔

”ہاں میں اس ویک اینڈ پر جا رہا ہوں۔“ سالار نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔
 ”لیکن میں... میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ وہ بے اختیار اٹکی۔ ”تمہارے پاپا تو تمہیں منع کر کے گئے ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ اسلام آباد نہ لے کر آنا۔ پھر؟“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”ہاں... اور اب وہی کہہ رہے ہیں کہ اگر میں تمہیں ساتھ لانا چاہوں تو لے آؤں۔“
 اس بڑی روانی سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”میری فیملی کو پتا لگ سکتا ہے۔“ اس نے لمبی خاموشی کے بعد بالآخر کہا۔
 ”آج یا کل تو پتا لگنا ہے۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔ ”یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ساری عمر تمہیں چھپا کر رکھوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری فیملی نے تمہارے بارے میں لوگوں سے کہا ہے کہ تم شادی کے بعد بیرون ملک سیٹل ہو گئی ہو۔ اب اتنے سالوں کے بعد تمہارے حوالے سے کچھ کریں گے تو خود انہیں بھی embarrassment ہوگی۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ کریں گے۔“
 وہ مطمئن تھا۔

”تم انہیں نہیں جانتے، انہیں پتا چل گیا تو وہ چپ نہیں بیٹھیں گے۔“ وہ پریشان ہونے لگی تھی۔

”وہاں کبھی کبھار جایا کریں گے، خاموشی سے جائیں گے اور آ جایا کریں گے۔ یار! اتنا socialize نہیں کریں گے وہاں۔“ وہ اس کی بے فکری سے چڑی۔

”انہیں پتا چلا تو وہ مجھے لے جائیں گے... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”فرض کرو امامہ! اگر انہیں اتفاقاً تمہارے بارے میں پتا چلتا ہے یا یہاں لاہور میں تمہیں کوئی دیکھ لیتا ہے، تمہیں کوئی نقصان پہنچاتے ہیں تو...؟“

”نہیں پتا چلے گا میں کبھی باہر جاؤں گی ہی نہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تمہارا دم نہیں گھٹے گا اس طرح...؟“ اس نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں مسیحا جیسی ہمدردی تھی۔

”مجھے عادت ہو گئی ہے سالار... اتنا ہی سانس لینے کی... مجھے فرق نہیں پڑتا۔ جب میں

جاب نہیں کرتی تھی تو مہینوں گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ میں اتنے سالوں سے لاہور

میں ہوں لیکن میں نے یہاں بازاروں، پارکس اور ریسٹورانٹس کو صرف سڑک پر سفر کرتے ہوئے باہر سے دیکھا ہے یا ٹی وی اور نیوز پیپرز میں۔ میں اگر اب ان جگہوں پر جاؤں تو میری سمجھ میں ہی نہیں آئے گا کہ مجھے وہاں کرنا کیا ہے۔ جب ملتان میں تھی ہاسٹل اور کالج کے علاوہ دوسری کوئی جگہ نہیں تھی میری زندگی میں۔ اب لاہور آگئی تو یہاں بھی پہلے یونیورسٹی اور گھر... اور اب گھر... مجھے ان کے علاوہ دوسری ساری جگہیں عجیب سی لگتی ہیں۔ مہینے میں ایک بار میں سعیدہ اماں کے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں ان کے ساتھ جاتی تھی، وہ میری واحد آؤٹنگ ہوتی تھی۔ وہاں ایک بک شاپ تھی۔ میں پورے مہینے کے لیے بکس لے لیتی تھی وہاں سے۔ کتاب کے ساتھ وقت گزارنا آسان ہوتا ہے۔”

وہ پتا نہیں اسے کیوں بتاتی گئی۔

”ہاں، وقت گزارنا آسان ہوتا ہے، زندگی گزارنا نہیں۔“

اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اُسے دیکھا، وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

”مجھے فرق نہیں پڑتا سالار۔“

”مجھے فرق پڑتا ہے... اور بہت فرق پڑتا ہے۔“ سالار نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔

”میں ایک نارمل زندگی گزارنا چاہتا ہوں... جیسی کبھی تمہاری زندگی تھی۔ تم نہیں

چاہتیں یہ سب کچھ ختم ہو جائے...؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ابنارمل لائف ہی سہی لیکن میں سیف ہوں۔“

سالار نے بے اختیار اس کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلا یا۔

”تم اب بھی سیف رہو گی... trust me... کچھ نہیں ہو گا... میری فیملی تمہیں

protect کر سکتی ہے اور اگر تمہاری فیملی کو اب یہ پتا چلتا ہے کہ تم میری بیوی ہو تو

اتنا آسان نہیں ہو گا ان کے لیے تمہیں نقصان پہنچانا۔ جو بھی ہونا ہے، ایک بار گھل کر

ہو جائے۔ تمہیں اس طرح چھپا کر رکھوں اور انہیں کسی طرح علم ہو جائے تو وہ تمہیں

کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ایسی صورت میں، میں پولیس کے پاس جا کر بھی کچھ نہیں کر

سکوں گا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ تم نو سال سے غائب ہو اور وہ تمہارے بارے

میں کچھ نہیں جانتے۔“ وہ خاموش رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سالار نے بولتے بولتے اس کی خاموشی نوٹس کی۔

”مجھے تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہیے تھی... کسی کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہیے تھی... میں نے اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔“ وہ بے حد اپ سیٹ ہو گئی۔

”ہاں، اگر تم کسی اور کے ساتھ شادی کرتیں تو یہ واقعی unfair ہوتا لیکن میری کوئی بات نہیں۔ میں نے تو خیر پہلے بھی تمہاری فیملی کی بہت گالیاں اور بددعائیں لی ہیں، اب بھی سہی۔“ وہ بڑی لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔

”تو پھر سیٹ بک کروادوں تمہاری؟“ وہ واقعی ڈھیٹ تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

”کچھ نہیں ہو گا اما Mark my word...“ سالار نے اسٹیرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”تم کوئی ولی نہیں ہو۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

اس کے کندھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے وہ بے اختیار ہنسا۔

”اچھا میں نے کب کہا کہ میں ولی ہوں۔ میں تو شاید انسان بھی نہیں ہوں۔“

اس کے اس جملے پر اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اب ونڈ سکرین کے پار دیکھ

رہی تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے اپنے چہرے پر امامہ کی نظریں محسوس کیں۔ ”ویسے ہی پایا چاہتے ہیں، ہم وہاں آئیں۔“

امامہ نے اس بار جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

☆☆☆☆

اس شام سالار کو ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کچھ سنجیدہ لگے تھے اور اس سنجیدگی کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ امامہ بھی کھانے کے دوران بالکل خاموش رہی تھی، لیکن اس نے اس کی خاموشی کو گاڑی میں ہونے والی گفت گو کا نتیجہ سمجھا۔

وہ لاؤنج میں بیٹھے چائے پر رہی تھے۔ جب ڈاکٹر سبط علی نے اس موضوع کو چھیڑا۔

”سالار! امامہ کو کچھ شکایتیں ہیں آپ سے۔“ وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ٹھٹکا۔

یہ بات اگر ڈاکٹر سبط علی نے نہ کہی ہوتی تو وہ اسے مذاق سمجھا۔ اس نے کچھ حیرانی کے

عالم میں ڈاکٹر سبط علی کو دیکھا، پھر اپنے برابر میں بیٹھے امامہ کو۔ وہ چائے کا کپ اپنے

گٹھنے پر رکھے چائے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال گاڑی میں

ہونے والی گفت گو کا آیا لیکن امامہ نے کس وقت ڈاکٹر صاحب کو گاڑی میں ہونے والی
گفت گو کے بارے میں بتایا تھا...؟... وہ بے حد حیران ہوا۔

”جی...!“ اس نے کپ واپس پرچ میں رکھ دیا۔

”امامہ آپ کے رویے سے ناخوش ہیں۔“ ڈاکٹر سبط علی نے اگلا جملہ بولا۔

سالار کو لگا، اسے سننے میں کوئی غلی ہوئی ہے۔

”جی...“ اس نے بے اختیار کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ امامہ پر طنز کرتے ہیں...؟“ وہ پلکیں جھپکے بغیر ڈاکٹر سبط علی کو دیکھتا رہا۔ بہ مشکل
سانس لے کر چند لمحوں بعد اس نے امامہ کو دیکھا۔

”یہ آپ سے امامہ نے کہہ؟“ اس نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سبط علی
کہا۔

”ہاں، آپ اس سے ٹھیک بات نہیں کرتے۔“

سالار نے گردن موڑ کر ایک بار پھر امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی نظریں جھکائے بیٹھی
تھی۔

”یہ بھی آپ سے امامہ نے کہا؟“ اس کے تو جیسے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر سبط علی نے سر ہلایا۔ سالار نے بے اختیار اپنے ہونٹ کا ایک کونا کاٹتے ہوئے چائے کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا زاہن بری طرح چکرا گیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے پریشان کن صورت حال میں سے ایک تھی۔

امامہ نے چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے بے حد شرمندگی اور پچھتاوے کے عالم میں اس کو گلا صاف کرتے ہوئے، کہتے سنا۔ ”اور...؟“

جو کچھ ہو رہا تھا، یہ امامہ کی خواہش نہیں تھی، حماقت تھی، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

”اور یہ کہ آپ کہیں جاتے ہوئے اسے انفارم نہیں کرتے۔ پرسوں آپ جھگڑا کرنے کے بعد اسے سعیدہ بہن کی طرف چھوڑ گئے تھے۔“ اس بار سالار نے پہلے کلثوم آنٹی کو دیکھا پھر ڈاکٹر سبط علی کو... پھر امامہ کو... اگر آسمان اس کے سپر گرتا تب اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت ہوئی تھی۔

”جھگڑا...؟ میرا تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔“ اس نے بہ مشکل اپنے حواس پر قابو پاتے

ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔ ”اور امامہ نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے گھر رہنا چاہتی ہے اور میں تو پچھلے چار دنوں سے کہیں۔ ”وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

اس نے امامہ کی سسکی سنی تھی۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر امامہ کو دیکھا، وہ اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔ کلثوم آنٹی اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سالار بات جاری نہیں رکھ سکا۔ کلثوم آنٹی اٹھ کر اس کے پاس آ کر اسے دلاسا دینے لگیں۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سبط علی نے ملازم کو پانی لانے کے لیے کہا۔

سالار کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس وقت وہاں اپنی صفائیاں دینے اور وضاحت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، وہ الو کا پٹھا ہے کیوں کہ پچھلے چار دن سے اس کی چھٹی حس جو سنگنلز بار بار دے رہی تھی، وہ بالکل ٹھیک تھے۔ صرف اس نے خوش فہمی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پانچ دس منٹ کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً آدھے گھنٹے تک سالار کو سمجھاتے رہے۔ وہ خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے برابر بیٹھی امامہ کو بے حد ندامت ہو رہی تھی۔ اگلے بعد سالار کا اکیلے میں سامنا کرنا کتنا مشکل تھا۔ یہ اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی ڈاکٹر سبط علی کے گھر کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی امامہ نے اسے کہتے سنا۔

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں یقین نہیں کر سکتا۔“

اسے اس سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔ وہ ونڈا سکرین سے نظر آتی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی اس وقت بے حد نروس ہو رہی تھی۔

”میں تم پر طنز کرتا ہوں... تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا... تمہیں بتائے بغیر جاتا ہوں... تمہیں سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ گیا تھا... جھگڑا کیا۔ تم نے ان لوگوں سے جھوٹ بولا؟“

امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ جھوٹ کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسے اتنا برا نہ لگتا۔

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ اس نے بے حد خفگی سے کہا۔

”میں تم پر طنز کرتا ہوں؟“ سالار کی آواز میں تیزی آگئی۔

”تم نے اس رات میری اندھیرے میں سونے کی عادت کو ”عجیب“ کہا۔“ وہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

”وہ طنز تھا؟ وہ تو بس ایسے ہی ایک بات تھی۔“

”مگر مجھے اچھی نہیں لگی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تم نے بھی تو جو ابامیری روشنی میں سونے کی عادت کو عجوبہ کہا تھا۔“ وہ اس بار چپ

رہی۔ سالار واقعی بہت زیادہ ناراض ہو رہا تھا۔

”اور میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا...؟“ وہ اگلے الزام پر آیا۔

”مجھے لگا تھا۔“ اس نے اس بار افغانہ انداز میں کہا۔

”لگا تھا...؟“ وہ مزید خفا ہوا۔ ”تمہیں صرف ”لگا“ اور تم نے سیدھا ڈاکٹر صاحب سے

جا کر کہہ دیا۔“

”میں نے ان سے کچھ نہیں کہا، سعیدہ اماں نے سب کچھ کہا تھا۔“ اس نے وضاحت

کی۔

وہ چند لمحے صدمے کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکا۔

”یعنی تم ان سے بھی یہ سب کچھ کہا ہے؟“ وہ چپ رہی۔

وہ ہونٹ کانٹے لگا۔ اسے اب سعیدہ اماں کی اس رات کی بے رخی کی وجہ سمجھ میں آرہی

تھی۔

”اور میں کہاں جاتا ہوں جس کے بارے میں نے تمہیں نہیں بتایا...؟“ سالار کو یاد آیا۔

”تم سحری کے وقت مجھے بتا کر گئے؟“ سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

”امامہ! میں مسجد جاتا ہوں اس وقت فرقان کے ساتھ۔ اس کے بعد جم اور پھر واپس

گھر آ جاتا ہوں۔ اب میں مسجد بھی تمہیں بتا کر جایا کروں؟“ وہ جھنجھلایا تھا۔

”مجھے کیا پتا تم اتنی صبح کہاں جاتے ہو...؟ مجھے تو اپ سیٹ ہونا ہی تھا۔“ امامہ نے کہا۔

اس کی وضاحت پر وہ مزید تپ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں رمضان میں سحری کے وقت کہاں جا سکتا ہوں۔؟ کسی

نائٹ کلب...؟ یا کسی گرل فرینڈ سے ملنے...؟ کوئی احمق بھی جان سکتا ہے کہ میں کہاں

جا سکتا ہوں۔“ وہ احمق کے لفظ پر بری طرح تلملانی۔

”ٹھیک ہے، میں واقعی احمق ہوں... بس۔“

اور سعیدہ اماں کے گھر میں رہنے کا تم نے کہا تھا... کہا تھا نا... اور کون سا جھگڑا ہوا تھا

تمہارا؟“

وہ خاموش رہی۔

”اتنے زیادہ جھولٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟“ وہ اس بار اس کی بات پر روہانسی ہو گئی۔

”بار بار مجھے جھوٹا مت کہو۔“

”امامہ! جو جھوٹ ہے، میں اسے جھوٹ ہی کہوں گا۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے

مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کیا سوچ رہے ہوں گا وہ میرے بارے

میں...؟“ وہ واقعی بری طرح اپ سیٹ تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”اچھا اب یہ سب ختم کرو۔“ اس نے امامہ کے گالوں پر یک دم بہنے والے آنسو دیکھ

لیے تھے اور وہ بری طرح جھنجھلا یا تھا۔ ”ہم جس ایشوپر ”بات“ کر رہے ہیں امامہ! اس

میں رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ روتی رہی۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے امامہ!... تم نے ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی یہی کیا تھا میرے

ساتھ۔“

اس کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا لیکن جھنجھلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، وہ اس کی

شادی کا چوتھا دن تھا اور وہ ایک گھنٹے میں دوسری باریوں زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی یوں رو رہی ہوتی تو وہ پریشان ہوتا، یہ تو خیر امامہ تھی۔ وہ بے اختیار نرم پڑا۔ اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اس نے جیسے اسے چپ کر کروانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اپنی سرخ ہوتی ہوئی ناک کو رگڑا اور سالار کی صلح کی کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں اس لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پتا تھا، تم میرے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرو گے۔“ وہ اس کے جملے پر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا پھر اس نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”کیسا سلوک... تم وضاحت کرو گی؟“ اس کے لہجے میں پھر خفگی اتر آئی ”یہاں نے آخر کیا کیا ہے تمہارے ساتھ۔“

وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ سالار نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کیں۔ وہ ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو یقیناً سر بھی پکڑ لیتا۔ باقی رستے دونوں میں کئی بھی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر چپ ہو گئی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔

اپارٹمنٹ میں آ کر بھی دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ بیڈ روم میں جانے

کے بجائے الاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ سالار بیڈروم میں چلا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر بیڈروم میں آیا، وہ تب بھی اندر نہیں آئی تھی۔ ”اچھا ہے، اسے بیٹھ کر اپنے رویے کے بارے میں کچھ دیر سونا چاہیے...“ اس نے اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ وہ سونا چاہتا تھا اور اس نے بیڈروم کی لائٹس آف نہیں کی تھیں لیکن نیند یک دم اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے بندہ سوچے لیکن اتنا بھی کیا سوچنا۔ مزید پانچ منٹ گزرنے کے باوجود اس کے نمودار نہ ہونے پر وہ بے اختیار جھنجھلایا۔ دو منٹ مزید گزرنے کے بعد وہ بیڈروم سے نکل آیا۔

وہ الاؤنج کے صوفے کے ایک کونے میں، دونوں پاؤں اوپر رکھ، کیشن گود میں لیے بیٹھی تھی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اس وقت رو نہیں رہی تھی۔ سالار کے الاؤنج میں آنے پر اس نے سراٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اسی طرح کیشن کو گود میں لیے اس کے دھاگے کھینچتی رہی۔ وہ اس کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ کیشن کو ایک طرف رکھتے ہوئے امامہ نے بے اختیار صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ سالار نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔

”یہی بیٹھو۔“ اس نے تحکمانہ انداز میں اس سے کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے بازو چھڑانے کا سوچا، پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی
لیکن اس نے اپنے بازو سے سالار کا بازو ہٹا دیا۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے... لیکن آئی ایم سوری۔“ اس نے مصالحت کی پہلی کوشش کا
آغاز کیا۔

امامہ نے خفگی سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا
لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ فی الحال اس کی معذرت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں
رکھتی۔

”تمہیں یہ کیوں لگا کہ تم سے ٹھیک بات نہیں کر رہا...؟ امامہ! میں تم سے بار کر رہا
ہوں۔“ اس نے اس کے خاموش رہنے پر کہا۔

”تم مجھے اگنور کرتے رہے۔“ ایک لمحے توقف کے بعد اس بالآخر کہا۔

”اگنور؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”میں تمہیں...“ ”تمہیں“ اگنور کرتا رہا... میں کر ”سکتا“
ہوں؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ امامہ نے اس سے نظریں نہیں ملائیں۔

”تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ...؟ تمہیں“ اگنور ”کرنے کے لیے شادی کی تھی میں نے

تم سے؟ تمہیں اگنور کرنے کے لیے اتنے سالوں سے خوار ہوتا پر رہا ہوں میں۔”

”لیکن تم کرتے رہے...” وہ اپنی بات پر مضر تھی۔ ”تم زبان سے ایک بات کہتے ہو لیکن تم...” وہ بات کرتے کرتے رکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ”تمہاری زندگی میں میری کوئی... کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔”

”رکومت، کہتی رہو... میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں ایسا کیا کر رہا ہوں جس سے تمہیں میرے بارے میں اتنی غلط فہمیاں ہو رہی ہیں۔” اس نے اس کی آنکھوں کی نمی کو نظر انداز کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”میں نے تمہیں صبح مسجد جاتے ہوئے نہیں بتایا... آفس جاتے ہوئے بھی نہیں بتایا... اور؟” اس نے گفت گو شروع کرنے کے لیے اسے کیودی۔

”تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم افطار پر دیر سے آؤ گے۔ تم چاہتے تو جلدی بھی آسکتے تھے۔” وہ رکی۔

”اور...؟” سالار نے کوئی وضاحت کیے بغیر کہا۔

”میں نے تمہارے کہنے کے مطابق تمہیں میسج کیا لیکن تم نے مجھے کال نہیں کی۔ اپنے

پیرنٹس کو ریسیدو کرنے یا چھوڑنے کے لیے تم مجھے بھی ایئر پورٹ لے جاسکتے تھے لیکن تم نے مجھ سے نہیں کہا۔ ٹھیک ہے، میں نے کہا تھا کہ مجھے سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ دو لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔ میری کتنی بے عزتی ہوئی ان کے سامنے۔”

وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

وہ پلک جھپکے بغیر یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پانی اب اس کی آنکھوں سے ہی نہیں، ناک سے بھی بہنے لگا تھا۔ وہ پوری دل جمعی سے رو رہی تھی۔ سالار نے سینٹر ٹیبل کے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر خود ایک ٹشو پیپر نکال لیا۔ اس نے ناک رگڑی تھی، آنکھیں نہیں۔

”اور...؟“ سالار نے بڑے تحمل کے ساتھ ایک بار پھر کہا۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے شادی کا کوئی گفٹ تک نہیں دیا۔ اس کی ایک دکھتی رگ یہ بھی تھی، لیکن اس سے تحفے کا ذکر کرنا اسے اپنی توہین لگی۔ اس نے تحفے کا ذکر نہیں کیا۔ کچھ دیر وہ اپنی ناک رگڑتی، سسکیوں کے ساتھ روتی رہی۔ سالار نے بالآخر اس سے پوچھا۔

”بس یا ابھی کچھ اور بھی جرم ہیں میرے؟“

”مجھے پتا تھا کہ تم شادی کے بعد میرے...“

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ساتھ یہی کرو گے... مجھے پتا ہے، تمہیں میرے بارے میں سب کچھ پہلے سے ہی پتا

چل جاتا ہے۔“ وہ اس کے جملے پر بری طرح چڑھا تھا۔ ”اس کے باوجود اب تم مجھے کچھ

کہنے کا موقع دو گی...؟“ وہ چپ بیٹھی اپنی ناک رگڑتی رہی۔

”اگر میں شادی کے اگلے دن آفس سے جلدی آسکتا تو آجاتا، آج آیا ہوں نا جلدی۔“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”تم اپنے پیرنٹس کے لیے تو آگئے تھے۔“ امامہ نے مداخلت کی۔

”اس دن میری پریزینٹیشن نہیں تھی اور میں نے تمہیں کال کی تھی۔ ایک بار نہیں، کئی

بار... تم اپنا سیل فون دیکھو یا میں دکھاؤں۔“ سالار نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

”میرے میسج کرنے پر تو نہیں کی تھی نا؟“

”اس وقت میں میٹنگ میں تھا، میرا سیل میرے پاس نہیں تھا۔ بورڈ روم سے نکل کر

پہلی کال میں نے تمہیں ہی کی تھی، ریسپو کرنا تو ایک طرف تم نے توجہ تک نہیں دی۔

میں نے سعیدہ اماں کے گھر بھی تمہیں کالز کیں، تم نے وہاں بھی یہی کیا، بلکہ سیل ہی آف کر دیا۔ تو مجھے بھی ناراض ہونا چاہیے تھا، مجھے کہنا چاہیے تھا کہ تم مجھے انور کر رہی ہو، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے سوچا تک نہیں اس چیز کے بارے میں۔ ”وہ اب اسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

”تمہیں اپنے ساتھ ایرپورٹ لے کر جانا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ ایرپورٹ ایک طرف ہے... بیچ میں میرا آفس ہے... اور دوسری طرف گھر... میں پہلے یہاں آتا... تمہیں لے کر پھر ایرپورٹ جاتا... دگنا ٹائم لگتا... اور تمہارے لیے انہیں ایرپورٹ جا کر ریسو کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔ ”وہ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر بولا۔

”اب میں شکایت کروں تم سے؟“

امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم نے سعیدہ اماں کے گھر پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، مجھ سے پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ ”اس کی آنکھوں میں سیلاب کا ایک نیار یلا آیا۔

”میرا خیال تھا، تم مجھے وہاں رہنے ہی نہیں دو گے، لیکن تم تو تنگ آئے ہوئے تھے مجھ

سے۔ تم نے مجھے ایک بار بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔”

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

”مجھے کیا پتا تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہاری خواہش ہے، مجھے پوری کرنی چاہیے۔ چلو ٹھیک ہے، میری غلطی تھی۔ مجھے کہنا چاہیے تھا تمہیں چلنے کے لیے، لیکن کم از کم تمہیں مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے باہر تک تو آنا چاہیے تھا۔ میں پندرہ منٹ صحن میں کھڑا انتظار کرتا رہا لیکن تم نے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر آنے کی زحمت نہیں کی۔“

”میں ناراض تھی، اس لیے نہیں آئی۔“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”ناراضی میں بھی کوئی فارمیٹی تو ہوتی ہے نا...؟“ وہ خاموشی رہی۔

”تم نے فرقان کے حوالے سے ضد کی کہ مجھے وہاں نہیں جانا۔ خواہ مخواہ کی ضد تھی۔

مجھے برا لگا تھا لیکن میں نے تمہیں اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کیا۔“ وہ ایک لمحہ کے

لیے رکا۔ ”فرقان میرا سب سے زیادہ کلوز فرینڈ ہے۔ فرقان اور بھابھی نے ہمیشہ میرا

بہت خیال رکھا ہے اور یہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ میری وائف اس فیملی کی

عزت نہ کرے۔“

اس کی آنکھوں میں امدتے سیلاب کے ایک اور ریلے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔ امامہ نے اس بار کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔

”میں نے تم سے یہ گلہ بھی نہیں کیا کہ تم نے میری پیرنٹس کو ایک دفعہ بھی کال کر کے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ٹھیک سے پہنچ گئے یا ان کی فلائٹ ٹھیک رہی۔“ وہ بڑے تحمل سے کہہ رہا تھا۔ وہ جزبز ہوئی۔

”میرے پاس ان کا نمبر نہیں ہے۔“

”تم مجھ سے لے لیتیں اگر تم واقعی ان سے بات کرنے میں انٹرسٹڈ ہوتیں۔ وہ تمہارے لیے یہاں آئے تھے تو تمہاری اتنی ذمہ داری تو بنتی تھی ناکہ تم ان کی فلائٹ کے بارے میں ان سے پوچھتیں یا ان کے جانے کے بعد ان سے بات کرتیں۔“

”تو تم مجھ سے کہہ دیتے۔ کیوں نہیں کہا...؟“

”میں نے اس لیے نہیں کہا کیوں کہ یہ میرے نزدیک کوئی ایشوز نہیں ہیں، یہ معمولی باتیں ہیں۔ یہ ایسے ایشوز نہیں ہیں کہ جن پر میں تم سے ناراض ہوتا پھروں یا جھگڑا کروں۔“ وہ بول نہیں سکی۔

”لیکن تم نے یہ کیا کہ میرے خلاف کیس تیار کرتی رہیں... ہر چھوٹی بڑی بات دل میں رکھتی رہیں، مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی... لیکن سعیدہ اماں کو سب کچھ بتایا... اور ڈاکٹر صاحب کو بھی... کسی دوسرے سے بات کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی... کرنی چاہیے تھی نا...؟“

اس کے آنسو تھمنے لگے۔ وہ اسے بڑے تحمل سے سمجھا رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری بات نہ سنتا تو اور بات تھی۔ پھر تم کہتیں کسی سے بھی، مجھے اعتراض نہ ہوتا۔“ وہ خاموش رہی۔ اس کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔

”تم سو نہ رہی ہو تیں تو میں یقیناً تمہیں بتا کر ہی گھر نکلتا میں کہاں جا رہا ہوں لیکن ایک سوئے ہوئے بندے کو صرف یہ بتانے کے لیے اٹھاؤں کہ میں جا رہا ہوں، یہ تو میں کبھی نہیں کر سکتا۔“

وہ کچھ بول نہ سکی۔

”اگنور...؟ میں حیران ہوں امامہ! کہ یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آگیا۔ میں چار دن سے ساتویں آسمان پر ہوں اور تم کہہ رہی ہو، میں تمہیں اگنور کر رہا ہوں۔“

”لیکن تم نے ایک بھی میری تعریف نہیں کی۔“ امامہ کو ایک اور ”خطا“ یاد آئی۔

سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کس چیز کی تعریف؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ ایک بے احمقانہ سوال تھا

لیکن اس سوال نے امامہ کو شرمندہ کیا تھا۔

”اب یہ بھی میں بتاؤں؟“ وہ بری طرح بگڑی تھی۔

”تمہاری خوب صورتی کی؟“ سالار نے کچھ اُلجھ کر اندازہ لگایا۔ وہ مزید خفا ہوئی۔

”میں کب کہہ رہی ہوں خوب صورتی کی کرو۔ کسی بھی چیز کی تعریف کر دیتے،

میرے کپڑوں کی کر دیتے۔“

اس نے کہہ تو دیا لیکن وہ یہ شکایت کرنے پر پچھتائی۔ سالار کے جوانی سوالوں نے اسے

بری طرح شرمندہ کیا تھا۔ سالار نے ایک نظر اسے، پھر اس کے کپڑوں کو دیکھ کر ایک

گہرا سانس لیا اور بے اختیار ہنسا۔

”امامہ! تم مجھے اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔“ اس نے ہنسنے

ہوئے کہا۔ یہ جیسے اس کے لیے مذاق تھا۔ وہ بری طرح جھنپ گئی۔

”مت کرو، میں کب کہا ہے۔“

”نہیں، یو آر رائٹ۔ میں نے واقعی ابھی تک تمہیں کسی بھی چیز کے لیے نہیں سراہا۔ مجھے کرنا چاہیے تھا۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے امامہ کی شرمندگی محسوس کر لی تھی۔

اس کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اس نے امامہ کو اپنے قریب کیا۔ اس بار امامہ نے اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ اس کے آنسو اب تھم چکے تھے۔ سالار نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بڑی نرمی کے ساتھ سہلاتے ہوئے بولا۔

”ایسی شکایتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں صرف چند دن کے ساتھ ہو لیکن جہاں زندگی بھر کی بات ہو، وہاں یہ سب کچھ بہت سیکنڈری ہو جاتا ہے۔“ اسے اپنے ساتھ لگائے وہ بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”تم سے شادی میرے لیے بہت معنی رکھتی“ تھی ”اور معنی رکھتی“ ہے ”... لیکن آئندہ بھی کچھ معنی رکھے“ گی ”اس کا انحصار تم پر ہے۔ مجھ سے جو گلہ ہے اسے مجھ سے کرو، دوسروں سے نہیں۔ میں صرف تم کو جواب دہ ہوں امامہ! کسی اور کے سامنے

نہیں۔ ”اس نے بے پنے تلے لفظوں میں اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
 ”ہم کبھی دوست نہیں تھے لیکن دوستوں سے زیادہ بے تکلفی اور صاف گوئی رہی ہے
 ہمارے تعلق میں۔ شادی کا رشتہ اسے کمزور کیوں کر رہا ہے؟“

امامہ نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں بھی وہی سنجیدگی
 جنظر آئی جو اس کے لفظوں میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ ”وہ غلط نہیں
 کہہ رہا تھا“ اس کے دل نے اعتراف کیا۔

”تم میری زندگی میں ہر شخص اور ہر چیز سے بہت زیادہ امپورٹنس رکھتی ہو۔“ سالار
 نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ایک جملہ میں تمہیں ہر روز نہیں
 کہہ پاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے لئے تمہاری امپورٹنس کم ہو گئی ہے۔
 میری زندگی میں تمہاری امپورٹنس اب میرے ہاتھ میں نہیں، تمہارے ہاتھ میں
 ہے۔ یہ تمہیں طے کرنا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تم اس امپورٹنس کو بڑھاؤ گی یا
 کم کر دو گی۔“ اس کی بات سنتے ہوئے امامہ کی نظر اس کے اس ہاتھ کی پشت پر پڑی
 جس سے وہ اُس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت بے حد صاف ستھری تھی۔
 ہاتھ کی پشت اور کلائی پر بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہاتھ کی انگلیاں کسی مصور کی

انگلیوں کی طرح لمبی اور عام مردوں کے ہاتھوں کی نسبت پتلی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر سبز اور نیلی رنگیں بہت نمایاں طور پر نظر آرہی تھیں۔ اس کی کلائی پر ریسٹ وائچ کا ہلکا سا نشان تھا۔ وہ یقیناً بہت باقاعدگی سے رسٹ وائچ پہناتا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کے ہاتھ کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کے ہاتھ بہت اچھے لگے۔ اس کا دل کچھ اور موم ہوا۔

اس کی توجہ کہاں تھی، سالار کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ وہ اسے اسی طرح سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

”محبت یا شادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں پارٹنرز ایک دوسرے کو اپنے اپنے ہاتھ کی مٹھی میں بند کر کے رکھنا شروع کر دیں۔ اس سے رشتے مضبوط نہیں ہوتے، دم گٹھنے لگتا ہے۔ ایک دوسرے کو اسپیس دینا، ایک دوسرے کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنا، ایک دوسرے کی آواز کے حق کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔“ امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا، وہ اب بے حد سنجیدہ تھا۔

”ہم دونوں اگر صرف ایک دوسرے کے عیب اور کوتاہیاں ڈھونڈتے رہیں گے تو بہت جلد ہمارے دل سے ایک دوسرے کے لیے عزت اور لحاظ ختم ہو جائے گا۔“

کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا گیا ہو، اگر عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جائے... یہ دونوں چیزیں محبت کے گر کی چار دیواری ختم ہو جائے تو گھر کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔”

امامہ نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر مسکرایا۔
”اچھی فلاسفی ہے نا؟“

امامہ کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بیک وقت آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
سالار نے اسے اپنے کچھ اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

”میں اللہ کا پرفیکٹ بندہ نہیں ہوں تو تمہارا پرفیکٹ شوہر کیسے بن سکتا ہوں امامہ! شاید اللہ میری کوتاہیاں نظر انداز کر دے، تو تم بھی معاف کر دیا کرو۔“

وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، وہ واقعی اس سالار سکندر سے ناواقف تھی۔ سالار نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سوچے ہوئے پپوٹوں کو اپنی پوروں سے چھوا۔

”کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنی آنکھوں کا...؟ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا؟“

وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب بے پُرسکون تھی۔ اس کے گرد اپنا ایک بازو جمائل کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے اور گردن پر آئے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اس نے پہلی بار نوٹس کیا کہ وہ رونے کے بعد زیادہ اچھی لگتی ہے لیکن اس سے یہ بات کہنا، اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ اس کے نائٹ ڈریس کی شرٹ پر بنے پیٹرن پر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”موو کلرا اچھا لگتا ہے تم پر۔“ اس نے بے حد رومانٹک انداز میں اس کے کپڑوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کے سینے پر حرکت کرتا اس کا ہاتھ ایک دم رکا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سالار نے اس کی آنکھوں خفگی دیکھی، وہ مسکرایا۔

”تعریف کر رہا ہوں تمہاری۔“

”یہ ٹی پنک ہے۔“

”اوہ! اچھا۔“ سالار نے گڑ بڑا کر اس کے کپڑوں کو دوبارہ دیکھا۔

”یہ ٹی پنک ہے؟ میں نے اصل میں موو کلر بہت عرصے سے کسی کو پہنے نہیں

دیکھا۔“ سالار نے وضاحت کی۔

”کل موو پہنا ہوا تھا میں نے۔“ امامہ کی آنکھوں کی خفگی بڑھی۔

”لیکن میں تو اسے پریل سمجھا تھا۔“ سالار مزید گڑ بڑایا۔

”وہ جو سامنے دیوار پر پینٹنگ ہے نا، اس میں ہیں پریل فلاورز۔“ امامہ کچھ تھمل کا

مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

سالار اس پینٹنگ کو گھورتے ہوئے اسے یہ نہیں بتا سکا کہ وہ ان فلاورز کو بلیو کلر کا کوئی

شیڈ سمجھ کر لایا تھا۔ امامہ اب اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سالار نے کچھ بے چارگی کے

انداز میں گہرا سانس لیا۔

”میرا خیال ہے، اس شادی کو کامیابی کرنے کے لیے مجھے اپنی جیب میں ایک شیڈ کارڈز

رکھنا پڑے گا۔“ وہ پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے بڑ بڑایا تھا۔



وہ پہلی صبح تھی جب اس کی آنکھ سالار سے پہلے کھلی تھی، الارم سیٹ ٹائم سے بھی دس منٹ پہلے۔ چند منٹ وہ اسی طرح بستر میں پڑی رہی۔ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ رات کا کون سا پہر ہے۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑا الارم کلاک اٹھا کر اس نے ٹائم دیکھا پھر ساتھ ہی الارم آف کر دیا۔ بڑی احتیاط سے وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھی۔ سائڈ ٹیبل کا لیمپ بڑی احتیاط سے آن کرتے ہوئے اس نے سلپرز ڈھونڈے، پھر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے سائڈ ٹیبل کا لیمپ آف کیا۔ تب اس نے سالار کی سائڈ کے لیمپ کو آن ہوتے دیکھا۔ وہ کس وقت بیدار ہوا تھا، امامہ کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔

”میں سمجھی تم سو رہے ہو۔“ اس نے سالار کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی اٹھا ہوں، کمرے میں آہٹ کی وجہ سے۔“

وہ اسی طرح لیٹے لیٹے اب اپنا سیل فون دیکھ رہا تھا۔

”لیکن میں نے تو کوئی آواز نہیں کی۔ میں تو کوشش کر رہی تھی کہ تم ڈسٹرب نہ ہو۔“

امامہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

”میری نیند زیادہ گہری نہیں ہے امامہ! کمرے میں ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی ہو تو میں

جاگ جاتا ہوں۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیل سائڈ ٹیبل پر رکھا۔

”میں آئندہ احتیاط کروں گی۔“ اس نے کچھ معذرت خوانہ انداز میں کہا۔

”ضرورت نہیں، مجھے عادت ہے اسی طرح کی نیند کی۔ مجھے اب فرق نہیں پڑتا۔“ اس

نے بیڈ پر پڑا ایک اور تکیہ اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واش

روم میں جانے سے پہلے چند لمحے اسے دکھتی رہی۔ ہر انسان ایک کتاب کی طرح ہوتا

ہے۔ کھلی کتاب جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ سالار بھی اس کے لیے ایک کھلی کتاب

تھا لیکن چائیز زبان میں لکھی ہوئی کتاب۔

اس دن اس نے اور سالار نے سحری اکٹھے کی اور ہر روز کی طرح سالار، فرقان کے

ساتھ نہیں گیا۔ وہ شاید پچھلے کچھ دنوں کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

امامہ کا موڈ رات کو ہی بہت اچھا ہو گیا تھا اور اس میں مزید بہتری اس کی اس ”توجہ“

نے کی۔

مسجد میں جانے سے پہلے آج پہلی بار اس نے اسے مطلع کیا۔

”امامہ! تم میرا انتظار مت کرنا۔ نماز پڑھ کر سو جانا، میں کافی لیٹ آؤں گا۔“

اس نے جاتے ہوئے اسے تاکید کی لیکن وہ اس کی تاکید کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

وہ ساڑھے آٹھ بجے اس کے آفس جانے کے بعد سوئی تھی۔ دوبارہ اس کی آنکھ گیارہ بجے ڈور بیل کی آواز پر کھلی۔ نیند میں اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے، اس نے بیڈروم سے باہر نکل کر اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ کھولا۔ چالیس، پینتالیس سالہ ایک عورت نے اسے بے حد پُر تجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”مجھے نوشین باجی نے بھیجا ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔

امامہ کو ایک دم یاد آیا کہ اس نے نوشین کو صفائی کے لیے ملازمہ کو کل کے بجائے اگلے دن بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسے راستہ دیتی ہوئی دروازے سے ہٹ گئی۔

”اتنی خوشی ہوئی جب نوشین باجی نے مجھے بتایا کہ سالار صاحب کی بیوی آگئی ہے۔“

مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب شادی کر لی سالار صاحب نے۔“ امامہ کے پیچھے اندر آتے ہوئے ملازمہ کی باتوں کا آغاز ہو گیا تھا۔

”کہاں سے صفائی شروع کرنی ہے تم نے؟“

”امامہ کی فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے صفائی کے بارے میں کیا ہدایات دے۔“

”بابی! آپ فکر نہ کریں۔ میں کر لوں گی، آپ چاہے آرام سے سو جاؤ۔“ ملازمہ نے اپنے فوری آفر کی۔ یہ شاید اس نے اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

”نہیں، تم لاؤنج سے صفائی شروع کرو، میں ابھی آتی ہوں۔“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

آفر بری نہیں تھی، اسے واقعی نیند آرہی تھی لیکن وہ... اس طرح اسے گھر میں کام کرتا چھوڑ کر سو نہیں سکتی تھی۔

واش روم میں آخر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، کپڑے تبدیل کر کے بال سمیٹے اور لاؤنج میں نکل آئی۔ ملازمہ ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ لاؤنج کی کھر کیوں کے بلاسٹڈ زاب ہٹے ہوئے تھے، سورج ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا لیکن اب ہند نہ ہونے کے برابر تھی۔ لاؤنج کی کھر کیوں سے باہر پودے دیکھ کر اسے انہیں پانی دینے

کا خیال آیا۔

ملازمہ ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے بالکلونی کی طرف جاتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔

جب وہ پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوئی تو ملازمی لاؤنج صاف کرنے کے بعد اب سالار کے اس کمرے میں جا چکی تھی جسے وہ اسٹڈی روم کی طرح استعمال کرتا تھا۔

”سالار صاحب بڑے اچھے آدمی انسان ہیں۔“

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے کے بعد امامہ نے اس سے چائے کا پوچھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ملازمہ نے ایک بار پھر اس سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امامہ اس کے تبصرے پر صرف مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

”آپ بھی ان کی طرح بولتی نہیں ہیں؟“ ملازمہ نے اس کے بارے میں اپنا پہلا اندازہ لگایا۔

”اچھا، سالار بھی نہیں بولتا۔“ امامہ نے جان بوجھ کر اسے موضوع گفتگو بنایا۔

”کہاں جی۔ حمید بھی یہی کہتا ہے صاحب کے بارے میں۔“

ملازمہ نے شاید سالار کے ملازم کا نام لیا تھا۔

”لیکن باجی! بڑی حیا ہے آپ کے آدمی کی آنکھ میں۔“

اس نے ملازمہ کے جملے پر جیسے بے حد حیرنا ہو کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ملازمہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔

”جیسے فرقان صاحب ہیں ویسی ہی عادت سالار صاحب کی ہے۔ فرقان صاحب تو خیر سے بال بچوں والے ہیں لیکن سالار صاحب تو اکیلے رہتے تھے ادھر۔ میں تو کبھی بھی اس طرح اکیلے مردوں والے گھروں میں صفائی نہ کروں۔ بڑی دنیا دیکھی ہے جی میں نے، لیکن یہاں کام کرتے ہوئے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا صاحب نے مجھے۔ میں کئی بار سوچتی تھی کہ بڑے ہی نصیب والی عورت ہوگی، جو اس گھر میں آئے گی۔“

ملازمہ فراٹے سے بول رہی تھی۔

ہیٹر کے سامنے صوفے پر نیم دراز زمامہ اس کی باتیں سنتی کسی سوچ میں گم رہی۔

ملازمہ کو حیرت ہوئی تھی کہ باجی اپنے شوہر کی تعریف پر خوش کیوں نہیں ہوئی۔

”باجی“ کیا خوش ہوتی، کم از کم اسے اتنی توقع تو تھی اس سے کہ وہ گھر میں کام کرنے

والی کسی عورت کے ساتھ بھی انوالو نہیں ہو سکتا۔ وہ مردوں کی کوئی بری ہی بدترین قسم ہوتی ہوگی، جو گھر میں کام کرنے والی م لازمہ پر بھی نظر رکھتے ہوں گے اور سالار کم از کم اس قسم کے مردوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔

ملازمہ اس کی مسلسل خاموشی سے کچھ بے زار ہو کر جلدی چائے پی کر فارغ ہو گئی۔ امامہ اس کے پیچھے دروازہ بند کرنے گئی تو ملازمہ نے باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر اس سے کہا۔

”باجی! کل ذرا جلدی آ جاؤں آپ کے گھر؟“

امامہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر یقیناً کوئی ایسا تاثر تھا جس نے ملازمہ کو کچھ بوکھلا دیا تھا۔

”باجی! مجھے چھوٹے بچے کو ہسپتال لے کر جانا ہے، اس لیے کہہ رہی تھی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ امامہ نے بہ مشکل جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ کل جلدی آنے کے مطالبے نے اسے ساکت نہیں کیا تھا بلکہ اسے ساکت کیا تھا

اس کے تین لفظوں نے... ”آپ کے گھر“ یہ ”اس کا گھر“ تھا جس کے لیے وہ اتنی سالوں سے خوار ہوتی پھر رہی تھی۔ جس کی آس میں وہ کتنی بار جلال انصر کے پیچھے گڑ گڑانے لگی تھی۔ وہ بے یقینی سے لاؤنج میں آکر ان دیواروں کو دیکھ رہی تھی جنہیں دنیا ”اس کے گھر“ کے نام سے شناخت کر رہی تھی، وہ واقعی اس کا گھر تھا۔ وہ پناہ گاہیں نہیں تھیں جہاں وہ اتنے سال سر جھکا کر ممنون و احسان مند بن کر رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا اس کی آنکھوں میں... بعض اوقات انسان سمجھ نہیں پاتا کہ وہ روئے یا ہنسے... روئے، تو کتنا روئے... ہنسے، تو کتنا ہنسے... وہ بھی کچھ ایسی ہی کسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح ہر کمرے کا دروازہ کھول کھول کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہی تھی۔ وہ جاسکتی تھی وہاں... جو چاہے کر سکتی تھی... یہ اس کا گھر تھا۔ یہاں کوئی جگہ اس کے لیے ”علاقہ غیر“ نہیں جتھی۔ اسے بس اتنی سی دنیا ہی چاہیے تھی اپنے لیے... کوئی ایسی جگہ جہاں وہ استحقاق کے ساتھ رہ سکتی ہو... سالار یک دم جیسے کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔ گھر کے معاملے میں عورت کے لیے ہر مرد پیچھے رہ جاتا ہے۔ سالار نے اسے دو بار وقفے وقفے سے سیل پر کال کی لیکن امامہ نے ریسیو نہیں کی... سالار نے تیسری بار پھر پی ٹی سی ایل پر کال کی، اس بار امامہ نے ریسیو کی لیکن اس کی

آواز سنتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ اسے اس کی آواز بھر آئی ہوئی لگی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“

وہ دوسری طرف جیسے اپنے آنسوؤں اور آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیوں رو رہی ہو؟“

سالار کی واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ رات ہر جھگڑے کا اختتام بے حد خوشگوار انداز میں ہوا تھا۔ وہ صبح دروازے تک مسکرا کر اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ پھر اب...؟ وہ الجھ رہا تھا۔

دوسری طرف امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے۔ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس لیے رو رہی ہے کہ کسی نے اسے ”گھر والی“ کہا ہے۔ سالار یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا... کوئی بھی مرد نہیں سمجھ سکتا۔

”مجھے امی اور ابو یاد آ رہے ہیں۔“ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

یہ وجہ سمجھ میں آتی تھی... وہ یک دم پر سکون ہوا۔ ادھر وہ بالکل خاموش تھی۔ ماں باپ کا ذکر کیا تھا، جھوٹ بولا تھا لیکن اب رونے کی جیسے ایک اور وجہ مل گئی تھی۔ جو آنسو پہلے تھم رہے تھے، وہ ایک بار پھر سے برسنے لگے تھے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ فون پر اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا۔

وہ اس غیر ملکی بینک میں انویسٹمنٹ بینکنگ کو ہیڈ کرتا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا انویسٹمنٹ scam پکڑ سکتا تھا، خسارے میں جاتی بڑی سے بڑی کمپنی کے لیے بیل آؤٹ پلان تیار کر سکتا تھا۔ کمپنیز کے مارجن سیکرٹیز تیار کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ پوائنٹ دن پر سنٹ کرپریسیشن کے ساتھ ورلڈ اسٹاک مارکیٹس کے ٹرینڈز کی پیش بینی کر سکتا تھا۔ مشکل سے مشکل سرمایہ کار کے ساتھ سودا طے کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا لیکن شادی کے اس ایک ہفتے کے دوران ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ امامہ کو روتے ہوئے چپ نہیں کر سکتا، نہ وہ ان آنسوؤں کی وجہ ڈھونڈ سکتا تھا، نہ انہیں روکنے کے طریقے اسے آتے تھے۔ وہ کم از کم اس میدان میں بالکل اناری تھا۔

”ملازمہ نے گھر صاف کیا تھا آج؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی توجہ رونے سے ہٹانے کے لیے جس موضوع اور جملے کا انتخاب کیا وہ احمقانہ تھا۔ امامہ کو

جیسے یقین نہیں آیا کلمہ یہ باتنے پر کہ اسے اپنے ماں باپ یاد آرہے ہیں، سالار نے اس سے یہ پوچھا ہے۔ پچھلی رات کے سالار کے سارے لیکچرز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے ریسپور کریڈل پر پٹک دیا اور فون منقطع ہوتے ہی سالار کو اپنے الفاظ کے غلط انتخاب کا احساس ہو گیا تھا۔ اپنے سیل کی تاریک اسکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

اگلے پانچ منٹ وہ سیل ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا اس نے اب کال کی تو وہ ریسپو نہیں کرے گی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے دوبارہ کال کی۔ خلاف توقع امامہ نے کال ریسپو کی۔ اس بار اس کی آواز میں خفگی تھی لیکن وہ بھرائی ہوئی نہیں تھی۔ وہ یقیناً رونا بند کر چکی تھی۔

”آئی ایم سوری!؟“ سالار نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

امامہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ اُس وقت اس کی معذرت نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی بات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی، اسے سالار پر غصہ کیوں آجاتا تھا...؟ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر... اتنے سالوں میں جس ایک احساس کو وہ مکمل طور پر بھول گئی تھی، وہ غصے کا احساس ہی تھا۔ یہ احساس اس کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ اتنے

سالوں سے اس نے اللہ کے علاوہ کسی سے بھی کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ کسی سے ناراض ہونا یا کسی کو خفگی دکھانا تو بہت دور کی بات ہے، پھر اب یہ احساس اس کے اندر کیوں جاگ اٹھا تھا۔ سعیدہ اماں، ڈاکٹر سبط علی اور ان کی فیملی... اس کے کلاس فیلوز... کو لیکرز... ان میں سے کبھی کسی پر اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ ہاں، کبھی کبھار شکایت ہوتی تھی لیکن وہ شکایت کبھی لفظوں کی شکل اختیار نہیں کر سکی، پھر اب کیا ہو رہا تھا اسے؟

”امامہ پلیز بولو... کچھ کہو۔“ وہ چونکی۔

”نماز کا وقت نکل رہا ہے، مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ اس نے اسی الجھے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔

”تم خفا نہیں ہو؟“ سالار نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ نماز کے بعد دیر تک اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈتی رہی اور اسے جواب مل گیا... نو سال میں اس نے پہلی بار اپنے لیے کسی کی زبان سے محبت کا اظہار سنا تھا۔ وہ احسان

کرنے والوں کے ہجوم میں تھی، پہلی بار کسی محبت کرنے والے کے حصار میں آئی تھی۔ گلہ، شکوہ، ناز، نخرا، غصہ، خفگی یہ سب کیسے نہ ہوتا، اسے ”پتا“ تھا کہ جب وہ روٹھے گی تو وہ اسے منالے گا، خفا ہوگی تو وہ اسے وضاحتیں دے گا، مان تھا یا گمان... لیکن جو کچھ بھی تھا، غلط نہیں تھا۔ اتنے سالوں میں جو کچھ اس کے اندر جمع ہو گیا تھا، وہ کسی لاوے کی طرح نکل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو رہی تھی۔

☆☆☆☆

شام کو سالار اسے خوش گوار موڈ میں دیکھ کر حیران ہوا
 شام کو سالار اسے خوش گوار موڈ میں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ یہ خلاف توقع تھا، خاص طور پر دوپہر والے واقعہ کے بعد... لیکن... اس رات وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا۔ وہ بے حد نروس تھی لیکن بے حد ایکسائیٹڈ بھی... وہ کتنے سالوں کے بعد یوں کسی ریسٹورنٹ کے اوپن ایئر حصہ میں بیٹھی باربی کیو کھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں ونڈوشاپنگ کی نیت سے مارکیٹ چلے آئے... سالار نے بڑی نرمی اور توجہ سے اسے خود کو سنبھلانے کا موقع دیا تھا۔ وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا کھانا ختم کرنے تک وہ نارمل ہو چکی تھی۔

عید کی خریداری کی وجہ سے مارکیٹ میں اس وقت بھی بڑی گہما گہمی تھی۔ وہ بہت عرصہ کے بعد وہاں آئی تھی، مارکیٹ کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ وہ بے حد حیرت سے ان نیو برانڈز اور دوکانوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی جو آٹھ نو سال پہلے وہاں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی کی سیٹیاں یا سعیدہ اماں کے بیٹے اپنی فیملیز کے ساتھ جب بھی آؤٹنگ کے لیے باہر نکلتے، وہ اسے بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے، لیکن ان کے ساتھ باہر نہ جانے کا فیصلہ اس کا اپنا ہوتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کے لیے مزید کسی مصیبت کا باعث تھا۔

NEW ERA MAGAZINE

سین بننا چاہتی تھی۔ شادی کو وہ صرف رہنے کی جگہ کی تبدیلی سمجھ رہی تھی، حالات کی تبدیلی کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا... لیکن معجزات ہوتے ہیں... شازو نادر سہی لیکن ہوتے ضرور ہیں۔

”کچھ لوگی؟“ سالار کی آواز پر وہ بے اختیار چونکی۔

”ہاں... کافی۔“ اس نے جھجک کر کہا۔

”میں شاپنگ کی بات کر رہا تھا۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، میرے پاس سب کچھ ہے۔“ امامہ نے مسکرا کر کہا۔

”وہ تو اب میرے پاس بھی ہے۔“ اس کے چہرے پر بے اختیار سرخی دوڑی تھی۔

”تمہیں میری تعریف اچھی لگی...؟“

”سالار! باز آؤ، میں نے تمہیں یہاں تعریف کرنے کو کہا تھا؟“ وہ بے ساختہ جھپینی۔

”تم نے جگہ نہیں بتائی تھی، صرف یہ کہا تھا کہ مجھے تمہاری تعریف کرنی چاہیے۔“ وہ

اسے چھیڑتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔

امامہ نے اس بار گردن موڑ کر اسے نظر انداز کیا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے ایک شوکیس

میں ڈسپلے پر لگی ایک ساڑھی دیکھ کر وہ بے ساختہ رکی۔ کچھ دیر ستائشی نظروں سے اسے

کا ہی رنگ کی ساڑھی کو دیکھتی رہی۔ وہاں شوکیس میں لگی یہی وہ شے تھی، جس کے

سامنے وہ یوں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ سالار نے ایک نظر اس ساڑھی کو دیکھا پھر اس

کے چہرے کو اور بڑی سہولت کے ساتھ کہا۔

مجھے لگتا ہے، یہ ساڑھی تم پر بہت اچھی لگے گی، آؤ لیتے ہیں۔“ وہ گلاس ڈور کھولتے

ہوئے بولا۔

”نہیں، میرے پاس بہت سے فینسی کپڑے ہیں۔“ امامہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے کر اسے روکا۔

”لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیا تمہیں شادی پر، اس لیے کچھ دینا چاہتا ہوں۔“

وہ اس بار بول نہیں سکی۔ وہ ساڑھی اسے واقعی بہت اچھی لگی تھی۔

اس بوتیک سے انہوں نے صرف وہ ساڑھی ہی نہیں خریدی بلکہ چند اور سوٹ بھی لیے تھے۔ دوسری بوتیک سے گھر میں پہننے کے لیے کچھ ریڈی میڈ ملبوسات، کچھ سویٹر

زاور جوتے۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”مجھے پتا ہے، تمہارے پاس کپڑے ہیں لیکن تم میرے خریدے ہوئے پہنو گی تو مجھے

زیادہ اچھالے گا۔ یہ سب میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا ہوں، تمہیں خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔“

اس کے پہلے اعتراض پر سالار نے بے حد رسائیت سے کہا تھا۔

امامہ نے اس کے بعد اعتراض نہیں کیا۔ اسے کچھ جھجک تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ

جھجک بھی ختم ہو گئی۔ پھر اس نے ساری چیزیں اپنی پسند سے لی تھیں۔

”مجھے تم پر ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ سو تم مجھ سے مت پوچھو۔“ اس نے سالار کی پسند پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”لاؤنج کی کھڑکیوں پر curtains لگالیں۔“ امامہ کو یاد آیا۔

”بلا سنڈ سے کیا ایشو ہے تمہیں؟“ وہ چونکا۔

”کوئی نہیں لیکن مجھے curtains اچھے لگتے ہیں۔ خوب صورت ہے۔“

”کیوں نہیں...“ سالار نے اپنی دلی تاثر چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اسے پردوں سے چڑ تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

رات پونے بارہ بجے ایک کیفے میں کافی اور tiramisu کھانے کے بعد وہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے گھر واپس آئے۔ لاہور تک ایک بار پھر دھند میں ڈوب چکا تھا لیکن زندگی کے راستے سے دھند چھٹنے لگی تھی۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ بے مقصدان چیزوں کو کھول کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کتنے سالوں بعد وہ ملنے والی کسی چیز کو تشکر اور احسان مندی کے بوجھ کے ساتھ نہیں بلکہ استحقاق کے احساس کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

عورت کے لیے بہت ساری نعمتوں میں سے ایک نعمت اس کے شوہر کا اس کی ذات پر پیسہ خرچ کرنا بھی ہے اور یہ نعمت کیوں تھا، وہ اسے آج سمجھ پائی تھی۔

ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی ہر سیزن کے آغاز میں اسے کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر دیتے تھے۔ سعیدہ اماں بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی تھیں۔ ان کے بیٹے اور ڈاکٹر سبط علی کی سیٹیاں بھی اسے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی تھیں لیکن ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے ایسی خوشی یا سکون محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ خیرات نہیں تھی لیکن وہ حق بھی نہیں تھا، وہ احسان تھا اور وہ اتنے سالوں میں بھی اپنے وجود کو احسانوں کا عادی نہیں بنا سکی تھی۔ بے شک وہ اس کی زندگی کا حصہ ضرور بن گئے تھے۔

یہ کیسا احساس تھا جو ان چیزوں کو گود میں لیے اسے ہو رہا تھا۔ خوشی؟ آزادی؟ اطمینان؟ سکون...؟ یا کوئی ایسی شے تھی جس کے لیے اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔

”کیا دیکھ رہی ہو تم؟“

سالار کپڑے تبدیل کروا کر روم سے نکال تھا اور ڈریسنگ روم کی لائٹ آف کر کے کمرے میں آٹے ہوئے اس نے امامہ کو اسی طرح صوفے پر وہ ساری چیزیں پھیلانے

بیٹھے دیکھا۔ وہ حیران سا ہوا۔ وہ جب سے آئی تھی، اس وقت سے ان چیزوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں میں بس رکھنے ہی لگی تھی۔“ امامہ نے ان چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

”ایک وارڈروب میں نے خالی کر دی ہے، تم اپنے کپڑے اس میں رکھ لو۔ اگر کچھ اور جگہ کی ضرورت ہو تو گیٹ روم کی ایک وارڈروب بھی خالی ہے... تم اسے استعمال کر سکتی ہو۔“

وہ اپنے کمرے سے کچھ ڈھونڈتا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”مجھے سعیدہ اماں کے گھر سے اپنا سامان لانا ہے۔“ امامہ نے ساری چیزوں کو دوبارہ ڈبوں اور بیگز میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیسا سامان؟“ وہ ابھی تک دراز میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

”میرے جہیز کا سامان۔“ امامہ نے بڑی رسائیت سے کہا۔

”مثلاً؟“ وہ دراز سے نکالے گئے کچھ پیپرزدیکھتے ہوئے چونکا۔

”برتن ہیں، الیکٹرونکس کی چیزیں ہیں۔ فرنیچر بھی ہے لیکن وہ شوروم پر ہے اور بھی

”کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔“

وہ ان پیپرز کو دراز میں رکھ کر اس کی بات سنتا رہا۔

”تمہارے ذاتی استعمال کی کوئی چیز ہے وہاں...؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ سب میری ذاتی چیزیں ہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”وہ جہیز کا سامان ہے۔“ سالار نے اسے جتانے والے انداز میں کہا۔

”اب تم کہو گے، تمہیں جہیز نہیں چاہیے۔“ وہ کچھ جزبز ہو کر بولی۔

”مجھے کسی بھی قسم کا سامان نہیں چاہیے۔“ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”تمہیں

لگتا ہے اس اپارٹمنٹ میں پہلے ہی کسی چیز کی کمی ہے...؟... تم چاہتی ہو، یہاں ہر چیز دو،

دو کی تعداد میں ہو۔ رکھیں گے کہاں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ امامہ سوچ میں پڑ گئی۔

”اتنے سالوں سے چیزیں میں خریدتی رہی ہوں اپنے لیے، لیکن زیادہ سامان ابو کے

پیسوں سے آیا ہے۔ وہ ناراض ہوں گے۔“ وہ اب بھی تیار نہیں تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تینوں بیٹیوں کو جہیز دیا؟“ وہ اب پوچھ رہا تھا۔ ”نہیں دینا؟“

”تمہیں کیسے پتا؟“ وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔

”انہوں نے ہمیں خود بتایا تھا۔“ اس نے کہا۔

”ان کی تینوں بیٹیوں کی شادیاں فیملی میں ہوئی ہیں اس لیے۔“ امامہ نے کہا۔

”ٹرسٹ می... میں بھی جہیز لے کر نہ آنے پر تم سے برا سلوک نہیں کروں گا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا تحفہ ہوتا تو میں ضرور رکھتا لیکن یہ انہوں نے تمہاری سیکورٹی کے لیے دیا تھا، کیوں کہ تمہاری شادی کسی ایسی فیملی میں ہو رہی تھی جن کے بارے میں وہ مکمل طور پر نہیں جانتے تھے لیکن میرے بارے میں تو وہ بھی جانتے ہیں اور تم بھی۔“ سالار نے اس سے کہا۔

”میرے برتن، بیڈ شیٹس اور کپڑے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کتنی چیزیں ہیں جو میں اتن سالوں سے جمع کر رہی ہوں۔ اب کیسے دے دوں یہ سب کچھ؟“ وہ ناخوش تھی۔

”اوکے، جو چیز تم نے اپنی پے سے لی ہے، وہ لے آؤ، باقی چھوڑ دو سب کچھ۔ وہ کسی خیراتی ادارے کو دے دیں گے۔“ سالار نے ایک اور حل نکالا۔ وہ اس بار کچھ سوچنے لگی۔

”میں صبح آفس جاتے ہوئے تمہیں سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دوں گا اور آفس سے

”آج ذرا جلدی آجاؤں گا۔ تمہاری پیکنگ بھی کروادوں گا۔“

وہ ہاتھ میں کچھ پیپرز لیے ہوئے اس کی طرف آیا۔ صوفے پر اس کے پاس پڑی چیزوں کو ایک طرف کرتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”یہ جس جگہ پر کر اس کا نشان ہے، اس پر اپنے سائن کر دو۔“

اس نے کچھ پیپرز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک پین اسے تھمایا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے کچھ حیران ہو کر ان پیپرز کو دیکھا۔

”میں اپنے بینک میں تمہارا اکاؤنٹ کھلو اور ہا ہوں۔“

”لیکن میرا اکاؤنٹ تو پہلے ہی کھلا ہوا ہے۔“

”چلو، ایک اکاؤنٹ میرے بینک میں بھی سہی۔ برے نہیں ہیں ہم، اچھی سروس

دیتے ہیں۔“ اس نے مذاق کیا۔ امامہ نے پیپرز پر سائن کرنا شروع کر دیا۔

”پھر وہ اکاؤنٹ بند کر دوں؟“ امامہ نے سائن کرنے کے بعد کہا۔

”نہیں، اسے رہنے دو۔“ سالار نے پیپرز اس سے لیتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کتنی رقم کاچیک دوں؟“

امامہ کا خیال تھا کہ وہ غیر ملکی بینک ہے۔ یقیناً اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ملکی بینک کی نسبت کچھ زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی۔

”تمہارا حق مہر پے کرنا ہے مجھے، اسی رقم سے کھول دوں گا۔“

سالار نے پیپر ز ایک لفافے میں رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”اس پر ایک فکر لکھو۔“

امامہ نے حیرانی سے اس پر رائٹنگ پیڈ کو دیکھا جو اس نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

”کیسی فکر؟“ وہ الجھی۔

”کوئی بھی فکر، اپنی مرضی کے کچھ... digits... سالار نے کہا۔

”کیوں؟“ وہ مزید الجھی۔

سالار نے اس کے ہاتھ میں پین تھمایا۔ اس نے دوبارہ پین پکڑ تو لیا لیکن ذہن مکمل طور پر خالی تھا۔

”کتنے digits کا فکر۔“ امامہ نے چند لمحے بعد اس کی مدد چاہی۔

”وہ یک دم سوچ میں پڑ گیا“ پھر اس نے کہا۔

”اگر تم اپنی مرضی سے کوئی فکر لکھو گی تو کتنے digits لکھو گی...؟“

”Seven digits...“ امامہ سوچ میں پڑ گئی۔

Alright... ”لکھو پھر۔“ سالار کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔

امامہ چند لمحے اس صاف کاغذ کو دیکھتی رہی پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔

3752960۔ اس نے رائٹنگ پیڈ سالار کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ پر نظر ڈالتے ہی وہ

چند لمحوں کے لیے جیسے سکتہ میں آیا پھر کاغذ کو پیڈ سے الگ کرتے ہوئے بے اختیار

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہنسا۔

”کیا ہوا؟“ وہ اس کے رد عمل سے کچھ اور الجھی۔

”کچھ نہیں... کیا ہونا تھا؟“ کاغذ کو تہہ کرتے ہوئے اس نے امامہ کے چہرے کو

مسکراتے ہوئے بے حد گہری لیکن عجیب نظروں سے دیکھا۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟“ وہ اس کی نظروں سے الجھی۔

”تمہارا شوہر ہوں، دیکھ سکتا ہوں تمہیں۔“

امامہ کو احساس نہیں ہوا، وہ بڑی صفائی سے بات بدل رہا تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں کاغذ پر اس لفافے میں ڈال چکا تھا۔

”تم نے مجھے ساڑھی پہن کر نہیں دکھائی؟“

”رات کے اس وقت میں تمہیں ساڑھی پہن کر دکھاؤں؟“ وہ بے اختیار ہنسی۔

وہ اس کے پاس سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔ وہ پہلی بار اس طرح کھلکھلا کر ہنسی تھی یا پھر شاید وہ اتنے قریب سے پہلی بار اسے ہنستے دیکھ رہا تھا۔ ایک بیگ کے اندر ڈبے رکھتے ہوئے امامہ نے اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ واقعی اسے دیکھ رہا تھا۔

”اب کیا ہے؟“

”میں ایک بات سوچ رہا تھا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”کیا؟“

”کہ تم صرف روتے ہوئے ہی نہیں ہنستے ہوئے بھی اچھی لگتی ہو۔“

اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت آئی، پھر چمک اور پھر خوشی۔ سالار نے ہر تاثر کو پہچانا تھا

یوں جیسے کسی نے اسے فلش کارڈ دکھائے ہوں... پھر اس نے اسے نظریں چراتے ہوئے دیکھا... پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا... پہلے اس کا کان کی لوئیں سرخ ہوئیں پھر اس کے گال، ناک... اور شاید اس کی گردن بھی... اس نے زندگی میں کبھی کسی عورت یا مرد کو اتنے واضح طور پر رنگ بدلتے نہیں دیکھا تھا جس طرح اسے... نو سال پہلے بھی دو تین بار اس نے اسے غصے میں اسی طرح سرخ ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے لیے عجیب سہی لیکن یہ منظر دل چسپ تھا... اور اب وہ اسے محض ہوتے ہوئے بھی اسی انداز میں سرخ ہوتے دیکھ رہا تھا، یہ منظر اس سے زیادہ دل چسپ تھا۔ ”یہ کسی بھی مرد کو پاگل کر سکتی ہے۔“ اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے اعتراف کیا، اس نے اپنی زندگی میں آنے والی کسی عورت کو اتنے ”بے ضرر“ جملے پر اتنا شرماتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اس کو شکایت تھی کہ وہ اس کی تعریف نہیں کرتا۔ سالار کا دل چاہا، وہ اسے کچھ اور چھیڑے۔ وہ بہ ظاہر بے حد سنجیدگی سے اسے نظر انداز کیے ہوئے چیزیں بیگ میں ڈال رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ اس کی نظروں سے یقیناً کنفیوز ہو رہی تھی۔

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں گھر میں لانے کے بعد آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ

آپ انہیں کہاں رکھیں، کیوں کہ آپ انہیں جہاں بھی رکھتے ہیں، اس چیز کے سامنے وہ جگہ بے حد بے مایہ سی لگتی ہے۔ کچھ چیزیں جیسی ہوتی ہیں، جنہیں گھر میں لانے کے بعد انہیں جہاں بھی رکھیں، وہی جگہ سب سے انمول اور قیمتی ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، امامہ اس کے لیے ان چیزوں میں سے کون سی چیز تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھتا وہ کچھ بے اختیار ہو کر اس کی طرف جھکا اور اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کے دائیں گال کو چھوا، وہ کچھ حیا سے سمٹی۔ اس نے اسی نرمی کے ساتھ اس کا دایاں کندھا چوما اور پھر امامہ نے اسے ایک گہرا سانس لے کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی، سالار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ ان پیپر ز کو اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ رہا تھا۔ پلٹ کر دیکھتا تو شاید امامہ کی نظریں اسے حیران کر دیتیں۔ اس نے پہلی بار اس کے کندھے کو چوما تھا اور اس لمس میں محبت نہیں تھی... ”احترام“ تھا... اور کیوں تھا، یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔

☆☆☆☆

وہ اگلے دن تقریباً دس بجے سعیدہ اماں کے گھر آئے۔ امامہ کا مسکراتا، مطمئن چہرہ دیکھ کر فوری رد عمل یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف سالار کے سلام کا جواب دیا بلکہ اس کے

سر پر پیار دیتے ہوئے اس کا ماتھا بھی چوما۔

”یہ سب لے کر جانا ہے۔“ وہ اسے اپنے کمرے میں لائی تھی وہاں کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور ان میں تقریباً تین چار سو کتابیں تھیں۔

”یہ بکس؟“ سالار نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

”نہیں، یہ ایزل، کینوس اور پینٹنگ کا سامان بھی۔“ امامہ نے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پڑے پینٹنگ کے سامان اور کچھ ادھوری پینٹنگز کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ سب کچھ زیادہ نہیں ہے، بکس ہی تقریباً دو کارٹن میں آئیں گی۔“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار نے ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

”نہیں، یہ اتنی ہی بکس نہیں ہیں اور بھی ہیں۔“ امامہ نے کہا۔

اس نے اپنا دوپٹا اتار کر بیڈ پر رکھ دیا اور پھر گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے بیڈ

کے نیچے سے ایک کلرٹن کھینچنا شروع کیا۔

”ٹھہرو! میں نکالتا ہوں۔“ سالار نے اسے روکا اور خود جھک کر اس کارٹن کو کھینچنے لگا۔

”بیڈ کے نیچے جتنے بھی ڈبے ہیں، وہ سارے نکال لو۔ ان سب میں بکس ہیں۔“ امامہ

نے اسے ہدایت دی۔

سالار نے جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں مختلف سائز کے کم از کم سات آٹھ ڈبے موجود تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک ڈبا نکالتا گیا۔

”بس...؟“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔

وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کمرے میں موجود کپڑوں کی الماری کے اوپر ایک اسٹول پر چڑھی کچھ ڈبے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سالار نے ایک بار پھر اسے ہٹا کر خود وہ ڈبے نیچے اتارے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کتابوں کی آخری کھیپ ہے کیوں کہ کمرے میں اسے ڈبا رکھنے کی کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی، یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ اب الماری کو کھولے اس کے اندر موجود جاک خانے سے کتابیں نکال کر بیڈ پر رکھ رہی تھی۔ وہ کم از کم سو کتابیں تھیں جو اس نے الماری سے نکالی تھی، وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ الماری کے بعد بیڈ سائیڈ ٹیبلز کی درازوں کی باری تھی، ان میں بھی کتابیں تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبلز کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں اور خانوں کی باری تھی۔ کمرے میں موجود کپڑے کی جس باسکٹ کو وہ لانڈری باسکٹ سمجھتا تھا، وہ بھی کتابیں اسٹور کرنے کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا، اسے کمرے کی مختلف جگہوں سے کتابیں برآمد کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیڈ پر موجود کتابوں کا ڈھیر اب شیلف پر لگی کتابوں سے بھی زیادہ ہو چکا تھا لیکن وہ اب بھی بڑی شد و مد کے ساتھ کمرے کی مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی کتابیں نکال رہی تھی۔ اس نے ان کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جو صحن میں کھلتی تھیں۔ اس کے بعد سالار نے اسے باری باری ساری کھڑکیاں کھول کر ان میں سے بھی کتابیں نکالتے ہوئے دیکھا۔ جو پلاسٹک کے شاپرزمین بند تھیں۔ شاید یہ احتیاط کتابوں کو مٹی اور نمی سے بچانے کے لیے کی گئی تھی۔

”بس اتنی ہی کتابیں ہیں۔“ اس نے بالآخر سالار کو مطلع کیا۔

سالار نے کمرے میں چاروں طرف بکھرے ڈبوں اور ڈبل بیڈ پر پڑی کتابوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا۔

”کوئی اور سامان بھی ہے...؟“

”ہاں! میرے کچھ کینوس اور پینٹنگز بھی ہیں، میں لے کر آتی ہوں۔“

وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

سالار نے ڈبل بیڈ پر پڑی کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی ۱ وہ ایک ناول تھا۔ گھٹیا رومانس لکھنے والے ایک بہت ہی مشہور امریکن رائٹر کا ناول... اس نے ٹائٹل پر نظر ڈالی اور بے اختیار اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اگر وہ ناول کا نام امامہ کے سامنے لیتا تو وہ سرخ ہو جاتی۔ اس نے ناول کھولا۔ کتاب کے اندر پہلے ہی خالی صفحے پر امامہ نے اپنا نام لکھا تھا۔ جس تاریخ کو وہ کتاب خریدی گئی، وہ تاریخ... جس جگہ سے خریدی گئی وہ جگہ... جس تاریخ کو کتاب پڑھنا شروع کیا اور جس تاریخ کو کتاب ختم کی۔ وہ حیران ہوا، اس طرح کے ناول کو وہ فضول سمجھتا تھا۔ وہ شاید یہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس رائٹر کے کسی ناول کو کوئی اس کے ہاتھ میں دیکھا مگر اس نے اس ناول پر اتنی سنجیدگی سے اپنا نام اور ڈیٹس لکھی ہوئی تھیں جیسے وہ بے حد اہم کتاب ہو۔ اس نے ناول کے چند اور صفحے پلٹے اور پھر کچھ بے یقینی کے عالم میں پلٹتا ہی چلا گیا۔ ناول کے اندر جگہ جگہ رنگین مارکرز کے ساتھ مختلف لائسنز ہائی لائٹ کی گئی تھیں۔ بعض لائسنز کے سامنے اسٹار اور بعض کے سامنے ڈبل اسٹار بنائے گئے تھے۔

وہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

ان لائسنز میں بے ہودہ رومانس، بے حد platonic، سوپی باتیں، ذومعنی ڈائلاگز

تھے۔ ان پر اسٹار بنے ہوئے تھے اور وہ نشان زدہ تھے۔

سالار نے وہ ناول رکھتے ہوئے دوسرا ناول اٹھایا... پھر تیسرا... پھر چوتھا... پانچواں...
چھٹا... ساتواں... وہ سب کے سب رومانٹک تھے۔ ایک ہی طرح کے رومانٹک ناولز اور
وہ سب بھی اسی طرح ہائی لائیٹڈ تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار رومانٹک اور وہ بھی ملز اینڈ
بونز اور باربرا کارٹ لینڈ کی ٹائپ کے رومانس کے اتنے ”سنجیدہ قاری“ سے مل رہا تھا
اور کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھتے ہوئے اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ ”کتابیں“ نہیں
پڑھتی تھی بلکہ صرف یہی ناولز پڑھتی تھی۔ کمرے میں موجود ان ڈیڑھ دو ہزار کتابوں
میں اسے صرف چند پینٹنگز، ککری اور شاعری کی کتابیں نظر آئی تھیں، باقی سب
انگلش ناولز تھے۔

”اور یہ لے کر جانی ہیں۔“ ایک ناول دیکھتے ہوئے وہ امامہ کی آواز پر بے اختیار چونکا۔
وہ کمرے میں دو تین چکروں کے دوران کچھ مکمل اور کچھ ادھوری پینٹنگز کا ایک چھوٹا
ساڈھیر بھی بنا چکتی تھی۔ سالار اس دوران ان کتابوں کے جائزے میں مصروف رہا
تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ناول واپس کتابوں کے اس ڈھیر پر رکھ دیا جو بیڈ پر پڑا تھا۔
کارپٹ پر پڑی ان پینٹنگز پر نظر ڈالتے ہوئے سالار کو احساس ہوا کہ سعیدہ اماں کے گھر

میں جا بجا لگی ہوئی پینٹنگز بھی اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں اور یقیناً ان پینٹنگز کے کسی دیوار پر لٹکانہ ہونے کا سبب مزید خالی جگہ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔

”بیٹا! یہ سارا کاٹھ کباڑ کیوں اکٹھا کر لیا، یہ لے کر جاؤ گی ساتھ؟“

سعیدہ اماں کمرے میں آتے ہی کمرے کی حالت دیکھ کر چونکیں۔

”اماں! یہ ضروری چیزیں ہیں میری۔“

امامہ، سالار کے سامنے اس سامان کو کاٹھ کباڑ قرار دیے جانے پر کچھ جزبہ ہوئی۔

”کیا ضروری ہے ان میں، یہ کتابیں تو ردی میں دے دیتیں۔ اتنا ڈھیر لگا لیا ہے اور

تصویریں وہیں رہنے دیں، جہاں پڑی تھیں۔ چھوٹا سا گھر ہے تم لوگوں کا، وہاں کہاں

پورا آئے گا یہ سب کچھ۔“ سعیدہ اماں کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر متوحش ہو رہی

تھیں۔ یقیناً انہوں نے بھی امامہ کی ساری کتابوں کو پہلی بار اکٹھا دیکھا تھا اور یہ ان کے

لئے کوئی خوش گوار نظارہ نہیں تھا۔

”نہیں، آجائے گا پورا، یہ سب کچھ۔ تین بیڈرومز ہیں، ان میں سے ایک کو استعمال

کریں گے۔ یہ سامان رکھنے کے لیے، لیکن دوسری چیزوں کو یہیں رکھنا پڑے گا۔

کمبل، کونٹس، رگزاورکشنز وغیرہ کو۔ ”وہ ایک سیکنڈ میں تیار ہو گئی تھی۔

”لیکن بیٹا! یہ سارا سامان تو کام کا ہے۔ گھر سجانا اس سے... یہ کتابوں کے ڈھیر اور تصویروں کا کیا کرو گی تم؟“ سعیدہ اماں اب بھی معترض تھیں۔

”کوئی بات نہیں، ان کی کتابیں ضروری ہیں۔ ابھی کچھ اور کارٹن یا شاپرز ہیں جنہیں پیک کرنا ہے۔“ سالار نے اپنے سویٹر کی آستینوں کو موڑتے ہوئے آخری جملہ امامہ سے کہا۔

تین بجے کے قریب وہ سارا سامان کے گھر پر گیسٹ روم میں بکھرا ہوا تھا۔ فرقان نے اس دن بھی انہیں افطاری کے لیے اپنی طرف مدعو کیا ہوا تھا لیکن سالار نے معذرت کر لی۔ فی الحال اس سامان کو ٹھکانے لگانا زیادہ اہم تھا۔

ایک اسٹور میں سالار نے کچھ عرصے پہلے ایلو مینیم اور شیشے کے ریکس والی کچھ الماریاں دیکھی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہاں لگایا ہوا چکر بے کار نہیں گیا۔ چھ فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی ایک ہی طرح کی تین الماریوں نے گیسٹ روم کی ایک پوری دیوار کو کور کر کے یک دم اسے اسٹڈی روم کی شکل دے دی تھی لیکن امامہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ان تین الماریوں میں اس کی تقریباً ساری کتابیں سما گئی تھیں۔ ان

کتابوں کو اتنے سالوں میں پہلی بار کوئی ڈھنگ کی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ اس کے ایزیل اور ریکس، لانڈری کی دیوار پر بنی ریکس پر سمیٹے گئے تھے۔

وہ جہیز کے سامان میں برتنوں اور بیڈ شیٹس کے علاوہ اور کچھ نہیں لائی تھی، تب اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی قسمت میں اس سامان میں سے صرف ان ہی دو چیزوں کا استعمال لکھا تھا۔

سالار کا چکن ایریا اب پہلی بار ایک آباد جگہ کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ برتنوں کے لیے بنے ریکس کے شیشوں سے نظر آتی نئی کراکری اور کاؤنٹر کی سلیب پر چکن کے استعمال کی چھوٹی موٹی نئی چیزوں نے چکن کی شکل کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔

وہ لوگ رات کے دس بجے جب فارغ ہوئے تو اپارٹمنٹ میں آنے والا نیا سامان سمیٹا جا چکا تھا۔ اس کے لیے فرقان کے گھر سے کھانا آیا تھا لیکن اس رات امامہ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ نئی کراکری سرو کیا تھا۔

”اچھا لگ رہا ہے نا ایسے؟“ امامہ نے چمکتی آنکھوں کے ساہ اس سے پوچھا۔ سالار نے اپنے سامنے موجود نئی برانڈڈ نرپلیٹ اور اس کے اطراف میں لگی چمکتی ہوئی کٹلری کو دیکھا اور پھر کانٹا اٹھا کر اسے بغور دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں، ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم کسی ریستورنٹ کی اوپننگ والے دن سب سے پہلے اور اکلوتے کسٹمر ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے امامہ! کہ یہ کراکری اور کٹلری اتنی نئی ہے کہ اس میں کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا... میں پرانے برتنوں میں نہیں کھا سکتا...؟“

امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔ کم از کم یہ وہ جملہ نہیں تھا جو وہ اس موقع پر اس سے سننا چاہتی تھی۔

”لیکن یہ بہت خوب صورت ہیں۔“ سالار نے فوراً اپنی غلطی کی تصحیح کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فی الحال وہ مذاق کو سراہنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ امامہ کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے سالار نے کہا۔ ”کھانے کے بعد کہیں کافی پینے چلیں گے۔“ اس بار اس کے چہرے پر کچھ نرمی آئی۔

”کچن کا سامان لینا ہے۔“ اس نے فوراً کہا۔

وہ چاول کا چمچ منہ میں ڈالتے رک گیا۔ ”ابھی بھی کوئی سامان لینا باقی ہے؟“ وہ حیران ہوا۔

”گروسری چاہیے۔“

”کیسی گروسری...؟ کچن میں سب کچھ تو ہے۔“

”آٹا، چاول، دالیں، مسالے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔“ امامہ نے جو ابابو چھا۔

”ان کو میں نے کیا کرنا ہے؟ میں نے کبھی کھانا نہیں پکایا۔“ سالار نے کندھے اچکا کر

لاپروائی سے کہا۔

”لیکن میں تو پکاؤں گی نا... ہمیشہ تو دوسروں کے گھر سے نہیں کھا سکتے ہم۔“ امامہ نے

سنجیدگی سے کہا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”جارزا اور کنٹینرز بھی چاہیں۔“ امامہ کو یاد آیا۔

”فی الحال آج میرا اس طرح کی خریداری کرنے کا موڈ نہیں ہے... مجھے تھکن محسوس ہو

رہی ہے۔“ سالار کراہا۔

”اچھا، ٹھیک ہے، کل خرید لیں گے۔“ امامہ نے کہا۔

اس رات وہ کافی کے لیے قریبی مارکیٹ تک ہی گئے تھے۔ گاڑی فورٹریس کے گرد

گھماتے ہوئے انہوں نے وہی گاڑی میں بیٹھے ہوئے کافی پی۔

”شکر ہے، کتابوں کو تو جگہ مل گئی۔“

سالار کافی پیتے ہوئے چونکا۔ وہ کھڑکی سے باہر دور شاپس کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ اس کے لاشعور میں اب بھی کہیں وہ کتابیں ہی اٹکی ہوئی تھیں۔

”وہ کتابیں نہیں ہے۔“ سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

کافی کا گھونٹ بھرتے اس نے چونک کر سالار کو دیکھا۔

”پچانوے فیصد ناولز ہیں... وہ بھی چیپ رومانس... پانچ دس میں سمجھ سکتا ہوں... چلو اتنے سالوں میں سو دو سو بھی ہو سکتے ہیں... لیکن ڈیڑھ دو ہزار اس طرح کے ناولز...؟ تمہارا کتنا stamina ہے اس طرح کی ریش پڑھنے کے لیے اور تم نے باقاعدہ مارک کر کے پڑھا ہے ان ناولز کو۔ میرا خیال ہے، پاکستان میں چیپ رومانس کی سب سے بڑی کلکیشن اس وقت میرے گھر میں ہے۔“

وہ خاموش رہی۔ کافی پیتے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

سالار کچھ دیر اس کی طرف سے کسی ردِ عمل کا انتظار کرتا رہا، پھر اس کی لمبی خاموشی پر اسے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ برانہ مان گئی ہو۔ اپان بایاں بازو اس کے کندھوں پر پھیلاتے

ہوئے اس نے جیسے خاموش معذرت پیش کی۔

”ٹھیک ہے، چیپ رومانس ہے، لیکن اچھا لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ دیر بولی۔

”وہاں لوگ ہمیشہ مل جاتے ہیں... کوئی کسی سے بچھڑتا نہیں ہے... میرے لیے ونڈر لینڈ ہے یہ۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جیسے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا اور اسے سنتا رہا۔

”جب اپنی زندگی میں کچھ بھی اچھا نہ ہو رہا ہو تو کسی ایسی دنیا میں جانا اچھا لگتا ہے، جہاں سب کچھ پرفیکٹ ہو۔ وہاں وہ کچھ ہو رہا ہو، جو آپ چاہتے ہیں... وہ مل رہا ہو، جو آپ سوچتے ہیں... جھوٹ ہے یہ سب کچھ لیکن کوئی بات نہیں، اس سے میری زندگی کی کڑواہٹ تھوری کم ہوتی تھی... جب میں جاب نہیں کرتی تھی تب زیادہ پڑھتی تھی ناولز۔ کبھی کبھار، سارا دن اور ساری رات... جب میں یہ ناولز پڑھتی تھی تو مجھے کوئی بھی یاد نہیں آتا تھا۔ امی ابو، بہن بھائی، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں... کوئی نہیں... ورنہ بہت مشکل تھا سارا دن یا رات کو سونے سے پہلے اپنی فیملی کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا، اپنی زندگی کے علاوہ کسی اور کے بارے میں پریشان ہونا، میں

خوف ناک خواب دیکھتی تھی اور پھر میں نے ان ناولز کے ذریعے خوابوں کی ایک دنیا بسالی۔ میں ناول کھولتی تھی اور یک دم زندگی بدل جاتی تھی۔ میری فیملی ہوتی تھی اس میں... میں ہوتی تھی... جلال ہوتا تھا۔”

سالار کافی کا گھونٹ نہیں لے سکا۔ اس کے لبوں پر اس وقت اس ”شخص“ کا نام سن کر کتنی اذیت ہوئی تھی اسے... نہیں، اذیت بہت ہی چھوٹا سا لفظ ہے۔ ایسی تکلیف انسان کو شاید مرتے وقت ہوتی ہوگی۔ ہاں، اگر یہ ناولز اس کی ”مکمل دنیا“ اور اس کا ونڈر لینڈ تھے تو اس میں جلال انصر ہی ہوتا ہوگا، سالار سکندر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مذہباً اور قانوناً ایک رشتے میں بندھی تھی، دل کے رشتے میں کہاں بندھی تھی۔ دل کے رشتے میں تو شاید ابھی تک... اور وہ تو ماضی تھا جہاں جلال انصر کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ رنجیدگی سے سوچ رہا تھا اور امامہ کو بولتے ہوئے شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے جلال کا نام لیا اور کسی پیرائے میں لیا تھا، احساس ہوتا تو وہ ضرور اٹکتی یا کم از کم ایک بار سالار کے چہرہ ضرور دیکھ لیتی۔ وہ ابھی بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ابھی بھی کہیں ”اور“ تھی۔ ابھی بھی ”کسی“ کا صبر آزما رہی تھی۔

”اچھا لگتا تھا مجھے اس دنیا میں رہنا۔ وہاں اُمید تھی... روشنی تھی... انتظار تھا لیکن لا حاصل نہیں، تکلفی تھی مگر ابدی نہیں، آنسو تھے مگر کوئی پونچھ دیتا تھا اور واہد کتابیں تھیں جن میں امامہ ہاشم ہوتی تھی، آمنہ نہیں۔ ہر بار ان کتابوں پر اپنا نام لکھتے ہوئے میں جیسے خود کو یاد دلاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ دوبارہ کتاب کھلونے پر جیسے کتاب مجھے بتاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ وہ مجھے میرے پرانے نام سے بلاتی تھی۔ اس نام سے، جس سے اتنے سالوں میں مجھے کوئی اور نہیں بلاتا تھا۔ تاریکی میں بعض دفعہ اتنی روشنی بھی بہت ہوتی ہے جس سے انسان بے شک اپنے آپ کو نہ دیکھ پائے لیکن اپنا وجود محسوس کرنے کے تو قابل ہو جائے۔“

اس کی آوازاں بھینگنے لگی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دونوں کے ہاتھ میں پکڑے کیوں میں کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور وہ اسے اب پینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو پیپر نکال کر اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ لے لیا۔ ایک ڈمپسٹر میں دونوں کپ پھینکنے کے بعد وہ دوبارہ گاڑی میں آکر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے امامہ سے پوچھا۔

”اور کافی چاہیے تمہیں؟“

”نہیں۔“ واپسی کا راستہ غیر معمولی خاموشی میں طے ہوا تھا۔

☆☆☆☆

”مجھے آفس کا کچھ کام ہے تم سو جاؤ۔“ وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے بجائے کمرے سے نکل گیا۔

”میں انتظار کروں گی۔“ امامہ نے اس سے کہا۔

”نہیں، مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔“ اس نے امامہ کے ہاتھ میں پکڑے ناول کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا جو وہ رات کو پڑھنے کے لیے لے کر آئی تھی۔

اسے واقعی آفس کے کچھ کام نمٹانے تھے، مگر اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ آخری کام جو وہ آج کرنا چاہتا تھا، وہ یہ تھا۔ کچھ دیر وہ لیپ ٹاپ آن کیے اپنی ٹیبل پر

بیٹھا رہا، پھر یک دم اٹھ کر گیسٹ روم میں آ گیا۔ لائٹ آن کرتے ہی کتابوں سے

بھری ہوئی سامنے دیوار کے ساتھ لگی الماریاں اس کی نظروں کے سامنے آ گئیں۔ اس

نے کتابوں کو وہاں کچھ گھنٹے پہلے ہی رکھا تھا، بڑی احتیاط اور نفاست کے ساتھ۔ مصنف

کے نام کے اعتبار سے ان کی مختلف ریکس پر گروپنگ کی تھی... تب تک وہ اس کے لیے صرف ”امامہ کی کتابیں“ تھیں لیکن اب وہ ان تمام کتابوں کو اٹھا کر بحیرہ عرب میں ڈبو دینا چاہتا تھا یا کم از کم راوی میں تو پھینک ہی سکتا تھا۔ وہ اب کتابیں نہیں رڈی تھی۔ امامہ کی وہ تصوراتی پرفیکٹ زندگی جو وہ جلال انصر کے ساتھ گزارتی رہی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو ہزار رومانس ان کرداروں کے رومانس نہیں تھے جو ان ناو لزمیں تھے۔ وہ صرف دو کرداروں کا رومانس تھا۔ امامہ اور جلال کا... اعلیٰ ظرف بننے کے لیے کھلے دل یا برداشت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دماغ کا کام نہ کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ وہ بھی اس کا شوہر تھا۔ وہ ان کتابوں کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی... روتی دھوتی، ناراض ہوتی لیکن اتنی باختیار نہیں تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر ان کتابوں کو وہاں رکھ سکتی۔ وہ عورت تھی۔ ضد کر سکتی تھی، منوا نہیں سکتی تھی۔ وہ مرد تھا اسے اپنی مرضی کے لیے ضد جیسے کسی حربے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا گھر تھا، یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ شرائط کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا نہ ہی ایسے جی سکتا ہے۔ وہ مراعات کے ساتھ دنیا میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ دنیا میں رہتا ہے۔

تو آسان حل یہ تھا جو اسے معاشرہ اور اس کا ذہن بتا رہا تھا۔ مشکل حل وہ تھا جو اس کا دل

اس سے کہہ رہا تھا اور دل کہہ رہا تھا۔ ”چھوڑو، جانے دو یار! یہ زہر کا گھونٹ ہے لیکن پی جاؤ۔“ اور دل نہ بھی کہتا تب بھی وہ اس چیز کو اپنے گھر سے نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا، جو امامہ کی ملکیت تھی۔ جو کبھی اس کے دکھوں کے لیے مرہم بنی تھی۔ ان کتابوں کے کرداروں میں وہ جس کسی کو بھی سوچتی رہی تھی لیکن ان کتابوں پر لکھا ہوا نام اس کا اپنا تھا اور یہ وہ نام تھا جو اس کی روح کا حصہ تھا۔ صبر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور کوئی بھی قسم آسان نہیں ہوتی، وہاں کھڑے اس نے سوچا اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ رمضان میں کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسٹڈی روم میں واپس آ کر اس نے سگریٹ سلگایا تھا۔ اس وقت خود کو نارمل کرنے کے لیے یہی واحد حل اس کی سمجھ میں آیا۔ ایک سگریٹ پینے کی نیت سے بیٹھے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنے سگریٹ پی چکا ہے۔

”سالار...!“ امامہ کی آواز پر وہ رانگ چیر پر بیٹھے بیٹھے چونکا۔ غیر محسوس انداز میں بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں مسلا۔ وہ دروازے میں ہی کھڑکی تھی اور یقیناً اس کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ چکی تھی۔ نہ بھی دیکھتی تب بھی کمرے میں

پھیلی سگریٹ کی بو اسے بتا دیتی۔

”تم اسموکنگ کرتے ہو؟“ وہ جیسے کچھ پریشان اور شاکڈ انداز میں آگے بڑھی۔

”نہیں“ بس کبھی کبھار۔ جب اپ سیٹ ہوتا ہوں تو ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں۔“

کہتے ہوئے سالار کی نظر ایش ٹرے پر پڑی۔ وہ سگریٹ سے ٹکڑوں سے بھری ہوئی

تھی۔ ”آج کچھ زیادہ ہی پی گیا۔“

وہ بڑبڑایا پھر اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا اور اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”تم سوئیں نہیں ابھی تک؟“

”تم میری وجہ سے اپ سیٹ ہو؟“ اس نے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے

پوچھا۔

تو اس نے محسوس کر لیا؟ سالار کا اس کا چہرہ دیکھا اور سوچا۔ اس کی آنکھوں میں ایک

عجیب سا خوف اور اضطراب تھا۔ وہ نائٹی میں ملبوس اونی شال اپنے گرد لپیٹے ہوئے

تھی۔ سالار جواب دینے کے بجائے راکنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا

رہا۔ اس نے کرسی کو ہلانا بند کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی نے جیسے اس کے اضطراب میں اور اضافہ کیا۔

”تمہاری فیملی نے کچھ کہا ہے...؟... یا میری فیملی نے کچھ کیا ہے؟“

وہ کیا سوچ رہی تھی؟ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا... کاش ”یہ“ وجہ ہوتی ”وہ“ نہ ہوتی، جو تھی۔

”کیا کہے گی میری فیملی...؟ یا کیا کرے گی تمہاری فیملی...؟“ اس نے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ اسی طرح اب بھی ہوئی یوں چپ کھڑی رہی جیسے اسے خود بھی اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن وہ خاموش اسے دیکھتی رہی، یوں جیسے اسے یقین ہو کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کیسے کیسے خدشات ذہن میں لیے بیٹھی ہے۔

وہ رانگ چیئر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت امامہ پر جیسے ترس آیا تھا۔

”یہاں آؤ!“ اس نے سیدھے ہوئے ہوئے اس کا بایاں ہاتھ پکڑا۔ وہ جھجکی، ٹھٹکی پھر

اس کی آغوش میں آگئی۔ سالار نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اس کی شمال کے اندر

کرتے ہوئے، اس کی شمال کو اس کے گرد اور اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے، کسی ننھے

بچے کی طرح اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے تھپکا اور اس کا سر چوما۔

”کوئی کچھ نہیں کہہ رہا... اور کوئی کچھ نہیں کر رہا... ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہے اور اگر کچھ ہوگا تو میں دیکھ لوں گا سب کچھ۔ تم اب ان چیزوں کے بارے میں پریشان ہوتا چھوڑ دو۔“

وہ اسے گود میں لیے، اب دوبارہ رانگ چیئر پر جھول رہا تھا۔

پھر تم اپ سیٹ کیوں ہو؟“

”میں...؟... میرے اپنے بہت سے مسئلے ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے گردن اوپر کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اتنے دنوں میں وہ پہلی بار اسے اتنا سنجیدہ لگا تھا۔

”سالار! تم...“

”میں پریشان نہیں ہوں اور اگر ہوں بھی تو تم اس کی وجہ نہیں ہو۔ اب دوبارہ مجھ سے

یہ سوال مت کرنا۔“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے کچھ سخت لہجے میں جھڑکنے والے انداز میں

اس کی بات کاٹ کر سوال سے پہلے جواب دیا۔ وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا اور سالار کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔

”تم کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے کہ کچن کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے...؟“ اس نے اس بار بے حد نرمی کے ساتھ موضوع بدلا۔

امامہ نے ایک بار پھر اسے ان چیزوں کے نام بتائے۔

”کل چلیں گے رات کو گروسری کے لیے۔“

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ اس کے سینے پر سر رکھے، وہ دیوار پر اس سو فٹ بورڈ پر لکھے بہت سے نوٹس، ڈیڈ لائنز اور کچھ عجیب سے انڈیکسز والے چارٹس دیکھتی رہی، پھر اس نے سالار سے پوچھا۔

”تم بینک میں کیا کرتے ہو؟“

وہ ایک لمحہ کے لیے چونکا، پھر اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بورڈ پر نظر ڈالی۔

”میں بے کار کام کرتا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”مجھے بینکرز بھی اچھے نہیں لگے۔“ امامہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے غلط وقت پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

”جانتا ہوں، تمہیں ڈاکٹر ز اچھے لگتے ہیں۔“ سالار کے لہجے میں خنکی آئی تھی۔

”ہاں، مجھے ڈاکٹر ز اچھے لگتے ہیں۔“ امامہ نے سادہ لہجے میں بورڈ کو دیکھے ہوئے کچھ بھی

محسوس کیے بغیر، اس کے سینے پر سر رکھے اس کی تائید کی۔ یہ کہتے ہوئے اسے جلال کا

خیال نہیں آیا تھا لیکن سالار کو آیا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم بینک میں کیا کرتے ہو؟“ امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

”میں public relationing میں ہوں۔“ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا، وہ

خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ امامہ نے بے اختیار اطمینان بھر اسانس لیا۔

”یہ بھر بھی بہتر ہے۔ اچھا ہے تم ڈائریکٹ بینکنگ میں نہیں ہو۔ تم نے کیا پڑھا تھا

سالار؟“

”ماس کمیونیکیشنز۔“ وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ بول رہا تھا۔

”مجھے یہ سچیکٹ بہت پسند ہے۔ تمہیں کچھ اور بننا چاہیے تھا۔“

”یعنی ڈاکٹر؟“ سالار سگا لیکن امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”ماس کمیونیکیشنز پڑھ کر تو ڈاکٹر نہیں بن سکتے۔“ سالار نے جواب نہیں دیا۔ اگر وہ

اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو اتنی بے تکلفی کے ساتھ یہ سارے تبصرے نہ کر رہی ہوتی۔

”میں ڈاکٹروں سے نفرت کرتا ہوں۔“ سالار نے سرد لہجے میں کہا وہ بے اختیار سالار

سے لگ ہوئی۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اس کا چہرہ بے تاثر تھا، کم از کم امامہ اسے پڑھ نہیں سکی۔

”ایسے ہی۔“ سالار نے کندھے اچکاتے ہوئے بڑی سرد مہری سے کہا۔

”ایسے ہی کیسے...؟ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔“ وہ جزبز ہوئی۔

”تمہیں کیوں ناپسند ہیں بینکرز؟“ سالار نے ترکی بہ ترکی جواب کہا

”بددیانت ہوتے ہیں۔“ امامہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”بینکرز؟“ سالار نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں۔“ اس بار وہ سنجیدہ تھی۔

وہ سالار کا بازو اپنے گرد سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب قریب جا کر بورڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس پر لگائے ہوئے نوٹس اور ڈیڈلائنز پڑھ رہی تھی۔

”بینکرز لوگوں کا پیسہ، اثاثہ محفوظ رکھتے ہیں۔“

اس نے اپنے عقب میں سالار کو بڑے جتانے والے انداز میں کہتے سنا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”اور پیسہ لوگوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے۔“ اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

”اس کے باوجود لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔ اس بار

امامہ پلٹی۔

”لیکن وہ آپ پر بھروسا نہیں کرتے۔“

وہ مسکرا رہی تھی مگر سالار نہیں۔ اس نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا، پھر اثبات میں

سر ہلایا۔

”ایک بددیانت بینکر صرف آپ کا پیسہ لے سکتا ہے لیکن ایک بددیانت ڈاکٹر آپ کی جان لے سکتا ہے تو پھر زیادہ خطرناک کون ہوا؟“

اس بار امامہ بول نہیں سکی۔ اس نے چند منٹ تک جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اسے جواب نہیں ملا، پھر اس نے یک دم سالار سے کہا۔

”اگر میں ڈاکٹر ہوتی تو پھر بھی تمہیں ڈاکٹرز سے نفرت ہوتی...؟“

وہ اب اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔ یہ غلط تھا لیکن اب وہ اور کیا کرتی؟

”میں ممکنات پر کوئی نتیجہ نہیں نکالتا، زمینی حقائق پر نکالتا ہوں۔ جب exist نہیں کرتا تو میں اس پر رائے بھی نہیں دے سکتا۔“ اس نے کندھے اچکا کر صاف جواب دیا۔

امامہ کارنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔ جواب غیر متوقع تھا، کم از کم سالار کی زبان سے۔

”زمینی حقائق یہ ہیں کہ تم میری بیوی ہو اور تم ڈاکٹر نہیں ہو۔ میں بینکر ہوں اور میں ڈاکٹرز سے نفرت کرتا ہوں۔“

اس کے لہجے کی ٹھنڈک پہلی بار امامہ تک پہنچی تھی، لہجے کی ٹھنڈک یا پھر آنکھوں کی

سرد مہری۔ وہ بول نہیں سکی اور نہ ہی ہل

ہل سکی۔ ایک ہفتے میں اس نے اس طرح تو کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

”رات بہ ہو گئی ہے، سونا چاہیے ہمیں۔“

وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اسے دیکھے بغیر کرسی سے اٹھ کر چلا گیا۔

وہ دیوار کے ساتھ لگی جھولتی ہوئی کرسی کو دیکھتی رہی، وہ اس کے بدلتے موڈ کی وجہ سے سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہے جس پر وہ اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرتا۔ وہ وہاں کھڑی اپنی اور اس کے درمیان ہونے والی گفت گو کو شروع سے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے بینکرز کے بارے میں میرے کمنٹس اچھے نہیں لگے۔ وہ جیسے تجزیہ کر رہی تھی۔

جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو کمرے کی لائٹ آن تھی لیکن وہ سوچکا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ سارا دن کام کرتی رہی تھی لیکن بری طرح تھک جانے کے باوجود اس وقت اس کی نیند یک دم غائب ہو گئی تھی۔ سالار کے بارے میں سارے اندیشے، جو اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ہفتے نے سلادے تھے، یک دم پھر سے جاگ اٹھے

تھے۔ وہ اس کی طرف کروٹ لیے ہوئے سو رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا، کم از نیند کی حالت میں پر سکون لگ رہا تھا۔

”آخر مرد اتنی جلدی کیوں بدل جاتے ہیں؟ اور اتنے ناقابل اعتبار کیوں ہوتے ہیں؟“ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اس کی رنجیدگی میں اضافہ ضرور ہوا تھا۔ زندگی اتنی محفوظ نہیں ہوئی تھی جتنی وہ کچھ گھنٹے پہلے تک سمجھ رہی تھی۔

”آج لائٹ آن کر کے سوؤ گی کیا؟“ سالار کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

وہ یقیناً گہری نیند میں نہیں تھا۔ امامہ نے ہاتھ بڑھا کر لائٹس آف کر دیں لیکن وہ سونے کے لیے نہیں لیٹی تھی۔ اندھیرے میں سالار نے دوبارہ اس کی طرف کروٹ لی۔

”تم سو کیوں نہیں رہیں؟“

”ابھی سو جاؤں گی۔“

سالار نے ہاتھ بڑھا کر اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیپ آن کر دیا۔ امامہ نے کچھ کہے بغیر کمبل خود کھینچا اور سیدھے لیٹتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سالار چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے لیپ دوبارہ آف کر دیا۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں کھول لیں۔

”تمہیں سحری کے وقت بھی اٹھنا ہے امامہ!“

اسے حیرت ہوئی، اس نے اندھیرے میں اسے آنکھیں کھولتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا۔

گردن موڑ کر اس نے سالار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔

”تمہیں پتا ہے سالار، دنیا کا سب سے بے ہودہ کام کون سا ہے؟“ اس نے سالار کی طرف

کروٹ لے کر کہا۔

”کیا...؟“

”شادی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے سالار کو کہتے سنا۔

”I agree“

امامہ کو بے اختیار دکھ ہوا۔ کم از کم سالار کو اس بات سے اترنا چاہیے تھا۔

اس نے سالار کا بازو اپنے گرد جمائل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اب اس کی پیشانی

چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”گڈ نائٹ۔“ یہ اسے سلانے کی ایک اور کوشش تھی۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کچھ بے چین ہو کر کہا۔

”سالار!“

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا اور آنکھیں کھول دیں۔

”تمہیں کیا ہوا ہے...؟“

”کچھ نہیں۔“ جھوٹ ”ضروری“ تھا، لیکن سچ بے حد ”مضر“ تھا۔

”تم میرے ساتھ اتنے روڈ ہوئے۔“ اس نے بالآخر شکایت کی۔

”آفس کے کسی پرابلم کی وجہ سے میں کچھ اپ سیٹ تھا شاید اس لیے روڈ ہو گیا۔“ اس

نے معذرت جی، وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

”کیسا پرابلم؟“

”ہوتے رہتے ہیں امامہ you just don't worry... اگر آئندہ کبھی بھی

میرا ایسا موڈ ہو تو تم پریشان مت ہونا، نہ ہی مجھ سے زیادہ سوال کرنا۔ میں خود ہی ٹھیک

ہو جاؤں گا۔“

امامہ کی سمجھ میں اس کی توجیہ نہ نہیں آئی تھی لیکن وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

”میں اس لیے پریشان ہو رہی تھی، کیوں کہ مجھے لگا کہ شاید تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے۔ میں نے بینکرز کو برا کہا تھا اس لیے۔“

”تمہیں تو سات خون معاف کر سکتا ہوں میں، یہ تو کوئی بات ہی ندی۔“

اس نے ایک بار پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، ڈاکٹرز میں بھی بہت سی برائیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے بس اچھے لگتے ہیں وہ... بس محبت ہے مجھے ڈاکٹرز سے... میں بھی ان کی ساری خامیاں اگنور کر سکتی ہوں۔“ سالار کی آنکھوں میں نیندیک دم غائب ہو گئی۔ وہ کسی اور حوالے سے

وضاحت دے رہی تھی، اس نے اسے کسی اور پیرائے میں لیا۔

”تمہیں واقعی ڈاکٹرز سے نفرت ہے؟“ وہ اب یقینی کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”جو چیز تمہیں پسند ہو، میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں...؟ مذاق کر رہا تھا میں۔“ امامہ

کے ہونٹوں پر مطمئن مسکراہٹ آئی۔

اس نے بھی سالار کے گرد اپنا بازو جمائل کرتے ہوئے کہا۔

”اب مجھے نیند آرہی ہے، تم بھی سو جاؤ۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس کے بالوں انگلیاں پھیرتا رہا۔ محبوب کی دو خصوصیات یونیورسل ہوتی ہیں۔ وہ بے نیاز ہوتا ہے... اور... اور اپنی بے نیازی سے بے خبر بھی... اور یہ دونوں خصوصیات اس کے محبوب میں بھی تھیں۔ جلال النصر سے اسے ایک بار پھر شدید قسم کا حسد محسوس ہوا... لیکن رشک اسے اپنے آپ پر آیا کہ وہ اس کے ”پاس“ تھی۔ اور اس کی تھی۔

☆☆☆☆☆
NEW ERA MAGAZINE
Fiction | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
”صاحب نے نیوز پیپرز کا کہا تھا کہ آپ سے پوچھ لوں اور یہ میگزین ہیں، ان میں سے جو پسند ہیں، بتادیں، میں لے آیا کروں گا۔“

نیوز ہا کرنے اسے ایک کاغذ تھماتے ہوئے کہا۔ جس پر اخبارات اور میگزینز کی ایک لسٹ تھی۔ وہ نیند میں بیل بجنے کی آواز پر اٹھ آئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ سالار کے گھر اس نے صرف اتوار کو اخبار دیکھا تھا، وہ بھی سالار نے ہا کر سے خود لیا تھا۔ وہ خود آفس میں ہی اخبار دیکھتا تھا۔ اب وہ یقیناً اس کی وجہ سے اخبار لگوار ہا تھا۔ ایک نظر اس لسٹ پر ڈال کر اس نے ہا کر کو ایک اخبار اور ایک میگزین کا

بتایا۔ وہ اخبار اسے تھما کر چلا گیا۔ وہ جمائیاں لیتے ہوئے اخبار اندر لائی اور رکھ دیا۔ دس بجنے والے تھے، کھڑکی سے باہر دھند چھٹ رہی تھی لیکن ابھی بھی کچھ تھی۔

جتنی دیر میں ملازمہ آئی، وہ اخبار دیکھ چکی تھی۔ ملازمہ آج اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ مالی بھی تھا۔ وہ فرقان جکے پودے دیکھنے آیا تھا۔ وہ سالار کے پودے اتوار کے دن دیکھنے آتا تھا یا پھر نو شین خود اس کے ساتھ وہاں آتی تھی۔ سالار کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ان کے پاس بھی تھی۔ آج نو شین نے یہاں امامہ کی موجودگی کی وجہ سے اسے بھیج دیا تھا۔

وہ اس کے ٹیرس پر جانے کے کچھ دیر کے بعد خود ہی باہر نکل آئی۔ مالی کے پاس کھڑے خاموشی سے اسے دیکھے رہنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ اسے کسی قسم کی ہدایات کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ماہرانہ انداز میں اپنا کام کر رہا تھا، وہ واپس اندر آگئی۔ ملامہ نے بڑے پر جوش انداز میں کچن میں رکھے ہوئے برتنوں کو نوٹس کرنے کے بعد تعریف کی۔ امامہ بے اختیار خوش ہوئی۔

”باجی! اب یہ گھر، گھر لگ رہا ہے۔“ اس نے امامہ سے کہا۔ وہ سالار کی اسٹڈی کو ویکيوم کر رہی تھی۔ امامہ مسکراتی ہوئی سالار کی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ڈسٹ صاف کرنے

لگی۔

باجی! میں کرتی ہوں، آپ رہنے دو۔ ”ملازمہ نے اسے روکا۔

”نہیں، تم باقی سب کر لینا میں ابھی فارغ ہوں، اس لیے کر رہی ہوں۔“ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ نہیں چہاتی کہ سالار کا کوئی کاغذ ادھر ادھر ہو جائے لیکن یہ سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں اس اسٹڈی ٹیبل کو اتنے عرصے سے وہ ملازمہ ہی صاف کر رہی ہے۔

میل ٹرے دعوتی کارڈز کے بند اور کھلے لفافوں سے تقریباً بھری ہوئی تھی۔ امامہ نے ایک لفافہ کھول کر دیکھا۔ وہ کسی افطار پارٹی کا انویٹیشن تھا۔ ایک کے بعد ایک، وہ سارے لفافے کھول کر دیکھتی گئی۔ سب کارڈ کسی نہ کسی افطار پارٹی یا تقریب سے متعلق تھے اور بعض کارڈز میں تو وہ دو یا تین جگہوں پر بھی انویٹڈ تھا۔ وہ یقیناً بے حد سوشل زندگی گزار رہا تھا۔ یہ اس کا اندازہ تھا، یقیناً وہ اس کے گھر آجانے کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے ان پارٹیز میں نہیں جا رہا تھا۔ یہ اس کا ایک اور تجزیہ تھا۔ پندرہ بیس کارڈز دیکھنے کے بعد اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے کارڈز اٹھا کر واپس رکھ دیے۔ کچھ اور کارڈز دیکھتی یا نیچے میل کے کسی لفافے کے ایڈرس پر نظر ڈال لیتی تو شاید اسے

سالار کا شعبہ نظر آجاتا کہ وہ انویسٹمنٹ میں تھا، پی آری میں نہیں۔ کم از کم وہ یہ جھوٹ تو ضرور پکڑ سکتی تھی۔

”باجی! رات کو کوئی مہمان آئے تھے؟“ وہ ملازمہ کی آواز پر چونکی۔ وہ ایش ٹرے ہاتھ میں لیے کچھ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں۔“ امامہ نے سوال سمجھ بغیر کہا۔

”تو یہ سگریٹ کس نے پیے ہیں؟ سالار صاحب تو سگریٹ نہیں پیتے۔“ ملازمہ بے حد حیران تھی۔

امامہ کچھ دیر بول نہیں سکی۔ ملازمہ جیسے سالار کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔ یعنی وہ واقعی عادی نہیں تھا جو ایک آدھ سگریٹ وہ بھی کبھی کبھار پیتا ہوگا، اسے ملازمہ کسی مہمان کا پیا ہوا سگریٹ سمجھ لیتی ہوگی۔

”اوہ! ہاں... اس کے کچھ دوست آئے تھے، مجھے یاد ہی نہیں تھا۔“ امامہ نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، ڈور بیل بجی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ امامہ اس سے کہہ کر باہر نکل آئی۔

”لانڈری collect کرنے آئے ہیں۔“

دروازے پر ایک لڑکا سالار کے کچھ ڈرائی کلینڈ اور دھلے ہوئے کپڑے کے ہینگز لیے ہوا کھڑا تھا۔ اس کی طرف ایک بل کے ساتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”کپڑے چیک کر لیں۔“

بل کے ساتھ لانڈری کے لیے بھیجے گئے کپڑوں کی لسٹ بھی تھی۔ امامہ نے ہینگز لاونج میں لانے کے بعد باری باری لسٹ اور کپڑوں کو ملانا شروع کیا، کپڑے پورے تھے۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ملازمہ تب تک باہر نکل آئی تھی۔ امامہ بل کے پیسے لینے اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے ملازمہ کو دروازے پر لانڈری بوائے کو ایک لانڈری بیگ تھماتے ہوئے دیکھا۔ جس کے اوپر ایک لسٹ چسپاں تھی۔ یقیناً وہ ان کپڑوں کی لسٹ تھی جو لانڈری کے لیے دیے جا رہے تھے۔ لانڈری بوائے ایک رائٹنگ پیڈ پر کچھ اندارج کر رہا تھا۔

”بابی! آپ نے بھی دینے ہیں کپڑے؟“ ملازمہ نے اسے آتے دیکھ کر کہا۔

”نہیں، میں یہ بل دینے آئی ہوں۔“ امامہ نے بل کی رقم اس لڑکے کی طرف

بڑھائی۔ اس نے جواباً ایک رسید اس کی طرف بڑھادی۔

”بل تو مہینے کے شروع میں اکٹھا ہی جاتا ہے۔“ ملازمہ نے اسے روکا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آگئی۔ امامہ نے رسید پر نظر ڈالی۔ وہ سالار کے کپڑوں کی لسٹ تھی جو وہ لے کر گیا تھا۔

”تم نے لانڈری کے کپڑے کہاں سے لیے ہیں؟“ امامہ نے اس لسٹ کو پڑھتے ہوئے ملازمہ کو روکا۔

”سالار صاحب کپڑے بیگ میں ڈال کر اوپر لسٹ رکھ جاتے ہیں۔ لانڈری میں ہی رکھتے ہیں بیگ...“ ملازمہ یہ کہہ کر دوبارہ اندر چلی گئی۔

امامہ نے بل پر نظر ڈالی۔ لانڈری تو وہ خود بھی کر سکتی تھی۔ ہر ہفتے اتنے پیسے اس پر خرچ کرنا فضول خرچی تھی، اس نے سوچا۔

ملازمہ ابھی وہیں تھی جب ایک آدمی وہ پردے لے کر آیا تھا جو اس نے بننے کے لیے دیے تھے۔

”باجی! آپ نے کوئی پردے بننے کے لیے دیے ہیں؟“

ملازمہ نے انٹرکام کی بیل بجنے پر ریسپونڈ کرنا سے پوچھا۔

امامہ کچھ حیران ہوئی۔ ”ہاں... کیوں؟“

”وہ نیچے گیٹ پر ایک آدمی لے کر آیا ہے، گارڈ انٹرکام پر پوچھ رہا ہے۔ ہاں! بھیج دو، باجی نے پردے بنوائے ہیں۔“ ملازمہ نے اس کو بتا کر ریسپونڈ سے کہا۔ ریسپونڈ رکھ کر وہ دوبارہ لاؤنج صاف کرنے میں لگ گئی تھی۔ کچن کاؤنٹر پر گلاس سیٹ کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے، امامہ کو عجیب طرح کا احساس کمتری ہوا۔ اس نے اتنے دنوں وہاں چلتے پھرتے کئی بار انٹرکام کو دیکھا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس انٹرکام کی وہاں کیا افادیت ہے، جب کہ دروازہ اتنا قریب تھا۔ ملازمہ اس گھر کی ہر چیز کو اس سے زیادہ ذہانت، پھرت اور سہولت کے ساتھ استعمال کر رہی تھی۔

☆☆☆☆

”سالار! لاؤنج اب اچھا لگ رہا ہے نا؟“

سالار نے لاؤنج کی کھر کیوں پر لگے نی، پردوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے گھر آیا تھا۔ امامہ نے بے حد خوشی کے عالم میں آتے ہی اسے اطلاع دی۔ وہ نہ بھی دیتی

تب بھی لاؤنج بیچیں پہلا قدم رکھتے ہی وہ اس ”واضح“ تبدیلی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”بہت۔“ اس نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے فخریہ انداز میں پردوں کو دیکھا۔

وہ آج بھی افطاری راستے میں ہی کر آیا تھا۔ امامہ نے افطاری فرقان کے گھر پر کی تھی اور اب وہ دونوں ایک ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔

”تو جناب کا آج کا دن کیسا گزرا؟“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کھانا شروع کرتے ہوئے سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ اسے پورے دن کی ایکٹیویٹیز بتانے لگی۔ آج ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ پہلی تفصیلی گفت گو تھی۔ سالار نے اسے دن میں دو بار، ایک یا ڈیڑھ منٹ کے لیے کال کی تھی مگر بات صرف حال احوال تک ہی رہی تھی۔

”یعنی آج بہت کام کرنا پڑا۔“ سالار نے اس کے دن کی تفصیل سن کر کہا۔

”کیا کام...؟ میں نے کیا کیا...؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ امامہ نے اس کی بات پر

کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”جتنا بھی کیا ہے، بہت ہے۔“

”میں تمہاری لانڈری خود کر دیا کروں گی اگلے ہفتے سے۔“ امامہ نے سالار کی بات کو

نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اور پریس بھی کر دیا کروں گی۔“

”میں تمہیں کپڑے دھونے کے لیے نہیں لے کر آیا۔“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”مجھے پتا ہے لیکن میں فارغ ہوتی ہوں سارا دن اور پھر مجھے اپنے کپڑے بھی تو دھونے

ہوتے ہیں، تو تمہارے بھی دھوسکتی ہوں۔“

”تم اپنے کپڑے بھی کیوں دھوؤ گی۔ لانڈری وین ہر ہفتے آتی ہے۔ تم اپنے بھی دے دیا

کرو۔“ سالار نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر کہا۔

”پیسے ضائع ہوں گے۔“ اس نے بے اختیار کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ سالار نے اسی انداز میں کندھے اچکا کر کہا۔

امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اور میں سارا دن کیا کروں؟“

”وہی جو دوسری عورتیں کرتی ہیں۔ سویا کرو، ٹی وی دیکھو، فون پر دوستوں کے ساتھ

گپ شپ لگاؤ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے کوئی دوست نہیں ہیں۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

سالار نے کچھ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”کوئی تو ہوتا...؟“

”نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

وہ کھانا کھاتے کھاتے کچھ سوچنے لگی تھی، پھر اس نے کہا۔

”کالج اور یونیورسٹی میں تو میں اتنی خوف زدہ رہتی تھی کہ کسی کو دوست بنانے کا خیال

ہی نہیں آیا۔ دوستی ہوتی تو پھر سوال ہوتے... میرے بارے میں... فیملی کے بارے

میں... پھر اگر کوئی گھر آتا اور ابو کی فیملی کو کوئی پہلے ہی سے جانتا ہوتا تو... یا سعیدہ اماں کو

ہی... دوستی اس وقت بڑی مہنگی چیز تھی میرے لیے... میں انور ڈ نہیں کر سکتی تھی... پھر

آفس جاب میں کو لیگز کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ ہوتی تھی لیکن مجھے اکیلے رہنے

کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ میں لوگوں کے ساتھ کبھی بھی comfortable

نہیں رہتی تھی۔ میں ان کے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتی تھی... ان کے گھر نہیں جاسکتی تھی... اپنے گھر نہیں بلا سکتی تھی... کیسے دوستی ہوتی پھر... اسی لیے مجھے کتابیں پڑھنا اچھا لگتا تھا... پینٹ کرنا اچھا لگتا تھا۔”

”لوگوں سے میل جول ہونا چاہیے، دوست ہونی چاہیں۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تمہیں تھوڑا سوشلائز کرنا چاہیے۔ اب تمہارا گھر ہے، تم کو لیگنز کو انوائٹ کر دیا کم از کم جان سے فون پر ہی بات کر لیا کرو۔“ وہ اسے بڑی سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

”تم خود سوشل ہو، اس لیے کہہ رہے ہو۔“ امامہ نے جواباً جھکا۔
 ”ہاں، میری جاب کی ضرورت ہے سوشل ہونا۔ ماہ رمضان کی بعد کو فنکشنز ہیں... ڈنر بھی ہیں کچھ... تمہیں ملو اوں گا کچھ دوستوں سے بھی... اچھا لگے گا تمہیں۔“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے تمہارے ڈیسک پر دیکھے ہیں، افطار، ڈنرز کے کارڈز۔ تم میری وجہ سے نہیں جا رہے؟“ امامہ نے کہا۔

”نہیں، میں افطار پارٹیز یا ڈنرز میں نہیں جاتا۔“ سالار نے سرسری انداز میں کہا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کیوں کہ میں سمجھتا ہوں یہ پارٹیز ماہ رمضان کی اسپرٹ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ میں ماہ رمضان میں کسی کے گھر افطار پر نہیں جاتا۔“

”لیکن فرقان کے گھر تو جاتے ہو۔“ امامہ نے بے ساختہ کہا، وہ مسکرا دیا۔

وہ اس وقت بھی فرقان کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔

”میں فرقان کے گھر ماہ رمضان سے پہلے بھی کھانا کھاتا رہا ہوں اور اگر وہ مجھے افطار یا ڈنر کے لیے بلاتا ہے تو کھانے میں کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو اس کے گھر میں عام دنوں میں پکتا ہے لیکن عام دنوں میں اس کے گھر میں نہیں پکتا۔“ سالار نے ٹیبل پر پڑی تین چار چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

”پھر...؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”یہ سارا اہتمام فرقان اور بھابھی تمہارے لیے کر رہے ہیں کیوں کہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے تو تمہارے لیے سحری اور افطاری میں بھی اہتمام ہو رہا ہے، ورنہ تو ہم سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ ماہ رمضان میں ہم لوگ اپنے کچن کے لیے گروسری عام مہینوں

کی نسبت آدھا خرچ کرتے ہیں اور آدھے پیسوں سے ہم کسی اور فیملی کو پورے مہینے کا راشن منگوا دیتے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارا۔ ”سالار نے سے متوجہ کیا، وہ خود کھانا ختم کر کے اب میٹھا کھا رہا تھا۔

یہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی روایت تھی۔ ماہ رمضان میں ان کے گھر آنے والا راشن آدھا ہو جاتا تھا۔ گھر کے دو ملازموں کے ماہ رمضان کا راشن اس باقی راشن کی قیمت سے آتا تھا۔

امامہ! ”سالار نے پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔ وہ کھانا کھانے لگی۔ سالار میٹھا بھی ختم کر چکا تھا اور اب منتظر تھا کہ وہ کھانا ختم کر لے۔ وہ خود ساتھ ساتھ سیل پر مسلسل میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کسی حد تک بدل گیا تھا اور اس کے اندر آنے والی تبدیلی کس حد تک ڈاکٹر صاحب کی مرہون منت تھی اور کس حد تک اس کی اپنی سوچ کی، اندازہ لگانا مشکل تھا... وہ کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ اس کے کھانا شروع کرنے کا انتظار کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس کی پلیٹ میں ضرور رکھتا تھا اور اس کے کھانا ختم کرنے کے بعد ہی کھانے کی ٹیبل سے اٹھتا۔ وہ یہ باتیں نوٹس نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن وہ یہ نوٹس کیے بغیر بھی رہ نہیں سکتی تھی۔ وہ

عجیب تھا۔ ”عجیب؟“ اس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ امامہ کے ذہن میں نہیں آیا۔
 ڈنر کے بعد وہ رات کو بچن کا سودا سلف خریدنے کے لیے گئے تھے۔ امامہ نے اگر سالار
 کی یہ گفت گو نہ سنی ہوتی تو یقیناً وہ بچن کے لیے ایک لمبی چھوڑی لسٹ بنائے بیٹھی تھی،
 لیکن اس نے خریداری کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیا۔ خریدی جانے والی زیادہ تر
 اشیاء کنٹینرز اور جاز ہی تھے۔ کھانے پکانے کا سامان اس نے بہت کم خریدا تھا۔
 آج انہوں نے ایک اور جگہ سے کافی پی تھی۔

”تمہارا وہ پر اہلم حل ہو گیا؟“ امامہ کو گاڑی میں اچانک یاد آیا۔
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 ”کون سا پر اہلم؟“ سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ جس کی وجہ سے تم کل رات پریشان تھے۔“ امامہ نے اسے یاد دلایا۔

وہ بے اختیار بڑبڑایا۔ ”کاش ہو جاتا۔“

”یعنی نہیں ہوا۔“ امامہ متفکر ہوئی۔

”ہو جائے گا۔“ سالار نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

”پرسوں میں کراچی جا رہا ہوں۔“ سالار نے بات بدلی۔

”کتنے دن کے لیے؟“ وہ چونکی۔

”صبح جاؤں گا اور رات کو آجاؤں گا۔ میں مہینے میں دو تین بار جاتا ہوں کراچی... تم چلو گی ساتھ...؟“ وہ ہنسا۔ امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ایک دن کے لیے؟“

”ہاں...“

”تم آفس کے کام سے جا رہے ہو، میں کیا کروں گی وہاں؟“

”تم انتیا کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جانا، وہ تمہیں گھما پھرائے گی کراچی۔ کبھی گئی ہو پہلے وہاں؟“ سالار پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ وہ کچھ ایکسائیٹڈ ہونے لگی تھی۔ سمندر اسے پسند تھا اور زندگی میں پہلی بار

اسے سمندر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

”انتیا سے ٹائی اپ کرتا ہوں پروگرام... میں آفس میں تم میری بہن کے ساتھ بازاروں

میں... ہم تو اسی طرح کا ہنی من منا سکتے ہیں فی الحال۔“ وہ اسے پھر چھیڑ رہا تھا۔

وہ ہنس پری... وہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ جس زندہ کو وہ گزار کر آئی تھی، اس کے

مقابلے میں یہ آزادی اسے جنت جیسی محسوس ہو رہی ہے۔

☆☆☆☆

”یہ کیا ہے؟“

وہ خرید اہوا سودا سلف، چار ز اور کنٹینرز میں ڈالنے میں مصروف تھی جب سالار اپنے اسٹڈی روم سے ایک لفافہ لے کر کچن ایریا میں آیا۔

”اس میں تمہاری چیک بک ہے۔“ سالار نے اسے بتایا اور لفافہ کاؤنٹر پر رکھ کر چلا گیا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے لفافہ کھول کر اندر موجود چیک بک نکالی۔ اس کے ساتھ ایک پے سلپ بھی نکل آئی۔ وہ تیس لاکھ کی تھی۔ امامہ کو لگا کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے سلپ کو دوبارہ دیکھا۔ وہ واقعی تیس لاکھ ہی کی تھی۔ اس نے اس کے اکاؤنٹ میں تیس لاکھ کیوں جمع کروائے؟ یقیناً اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

وہ لفافہ پکڑے اسٹڈی روم میں آگئی۔ سالار اپنے کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

”سالار! تمہیں پتا ہے، تم نے کتنا بڑا blunder کیا ہے؟“ امامہ نے اندر آتے

ہوئے کہا۔

”کیسا blunder؟“ وہ چونکا۔

امامہ نے اس کے قریب آکر پے سلپ اس کے سامنے کی۔

”اسے دیکھو ذرا... یہ کیا ہے؟“

”پے سلپ ہے۔“ سالار نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے دوبارہ ڈیسک ٹاپ پر نظر

دوڑانا شروع کر دی۔

”کتنی رقم جمع کروائی ہے تم نے میرے اکاؤنٹ میں؟“

”تیس لاکھ۔“ وہ حیران ہوئی۔

”ابھی کچھ رہتی ہے، سات لاکھ اور کچھ... چند ماہ میں وہ بھی دے دوں گا۔“

وہ کچھ ٹائپ کرتے ہوئے سر سری انداز میں کہہ رہا تھا۔

”لیکن کیوں دو گے مجھے...؟ کس لیے؟“ وہ حیران تھی۔

”تمہارا حق مہر ہے۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔

”میرا حق مہر دولا کھ روپے ہے۔“ امامہ کو لگا کہ شاید وہ بھول گیا ہے۔

”وہ آمنہ کا تھا، میں تمہیں زیادہ حق مہر دینا چاہتا ہوں۔“ سالار نے کندھے اچکا کر کہا۔

”لیکن یہ تو بہت ہی زیادہ ہے سالار۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہوئی۔ ”تم سے کس نے کہا،

مجھے اتنی رقم دو...؟“

”تم نے خود مجھے لکھ کر دی تھی یہ رقم۔“

سالار نے اس بار مسکراتے ہوئے مانیٹر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”میں نے کب...“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ”وہ فکر تم اس لیے لکھوا رہے تھے...؟“

اسے یاد آ گیا۔

”ہاں۔“ اس کی لاپرواہی اب بھی برقرار تھی۔

”تم پاگل ہو۔“ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی۔

”شاید۔“ سالار نے بے ساختہ کہا۔

”اچھا، میں ایک رب لکھ دیتی تو کیا کرتے؟“ وہ اب طنز کر رہی تھی۔

”تو ایک ارب بھی دے دیتا۔“ ”کیا فیاضی تھی۔“

”کہاں سے دیتے...؟ فراڈ کرتے؟“ وہ بے ساختہ ناراض ہوئی۔

”کیوں کرتا...؟... کما کر دیتا۔“ سالار نے اس کی بات کا برامانا۔

”ساری عمر کماتے ہی رہتے پھر؟“

”اچھا ہوتا، ساری عمر تمہارا قرض دار رہتا۔ واقعی اچھا ہوتا، تو ایک ارب چاہیے کیا...؟“

وہ تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ امامہ کو کئی سال پہلے والے سالار کی جھلک نظر آئی۔

”کیوں دے رہے ہو؟“ اس نے سنجیدگی سے کچھ دیر اسے دیکھ کر کہا۔

”بیوی ہو تم، اس لیے۔“

”اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“

”امامہ! میری سیونگنز ہیں یہ۔“ سالار نے بے حد تحمل سے کہا۔

”سیونگنز ہیں تو مجھے کیوں دے رہے ہو؟“ وہ کچھ خفا ہوئی۔

”میرا دل چاہتا ہے، میں تمہیں دوں۔ اگر یہ پوری دنیا میری ہوتی تو میں یہ ساری دنیا تمہیں دے دیتا۔ میں کما رہا ہوں اور روپیہ آجائے گا میرے پاس۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...“ کیا شاہانہ انداز تھا۔

”لیکن اتنی زیادہ رقم۔“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”میں اتنی زیادہ رقم نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تمہاری مرضی کا حق مہر دینا چاہتا تھا، اس لیے تم سے ایک فکر لکھنے کو کہا۔ تمہیں پتا ہے جو فکر تم نے لکھی تھی، اس دن میرے اکاؤنٹ میں ایگزیکٹ اتنی ہی اماؤنٹ تھی۔“ وہ اب رقم دہراتے ہوئے ہنس رہا تھا۔

”اب اس کو تم کیا کہو گی اتفاق...؟ مجھے اتفاق نہیں لگا، مجھے لگا وہ رقم میرے پاس تمہاری امانت تھی... یا حق تھا... اس لیے تمہیں دے رہا ہوں۔ تیس لاکھ دیا ہے کچھ رقم کا ادھار کر لیا ہے تم سے... ورنہ اگلے دو تین ماہ ادھر ادھر سے مان رہا ہوتا۔ اس لیے تم آرام سے رکھو یہ پیسے، مجھے اگر کبھی ضرورت ہوئی تو تم سے مانگ لوں گا۔ اب میں تھوڑا سا کام کر لوں؟“

امامہ نے کچھ نہیں کہا تھا، وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ ڈائمنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر وہ ایک بار پھر اس پے سلپ کو دیکھنے لگی۔ وہ اس شخص کو کبھی نہیں سمجھ سکتی

تھی۔ کبھی نہیں... وہ لاابالی نہیں تھا... کم از کم اتنے دن میں اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا... لیکن وہ سمجھ دار بھی نہیں تھا... کم از کم وہ پے سلپ اسے یہی بتا رہی تھی... وہ اگر اسے خوش کرنا چاہتا تھا... تو وہ نہیں ہوئی تھی... احسان مند دیکھنا چاہتا تھا تو ہاں، اس کے کندھے جھکنے لگے تھے... ایسی چاہ اس نے زندگی میں کسی اور شخص سے چاہی تھی... ایسی نوازشات کی طلب اسے کہیں اور سے تھی... اس کے وجود کو گیلی لکڑی وہ پیسہ نہیں بنا رہا تھا، بلکہ وہ فیاضی بنا رہی تھی جو وہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس سے برابری چاہ رہی تھی... برابر نہیں ہو پارہی تھی... اس شخص کا قد لمبا نہیں ہو رہا تھا، بلکہ اس کا اپنا ہی وجود سکڑنے لگا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

☆☆☆☆

”امامہ! ہم کل صبح کے بجائے، آج شام کو جا رہے ہیں۔ رات کراچی میں رکیں گے اور پھر کل رات کو ہی واپس آجائیں گے۔ سات بجے کی فلاٹ ہے۔ میں شام ساڑھے پانچ بجے تمہیں پک کروں گا، تم پیکنگ کر لو۔“

اس نے بارہ بجے کے قریب فون کر کے آفس سے کراچی کا نیا پروگرام بتایا تھا۔ وہ یک دم نروس ہونے لگی۔ اتنی جلدی پیکنگ، ٹھیک ہے وہ ایک رات کے لیے جا رہے تھے۔

پھر بھی... وہ اب اسے اپنے ان کپڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو وہ ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔ وہ پیننگ کرتے ہوئے بے حد بولائی ہوئی تھی۔

وہ ساڑھے پانچ بجے وہاں موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے گاڑی میں روزہ افطار کر لیا ہوگا، لیکن پھر بھی وہ ایک باکس میں اس کے لیے کھانے کی چیزیں اور جو س لے کر آئی تھی۔ ایئرپورٹ تک کی ڈرائیو میں دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ وہ چیزیں بھی کھاتے رہے۔

وہ ساڑھے چھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچے، بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس سے سفر کر رہے تھے۔ اسی لیے ٹریفک کی وجہ سے کچھ لیٹ ہونے کے باوجود سالار مطمئن تھا۔

ایگزیکٹو لاونج سے جہاز میں سوار ہوتے ہوئے سالار کی فرسٹ کلاس کے کچھ اور پسینجرز سے سلام دعا ہوئی۔ چند ایک سے اس نے امامہ کا بھی تعارف کروایا۔ وہ سب کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتے تھے یا پھر سالار کے کسٹمرز تھے۔

جہاز کے ٹیک آف کے چند منٹوں کے بعد کسی دوسری کمپنی کا کوئی ایگزیکٹو، سالار سے کوئی معاملہ ڈسکس کرنے کے لیے اس کے پاس آیا۔ چند لمحے اس سے باتیں کرنے کے

بعد سالار اس سے معذرت کر کے اس ایگزیکٹو کے ساتھ اس کی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے انتظار میں بیٹھی رہی، پھر کچھ بور ہو کر اس نے ایک میگزین اٹھالیا۔ سالار کی واپسی، لیڈنگ کے اعلان کے پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ ”سوری“ کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔

”تم بور تو نہیں ہوئیں؟“

نہیں... مجھے تو بہت مزہ آرہا تھا۔ ”اس نے بے حد خفگی سے جواب دیا۔

اس نے میگزین سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ سالار نے بڑے آرام سے اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر پاس سے گزرتی ایئر ہو سٹس کو تھما دیا۔ وہ شکر یہ ادا کرتی ہوئی چلی گئی۔

”یہ بد تمیزی ہے۔“ امامہ نے اس کے جانے کے بعد کچھ دبی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔

”ہاں... ہے تو سہی لیکن تم مجھے دیکھ نہیں رہی تھیں۔“ اس نے اطمینان اور ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے خفا ہو یا ہنسے۔

”جتنی باتیں تم ان لوگوں سے کر رہے تھے، تم نے مجھ سے کبھی نہیں کیں۔“

وہ اس کے شکوے پر ہنسا۔ ”بینک کے کسٹمرز ہیں۔ یہ ان باتوں کے پیسے دیتے ہیں۔“

اس نے کچھ ملامت بھری نظروں سے سالار کو دیکھا۔ ”تم کتنے materialistic ہو۔“

”ہاں، وہ تو ہوں۔“ اس نے آرام سے جواب دیا۔

”میں بھی دے سکتی ہوں تمہیں پیسے۔“ وہ اس کے جملے پر چونکا۔

”ارے، میں تو بھول ہی گیا تھا، فی الحال تو تم مجھ سے زیادہ امیر ہو۔ میرے بینک کی کسٹم بھی ہو اور میں تمہارا قرض دار بھی ہوں، تو تم سے باتیں کرنا تو فرض ہے میرا۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”بینکرز...“ وہ کچھ کہنے لگی تھی۔ سالار نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے روکا اور کہا۔

”میں اپنا ٹپ خراب نہیں کرنا چاہتا امامہ...! تم سے واپسی پر سنوں گا کہ بینکرز کیسے

ہوتے ہیں۔“ اس نے یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس میں سنجیدہ ہونے والی کیا بات تھی، اس نے سوچا۔

ایئر پورٹ پر ہوٹل کی گاڑی نے انہیں پک کیا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ ہم انتیا کے گھر پر ٹھہریں گے۔“ امامہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں کبھی انتیا کے گھر نہیں ٹھہرا، میں ہوٹل میں رہتا ہوں۔“ سالار نے اسے بتایا۔
 ”کراچی اکثر آتا جاتا ہوں میں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔
 ”بعض دفعہ تو یہاں آکر انتیا سے بات تک نہیں ہو پاتی۔“

امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ مسلسل سیل پر کچھ میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ ساتھ ساتھ اسے سڑک کے دونوں اطراف آنے والے علاقوں کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔

”پھر مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے ...“

سالار نے اس کے اچانک اس طرح کہنے پر اسے ٹوکا۔

”تمہیں ساتھ لے کر آنا مجھے اچھا لگ رہا ہے اور تمہیں انتیا کی فیملی سے ملوانے کے لیے یہاں لے کر تو آنا ہی تھا مجھے۔“ امامہ نے اس کا چہرہ غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے امامہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں

میرے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟” سالار نے یک دم اس سے پوچھا، وہ مسکرا دی۔

”آپ اپنی وائف کے ساتھ پہلی بار یہاں ٹھہر رہے ہیں۔“

ہوٹل میں چیک ان کرتے ہوئے ریسپشن پر موجود لڑکے نے مسکراتے ہوئے سالار

سے کہا۔

اس فائو اسٹار ہوٹل کے چند کمرے مستقل طور پر سالار کے بینک نے بک کیے ہوئے تھے اور ان کمروں میں باقاعدگی سے ٹھہرنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا، لیکن آج

وہ پہلی بار اس کی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

NEW ERAMAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور سائن کرنے لگا۔ وہ لڑکا اب امامہ سے کچھ خوش گوار جملوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کے گرد موجود ساری سلاخیں گرا رہا ہو۔ وہ باہر کی اس دنیا سے مسحور ہو رہی تھی، جس سے وہ سالار کی وجہ سے

متعارف ہوئی تھی۔

بیچ لگژری پر اینٹا اور اس کی فیملی نے اس کے لیے ڈنر ایجنج کر رکھا تھا۔ وہ لوگ آدھے گھنٹے میں تیار ہونے کے بعد تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہاں پہنچے۔ اینٹا اور اس کے شوہر

کے علاوہ اس کے سسرال کے بھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ یہ سالار اور اس کے بیوی کے لیے ایک فیملی ڈنر تھا۔ اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا۔ اس کی گھبراہٹ ابتدائی چند منٹوں کے بعد ختم ہونا شروع ہو گئی۔ وہ کافی لبرل فیملی تھی اور ان دونوں کی شادی کے حوالے سے ہونے والی رسمی گفت گو کے بعد، گفت گو کے موضوعات بدل گئے تھے۔ امامہ چیف گیسٹ تھی لیکن وہاں کسی نے اسے ٹیلی سکوپ کے نیچے نہیں رکھا تھا اور اس چیز نا امامہ کے اعتماد میں اضافہ کیا۔ کھانا بھی رو نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈرنکس لیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ امامہ گفت گو میں ایک مسکراتے ہوئے خاموش سامع کارول ادا کر رہی تھی۔ اس کی زیادہ توجہ پیج لکٹری ویو کے گرد نظر آنے والے سمندر اور شہر کی روشنیوں پر تھی۔ وہ لوگ اوپن ایر میں تھے۔ کراچی میں لاہور جیسی سردی نہیں تھی لیکن یہاں اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ سالار نے آنے سے پہلے اسے گرم شال لینے کا نہ کہا ہوتا تو یقیناً اس وقت اس کے دانت بج رہے ہوتے۔ وہاں موجود تمام خواتین سویٹرز کے بجائے، اسی طرح کی شالیں اپنے کندھوں پر ڈالے ہوئے تھیں۔

”سالار! میں وہاں آگے جا کر نیچے سمندر دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ساتھ بیٹھے

ہوئے سالار کی طرف جھکتے ہوئے مدھم آواز میں سرگوشی کی۔

”تو جاؤ۔“ سالار نے اطمینان سے کہا۔

”میں کیسے جاؤں...؟ اس طرح اکیلے... تم ساتھ آؤ میرے۔“ اس نے اس کے

مشورے پر جبر ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تم خود جاؤ... دیکھو... اور بھی لوگ کھڑے ہیں، تم بھی جا کر دیکھ آؤ۔“ سالار

نے اس سے کہا۔ وہ اب اس کی گود میں پڑا بیگ اٹھا کر نیچے زمین پر رکھتے ہوئے بلند آواز

میں اس سے کہہ رہا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اس لمبی ٹیبل کے گرد موجود افراد پر نظر ڈالی، وہ سب گفت

گو میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کچھ ہمت

پاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بائیں طرف بیٹھی انیتا اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”وہاں سے جا کر دیکھو، وہاں سے زیادہ اچھا ویو ہے۔“ انیتا نے اشارے سے اسے گائیڈ

کیا۔ امامہ نے سر ہلایا۔

وہاں اس وقت اس کے علاوہ اور بھی کچھ فیملیز موجود تھیں اور سالار ٹھیک کہہ رہا تھا۔

کوئی نہ کوئی وقتاً فوقتاً اٹھ کر اسی طرح اس عرشہ نما جگہ کے کنارے کھڑے ہو کر
سمندر کو دیکھنے لگتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نروس تھی لیکن پھر وہ نارمل ہونا
شروع ہو گئی۔

سالار وہیں بیٹھا کولڈ ڈرنک پیتے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ امامہ نے دوبارہ پلٹ کر
کچھ نروس ہو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں بار مسکرا دیا۔ یہ نو سال پہلے کی وہ پراعتما لڑکی
نہیں تھی جو آدھی رات کو اپنے گھر کی دیوار کو د کر اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ اس
سے شادی کی تھی، پھر گھر سے چلی گئی تھی۔

وہ وسیم کی اس بہن کے بارے میں وسیم سے بہت کچھ سن چکا تھا لیکن پچھلے دس دنوں
سے وہ جس لڑکی کو دیکھ رہا تھا، یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ وقت نے جتنی توڑ پھوڑ اس کی
زندگی میں پیدا کی تھی اس سے زیادہ توڑ پھوڑ اس نے عرشے کی طرف جاتی ہوئی اس
لڑکی کی زندگی میں پیدا کی تھی۔ اس کی اندازاً طوار ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ نو سال اگر
کسی شخص کو اس کے گھر والوں سے الگ کر دیا جائے خوف اور دباؤ کے ساتھ چند
جگہوں تک محدود کر کے پانی دنیا سے کاٹ دیا جائے تو وہ کس حد تک کنفیوزڈ، ڈبل مائنڈ
، غیر محفوظ اور ڈیپنڈنٹ ہو سکتا ہے۔ وہ اس کا عملی مظاہرہ امامہ کی اس حالت میں دیکھ

رہا تھا اور یہ چیز اسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ وہ کم از کم اسے اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

”سالار... سالار...“ وہ انیتا کی آواز پر بے اختیار چونکا۔

اس نے پوری قوت سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

”یا تو اسے وہاں بھیجتے نہ، اب بھیج ہی دیا ہے تو دو چار منٹوں کے لیے کسی اور چیز کو بھی

دیکھ لو۔“ وہ اب اسے ڈانٹ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔ اس کا بہنوئی غفران

اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ہو امامہ کے بالوں کو بکھیر رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار کانوں کے پیچھے کر کے سنبھالنے کی

کوشش کر رہی تھی لیکن انہیں کھلا چھوڑ کر آنے پر پچھتا بھی رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں

وہ شیفون کے دوپٹے کو سر پر ٹکانے کی کوشش چھوڑ چکی تھی، ہاں وہ پشمینہ شمال اس کی

مہین شیفون کی قمیص کو اڑنے سے توروک نہیں پار رہی تھی لیکن اس کے جسم کو اچھی

طرح ڈھانپنے رکھنے میں مؤثر تھی۔ وہ کئی سالوں میں آج پہلی بار کسی پبلک پلیس پر سر

ڈھانپنے بغیر کھڑی تھی۔ اسے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ اگر وہ سالار کے ساتھ نہ ہوتی تو

کبھی بھی ایسی حالت میں کسی کھلی جگہ پر کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دس دن پہلے تک تو وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنا چہرہ بھی چھپاتی تھی۔ وہ واحد گیٹ اپ تھا جس میں وہ خود کو بے حد محفوظ سمجھتی تھی۔ سالار سے شادی کے بعد اس نے چہرہ چھپانا چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔

تاریک سمندر میں نظر آتی روشنیوں کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر گردن کے گرد لپٹے دوپٹے کو سر پر لینے کی کوشش کی۔ یہاں اس کی کوشش کو نوٹس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ کام اس ہو میں شال، دوپٹے اور کھلے بالوں کے ساتھ آسان نہیں تھا۔

”میں بال سمیٹ دوں تمہارے؟“ وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی پھر جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ اس نے سالار کو اپنے عقب میں دیکھ کر بے اختیار کہا۔ وہ کس وقت آتا تھا، اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”تم میرا دوپٹا پکڑو گے؟“ اس نے سالار کی اونٹ میں آتے ہوئے اپنا دوپٹا اسے پکڑا دیا۔ وہ اب وہاں کھڑی دوسروں کو نظر نہیں آرہی تھی۔

”تمہیں مجھ کو بتانا چاہیے تھا کہ یہاں اتنی تیز ہوا ہوگی، میں بال تو کھلے چھوڑ کر نہ آتی۔“ وہ اپنے بالوں کو ڈھیلے جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے اس سے شکایتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ بہ اب اپنی مثال اتار کر اسے دیتے ہوئے، دوپٹا اس سے لے رہی تھی۔

”یہ کون سا کلر ہے؟“ دو دوپٹے کو اپنے سر اور گردن کے گرد کپٹے ہوئے اس کے سوال پر ٹھٹکی۔

”کر مزن... کیوں؟“

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

سالار نے مثال اس کے کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا، تم اس کلر میں بہت اچھی لگتی ہو۔“ اس نے اس کے بائیں گال کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے بہت آہستہ سے چھوا تھا۔

امامہ کی آنکھوں میں حیرت اٹھ آئی۔ اگلے لمحے سالار کو یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اس کا لباس زیادہ قرمزی تھا یا اس کا چہرہ، وہ بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

”اب تم اتنی سی بات پر بھی یوں بلش ہو کر وگی تو معاملہ جان لیوا ہو جائے گا۔ مار دوگی

تم بڑی جلدی مجھے۔ ”وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

وہ تقریباً ڈھائی بجے واپس اپنے ہوٹل میں آئے تھے۔ امامہ کو اتنی نیند آرہی تھی کہ اس نے جیولری اتاری دی چہرہ بھی دھولیا لیکن کپڑے تبدیل کیے بغیر سو گئی تھی۔

☆☆☆☆

سالار صبح کب آفس کے لیے نکلا، امامہ کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تقریباً دس بجے اٹھی۔ جب تک وہ اپنا سامان پیک کر کے تیار ہوئی، تب تک انیتا سے لینے کے لیے آچکی تھی۔

وہ لوگ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے نکلے اس کے بعد وہ انیتا کے ساتھ کراچی کے مختلف مالز میں گھومتی پھرتی رہی۔ انیتا نے اسے سالار کے دیے ہوئے کریڈٹ کارڈ کو استعمال کرنے ہی نہیں دیا۔ اس دن وہی اس کو شاپنگ کرواتی رہی۔

شاپنگ کے بعد انیتا سے اپنے گر لے گئی، اس نے وہاں افطار کیا۔ ساڑھے سات بجے وہ گھر سے ایر پورٹ کے لیے نکلی اور اسی وقت سالار سے اس کی فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی ایر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ سالار کی نسبت جلدی ایرپورٹ پہنچی۔ بورڈنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایگزیکٹو لاؤنج میں پہنچتے ہی ایک بار پھر وہ کسی نہ کسی سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔ یہ وہ فلائٹ تھی جس سے وہ عام طور پر کراچی سے واپس آیا کرتا تھا اور اس کی طرح باقی لوگ بھی ریگولر ٹریولر تھے لیکن وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ اس نے سالار کی توجہ کسی اور طرف ہونے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

وہ خوش تھی، یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا اور سالار کو اس کی یہ خوشی حیران کر رہی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Urdu

”یہ تمہارا کریڈٹ کارڈ اور پیسے۔“

اس نے لاؤنج میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی اپنے بیگ سے دونوں چیزیں نکال کر سالار کو تھما دیں۔

”انیتا نے مجھے بل پے کرنے نہیں دیے۔ اسی نے سارے بلز دیے ہیں۔ تم اسے پے کر دینا۔“ امامہ نے اسے بتایا۔

”کیوں...؟ کوئی بات نہیں اگر اس نے پے کیے ہیں... اسے ہی کرنے چاہیے تھے۔“

سالار نے کریڈٹ کارڈ اپنے والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسے اس نے واپس امامہ کے بیگ میں ڈال دیے تھے۔

”لیکن ہم نے تو اسے یا اس کی فیملی کو کچھ بھی...“

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم نیکسٹ ٹائم آؤگی تو لے آنا کچھ اس کے لیے۔ دو چار ہفتے تک وہ ویسے بھی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو رہی ہے۔ تو تمہیں اچھا لگا کراچی آکر...؟“ سالار نے موضوع بدلا۔

امامہ کا چہرہ ایک بار پھر چمکنے لگا... وہ اسے ان جگہوں کے بارے میں بتا رہی تھی جہاں وہ اینٹا کے ساتھ گئی تھی۔ سالار مسکراتے ہوئے اسے سناتا رہا۔ وہ بچوں جیسے جوش و خروش کے ساتھ اپنی شاپنگ کی تفصیل بتا رہی تھی۔

”میں نے ابو، آنٹی اور سعیدہ اماں کے لیے بھی کچھ گفٹس لیے ہیں۔“ وہ بتا رہی تھی۔

”اچھا!“ سالار نے دل چسپی لی لیکن گفٹس کی نوعیت نہیں پوچھی۔

”فرقان بھائی کی فیملی اور تمہارے پیرنٹس کے لیے بھی۔“

”امامہ! صرف میرے پیرنٹس نہیں ہیں وہ، تمہارا بھی کوئی رشتہ ہے ان سے۔“

سالار نے اعتراض کیا۔

وہ اب بھی اس کے ماں باپ کا ذرا سی طرح کرتی تھی۔ اس وقت یک دم امامہ کو احساس ہوا کہ اس نے سالار کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔ یہ بھول تھی یا لاپرواہی، لیکن اسے شاپنگ کے دوران سالار کا خیال تک نہیں آیا۔ اسے بے حد ندامت ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کچھ شرمندگی سے کہا۔

”سالار! مجھے تمہارے لیے کچھ خریدنا یاد نہیں رہا۔“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”کوئی بات نہیں، تم نے اپنے لیے شاپنگ کی ہے تو سمجھو، تم نے میرے لیے ہی خریدا ہے۔“ سالار نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا کندھا تھپک کر جیسے تسلی دی۔

پھر بھی مجھے تمہارے لیے کچھ لینا چاہیے تھا۔ ”امامہ مطمئن نہیں ہوئی۔“ لیکن مجھے

تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔“

اس کا محبوب ظالم تھا، وہ جانتا تھا۔ ”کوئی بات نہیں، جب خیال نہیں آیا تو کیسا تحفہ...؟“

تحفہ تو ان کو دیا جاتا ہے جن کا خیال آتا ہو۔ ”سالار کے لہجے میں گلہ نہیں تھا لیکن امامہ کو

گلہ لگا۔ وہ نادم سی ہو کر خاموش بیٹھ گئی۔

”اور کیا کیا لیا؟“ اس کی ندامت محسوس کرتے ہوئے سالار نے دوبارہ اس سے بات شروع کی۔

”مجھے انتہا اچھا لگی ہے۔“ امامہ نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

”چلو اچھا ہے، کوئی تو اچھا لگا تمہیں۔ میں نہ سہی، میری بہن ہی سہی۔“

امامہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا سالار کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی، وہ سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”اور پتا ہے میں نے کیا کیا لیا ہے؟“ وہ پھر بولنے لگی۔

سالار بے اختیار مسکرایا۔ اگر اسے، اس سے اپنے لیے کسی اظہار کی توقع تھی، تو غلط تھی۔

☆☆☆☆

اگلے دو دن امامہ بہت اچھے موڈ میں رہی، اسے ہر بات پر کراچی یاد آجاتا۔ اس کی یہ خوشی سالار کو حیران کرتی رہی۔ اس کا خیال تھا اسے وہ شہر پسند آیا ہے لیکن اسے یہ

اندازہ نہیں ہوا کہ بات شہر کی نہیں تھی، وہ اگر امامہ کو نواب شاہ بھی لے جاتا تو بھی وہ اسی ٹرانس میں واپس آتی۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو رہی تھی اور ایک لمبے عرصے کے بعد گھٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ جینے کے بعد کچھ دیر تک تو انسان ایسے ہی گہرے سانس لیتا ہے، جیسے وہ لے رہی تھی۔

اگلے دن وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ وہ سالار کے ساتھ خوش تھی، یہ بات اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی البتہ سعیدہ اماں نے پھر بھی کچھ احتیاطی تدابیر کے تحت سالار کو سامنے والوں کے لڑکے کی آمنہ کے لیے دیوانہ وار محبت کا ایک اور قصہ سنانا ضروری سمجھا، جسے سالار نے بے حد تحمل سے سنا۔ اس بار امامہ نے دوران گفت گو سعیدہ کو ٹوکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی، سعیدہ اماں کا خیال تھا، سالار کو ایک اچھا، تابع دار شوہر بنانے کے لیے اس طرح کے لیکچرز ضروری ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ماضی میں کسی عورت کے ساتھ وابستہ رہ چکا ہو، امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ سعیدہ اماں کو اپنے اور سالار کے تعلق کے بزارے میں کیسے بتائے، اسے خدشہ تھا کہ اس انکشاف کے بعد سعیدہ اماں خود اسی سے ہی ناراض نہ ہو جائیں۔ اسے فی الحال اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔



اسلام آباد جانا ضروری ہے؟”

وہ جمعہ کی رات ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی، وہ جانا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ ایک عجیب سے خوف کا شکار بھی تھی۔

”بہت زیادہ ضروری ہے۔“ سالار بیڈر پر بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر ای میل چیک کرنے میں مصروف تھا۔

”تمہیں کیا کام ہے وہاں...؟“ امامہ نے ہاتھ میں پکڑا ناول بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنی کے بل ٹیک لگائے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے، اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے گاؤں جانا ہے۔“ وہ اسکرین پر نظریں جمائے اپنا کام کرتے ہوئے بولا۔

”کون سے گاؤں...؟“ وہ چونکی۔

”اسلام آباد سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔“ اس نے نام بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں وہاں ایک اسکول اور چند دوسرے پروجیکٹس چلا رہا ہوں۔ اسکول کی بلڈنگ میں کچھ ایکسٹینشن ہو رہی ہے، اسی کو دیکھنے جانا ہے مجھے۔ جانا تو لاسٹ ویک تھا لیکن جا نہیں سکا۔“

وہ ابھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی طویل خاموشی اور خود پر جمی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے سالار نے اسے دیکھا۔ امامہ سے نظریں ملنے پر اس نے کہا۔

”تم ساتھ چلنا اور دیکھ لینا۔“ وہ دوبارہ اسکرین پر دیکھنے لگا۔

”تم اکیلے چلے جاؤ۔“ امامہ نے کہا۔

”میں تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”ویسے بھی پاپا نے کہا ہے آنے کے لیے... ہاں، اگر تم گاؤں نہیں جانا چاہتیں تو مت جاؤ لیکن اسلام آباد تو چلنا ہے تمہیں۔“ سالار نے جیسے قطعی انداز میں کہا۔

امامہ نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کچھ خفگی کے عالم میں ناول کھول دیا۔

”کیا اسٹوری ہے اس ناول کی؟“

سالار کو اس کے بگڑتے ہوئے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ امامہ نے جواب نہیں دیا۔

”ہیرو، ہیروئن کے کپڑوں کی زیادہ تعریف کرتا ہے اس میں یا خوب صورتی کی؟“ وہ

اب اسے چھیڑ رہا تھا۔

امامہ نے اسے نظر انداز کیا۔ یہ اتفاق تھا کہ جو صفحہ وہ پڑھ رہی تھی اس میں ہیرو،

ہیروئن کی خوب صورتی ہی کی تعریف کر رہا تھا۔ امامہ کو ہنسی آگئی تھی۔ ناول سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے تاثرات دیکھے۔ سالار نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

☆☆☆☆

”خواتین و حضرات توجہ فرمائیے، ہم اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکے ہیں۔ اس وقت یہاں شام کے سات بج رہے ہیں اور یہاں کا درجہ حرارت ”...“ جہاز کے کابین عملہ میں سے کوئی انگلش کے بعد اردو میں رسمی الوداعی کلمات دہرا رہا تھا۔ جہاز ٹیکسی کرتے ہوئے ٹرمینل کے سامنے جا رہا تھا۔ بزنس کلاس کی ایک سیٹ پر بیٹھے سالار نے اپنا سیل فون آن کرتے ہوئے اپنی سیفٹی بیلٹ کھولی۔ امامہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گم صم تھی۔

”کہاں گم ہو؟“ اس نے امامہ کا کندھا تھپکا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اپنی سیفٹی بیلٹ کھولنے لگی۔ سالار اب لکچ

کمپارٹمنٹ سے اپنے بیگز نکال رہا تھا۔ ایک فلائٹ اسٹیورڈ نے اس کی مدد کی۔ دونوں کے درمیان چند خوش گوار جملوں کا تبادلہ ہوا۔

وہ اس فلائٹ پر آنے والے ریگولر پینجرز میں سے ایک تھا اور فلائٹ کا عملہ اسے پہچانتا تھا۔

جہاز کی سیڑھیوں کی طرف جانے سے پہلے سالار نے مڑ کر اس سے کہا۔

”تمہیں کوئی کوٹ وغیرہ لے کر آنا چاہیے تھا، سویٹر میں سردی لگے گی تمہیں۔“

”یہ تمہارا ہی نہیں، میرا بھی شہر ہے۔ میں پیدا ہوئی ہوں یہاں، بیس سال گزارے ہیں میں نے یہاں۔ مجھے پتا ہے، کتنی سردی ہوتی ہے، یہ سویٹر کافی ہے۔“ امامہ نے

بڑے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

جہاز کی سیڑھیوں سے باہر آتے ہی سرد ہوا کے پہلے جھونکے نے ہی اسے احساس دلادیا

کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے دانت بچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سالار نے کچھ کہے بغیر

اپنے بازو پر پڑی جیکٹ اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے بری فرماں برداری سے کچھ نام

ہو کر جیک پہن لی۔ اسلام آباد بدل گیا تھا۔ اس نے نجل ہو کر سوچا۔ ارائیول لاؤنج کی

ایگزٹ کی طرف بڑھتے ہوئے سالار چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

”ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گیا امامہ... ”اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”پاپا کو یہ پتا نہیں ہے کہ ہم آج اسلام آباد آرہے ہیں۔“ امامہ کے چہرے کی

مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

سالار نے اسے رکتے دیکھا تو وہ بھی رک گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سالار

نے اپنے جکندھے پر اس کے بیگ کی بیلٹ ٹھیک کی۔ شاید ٹائمنگ غلط ہو گئی، ٹیکسی میں

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

بتانا زیادہ بہتر تھا اور اب اگر اس نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا تو... وہ دل ہی دل

میں فکر مند ہوا۔

وہ پلکیں جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسی طرح

دیکھتا رہا۔ یہ ڈھٹائی تھی لیکن اب وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے بالآخر

امامہ کی آنکھوں کی بے یقینی کو غصے میں بدلتے دیکھا، پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

وہ مسلسل دو ہفتوں سے اسے سکون ندر عثمان کے اسلام آباد بلانے کا کہہ رہا تھا۔ یہ

سکندر عثمان کا بلا وانہ ہوتا تو وہ صرف سالار کے کہنے پر تو کبھی وہاں نہ جاتی اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ سکندر عثمان کے نہ بلانے کے باوجود وہاں جانے کا کیا مطلب تھا، اس کا اندازہ وہ کر سکتی تھی اور اس وقت وہ بری طرح پریشان ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ لاؤنج سے باہر نکلنے سے ہی انکار کر دے۔ اسے سالار پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”سوری!“ سالار نے اطمینان سے کہا۔

وہ چند لمحے مزید اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ارد گرد دیکھا، پھر سالار نے اسے جیک اتارتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہاں کھڑی بے بسی کے عالم میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کر سکتی ہے۔ اس نے جیک اتار کر تقریباً پھینکنے والے انداز میں سالار کو دی۔

”تھینک یو۔“ سالار نے جیکٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

اس نے شکر ادا کیا کہ جیکٹ اس نے اس کے منہ پر نہیں دے ماری۔ وہ اب بے حد غصے میں ایگزٹ ڈور کی طرف جا رہی تھی۔ سالار کو حیرت ہوئی اس نے اس سے اپنا بیگ کیوں نہیں لیا تھا۔ اصولی طور پر یہ اس کا دوسرا رد عمل ہونا چاہیے تھا۔

”میر ایگ دو۔“ ایگزٹ ڈور سے نکلنے سے پہلے ہی امامہ نے پلٹ کر تقریباً غراتے

ہوئے، اس سے کہا تھا۔ سالار نے آرام سے بیگ سے پکڑا دیا۔

ٹیکسی میں بیٹھنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ پورا راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی، سالار نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت غصے

کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے مخاطب نہ کرنا مناسب تھا۔ وہ اب گھر پر سکندر عثمان اور

طیبہ کے رد عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگلی بجلی ان پر گرنے والی تھی۔



NEW ERA MAGAZINE

گاڑی ان کے گھر کی بانی روڈ کا موٹر مٹر رہی تھی۔ امامہ کو اپنا پورا جسم سرد ہوتا ہوا محسوس

ہوا۔ یہ سردی نہیں تھی، یہ خوف بھی نہیں تھا، یہ کچھ اور تھا۔ وہ نو سال کے بعد اپنے

گھر کو، اس سڑک کو اور اس موٹر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے،

آنکھیں بھینگنے لگی تھیں۔ سالار سے ساری ناراضی، سارا غصہ جیسے دھواں بن کر ہوا

میں تحلیل ہو رہا تھا۔ خوشی تھی، کیا تھا جو وہ گاڑی کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھ کر

محسوس کر رہی تھی۔ اس کے گھر کا گیٹ سالار کے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا

اور وہ صرف یہ اندازہ کر پائی تھی کہ گیٹ بند تھا، گھر کی بیرونی لائٹس آن تھیں۔

گاڑی کے ہارن پر گاڑنے باہر دیکھا پھر اس نے گاڑ روم سے باہر نکل کر گیٹ کھول دیا۔ سالار تب تک اس کے ساتھ گاڑی سے نکل کر ڈگی سے بیگز نکال رہا تھا۔ امامہ نے اس بار اپنا بیگ خود تھا منے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

گاڑ نے سامان لینے کی کوشش نہیں کی۔ سالار اپنے سامان خود اٹھانے کا عادی تھا لیکن اس نے سالار کے ساتھ آنے والی اس لڑکی کو بڑی حیرت اور دل چسپی سے دیکھا تھا، جو گیٹ سے گھر کے اندر آنے تک ان ہمسایوں کے گھر کو دیوانہ وار دیکھتی آرہی تھی جن کے ساتھ سکندر عثمان کا میل ملاپ بند تھا۔

دھند کے باوجود امامہ نے گھر کی بالائی منزل کے کچھ بیڈرومز کی کھڑکیوں سے آتی روشنی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے اپنے بیڈروم میں بھی روشنی تھی۔ اب وہاں کوئی اور رہتا ہوگا... وسیم... یاسعد... یا اس کا کوئی بھتیجا یا بھتیجی... اس نے آنکھوں میں اڈتے سیلاب کو صاف کرتے ہوئے ان کھڑکیوں میں جیسے کسی سائے، کسی ہیولے کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔

”اندر چلیں...؟“ اس نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کی نرم گرفت محسوس کی۔ امامہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے سر ہلایا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ وہ رورہی

ہے لیکن اس نے اسے رونے سے روکا نہیں تھا، اس نے بس اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

سکندر عثمان اس وقت لاؤنج میں فون پر کسی دوست کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے طیبہ کا انتظار کر رہے تھے جو اپنے بیڈروم میں کوئی چیز لینے کے لیے گئی تھیں۔ اگر سکندر کو آفس سے آنے میں دیر نہ ہو گئی ہوتی تو، وہ دونوں اس وقت کسی افطار ڈنر میں جا چکے ہوتے۔

لاؤنج میں سالار اور امامہ کا سا مناسب سے پہلے انہیں سے ہوا تھا۔ کسی بھوت کو دیکھ کر سکندر عثمان کا وہ حال نہ ہوتا، جو اس وقت ان دونوں کو دیکھ کر ان کا ہوا تھا۔ وہ فون پر بات کرنا بھول گئے تھے۔

”جبار! میں بعد میں فون کرتا ہوں تمہیں۔“ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے دوست سے کہا اور سیل بند کر دیا۔ غصہ بے حد معمولی لفظ تھا جو انہوں نے اس وقت سالار کے لیے محسوس کیا۔ وہ لاہور میں اس الو کے پٹھے کو نہ صرف اسلام آباد امامہ کے ساتھ نہ آنے کی تاکید کر کے آئے تھے، بلکہ پچھلے کئی دن سے مسلسل فون پر ہر بار بات کرنے کے دوران یہ بات دہرانا نہیں بھولے اور وہ ہر بار فرماں برداری سے ”اوکے“

کہتا رہا۔ نہ یہ فرماں برداری ان سے ہضم ہوئی تھی، نہ اتنا سیدھا اوکے۔ ان کی چھٹی حس اس کے بارے میں سگنل دے رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں میں بہت بدل گیا تھا، بے حد فرماں بردار ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا، بہت کم ان کی کسی بات سے اختلاف کرتا یا اعتراض کرتا لیکن وہ ”سالار سکندر“ تھا ان کی وہ ”چو تھی اولاد“ جس کے بارے میں وہ سوتے میں بھی محتاط رہتے تھے۔

صرف سالار ہی نہیں، بلکہ امامہ نے بھی سکندر عثمان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دور ہی سے بھانپ لیا تھا۔

”ڈونٹ وری... پاپا مجھے کچھ ذلیل کریں گے لیکن تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ دور سے اپنی طرف آتے، سکندر کی طرف جاتے ہوئے، وہ خود سے چند قدم پیچھے چلتی امامہ کی طرف دیکھے بغیر بے حد مدھم آواز میں بڑبڑایا تھا۔

امامہ نے سراٹھا کر اپنے ”شوہر“ کا ”اطمینان“ دیکھا، پھر تقریباً دس میٹر کے فاصلے پر آتے اپنے ”سسر“ کا ”انداز۔“ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر زیادہ خوف زیادہ ہوئی تھی کہ سکندر عثمان، سالار کی انسلٹ کرنے والے تھے۔

”السلام علیکم پاپا!“ اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگنر کھتے ہوئے اس نے پاس آتے ہوئے سکندر عثمان سے ہمیشہ کی طرح یوں گلے ملنے کی کوشش کی تھی جیسے وہ ان کی دعوت اور ہدایت پر وہاں آیا ہے۔

سکندر عثمان نے خشمگین نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں منع کیا تھا نا؟“

”جی۔“ سالار نے بے حد تابع داری سے اس سوال کا جواب دیا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سکندر عثمان کا دل چاہا کہ وہ اس کا گلا دبا دیں۔

”کیسے آئے ہو؟“ چند لمحوں کے بعد انہوں نے اس سے اگلا سوال کیا۔

”ٹیکسی پر۔“ جواب کھٹاک سے آیا تھا۔

”ٹیکسی اندر لائے تھے؟“

”نہیں گیٹ پر ہی اترے ہیں۔“ وہ نظریں جھکائے بے حد سعادت مندی سے کہہ رہا

تھا۔

”تو سسرال والوں کو بھی سلام کر آتے۔“ وہ اس بار چپ رہا۔ جانتا تھا، نہ یہ سوال ہے نہ مشورہ۔

”بیٹا! آپ کیسی ہیں؟“ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے وہ اب امامہ کی طرف بڑھ آئے تھے۔ ان کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گفت گو سن رہی تھی اور سکندر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ سکندر کے سوال کا فوری طور پر جواب نہیں دے سکی۔

”سفر ٹھیک رہا؟“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بے حد شفقت سے پوچھا تھا۔ ”اور طبیعت ٹھیک ہے، چہرہ کیوں اتنا سرخ ہو رہا ہے؟“

سکندر نے بھی اس کی آنکھوں کی نمی اور پریشانی کو محسوس کیا تھا۔

”جی... وہ جی...“ وہ اٹکی۔

”سردی کی وجہ سے... السلام علیکم! مہی... کیسی ہیں آپ؟“ سالار نے بیگ دوبارہ کھینچتے ہوئے پہلا جملہ سکندر سے کہا اور دوسرا دور سے آتی ہوئی طیبہ کو دیکھ کر جو اسے دیکھ کر جیسے کراہی تھیں۔

”سالار! کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی، کچھ تو احساس کیا کرو۔“ وہ اب ان سے گلے مل رہا تھا۔

طیبہ! امامہ کو چائے کے ساتھ کوئی میڈیسن دیں اور اب اس ڈنر کو رہنے ہی دیں۔“
سکندر اسے ساتھ لاتے ہوئے اب طیبہ سے کہہ رہے تھے۔ طیبہ اب سالار کو ایک طرف کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئیں۔

”کیا ہو امامہ کو؟“

”کچھ نہیں... میں... ٹھیک ہوں“ اس نے مدافعانہ انداز میں طیبہ سے ملتے ہوئے کہا۔
”آپ لوگ ڈنر پر جائیں، ہماری پروانہ کریں۔ ہم لوگ کھالیں گے جو بھی گھر میں ہے۔“ سالار نے سکندر سے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس وقت کہیں انوائسٹڈ ہیں، یقیناً گھر میں اس وقت ڈنر کی کوئی تیاری نہیں کی گئی ہوگی۔

سکندر نے اس کی بات سننے کی زحمت نہیں کی۔ انہوں نے پہلے انٹرکام پر گارڈز کو سیکورٹی کے حوالے سے کچھ ہدایات کیں، اس کے بعد ڈرائیور کو کسی قریبی ریسٹورنٹ سے کھانے کی کچھ ڈشز لکھوائیں اور خانساماں کو چائے کے لیے بلوایا۔

”پلیز پاپا! آپ ہماری وجہ اپنا پروگرام کینسل نہ کریں، آپ جائیں۔“ سالار نے سکندر عثمان سے کہا۔

”تاکہ تم پیچھے سے ہمارے لیے کوئی اور مصیبت کھڑی کر دو۔“

وہ سکندر کے جملے پر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی نے سکندر کو کچھ اور برہم کیا۔ امامہ اگر اس کے پاس نہ بیٹھی ہوتی تو سکندر عثمان اس وقت اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دیتے۔

”جب میں نے تم دونوں سے کہا تھا کہ فی الحال یہاں مت آنا تو پھر... امامہ! کم از کم تمہیں اسے سمجھنا چاہیے تھا۔“

سکندر نے اس بار امامہ سے کہا تھا جو پہلے ہی بے حد شرمندگی اور حواس باختگی کا شکار ہو رہی تھی۔

”پاپا! امامہ تو مجھے منع کر رہی تھی، میں زبردستی لایا ہوں اسے۔“ امامہ کی کسی وضاحت سے پہلے ہی سالار نے کہا۔

سکندر نے بے حد خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی اولاد میں سے کسی نے آج

ان کے منہ پر بیٹھ کر اتنے فخریہ انداز میں ان کی بات نہ ماننے کا اعلان نہیں کیا تھا۔
 سالار نے مزید کچھ کہنے کے بہ جائے انہوں نے ملازم سے سامان ان کے کمرے میں
 رکھنے کے لیا کہا۔ اس سارے معاملے پر سالار سے سنجیدگی سے بات کرنا ضروری تھا،
 لیکن اکیلے میں۔

سالار کے کمرے میں آتے ہی امامہ مقناطیس کی طرح کھڑکی کی طرف گئی تھی اور پھر
 جیسے سحر زدہ سی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے اس کا گھر کا بایاں حصہ
 نظر آ رہا تھا۔ اس کے گھر کا اوپر والا حصہ... اس کے کمرے کی کھڑکیاں... و سیم کے
 کمرے کی کھڑکیاں... دونوں کمروں میں روشنی تھی لیکن دونوں کھڑکیوں کے پردے
 گرے ہوئے تھے۔ کوئی ان پردوں کو ہٹا کر اس وقت اس کی طرح آ کر کھڑکی کے
 سامنے کھڑا ہو جاتا تو اسے آرام سے دیکھ لیتا۔ پتا نہیں پہچانتا بھی یا نہیں... وہ اتنی تو نہیں
 بدلی تھی کہ کوئی اسے پہچان ہی نہ پاتا... اس کے اپنے خونی رشتے تو... پانی سیلاب کے
 ریلے کی طرح سب بند توڑ کر اس کے آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔ یہ کب سوچا تھا اس نے
 کہ کبھی اپنی زندگی میں وہ دوبارہ اس گھر کو دیکھ سکے گی۔ کیا ضروری تھا کہ یہ سب کچھ
 اس کی زندگی میں، اس کے ساتھ ہوتا۔

وہ بے حد خاموشی کے ساتھ اس کے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی آنے والے اس گھر کو دیکھا اور پھر امامہ کی آنکھوں سے بہنے والے پانی کو۔ اسی خاموشی کے ساتھ اس نے امامہ کے کندھے پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے جیسے اسے دلاسا دینے کے لیے اس کے سر کو چوما۔

”وہ میرا کرا ہے۔“ بہتے آنسوؤں کے ساتھ امامہ نے اسے بتایا۔

”جہاں سے تم مجھے دیکھا کرتی تھیں؟“ وہ بہتر آنسوؤں کے بیچ ہنس پڑی۔

”میں تمہیں نہیں دیکھتی تھی سالار!“ اس نے احتجاج کیا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار نے اس کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور مجھے پتا تک نہیں تھا کہ یہ تمہارا کرا ہے۔ میں سمجھتا تھا، یہ وسیم کا کرا ہے۔ میں تو

کپڑے بھی یہیں بدلا کرتا تھا۔“ سالار کو کچھ تشویش ہوئی۔

”مجھے کیا پتا، تم کیا کرتے تھے... میرے کمرے کی کھڑکیاں تو بند ہوتی تھیں۔“

کیوں؟“ سالار نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

”تم شارٹس میں پھرتے تھے بیڈ روم میں اس لیے... اور تمہارے خیال میں کھڑکیاں

کھلی رکھ سکتی تھی... تمہیں کوئی شرم ہی نہیں تھی... تم کیسے اس طرح اپنے بیڈروم میں پھر لیتے تھے...”

وہ اب آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس پر خفا ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے آرام سے اس کی توجہ اس طرف سے ہٹائی تھی۔

”تم کس طرح کے انسان تھے؟“

سالار نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔

”تمہیں کھانے کا کہنے آیا تھا۔ تم چیخ کر لو تو چلتے ہیں۔“ اس نے یک دم بات بدلتے ہوئے امامہ سے کہا۔ اس نے سالار کے تاثرات نہیں دیکھے۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی سے نظر آنے والا گھر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆☆

وہ تقریباً دو بجے کمرے میں آیا اور اس کا خیال تھا کہ امامہ سوچکی ہوگی، مگر وہ ابھی بھی کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھر کی لائٹس اب آف تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا تھا۔

”سو جانا چاہیے تھا تمہیں امامہ!“ اس سے نظریں ملنے پر سالار نے کہا۔

وہ کھڑکیوں کے آگے کرسی رکھے دونوں پاؤں اوپر کیے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔

”سو جاؤں گی۔“

”وہاں سب سوچکے ہیں، دیکھو لائٹس آف ہیں سب بیڈرومز کی۔“

وہ دوبارہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔

سالار چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر واش روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد کپڑے تبدیل کر کے وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔

”امامہ! اب بس کرو، اس طرح دیکھنے سے کیا ہوگا؟“ بیڈ پر لیٹے لیٹے اس نے امامہ سے کہا۔

”میں نے کب کہا کہ کچھ ہوگا، تم سو جاؤ۔“

”تم وہاں بیٹھی رہو گی تو مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔“

”لیکن میں یہیں بیٹھوں گی۔“ اس نے ضدی انداز میں کہا۔

سالار کو اس کی ضد نے کچھ حیران کیا۔ چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اس نے پھر کہا۔
 ”امامہ! تم اگر بیڈ پر آکر لیٹو گی تو یہاں سے بھی تمہارا گھر نظر آتا ہے۔“ سالار نے ایک
 بار پھر کوشش کی تھی۔

”یہاں سے زیادہ قریب ہے۔“

وہ اس بار بول نہیں سکا۔ اس کے لہجے میں موجود کسی چیز نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔
 چند گز کا فاصلہ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ اس کا گھر نہیں تھا۔ چند گز کی نزدیکی اس
 کے لیے بہت تھی۔ وہ نو سال بعد اس گھر کو دیکھ رہی تھی۔
 ہمارے گھر کے اوپر والے فلور میں ایک کمر ہے، اس کمرے کی کھڑکیوں سے
 تمہارے گھر کا لان اور پورچ تک نظر آتا ہے۔ ”وہ لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے
 بڑبڑایا۔“

امامہ یک دم کسی سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

”کون سا کمرہ...؟“ مجھے دکھاؤ۔ ”اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اس نے بے
 چینی سے پوچھا۔“

”دکھا سکتا ہوں اگر تم سو جاؤ، پھر صبح میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔“ سالار نے آنکھیں کھول کر کہا۔

”میں خود بھی جاسکتی ہوں۔“ وہ بے حد خفگی سے سیدھی ہو گئی۔

”اوپر والا فلور لاکڈ ہے۔“ امامہ جاتے جاتے رک گئی۔ وہ یک دم مایوس ہوئی تھی۔

”سالار! مجھے لے جاؤ اوپر...“ وہ پھر اس کا کندھا ہلانے لگی۔

”اس وقت تو نہیں لے جاؤں گا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”تمہیں ذرا سی بھی محبت نہیں ہے مجھ سے؟“ وہ اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔

”ہے، اس لیے تو نہیں لے کر جا رہا، صبح وہاں جانا۔ تمہاری فیملی کے لوگ گھر سے نکلیں گے۔ تم انہیں دیکھ سکتی ہو۔ اس وقت کیا نظر آئے گا تمہیں؟“ سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”ویسے بھی مجھے تمہیں پتا ہے کہ کمرے کی چابیاں کس کے پاس ہیں، صبح ملازم سے

پوچھ لوں گا۔“ سالار نے جھوٹ بولا۔

اوپر کا فلور متقل نہیں تھا لیکن امامہ کو روکنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ

کچھ مایوس ہو کر دوبارہ کھڑکی کی طرف جانے لگی۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اور فلور میں تب ان لاک کرواؤں گا، اگر تم ابھی سو جاؤ۔“

وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں بیڈ کی اس طرف سوؤں گی۔“

سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اپنی جگہ چدھوڑ دی۔ اس نے کمبل ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنادی تھی۔

”اور میں لائٹس بھی آن رکھوں گی۔“ وہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ اب کراؤن سے ٹیک لگائے دونوں گٹھنے سکیرٹے بیڈ پر بیٹھی کھڑکی کو دیکھنے لگی تھی۔

”مجھے روشنی میں نیند نہیں آئے گی۔“ سالار نے کمبل سے اس کے پاؤں اور ٹانگیں ڈھانپتے ہوئے کہا۔

”تمہیں تو روشنی میں ہی نیند آتی تھی۔“ وہ کچھ جزبز ہو کر بولی۔

”اب اندھیرے میں آتی ہے۔“ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تو پھر مجھے روشنی میں ہی نیند آتی ہے۔“ سالار نے اپنی مسکراہٹ روکی۔

”تمہیں ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر کی نیند کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔“

مصنوعی غصے کے ساتھ سالار نے کچھ آگے جھکتے ہوئے سائڈ ٹیبل لیپ اور دوسری

لائٹس آف کرنی شروع کر دیں۔

امامہ خفگی سے بیٹھی رہی، لیکن اس نے سالار کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کمراب نیم

تاریک تھا لیکن بیرونی روشنیوں کی وجہ سے امامہ کا گھر زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔

”اس طرح دیکھنے سے کیا ہوگا؟“ سالار اب کچھ جھلا گیا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”ہو سکتا ہے کوئی پردے ہٹا کر کھڑکی میں کھڑا ہو۔“

وہ خواہش نہیں تھی، آس تھی اور وہ اس آس کو توڑ نہیں سکتا تھا۔

”صبح گاؤں جانا ہے ہمیں...“ وہ اب اس کی توجہ اس کھڑکی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا

تھا۔

”مجھے نہیں جانا، مجھے یہیں رہنا ہے۔“ امامہ نے دو ٹوک انکار کیا۔ سالار کو اس کی توقع

تھی۔

”تمہیں گاؤں لے جانے کے لیے لے کر آیا تھا۔“ سالار نے کچھ خفگی سے کہا۔

”تم جاؤ مجھے کسی گاؤں میں دل چسپی نہیں ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

سالار یک دم کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ سے اٹھا اور اس نے پردے برابر کر دیے۔ باہر آنے والی روشنی بند ہوتے ہی کمر ایک دم تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ امامہ نے بے حد خفگی کے عالم میں لیٹتے ہوئے کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ سالار کے جاگنے سے کھلی۔ سحری ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

اس نے اٹھ کر سب سے پہلے کھڑکی کر پردے ہٹائے تھے۔ سالار نے اسے کچھ

ہمدردی سے دیکھا۔ وہ انٹر کام اٹھا کر خانساماں کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ رہا تھا۔

امامہ کے کمرے میں لائٹ آن تھی لیکن کھڑکیوں کے آگے اب بھی پردے گرے

ہوئے تھے۔

اسے جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر آئی،

تب تک خانساماں کھانے کی ٹرالی کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ انہوں نے بڑی خاموشی کے

ساتھ کھانا کھایا اور کھانا ختم کرتے ہی امامہ نے کہا۔ ”اب چابیاں لے لو، اوپر چلیں۔“

”مجھے نماز پڑھ کر آنے دو۔“

”نہیں، مجھے اپنا گھر دیکھنا ہے۔“

اس بار سالار نے جیسے امامہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اسے لے کر وہ اوپر کے فلور آ گیا۔ کمر اٹھلا دیکھ کر امامہ نے اسے بے خفگی سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ سالار کی کسی بات پر ناراض نہیں ہو رہی تھی۔

اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوتے ہی وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔ وہاں سے اس کے گھر کا پورا لان اور پورچ نظر آ رہا تھا۔ لان بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ویسا نہیں رہا تھا جیسا کبھی ہوتا تھا، جب وہ وہاں تھی۔ تب وہاں دو کرسیاں بھی نہیں تھیں، جو پہلے ہوتی تھیں۔ لان میں لگی بلیں اب پہلے سے بھی زیادہ بڑی اور پھیل چکی تھیں۔ آنسوؤں کا ایک نیاریلا اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ سالار نے اس دفعہ اسے کچھ نہیں کہا۔ کہنا بے کار تھا۔ اسے فی الحال رونا تھا، وہ جانتا تھا۔

وہ مسجد میں نماز اور کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تھا اور حسب توقع تب بھی امامہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

وہ گاؤں جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے اوپر آیا تھا۔ اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ وہ پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔

اڑھائی گھنٹے کے بعد بھی وہ کھڑکی کے سامنے اسی طرح کھڑی تھی۔ سالار کے اندر آنے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے اسے مخاطب کرنے کے بجائے کمرے میں دوڑ پڑے صوفے کو کچھ جدوجہد کے ساتھ کھڑکی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔

”یہاں بیٹھ جاؤ تم، کب تک اس طرح کھڑی رہو گی۔“

صوفہ دھکیل کر اس کے قریب لانے کے بعد سالار نے اس کو مخاطب کیا اور تب ہی اس نے امامہ کا چہرہ دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک سرخ تھی۔ سالار نے گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں ایک گاڑی میں کچھ بچے سوار ہو رہے تھے اور ایک عورت کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

”رضوان کے بچے ہیں؟“ سالار نے گاڑی کو اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر امامہ سے کہا۔

امامہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بس انہیں دیکھ

رہی تھی۔ سالار نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ نو سال لمبا عرصہ تھا۔ پتا نہیں مزید ان میں سے کس کو وہ پہچان سکی تھی اور کس کو نہیں اور ان میں سے کس کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ عورت اب اندر چلی گئی تھی۔

اس کے کندھوں پر ہلکا دباؤ ڈالتے ہوئے سالار نے اس سے کہا ”بیٹھ جاؤ“!

امامہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور ناک رگڑنے کی کوشش کی۔ صرف چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ خشک ہوا تھا، برسات پھر ہونے لگی تھی۔ سار پنچوں کے بل اس کے سامنے چند لمحوں کے لیے بیٹھا۔ اس نے امامہ کے دونوں ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں اپنے ہاتھوں میں لیے۔ اس کے دونوں ہاتھ بے حد سرد تھے۔ وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی سردی کو اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ ہیٹر آن کرنے کے بعد اس نے کمرے کی الماری میں کوئی کمبل ڈھونڈنے کی کوشش کی اور ایک کمبل اسے نظر آ ہی گیا تھا۔

”میں گاؤں کے لیے نکل رہا ہوں، شام تک واپس آؤں گا۔ دس گیارہ بجے کے قریب پاپاور می اٹھ جائیں گے، تب تم نیچے آجانا۔“ اس کی ٹانگوں پر کمبل ڈالتے ہوئے۔ اس نے امامہ سے کہا۔

وہ اب بھی اسی طرح دوپٹے سے آنکھیں اور ناک رگڑ رہی تھی لیکن اس کی نظریں اب بھی کھڑکی سے باہر تھیں۔ سالار اور یہ کمر جیسے اس کے لیے اہم نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے کیا کہہ رہا تھا، اس نے نہیں سنا تھا اور سالار یہ جانتا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے چلا گیا۔

وہ اگلے چار گھنٹے اس طرح صوفے پر جمی بیٹھی رہی۔ اس دن اس نے نو سال کے بعد باری باری اپنے تینوں بھائیوں کو بھی گھر سے جاتے دیکھا تھا۔ وہ وہاں بیٹھی انہیں دیکھتی ہچکیوں سے روتی رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ اس نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اتنے سال سے صبر کے جو بند وہ باندھتی چلی آرہی تھی، اب وہ بند باندھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ پہلے اسلام آباد آنا نہیں چاہتی تھی اور اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اسی طرح چوری چھپے اس گھر میں رہتی، اس طرح روز اپنے گھر والوں کو دیکھتی رہتی۔ اس کے لیے تو یہ بھی بہت تھا، وہ احمقانہ سوچ تھی، لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ وہ ہر بات سوچ رہی تھی جس سے وہ یہاں اپنے ماں باپ کے گھر کے پاس رہ سکتی ہو۔

سالار نے گاؤں پہنچنے کے چند گھنٹے کے بعد سکندر کو فون کیا۔

”میں بھی حیران تھا جب ملازم نے مجھے بتایا کہ وہ اوپر گیسٹ روم میں ہے۔ میں سوچ رہا تھا پتا نہیں وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔“

سالار نے انہیں امامہ کو وہاں سے بلوانے کے لیے کہا تھا اور سکندر نے اسے جواباً کہا۔
 ”کیا ضرورت تھی اسے خوا مخواہ وہاں لے جانے کی، گھر تو اس کا تمہارے کمرے سے بھی نظر آتا ہے۔“

”لیکن گھر والے اسے گیسٹ روم سے ہی نظر آسکتے تھے۔“ سالار نے دو سالار سے بات ختم کرنے کے بعد سکندر اٹھ کر اوپر والے فلور پر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر آئے تھے۔

”بیٹا! نیچے آنا تھا، ہم لوگوں کے پاس آکر بیٹھیں کچھ دیر۔“

سکندر یہ کہتے ہوئے اندر آئے اور امامہ کچھ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

وہ ان کے وہاں آنے کی توقع نہیں کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں بری طرح سو جی ہوئی تھیں۔

”رونے والی کیا بات ہے بیٹا...؟“ سکندر نے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں... وہ... میں...“ وہ بے حد ندامت سے ان سے نظریں ملائے بغیر بولی۔
 ”چلیں! نیچے آئیں، طیبہ بھی پوچھ رہی ہیں آپ کا۔“ سکندر نے ایک بار پھر اس کا سر
 تھپکا۔

یہ سالار نہیں تھا، جسے وہ دھڑلے سے انکار کر دیتی۔ ”جی۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے
 صوفے پر پڑا کمبل اٹھانے کی کوشش کی۔ سکندر نے اسے روک دیا۔
 ”ملازم اٹھالے گا... آپ آجائیں۔“

اس کا چہرہ دیکھ کر طیبہ بھی بے چین ہو گئیں۔ جیسے بھی حالات میں شادی ہوئی،
 بہر حال وہ ایک ایسی فیملی تھی۔ جسے وہ طویل عرصے سے جانتے تھے اور جن کی دیوار
 کے ساتھ ان کی دیوار جڑی تھی۔ اس رشتے کا پاس، بہو ہونے کے ناتھے ان پر کچھ زیادہ
 ذمہ داری عائد کرتا تھا۔ خود وہ بھی امامہ کو بچپن سے دیکھتے آئے تھے۔ کسی نہ کسی حد
 تک وہ ان کے لیے بے حد شناسا تھی۔

وہ لوگ اسے تسلیاں دیتے اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سکندر نے اسے آرام

کرنے کے لیے کہا۔ وہ کمرے میں آکر کچھ دیر کے لیے کھڑکی کے پاس بیٹھی رہی، پھر کچھ تھکی ہوئی آکر بیڈ پر لیٹ کر سو گئی۔

ساڑھے چار بجے اسے ملازم نے انٹرکام پر اٹھایا تھا۔ افطار کا وقت قریب تھا، سکندر اور طیبہ بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ سالار بھی افطار سے چند منٹ پہلے ہی پہنچا تھا۔ سکندر اور طیبہ اس رات بھی کہیں مدعو تھے۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔ رات کو وہ بارہ بجے کے قریب واپس آئے، گیارہ بجے سالار اور اس کی فلاٹ تھی۔ طیبہ جانے سے پہلے امامہ کو کچھ تحائف دینے آئیں تو امامہ کو وہ تحائف یاد آگئے جو وہ کراچی سے ان دونوں کے لیے لے کر آتی تھی۔

امامہ کو حیرت ہوئی جب سالار، طیبہ سے ملنے کے بعد سونے کے لیے گیٹ گیا تھا۔ ”تم مجھے دس بجے اٹھا دینا۔“ اس نے امامہ کو ہدایت دی تھی۔

”گیارہ بجے فلاٹ ہے، دیر تک نہیں ہو جائے گی...؟“ امامہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں، پہنچ جائیں گے۔“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی اسے دیکھتی رہی پھر وہ دوبارہ اوپر کے فلور کے اسی کمرے میں آگئی۔

اس کے گھر کے پورچ میں کوئی گاڑی بھی نہیں کھڑی تھی۔ وہ ویک اینڈ تھا اور وہ یقیناً گھر پر نہیں تھے۔ کہاں ہو سکتے تھے۔ امامہ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ نو سال کے بعد یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ اسے امید یہ تھی کہ وہ وہاں بیٹھی انہیں واپس آتے دیکھ سکتی ہے، لیکن دس بجے تک کوئی گاڑی نہیں آئی۔ وہ بو جھل دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر نیچے آگئی۔ سالار کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جانے کے لیے سامان سمیٹ کھڑا تھا۔ امامہ کا دل مزید بو جھل ہوا، تو بالآخر ایک بار پھر سب کچھ چھوڑ کر جانے کا وقت آ گیا تھا۔

باہر پورچ میں ڈرائیور ایک گارڈ کے ساتھ گاڑی میں انتظار کر رہا تھا۔ سکندر عثمان نے گارڈ کو ایر پورٹ تک ساتھ جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ ہر طرح کی احتیاطی تدابیر کر رہے تھے۔ سالار نے سامان گاڑی میں رکھنے کے بعد چابی ڈرائیور سے لے لی۔ امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

”ہم لوگ بائی روڈ جا رہے ہیں، پاپا آئیں تو انہیں بتا دینا۔“

ڈرائیور نے کچھ احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ شاید سکندر اسے ضرورت سے زیادہ

ہدایات کر گئے تھے، لیکن سالار کی ایک جھاڑ نے اسے خاموش کر دیا۔
 ”اور اب اتنی وفاداری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے گھر سے نکلتے ہی پاپا کو
 فون کر دو۔“

وہ گاڑی میں بیٹھا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس کے گھر سے نکلتے ہی یہی
 کام کرے گا۔ اس لیے گیٹ سے نکلتے ہی اس نے سکندر کے فون پر کال کی تھی۔ وہ کچھ
 دیر کے لیے سکندر کا فون انگیج کرنا چاہتا تھا۔

”پاپا! ہم لوگ نکل رہے تھے تو سوچا آپ سے بات کر لوں۔“ سالار نے سکندر سے
 کہا۔

”اچھا کیا۔“

”ذرا مٹی سے بات کر ادیں۔“ اس نے سکندر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سکندر سے کہا۔
 اسے خدشہ تھا کہ سکندر ڈرائیور کی ان کمنگ کال دیکھ کر چونکیں گے۔ وہ اگر گاڑی میں
 ان سے بات کر رہا ہے تو ڈرائیور انہیں کیوں کال رہا تھا۔ البتہ طیبہ اس سے بات کرتے
 ہوئے کسی ان کمنگ کال کو چیک نہیں کرتیں اور اگر کرتیں بھی تو ان کو شک نہیں

ہوتا۔ اگلے پندرہ منٹ وہ طیبہ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ ساتھ بیٹھی امامہ کچھ حیران تھی۔ لیکن اس نے اسے نظر انداز کیا تھا۔ وہ اتنی لمبی باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ جتنا وہ اب یک دم باتونی ہو گیا تھا۔

ادھر یہی حیرانی طیبہ کو بھی ہو رہی تھی۔ سکندر ڈنر ٹیبل پر چند دوسرے افراد کے ساتھ مصروف تھے۔ پندرہ منٹ لمبی گفتگو کے بعد جب سالار کو یقین ہو گیا کہ ڈرائیور اب تک سکندر کو کئی کالز کرنے کے بعد تنگ آکر کالز کرنا چھوڑ چکا ہو گا یا کم از کم دوبارہ کرنے کی اگلی کوشش کچھ دیر بعد ہی کرے گا تو اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون آف کر دیا۔ طیبہ اور سکندر کی واپسی بارہ بجے سے پہلے متوقع نہیں تھی اور اب اگر ڈرائیور سے پانچ دس منٹ بعد بھی ان کی بات ہوتی تو وہ بہت فاصلہ طے کر چکے ہوتے۔

”بائی روڈ آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس کا فون بند ہوتے دیکھ کر امامہ نے اس سے پوچھا۔

”یو نہی دل چاہ رہا تھا۔ کچھ یادیں تازہ کرنا چاہتا ہوں۔“ سالار نے سیل فون رکھتے ہوئے کہا۔

”کیسی یادیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تمہارے ساتھ پہلے سفر کی یادیں۔“ وہ کچھ دیر اس سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔

وہ اس شخص سے کہا کہتی کہ وہ اس سفر کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اس کے لیے سفر نہیں تھا، خوف اور بے یقینی میں گزارے چند گھنٹے تھے جو اس نے گزارے تھے۔ مستقبل

اس وقت ایک بھیانک بھوت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس راسے میں وہ بھوت مسلسل اسے ڈراتا رہا تھا۔

”میرے لیے خوش گوار نہیں تھا وہ سفر۔“ اس نے تھکے سے لہجے میں سالار سے کہا۔

”میرے لیے بھی نہیں تھا۔“ سالار نے بھی اسی انداز میں کہا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

، کئی سال ہانٹ کرتا رہا مجھے، دیکھنے آیا ہوں کہ اب بھی ہانٹ کرتا ہے۔“ وہ بات ختم

کرتے ہوئے اسے دیکھ کر بہت مدہم انداز میں مسکرایا۔

امامہ خاموش رہی۔ کئی سال پہلے کی وہ رات ایک بار پھر سے ایک اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگی تھی اور آنکھوں کے سامنے صرف رات ہی نہیں بلکہ جلال بھی آیا تھا۔

اس رات کی تکلیف کا ایک سر اس کی ذات کے ساتھ بندھا تھا۔ دوسرا اس کی فیملی کے

ساتھ۔ اس نے دونوں کو کھویا تھا۔ اگلی صبح کا سورج لاکھ ہمیشہ جیسا ہوتا، اس کی زندگی

ویسی نہیں رہی تھی۔ کبھی وہ سوچ سکتی تھی کہ وہ کبھی اس رات کو صرف تکلیف سمجھ کر سوچے گی، تقدیر سمجھ کر نہیں... اس کی آنکھیں بھینگنے لگی تھیں۔ برابر میں بیٹھا شخص آج اس کے آنسوؤں سے بے خبر نہیں تھا، لیکن اس وقت بے خبر تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، امامہ آنکھیں پونچھنے لگی تھی۔ وہ سارا نقشہ جو اس نے اپنی زندگی کا کھینچا تھا، اس میں یہ شخص کہیں نہیں تھا۔ زندگی نے کس کو کس کے ساتھ جوڑا... کس تعلق کو، کہاں سے توڑا تھا... پتا ہی نہیں چلا... سفر خاموشی سے ہو رہا تھا، لیکن طے ہو رہا تھا۔

”اب بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا ہوں۔“ امامہ کو کئی سال پہلے کی اس کی ریش ڈرائیونگ یاد تھی۔ ”زندگی کی قدر ہو گئی ہے اب؟“ اس نے سالار سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری وجہ سے احتیاط کر رہا ہوں۔“ وہ بول نہیں سکی۔ خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔ وہ شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور سڑک پر دھند محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں دھند گہری نہیں تھی، لیکن موجود تھی۔

”کبھی دوبارہ سفر کیا کیلے اس روڈ پر...“ امامہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”موٹروے سے جاتا ہوں اب اگر گاڑی میں جانا ہو تو... بس ایک بار آیا تھا کچھ ماہ پہلے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جب پاپا نے مجھے تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ دیا۔ کیا رات تھی؟“

وہ جیسے تکلیف سے کراہا اور پھر ہنس پڑا۔

”امید تھی جس کو، اس رات میں میں مجسم فنا ہوتے دیکھا۔ سمجھ میں آیا مجھے کہ تب اس رات تم کس حالت سے گزری ہو گی۔ افیت سے بہت زیادہ... موت سے ذرا سی کم... لیکن تکلیف اس کو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔“

ونڈاسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے، وہ جو کچھ اس تک پہنچنا چاہ رہا تھا، پہنچ رہا تھا۔ اس کانچ سے وہ بھی گزری تھی۔ نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ، گردن سیٹ کی پشت سے ٹکائے، وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں سارا راستہ بس یہی سوچتا رہا کہ میں اب کروں گا کیا۔ کیا کروں گا میں زندگی میں سوچ رہا تھا۔ اللہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ زندگی دے دی ہے... تمہارے ساتھ برا کیا تھا... براتو ہوتا ہی تھا میرے ساتھ... یاد ہے نا، میں نے تمہارے ساتھ سفر میں کیسی باتیں کی تھیں۔“

اس نے عجیب سے انداز میں ہنس کر ایک لمحہ کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں کی نظریں ملی تھی، پھر سالار نے نظریں چراتے ہوئے گردن سیدھی کر لی۔ سفر پھر خاموشی سے طے ہونے لگا تھا۔ وہ تعلق جوان کے بیچ تھا، وہ جیسے خاموشی کو بھی گفت گو بنا رہا تھا۔ لفظ اس وقت خاموشی سے زیادہ با معنی نہیں ہو سکتے تھے۔

امامہ بھی گردن سیدھی کر کے سڑک کو دیکھنے لگی۔ دھند اب گہری ہو رہی تھی۔ جیسے وہ سڑک پر نہیں بلکہ اپنے ماضی کی دھند میں داخل ہو رہے تھے۔ گہری، معدوم نہ ہونے اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی گہری دھند... کیا کیا اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی، لیکن جو کچھ تھا، وہ ابو جھل ہو گیا تھا، فراموش نہیں ہوا تھا۔

سیل فون کی رنگ ٹون نے ان دنوں کو چونکا دیا۔ سیل پر سکندر کا نمبر چمک رہا تھا۔ سالار ہنس پڑا۔ امامہ اس کی بے مقصد ہنسی کو نہیں سمجھی۔

”ہیلو!“ سالار نے کال ریسیو کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اسے حیرت تھی، سکندر عثمان کی کال اتنی دیر سے نہیں آنی چاہیے تھی۔ شاید ڈرائیور نے ان کے گھر پہنچنے پر ہی انہیں سالار کے ایڈونچر کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ سالار نے آواز کچھ کم

کردی تھی۔ جو کچھ سکندر اسے فون پر کہہ رہے تھے، وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ امامہ تک پہنچتا۔

”جی... جی۔“ وہ اب تابع داری سے کہہ رہا تھا۔ سکندر اس پر بری طرح برس رہے تھے اور کیوں نہ برستے وہ، انہیں بے وقوف بنانا جیسے سالار کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہ احساس سکندر کے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر پہلے طیہہ کے پرس میں پڑے اپنے سیل پر ڈرائیور کی مسڈ کا لزد دیکھی تھیں اور اس سے بات کر کے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ بائی روڈ لاہور جانا، اس وقت ان کے لیے اس کی حماقت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ تھا لیکن اس نے جتنی اطمینان سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی، وہ ان کے لیے زیادہ اشتعال انگیز تھا۔

”اب غصہ ختم کر دیں پاپا! ہم دونوں بالکل محفوظ ہیں اور آرام سے سفر کر رہے ہیں۔“ اس نے بالآخر سکندر سے کہا۔

”تم ظفر کو دھمکیاں دے کر گئے تھے کہ وہ مجھے انفارم نہ کرے؟“

”دھمکی... میں نے ایک مؤدبانہ درخواست کی تھی اس سے کہ وہ آپ کو فی الحال انفارم نہ کرے... آپ ڈنر چھوڑ کر خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔“ وہ بڑی رسائیت سے ان سے کہہ

رہا تھا۔

”میری دعا ہے سالار! کہ تمہاری اولاد بالکل تمہارے جیسی ہو اور تمہیں اتنا ہو خوار کرے، جتنا تم ہمیں کرتے ہو، پھر تمہیں ماں باپ کی پریشانی کا احساس ہوگا۔“ وہ ہنس

پڑا۔

”پاپا! اس طرح کی باتیں کریں گے تو میں اولاد ہی پیدا نہیں کروں گا۔“

امامہ نے اس کے جملے پر چونک کر اسے دیکھا۔

”پاپا دعا کر رہے ہیں کہ ہماری اولاد جلد پیدا ہو۔“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ کو چونکتے دیکھ کر سالار نے فون پر بات کرتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ بے اختیار سرخ

ہوئی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس طرح کی دعا کا کون سا وقت اور طریقہ

ہے۔ دوسری طرف سکندر فون پر اس کا جملہ سن کر کچھ بے بسی سے ہنس پڑے تھے۔

ان کا غصہ کم ہونے لگا تھا۔ کئی سالوں کے بعد انہیں سالار سے اس طرح بات کرنا پڑی

تھی۔ وہ اب اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔ سکندر کو اپنے حدود اربعہ کے

بارے میں بتا کر سالار نے فون بند کر دیا۔

”پاپاناراض ہو رہے تھے...؟“ امامہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے جواباً کہا۔

”تم جھوٹ کیوں بولتے ہو؟“ امامہ نے جیسے اسے شرم دلانے کی کوشش کی تھی۔

”کیوں کہ اگر میں سچ بولوں تو لوگ مجھے وہ نہیں کرنے دیتے، جو میں کرنا چاہتا ہوں۔“

کمال کی منطق تھی اور بے حد سنجیدگی سے پیش کی گئی تھی۔

”چاہے تمہارے جھوٹ سے کسی کو دکھ پہنچے۔“

”میرے جھوٹ سے کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا، بلکہ غصہ آتا ہے۔“

اسے سمجھانا بے کار تھا، وہ سالار تھا۔ وہ اب اندازہ لگا سکتی تھی کہ سکندر نے اسے فون پر

کیا کہا ہوگا۔

رات کے تقریباً پچھلے پہر وہ اس سروس اسٹیشن پر پہنچے تھے۔

”یہ جگہ یاد ہے تمہیں؟“ سالار نے گاڑی روکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ امامہ نے دھند

زدہ اس جگہ کو دیکھا، جہاں کچھ لائٹس دھند اور اندھیرے کا مقابلہ کرنے میں مصروف

تھیں۔

”نہیں۔“ اس نے سالار سے کہا۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں تم نے رک کر نماز پڑھی تھی۔“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اتر آیا۔

امامہ نے قدرے حیران نظروں سے اس جگہ کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا۔ اب وہ اسے کسی حد تک شناخت کر پار ہی تھی۔ وہ بھی دروازہ کھول کر اتر آئی۔ ایک کپکپی اس کے جسم میں دوڑی۔ وہ آج بھی ایک سویٹر اور چادر میں ملبوس تھی۔

وہ کمر ابدل چکا تھا، جہاں انہوں نے بیٹھی کر کبھی چائے پی تھی۔

”چائے اور چکن برگر۔“ سالار نے کرسی پر بیٹھے ہوئے اس آدمی سے کاہ، جو جمائیاں لیتے ہوئے انہیں اندر لے کر آیا تھا اور اب آرڈر کے انتظار میں کھڑا تھا۔ امامہ اس کے آرڈر پر اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”اب کھا لو گے؟“ وہ جانتا تھا، اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر مسکرا دیا۔

”لاسٹ ٹائم ہم وہاں بیٹھے تھے۔ تم نے وہاں نماز پڑھی تھی۔“

وہ ہاتھ کے اشارے سے اس کمرے کی مختلف اطراف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

امامہ کو یاد نہیں تھا، کمرے میں جگہ جگہ ٹیبلز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

فجر کی اذان میں ابھی بہت وقت تھا اور فی الحال اس جگہ پر کام کرنے والے چند آدمیوں کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔

اب اس جگہ پر چائے اور برگر اتنے برے نہیں تھے جتنے اس وقت تھے۔ پریزنٹیشن بھی بہت بہتر تھی، لیکن ان دونوں میں سے کوئی نہ ذائقے کو دیکھ رہا تھا نہ پریزنٹیشن کو۔ دونوں اپنے اپنے ماضی کو زندہ کر رہے تھے۔ یہ چند گھونٹ اور چند لقموں کی بات نہیں تھی، زندگی کی بات تھی جو نہ جانے ریل کی پٹریوں کی طرح کہاں کہاں سے گزر کر ایک اسٹیشن سے لے آئی تھی۔ وہ اس مقام پر کھڑے تھے، جہاں ان پٹریوں کا کاٹنا بدلا تھا۔ دور قریب... ایک دوسرے میں مدغم... اور اب ایک دوسرے کے ساتھ۔

اس راستے پر کچھ نئی یادیں بنی تھیں۔ ان کی شادی کے بعد سڑک کے راستے ان کا پہلا سفر اور ان نئی یادوں نے پرانی یادوں کو دھندلانے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

ٹیبل پر بل کے پیسے رکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امامہ نے بھی اس کی پیروی کی۔ سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

اس کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ آئی تھی۔

”امامہ! وہ پسٹل کہاں ہے؟“

وہ عمارت سے باہر آتے ہوئے اس کے سوال پر چونکی۔ اسے کیا یاد آیا تھا، وہ ہنس پڑی۔

”ابو کے پاس ہے۔“ اس نے سالار سے کہا۔

”تم واقعی چلا سکتی تھیں؟“ سالار نے پتا نہیں کیا یقین دہانی چاہی۔

”ہاں۔“ امامہ نے سر ہلایا۔

”لیکن اس میں گولیاں نہیں تھیں۔“ وہ اس کے اگلے جملے پر بے اختیار ٹھٹکا۔

”میرے پاس بس پسٹل ہی تھا۔“ وہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

اس نے بے اختیار سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں دھول اس نے جھونکی تھی یا اللہ نے،

وہ اندازہ نہیں کر سکا۔ اس پسٹل نے اسے جتنا شاک اور غصہ دلایا تھا اگر اسے اندازہ ہو

جاتا کہ وہ بلٹس کے بغیر تھا تو سالار اس دن امامہ کو پولیس کے ہاتھوں ضرور اریسٹ

کروا کر آتا۔ وہ پسٹل ہاتھ میں لیے کیوں اتنی پر اعتماد نظر آئی تھی اسے... یہ اسے اب

سمجھ میں آیا تھا۔

”تم ڈر گئے تھے۔“ امامہ ہنس رہی تھی۔

”نہیں... ڈراتو نہیں تھا، مگر شاکڈرہ گیا تھا۔ تم سارا راستہ روتی رہی تھیں۔ میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم مجھ پر پستل نکال لو گی۔ تمہارے آنسوؤں نے دھوکا دیا مجھے۔“

وہ اب کچھ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔

وہ دونوں اب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ بیٹھنے کے بعد بھی جب وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بجائے، ونڈ سکرین سے باہر دیکھتا رہا تو امامہ نے اس سے کہا۔

”گاڑی کیوں نہیں اسٹارٹ کر رہے؟“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”مجھے کیوں یہ خیال نہیں آیا کہ تمہارا پستل خالی بھی ہو سکتا ہے... کیوں خیال نہیں

آیا...؟“ وہ جیسے بڑبڑھایا ہوا ایک بار پھر کراہا۔

”اب رونامت۔“ امامہ نے اسے چھیڑا۔ ”ویسے کیا کرتے تم اگر تمہیں یہ پتا چل جاتا؟“

”میں سیدھا جا کر پولیس کے حوالے کرتا تمہیں۔“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں شرم نہ آتی؟“ امامہ بگڑی۔

”تمہیں آئی تھی، جب تم نے مجھ پر پستل نکال لیا تھا، میں محسن تھا تمہارا۔“ سالار نے بھی اسی انداز میں کہا۔

”محسن تھے... تم مجھے دھمکا رہے تھے۔“

”جو بھی تھا، کم از کم میں یہ ڈیزرو نہیں کرتا تھا کہ تم گن پوائنٹ پر رکھ لیتی مجھے۔“

لیکن میں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔“ امامہ نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

”تو میں نے کون سا نقصان پہنچایا تھا؟“ گاری اب دوبارہ مین روڈ پر تھی۔

لاہور کی حدود میں داخل ہونے تک امامہ اس سے ایک بار پھر خفا ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆

وہ اگلے دو تین دن تک اسلام آباد کے ٹرانس میں ہی رہی... وہ وہاں جانے سے جتنی خوف زدہ تھی اب وہ خوف یک دم کچھ ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس کا حتمی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ اب اسلام آباد کے اگلے دورے کی منتظر تھی۔ اس گیسٹ روم کی کھڑکی میں کھڑے سار دن کس کو، کس وقت دیکھا تھا، وہ اگلے دو تین دن سالار کو بھی بتاتی

رہی اور تیرے دن اس کی تان ایک جملے پر آکر ٹوٹی تھی۔

”سالار! ہم اسلام آباد میں نہیں رہ سکتے؟“

سالار بیڈ پر بیٹھالیپ ٹاپ گود میں رکھے کچھ ای میلز کرنے میں مصروف تھا، جب امامہ نے اس سے پوچھا۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس سے صرف اسلام آباد کی ہی باتیں کر رہی تھی اور سالار بے حد تحمل سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا جواب بھی دے رہا تھا۔

”نہیں۔“ اپنے کام میں مصروف سالار نے کہا۔

”کیوں؟“

”کیوں کہ میری جاب یہاں ہے۔“

”تم جاب بدل لو۔“

”نہیں بدل سکتا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

”میں اسلام آباد میں نہیں رہ سکتی؟“

اس بار سالار نے بالآخر اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”اس بات کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ میں وہاں رہ لوں گی تم ویک اینڈ پر آجایا کرنا۔“

ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ وہ مذاق کر رہی ہے لیکن وہ مذاق نہیں تھا۔

”میں ہر ویک اینڈ پر اسلام آباد نہیں جاسکتا۔“ اس نے بے حد تحمل سے اسے بتایا۔ وہ

کچھ دیر خاموش رہی۔ سالار دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تو تم مہینے میں ایک دفعہ آجایا کرو۔“

وہ اس کے جملے سے زیادہ اس کے اطمینان پر ٹھٹکا تھا۔

”بعض دفعہ میں مہینے میں ایک بار بھی نہیں آسکتا۔“ اس نے کہا۔

”تو کوئی بات نہیں۔“

”یعنی تمہیں فرق نہیں پڑتا؟“ وہ ای میلز کرنا بھول گیا تھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ امامہ نے بے ساختہ کہا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس

کے احساسات کو اتنی صفائی سے زبان دے گا۔

”پاپا اور مئی اکیلے ہوتے ہیں وہاں، اس... ”سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”وہ وہاں اکیلے نہیں ہوتے۔ عمار اور یسریٰ ہوتے ہیں ان کے پاس، وہ دونوں آج کل پاکستان سے باہر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پاپا اور مئی بڑی سوشل لائف گزار رہے ہیں۔ ان کو تمہاری سروسز کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنے مجھے ہے۔ ”سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش اس کی گود میں پڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو گھورتی رہی، پھر بڑبڑائی۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”میں اسلام آباد میں خوش رہوں گی۔“

”یعنی میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟“ وہ جزبز ہوا۔

”وہاں زیادہ خوش رہوں گی۔“ وہ اب بالآخر صاف صاف اپنی ترجیحات بتا رہی تھی۔

”پاپا ٹھیک کہتے تھے مجھے تمہیں اسلام آباد نہیں لے کر جانا چاہیے تھا۔ ماں باپ کی بات سننی چاہیے۔“ وہ بے اختیار پچھتا یا۔ ”دیکھو! اگر میں تمہیں اسلام آباد بھیج دیتا ہوں تو کتنی دیر رہ سکتی ہو تم وہاں، ہمیں اگلے سال پاکستان سے چلے جانا ہے۔“ وہ اسے

پیار سے سمجھانے کی ایک اور کوشش کر رہا تھا۔

”تو کوئی بات نہیں، تم پاکستان تو آیا کرو گے نا۔“

سالار کا دل خون ہوا۔ زندگی میں آج تک کسی نے اس کی ذات میں اتنی عدم دل چسپی نہیں دکھائی تھی۔

میں امریکا میں رہوں اور میری بیوی یہاں ہو، اتنا بنا رمل لائف اسٹائل نہیں رکھ سکتا میں۔“

اس نے اس بار دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر چند لمحوں کے بعد سالار نے اس کے کندھے پر بے حد محبت اور ہمدردی سے اپنا ہاتھ رکھا۔

”سالار! تم دوسری شادی کر لو اور دوسری بیوی کو ساتھ لے جانا۔“

اس بار جیسے اس کے حواس غائب ہوئے۔ اگر یہ مذاق تھا۔ تو بے ہود تھا اور اگر واقعی تجویز تھی تو بے حد سنگدلانہ تھی۔ وہ کئی لمحے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے۔ وہ شادی کے تیرے ہفتے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی تھی تاکہ وہ اپنے ماں باپ کے قریب رہ سکے۔

”سنو! میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔“ امامہ نے اس کے تاثرات سے کچھ نروس ہوتے ہوئے اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ سالار نے بڑی بے رخی سے اپنے نیچے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”خبردار! آئندہ میرے سامنے تم نے اسلام آباد کا نام بھی لیا اور اپنے احمقانہ مشورے اپنے پاس رکھو۔ اب میرا دماغ چاٹنا بند کرو اور سو جاؤ۔“ وہ بری طرح بگڑا تھا۔

اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر وہ بے حد خفگی کے عالم میں بیڈروم سے نکل گیا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ اس وقت اسے واقعی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اپنے ماں باپ کی محبت میں وہ کتنے احمقانہ انداز میں سوچنے لگی تھی۔

لائٹس آفس کر کے اس نے کچھ دیر کے لیے سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ اسے بار بار اب سالار کا خیال آرہا تھا۔ چند لمحے لیٹے رہنے کے بعد وہ یک دم اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ لاؤنج کا ہیٹر آن کیے، قریب پڑے صوفے پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ٹھٹکا تھا۔

”اب کیا ہے؟“ امامہ کو دکھتے ہی اس نے بے حد خفگی سے کہا۔

”کچھ نہیں، میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔“ وہ اس کے سختی سے پوچھنے پر کچھ جزبہز ہوئی۔

”کافی بنا دوں تمہیں؟“ وہ مصالحانہ انداز میں بولی۔

”مجھے ضرورت ہوگی تو میں خود بنالوں گا۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔

وہ اس کے قریب صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ کچھ کہے بغیر اس نے سالر کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے کندھر پر سر ٹکا دیا۔ یہ ندامت کا اظہار تھا۔ سالار نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ پر اپنا کام کرتا رہا لیکن یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اس کے اتنے قریب بیٹھی ہو اور وہ اسے نظر انداز کر دے... کر دیتا اگر صرف اس کی بیوی ہوتی... یہ ”امامہ“ تھی۔ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر چلتی اس کی انگلیاں تھمنے لگیں، پھر ایک گہرا سانس لے کر وہ بڑبڑایا۔

”اب اس طرح بیٹھو گی تو میں کام کیسے کروں گا؟“

”تم مجھے جانے کا کہہ رہے ہو؟“ امامہ نے برامانا۔

”میں تمہیں جانے کا کہہ سکتا ہوں؟“ اس نے اس کا سر چوما۔ ”بہت احمقانہ بات کہی

تھی تم نے مجھے۔”

ایسے ہی کہا تھا، مجھے کیا پتا تھا تم اتنی بد تمیزی کرو گے میرے ساتھ؟ ”وہ ہکا بکار ہا گیا۔
 ”بد تمیزی... کیا بد تمیزی کی ہے میں نے...؟ تمہیں ایکسیوز کرنا چاہیے جو کچھ تم نے مجھ
 سے کہا۔”

وہ سمجھا، وہ ندامت کا اظہار کرنے آئی ہے، لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ امامہ نے بے
 حد خفگی سے اس کا کندھے سے اپنا سراو پر اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔
 ”اب میں ایکسیوز کیا کروں تم سے...؟

”سالار نے اس کی اٹھی ہوئی ٹھوڑی دیکھی۔ کیا مان تھا...؟ کیا غرور تھا...؟ جیسے وہ اس
 سے یہ تو کروا ہی نہیں سکتا۔

”ایکسیوز کروں تم سے؟ ”خفاسی آنکھوں اور اٹھی ٹھوڑی کے ساتھ وہ پھر پوچھ رہی
 تھی۔

سالار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جھک کر اس کی ٹھوڑی کو چوما، یہ مان اسے ہی رکھنا
 تھا۔ وہ اس کا سر جھکا دیکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔

”نہیں، تم سے ایکسکیوز کروا کر کیا کروں گا میں۔“

وہ بے حد نرمی سے اس کی ٹھوڑی کو دوبارہ چومتے ہوئے بولا۔

امامہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ کیا غرور تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ ہاں، وہ کیسے اس سے یہ کہہ سکتا تھا۔ اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔

”اچھا، اب تم ایکسکیوز کرو مجھ سے، کیوں کہ تم نے بد تمیزی کی ہے۔“

وہ اب اطمینان سے مطالبہ کر رہی تھی، وہ مسکرا دیا۔ وہ معترف سے اعتراف چاہتی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ سالار نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، اب آئندہ تم یہ نہ کہنا کہ میں اسلام آباد کی بات نہ کروں۔“ وہ بے حد فیاضانہ انداز میں اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے بولی۔

سالار کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلی تو سارا مسئلہ اسلام آباد کا تھا۔ اسے شاید یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ وہ دوبارہ اسے وہاں نہیں لے کر جائے گا اور وہ اسی خدشے کے

تحت اس کے پاس آئی تھی۔ کیا انداز دلبری تھا، وہاں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جو بھی تھا، کسی کے طفیل تھا۔ وہ ہنس پڑا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے الجھ کر سالار کو دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ سالار نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے بڑی نرمی اور محبت سے اسے اس طرح گلے لگا کر اس کا سر اور ماتھا چوما، جس طرح وہ روز آفس سے آنے کے بعد دروازے پر اسے دیکھ کر کرتا تھا۔

”گڈ نائٹ۔“ وہ اب اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”گڈ نائٹ۔“ وہ اپنی شال لپیٹتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بیڈروم کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ الوداعیہ انداز میں مسکرا دی، وہ بھی جواباً مسکرایا تھا۔ امامہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ بہت دیر تک اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔

یہ عورت جس مرد کی زندگی میں بھی ہوتی، وہ خوش قسمت ہوتا لیکن وہ خوش قسمت نہیں تھا۔ ”خوش قسمتی“ کی ضرورت کہاں رہ گئی تھی اسے!



”حبیب صاحب کی بیوی نے کئی چکر لگائے میرے گھر کے... ہر بار کچھ نہ کچھ لے کر آتی تھیں آمنہ کے لیے۔“

کہتی تھیں ہمیں جہیز نہیں چاہیے، بس آمنہ کا رشتہ دے دیں۔ کہتی کیا تھیں بلکہ منتیں کرتی تھیں... امامہ کے دفتر اپنے بیٹے کو بھی لے گئیں ایک دن... بیٹا بھی خود آیاماں کے ساتھ ہمارے گھر... بچپن سے پلا بڑھا تھا میری نظروں کے سامنے...”

وہ صحن میں چار پائی پر بیٹھا سر جھکائے، سرخ اینٹوں کے فرش پر نظریں جمائے سعیدہ اماں کی گفت گو پچھلے آدھے گھنٹے سے اسی خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اس کی خاموشی سعیدہ اماں کو بری طرح تپا رہی تھی۔ کم بخت نہ ہوں نہ ہاں، کچھ بولتا ہی نہیں۔ مجال ہے ایک بار ہی کہہ دے کہ آپ نے اپنی بچی کی شادی میرے ساتھ کر کے میری بڑی عزت افزائی کی یا یہی کہہ دے کہ بہت گنوں والی ہے آپ کی بچی۔ وہ باتوں کے دوران مسلسل کھول رہی تھیں۔

اتوار کا دن تھا اور وہ امامہ کے ساتھ صبح باقی کا سامان ٹھکانے لگانے آیا تھا۔ وہ الیکٹرونکس اور دوسرے سامان کو کچھ چیریٹی اداروں میں بھجوانے کا انتظام کر کے آیا تھا۔ امامہ نے

اس پر اعتراض نہیں کیا تھا لیکن سعیدہ اماں کو ان دونوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ سامان ان کے گھر نہیں، کہیں اور بھجوا یا جا رہا ہے۔

سہ پہر ہو رہی تھی اور وہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہیں دھوپ میں صحن میں بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ امامہ اندر کچن میں افطاری اور کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ انہیں آج افطاری وہی کرنی تھی۔

دھوپ کی وجہ سے سالار نے اپنا سویٹر اتار کر چارپائی کے ایک کونے پہ رکھ دیا تھا۔ جینز کی جیب میں رکھا ایک رومال نکال کر اس نے چہرے پر آئی ہلکی سی نمی کو پونچھا۔ یہ امامہ کے رشتے کی چوتھی داستان تھی، جو ہوسن رہا تھا۔

بیسن کو برتن میں گھولتے ہوئے امامہ نے صحن میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے سالار کو دیکھا، اسے اس پر ترس آیا۔ وہ کچن میں سعیدہ اماں کی ساری گفت گو سن سکتی تھی اور وہ گفت گو کس حد تک ”قابل اعتراض“ ہو رہی تھی، وہ اس کا اندازہ کر رہی تھی۔ تین دفعہ اس نے مختلف بہانوں سے سعیدہ اماں کو آکر ٹالنے کی کوشش کی، گفت گو کو موضوع بدلا لیکن جیسے ہی وہ کچن میں آتی، باہر صحن میں پھر وہی گفت گو شروع ہو جاتی۔

اونچا لمبا جوان۔ قد تم سے کچھ آدھ فٹ زیادہ ہی ہوگا۔”

حبیب صاحب کے بیٹے کا حلیہ بیان کرتے ہوئے سعیدہ اماں مبالغے کے آخری حدوں کو چھو رہی تھیں۔ سالار کا اپنا قد چھ فٹ دو انچ کے برابر تھا اور آدھ فٹ ہونے کا مطلب تقریباً پونے سات فٹ تھا، جو کم از کم لاہور میں پایا جانا ممکن نہیں، تو مشکل ضرور تھا۔

”اماں! زیرہ نہیں مل رہا مجھے۔“ امامہ نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سعیدہ اماں کو کہا۔

اس کے علاوہ اب اور کوئی بھی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں اندر بلا لیتی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”ارے بیٹا! ادھر ہی ہے جدھر ہمیشہ ہوتا ہے۔ زیرے نے کہاں جانا ہے۔“ سعیدہ

اماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

امامہ نے زیرے کی ڈبیا کو سبزی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر اس نے سعیدہ اماں

کو زیرے کی تلاش میں مصرور رکھنا تھا، پھر بعد میں کچھ اور کام سونپ دیتی انہیں، وہ

پلان کر رہی تھی۔

”مولوی صاحب سے دم والا پانی لا کر دو گی تمہیں... وہی پلانا... اس سے دل موم ہوگا

اس کا۔”

سعیدہ اماں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے جو کچھ کہا، وہ نہ صرف امامہ نے، بلکہ باہر صحن میں بیٹھے سالار نے بھی سنا تھا۔

”کیوں... کیا ہوا...؟“ امامہ نے چونک کر پوچھا۔ وہ آلوکاٹ کر بین میں ڈال رہی تھی۔

”کیسا پتھر دل ہے اس کا... مجال ہے کسی بھی بات میں ہاں میں ہاں ملائے۔“ وہ دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔

”اماں! اب آپ اس طرح کی باتیں کریں گی تو وہ کیسے ہاں میں ہاں ملائے گا۔ آپ نہ کیا کریں اس طرح کی باتیں، اسے برا لگتا ہوگا۔“ امامہ نے دبی آواز میں سعیدہ اماں کو منع کیا۔

”کیوں نہ کروں، اسے بھی تو پتا چلے کوئی فالٹو چیز نہیں تھی ہماری بچی... لاکھوں میں ایک، جسے ہم نے بیاہا ہے اس کے ساتھ... یہ زیرہ کہاں گیا...؟“ سعیدہ اماں بات کرتے ہوئے ساتھ زیرے کی ڈبیا کی گمشدگی پر پریشان ہونے جلگئیں۔

”میں نے آپ سے کہا ہے نا! اب وہ ٹھیک ہے میرے ساتھ۔“ امامہ نے اماں کو

سمجھایا۔

”تو بڑی صابر ہے بیٹا... میں جانتی نہیں ہوں کیا... بات تو کرتا نہیں میرے سامنے تجھ سے... بعد میں کیا کرتا ہوگا۔“ سعیدہ اماں قائل نہیں ہوئی تھیں۔

صحن میں چار پائی پر بیٹھے سالار نے جوتے اتار دیے۔ سویٹر کو سر کے نیچے رکھتے ہوئے وہ چار پائی پر چت لیٹ گیا۔ اندر سے اماں اور سعیدہ اماں کی باتوں کی آوازاں بھی آرہی تھی لیکن سالار نے ان آوازوں سے توجہ ہٹالی۔ وہ سرخ اینٹوں کی دیوار پر چڑھی سبز پتوں والی بیلین دیکھ رہا تھا۔ دھوپ اب کچھ ڈھلنے لگی تھی مگر اس میں اب بھی تمازت تھی۔ برابر کے کسی گھر کی چھت سے چند کبوتر اڑ کر صحن کے اوپر سے گزرے۔ ان میں سے ایک کبوتر کچھ دیر کے لیے صحن کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس نے دھوپ میں ایسا سکون پایا تھا۔ دھوپ میں سکون نہیں تھا، زندگی میں سکون تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بڑے غیر محسوس انداز میں اس کے سر کے نیچے ایک تکیہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دکھ کر اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”گردن تھک جاتی اس طرح تمہاری۔“ اس نے سالار کا سویٹر نکالتے ہوئے کہا۔

سالار نے کچھ کہے بغیر تکیہ سر کے نیچے لے لیا۔ وہ اس کا سویٹر تہہ کرتے ہوئے۔ اپنے بازو پر ڈالتے اندر چلی گئی۔ ایسی ناز برداری کا کہاں سوچا تھا اس نے... اور وہہ دیسی ناز برداری چاہتا تھا کہاں تھا اس سے... ساتھ کی خواہش تھی وہ مل گیا تھا... کچھ اور ملتا نہ ملتا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”سو گیا ہے کیا؟“ سعیدہ اماں نے کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے اندر آتی امامہ سے پوچھا۔

”جی، سو رہا ہے۔“
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 ”اچھا، میں نے تو سوچا تھا بھی اور تھوڑا سا سمجھاؤں گی اسے، یہ سو کیوں گیا؟“

سعیدہ اماں کو مایوسی اور تشویش ایک ساتھ ہوئی تھی۔

”تھک گیا ہے اماں... آپ نے دیکھا تو ہے کتنا کام کیا ہے اس نے... مزدوروں کے ساتھ مل کر سامان اٹھوایا، کل بھی گھر میں کام کرواتا رہا ہے۔ آج کل بینک میں بھی بہت مصروف رہتا ہے۔“ امامہ مدھم آواز میں اماں کو بتاتی گئی۔

اس نے کچن کی کھڑکی بند کر دی تھی۔ سالار کی نیند کتنی کچی تھی، اسے اندازہ تھا۔

”ہاں! لیکن...“ امامہ نے بے اختیار سعیدہ اماں کو آہستہ سے ٹوکا۔

”اماں! آہستہ بات کریں، وہ اٹھ جائے گا پھر۔“

”دیکھ، تجھے کتنا خیال ہے اس کا... اور ایک وہ ہے...“ سعیدہ اماں رنجیدہ ہوئیں۔

امامہ اب بری طرح چپچھتا رہی تھی۔ سالار کے بارے میں وہ سعیدہ اماں سے اس طرح کی غیبت نہ کرتی تو سعیدہ اماں اسے ”قابل اعتبار“ سمجھتیں۔ اب مسئلہ یہ ہو رہا تھا کہ سعیدہ اماں کو اس کی لاکھ یقین دہانیوں کے باوجود بیٹھے بٹھائے سالار کی پہلی بیوی کے حوالے سے بتا نہیں کیا کیا خدشات ستاتے رہتے، انہیں جیسے یقین تھا کہ امامہ ان سے ضرور کچھ چھپانے لگی ہے۔ وہ سالار کے ساتھ اتنی خوش نہیں تھی، جتنا وہ ظاہر کرتی تھی، اور اس تاثر کی بنیادی وجہ سالار کی وہ مکمل خاموشی تھی، جو وہ سعیدہ اماں کی امامہ کے سلسلے میں کی جانے والی باتوں پر اختیار کرتا تھا۔ سالار کی خاموشی کی وجہ اس گفت گو کی نوعیت تھی، جو سعیدہ اماں اس سے کرتی تھیں۔

ایک چیز جو امامہ نے اس ساری صورتِ حال میں سیکھی تھی، وہ یہ تھی کہ اسے اپنے شوہر کے بارے میں، کچھ کسی دوسرے سے کوئی شکایت نہیں کرنی۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے کچھ لفظ اب اسی پر بہت بھاری پڑ رہے تھے۔

”بس افطار اور کھانے کے لیے یہی کچھ... میں نے

وہ اس ہفتے پھر اسے اپنے ساتھ کراچی لے کر گیا۔ لیکن اس بار رات کی فلائٹ سے واپس آگئے تھے وہ۔ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ اسی ہوٹل میں رہے۔ سالار آفس میں مصروف رہا جبکہ وہ انیتا کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ سالار سے اسکی دوبارہ ملاقات اسی طرح رات فلائٹ سے پہلے ہوئی تھی۔ وہ کچھ چپ تھی۔ سالار نے محسوس کیا لیکن اس کے ساتھ اس فلائٹ میں اسکے بنک کے کچھ غیر ملکی عہدیداران بھی سفر کر رہے تھے۔ امامہ سے اسکو بات کرنے کا موقع ایر پورٹ سے واپسی پر ملا۔ کار پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے امامہ سے پہلا سوال یہی کیا۔

تم اتنی خاموش کیوں ہو؟

کس سے باتیں کروں؟ تم تو مصروف تھے۔ امامہ نے جواباً کہا۔

چلو اب بات کرو۔ سالار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

کیسا رہا آج کا دن؟

بس ٹھیک تھا۔

کہا گئی تھی آج تم؟

اس نے سالار کو ان تین جگہوں کے نام بتائے جہاں وہ انیتا کے ساتھ گئی تھی۔ مگر سالار کو اسکی باتوں میں پچھلی دفعہ کی طرح جوش نظر نہیں آیا۔

تمہاری پے کتنی ہے سالار؟ وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

وہ سجدہ سنجیدہ تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

نو کمنٹس۔



میں بھی سیریس ہوں۔ میں شوہر ہوں تمہارا لیکن بے وقوف نہیں۔

جس اپارٹمنٹ میں ہم رہ رہے ہیں وہ تمہارا ذاتی ہے؟

اگلے سوال نے سالار کو اور زیادہ حیران کیا۔

نہیں یہ ریٹنڈ ہے۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔

اپنے جواب پر اسے امامہ کے چہرے پر مایوسی اتنی صاف نظر آئی کہ اب وہ بھی سنجیدہ

ہو گیا۔

ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ میں سمجھی تمہارا اپنا ہوگا۔

میں سوچ رہی تھی کہ تم نے مجھے جو پیسے دیے ہیں اس سے ہم کوئی پلاٹ خرید لیں۔

امامہ۔۔۔۔۔ کیا پرابلم ہے؟ سالار نے اس بار اسکے کندھوں کے گرد بازو ہھیلاتے

ہوئے کہا۔

کوئی پرابلم نہیں۔ اپنا گھر تو بنانا چاہیے نا ہم کو۔ وہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

تم اینٹا کا گھر دیکھ کر آئی ہو؟ ایک جھماکے کی طرح سالار کو خیال آیا تھا۔

ہاں۔۔۔۔۔ امامہ نے سر ہلایا۔ سالار نے گہرا سانس لیا۔ اسکا اندازہ ٹھیک نکلا۔

بہت اچھا گھر ہے نا اسکا؟ وہ اب سالار سے کہی رہی تھی۔

ہاں بہت اچھا ہے۔ سالار نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

تم نے سوئمنگ پول کی بوٹ دیکھی ہے؟

نہیں میں نے کافی مہینوں پہلے انکا گھر دیکھا تھا تب وہ انٹیریر نہیں ہوا تھا۔

ویسے سوئمنگ پول میں بوٹ کا کیا کام؟

اصلی والی نہیں ہے۔ چھوٹی سی ہے۔ لکڑی کی لگتی ہے لیکن کسی اور میٹیریل سے بنی ہے۔ اس پر ایک چھوٹی سی ونڈل ہے اور وہ ہوا سے اس سارے سوئمنگ پول میں حرکت کرتی رہتی ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اسکا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اسے کشتی کی ایک ایک چیز بتا رہی تھی۔

انتانے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر۔ اس کے خاموش ہونے پر سالار نے کہا۔

کیوں؟ وہ چونکی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میری شادی کے تیسرے ہفتے میری بیوی کو اپنا گھر دکھا دیا۔

کہیں زمین خرید لیتے ہیں سالار۔ امامہ نے اسکی بات نظر انداز کی۔

امامہ! میرے پاس دو پلاٹ ہیں۔ پاپانے دیئے ہیں۔ اسلام آباد میں تو گھر بنانا اتنا بڑا

مسئلہ نہیں ہے۔ سالار نے اسے تسلی دی۔

کتنے بڑے پلاٹ ہیں؟ وہ ایک دم پر جوش ہوئی۔

دس دس مرلے کے ہیں۔

بس؟ کم از کم ایک دو کنال تو ہونا چاہیے۔ وہ ایک دم مایوس ہوئی۔

ہاں دس مرلے کم ہیں۔ دو کنال تو ہونا چاہیے۔ سالار نے تائید کی۔

نہیں۔ دونہ ہو۔ ایک بھی کافی ہے۔ اس میں ایک سبزیوں کا فارم بنائیں گے۔ جانور

بھی رکھیں گے۔ ایک سمر ہاؤس بنائیں گے۔ اور ایک فش فارم بھی بنالیں گے۔

سالار کو لگا امامہ کو جگہ اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی تھی۔

ایک کنال میں یہ سب کچھ نہیں بن سکتا امامہ۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ وہ چونکی۔

لیکن میں تو ایکڑ کی بات کر رہی تھی۔

وہ چند لمحے بھونچکا سا رہ گیا۔

اسلام آباد میں تمہیں ایکڑ زمین زمین کہاں سے ملے گی۔ چند لمحوں بعد اس نے سنبھل

کر کہا۔

اسلام آباد سے باہر تو مل سکتی ہے نا؟ امامہ سنجیدہ تھی۔

تم پھر گھر نہ کہو۔ یہ کہو کہ فارم ہاؤس بنانا چاہتی ہو تم۔

نہیں۔۔ فارم ہاؤس نہیں۔ ایک بڑی سی کھلی سی جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر۔ جیسے کوئی
وادی۔۔ اس طرح کی وادی میں گھر۔۔

پاپاکا بھی ایک فارم ہاؤس ہے۔ کبھی کبھار جاتے ہیں ہم لوگ۔۔۔ تمہیں بھی لے
جاؤں گا وہاں۔ سالار نے اسے پھر ٹالا۔

میں فارم ہاؤس کی بات نہیں کر رہی اصلی والے گھر کی بات کر رہی ہوں۔۔ امامہ اب
بھی اپنی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔

جس طرح کامیرا پروفیشن ہے امامہ اس میں فارم ہاؤسز یا شہر سے باہر رہائش رکھنا میں
افورڈ نہیں کر سکتا۔ کم از کم جب تک میں کام کر رہا۔

اور بڑے شہروں میں بہت مشکل ہے ایکڑز میں گھر بنانا۔ یہ تمہارے ان رومینٹک
ناولز میں ہو سکتا ہے لیکن ریل لائف میں نہیں۔ جو چیز ممکن ہے اور پریکٹیکل ہے وہ یہ
ہے کہ چند سالوں بعد کوئی لگژری فلیٹ لیا جائے۔ یادو چار کنال کا کوئی گھر بنا لیا جائے
اس سے زیادہ افورڈیبل نہیں۔ ہاں یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ پانچ دس سال بعد اسلام
آباد یا لاہور سے باہر کوئی فارم ہاؤس بنا لیا جائے۔ لیکن میں جانتا ہوں بیس یا تیس سال
میں ہم دس یا بیس بار سے زیادہ وہاں جا نہیں پائیں گے وہ بھی چند دنوں کے لیے۔ وہ

ہمارے لیے ایک سفید ہاتھی ثابت ہوگا۔ جس پر ہر ماہ ہمارے اخراجات ہوں گے۔
 سالار کو اندازہ نہیں تھا کہ اس نے ضرورت سے کچھ زیادہ صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔
 امامہ کا رنگ کچھ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ وہ حقیقت تھی جو وہ اسے دکھا رہا تھا۔ سالار نے اسے
 دوبارہ بولتے نہیں دیکھا۔ سارا رستہ اسکی خاموشی سالار کو چھبستی رہی۔
 اچھا تم گھر کا ایک سکیچ بنا دو میں دیکھوں گا اگر فیئر بیل ہو تو بنایا جاسکتا ہے۔
 یہ سونے سے پہلے سر سری انداز میں امامہ سے کہا تھا اور ایک سیکنڈ میں امامہ کے چہرے
 کا رنگ تبدیل ہوتے دیکھا۔ ایک چھوٹی سی بات اسے اتنا خوش کر دیگی اسے اندازہ
 نہیں تھا۔

سحری کے وقت جب وہ الارم کی آواز پر اٹھا تو وہ بستر میں نہیں تھی۔

تم آج پہلے اٹھ گئیں۔۔

وہ کچن میں کام کر رہی تھی جب سالار سحری کے لیے وہاں گیا۔ وہ جواب دینے کی

بجائے مسکرائی۔ سالار کو حیرت ہوئی

آج اس نے سحری ختم کرنے میں بڑی عجلت دکھائی تھی اور کیوں دکھائی تھی یہ راز

زیادہ دیر تک راز نہیں رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اپنا سکیچ بک اٹھالائی تھی۔

یہ میں نے سکیچ کر لیا ہے جس طرح کا گھر میں کہہ رہی تھی۔

سحری کرتے ہوئے سالار بری طرح چونکا تھا۔ وہ اپنی کسی ہدایت پر اتنا فوری عمل درآمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ سکیچ بک اسکے سامنے کھولے بیٹھی تھی۔ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سکیچ بک کو تھامے ہوئے سالار نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دوسری اس گھر پر جو سکیچ میں نظر آ رہا تھا۔ گھر سے زیادہ اسے اسٹیٹ کہنا زیادہ بہتر تھا۔ اس نے ہر وہ چیز شامل کی تھی جس کا ذکر اس نے رات کو کیا تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں کھلے سبزے میں ایک چھوٹا گھر جسکے سامنے ایک جھیل تھی اور اسکے ارد گرد چھوٹے چھوٹے سٹر کچرز تھے اور سمراؤس۔ اس نے اپنے سٹر کچرز کو کلر بھی کیا ہوا تھا۔ اور یہ آگے بھی ہے۔ اس نے سالار کو سکیچ بک بند کرتے دیکھ کر جلدی سے اگلا صفحہ پلٹ دیا۔

وہ اسکے گھر کا یقیناً عقبی حصہ تھا۔ جہاں پر اصطلبل اور اور پرندوں کی مختلف قسم کی رہائش گاہیں بنائی گئی تھی۔ اس میں وہ فٹ فارم بھی تھا جس کا وہ رات کو ذکر کر رہی تھی۔

وہ پلک جھپکتے ہی اٹھ کر سکیچ بک سمیت غائب ہو گئی۔

وہ کانٹا ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہ گیا۔ وہ ایک بہت مضحکہ خیز صورت حال کا سامنا کر رہا تھا۔ سالار سحری ختم کر کے بیڈروم میں آ گیا۔ امامہ صوفے پر سکیچ بک کھولے بیٹھی تھی۔ سالار کو دیکھ کر اس نے سکیچ بک بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

اگر تمہیں فوری طور پہ گھر چاہیے تو میں خرید دیتا ہوں تمہیں۔ اس نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے اس طرح کا گھر چاہیے۔ اس نے پھر سکیچ بک اٹھالی۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
ایک ایکڑ ہو یا نہ ہو لیکن ایسا ایک بنا دوں گا میں تمہیں۔ وعدہ۔ لیکن اب یہ ہوم مینیا کو اپنے سر سے اتارو۔

وہ امامہ کا کندھا تھکتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ بے اختیار مطمئن ہو گئی۔ وعدے کا لفظ کافی تھافی الحال اسکے لیے۔

ماہ رمضان کے باقی دن بھی اسی طرح گزرے تھے۔ عید کے فوراً بعد سالار کا بنک کوئی

نیا نو ایسمنٹ پلان لانچ کرنے والا تھا۔ اور وہ ان دنوں اسی سلسلے میں بہت مصروف رہا۔ امامہ کی مصروفیت کا دائرہ گھر سر شروع ہو کر گھر پہ ہی ختم ہوتا تھا۔ وہ اسے دن میں دو تین بار بنک سے چند منٹ کے لیے کال کر لیتا تھا۔

امامہ کا خیال تھا کہ وہ وقتی طور پر مصروف ہے اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ وقتی طور پر اپنی مصروفیت کو حتی الامکان کم کیے ہوئے تھا۔

بازاروں میں عید کی تیاریوں کی وجہ سے رش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کے باوجود اسے ہر رات ایک آدھ گھنٹے کے لیے باہر لے جایا کرتا تھا۔ وہ روزانہ رات کے اس ایک گھنٹے کا انتظار کرتی تھی۔

وہ عید سے دو دن قبل اسلام آباد آگئے تھے۔ کامران اور معیز اپنی فیملیز کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ ان سے فون پر بات کر چکی تھی لیکن سالار کی بیوی کی حیثیت سے یہ انکی پہلی ملاقات تھی۔ وہ سب اس سے بہت دوستانہ انداز سے ملے۔ وہ کون تھی وہ سب پہلے سے جانتے تھے۔ لہذا کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔

وہ سکندر عثمان کی وسیع و عریض سٹنگ ایریا میں بیٹھی، وہاں موجود تمام لوگوں کی گہ شپ سن رہی تھی۔ سالار کے تینوں بھائیوں کے سسرال اسلام آباد میں ہی تھی اور

اس وقت موضوع گفتگو تینوں بھائیوں کی سسرال کی طرف سے آنے والے قیمتی تحائف تھے جو عید پر انکے لیے بھیجے گئے تھے۔ امامہ کو وہاں بیٹھے شدید احساس کمتری ہوا۔ اسکے اور سالار کے پاس وہاں کسی دوسرے سے کسی تحفے کی تفصیلات شیئر کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

اسلام آباد آنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی سعیدہ اماں اور ڈاکٹر فرقان کے علاوہ انکی بیٹیوں نے بھی اسکے لیے کچھ کپڑے بھجوائے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز انکے ماں باپ کے گھر سے نہیں آئی تھی۔ کچھ چیزوں کی کمی انکی زندگی میں ہمیشہ رہنی تھی تم نے کیا بنوایا ہے عید کے لیے؟ کامران کی بیوی زوہانے اچانک پوچھا۔

میں نے؟ وہ گڑ بڑائی۔

چند لمحوں کے لیے سب کی نظریں اس پر جم گئی۔

سالار نے کپڑے لے کر دیئے ہے مجھے۔ قمیص شلوار ہی ہے۔

امامہ کے لیے تو عید کے کپڑے میں نے بھی بنوائے ہیں۔ یہ پہلی عید ہے اسکی۔ تم عید پر تو میرے والے کپڑے ہی پہننا۔ طیبہ نے مداخلت کرتے ہوئے اسے بتایا۔

تھی۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی اسکی اداسی کو اسلام آباد آنے کا نتیجہ ہی سمجھتا تھا۔ لیٹے لیٹے سالار نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اسکے ہاتھ کی گرفت میں اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔

تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

پھر کس سے شادی کرنی چاہیے تھی۔ وہ حیران ہوا۔

کسی سے بھی۔ میرے علاوہ کسی سے بھی۔

اچھا مشورہ ہے لیکن دیر سے ملا ہے۔ اس نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ہاتھ چھڑا دیا۔

تم پچھتا رہے ہو ناب؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں کیوں پچھتاؤں گا۔ وہ اب سنجیدہ ہو گیا۔

تمہیں پتہ ہو گا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سالار نے اسے روک دیا۔

نہیں مجھے نہیں پتا۔ تم بتا دو۔ وہ واقعی حیرت زدہ تھی۔

تمہارا بھی دل چاہتا ہو گا کہ کوئی تمہیں بھی کپڑے دے۔۔ تحائف دے

اور----- وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ اسکی آواز پہلے بھرائی اور پھر آنسو ٹپکنے لگے۔

وہ ہکا بکا اسکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جو بات اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھی وہ اسکے لیے احساس جرم بن رہی تھی۔

میرے خدایا۔۔۔ اما تم کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔۔۔۔۔ وہ واقعی ششدر تھا۔

وہ اپنی آنکھوں کو رگڑ کر صاف کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

بس تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ دلبرداشتہ تھی۔

بات تحفوں کی نہیں تھی بلکہ سسکی کی تھی جو لاؤنج میں بیٹھے ان لوگوں کے درمیان اس نے محسوس کی تھی۔

سالار نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے اسے گلے سے لگا کر تسلی دینے والے انداز میں

تھپکا۔ اسے تسلی نہیں ہوئی اس نے اسکا ہاتھ ہٹایا اور اٹھ کر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے تک

واش روم میں آنسو بہانے کے بعد اسکے دل کا بوجھ تو ہلکا نہیں ہوا البتہ اسکے سر میں درد

ہونے لگا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے جب واپس وہ کمرے میں آئی تو وہ کمرے کی لائٹ

آن کیئے ہوئے اسی طرح بیٹھا تھا۔ امامہ کو کچھ شرمندگی ہوئی۔ وہ اس سے کچھ نہ کہتی تو ٹھیک تھا۔ وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بیڈ کی دوسری طرف آکر لیٹ گئی۔ وہ بھی لائٹس آف کر کے لیٹ گیا۔ اس نے امامہ کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ اور یہ اسکے لیئے جیسے نعمت مترقبہ تھی۔

+++++

امامہ بی بی آپ اتنی عقلمند نہیں جتنا میں آپکو سمجھتا تھا۔ بہت ساری چیزیں ہیں جسمیں آپ خاصی حماقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

اگلی صبح گاؤں جاتے ہوئے ڈرائونگ کے دوران وہ سجد سنجیدگی سے اسے کہہ رہا تھا۔ وہ سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔

کیا ہو جاتا ہے تمہیں بیٹھے بٹھائے۔ کیوں الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو؟

تم اب مجھ سے اس طرح کی باتیں کر کے مجھے اپ سیٹ کر رہے ہو۔

اس نے نہایت بیزاری سے کہا۔

میں بات کروں گا۔ اس نے جو اباً سے ڈانٹا تھا۔

تم سے کسی نے کچھ کہا؟

نہیں۔

تو پھر؟

کہا نہیں لیکن پھر بھی دل میں سوچا تو ہو گا نا۔

تم انکے دلوں تک مت جاؤ جو میں کہہ رہا ہوں تم صرف وہ سنو۔ سالار نے اسکی بات کاٹ کر کہا۔ یہ بے معنی چیزیں ہیں، ایک نارمل اریج میرج ہوتی تو بھی میں سسرال سے کوئی تحائف لینا پسند نہیں کرتا۔ جن رواج کو میں پسند نہیں کرتا انکی وجہ سے کوئی حسرت اور پچھتاوے بھی نہیں مجھے۔۔۔۔۔

تم سے زیادہ کوئی قیمتی گفٹ ہو سکتا ہے میرے لیے؟ وہ جانتا تھا کہ وہ اسکی بات سے متاثر نہیں ہو رہی ہوگی۔ اس نے امامہ سے مزید کچھ نہ

کہا۔۔۔۔۔+++++

اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ اور اسکے اندر موجود چھوٹی بڑی عمارتوں نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو حیران کر دیا۔ اس نے سالار سے اس سکول اور دوسرے پراجیکٹس کے

بارے میں سرسری تذکرہ سنا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنا منظم ہو رہا ہے۔

کمپاؤنڈ میں آج صرف ڈسپنسری کھلی تھی۔ اور اس وقت بھی وہاں مریضوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ یہ عید کی تعطیلات تھی۔

سالار کی گاڑی کو کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے کمپاؤنڈ میں ہلچل مچ گئی۔ کیریئکر اسٹاف ایک دم الرٹ ہو گئے۔ وہاں کام کرنے والے اکثر افراد آج چھٹی پر تھے۔ اور جو وہاں موجود تھے انہوں نے کمپاؤنڈ کے آخری کونے میں انیکسی کے سامنے گاڑی رکنے کے بعد سالار کے ساتھ گاڑی سے نکلنے والی چادر میں ملبوس اس لڑکی کو دلچسپی سے دیکھا۔

انیکسی کا چوکیدار پہلا آدمی تھا جسے سالار نے اپنی بیوی سے متعارف کرتے ہوئے اپنی شادی کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ اور وہ جانتا تھا جب تک وہ عمارت کے دوسرے حصوں تک جائے گا تب تک اسکی شادی کی خبر ہر طرف پھیل چکی ہوگی۔

انیکسی کے سامنے موجود لان سے گزرتے ہوئے امامہ نے بڑی دلچسپی سے اپنے قرب و جوار میں نظر اڑائی۔ بہت عرصہ بعد وہ ایسی کھلی فضا میں سانس لے رہی تھی کچھ دیر کے لیے اداسی کی ہر کیفیت کو اس مے غائب ہوتے محسوس کیا۔

ہم یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔

انیکسی کے برآمدے میں پہنچتے ہی اس نے سالار سے کہا۔ جو چوکیدار سے دروازہ کھلوا رہا تھا۔۔

نہیں۔۔۔۔۔ یہاں کچھ دیر بعد تمہیں سردی لگے گی۔ اندر لاؤنج میں بیٹھ کر بھی تمہیں یہ سب کچھ اسی طرح نظر آئے گا۔ فی الحال ذرا میں ڈسپنسری کا ایک راؤنڈ لوں گا تمہیں اگر یہاں بیٹھنا ہے تو بیٹھ جاؤ۔ سالار نے اس سے کہا۔

نہیں۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اس نے فوراً کہا۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
کبھی ہم بھی یہاں رہنے کے لیے آئے گے۔ اس نے بے اختیار کہا۔

اچھا۔۔۔۔۔ امامہ کو لگا جیسے وہ اسے بہلا رہا ہے۔۔۔۔۔ دس منٹ بعد وہ اسے مرکزی عمارت اور اس سے منسلک دوسرے حصے دکھا رہا تھا۔ اور سٹاف کو کچھ ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔

وہ سب لوگ کہہ رہے ہیں مٹھائی کھلائے جی۔ جو چوکیدار نے سالار کو دوسرے لوگوں کی فرمائش سنا دی۔

چلیں۔۔۔ آج افطار اور افطار ڈنر کا انتظام کر لیں۔ میں اکاؤنٹنٹ کو بتا دیتا ہوں۔ سالار نے مسکرا کر کہا۔

دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد جو وہ اسکے ساتھ وہاں سے نکلی تو پہلی بار اپنے دل میں اسکے لیے عزت کے کچھ جذبات لیے ہوئے تھی۔

یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟ اس نے رستے میں اس سے پوچھا۔

اپنی بخشش کے لیے۔ جواب غیر متوقع تھا لیکن کہنے والا بھی تو سالار سکندر تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے رحمدل ہو۔ چند لمحے خاموش رہ کر امامہ نے اس سے کہا۔

نہیں۔۔۔ رحمدل نہیں ہوں نا ہی ترس کھا کہ کسی لے لیے کچھ کر رہا ہوں۔ ذمہ داری

سمجھ کے کر رہا ہوں۔ رحمدل ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا۔ آخری جملہ اس نے جیسے بڑ بڑاتے

ہوئے کہا۔

کیسے شروع کیا یہ سب کچھ۔؟

وہ اسے فرقان سے اپنی ملاقات اور اس پراجیکٹ کے آغاز کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ

چہ چاپ سنتی رہی۔

اس کے خاموش ہونے پر اس نے جیسے سراہنے والے انداز میں کہا۔۔ بہت مشکل کام تھا۔۔۔۔

نہیں وہ لائف سٹائل بدلنا زیادہ مشکل تھا جو میرا تھا۔

وہ چند لمحے بول نہ سکی۔ اسکا اشارہ جس طرف تھا اسے یاد کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔۔۔

ہر کوئی اس طرح کا کام نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ مدھم آواز میں بولی۔۔

ھر کوئی کر سکتا کے لیکن کرنا نہیں چاہتا۔ سروس آف ہیومینیٹی کسی کی چیک لسٹ پر نہیں ہوتی، میں خوش قسمت تھا کہ آگئی۔ وہ ہنسا۔۔۔۔

تم بہت بدل گئے ہو، امامہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرایا۔۔

زندگی بدل گئی تھی میں کیسے نہ بدلتا۔۔۔۔ نہ بدلتا تو سسرال سے آنے والے عید کے

تحائف کے انتظار میں بیٹھا ہوتا۔

امامہ نے اسکے طنز کا برا نہیں مانا۔۔

میں مانتی ہوں کے میں بہت ٹپیکل ہوں۔۔ اس نے اعتراف کیا۔۔

ٹپیکل نہیں ہو، زندگی کو دیکھا نہیں ہے ابھی تم نے۔ وہ سنجیدہ ہوا۔

کم از کم یہ تو نہ کہو، مجھے زندگی نے بہت کچھ دکھایا اور سکھایا ہے۔ امامہ نے کچھ رنجیدگی سے اسکی بات کاٹی تھی۔

مثلاً کیا؟؟؟ سالار نے پوچھا۔

کیا نہیں سکھایا زندگی نے، گنوا نہیں سکتی میں۔ بہت سبق سکھائے ہیں زندگی نے مجھے۔ سبق سکھائے ہونگے گر نہیں۔۔

امامہ نے چونک کر اسکا چہرہ دیکھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ سیدھی باتیں کبھی بھی نہیں کرتا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اچھا لگ رہا ہوں کیا؟ سڑک پر نظریں جمائے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

کیا؟؟؟ وہ اسے دیکھتے ہی بری طرح گڑ بڑائی۔

تم مجھے دیکھ رہی ہو، اس لیے ہو چھ رہا ہوں،۔۔ امامہ نے حیرانی سے اسکا چہرہ دیکھا پھر بے اختیار ہنس پڑی۔ چند لمحوں کے لیے واقعی وہ اسے بے حد اچھا لگا تھا۔۔۔

عید کے چاند کا اعلان عشاء سے کچھ پہلے ہوا تھا اور اس اعلان کے فوری بعد سکندر نے ان دونوں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی شاپنگ مکمل کر کے واپس آنے کا کہا تھا۔ انہوں نے شاپنگ نہیں کی تھی بلکہ ایک ریسٹورنٹ سے ڈنر کیا۔ اسکے بعد مہندی لگوا کر اور چوڑیاں خرید کر واپس آگئی تھی۔ سالار کم از کم آج رات واقعی محتاط تھا۔ اور سکندر کی ہدایات کو نظر انداز نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ امامہ کے گھر میں مسلسل گاڑیوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ اور وہ لوگ بھی انہی مارکیٹس میں جاتے تھے جہاں سالار کی فیملی جاتی تھی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب وہ گھر پہنچے تھے۔ اور اس وقت گھر میں کوئی موجود نہ تھا۔ سالار پچھلے دو گھنٹوں سے مختلف لوگوں کی فون کالز سن رہا تھا۔ یہ سلسلہ گھر آنے تک جاری تھا۔ امامہ بیزار ہونے لگی تھی۔

چلو کافی بناتے ہیں اور پھر فلم دیکھتے ہیں۔۔ سالار نے بلا آخر اسکی بیزارگی کو محسوس کر لیا تھا۔

میں ہاتھ دھولوں؟ امامہ نے ہاتھوں پر لگی مہندی کو دیکھ کر کہا۔

نہیں،،، میں بناؤں گا کافی، تم بس میرے ساتھ کچن میں آ جاؤ۔۔۔

تم بنا لو گے؟

بہت اچھی۔۔۔۔ اس نے سیل آف کرتے ہوئے ٹیبل پر رکھا۔

مہندی لگے ہوئے دونوں ہاتھ کچن کی ٹیبل پر کسٹیاں ٹکائے وہ اسے کافی بناتے ہوئے

دیکھتی رہی۔ کچن میں رکھے بلیک کرنٹ اور چاکلیٹن فنج کیک کے دو ٹکڑے لیکر وہ کافی

ٹرے میں رکھنے لگا تو امامہ نے کہا، کچھ فائدہ ہو میرے کچن میں آنے کا؟

ہاں تم نے مجھے کمپنی دی، اس نے ٹرے اٹھا کر کچن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

تم اکیلے بھی بنا سکتے تھے خوا مخوا مجھے اپنے ساتھ لائے۔۔۔۔

تمہیں دیکھتے ہوئے زیادہ اچھی بنی ہے۔۔۔ وہ اسکی بات پر ہنسی۔

یہ بڑی چیپ بات ہے۔۔۔۔

اوہ ریٹلی۔۔۔۔ وہ تمہارے رومینٹک ناولز میں بھی تو ہیر وایسی ہی باتیں کرتا ہے۔

تم میری بکس کی بات کیوں کرتے ہو۔ وہ ایک دم بگڑی۔

او کے۔۔۔ او کے سوری۔۔ سالار نے ساتھ چلتے ہوئے ٹرے سے ایک ہاتھ ہٹا کر اسکے گرد ایک لمحے کے لیے جمائل کر دیا۔

کونسی موویزلی تھی تم نے؟ بیڈروم میں آکر صوفے پر بیٹھتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔ سالار نے مارکیٹ سے آتے ہوئے ایک مووی شاپ سے کچھ سی ڈیزلی تھی۔ سی ڈی پلیئر پر مووی لگاتے ہوئے سالار نے ان موویز کے نام دہرائے۔

ریموٹ پکڑے وہ کمبل اٹھا کر خود بھی صوفے پر آگیا اسکی اور اپنی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر اس نے کارنر ٹیبل پہ پڑا کافی کا مگ اٹھا کر امامہ کی طرف بڑھایا۔
 تم پیو۔۔ پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے امامہ کو مہندی والے ہاتھوں سے مگ پکڑنے سے روکا۔

سکرین پر فلم کے کریڈٹس چل رہے تھے۔ امامہ نے کافی کا گھونٹ لیا۔

کافی اچھی ہے۔۔ اس نے ستائشی انداز میں مسکرا کے سر ہلایا۔

تھینک یو۔۔ سالار نے دو سے ہاتھ سے اپنا مگ اٹھایا۔

وہ اب سکرین کی طرف متوجہ تھا جہاں چارلی تھیرن نظر آرہی تھی۔ امامہ نے اسکا

انہماک محسوس کیا تھا۔ وہ کچھ بے چین ہوئی۔ وہ اس ایکٹریس سے ناواقف تھی۔

یہ کون ہے؟ امامہ نے اپنا لہجہ حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

تم نہیں جانتی؟ سالار اب کانٹے کے ساتھ کیک کا پیس اسکے منہ میں ڈال رہا تھا۔

نہیں۔۔۔۔۔

چارلیز تھیرن ہے۔ میرے نزدیک دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہے۔ کیک

امامہ کو کڑوا لگا تھا۔ وہ پورا سکریں کی طرف متوجہ تھا۔

خوبصورت ہے نا؟ کیک کھاتے ہوئے اس نے سکریں سے نظریں ہٹا کر امامہ کو

دیکھا۔۔۔۔

ٹھیک ہے بس۔۔۔ اس نے سرد مہری سے کہا۔

مجھے تو خوبصورت لگتی ہے۔ سکریں پہ نظریں جمائے وہ بڑبڑایا۔

امامہ کی دلچسپی اب فلم سے ختم ہو گئی تھی۔

خوبصورت ہے لیکن بری ایکٹریس ہے۔ چند سین گزرنے کے بعد اس نے کہا۔

آسکر جیت چکی ہے۔ ابھی تک اسکی نظریں سکرین پر تھی۔ امامہ کوچارلیز اور بری لگی۔

مجھے اسکی ناک اچھی نہیں لگ رہی۔ چند لمحے مزید گزرنے پر امامہ نے کہا۔

ناک کون دیکھتا ہے۔ وہ اسی انداز میں بڑبڑایا۔ امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سالار

سنجیدہ تھا۔

پھر-----؟؟؟؟

مجھے بال پسند ہیں اسکے۔ امامہ دوبارہ سکرین دیکھنے لگی۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے امامہ کو ساتھ لگایا۔

تم ذرا بھی ذہین نہیں ہو۔

کیا ہوا؟۔۔۔ امامہ کو اسکے ہنسنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔

کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔۔ مووی دیکھو۔

امامہ نے ریموٹ اٹھا کر سی ڈی پلیئر بند کر دیا۔

کیا ہوا؟؟ وہ چونکا

فضول مووی ہے۔ بس تم مجھ سے باتیں کرو۔ امامہ نے جیسے اعلان کر دیا۔
 باتیں ہی تو کر رہا ہوں۔ مہندی خراب ہوئی ہوگی۔ سالار نے اسکا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔
 نہیں سوکھ گئی ہے۔ میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ وہ ریموٹ رکھ کر چلی گئی۔
 چند منٹوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو مووی دوبارہ آن تھی۔ امامہ کو آتے دیکھ کر اس
 نے مووی آف کر دی۔ وہ اسکے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کافی پیتے ہوئے سالار نے اسکے
 مہندی والے ہاتھ باری باری پکڑ کر دیکھے۔

تمہارے ہاتھوں پر مہندی بہت اچھی لگتی ہے۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 اسکی ہتھیلی اور کلائی کی ناش و نگار پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ بلاوجہ مسکرا
 دی۔۔۔

چوڑیاں کہاں ہیں۔۔ سالار کو یاد آیا۔

پہنوں؟ وہ پر جوش ہوئی۔

ہاں۔۔۔۔

وہ چوڑیاں پہن کر دوبارہ اسکے پاس آگئی۔ اسکی کلائی ایکدم سرخ چوڑیوں سے سج

گئی۔ اپنی کلائیاں سالار کے سامنے کر کے اس نے اسے چوڑیاں دکھائی۔

پرفیکٹ۔۔۔ وہ نرمی سے مسکرایا۔

وہ اب اسکی چوڑیوں پر انگلی پھیر رہا تھا۔

معجزہ لگتا ہے یہ۔۔۔ چند لمحوں بعد گہری سانس لیکر کہا اس نے۔

اپنے بازو اسکے گرد جمائے کر کے اس نے امامہ کو خود سے قریب کیا۔ امامہ نے اسکے سینے پہ سر رکھ دیا۔ وہ اس شخص سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن بار بار اسکی قربت میں ایسے ہی سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا۔۔۔ وجہ وہ رشتہ تھا جو انکے درمیان تھا یا کچھ اور۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ایک بات مانو گی؟۔۔۔ سالار نے اسکے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ملامت سے کہا۔

کیا؟۔۔۔ اسکے سینے پہ سر رکھے امامہ نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔

وعدہ کرو پہلے۔

اوکے۔۔۔ امامہ نے بے اختیار وعدہ کر لیا۔۔۔

فلم دیکھنے دو مجھے۔۔ وہ بے حد خفہ ہو کر الگ ہوئی اس سے۔

میں دیکھنے کے لیے لیکر آیا ہوں امامہ۔

تم دوسری موویز بھی لیکر آئے ہو ان میں سے کوئی دیکھ لو۔

اوکے ٹھیک ہے۔۔ امامہ حیران ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کیسے مان گیا۔

سی ڈی پلیئر میں مووی تبدیل کر کے وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

اب خوش؟؟ اس نے امامہ سے پوچھا۔

وہ مطمئن انداز میں مسکا کر دوبارہ اس کے قریب ہو گئی۔ اس کے سینے پہ سر ٹکائے اس نے فلم

کے کریڈٹس دیکھے۔ وہ اسے بہت آہستہ آہستہ تھپک رہا تھا۔ امامہ کو نیند آ گئی۔ اسکی آنکھ

لگ جاتی اگر تیسرے سین میں اسے چارلیز تھیرن نظر نہ آتی۔

کچھ کہے بغیر اس نے سر اٹھا کر سالار کو دیکھا۔

اُئی ایم سوری تینوں موویز اسی کی ہیں۔۔ اس نے ایک شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ

کہا۔

دیکھنے دو یار۔۔ اس نے جیسے التجا کی تھی۔۔

امامہ نے چند لمحے سکریں کو دیکھنے کی بعد کہا۔

تعریف نہیں کرو گے تم اسکی۔۔۔

آئی پراس۔۔ سالار نے بے ساختہ کہا

وہ خوبصورت نہیں ہے۔ امامہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

بلکل بھی نہیں۔۔ سالار نے تائید کی

اور بری ایکٹریس ہے۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Poetry|Ghazals|Urdu|English|Urdu|English

بے حد۔ امامہ کو تسلی ہوئی۔۔۔

اور تم اسے اس طرح اب کبھی نہیں دیکھو گے جیسے پہلے دیکھ رہے تھے۔ اس بار سالار

ہنس پڑا۔۔

کس طرح دیکھتا ہوں میں؟

تم دیکھتے نہیں گھورتے ہو اسے۔۔

کون ایسا نہیں کریگا وہ اتنی۔۔۔۔۔ سالار روانی میں کہتے کہتے رک گیا۔۔۔

کہہ دو نا کہ خوبصورت ہے۔۔ امامہ نے اسکی بات مکمل کر لی۔۔

میں تمہارے لیے اسکو بہن نہیں بنا سکتا۔

تو صرف ایکٹریس سمجھو اسے۔۔۔

ایکٹریس ہی تو سمجھ رہا ہوں یا۔۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ میں نہیں دیکھتا۔۔ آدھی مووی

تو ویسے ہی گزر گئی ہے۔۔ سالار نے اس بار کچھ خفہ ہو کر ریموٹ سے مووی آف

کر دی۔

امامہ بے حد مطمئن انداز میں صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی وہ اب صوفے سے چیزیں

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سمیٹ رہا تھا۔

کمبل لے آؤ گے نا تم؟ واش روم کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔۔۔

جی لے آؤں گا کوئی اور حکم ہو تو وہ بھی دیں۔

وہ کمبل اٹھاتے ہوئے خفگی سے بڑبڑایا۔۔۔۔۔

سکندر نے عید کے تحفے کے طور پہ ایک بریسلٹ دیا تھا اسے اور سوائے سالار کے سب

نے ہی اسے کچھ نہ کچھ دیا تھا۔ امامہ کا خیال تھا، وہ اس بار ضرور اسے زیور میں کوئی چیز

تحفے میں دے گا۔ اسے لاشعوری طور پہ جیسے انتظار تھا کہ وہ اسے کچھ دے۔ اس نے اس بار بھی اسے کچھ رقم دی تھی۔ وہ کچھ مایوس ہوئی لیکن اس نے سالار سے کوئی شکایت نہیں کی۔

عید کی رات شہر کے نواح میں واقع سکندر عثمان کے فارم ہاؤس میں ایک بڑا فیملی ڈنر تھا۔ وہاں سالار کی بیوی کی حیثیت سے پہلی بار وہ متعارف ہوئی تھی۔ اور طیہہ کے تیار کیئے گئے سرخ لباس میں وہ بالکل نئی نوپلی دلہن لگ رہی تھی۔ امامہ کو اب احساس ہوا تھا کہ سالار کا اسے اسلام آباد لانے اور اپنی شناخت نہ چھپانے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ اسے اس عزت و احترام کی اشد ضرورت تھی جو اسے وہاں ملی تھی۔

اوپن ایر میں باربی کیوز کے دوران اپنی پلیٹ لیکر وہ کچھ دیر کے لیئے فارم ہاؤس کے برآمدے میں لکڑیوں کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ باقی افراد ٹولٹیوں کی شکل میں سامنے کھلے سبزے میں ڈنر کرتے ہوئے مختلف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

تم یہاں کیوں آکر بیٹھ گئی؟ امامہ کے قریب آتے ہوئے اس نے دور سے کہا۔
ایسے ہی۔۔ شال لینے آئی تھی۔۔ پھر یہی بیٹھ گئی۔ وہ مسکرائی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سالار نے سوفٹ ڈرنک کا گلاس اپنی ٹانگوں کے درمیان نچلی سیڑھی پہ رکھا۔

امامہ لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے ایک گٹھنے پر کھانے کی پلیٹ ٹکائے کھانا کھاتے
ہوئے دوران میں سیٹج پر بیٹھے گلوکار کو دیکھ رہی تھی

سالار نے اسکا کانٹا اٹھا کر اسکی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔ وہ اب
گلوکار کی طرف متوجہ تھا جو اپنی غزل شروع کر چکا تھا۔

انجوائے کر رہی ہو؟ سالار نے اس سے پوچھا۔

ہاں۔۔۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ اب غزل سن رہی تھی۔

کسی کی آنکھ پر نم ہے محبت ہو گئی ہوگی۔

زباں پر قصہ غم ہے محبت ہو گئی ہوگی۔

وہ بھی سوفٹ ڈرنک پیتے ہوئے غزل سننے لگا۔

کبھی ہنسنا کبھی رونا کبھی ہنس ہنس کے رو دینا،

عجب دل کا یہ عالم ہے محبت ہو گئی ہوگی۔۔

اچھا گارہا ہے۔۔ امامہ نے ستائشی انداز میں کہا۔۔

سالار نے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلا دیا۔

خوشی کا حد سے بڑھ جانا بھی اب اک بیقراری ہے،،

نہ غم ہونا بھی اک غم ہے محبت ہوگی ہوگی۔۔۔

سالار سو فٹ ڈرنک پیتے ہوئے ہنس پڑا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ شاید کہی اور پہنچا

ہوا تھا۔

تمہیں کچھ دینا چاہ رہا تھا میں۔۔۔۔۔

وہ جیکٹ کی جیب سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بہت دنوں سے دینا چاہتا تھا لیکن۔۔۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔۔

اسکے ہاتھ میں اک ڈبیا تھی۔ امامہ کے چہرے پہ بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ تو بلا آخر اسے

اس کا خیال آ ہی گیا اس نے ڈبیا لیتے ہوئے سوچا اور اسے کھولا۔ وہ ساکت ری گئی۔ اندر ایر

رنگز تھے۔ ان ایر رنگز سے تقریباً ملتے جلتے جو وہ اکثر پہنا کرتی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا

کر سالار کو دیکھا۔

میں جانتا ہوں یہ اتنے ویو ایبل تو نہیں ہوں گے جتنے تمہارے فادر کے ہیں لیکن مجھے

اچھا لگے گا اگر تم کبھی کبھار اسے بھی پہنو۔

ان ایررنگز کو دیکھتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

تم نہیں پہننا چاہتی تو بھی ٹھیک ہے۔۔۔ میں ریپلیس کرنے نہیں دے رہا۔

سالار نے اسکی آنکھوں میں نمودار ہوتی نمی کو دیکھ کر بے ساختہ کہا۔۔

کچھ کہنے کی بجائے امامہ نے اپنے دائیں کان میں لٹکتا جھمکا اتارا۔

میں پہننا سکتا ہوں؟؟

سالار نے ایک ایررنگ نکالتے ہوئے کہا۔ امامہ نے سر ہلادیا۔۔ سالار نے باری باری

اسکے کانوں میں ایررنگز پہننا دیئے۔

وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔۔ وہ دیر تک مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔

اچھی لگ رہی ہو۔۔

مجھ سے زیادہ کوئی تم سے محبت نہیں کر سکتا، کوئی مجھ سے زیادہ تمہاری پرواہ نہیں

کر سکتا۔ مجھ سے زیادہ خیال نہیں رکھ سکتا تمہارا۔ میرے پاس تمہارے علاوہ کوئی قیمتی

چیز نہیں۔

اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اسے کہہ رہا تھا۔۔

مجھے نوازا گیا ہے۔۔ سیدھا ہوتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔

رومانس ہو رہا ہے؟ اپنے عقب میں آنے والی کامران کی آواز پہ وہ ٹھٹکے۔

کوشش کر رہے ہیں۔۔ سالار نے پلٹے بغیر کہا۔

گڈ لک۔۔ وہ کہتا ہوا اسکے پاس سے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے انہے دیکھے بغیر

چلا گیا۔

امامہ کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ جھینپ گئی تھی۔ سالار اور اسکی فیملی کم از کم ان

معاملات میں آزاد خیال تھے۔

لکڑی کی ان سیڑھیوں پر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے وہ گلوکار کی سریلی آواز کو سن

رہے تھے زندگی کے وہ لمحے یاد بن رہے تھے۔

*****_**_*****_**_*

لاہور واپسی پر عید ڈنر کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ امامہ کو اپنے سوشل اور

بزنس سرکل میں متعارف کروا رہا تھا۔

عید کے چوتھے دن وہ اسے پہلی بار اپنی ہی بنک کی طرف سے دیے گئے عید کے ڈنر میں لیکر گیا تھا اور ایک بڑے ہوٹل میں ہونے والے اس ڈنر میں جاتے ہی امامہ کو پسینہ آنے لگا۔ گیدرنگ کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھا۔ وہ فیملی ڈنر تھا۔ کم از کم سالار اسے یہ ہی بتا کر اسے وہاں لایا تھا۔ لیکن وہاں آنے والی فیملیز کون تھی یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے وہ مس ورلڈ کے مقابلہ حسن میں آگئی ہو۔ وہاں موجود عورتیں بیس سے ساٹھ سال کی عمر تک کے درمیان تھی لیکن یہ طے کرنا زیادہ مشکل تھا کہ ان میں ست کون عمر کی کس سیڑھی پر ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے ہاتھ میں ڈرنکس لیے وہ گرمجوشی اور بے تکلفی کے ساتھ مختلف مردوں سے گلے ملتے ہوئے گفتگو میں مصروف تھیں۔ شیفون کے لباس پر دوپٹہ اوڑھے امامہ کو اپنا آپ الو باٹا لگا۔

وہاں کھڑے جیسے اس نے خود کو جانچنا شروع کیا تھا۔ اس نے پہلی بار سالار اور اپنے حلیے کا فرق بھی نوٹس کیا۔

ایک برانڈ ڈسیاہ ڈنر سوٹ میں سرخ دھاری دھار ٹائی کے ساتھ وہ بالکل اس ماحول کا حصہ لگ رہا تھا۔ وہاں لگڑے اس پر یہ ہولناک انکشاف بھی ہوا کہ اس کا حلیہ سالار کے

اس لک کے ساتھ بالکل میچ نہیں کر رہا۔

وہ اوڈ کپل تھے۔ اسے احساس کمتری کا دوسرا بڑا دورہ بڑے غلط وقت اور غلط جگہ پر پڑا تھا۔ وہ اسکا تعارف باری باری مختلف لوگوں سے کروا رہا تھا۔ اور امامہ اس پذیرائی اور گرمجوشی پر حیران تھی۔ جو اسے مل رہی تھی پھر اسے ایک دم احساس ہوا اس کی وجہ بھی سالار تھا۔ یہ پروٹوکول مسز سالار سکندر کے لیے تھا۔ امامہ ہاشم کے لیے نہیں۔ یہ ٹیگ جسکے گلے میں لٹکا ہوتا، اسے یہ ہی پروٹوکول ملتا۔ چاہے اسکا حلیہ اس سے بھی بدتر ہوتا۔ اسکا احساس کمتری کا پارہ اوپر جا رہا تھا۔ سالار کے ساتھ کھڑے اسے اپنے ہی حلیے کی چند اور خواتین بھی بلاخر اس مجمع میں نظر آ ہی گئی۔ اور اسے کچھ حوصلہ ملا۔

ڈرنک پلیز! "مشروبات کی ٹرے پکڑے ویٹرنے بالکل اسکے پاس آ کر کہا۔ وہ چونکی اور اس نے ٹرے پر نظر دوڑائی۔ وائٹ گلاس میں اپیل جو س تھا۔ اس نے ایک گلاس اٹھا لیا۔ اپنے سامنے کھڑے ایک غیر ملکی جوڑے سے باتیں کرتے ہوئے سالار نے بجد غیر محسوس انداز میں امامہ کو دیکھے بنا اسکے ہاتھ سے گلاس لیا۔ وہ چونک اٹھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا جیسے وہ خود پینا چاہتا ہو لیکن اسکا گلاس ہاتھ میں لیے اسی طرح وہ اس جوڑے سے باتیں کرتا رہا۔ ویٹرنے میں کھڑے تمام افراد کو سرو کرتا

ہوا واپس سالار کے پاس آیا۔ سالار نے امامہ کا گلاس بیحد غیر محسوس انداز سے ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے ویٹر سے کہا .

سوفٹ ڈرنک پلیز۔۔

امامہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ ٹرے میں رکھا اپنا گلاس اس بے دور جاتے دیکھا۔ پھر اس نے سالار کو دیکھا وہ اب بھی وہاں مصروف تھا۔ ویٹر چند لمحوں بعد ایک دوسری ٹرے لیئے موجود تھا۔ اس بار اس کا گلاس اٹھانے سے پہلے ہی سالار نے ایک گلاس اٹھا کر اسے دیا اور دوسرا خود پکڑ لیا۔۔۔

اوپر ہیلو۔۔۔ سالار۔۔۔ وہ چالیس سینتالیس سال کی ایک عورت تھی جس نے سالار

کے قریب آتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر بے حد دوستانہ انداز میں بے تکلفی کیساتھ اسکے بازو پہ ہاتھ رکھ لیا۔ وہ وہاں موجود دوسرے مردوں کی طرح عورتوں سے گلے نہیں مل رہا تھا۔ لیکن ان میں سے کچھ عورتوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ امامہ کے لیئے یہ ہضم کرنا بالکل مشکل ہو رہا تھا۔

مجھے کسی نے تمہاری بیوی کے بارے میں بتایا۔ یہ میرے لیئے ایک بڑی خبر ہے۔ کب

شادی کی تم نے؟

وہ عورت اب کہہ رہی تھی اس سے۔ سالار بے شائستگی سے امامہ کا تعارف کرایا۔
 مسز لیتھ نے اس سے ملتے ہوئے اسے ڈنر پر مدعو کیا۔ سالار نے ہلکی سی مسکراہٹ
 کیساتھ کوئی دن طے کیے بغیر دعوت قبول کر لی۔ امامہ نے اپنے عقب میں کسی کو دیکھ
 کر سالار کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

ہائے رمشا۔۔۔

امامہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا

اوہ ہائے۔۔۔۔۔ رمشا بھی مسکراتی ہوئی اسکے پاس آئی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ رمشا بڑی خوشدلی سے اس سے
 ملی۔۔

بڑی لکی ہیں آپ۔ اگر آپ اسے نہ ملتی تو اس بندے سے میں نے شادی کر لینی تھی
 ۔۔ رمشانے بڑی بے تکلفی سے امامہ سے کہا۔۔۔ بس۔۔۔ کچھ دیر ہو گئی مجھے سالار
 سے ملنے میں ۔

وہ بھی جو اب خوشدلی سے ہنساتھا۔۔

ولیمہ کب ہے؟ وہ پوچھ رہی تھی۔

بیس تاریخ کو اسلام آباد میں۔۔۔ وہ سالار سے کہہ رہی تھی۔

امامہ نے اس بار سالار کو اسے ٹالتے نہیں دیکھا۔ وہ اسکے ساتھ ملاقات طے کر رہا تھا۔ اسکے پاس آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی جسکے ساتھ سالار کا رویہ کچھ زیادہ ہی بے تکلفی لیتے ہوئے تھا۔ امامہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔۔۔

کوئی بات کرو۔ واپسی پر سالار نے اسکی خاموشی محسوس کر کے کہا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کیا بات کروں۔۔۔

کوئی بھی۔۔۔ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

عجیب لوگ تھے سارے۔۔۔ کچھ دیر بعد سالار نے اسے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ وہ چونک

کر اسکی طرف متوجہ ہوا۔

عجیب کیوں۔۔۔۔

تمہیں عورتیں اس طرح کی لباس میں یہ سب کرتی اچھی لگتی ہے؟؟ اس نے اسکی

آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا .

تم نے وہ پہنا جو تمہیں اچھا لگا انہوں نے بھی وہ پہنا جو انکو اچھا لگا۔

اس نے بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔ کم از کم وہ اس سے ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

تمہیں کچھ برا نہیں لگا؟

میرے لیے وہ سب ریسیکٹیبل لوگ تھے۔ کچھ میرے کلائنٹس تھے اور کچھ کو میں ویسے ہی جانتا ہوں۔

تمہیں برا کیوں لگے گا سالار تم مرد ہو۔۔۔ تمہیں تو بہت اچھا لگے گا اگر تمہیں عورتیں اس طرح کے کپڑوں میں نظر آئیں گی۔۔

بات کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اسکا لہجہ کتنا سخت تھا۔ سالار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔۔

میں ایسی گیدرنگز میں مرد بن کر نہیں جاتا مہمان بن کر جاتا ہوں۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کس نے کیا پہنا ہے۔ میرے لیے ہر عورت بغیر اپنے پہناوے کے

قابل احترام ہے میں لباس کی بنا پر کسی کا کردار نہیں جانتا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تم نے دوپٹا لیا ہوا ہے تو تم قابل عزت ہو۔۔ اور وہ عورت جو ایک قابل اعتراض لباس پہنے ہوئے ہے وہ عزت کے قابل نہیں۔۔ تو تم بالکل غلط ہو۔

وہ بول نہ سکی۔ سالار کے لہجے میں پہلے بار اس نے ترشی محسوس کی۔

تمہیں کیسا لگے گا اگر کوئی تمہارے پردے کی وجہ سے تمہارے بارے میں یہ ہی بات کہے۔۔۔ جیسی تم انکے بارے میں کہہ رہی ہو۔

تم انکی حمایت کیوں کر رہی ہو۔ وہ جھنجھلائی۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 میں کسی کی حمایت نہیں کر رہا صرف یہ کہہ رہا کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں یہ ہمارا مسلہ نہیں۔۔۔۔۔

تمہیں یہ سب پسند ہے؟ وہ اسکے سوال پر ہنسا تھا۔

یہ ایشو نہیں ہے مجھے یہ سب اپنی زندگی کے لیے پسند نہیں ہے لیکن مجھے ایسے ڈنر میں اس لیے جانا پڑتا ہے کیونکہ مجھے اپنی جاب کی وجہ سے کسی حد تک سوشل رہنا ہے۔

ایک بات پوچھوں؟ سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

اگر میں تمہاری زندگی میں نہیں آتی تو تم اس طرح کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے جو آج وہاں تھی؟

وہ رمشا کا نام لینا چاہتی تھی لیکن اس نے نہیں لیا۔

تمہارا مطلب ہے کہ میں پردہ کرنے والی اور پردہ نہ کرنے والی میں کس سے شادی کرتا۔۔۔ سالار نے براہ راست سوال کر دیا۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی وہ واقعی یہ ہی پوچھنا چاہتی تھی۔۔۔

آنہ نیسٹلی میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔۔۔ میں کسی عورت کا صرف پردہ دیکھ کر اس سے شادی نہ کرتا۔ کسی عورت کا پردہ کرنا نہ کرنا میرے لیے اتنا اہم نہیں جتنا اس میں کچھ دوسری خوبیوں کا ہونا۔۔۔ اسے آج شاک پہ شاک لگ رہے تھے۔

اگر ایک عورت اللہ کے احکامات پہ عمل کرتی ہیں سر اور جسم چھپاتی ہے

لیکن میں اس ایک چیز کے علاوہ بھی اس عورت میں کچھ اور خوبیاں چاہتا جس سے میں نے شادی کرنی ہوتی۔۔۔

کیسی خوبیاں؟۔۔۔ اسے تجسس ہوا۔۔۔

صبر و برداشت و اطاعت۔۔ وہ اسکا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

یہ دونوں نادر کوالٹیز ہیں۔۔ باقی سب کچھ ہوتا ہے لڑکیوں میں۔۔ ڈگریز اور لک اور میسرزم اور پردہ بھی۔۔۔ لیکن یہ دو کوالٹیز ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اسے کوئی زعم تھا تو ختم ہو گیا تھا۔

میں کیوں اچھی لگی تمہیں؟ اس نے بلا آخر سالار سے پوچھ ہی لیا۔

خالی پردہ تمہیں امپریس نہیں کرتا۔ تحمل اور اطاعت تو کبھی دکھائی نہیں میں نے۔

پھر؟؟؟

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

پتہ نہیں۔۔۔ یہ وہ سوال ہے جسکا جواب مجھے کبھی نہیں ملا تمہیں ناپسند کرنے کے کئی

جواز بتا سکتا ہوں لیکن پسند کرنے کے لیے میرے پاس کوئی جواز نہیں۔ وہ گاڑی ڈرائیو

کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

پہلے تم مجھے intrigue کرتی تھی۔ پھر تم مجھے ایریٹیٹ کرنے لگی اسکے بعد تم مجھے

haunt کرنے لگی۔ پھر میں تم سے جیلنس ہونے لگا۔۔ پھر حسد کرنے لگا اور پھر

محبت،،، وہ قدرے بے بسی سے ہنسا۔

ان ساری سٹیجز میں صرف ایک چیز کا من تھی۔ میں تمہیں کبھی بھی اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا۔ مجھے تمہارا خیال آتا تھا اور آتا ہے۔ اور بس میرا دل تمہاری طرف کھنچتا تھا۔ خوار جو کرنا تھا اللہ نے مجھے میری اوقات بتا کر۔۔ بس اور کوئی بات نہیں تھی۔ اس لیے یہ تو کبھی پوچھو ہی مت کہ کیوں اچھی لگی تم مجھے۔ وہ محبت سے زیادہ بے بسی کا اظہار تھا۔

اور اگر یہ سب نہ ہو اہوتا تو پھر تم میرے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کر لیتے۔ مثلاً
ر مشا سے۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Art | Poetry | Inquiries
سالار نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ہنس دیا۔۔۔

تو یہ سوال ر مشا کی وجہ سے ہو رہے تھے۔۔۔ یو آر سلی۔۔۔

تمہیں پسند ہے نا وہ؟ وہ اسکی ہنسی کو نظر انداز کر کہ سنجیدہ ہی رہی۔

ایک دوست اور کو لیگ کے طور پر۔۔۔ سالار نے کہا۔

امامہ نے کچھ نہیں کہا۔ سالار کو لگا جیسے وہ گہری سوچ میں ہے۔

کیا ہوا؟؟ سالار نے اسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہاں۔۔۔۔ اسی طرح کام کرتے ہوئے اس نے کہا۔۔

تم اچھے انسان ہو ویسے،،،، اسکی تعریف کرتے ہوئے وہ عجیب سی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

اچھا۔۔۔ وہ اسی طرح مصروف تھا۔ امامہ کو لگا اس نے اسکی بات غور سے نہیں

سنی۔۔۔ میں نے تمہاری تعریف کی ہے۔۔ اس نے دہرایا۔۔

بہت شکریہ۔۔۔ اسکا لہجہ اب بھی اتنا ہی سرسری تھا۔۔۔

تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔۔۔ اسکا اتنا نارمل رہنا ہے۔۔ امامہ کو ہضم نہیں ہوا تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کس چیز سے؟ وہ چونکا۔

میں نے تمہاری تعریف کی۔۔

اور میں نے تمہارا شکریہ ادا کر دیا۔۔

لیکن تمہیں اچھا نہیں لگا؟ وہ کچھ متجسس تھی۔۔

کیا اچھا لگتا مجھے۔۔ میری باتیں سن کر مجھے اچھا آدمی کہہ رہی ہو۔ عمل دیکھ کر کہتی تب

خوشی ہوتی مجھے۔۔ اور فی الحال میں ایسا کوئی عمل تمہیں پیش نہیں کر سکتا۔۔

امامہ بول نہ سکی۔ وہ پھر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھا۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ اسکا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر کہا۔

تم نے میرے ہاتھ سے وہ ڈرنک کیوں لی تھی؟ اسے اچانک یاد آیا تھا۔

کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھے شوٹ کر دو۔۔۔ وہ اس کے بے تکے جواب پر حیران ہوئی۔

یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟

شراب تھی وہ۔۔۔ وہ ہل نہ سکی۔

سوری۔۔۔ سالار نے سکریں سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس سے معذرت کی۔ امامہ کا

رنگ اڑ گیا تھا۔ ان پارٹیز میں ہارڈ ڈرنک بھی ہوتی ہے۔ سوشل ڈرنک سمجھی جاتی ہے

وہاں۔۔۔ وہ سنجیدگی سے اسے بتاتے ہوئے دوبارہ سکریں کی طرف متوجہ ہوا۔

امامہ کا دل یکدم جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار شراب

دیکھی تھی اور شراب ہاتھ میں لی تھی۔ اگر وہ سالار کے ساتھ کھڑی نہ ہوتی تو شاید پی

بھی لیتی۔ اسکا شوہر ان پارٹیز میں جانے کا عادی تھا۔ اور وہ وہاں کس حد تک اجتناب

کر پاتا تھا۔ کرتا بھی یا نہیں۔۔۔ اسکا اعتماد پھر تڑخنے لگا۔

وہ چند ہفتوں میں کسی کا کردار نہیں جانچ سکتی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ اسے شادی کے اس پہلے مہینے میں مکمل طور پر متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔

چند لمحے پہلے دل میں سالار کے لیے نمودار ہونے والا احترام سیکنڈز میں غائب ہوا تھا۔۔۔

وہ جس شیشے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر دھندلا گیا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سالار سے اگلا جملہ کیا کہے وہ اپنی ای میلز کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ دوسرے بیڈ روم کے واش روم میں آکر وہ بے مقصد اپنا دایاں ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتی رہی۔ وہ احمقانہ حرکت تھی لیکن اس وقت وہ اپنی ڈپریشن ختم کرنے لے لیئے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بے مقصد گھر کے ہر کمرے میں پھرتی رہی نیند اسکی آنکھوں سے مکمل غائب ہو چکی تھی۔

اللہ سکون کے آسمان کو اندیشوں کی زمین کے بغیر کیوں نہیں کھڑا کرتا۔ اس نے سوچا۔ وہ تاریکی اور سردی میں کتنی ہی دیر ٹیرس کی ریکنگ کے پاس کھڑی رہی وقت کا احساس

ہی نہیں ہوا۔

تم کیا کر رہی ہو یہاں؟ اپنے عقب میں سالار کی آواز نے اسکی سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔ وہ کمرے سے اسکی طویل عدم موجودگی کی طنز پر اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا تھا۔

میں۔۔۔ امامہ نے چونک کر پلٹ کر اسے دیکھا۔۔۔ میں نیچھے دیکھ رہی تھی۔

نیچھے کیا ہے۔۔۔ سالار نے اسکے قریب آ کر نیچھے جھانکا۔

نیچھے۔۔۔؟ امامہ کو کو خود پتہ نہیں تھا۔

نیچھے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ سالار نے اسکے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش

کی۔ وہ اسے غائب دماغ لگی تھی۔۔۔ یا پریشان۔۔۔

اندر چلیں؟۔۔۔ وہ کچھ کہنے کی بجائے شال ٹھیک کرتے ہوئے اسکے ساتھ اندر آ گئی۔

تم سو جاؤ میں تھوڑی دیر بعد آؤنگی۔۔۔ اس نے اندر آتے ہوئے سالار سے کہا۔

میں کچھ دیر ٹی وی دیکھوں گی۔۔۔ سالار ٹھٹک گیا۔

امامہ ریوٹ ہاتھ میں لیکر اب ٹی وی آن کر رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ ٹی وی

دیکھنے میں اتنی دلچسپی ظاہر کر رہی تھی۔

ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام آرہا ہے؟ اس نے پوچھا۔۔

نہیں ویسے ہی دیکھوں گی۔ امامہ نے اسکی طرف دیکھے بنا کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جائے۔

وہ جانے کی بجائے صوفے پر اسکے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے ریموٹ لیکر ٹی وی آف کر دیا۔

امامہ نے کچھ جزبز ہو کر اسے دیکھا۔

میں شراب نہیں پیتا امامہ۔۔ میں یہ پھل چکھ چکا ہوں اسکا ذائقہ کیا ہے اسکا اثر کیا ہے میں دونوں سے واقف ہوں مجھے شراب میں کوئی غم ڈبونا ہے ناکسی سرور کی تلاش ہے میرے لیے یہ ان گناہوں میں سے ایک ہے جسکو میں چھوڑ چکا ہوں۔ تم ہر روز بس اللہ سے یہ دعا کیا کرو کہ وہ مجھے سیدھے رستے سے نہ بھٹکائے۔ وہ اس سے سوال کی توقع کر رہی تھی جواب کی نہیں۔۔ وہ کسی سائیکالوجسٹ کی طرح اسکا ذہن پڑھ رہا تھا۔

اب تمہیں ٹی وی دیکھنا ہے تو دیکھو۔۔ ورنہ آکر سو جاؤ۔۔ گڈ نائٹ۔۔

اس نے ٹی وی آن کر کے ریموٹ امامہ کے ہاتھ میں دیا۔ اور بیڈ روم چلا گیا۔ وہ اسے

دیکھتی رہ گئی تھی۔

*****_*****_*****

سالار کے ساتھ اس گفتگو نے اسکے لیے بہت آسانی پیدا کر لی تھی۔ دوبارہ ڈنر پر جاتے ہوئے امامہ نے وہاں آنے والے لوگوں کو نہیں جانچا تھا۔ اس بار وہ اسے اتنے برے بھی نہیں لگے۔

تم کسی سے کوئی بات کیوں نہیں کرتی؟ وہ شاید چوتھا ڈنر تھا جب واپسی پر رات کو سونے سے قبل کپڑے تبدیل کرتے سالار نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ ناول پڑھتے ہوئے چوٹکی۔۔

کیسی بات؟

کوئی بھی بات۔۔ وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

جب کوئی مجھ سے کچھ پوچھتا ہے تو میں جواب دیتی ہوں۔۔

لیکن تم بھی تو کسی سے کچھ پوچھا کرو۔ وہ ان پارٹیز میں اسکی مسلسل خاموشی کو نوٹ کر رہا تھا۔

کیا پوچھا کروں۔۔۔

تم حال چال پوچھا کرو۔ پھر فیملی کے بارے میں پوچھا کرو بچوں کے بارے میں بات کر سکتی ہو۔ فارگاڈ ایک امامہ عورتوں کو تو یہ بتانا نہیں پڑتا کہ انہوں نے آپس میں کیا باتیں کرنی ہے۔ وہ اسے بتاتے ہوئے کچھ سٹیٹا گیا۔

اچھا میں کوشش کروں گی۔ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

میرا یہی سوشل سرکل ہے یہی لوگ بار بار ملیں گے تمہیں۔ ان ہی میں سے تم نے

دوست بنانے ہیں۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

لیکن میں نے دوست بنا کر کیا کرنا ہے۔ اس نے دوبارہ ناول کھولتے ہوئے کہا سالار

نے ہاتھ بڑھا کر ناول اس سے لے لیا

کتابیں اچھی ہوتی ہے لیکن ایک دنیا اسکے باہر ہے۔ وہ بھی اچھی ہے۔ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ

اسکا چہرہ دیکھتی رہی۔

لوگوں سے چھپ چھپ کر بھاگ بھاگ کر اب بہت مشکل ہو گیا ہے دوبارہ انکے

ساتھ چلنا۔۔ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کیساتھ انٹرایکٹ کرو۔ اب ضرورت نہیں رہی چھپنے کی جہاں میں تمہیں لیکر جاتا ہوں وہاں تم میری فیملی ہو۔ وہاں تم سے کوئی تمہاری فیملی کے بارے میں انویسٹی گیٹ نہیں کریگا۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

اچھا میں کوشش کروں گی۔۔ اس نے غیر محسوس انداز میں سالار سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔۔

بھابھی کے ہاں بھی جایا کرو۔ وہ اسے نو شین کے بارے میں کہہ رہا تھا۔

جاتی ہوں۔۔ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ اسے چپ چاپ کچھ دیر دیکھتا رہا۔

اب اس طرح مت دیکھو مجھے۔ امامہ نے اسکی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے

ہوئے گردن موڑ کر کہا۔ میں نے کہا ہے نا میں کوشش کروں گی۔۔

وہ کچھ کہنے کی بجائے کسبل لیتا ہوا چت لیٹ گیا۔ وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگی لیکن کچھ دیر

بعد پھر اسے سالار کی نظریں خود پر محسوس ہوئی۔

اب کیا ہے۔۔ اس نے کچھ جھنجھلا کر سالار کو دیکھا۔۔

کچھ نہیں۔۔۔ امامہ نے اسکی نظروں میں عجیب سا تاثر محسوس کیا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچ رہا تھا

*****_-----*****_-----+*****

عید کے دو ہفتے بعد اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں انکے ولیمہ کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اگر سالار کی ضد نہ ہوتی تو سکندر کبھی اس تقریب لے لیئے اسلام آباد کا انتخاب نہ کرتے۔ ولیمہ کی تقریب خاصی سادگی سے ہوئی۔ دو ہزار کے قریب افراد کی موجودگی میں امامہ اتنا ہی غیر آرام دہ محسوس کر رہی تھی جتنا اسے کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اسکے باوجود وہ خوش تھی۔ وہ باقاعدہ طور پر سالار کی فیملی کا حصہ بن کر جیسے کسی چھت کے نیچھے آگئی تھی۔

وہ ولیمہ لے بعد دو ہفتوں کے لیئے بہماس گئے تھے۔ پاکستان سے باہر سالار کیساتھ امامہ کا یہ پہلا سفر تھا۔ ان دنوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی ان پندرہ دنوں جیسے پرسکون اور بے فکری کے دن انکی زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں آنے والے تھے۔۔۔ انکا رشتہ نیا تھا لیکن تعلق پرانا تھا۔

سالار کا فون انٹر نیشنل رومنگ پر تھا لیکن دن کا زیادہ وقت وہ آف رہتا تھا۔ بنک اور ان

سے متعلقہ کاموں کو اس نے پندرہ دنوں کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ سالار
بہماس پہلے بھی دو مرتبہ آچکا تھا۔ وہ اسے لیکران تمام جگہوں پر جا رہا تھا جہاں کی سی
فوڈز مشہور تھی۔

ہم اپنے گھر میں اس طرح کا ایک رانچ بنائیں گے۔

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے مذاق لگا۔ لیکن وہ سنجیدہ
تھی۔

کس پر بنائیں گے؟ سالار نے اسے جیسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

جھیل پر۔۔ بلا کی سنجیدگی تھی۔

اور جھیل کہاں سے آئے گی۔۔ وہ ہکا بکا تھا۔

وہ تم بناؤ گے نا۔۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

اور اس جھیل میں پانی کہاں سے آئے گا؟

امامہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔۔۔ نہر سے۔ وہ ہنس پڑا لیکن امامہ نہیں ہنسی۔۔

پانی کی نہر نکالنا دودھ کی نہر نکالنے سے زیادہ مشکل ہے سویٹ ہارٹ۔۔

اس نے امامہ کے کندھوں پر بازو پھیلایا۔ امامہ نے اسکا ہاتھ جھٹک دیا۔۔۔

تم نہیں بنا کر دو گے؟ وہ سوال نہیں تھا۔ دھمکی تھی۔۔۔

ہم یہاں آجایا کریں گے بلکہ اگلے سال میں تمہیں ماریشس لیکر جاؤں گا۔ پھر اس سے

اگلے سال مالدیپ۔۔۔

امامہ نے اسکی بات کاٹی۔

تم نہیں بنا کر دو گے جھیل۔۔۔

امامہ جھیل کیسے بنا کر دوں میں تمہیں۔۔۔ ہاں بی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پر گھر

بنائے جہاں قدرتی طور پر آس پاس اس طرح پانی ہو۔ سالار نے اسے ٹالنے کی کوشش

کی۔۔۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس پر بروقت اثر ہوا تھا اور سالار نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔۔۔

سالار تم بہت اچھے ہو۔ امامہ نے اب اسکا ہاتھ پیار سے پکڑ کر کہا۔۔۔

امامہ یہ بلیک میلنگ ہے۔ سالار نے ہاتھ چھڑائے بنا گھر اسانس لیکر احتجاج کیا۔ وہ اسکے

جھوٹ کو اسکے گلے کی ہڈی بنا رہی تھی۔

ہاں۔۔۔ ہے تو۔۔۔ اس نے بڑے آرام سے کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے کہا۔

وہاں دوبارہ امامہ نے باقی دن رانچ کا ذکر نہیں کیا اور اس پر سالار نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسے امید تھی کہ وہ بھول جائیگی۔۔

واپس آنے کے چوتھے دن بعد اس نے فخریہ انداز میں سالار کو اس گھر کے نئے ڈیزائنز دکھائے۔ وہ جھیل اور رانچ بھی اس کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ ہنی مون اسے بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ دنیا کی پہلی بیوی تھی جس نے ہنی مون پر جھیل اور رانچ کی شاپنگ کی تھی۔ اور وہ دنیا کا پہلا شوہر تھا جس نے اس شاپنگ پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

انکے اپارٹمنٹ کی دیوار پر اب کچھ اور تصویروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جن میں ایک چیز کا من تھی۔ انکے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والی خوشی اور چمک اور انکے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ۔۔۔

وہ ایک دوسرے کے لیئے بنے تھے۔۔۔ کم از کم وہ تصویریں ہر لحاظ سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آرہی تھی۔ سالار واپس آنے کی بعد مصروف ہو گیا

-- وہ بنک سے تقریباً دس بجے گھر آ رہا تھا اور پہلے کی طرح گھر سے باہر کافی کے لیے نکلنے کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ سالار کے اصرار کے باوجود وہ کھانے پہ اسکا انتظار کرتی تھی۔

وہ نو شین کیساتھ اب وقتاً فوقتاً گھر سے نکلنے لگی تھی۔ اسکی زندگی کا دائرہ اب گھر سے باہر بڑھنے لگا تھا اور سالار اس چیز کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا

وہ اس دن چینل سرفنگ کر رہی تھی جب اسکی نظریں ایک چینل پہ ٹھہر گئی۔ چند لمحوں کے لیے اسکو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ وہ اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے کوئی پروگرام تھا۔ اور اس میں شامل دو شرکاء میں سے سالار بھی تھے ایک لمحے کے لیے امامہ کو یقین نہیں آیا وہ سکرین پر سالار کو دیکھ رہی ہے لیکن چند لمحوں کی بعس سالار کا نام اور اسکا عہدہ سکرین پر چند لمحوں کے لیے فلش ہوا۔

تو وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔۔۔؟ امامہ نے اسکا عہدہ دیکھ کر سوچا۔ وہ پی آر سے منسلک نہیں تھا لیکن اس وقت اسے سکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اتنی ایکساٹڈ تھی کہ اس نے سالار کے جھوٹ اور اسکے وجوہات پر غور ہی نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے فنانس سے متعلق کوئی پروگرام اتنے شوق اور لگن سے دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹا اس

پروگرام میں اسے سنتے اور دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت امپر یسیو تھا۔ کمپوزڈ۔۔ کانفیڈنٹ۔۔ بے حد شارپ اور مکمل پرو فیشنل۔۔ وہ زندگی میں پہلی بار اسکی شکل و صورت اور پرسنالٹی پر غور کر رہی تھی۔ اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اسکی آواز بہت اچھی ہے۔ شادی کے دوہی مہینے بعد اپنے شوہر کو ٹی وی پر دیکھتے ہوئے وہ بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔۔

سالار کسی پوسٹ لنچ میٹنگ میں تھا جب امامہ نے اسے کال کی میٹنگ ختم ہو رہی تھی اس لیے وہ کال لیتے ہوئے بورڈ روم سے باہر آیا۔

سالار تم ٹی وی پہ آئے ہو؟ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

ایک لمحے کے لیے سالار سمجھ نہ سکا۔۔

کیا؟

تم ٹی وی چینل پہ آئے تھے ایک پروگرام میں اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔۔

دو ماہ پہلے ریکارڈ کیا تھا انہوں نے ریپیٹ کیا ہوگا۔ سالار کو یاد آ گیا۔

تم کیا کر رہی ہو۔ اس نے موضوع بدلا لیکن امامہ کس حد تک متاثر تھی اس پروگرام

سے اسکا اندازہ اسے گھر آ کر ہی ہوا۔

میں نے اسے ریکارڈ کر لیا ہے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے جب امامہ نے اسے بتایا۔

کسے؟ وہ چونکا کیونکہ وہ کوئی اور بات کر رہے تھے۔۔۔

تمہارے اس پروگرام کو۔۔۔

اس میں ریکارڈ کرنے والی کیا بات تھی۔۔۔ وہ حیران ہوا۔۔۔

تم ٹی وی پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔ امامہ نے اسکی بات کا جواب دینے کی بجائے

NEW ERA MAGAZINE.com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کہا۔۔۔

اور تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں ہو۔ پی آر میں نہیں۔ امامہ نے اسے بتایا۔

وہ مسکرایا لیکن اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔۔۔

تم نے دیکھا ہے اپنا پروگرام؟

سالار نے کانٹھا تھ سے رکھتے ہوئے اس سے کہا۔۔۔

سویٹ ہارٹ ایسے بہت سے پروگرامز ہوتے ہیں جن میں ہر روز بہت سارے

ایکسپرس بلائے جاتے ہیں اس میں ایسی کونسی خاص بات ہے کہ اسکو بیوی کیساتھ بیٹھ کر دیکھا جائے۔۔ اس سے پہلے بھی کئی پروگرامز میں آچکا ہوں اور آئندہ بھی کہی نہ کہی نظر آتا رہوں گا۔ یہ بھی میری جاب کا ایک حصہ ہے۔۔۔

وہ اسکا ہاتھ تھپک کر اب دوبارہ کانٹا اٹھا رہا تھا۔ امامہ چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔ اس نے جیسے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس پر انڈیل دیا تھا ایسے وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔۔۔۔۔

سالار سود حرام ہے نا۔۔۔

وہ خود سمجھ نہ پائی کہ اس نے سالار کی باتوں کے جواب میں یہ کیوں کہا۔۔۔ شاید یہ اس شرمندگی کا رد عمل تھا۔

ہاں۔۔۔۔۔ وہ کانٹے سے کباب کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے صرف ایک لمحے لے لے لیے ٹھٹکا۔۔

بلکل اسی طرح جس طرح جھوٹ حرام ہے۔ غصہ حرام ہے۔ غیبت حرام ہے۔ منافقت تہمت اور بددیانتی حرام ہے۔۔ وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔۔

میں ان چیزوں کی بات نہیں کر رہی۔

امامہ نے اسکی بات کاٹی۔۔۔ اس نے جو اباً امامہ کی بات کاٹی۔۔۔۔۔

کیوں؟ کیا ان ساری چیزوں سے کیا معاشرے کو کم نقصان پہنچتا ہے؟ امامہ کو جواب نہیں سوچھا۔۔۔۔

تم جسٹی فائی کر رہے ہو سود کو۔۔۔۔۔؟ اس نے بلا آخر کہا۔۔

نہیں میں جسٹی فائی نہیں کر رہا میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ہم جز کو کل سے الگ نہیں کر سکتے۔ اسلامی معاشرے کو سود اتنا نقصان نہیں پہنچا رہا جتنا دوسری خرابیاں۔ وہ اسکا

چہرہ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میں اگر پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی پانچ خرابیاں بتاؤں اور کہوں ان میں سے کوئی ایک ختم کر دو جس سے معاشرہ بہتر ہو جائے۔۔ کرپشن کو غربت کو۔

نا انصافی کو بددیانتی یا سود کو تو میں شرط لگاتا ہوں امامہ یہ پانچواں آپشن کبھی بھی کسی کی پہلی ترجیح نہیں ہوگا۔ وہ چیلنج کر رہا تھا اور وہ چیلنج جیت بھی سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا وہ بھی پہلی چار میں سے ہی ایک کو ختم کرنا چاہیں گی۔ امامہ بے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔۔۔

اور سود صرف بنکنگ میں تو نہیں ہے۔ کوئی یوٹیلٹی بل لیٹ ہو جاتا ہے تو اس پر سر چارج لگ جاتا ہے۔۔ سکول کالج کی فیس لیٹ ہو جائے تو اس پر فائن لگ جاتا ہے۔۔۔ یہ بھی تو سود کی قسمیں ہیں۔

اسکے پاس اسکی توجیہات کا کوئی جواب نہیں تھا۔۔

تو تم بنکنگ میں اس لیے ہو کیونکہ تم سود کو دوسری برائیوں جیسی عام برائی سمجھتے ہو؟؟؟
امامہ نے بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔

نہیں میں اسے بہت بڑی لعنت سمجھتا ہوں تو پھر میری سوچ میں کیا تبدیلی آئے گی۔ یہ سوچ لیکر ساری دنیا کے مسلمان بنک میں کام کرنا بند کر دے۔۔ اور دوسرے مذاہب والوں کو کھلا راستہ چھوڑیں کہ وہ آئے اور ٹیک اوور کرے۔۔ ہماری اکانومی کو اپنی مٹھی میں لے لیں۔ جب چاہے جیسے چاہے ہمارا گلہ دبا دے۔

امامہ الجھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔۔ سود کے بارے میں یہ انکی پہلی بحث تھی۔۔*****

*****_**

رمضان میں اور اسکے بعد امامہ کو کھانا پکانے کا کوئی خاص موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن اب وہ اسکے لئے باقاعدہ طور پہ گھر کا کھانا بنانے لگی۔ وہ سی فوڈز کے علاوہ کسی خاص کھانے کا شوقین نہیں تھا۔ سی فوڈز کو شدید ناپسند کرنے کے باوجود وہ ہفتے میں اسکے لیے ایک یا دو بار ڈبے میں بند سی فوڈز کی جگہ بازار سے تازہ سی فوڈلا کر پکانے لگی۔

اتوار کا دن تھا اور وہ لٹچ کی تیار یوں میں مصروف تھی۔ کسی دوست سے فون پر بات کرتے ہوئے سالار کو وہم سا ہوا تھا کہ وہ سنک کے سامنے کھڑی رو رہی ہے۔ ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کرتے ہوئے اور دوست کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کر کچن میں آگیا۔ سنک کے سامنے کھڑی وہ رو نہیں رہی تھی بلکہ زار و قطار رو رہی تھی۔۔۔ سالار کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔۔

کیا ہوا؟؟؟

نئی میں سر ہلا کر وہ اسی طرح اپنے کام میں مصروف رہی۔

سالار نے ہاتھ بڑھا کر سنک کا نل بند کر دیا۔

کیوں رو رہی ہو تم؟؟؟ وہ واقعی سمجھنے سے قاصر تھا۔۔۔۔۔ امامہ۔۔۔۔۔

اپنے ماں باپ کے گھر میں نے کبھی ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔۔ جنہیں اب مجھے دھونا پڑ رہا ہے۔۔۔ پانی دوبارہ کھولتے ہوئے اس نے بھرائی آواز میں کہا۔۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی سی فوڈز اتنے ہی شوق سے کھائے جاتے تھے لیکن وہ ان سے شدید قسم کی کراہت رکھتی تھی۔

سالار کو کچھ دیر سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔۔۔

میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ مجھے یہ بنا کر دو۔۔

تم نے خود کہا تھا میں تمہیں سی فوڈز لا کر دوں گا اور تم آج یہ بنانا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار نے پھر کچھ خفگی سے پانی بند کر دیا۔۔

چھوڑو مت بناؤ۔۔ اس نے سختی سے کہتے ہوئے وہ برتن سنک سے اٹھا کر شیلف پر رکھ

دیے۔۔

یہ بات نہیں ہے۔۔ میں سوچ رہی تھی جب شوہر کو بنا کر کھلا سکتی ہوں تو ماں باپ کو

بھی بنا کر کھلا دیتی۔۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔

کیا رنج تھا۔۔ کیا پچھتاوا تھا۔۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔۔۔

اسکے منع کرنے کے باوجود اس نے اس دن سی فوڈ ہی تیار کیا۔۔ لیکن اسکی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر سالار کو اس قدر احساس جرم ہوا کہ وہ ٹھیک طرح کھانا بھی نہ کھا سکا۔۔

میں آہستہ آہستہ یہ سی فوڈ کھانا چھوڑ دوں گا۔ تمہیں یہ دوبارہ گھر پر نہیں بنانا پڑے گا۔۔۔

نہیں۔۔۔ تمہیں پسند ہے تم کیوں چھوڑو گے۔۔ پتہ نہیں مجھے ایسے ہی خیال آ گیا تو۔۔۔ آہستہ آہستہ میری ناپسندیدگی کم ہو جائے گی۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میں۔۔۔۔۔

امامہ نے اسکی بات کاٹ دی۔۔۔ رہنے دو بس۔۔۔ اگر کچھ چھوڑنا ہے تو یہ جو تم انرجی ڈرنگس وغیرہ پیتے ہو انہیں چھوڑ دو میں تمہیں کچھ فریش جو سز بنا کر دوں گی۔

وہ ہنس پڑا۔۔۔ وہ واقعی ان ڈرنگس کا بہت عادی تھا اور اسکی بنیادی وجہ اسکا لائف سٹائل اور اسکا فرو فیشن تھا۔ اسکی سہارے وہ ساری رات آرام سے کام کیا کرتا تھا۔ وہ امامہ کے ہاتھ کے بنے کھانے کا عادی ہونے لگا تھا۔ امامہ اسکی رات کو بہت دیر سے گھر آنے

پر بھی اسے تازہ چپاتی بنا کر دینے کی عادی ہو گئی تھی۔ اور سالار نے زندگی میں ایسی چپاتی نہیں کھائی تھی۔ وہ ناشتے میں سلاٹس اور ایک انڈا کھا کر چائے کافی کے ایک کپ کے ساتھ بھاگ جانے والا آدمی تھا۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ ناشتہ کا کوئی مینیو ہونے لگا تھا انڈا تلے ہوئے یا بلے ہوئے کی جگہ مختلف قسم کے آملیٹ ملنے لگے۔ بعض دفعہ پراٹھا ہوتا۔ ڈبے کی جگہ تازہ جو س کے گلاس نے لے لی تھی۔ لنچ کے لیے گھر کے بنے سینڈ وچز اور سلاد ہوتے۔ شروع شروع میں وہ امامہ کے اصرار پر کچھ بے دلی سے اس لنچ پیک کو گھر سے لاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اسکی ناخوشی ختم ہونے لگی۔ وہ گھر کا کھانا تھا۔ بہت ویلیو ایبل تھا۔ کیونکہ اسکو بنانے کے لیے صبح سویرے اٹھ کر اسکی بیوی اپنا کچھ وقت صرف کرتی تھی۔۔ وہ پانی کے اس گلاس کا بھی اس طرح عادی ہونے لگا تھا جو ہر روز گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اسے دیتی تھی۔

میں دودھ نہیں پیتا۔۔۔ جب اس نے پہلی بار گرم دودھ کا گلاس اسے دیا تو اس نے بجد شائستگی سے اسے بتایا۔۔

کیوں؟ جو اب اس نے اتنی حیرت کا اظہار کیا کہ وہ شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔
مجھے پسند نہیں ہے۔۔۔

مجھے تو بڑا پسند ہے۔ تمہیں کیوں نہیں پسند۔۔

مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

تو میں اسمیں اوو لٹین ڈال دوں۔۔۔ سالار نے اسکے جواب کو مکمل ہونے سے پہلے ہی

گلاس اٹھا کر پی لیا۔ وہ زہر پی سکتا تھا لیکن اوو لٹین نہیں۔۔

اسکے اپنے گھر میں مردوں کا جس طرح خیال رکھا جاتا تھا وہ بھی اس کا اسی طرح خیال رکھ

رہی تھی۔۔۔۔۔*****

NEW ERA MAGAZINE.COM
*****&*****

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ کے لیے زندگی بدل گئی تھی۔ یا بہت عرصہ کی بعد پھر شروع ہوئی تھی۔۔ سالار

نے اس سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا وہ اس گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔۔

یہ ناممکن تھا کہ ایسا شخص کسی کی دعاؤں کا حصہ نہ بنے اسے کبھی نماز کی بعد دعا کرتے

ہوئے سالار کو یاد نہیں کرنا پڑا تھا۔۔۔

آریوشیور۔۔۔ تم اکیلے رہ لو گی۔۔ سالار اب بھی جیسے یقین دہانی چاہتا تھا۔۔

وہ دو ہفتوں کے لیے نیویارک اپنے بنک کے کسی ورکشاپ کے سلسلے میں جا رہا تھا۔
میں رہ لوں گی۔۔۔ ویسے بھی فرقان بھائی اور بھابھی تو پاس ہی ہیں۔ کچھ نہیں
ہوتا۔۔۔ اس نے سالار کو تسلی دی۔۔۔ اسکی فلائٹ صبح گیارہ بجے تھی وہ اس وقت
پیکنگ سے فارغ ہوا تھا۔

میرے بغیر رہ لوں گی تم؟ اس نے امامہ کی بات سننے کے بعد کہا۔۔

ہاں دو ہی ہفتوں کی تو بات ہے۔ امامہ نے بجد اطمینان سے کہا۔۔۔

دو ہفتوں میں پندرہ دن ہوتے ہیں۔۔۔ سالار نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔۔
کوئی بات نہیں گزر جائیں گے۔۔

سالار نے گہرا سانس لیا۔ ہاں تمہارے تو گزر جائینگے میرے نہیں گزریں گے میں تو
ابھی اے تمہیں مس کرنے لگا ہوں یار۔۔۔ وہ ہنس پڑی۔۔۔

پہلے بھی تو جاتے ہو تم۔ دو ہفتے پہلے دبی گئے تھے۔ پچھلے مہینے سنگاپور۔۔ اس نے تسلی
دینے والے انداز میں یاد دلایا۔

دو دن کے لیے دبی گیا تھا اور چار دن کے لیے سنگاپور۔ یہ تو دو ہفتے ہیں۔۔

ہاں تو دو ہفتے ہیں نا۔ دو مہینے یاد دو سال تو نہیں۔ اس نے کمال اطمینان سے کہا۔۔
سالارا سے دیکھ کر رہ گیا۔۔

چلو اچھا ہے یہ بھی۔ نا میں یاد آؤں گا نا ہی نظر آؤں گا۔ نا میرا کوئی کام ہو گا۔۔ وقت ہی
وقت ہو گا تمہارے ساتھ۔۔ وہ نجانے اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔۔

ہاں کافی وقت ہو گا میں ایک دو پینٹنگز مکمل کر لوں گی۔ گھر کے کچھ اور کام ہے وہ بھی
کر لوں گی۔ میں نے بہت کچھ پلان کیا ہوا ہے۔۔

اس نے ناول پکڑے اپنی جما ہی روکنے کے لیے منہ پہ ہاتھ رکھا۔۔ وہ ہنس پڑا تھا۔۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
تمہارے لیے تو blessing in disguise ہو گیا ہے میرا ٹرپ۔۔ میں نے
تو سوچا ہی نہیں تھا میری وجہ سے تمہارے اتنے کام پینڈنگ ہو رہے ہیں۔۔۔
اگر اسکے لہجہ میں گلہ تھا تو امامہ نے نوٹس نہیں کیا۔۔

چلو یہ بھی اچھا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔۔

ویری لگا ہوتا تو میں تمہیں لے جاتا۔ اسے پھر کچھ خیال آیا تھا۔۔

تم پریشان مت ہو میں یہاں پہ بالکل ٹھیک رہوں گی۔ امامہ نے فوراً سے پیشتر کہا۔۔

سالار جواب دینے کی بجائے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔۔

کیا دیکھ رہے ہو۔۔ امامہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

تمہارا اطمینان۔۔۔

میں فلمی ہیرو سنز کی طرح ڈانٹاگ نہیں بول سکتی۔۔

صرف فلمی ہیرو سنز ہی ڈانٹاگ بولتی ہے؟

نہیں ہیرو بھی بولتے ہیں۔۔۔ وہ اطمینان سے ہنسی۔۔ سالار مسکرایا تک نہیں تھا۔ وہ

پھر سنجیدہ ہو گئی۔۔۔

مت جاؤ پھر۔۔۔؟ اگر اتنا مس کر رہے ہو تو۔۔ اس نے جیسے اسے چیلنج کیا۔

پیار سے کہتی تو نہ جاتا۔ لیکن میں تمہارا کوئی چیلنج قبول نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے ہار

پسند ہے۔۔ وہ ہنسی۔

تم بات بدل رہے ہو۔

نہیں خود کو تسلی دے رہا ہوں۔۔ چلو آؤ تمہیں کافی پلو کر لاؤں۔۔۔

وہ یکدم بستر سے اٹھ کر بولا۔

اس وقت؟ رات کے اس وقت امامہ تیار نہیں تھی۔۔

ہاں۔۔۔ اتنے دن تک تو نہیں پلو اسکوں گا کافی۔۔۔ وہ دراز سے والٹ اور کار کی

چابیاں نکال رہا تھا

لیکن اب میں پھر کپڑے بدلوں؟

مت بدلو۔۔ چادر لے لو یہی ٹھیک ہے۔۔۔

سالار نے اسکی بات کاٹی وہ اب سیل فون اٹھا رہا تھا۔۔۔۔

فورٹریس سے کافی پینے کے بعد وہ بے مقصد سٹیڈیم کے گرد ڈرائیو کرتا رہا۔۔

اب گھر چلیں۔۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔۔ امامہ کو اچانک خیال آیا۔۔

میں پلین میں آرام کروں گا۔۔

امامہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنا سنجیدہ اور گہری سوچ میں کیوں ڈوبا ہوا

ہے۔۔ واپس آتے ہوئے اس نے ایک دکان سے بہت سا پھل خریدا۔۔

تم یہاں نہیں ہو گے تو اتنا پھل خریدنے کی کیا ضرورت؟ امامہ حیران ہوئی تھی۔۔
تمہارے لیے خریدا ہے۔ شاید پھل کھاتے ہوئے ہی تمہیں میں یاد آجاؤں۔ اس نے
مسکرا کر کہا تھا۔۔

یہ پھل کھانے کے لیے شرط ہے؟ وہ بے اختیار ہنسی۔۔

نہیں۔۔ امید۔۔ امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔۔

-----* & **-----***

اسے واقعی سالار کے جانے کی بعد دو دن کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ سالار کی عدم موجودگی
میں رات کا کھانا وہ فرقان کے ہاں کھایا کرتی تھی۔ دو دن تک تو وہ اطمینان کیساتھ
کھانا کھا کر گھر واپس آجاتی تھی پھر کوئی ناول نکال لیتی تھی۔ اور سونے تک پڑھتی
رہتی۔۔ لیکن مسئلہ تیسری رات کو ہوا تھا۔ اس دن سالار نے دن بھر اسے کوئی کال
نہیں کی تھی اور اتنے مہینوں میں یہ پہلا دن تھا۔ اس طرح سے نہ میسج نہ ہی کوئی ای
میل آئی تھی۔ وہ پچھلی رات سے بہت مصروف تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ
شاید اگلے چند دن وہ اس سے بات نہ کر سکیں۔۔

وہ اس رات فرقان کے ہاں کھانے پہ نہیں گئی۔ اسکی بھوک غائب ہو گئی تھی۔ اس دن اس نے کمپیوٹر مسلسل آن رکھا ہوا تھا۔ اس آس میں کہ شاید وہ اسے کوئی ای میل کر دے۔۔

رات کو اس نے کافی کے لیئے کریم نکالنے کے لیئے فریج کھولا تو اس نے کیک کا وہ ٹکڑا دیکھا جو دو دن پہلے ایئر پورٹ جانے سے پہلے وہ کھاتے کھاتے چھوڑ گیا تھا اور امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیک کا بچا ہوا ٹکڑا فریج میں کیوں رکھ چھوڑا تھا۔۔

کافی بنا کر وہ ٹیرس پر نکل آئی تھی جہاں وہ ویک اینڈ پہ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟؟ ایک دن وہاں کھڑے اس نے نیچھے کھیلتے اور شور مچاتے بچوں کو دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا تھا۔۔

ہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس طرح کے نہیں۔۔۔۔۔

وہ ہنس پڑی۔۔ اسکا اشارہ شور کی طرف تھا۔۔

مجھے تو ہر طرح کے بچے اچھے لگتے ہیں۔۔ شور کرنے والے بھی اس نے نیچھے جھانکتے ہوئے کہا۔

گڈ فار یو بٹ آئی کانت سٹینڈ دم۔۔۔

سالار نے لاپرواہی سے کہا۔۔ دوسروں کے بچے ہیں نا اس لیے برے لگتے ہیں۔ اپنے بچوں کا شور کبھی برا نہیں لگے گا تمہیں۔۔ اس نے روانی سے کہا۔۔۔۔

بچے؟۔۔۔۔ ایک بچہ کافی ہے۔۔ وہ چائے پیتے پیتے اٹکا۔۔

امامہ نے چونک کر نیچھے جھانکتے دیکھا۔۔

ایک کیوں؟؟

تو کتنے ہونے چاہیے۔ وہ سنجیدہ ہوا۔۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ کم سے کم

چار۔۔

اور زیادہ سے زیادہ بارہ۔۔ سالار نے ہنستے ہوئے اسکے جملے میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اسے

مذاق سمجھا تھا۔

میں سیریس ہوں۔۔ اس کی ہنسی رکنے پہ اس نے کہا۔۔

چار بچے۔۔ تم حواسوں میں ہو۔۔ سالار نے مگ منڈھیر پہ رکھ دیا۔

کون پالے گا نہیں؟ اسے بے اختیار تشویش ہوئی۔۔

تم اور میں۔۔۔ اس نے اطمینان سے کہا۔۔

میں ایک بچہ پال سکتا ہوں چار نہیں۔۔۔

سالار نے ہاتھ اٹھا کر جیسے ختمی انداز میں کہا۔۔

ٹھیک ہے تم ایک پال لینا۔ تین میں پال لوں گی۔۔ وہ اطمینان سے کہہ کر دوبارہ نیچھے
جھانکنے لگی۔۔

امامہ۔۔ میں سنجیدہ ہوں۔۔

اور میں بھی۔۔۔

ہم چار بچے فورڈ نہیں کر سکتے۔

میں تو کر سکتی ہوں۔ میرے پاس وہ پیسے ہیں جو۔۔۔۔۔

وہ میں نے اس لیے نہیں دیئے کہ تم انہیں بچوں کی فونج پہ انویسٹ کرو۔۔۔

سالار نے جھنجھلا کر اسکی بات کاٹی۔۔۔

امامہ کو برا لگا وہ کچھ کہنے کی بجائے بے حد خفگی کے عالم میں پھر نیچھے دیکھنے لگی۔

سویٹ ہارٹ۔۔۔ ہم کو،،،، سالار نے اسکے کندھے کر گرد بازو پھیلا کر اسے منانے کی کوشش کی۔

ہاتھ ہٹاؤ۔۔۔ امامہ نے اسکا ہاتھ جھٹکا۔۔

میں نے کیا کیا ہے؟ وہ جھنجھلایا۔ تم چاہتی ہو میں گھر آفس سکول ڈاکٹر ز اور مارکیٹوں کے چکر لگاتے لگاتے بوڑھا ہو جاؤں۔۔

تو تم کیا کرتے ہوئے بوڑھا ہونا چاہتے ہو۔۔ تڑ سے جواب آیا تھا۔۔ وہ لاجواب

ہو گیا۔۔ وہ خفگی بھری سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ رات کے وقت اپنے بچوں کو گھر میں کیوں نہیں

رکھتے۔ دوسروں کو دکھانے کے لیے باہر کیوں لے آتے ہیں۔ وہ اسکے سوال کا جواب

دیے بغیر اپنا منگ اٹھا کر اندر چلا گیا۔۔ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

وہ اب بھی ہنس پڑی تھی منڈیر کے اس نشان کو دیکھ کر نیچھے لان میں پھر وہی شور برپا

تھا۔ اس نے پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگے اس رگ کو دیکھا جس پر وہ دیوار کیساتھ ٹیک

لگا کر کبھی کبھار گٹار بجایا کرتا تھا۔۔

اسے احساس نہیں ہوا کہ اسکی کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ اسی طرح بھرا ہوا مگ لیکر

واپس اندر آگئی۔۔۔****

*****_**

فجر کے بعد وہ مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ کال نہیں تو کوئی ای میل ہی
سہی۔ اس نے وقفے وقفے سے اسے چار پانچ ای میلز کی تھی پھر وہ مایوس ہو گئی۔ جواب
نہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ ای میلز چیک نہیں کر رہا تھا۔

اگلے دن ادا اسی کا دورہ اور بھی شدید تھا۔۔۔ اس دن نہ وہ کوئی پیئنگ بنا سکی نہ ہی کوئی
کتاب پڑھ سکی اور اس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ فریج میں چند دنوں کا پڑا ہوا کھانا کھالیا۔

شام تک وہ اگلے دن سعیدہ اماں کے ہاں جانے کا پروگرام بنا چکی تھی۔ اس کا خیا تھا یہ
تنہائی تھی جو اسے مضحکہ لگاتی تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ نو سال تنہا ہی رہی تھی
اس سے زیادہ تنہا۔۔۔ اس سے زیادہ برے حالات میں۔۔۔

اس دن اسے سالار کی تین لائونوں کی ایک ای میل ملی تھی اور ان تین لائونوں کو اس
نے رات تک کم از کم تین سو بار پڑھا تھا۔۔۔

امامہ نے کپڑوں کا بیگ کمرے میں رکھنے کے فوراً بعد ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ کوئی بھی اس کا چہرہ باآسانی سے ہڑھ سکتا تھا۔۔۔ اگلے دس منٹ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے تاثرات کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مسکرا کر گہرے سانس لیکر چہرے کے تاثرات کو نرم رکھ کر پھر جیسے زچ ہو کر اس نے ہارمان لی۔

جنہم میں جائے۔۔۔ اب لگتی ہوں پریشان تو کیا کروں۔۔۔ کتنا مسکراؤں میں۔۔۔؟
 پھر وہ باہر نکل آئی۔۔۔ سونا یہاں بھی مشکل تھا۔۔۔ ادا سی یہاں بھی ویسی ہی تھی۔۔۔
 اتنی چپ تو تم پہلے کبھی نہیں رہی تھی بیٹا۔۔۔ اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟ اگلی شام تک سعیدہ اماں یقینی طور پہ فکر مند ہو گئی تھی۔۔۔ حالانکہ اس دن صبح سالار سے اسکی بات بھی ہوئی تھی۔۔۔

تم سالار کیساتھ خوش تو ہونا؟ وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی اور وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔ ادا سی بری طرح بڑھی تھی۔ مسلہ خوشی کا نہیں تھا۔۔۔ مسلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اسکے ساتھ خوش ہے یا نہیں۔۔۔ بات صرف اسکے ساتھ رہنے کی تھی۔۔۔ خوش یا ادا اس جیسے بھی ہو لیکن اسکے ساتھ ہی۔۔۔۔

اس نے سعیدہ اماں کو جواب دینے کی بجائے موضوع بدل دیا۔ وہ دو دن وہاں رہ کر پھر اسی بے چینی کے عالم میں واپس آئی تھی۔۔

لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے آنے تک وہی رہو گی۔۔۔ سالار اسکی واپسی پر حیران ہوا۔۔

میری مرضی۔۔۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔۔ اوکے۔۔۔ وہ جواب پر حیران ہوا تھا۔۔

مجھے نیویارک سے ورکشاپ کے ختم ہونے کے بعد یہیں سے دو ہفتے کے لیے کینیڈا جانا ہے۔۔۔

سالار نے اسے اگلی خبر سنائی۔۔۔

کیا مطلب۔۔۔

جو کو لیگ مانٹریال والی کانفرنس اٹینڈ کر رہا تھا اسے کوئی میڈیکل ایمر جنسی ہو گئی تھی۔۔ فوری طور پر مجھے کانفرنس میں جانے کے لیے کہا گیا ہے کیونکہ میرے پاس ویزہ بھی ہے اور میں قریب بھی ہوں۔۔۔

وہ صدمے سے بول ہی نہ سکی دو ہفتے اور باہر رہنے کا مطلب تھا کہ وہ عید کے ایک ہفتے بعد واپس پاکستان آتا۔۔

ہیلو۔۔۔۔۔ سالار نے اسکی لمبی خاموشی پر لائن پر اسکی موجودگی چیک کی۔۔۔

یعنی عید کے بعد آؤ گے تم؟

اس نے اپنے لہجے کی مایوسی پر قابو پاتے ہوئے سالار کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ عید قریب ہے۔۔۔

ہاں۔۔۔۔۔ ایک حرفی جواب آیا تھا۔۔۔ یقیناً اسے یاد تھا۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اور میں عید پر کیا کروں گی؟

اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے اس سے۔۔۔ مایوسی کی انتہا تھی۔۔۔ جس کا وہ

اس وقت شکار ہو رہی تھی۔ ایک ہفتے کا انتظار تیب ہفتوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔۔۔ اور

تین ہفتے کے لیے اس اپارٹمنٹ میں اکیلا رہنا۔۔۔۔۔ اسے سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔۔۔

تم اسلام آباد چلی جانا عید پر۔۔۔ سالار نے کہا۔۔۔

نہیں۔۔۔۔۔ میں یہی رہوں گی۔۔۔ اس نے بلاوجہ ضد کی۔۔۔

ٹھیک ہے یہی رہنا۔۔ سالار نے باآسانی گٹھنے ٹیک دیئے۔

تمہیں کیوں بھیج رہے ہیں۔۔۔ بھیجنا تھا تو پہلے ہی کہنا چاہیے تھا نا اسے۔۔۔

اسے اب بنک والوں پر غصہ آرہا تھا۔۔

ایسی ایمر جنسی ہو جاتی ہے کبھی کبھار وہ کسی اور کو اتنے شارٹ نوٹس پر پاکستان سے

نہیں بھیج سکتے۔۔ ورنہ مجھے کہا بھیجنا تھا انہوں نے۔۔ سالار نے وضاحت کی۔۔

پھر بھی۔۔۔ تم کہہ دیتے کہ تم مصروف ہو۔۔ تمہیں ان دنوں پاکستان میں کوئی کام

ہے۔۔۔ وہ ہنس پڑا۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔۔۔ میں جھوٹ بولتا؟؟؟

امامہ کو غصہ آیا۔۔ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا کیا؟

نیور۔۔ اپنے کام میں؟ ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ امامہ کچھ

بول نہ سکی۔۔

تم ایسا کرو ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی جاؤ۔ اتنے دن اکیلی رہو گی تو بور ہو جاؤ گی۔۔

نہیں۔۔ میں بور نہیں ہونگی مجھے یہاں بڑے کام ہیں۔۔ وہ اسکے مشورے پر کچھ چڑسی

گئی۔

سالار کو اسکی ٹون نے حیران کیا تھا۔ وہ اس طرح کبھی بات نہیں کرتی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ بے حد خوشگوار اور پر جوش انداز میں بات کر رہی تھی پھر یکدم اسے کیا ہو گیا۔۔۔ وہ امامہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن فوری طور پہ اس نے موضوع بدلنا بہتر سمجھا۔۔۔

اپ سیٹ ایک چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت لے لیے جو وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ بے حد غم و غصہ میں تھی۔ آخر وہ اسے چار ہفتے کا کہہ کر تو باہر نہیں گیا تھا۔۔۔ وہ بعد میں ان تیس دنوں کے ایک ایک گھنٹے کو گننے لگی۔۔۔

میں بھی اب اسے ای میل نہیں کرنگی۔ نہ ہی کال کروں گی۔ نہ ہی اس سے پوچھوں گی کہ اس نے کب آنا ہے اور کب نہیں۔۔۔ آتا ہے تو آئے نہیں تو نہ آئے۔۔۔ جہنم میں جائے میرا ہی تصور ہے۔۔۔ بار بار اس سے نہ پوچھتی تو اس طرح نہیں کرتا وہ۔۔۔

اس رات بستر پر لیٹے ہوئے وہ بے حد رنجیدگی کے عالم میں ان تمام چیزوں کی فہرست بناتی رہی جن میں اسے اب سالار کی نافرمانی کرنی تھی۔ بستر پر لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اسکی فہرست ابھی دو سو پچپن اینٹریز تک پہنچی تھی لہ اسے بیڈ کے بلکل اوپر

کو۔۔ اور دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔۔

سالار۔۔۔۔ امامہ نے دوبارہ اسکا کندھا ہلایا۔۔۔۔

اسکا خیال تھا کہ وہ شاید نیند میں وہ چھپکلی دیکھ نہیں پایا تھا۔۔

دیکھ لی ہے میں نے امامہ۔۔ سونے دو۔۔ وہ لیٹے لیٹے بڑ بڑایا۔۔

دیکھ لی ہے تو کچھ کرو اسکا۔۔ وہ اسکی بے توجہی پر ناراض ہوئی۔۔

چلی جائے گی خود ہی۔۔ تم لائٹ آف کر کے سو جاؤ۔۔ وہ پھر بڑ بڑایا۔۔

میں کیسے سو جاؤں وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ اسکی خفگی بڑھی۔۔

لائٹ بند کر دو۔۔ نہ تم سے دیکھو نہ وہ تمہیں دیکھے۔۔

اسے اسکے مشورے سے زیادہ اسکی بے حسی پہ غصہ آیا۔۔

تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے۔

میں رات کے اڑھائی بجے چھپکلی نہیں مار سکتا۔۔ جسٹ اگنوراٹ۔۔

میں نہیں اگنور کر سکتی اسے۔۔ یہ اگر گرے تو سیدھا میری ٹانگوں پہ گرے

گی۔۔ اس نے چھت کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

یار میں تمہاری سائڈ پہ آجاتا ہوں تم میری سائڈ پہ آ جاؤ۔۔

وہ کروٹ لیتے کہتا ہوا اسی طرح اسکی سائڈ پر چلا گیا۔ وہ اسکے ایثار سے زیادہ اسکی دلیری

سے متاثر ہوئی تھی۔ کمرے کی بڑی لائٹ بند کرتے ہوئے وہ اپنا ناول لیے سالار کا بیڈ

سائڈ ٹیبیل لیمپ آن کر کے اسکے بستر میں بیٹھ گئی۔ سالار تب تک اسی طرح اوندھے

منہ لیٹے لیٹے اسکا سائڈ لیمپ آف کر چکا تھا۔۔ خود کو قدرے محفوظ پاتے ہوئے کچھ

پر سکون انداز میں اس نے ناول کے چند جملے پڑھے پھر دوبارہ چھکلی کو دیکھا۔۔ وہ جیسے

اسی جگہ پر چپک کر رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ امامہ نے سالار کو دیکھا۔۔ وہ اس چھکلی کے عین

نیچے بے حد اطمینان سے اسی طرح کنبل اوڑھے اوندھے منہ لیٹا تھا۔۔

سالار۔۔۔۔۔ تم مرد کتنے بہادر ہوتے ہو۔۔۔۔۔ اس نے مردوں کو سراہنا ضروری

سمجھا۔۔۔

اور سمجھدار بھی۔۔۔۔۔ اسے جو ابابڑ بڑا ہٹ سنائی دی۔

سمجھدار کیسے؟ وہ صفحہ پلٹتے پلٹتے چونکی۔۔۔

چھپکلی گرتی تمہارے بیڈ پر لیکن بھاگتی میرے بیڈ کی طرف۔۔ اسکا منہ میرے بیڈ کی طرف ہے۔۔ جماہی لیتے اسی طرح آنکھیں بند کیسے ہوئے سالار نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔۔

امامہ نے سراٹھا کر چھت کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ بیڈ سے باہر تھی۔۔ چھپکلی کا رخ واقعی سالار کے بیڈ کی طرف تھا۔۔

تم سارے مرد بے حد خود غرض ہوتے ہو اور ایک جیسے ہوتے ہو۔۔

وہ بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے جتنی بلند آواز میں یہ اس سے کہہ سکتی تھی اس نے کہا۔۔۔۔

سالار نے بلا آخر آنکھیں کھول دی تھی۔۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔۔ لیکن اسے اندازہ ہوا کہ تنگ کرنے کے لیے شاید یہ موقع غلط تھا۔۔

دس منٹ بعد اسے چھپکلی کا صفا یا کرنے کی اطلاع دیکر وہ اسے منا کر لاؤنج سے واپس لے آیا تھا۔ اس نے اگلے کئی دن یہ چھپکلی نہیں دیکھی تھی اور آج یہ چھپکلی پھر آگئی تھی۔۔ یقیناً اس نے جھوٹ بولا تھا اس نے اس چھپکلی کو نہیں مارا تھا۔۔ وہ احمقانہ بات

اس وقت اسکے لیئے ایک اور پوائنٹ ہو گیا تھا۔۔

اگلے دن فون پر اس نے سالار کو اس چھپکلی کے نمودار ہونے کا بتایا۔۔

تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم نے اسے مار دیا تھا۔۔ اس نے چھوٹے ہی سالار سے

کہا۔۔

میں نے اسے واقعی مار دیا تھا۔ یہ کوئی اور چھپکلی ہوگی۔۔ سالار نے لاپرواہی سے

کہا۔۔۔۔

نہیں یہ وہی چھپکلی تھی۔ تم نے اگر اسے مارا ہوتا تو تم مجھے دکھاتے۔۔ وہ اپنی بات پر مصر تھی۔

سالار کا سر گھوم کر رہ گیا۔۔ وہ امامہ سے اس سے زیادہ احمقانہ گفتگو کی توقع نہیں رکھ

سکتا تھا۔۔

تم اگر کہتی تو میں تمہیں وہ مری ہوئی چھپکلی بھی دکھا دیتا۔۔ اس نے تحمل کا مظاہرہ

کرنے کی کوشش کی تھی۔۔

نہیں یہ وہی تھی میں اسے پہچانتی ہوں۔۔۔

اگر یہ وہی تھی تو اتنے دن سے کہاں تھی۔۔۔

اس نے ایک ال لوجیکل چیز پر لاجک دینے کی کوشش کی۔۔

جہاں بھی تھی مجھے نہیں پتا لیکن تم یہی چاہتے تھے کہ میں پریشان ہوں۔

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔۔ وہ اس الزام کے جواب میں کیا کہتا۔ امامہ کو کچھ

ہوا تھا۔۔ لیکن کیا ہوا تھا اسے سمجھ نہیں آئی۔۔

تمہیں پتہ ہے مجھے چھپکلی سے ڈر لگتا ہے لیکن تم پھر بھی اسے یہاں چھوڑ کر

گئے۔ کیونکہ تمہیں احساس نہیں ہے میرا۔۔ تم مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہو

۔ تمہارے لیے ہر چیز مذاق ہے۔۔ اسکی کسی بات کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔۔ وہ اسکی گفتگو

سنتا رہا۔۔

تم ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کرتے ہو اور مجھے پتا ہے تم نے ہمیشہ اسی طرح کرنا

ہے۔۔ کیونکہ تمہارے لیے صرف تمہاری اپنی اہمیت ہے اور میں تمہارے گھر کی

نوکرانی ہوں۔۔۔ تم جہاں مرضی پھرو لیکن میں ہمیشہ گھر پہ رہوں جیسے غلام رہتے

ہیں۔۔۔ میں سارا دن کام کروں اور تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے۔۔ اس

بے ربط گفتگو کے اختتام پر وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔۔۔

ساری گفتگو میں ایشو کیا تھا۔ چھپکلی کا نہ مارا جانا، اسکی خود غرضی۔۔ اسکے گھر پہ نہ ہونا یا وہ سارے کام جو اسے کرنے پڑ رہے تھے۔۔ وہ سمجھ نہ سکا۔۔

اگلے پانچ منٹ وہ تحمل سے اسکی ہچکیاں رکھنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور پھر بلا آخر طوفان جب تھم گیا تو اس نے کہا۔۔ آئی ایم سوری میرا قصور تھا۔ میں فرقان سے کہتا ہوں وہ ملازم کو بھیجے وہ چھپکلی کو مار دے گا۔ فی الحال معذرت کے سوا اسے صورت حال سے نبٹنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔۔

نہیں۔۔۔ اب میں چھپکلی کے ساتھ رہو گی تاکہ تمہیں پتا چلے۔۔۔ اس نے ناک رگڑتے ہوئے اس سے کہا۔۔ سالار کو بے اختیار ہنسی آگئی تھی جسے اس نے کھانس کر اس پہ قابو پالیا۔۔ وہ جلتی پر تیل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ امامہ کا مسلہ کیا تھا وہ سمجھ نہیں پارہا تھا۔۔

فرقان کے ملازم نہیں اس دن آکر چھپکلی کو مار دیا تھا۔ لیکن اس چیز نے بھی امامہ کے دل میں ممنویت کو پیدا نہیں کیا تھا۔۔

اگلے دن کھانا پکاتے ہوئے اسکے ہاتھوں پر چھری سے کٹ لگ گیا۔۔ سنک میں پانی کے نیچھی انگلی رکھے وہ پھر اسے یاد آنے لگا۔۔

یہ کیا ہوا ہے۔۔؟

وہ اس دن آفس سے آنے کے بعد لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ امامہ ڈنر کے لیئے برتن لگا رہی تھی۔۔ وہ بات کرتے ٹہلتے ہوئے کچن کاؤنٹر پہ پڑے پیالے سے کچھ بیسز کھا رہا تھا جب امامہ نے وہاں آ کر رکھے ہوئے چاول اٹھائیں۔۔ سالار نے اسکے ہاتھ کی پشت پر چند آبلے دیکھے۔ فون پر بات سنتے سنتے اس نے بے اختیار اس سے کہا۔۔

کیا ہوا؟؟؟۔۔۔۔۔

یہ؟؟؟ امامہ نے چونک کر اسکی نظروں کے تعاقب میں اپنا ہاتھ دیکھا۔۔

کچھ نہیں۔۔ کھانا بنا رہی تھی تو آئل کے کچھ چھینٹیں گر گئے۔۔ اس نے لاپرواہی سے

بتایا۔۔۔۔

وہ اسی طرح فون پر بات سنتے ہوئے اسکا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگا۔۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر

اسی طرح فون پر بات کرتے لاؤنج سے غائب ہو گیا۔۔ وہ فریج سے پانی نکال رہی تھی جب وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اس نے فون پر سٹاک مارکیٹ کے کسی ایشیو پر بات کرتے ہوئے اس نے امامہ کا ہاتھ پکڑ کر چند لمحوں میں اس پر مرحم لگایا اور پھر اسی طرح دوبارہ چلا گیا۔۔ وہ ہل نہ سکی تھی۔ اتنے سالوں میں اسکے کسی زخم پہ رکھا جانے والا یہ پہلا مرحم تھا۔۔

کھانا کھاتے ہوئے سالار کی نظر ایک بار پھر اسکے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس نے قدرے خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

اگر اسی وقت کچھ لگالیتی تو یہ آبلے نہ پڑتے۔

مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی۔

مگر مجھے تکلیف ہو رہی ہے سویٹ ہارٹ۔۔۔

وہ اس سے نظریں ملا کر جواب نہ دے سکی۔ اسے یقین تھا کہ اسے تکلیف ہو رہی ہوگی اور اس مرحم سے زیادہ ٹھنڈک اسکے اس جملے نے پہنچائی تھی اسے، تو اب کوئی تھا جسے اسکے ہاتھ پہ آنے والے ایک معمولی زخم پر بھی تکلیف ہوتی تھی۔۔

وہ درد کے احساس سے جیسے دوبارہ آشنا ہو رہی تھی اور اب اتنے مہینوں بعد یہ پہلا کٹ تھا جسکے بارے میں اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور اسے یہ پوچھنے والا ایک بار پھر بری طرح یاد آیا تھا۔۔

دوسرے ہفتے کے اختتام تک وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بری طرح جھنجھلانے لگی تھی۔۔ مازمہ کیساتھ، مالی کیساتھ، اسکے گھر آنے والے فرقان کے بچوں کیساتھ اور خود سالار کیساتھ۔۔۔

آمامہ۔۔۔۔۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟۔۔ سب ٹھیک ہے نا؟ سالار کو بلا آخر اس سے ڈائریکٹ ہو کر پوچھنا پڑا۔

کیا ہونا ہے مجھے۔۔۔ وہ اسکے سوال پر بری طرح چڑی۔۔۔

وہی تو پوچھ رہا ہوں۔۔ اس نے تحمل سے کہا۔۔۔

کچھ نہیں ہو رہا ہے مجھے۔۔۔۔۔

پھر تم۔۔۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔۔۔ یہ کہنا ذرا مشکل تھا کہ وہ اسکے ساتھ تلخ ہو رہا تھا۔۔

پھر میں کیا؟۔۔۔ امامہ نے اسکے خاموش ہونے پر پوچھا۔۔

کچھ نہیں۔۔۔ میں ابھی دو تین دن تک تمہیں فون نہیں کر سکوں گا۔

کیوں؟؟ وہ بری طرح بگڑی۔۔ اتنا بھی کیا کام ہے کہ تم مجھے چند منٹ کے لیے بھی
کال نہیں کر سکتے۔۔۔

میں تمہیں ای میل کر دیا کروں گا۔۔ اگر وقت ملا تو کال بھی کروں گا۔۔ وہ اسے تحمل
سے سمجھا رہا تھا۔۔

تم مجھے ای میل بھی نہ کرو۔۔ اس سے اور بھی وقت بچے گا تمہارا۔۔۔

اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بند کر دیا۔ اسے سالار پہ بری طرح غصہ آرہا
تھا۔۔ چند منٹوں بعد دوبارہ کال آنے لگی تھی۔ وہ کال ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن
اسے ریسیو کرنا پڑی۔۔

تم نے فون بند کر دیا تھا۔۔ وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔۔

ہاں۔۔۔۔

کیوں؟؟

تاکہ تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔ میں نے کل ایک میگزین میں پڑا تھا کہ جن مردوں کو احساس کمتری ہو وہ اپنی بیویوں کو اپنی جھوٹی مصروفیت کے قصے سناتے رہتے ہیں۔۔ سالار نے کچھ ہکا بکا ہو کر اس کا جملہ سنا تھا۔۔

تاکہ انکی بیویوں کو یہ امپریشن ملے کہ وہ کتنے اہم ہیں۔۔ اور یہ دنیا اسکے بنا نہیں چل سکتی۔ سالار نے اسی اچھنبے میں اسکے باقی جملے بھی سنے۔۔ اس سے انکی سیلف اسٹیم بڑھتی ہے۔۔۔

اس نے آخری جملہ کہہ کر کچھ دیر کے لیے سالار کے رد عمل کا انتظار کیا۔۔ وہ خاموش تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہیلو۔۔ اما مہ کو حدشہ ہوا کہ شاید کال ڈراپ ہوگی ہے۔۔۔

میں سن رہا ہوں۔۔ اس میگزین میں بس اتنا لکھا تھا؟

وہ سنجیدہ لگ رہا تھا لیکن بات سنجیدہ نہیں تھی۔

ہاں۔۔۔۔۔۔۔

گڈ۔۔۔ ڈینٹسٹ کے پاس گی تھی تم؟ اس نے بات بدلی۔۔

امامہ لی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس سے بحث کرنا چاہتی تھی۔

دو گھنٹے بعد اس نے دو ہفتوں پر پراگرام چارٹ اسے ای میل کر دی۔ اس ڈاکومنٹ کو پڑھنے میں اسے پندرہ منٹ لگے۔ یہ ای میل اسے کس جملے کی وجہ سے کی گئی تھی اسے اندازہ تھا لیکن اسکے باوجود اس نے کسی قسم کی شرمندگی کا اظہار نہیں کیا۔

تم نے فرقان کے گھر ڈنر پہ جانا کیوں چھوڑ دیا؟ سالار نے اس دن اس سے پوچھا۔

میری مرضی۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ کہنا چاہتی تھی کہ ڈنر ٹیبل پر فرقان یا اسکی بیٹی کو دیکھتے ہوئے اسے وہ یاد آتا ہے اور ہر روز ڈنر کے بعد کچھ اور زیادہ اپ سیٹ ہو جاتی تھی لیکن وہ یہ سب نہ کہہ سکی۔

میں جانتا ہوں تم بہت بہادر ہو اکیلی رہ سکتی ہو ڈنر تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، پھر بھی انکے گھر چلی جاتی تو کوئی ایکٹیویٹی ہوتی تمہارے پاس اس ناولز لے علاوہ۔۔۔

تمہیں کیا پرواہ ہے۔۔ اس نے سالار کے جملے پر جربز ہو کر کہا۔

مجھے تمہاری پرواہ ہے۔۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھنا چھوڑ دو۔۔ وہ سنجیدہ تھا۔

میں نے کب کہا تم بیوقوف ہو؟۔۔۔

اب تم مجھ کو جھوٹا کہہ رہے ہو۔۔۔ وہ بے بسی سے ہنس پڑا۔

کیا ہوا ہے تمہیں امامہ۔۔۔

اب تم کہہ دو کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔

پانی پیو۔۔

کیوں پیوں۔۔۔۔۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Article | Poetry | Interview
اچھامت پیو۔۔۔ موسم کیسا ہے باہر کا۔۔۔

وہ اب موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ مگر وہ امامہ کے رد عمل پہ بری طرح

حیران تھا۔۔

امامہ! کوئی پریشانی ہے تمہیں؟؟ وہ اگلے دن نوشین کیساتھ اسکے کہنے پہ فورٹریس آئی

تھی۔ جب چلتے چلتے نوشین نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ بری طرح چونکی۔۔۔ پھر

مسکرانے کی کوشش کی۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ کیوں۔۔۔

پھر اس طرح کیوں گم صم ہو؟

نہیں میں۔۔۔ میں کچھ سوچ رہی تھی۔۔۔

سالار کیساتھ تو بات ہوتی ہے تمہاری۔۔ کوئی جھگڑا تو نہیں ہے۔۔۔

نہیں تو۔۔۔ روز بات ہوتی ہے۔۔۔ اس نے بے اختیار مسکرانے کی کوشش کی اور

ڈسپلے پر لگے ایک سوٹ کی طرف نو شین کو متوجہ کیا۔۔۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتی کہ یہاں

اسکے ساتھ پھرتے ہوئے سالار کتنا یاد آرہا ہے۔۔۔

میگزین میں آج تم نے کچھ نہیں پڑھا ان مردوں کے بارے میں جو احساس کمتری کا

شکار ہوتے ہیں۔۔ اور اپنی بیویوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟؟ سالار نے

اگلے دن فون پہ بات کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔۔۔

امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔۔

تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کہ ایسے مرد نہیں ہوتے اور میں فضول بات کرتی ہوں۔۔

میں مذاق کر رہا تھا امامہ۔۔۔ وہ کچھ محتاط ہوا۔۔۔

ایک سنجیدہ بات کو مذاق میں لے رہے ہو تم،،،،،،،

کونسی سنجیدہ بات؟ امامہ! تم آجکل کونسے میگزین پڑھ رہی ہو۔۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔۔

تمہیں اس سے کیا۔۔ وہ مزید بگڑی۔۔

اگر تم مجھے اس طرح کے اسٹوڈنٹ ایکسپریس سناؤ گی تو میں پوچھوں گا تو سہی نا۔۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے بحث کرنے لگا تھا۔۔ اب تقریباً روز یہی کچھ ہو رہا تھا۔۔ پچھلے چار دن سے فون کال کے اختتام پر اسے معذرت کر کے فون بند کرنا پڑ رہا تھا۔۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ امامہ کو کیا ہوا ہے؟ وہ ناراض پہلے بھی ہوتی تھی مگر اس طرح کی باتوں پہ نہیں ہوتی تھی۔

سالارا اگر اسکے بنتے بگڑتے موڈ کو سمجھ نہیں پارہا تھا تو وہ بھی خود کو نہیں سمجھ پارہی تھی۔۔ وہ سارا دن اسکے بارے میں سوچ سوچ کر اداس ہوتی تھی اور اس بات کرتے ہوئے وہ بلاوجہ اس سے جگھڑتی۔

اسے اس پر شدید غصہ آتا تھا اور کیوں آتا تھا یہ اسکی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ سارا دن ٹی وی آن کیسے ہوئے اسکی کال کے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی یا پھر کمپیوٹر

آن کر کے پرانے ای میلز پڑھتے ہوئے کسی نئے ای میل کا انتظار کرتی۔۔۔ چند لائنوں والی ای میلز جن میں وہ انکا حال پوچھتا تھا درجنوں بار پڑھتی تھی اور پھر ایک لمبا چوڑا جواب لکھ کر اسکی ای میل کے انتظار میں ساری ساری رات اسکی چیزیں نکال کر صاف کرتے ری اریج کرتی رہتی تھی۔ پھر اسکے کو لیکشن میں موجود چارلی تھیرون کی موویز دیکھتی تھی۔ یہ واقعی بے بسی کی حد تھی۔ اسے اب وہ ایکٹریس بھی بری لگنا بند ہو گئی تھی جسکو وہ پہلے سالار کے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔۔۔ ہر روز کھانے کی ٹیبل پر وہ اسکے بھی برتن لگا دیتی۔ یہ جیسے کھانے کی ٹیبل پہ اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش تھی۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

عید کے لیے اسلام آباد جانے تک گھر کی اس خاموشی اور تنہائی نے اسے مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا تھا۔۔۔

اسلام آباد سے آنے کے بعد بھی اس نے خود کو بہتر محسوس نہیں کیا تھا۔۔۔ سالار کی پوری فیملی میں سے صرف عمار اور یسریٰ عید منانے کے لیے وہاں موجود تھے۔۔۔ سالار نے طیبہ کو اسکی عید کی شاپنگ کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بڑے بچھے دل کیساتھ انکے ساتھ چلی گئی تھی۔۔۔

اسلام آباد آکر یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے گیسٹ روم کی کھڑکی سے لگ کر اپنے گھر والوں میں سے کسی کے نظر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

عید کی صبح پیلے کی طرح اس بار بھی سالار کی کال سے اٹھی۔ وہ مانٹریال میں اپنا سیشن ختم کر کے کچھ دیر پہلے ہوٹل آیا تھا۔

کون سے کپڑے پہن رہی ہو تم آج؟ اس نے مبارکباد دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

تمہیں بتانے کا فائدہ؟ اس نے بیڈ کے کراؤن کیساتھ پشت ٹکاتے ہوئے کہا۔

میں تصور کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کیسی لگ رہی ہو گی۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میرے سامنے کبھی تم نے میرے کپڑوں کو غور سے دیکھا تک نہیں، اب وہاں بیٹھ کر کیا تصور کرو گے۔

امامہ ہم کم از کم آج آرگینو نہیں کریں گے۔۔۔ سالار نے مداخلت کرتے ہوئے جیسے پیشگی

جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔۔۔ تمہیں کیا چاہیے آج؟؟ فلاور ز اور کیک تو مئی سے میں

نے کہا ہے تمہارے لیے کچھ اور چاہیے؟؟

نہیں۔۔۔ وہ بے حد اس تھی۔۔۔

او وہ۔۔۔۔۔ آج میں جینیفر کی آنکھوں کو غور سے دیکھوں گا۔۔۔ اس نے ڈنر پر اپنی
کسی ساتھی کا نام لیا۔۔۔

کیوں؟؟

اسکی آنکھوں میں مجھے اپنی بیوی کے کپڑوں کا کلر نظر آئے گا۔۔ وہ سنجیدہ تھا۔۔۔۔۔ وہ
بے اختیار ہنس پڑی۔۔۔۔

امامہ۔۔۔۔۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں تم پہلی بار ہنسی ہو۔۔ سالار نے اسکی ہنسی کو نوٹس
کیا۔۔۔ اور شادی کے بعد اتنے مہینوں میں یہ پہلا کلر ہے جسے تم نے شناخت کیا ہے اور
وہ بھی کسی عورت کی آنکھوں کی وجہ سے۔۔۔۔

تم جیلز ہو رہی ہو۔۔۔ وہ ہنس پڑا۔۔

ہاں بس اب ایک یہی تو کام رہ گیا ہے میرے کرنے کو۔۔۔۔

اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔۔

یعنی نہیں ہو رہی یا نہیں ہو سکتی۔۔۔۔

وہ ہو چھ رہا تھا اور وہ جواب نہ دے سکی اسکی خاموشی پر وہ ہنسا۔۔

اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔۔ وہ جزبہ ہوئی۔۔۔

ابہنی خوش فہمی پر ہنسا ہوں۔ کم از کم تم کسی عورت سے میرے لیے جیلس نہیں ہو سکتی۔

وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی اسکا اشارہ رمشہ کی طرف تھا۔۔

تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کب آرہے ہو؟

اس نے بات بدلنا بہتر سمجھا۔۔

وہ عمید کے دوسرے دن رات کی فلائٹ سے واپس لاہور آگئی تھی۔ کیونکہ اگلی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ آرہا تھا۔ وہ زودرنجی اور حساسیت جو پچھلے چار ہفتوں سے اسے ناخوش رکھے ہوئے تھی وہ یکدم غائب ہوگئی تھی۔

اور چار ہفتے کے بعد بلاآخر اس نے کیک کا وہ ٹکڑا اور کین ڈسپوز آف کر دیئے۔۔

اگر فرقان کو سیدھا ہسپتال سے ایئرپورٹ نہ جانا ہوتا تو وہ خود اسے ریسیو کرنے چلی جاتی وہ کچھ اتنی ایکساٹڈ ہو رہی تھی۔۔

نونج کرپینٹا لیس منٹ پر بلاآخر ڈور بیل بجی۔ اسے دروازے تک پہنچنے میں سیکنڈز لگے

تھے۔۔

خدا یا۔۔ کیا خوشی اسے کہتے ہیں جو اس شخص کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے محسوس کی
میں نے۔۔ اس نے دروازہ کھول کر ڈور ہینڈل پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھے سالار کو دیکھ کر
اچھنبے سے سوچا .

فرقان سے باتیں کرتا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سیدھا ہوا اور ان دونوں کی نظریں
میلیں۔۔ وہی گرمجوش مسکراہٹ جسکی وہ عادی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی چند لمحوں کے
لیئے جیسے ساکت ہو گئی۔۔

امامہ۔۔ سامان کی ڈیلیوری دینے آیا ہوں چیک کرو۔۔ کوئی بریک یا ڈیمج تو
نہیں۔۔ فرقان نے ایک سوٹ کیس کھینچ کر اندر لیجاتے ہوئے اسے چھیڑا۔۔ سالار
مسکرایا تھا۔

امامہ نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی تھی لیکن اسکے گلے میں کوئی گرہ لگنے لگی
تھی۔ بات یہی تک ہوتی تو ٹھیک تھی لیکن آنکھوں میں پانی کیسے اور کیوں آ گیا تھا۔ وہ
آگے بڑھا اور ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگایا۔۔ جیسے وہ آفس سے آنے کی بعد لگایا کرتا
تھا۔۔ بے اختیار آنسوؤں کا ایک اور ریلہ آیا۔۔ یہی تو وہ ڈھونڈتی پھر رہی

تھی۔۔۔ یہی نرم لمس۔۔ اپنے گرد یہی بازوؤں کا حصار۔۔

کیسی ہو تم۔۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔۔ گلے گرہیں اور بڑھ گئی۔ اس نے اب اسکو خود سے الگ کیا اور اسکا چہرہ اور آنسو دیکھے۔۔

کیا ہوا؟؟ وہ ٹھٹکا۔۔ اور سوٹ کیس اندر لیجاتے ہوئے فرقان نے پلٹ کر دیکھا۔

میں ابھی۔۔۔ ابھی سلاد کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔ اس نے کچھ گھبراہٹ میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔۔ پھر شاید خود ہی اسے بہانہ کمزور لگا۔ وہ سر میں کچھ درد تھا۔ اور فلو تھا۔ فرقان کی مسکراتی نظروں سے وہ کچھ گڑبڑائی۔

سالار نے فرقان کو نظر انداز کیا اور ایک بار پھر اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔۔ تو یار کوئی میڈیسن لینی چاہیے تھی۔۔

کوکنگ ریجن پہ کچھ رکھ کے آئی ہوں۔۔ وہ ر کے بنا کچن میں چلی گئی۔

اسکے سامنے کھڑے رہ کر اس سے نظریں ملا کر جھوٹ بولنا مشکل ہو گیا تھا۔۔ سنک میں چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر اس نے کچھ پانی پیا۔ آواز کی تھر تھراہٹ صرف اس

سے ختم ہو سکتی تھی۔

بیٹھو کھانا کھا کر جاؤنا۔۔۔ وہ جب لاؤنج میں آئی تو سالار فرقان سے کہہ رہا تھا۔

نہیں۔۔۔ اس وقت نہیں۔۔۔ کھانے پہ انتظار کر رہے ہونگے بچے۔ کچھ دنوں بعد چلیں

گے کہی ڈنر کے لیئے۔۔۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔۔۔ سالار

دروازے تک اسے چھوڑنے گیا۔ وہ کچن میں آکر کھانا اور برتن لگانے لگی۔۔۔

وہ دروازے سے واپسی پر کچن میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے آیا۔ فون پر سکندر

تھے۔ امامہ نے اسے کچن کاؤنٹر پہ رکھے پانی کی بوتل کو کھولتے دیکھا۔ فون کندھے اور

کان کے نیچے دبائے اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ امامہ نے اسکے گلاس کی طرف جانے

سے پہلے ایک گلاس لاکر اسکے سامنے کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔ سالار سے بوتل لیکر اس نے

گلاس میں اسکے لیئے پانی ڈالا۔۔۔

سالار نے سکندر سے بات کرتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر

پانی کی گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔۔۔

پاپا خیریت پوچھ رہے ہیں تمہاری۔۔۔

فرتج کادر وازہ کھولتے ہوئے وہ مسکرائی۔

میں اب ٹھیک ہوں۔۔ سالار نے اسکے جملے پر غور کیے بغیر سکندر تک اسکا جملہ پہنچا دیا۔۔

کاؤنٹر پر پڑے سلاد میں سے سیب کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے وہ اسی طرح سکندر سے بات کرتے ہوئے کچن سے نکلا۔ امامہ نے اسے ٹیس کادر وازہ کھول کر پودوں پر نظر دوڑاتے دیکھا۔۔ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اسکی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آنے لگی۔ ایک مہینہ بعد یہ جگہ اسے گھر لگی تھی۔ بات محبت کی نہیں بلکہ عادت کی تھی اور وہ اسکی عادی ہو چکی تھی اور بعض دفعہ عادت محبت سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔۔۔

اسے اچانک خیال آیا کہ وہ کھانا کھانے سے پہلے کپڑے تبدیل کر یگا بیڈ روم جا کر وہ اسکے لیئے کپڑے نکال کر واش روم میں لٹکا کر آئی۔

وہ واش روم سے نکل رہی تھی جب وہ بیڈ روم میں داخل ہوا۔

میں شاور لیکر کھانا کھاؤں گا۔ اس نے جیسے اعلان کیا۔۔

میں نے تمہارے کپڑے اور ٹاولز رکھ دیے ہیں اور یہ میں تمہارے لیے نئے سلپرز لیکر آئی تھی۔۔ وہ سلپرز کا ڈبہ شور یک سے نکالتے ہوئے بولی۔

رہنے دو امامہ میں خود ہی نکال لوں گا۔۔

ریسٹ واپس اتارتے ہوئے اس نے امامہ کو منع کیا۔۔ اسے کبھی بھی کسی دوسرے کا اپنا جوتا اٹھانا پسند نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی۔۔ لیکن اسکے منع کرنے کے باوجود میں سلپرز نکال لائی تھی۔۔

کچھ نہیں ہوتا۔۔ اس نے سلپرز اسکے پاس رکھ دیئے۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
وہ اب بیڈ پر بیٹھا اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا اور وہ بے مقصد اسکے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔۔ سالار نے کچھ حیرانی سے نوٹس کیا تھا۔۔

یہ یلو کپڑے تم نے میرے انتظار میں پہنے ہیں؟ اس نے جرابیں اتارتے ہوئے امامہ کو چھیڑا۔۔ وہ بے وجہ ہنسی۔۔ وہ مسٹرڈ کو یلو کہہ رہا تھا۔۔ لیکن آج اس نے تصحیح نہیں کی۔

نائس سلپرز۔۔ اس نے سلپرز پہنے امامہ سے کہا۔۔

میں رکھ لیتی ہوں۔۔ امامہ نے جوتے اور جرابیں اس سے لینے کی کوشش کی۔

کیوں یار۔۔ پہلے کون رکھتا تھا۔۔ سالار نے کچھ حیرانی سے اسے روکا۔۔ امامہ رک گئی۔۔

امامہ نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر اسکی رسٹ واچ اور سیل فون کو دیکھا۔ ہر خالی جگہ بھرنے لگی تھی۔۔ جب تک وہ نہا کر آیا امامہ کھانا لگا چکی تھی۔۔ سالار نے ڈائننگ ٹیبل پہ نظر ڈالتے ہی بے اختیار کہا۔۔

امامہ کیا کیا پکار کھا ہے یار۔۔۔

جو جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔۔ اس نے سادگی سے کہا۔۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 مجھے۔۔؟ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ٹیبل پر ڈشز دیکھ کر جیسے سوچ میں پڑا۔۔

تم نے اپنا وقت ضائع کیا۔۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ہو رہے دن کی محنت پر بولے جانے والے اس جملے سے سخت ناراض ہوتی۔۔ لیکن اس وقت اسے کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا وہ اتنی ہی سرشار تھی۔۔۔

میں نے اپنا وقت تمہارے لیے استعمال کیا۔۔ اس نے مدھم آواز میں سالار کی تصحیح

کی۔۔۔

لیکن تم تھک گئی ہو گی۔۔۔

نہیں۔۔۔ کیوں تھکوں گی میں۔۔۔ اس نے چاولوں کی ڈش سالار کی طرف بڑھا

دی۔۔۔

سالار نے اسکی پلیٹ میں ہمیشہ کی طرح پہلے چاول ڈالے۔۔۔ اپنی پلیٹ کے کونے میں پڑے ان چاولوں کو دیکھ کر اسکا دل بھر آیا تھا۔۔۔ وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔ ایک مہینے لے بعد وہ اسکے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ کھانا سرو کرتے ہوئے اسکے ہاتھ دیکھ رہی تھی سفید شرٹ کی آستینیں موڑے اسکے ہاتھوں نے ہمیشہ کی طرح اسکو اپنی طرف متوجہ کیا۔

پینٹنگز مکمل ہو گی ہیں تمہاری؟ وہ کھانا شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔۔۔

کون سی پینٹنگز؟ اس نے بے خیالی سے کہا۔۔۔ وہ ٹھٹکا۔۔۔

تم بنا رہی تھی نا کچھ۔۔۔ اس نے اسے یاد دلایا۔۔۔

یہ بھی لو۔۔۔ اس نے جواب دینے کی بجائے ایک اور ڈش اسکی طرف بڑھا دی۔

جو پہلے کیا کرتی تھی۔۔ اس نے نظریں چرا کر ایک اور ڈش اسکی طرف بڑھادی۔۔

لیکن تب تو بہت زیادہ وقت ہوتا ہوگا تمہارے ساتھ۔۔

بلکل۔۔۔ ساری شام۔۔۔ ساری رات۔۔۔

پھر تو عیش ہو گئے ہونگے تمہارے؟ اپنی پلیٹ میں قورمہ نکالتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔۔

امامہ نے جواب دینے کی بجائے اپنی پلیٹ کو دیکھا جس میں چیزوں کا ڈھیر اسی طرح پڑا تھا۔ اس سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔۔۔

تم سعیدہ اماں کو یہاں لے آتی۔۔۔ سالار نے یکدم اس سے کہا۔۔ اسے پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

میں نے کہا تھا ان سے لیکن تمہیں تو پتا ہے انکا وہ اتنے دنوں کے لیے اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ اس مے جو ب دیا۔

دیٹس انڈر سٹینڈ بیبل۔۔ سالار نے کھانا کھاتے ہوئے بے اختیار ایک نوالہ اسکی طرف بڑھایا۔۔ وہ آخری لقمہ ہمیشہ اسے کھلاتا تھا۔۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکی پھر

اس نے لقمہ منی میں لے لیا۔ لیکن اسے چبانہ سکی۔ وہ لقمہ جیسے آخری حد ثابت ہوا۔
وہ بے اختیار رو پڑی۔۔ وہ پانی پیتے پیتے یکدم رک گیا۔۔

کیا ہوا؟ وہ ہکا بکا تھا۔ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی گئی۔
کیا ہوا ہے امامہ۔۔ وہ بری طرح بدحواس ہوا۔۔ کم از کم اس وقت اس طرح کی گفتگو
کے دوران آنسو؟ وہ اسکی وجہ تلاش نہیں کر سکا۔۔

ایک دفعی آنسو بہہ جانے لے بعد سب کچھ آسان ہو گیا تھا۔۔

فارگاڈ ایک۔۔ تم پاگل کر دو گی مجھے۔۔ کیا ہوا؟ سب کچھ ٹھیک رہا میرے بعد؟ کسی
نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟ وہ اب مکمل طور پر حواس باختہ تھا۔۔ ٹشو پیپر سے
آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

تو پھر کیوں رو رہی ہو۔۔ سالار مطمئن نہیں ہوا۔

ایسے ہی بس میں تمہیں بہت مس کرتی رہی اس لیے۔۔ وہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔۔

سالار کو لگا جیسے اس نے سننے میں غلطی کی ہو۔۔۔

کس کو مس کیا؟؟

وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر کچن آگیا تھا۔ وہ فریج سے سویٹ ڈش نکال رہی تھی۔۔ سالار نے اسکے ہاتھ سے دو نگا پکڑ کر کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اسے گلے لگایا۔۔ بڑی نرمی سے یوں جیسے تلانی کر رہا ہو۔۔ معذرت کر رہا ہو۔۔ وہ خفگی سے الگ ہونا چاہتی تھی اسکا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی۔۔ برسات پھر ہونے لگی۔۔ وی اسکی عادتیں خراب کر رہا تھا۔۔

انکے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا۔۔

برسات تھمنے لگی تھی۔۔ وہ ہاتھ سے گال اور آنکھیں خشک کر کے اس سے الگ ہو گئی تھی۔۔

دراصل میں گھر میں اکیلی تھی اس لیے مس کرتی رہی۔۔

انکار۔ اقرار۔۔ اعتراف۔۔ پھر انکار۔۔ یہ مشرقی عورت کی زندگی کا دائرہ تھا وہ بھی اس دائرے میں گھومنے لگی تھی۔۔

ہاں۔۔ اکیلا ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔۔ سالار نے اسکے جھوٹ کو سچ بنانے میں اسکی مدد کی۔ امامہ کا حوصلہ بڑھا۔۔

دانت میں درد تھا تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ اس لیے مجھے رونا آ گیا۔۔ وہ اٹکی پھر اس نے کہا۔۔

یاں مجھے اندازہ ہے دانت کا درد بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہوا تھا مجھے۔۔ میں جانتا ہوں کیا حالت ہوتی ہے۔۔ وہ نظریں ملا بغیر جھوٹ بول رہے تھے۔

آ۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ وہ اٹکی اب تیسرا جھوٹ اسکے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ جو سوال آ رہا تھا اس نے وہی پوچھا۔۔ تم نے مجھے مس نہیں کیا۔۔؟

ہر دن ہر گھنٹہ ہر سیکنڈ۔۔ وہ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور امامہ کی آنکھوں میں جیسے ستارے جھلملانے لگے تھے۔۔

چار ہفتے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔۔ اگر تمہارا خیال ساتھ نہ ہوتا تو میں مر جاتا۔۔

تم جھوٹے ہو۔۔۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں ہنسی تھی۔۔

تم بھی۔۔۔ سالار نے بے ساختہ بتایا۔۔

وہ روتے ہوئے ہنس رہی تھی لیکن چار ماہ میں پہلی دفعہ سالار کے لیے وی برسات قابل اعتراض نہیں تھی۔۔

وہ اس رات بیڈ پر اس سے چند انچ دور کروٹ کے بل لیٹی کہنی تکیے پر ٹکائے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ایک مہینے کے دوران اکھٹی ہو جانے والی ساری باتیں۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ صرف وہ بول رہی تھی۔ سالار بلکل خاموش چت لیٹا اسکا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے سن رہا تھا۔ وہ خاموش سامع پلکیں جھپکائے بغیر صرف اسکے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسکی آنکھوں کے تاثرات اسکے چہرے پر جھلکنے والے رنگ بات کرتے ہوئے اسکی ہنسی کی کھلکھلاہٹ وہ جیسے سینیمائی فرنٹ رو میں بیٹھا ہوا ایک سحر زدہ ناظر تھا۔ کہنی کے بل نیم دراز جب وہ تھک جاتی تو پھر اسکے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہتی۔۔۔ اچھا چلو اب سو جاتے ہیں۔۔۔

یہ جملہ وہ شاید پچیس دفعہ کہہ چکی تھی۔۔۔

اسکے کندھے پہ سر رکھے اسے پھر کچھ یاد آ جاتا تو وہ یکدم سراٹھا کر اسکا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھتی۔ میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ۔۔۔۔۔

سالار نفی میں سر ہلاتا گفتگو پھر دوبارہ وہی سے شروع ہو جاتی۔ خاموش سامع پھر وہی فلم دیکھنے لگتا۔۔۔

یہ کونسی آذان ہو رہی ہے؟ وہ بات کرتے کرتے چونکی۔۔۔

دور کہی سے آذانوں کی آوازیں سنائی دی۔

فجر کی۔ سالار نے پر سکون انداز میں کہا۔۔ وہ بری طرح گڑ بڑائی۔

اومائی گاڈ۔۔ فجر ہو گئی۔۔ اور میں۔۔۔ تمہیں تو سونا چاہیے تھا تم تو تھکے ہوئے

تھے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ تم مجھے بتا دیتے۔۔ وہ اب بری طرح نادام ہو رہی تھی۔۔ مجھ

سے کہنا چاہیے تھا تمہیں۔ کیوں نہیں کہا تم نے۔

کیا کہتا۔۔۔ وہ اب پر سکون تھا۔

یہی کہ تم سونا چاہتے ہو۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

لیکن میں تو سونا نہیں چاہتا تھا۔۔

لیکن مجھے تو وقت کا پتا ہی نہ چلا کم از کم تم کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔۔ وہ واقعی شرمندہ

ہو رہی تھی .

تمہارا خیال ہے مجھے وقت کا احساس تھا؟

تم سو جاؤ اب۔۔۔ اور آئی ایم سوری۔ کتنی فضول باتیں کی میں نے تم بھی کیا سوچ رہے

ہونگے۔۔

میں تو نماز پڑھ کر سوؤں گا اب۔ اور میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آج تم نے مجھ سے اتنی باتیں کیسے کر لی۔۔

تم نے تو غور سے سنی بھی نہیں ہو گی میری باتیں۔۔ وہ شرمندگی سے مسکرائی۔

ایک ایک بات سنی ہے۔۔ چاہو تو دہرا سکتا ہوں۔۔ آج تک تم نے جب جب جو کچھ بھی کہا ہے مجھے یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہیگا۔۔

اسکا لہجہ ہموار تھا لیکن آنکھوں میں کوئی تاثر تھا جس نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو باندھا تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
اسی طرح باتیں کرو گی تو ہر رات جاگ سکتا ہوں تمہارے لیے۔۔ امامہ نے نظریں چرا لی۔۔

اس سے کچھ دور ہٹتے ہوئے اس نے تکیے پہ سر رکھ دیا۔ وہ اب سیدھی لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔۔

سائڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کے یکدم بجتے الارم کو بند کرتے ہوئے سالار نے اسکی طرف کروٹ بدلی۔۔ کہنی کے بل نیم دراز اس نے امامہ سے کہا۔۔

کچھ اور بتانا ہے تم نے؟ امامہ نے اسکا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔۔

نہیں۔۔۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔۔۔

آئی لو یو۔۔۔ جو اباسالار کے جملے نے اسے چند لمحوں کے لیے ساکت کیا۔۔ وہ اس کے

پاس تھا اسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے کچھ اس سے سننے کی خواہش رکھتا ہو۔۔

تھینک یو۔۔۔

وہ بے اختیار ہنسا۔۔ ایک گہرا سانس لیکر۔ ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرتے

ہوئے اس نے جیسے گٹھنے ٹیک دیئے۔۔ وہاں اس کے قریب کوئی اور عورت ہوتی تو اسے

اظہار محبت ہی ملتا۔۔ یہ امامہ ہاشم تھی اسکا اظہار تشکر ہی کافی تھا۔۔۔

*****&*****

یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔۔ وہ دس بجے کے قریب اس کے ساتھ ناشتہ کرنے کے

بعد ٹیبل صاف کر رہی تھی جب وہ بیڈروم سے ایک خوبصورت پیکنگ میں ایک باکس

لیکرا سکے پاس آیا تھا۔

یہ کیا ہے۔۔؟ وہ ٹیبل صاف کرتے کرتے رک گئی۔۔

اور دیکھو یہ بالکل میری انگلی کے سائز کے مطابق ہے وہ جیسے کچھ اور ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔۔۔

تمہاری انگلی کا سائز لیکر بنائی گئی ہے کیونکہ تمہاری ایک رنگ لیکر گیا تھا میں۔۔

اس نے اسکے ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا جس میں رنگ پہنا تھا۔

یہ ویڈنگ گفٹ ہے تمہارے لیئے۔ سالار نے اسکا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کچھ حیران سالار کو دیکھا۔

ویڈنگ گفٹ؟؟ چار مہینے ہو گئے ہیں شادی کو۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہاں۔۔۔۔ میں نے تمہیں ویڈنگ گفٹ نہیں دیا تھا۔۔ پہلے یاد نہیں تھا بعد میں پیسے نہیں تھے اس نے ہنس کر کہا۔۔۔۔۔

اور اب کہاں سے آئے پیسے۔۔۔

آگے کہیں سے۔۔ اس نے ٹالا۔۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔۔

کوئی غلط کام نہیں کیا میں نے۔۔۔ وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔۔

میں نے کب کہا کہ۔۔۔۔۔۔۔

چلو ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلتے ہیں اور سعیدہ اماں سے بھی مل کر آتے
ہیں۔۔۔ میرے بیگ میں کچھ گفٹس ہیں انکے لیے وہ نکال لو۔۔۔ سالار نے اسے بات
مکمل نہیں کرنے دی تھی۔۔

تھینک یو سالار۔۔۔ وہ جاتے جاتے ٹھٹکا۔۔۔

کس لیے۔۔۔؟؟

ہر چیز کے لیے۔۔۔

یہ سب تمہارا ہی ہے۔۔۔ اماں نے نظریں چرائی۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میں نے سوچا تمہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ تم نے مجھے شادی پر کوئی گفٹ نہیں
دیا۔۔۔۔۔ اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے خوشی سے سرشار ہوئی تھی۔۔۔ وہ واحد گلہ تھا
جو وہ سالار کے لیے دل میں رکھے ہوئے تھی .

نہیں بھولا نہیں تھا۔۔

مائی گاڈ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ وہ واک وے پر چلتے چلتے بے اختیار ٹھٹکی تھی۔۔۔

سالار نے اسکی نظروں کا تعاقب کیا۔۔ وہ دونوں ریس کورس میں لگنے والے ایک میلے کو دیکھنے آئے تھے۔ اب بے مقصد میلے کی جگہ سے کچھ دور چہل قدمی میں مصروف تھے جب امامہ واک وے کے داہنی طرف درختوں کے اطراف پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس میں نظر آنے والے عکس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس عکس کو دیکھ کر وہ بھی کچھ دیر کے لیے سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رنگ و نور سے بھری کسی وادی کے کنارے کھڑے اس میں چمکتے ہوئے رنگیں ہیرے جو اہرات کے درخت دیکھ رہے ہو یا الف لیلیٰ کا کوئی منظر دیکھ رہے ہو۔ جیسے جنت میں رات ہو گئی ہو۔۔۔

طویل خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی آواز سنی۔۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا

ایسی ہوتی ہوگی جنت؟؟ سالار نے اسے کہتے سنا۔۔

وہ کچھ کہنے کی بجائے دوبارہ اس پانی کو دیکھنے لگا۔۔

جنت میں ستارے ہونگے؟ وہ پوچھ رہی تھی۔۔

ہاں بہت سارے ہونگے۔۔ اس نے اندازہ لگایا۔۔

اتنے رنگوں کے؟

- کائنات میں موجود ہر رنگ۔۔۔ وہ بے اختیار محفوظ ہو کر ہنسی۔۔۔ اسے جواب پسند آیا

- رات ایسی منور ہوتی ہوگی۔۔۔ عکس پہ نظریں جمائے وہ جیسے بے خود ہو رہے تھے۔۔۔

اس سے زیادہ روشن اس سے زیادہ منور۔۔۔ سالار نے بے اختیار کہا۔۔۔ اس نے اپنی انگلی سے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔۔۔ سالار نے بروقت اسے کھینچا۔۔۔

درختوں پر لائٹس آن ہیں پانی میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ ناراض ہوا تھا۔۔۔

میں اسے چھونا چاہتی تھی۔۔۔

یہ عکس جنت نہیں۔۔۔

جنت میں اور کیا ہوگا۔

تم۔۔۔۔۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا اسے وہ عکس کو دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔

صرف میں؟؟ اور تم نہیں ہوں گے؟؟ پتا نہیں۔ اس نے گردن موڑ کے عجیب

مسکراہٹ کیساتھ اسے دیکھا۔۔۔

تو پھر تم کیسے جانتے ہو کہ میں وہاں ہوں گی۔۔۔ اس نے اسے تنگ کیا۔۔
 جنت کے علاوہ کہی اور رکھا جاسکتا ہے تمکو؟؟ اس نے جواباً سوال کیا۔ وہ ہنس پڑی۔۔
 اتنی آسانی سے مل جاتی ہے جنت؟ اس نے سالار کو بتایا۔۔۔
 مجھے آسانی سے نہیں ملے گی تمہیں آسانی سے مل جائیگی۔۔۔۔ اس کا لہجہ پھر عجیب
 سا تھا۔۔۔

کیوں؟؟ وہ حیران ہوئی۔۔۔
 تم جتنی آسانی سے ہر چیز میں جنت ڈھونڈ لیتی ہو میں آج تک نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس لیے
 کہہ رہا ہوں۔۔۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔۔

دو دن پہلے وہ گھر کے لیے ایک لیمپ خریدنے گئے تھے۔۔ وہ رات کو ناول پڑھتے
 پڑھتے لیمپ شیڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ ای میل چیک کرنے کے بعد اپنا لیمپ ٹاپ بند کرنے لگا
 تھا۔۔ تو اس نے امامہ کو دیکھا۔

کیا دیکھ رہی ہو تم؟ وہ حیران ہوا۔۔

بیوٹی فل۔۔۔ اس نے بے ساختہ لیمپ شیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔

ہاں اچھا ہے۔۔۔ اس نے سر سری انداز میں کہا۔

یہ کونسے پھول ہیں؟؟

پھول؟؟ سالار نے لیمپ شیڈ کو حیرانی سے دیکھا۔ اس نے پہلی بات اس پر لکڑی کر کے

شیڈ پر بنے پیٹرن کو دیکھا۔۔۔ سنہری مائل سیلے پھولوں کا ایک نفیس پیٹرن تھا۔

نہ یہ گلاب ہے نہ ہی ٹیولپ ہے۔۔۔ وہ جیسے پھولوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی

پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔۔۔

ایسے پھول جنت میں ہونگے؟؟ وہ ہنس پڑا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اچھا۔۔۔۔

دیکھو یہ پھول رنگ بدل رہے ہیں۔۔۔ لیکن یہ رنگ نہیں بدل رہے بلکہ یہ کھل

رہے ہیں۔۔۔ سالار جیسے کسی سحر میں آیا تھا وہ پھول واقعی کھل رہے تھے۔۔۔

LOVELY

وہ سرا ہے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے اب سمجھ آیا کہ یہ لیمپ اتنا مہنگا کیوں تھا۔

اور ایک ہفتے پہلے اسکی دراز صاف کرتے ہوئے سالار کی ویسٹ پیپر باکس میں سے وہ

ایک پوسٹ کارڈ اسکے پاس لیکر آئی تھی۔۔۔

ہاں۔۔۔۔۔ اسے پھینک دیا ہے میں نے۔۔۔۔۔ بیکار ہے۔۔۔ اس نے امامہ کے ہاتھ میں وہ پوسٹ کارڈ دیکھ کر کہا۔۔۔ وہ کارڈ کو لیئے اسکے پاس آکر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ سالار دیکھو کتنی خوبصورت جھیل ہے۔۔۔ اور دیکھو کتنا سکون ہے اس جگہ پر۔۔۔

یہ صندل سے بنی ہے۔ اس کشتی کارنگ دیکھو۔۔۔ یہ صندل کارنگ ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے کوئی صبح سویرے اس کشتی میں بیٹھ کر کہی جاتا ہو۔۔۔۔۔

کتنی سکرینیٹی ہے اس سین میں۔۔۔۔۔ ایسے جیسے یہ جنت ہو۔۔۔۔۔ میں نہ بتاتی تو تم تو اسے پھینک رہے تھے۔۔۔ وہ بے اختیار اسکا چہرہ دیکھنے لگا۔۔۔ وہ واقعی اسکی زندگی میں نہ آتی تو وہ جنت کو۔۔۔۔۔

اسکی پکچر بنا لو سیل فون کیساتھ۔۔۔ امامہ کی آواز نے یکدم اسے چونکا دیا۔۔۔ سالار

نے سیل فون نکال کر چند تصویریں کھینچی۔۔۔ اور سیل اسے تھما دیا۔۔۔ اس نے باری

باری اس تصویروں کو دیکھا اور مطمئن ہو گئی۔۔۔

چلیں۔۔۔؟؟ سالار نے اس سے کہا۔۔۔

ہاں۔۔۔۔ دونوں نے آخری نظر عکس پر ڈالی اور چل پڑے۔۔۔

سالار نے چلتے ہوئے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔

خاموش کیوں ہو گئے۔۔۔ کوئی بات کرو۔۔۔ امامہ نے چند قدم چلنے کے بعد کہا۔۔

تم کرو میں سن رہا ہوں۔۔

ہو سکتا ہے تمہیں مجھ سے پہلے جنت مل جائے۔۔ امامہ نے اپنے جملے کا مفہوم سمجھے بنا

اسکو تسلی دی۔۔ وہ ہنس پڑا تھا۔۔۔

چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔۔۔ وہ بڑبڑایا۔۔۔

تم سے پہلے مرنا چاہتا ہوں میں۔۔۔ اسے چلتے ہوئے ٹھوکر لگی۔۔ کوئی چی جیسے اسکے

جسم سے ایک لمحے کے لیے تھراتی ہوئی گزری۔۔۔ وہ جنت ڈھونڈتی پھر رہی تھی اس

سے پہلے سامنے جو شے کھڑی تھی وہ اسے بھول گئی تھی۔۔۔

تم کیوں کہہ رہے ہو اس طرح۔۔۔ وہ رک گئی اور اس نے سالار سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔۔

تم نے ہی تو کہا تھا شاید مجھے تم سے پہلے جنت مل جائے۔۔۔

لیکن میں نے مرنے کا نہیں کہا تھا۔۔۔

کیا اس کے بنا مل سکتی ہے؟؟

وہ بول نہ سکی۔۔ وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر سالار نے اسکی آنکھوں میں نمی اڈتے دیکھی۔۔۔

ٹھیک ہے۔۔ جو مرضی کہو۔۔ اسکی آواز میں خفگی تھی۔۔

سالار نے اسکا ہاتھ پکڑ کر معذرت خواہانہ انداز میں دبایا۔۔۔

میں نے صرف تمہاری بات دہرائی تھی۔۔

اور میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم نے نکالا۔۔

میں سمجھتا ہوں۔۔

وہ دونوں پھر چلنے لگے۔۔۔

کیا تم جنت میں مجھے اپنا پارٹنر منتخب کرو گی۔؟؟

وہ بول نہ سکی۔۔۔ وہ ہنس پڑا۔۔۔

یعنی نہیں۔۔۔۔

میں نے یہ کب کہا۔۔۔ وہ رک گئی۔

لیکن تم نے کچھ بھی کب کہا۔

میں سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

سوچ لیا۔۔۔ پھر اب بتاؤ۔۔۔ وہ ہنسی

تمہیں کیا ہوا ہے۔۔۔

جنت کی بات تم نے شروع کی تھی۔۔ اس نے سالار کا چہرہ دیکھا۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Art | Poetry | Gossip | Interviews
شاید۔۔ وہ خاموش کھڑا سے دیکھتا رہا۔۔

تمہیں یقین نہیں ہے۔

اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔۔

یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔

اگر تم جنت میں پہنچ گئے تو پھر تم کو ہی چننا پڑے گا۔۔ اس نے مذاق کیا۔۔

اور اگر کوئی اور بھی پہنچ گیا تو؟ اسکی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔۔

خریدنے کی آفر کی تھی۔۔ لیکن سکندر نے تب اسے یہ بتایا تھا کہ جائیداد کی تقسیم کے دوران وہ یہ پلاٹ سالار کے نام کر چکا ہے۔۔ البتہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی پلاٹ کو فروخت کرنے کی ضرورت پڑی تو احتشام الدین پہلی ترجیح ہوگا۔۔

میرے وکیل کے ذریعے سارا پیپر ورک ہوا ہے۔۔ آپ کہیں تو آپکو نیوز پیپر میں پلاٹ کی منتقلی کا ایڈ بھی بھجوا دیتا ہوں

۔ آپ کے بیٹے نے پلاٹ ڈیڑھ کروڑ میں بیچا ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ میرے وکیل نے منتقلی کے بعد بتایا مجھے۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سکندر عثمان کا سر گھوم کر رہ گیا۔۔

میں ابھی سالار سے بات کر کے دوبارہ آپ سے بات کرتا ہوں۔۔ سکندر عثمان نے یکدم کہا۔

انہیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ انکو بنا بتائے پلاٹ کیسے بیچ سکتا ہے۔۔

سالار اس دن اسلام آباد میں تھا اور اس وقت اپنے کسی کام سے مارکیٹ جا رہا تھا جب اسے سکندر کی کال ملی۔

سالار تم نے اپنا پلاٹ بیچ دیا ہے؟؟

اسکو ہیلو کہتے ہی سکندر نے دوسری طرف سے کہا۔

چند لمحے سالار کچھ بول نہ سکا۔ پلاٹ کی فروخت کا سکندر کو اتنی جلدی پتہ چل جائے

گا سے اندازہ نہیں تھا۔

تم میرے آفس آؤ۔۔۔ اس نے سرد مہری سے فون بند کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

کب بیچا تھا پلاٹ؟؟

اس کے آفس پہنچ کر کرسی پہ بیٹھتے ہی سکندر نے اس سے پوچھا۔

پچھلے مہینے۔۔ اس نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کی تھی۔۔۔

کیوں؟؟

مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔۔

کس لیے۔۔؟؟

سالار اس بار جواب دیتے ہوئے جھجکا۔۔

کس لیئے رقم کی ضرورت تھی۔۔

مجھے امامہ کو ایک رنگ خرید کر دینی تھی۔۔۔ سکندر کو لگا کہ اس نے سننے میں غلطی
کی ہے۔۔۔

کیا؟؟؟؟؟

امامہ کے لیئے رنگ خریدنی تھی۔۔ اس نے اپنا جواب دہرایا۔۔۔

لاکھ دو لاکھ کی رنگ کے لیئے تم نے پلاٹ بیچ دیا۔۔۔

اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے بنک سے پرسنل لون لیتے یا مجھ سے کہتے۔۔۔

میں لون لیکر اسے گفٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور ایک دو لاکھ کی انگوٹھی نہیں تھی کچھ

زیادہ مہنگی تھی۔۔ آپ اتنے پیسے کبھی نہ دیتے مجھے۔۔ وہ بڑی رسائیت سے کہہ رہا

تھا۔۔۔

کتنی مہنگی ہوتی۔۔ چار یا پانچ لاکھ کی ہوتی۔۔۔ چلو دس لاکھ کی ہوتی میں دے دیتا

تمہیں۔۔۔ سکندر بے حد خفہ تھے۔۔ وہ پلاٹ پونے دو کروڑ کا تھا جسے وہ ڈیڑھ کروڑ

میں بیچ آیا تھا۔۔

دس لاکھ کی بات نہیں تھی۔۔۔ سکندر نے اسے کہتے سنا۔۔۔

پھر؟؟ سکندر کے ماتھے پر بل آئے۔۔۔ سالار نے اپنا گلا صاف کیا۔۔۔

13.7 یہ واحد طریقہ تھا جس وہ اس کی قیمت تین ہندسوں میں کر پایا تھا۔۔۔

کیا؟؟

سکندر کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

13.7۔۔۔ سالار نے ایک بار پھر گلہ صاف کر کے اگلا لفظ کہا۔۔۔ سکندر کو چند لمحے

سانس نہیں آیا۔۔۔۔۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اسے پہلی بار اسکی بات سمجھ میں آئی تھی۔۔۔

13.7 ملین کی رنگ دی ہے تم نے اسے؟؟ اس کا ذہن جیسے بھک اڑ گیا۔۔۔ سالار ٹیبیل

پر پڑے پیپر ویٹ پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔۔۔

سالار ایک کروڑ سینتیس لاکھ کی رنگ دی ہے تم نے اسے۔۔۔

جی۔۔۔۔۔ اس بات سالار نے نظریں اٹھا کر سکندر کو دیکھا۔۔۔

سکندر بے یقینی سے اسکی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ سالار نے نظریں چرائی۔۔۔ وہ اب انکے عقب میں لگی پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔

اسکے چہرے پہ نظریں جمائے سکندر نے ریوا لونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا لی۔۔۔ وہ اگر اسے الو کا پٹھا کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔۔

کہاں سے لی تھی رنگ۔۔؟ بلا آخر انہوں نے لمبی خاموشی کو توڑا۔

Tiffany سے۔

انہیں ایسے ہی کسی نام کی توقع تھی۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ڈیزائن کیا ہوگا؟ اس مالیت کی رنگ نادر ہوتی ہے۔۔۔

جی۔۔۔ jewellery statment۔

اس نے tiffany کی سب سے مہنگی ریخ میں آنے والی جیولری کو لیکشن کا نام لیا۔

تو کوئی اس سے زیادہ مہنگی رنگ نہیں تھی؟ ابھی دوسرا پلاٹ پڑا تھا۔ چار ہیرے اور

لگوا دیتے اس میں۔۔

سکندر نے ٹیبل پر پڑے سگار کیس سے ایک سگار نکالتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے اس

سے کہا۔۔ سالار کے دائیں گال میں ڈمپل پڑا۔۔ اس نے یقیناً اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔۔ سکندر کا خیال اسکی یہ مسکراہٹ شرمندگی کی وجہ سے تھی۔۔ انکے پاؤں تلے سے یقیناً زمین کھسک جاتی اگر اسے یہ پتہ چلتا کہ اس نے پہلے دونوں پلاٹس بیچ کر اسے ایک نیکس دینے کا سوچا تھا۔ لیکن پھر اسے انگوٹھی کا خیال آ گیا جو امامہ مستقل طور پہ پہن سکتی تھی۔۔۔

میں کتابوں میں جب رانجھا فرہادر و میو مجنون وغیرہ کے بارے میں پڑھتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ یہ ساری لفاظی ہے کوئی مرد اتنا الو کا پٹھا نہیں ہو سکتا۔ لیکن تم نے تو یہ ثابت کر دیا مجھ پر کہ یہ ممکن ہے۔۔ کسی بھی زمانے میں کوئی بھی مرد کسی بھی عورت کے لیے عقل سے پیدل ہو سکتا ہے۔۔

سالار نے اس بے عزتی کو سر جھکائے شہد کے گھونٹ کی طرح پیا۔۔ اسکی اتنی بے عزتی کرنا تو سکندر کا حق تھا۔۔

بیوی کے لیے تو صرف ایک شاہجہان نے پیسے لٹائے تھے وہ بھی اسکے مرنے کی بعد۔۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا۔۔ سکندر نے جیسے اسے شرم دلانی۔۔۔

میں نے دراصل امامہ کو ابھی تک شادی کا کوئی گفٹ نہیں دیا تھا۔۔ اسکے لہجے میں بلا کا

اطمینان تھا۔۔۔

سکندر زندگی میں پہلی بار اسکی ڈھٹائی سے متاثر ہوئے تھے۔۔

تو اپنے پیسوں سے اسے گفٹ دیتے۔۔ انہوں نے طنز یہ کہا تھا۔۔

وہ بھی دے دیئے ہیں اسے۔۔ اس نے طنز کا جواب سنجیدگی سے دے کر اسے حیران

کر دیا۔۔

وہ اس بادشاہ کی شکل دیکھ کر رہ گئے جو اپنی بیوی پر اپنی سلطنت لٹانے پر تلا تھا۔

اپنا سگار ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ ٹیبل پر کچھ آگ جھکے اور انہوں نے جیسے ایک

ہمراز کی طرح کہا۔۔ سالار ایسا بھی کیا ہے امامہ میں۔۔ کہ تم عقل سے پیدل ہو گئے

ہو۔۔

یہ طنز نہیں تھا۔۔ وہ واقعی جاننا چاہتا تھا۔۔

سالار نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔۔

بس،، وہ اچھی لگتی ہے مجھے۔

وہ اس وقت سکندر کو تیس سالہ مرد نہیں بلکہ تین سال کا ایک معصوم بچہ لگا۔۔

ایک طویل سانس لیتے ہوئے وہ سیدھے ہو گئے۔۔

اسے پتہ ہے اس رنگ پر اس کا؟؟

نہیں۔۔۔۔

سکندر کچھ حیران ہوئے۔ تو یہاں اپنی محبوبہ کو مرعوب اور متاثر کرنے کا کوئی جذبہ بھی

کارفرما نہیں۔۔

آپ بھی مئی یا کسی اور سے بات نہ کریں۔۔ میں نہیں چاہتا کہ امامہ کو پتا چلے۔

وہ اب ان سے کہہ رہا تھا۔۔

باقی تیرہ لاکھ کا کیا کیا؟؟

وہ اب کچھ اور کارناموں کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

ساتھ لاکھ تو امامہ کو حق مہر دیا وہ ڈیو تھا۔۔۔۔۔ اس نے حق مہر کی اصل رقم بتائے بغیر

کہا۔

اور باقی چھ لاکھ میں نے کچھ خیراتی اداروں میں دے دیئے۔۔

سکندر کا غصہ دھویں کے مرغولوں میں تبدیل ہونے لگا۔ غصے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔۔۔
 سالار نے باپ کے ہونٹوں پہ ایک مشفقانہ لیکن بے حد معنی خیز مسکراہٹ نمودار
 ہوتے دیکھی۔۔۔

اور حق مہر صرف سات لاکھ تو نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ ہے نا سالار؟؟ وہ کتنے ملین دیا گیا؟؟
 اس نے بے حد پچکارتی ہوئی آواز میں کہا اس سے۔

سالار بے اختیار ہنسا۔۔۔ جانے دیں پاپا۔۔۔
 یعنی ملین میں ہے۔۔۔ اسکا اندازہ ٹھیک تھا۔۔۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اب میں جاؤں؟؟ سالار نے جواب دینے کی بجائے ہو چھا۔۔۔ سکندر نے سر ہلا دیا۔۔۔
 وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اسکی طرف آیا۔ اور اس نے جھکتے ہوئے سکندر کو ساتھ
 لگایا۔۔۔ پھر وہ سیدھا ہو گیا۔۔۔

سالار،، جو دوسرا پلاٹ ہے اسکے پیپر مجھے لاہور پہنچ کر بھجوا دینا۔۔۔ سکندر نے کہا۔۔۔
 پاپا، ٹرسٹ می۔۔۔ سالار نے کہا۔۔۔

شٹ اپ۔۔۔۔

او کے۔۔۔ وہ ہنس پڑا تھا۔۔

****_**_*_*_****+_*

Oh tiffany statement

وہ اس رات کسی ڈنر پر تھے جب اسکی رنگ مسز یوٹرن نے نوٹس کی۔

وہ بزنس کلاس کا ایک بڑا نام تھی۔ اور اپنی لباس اور جیولری کی وجہ سے خاصی مشہور تھی۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

مائی ویڈنگ رنگ۔۔۔ امامہ نے مسکرا کر کہا۔۔۔

وہ اسکا ہاتھ پکڑے بے حد مرعوب انداز میں کہہ رہی تھی۔۔ اور انکا یہ انداز اس ٹیبیل

پہ بیٹھی تمام خواتین میں اس رنگ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر رہا تھا۔۔

The most beautiful and expensive picec of
jewellery under this roof tonight...

لکی ویمن۔۔ تمہارے شوہر کا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔۔۔

امامہ ان ستائشی جملوں پہ فخریہ انداز میں مسکرائی۔۔

کیا قیمت ہوگی؟ بائیں جانب بیٹھی مسز یویر نے بھی اس رنگ کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔۔

مجھے نہیں پتا۔۔ شاید چار پانچ لاکھ۔ امامہ نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ بھرتے اندازہ لگایا۔۔

ایک لمحہ کے لیے اس نے ٹیبل پر چھا جانے والی خاموشی کو محسوس کیا۔۔ پھر خوبہ جی نظروں کو۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ڈالرز یا پونڈز؟؟

اس نے حیرانی سے مسز یویر کی شکل دیکھی۔۔ پھر ہنس پڑی۔۔ اس نے اسے مذاق سمجھا تھا۔۔ میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

مسز یویر نے دوبارہ سوال نہیں کیا وہ سمجھی امامہ قیمت نہیں بتانا چاہتی۔۔ سالار اس رنگ کی قیمت کیا ہے؟ اس رات بیڈ پر بیٹھے ناول پڑھتے ہوئے امامہ کو ایک دم مسز یویر کا سوال یاد آ گیا۔۔

کیوں؟؟؟ وہ بھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے چونکا۔

سب لوگوں نے بہت تعریف کی۔۔ اس نے بے حد فخر یہ انداز میں کہا۔

دیس گڈ۔۔۔ وہ مسکرا کر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔۔

مسز یونر نے قیمت پوچھی تھی میں نے کہا چار پانچ لاکھ کی ہوگی۔ انہوں نے پوچھا
ڈالر یا پائونڈز میں۔۔ میں نے کہا میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔۔۔ وہ بے
اختیار ہنس پڑا۔۔۔



NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کیا ہوا؟؟؟

وہ چونکی۔۔

کچھ نہیں۔۔۔ کچھ پڑھ رہا تھا۔۔ سالار نے بے ساختہ کہا۔۔

تو کیا قیمت ہے اسکی؟ امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

یہ انمول ہے۔۔ سالار نے اسکا ہاتھ پکڑ کر کہا۔۔

کوئی بھی چیز جو تمہارے ہاتھ میں ہو انمول ہے۔۔

پھر بھی۔۔۔۔۔ اس نے اصرار کیا۔۔

Two hundred and fifty six

سالار نے ڈالرز ساتھ نہیں لگایا۔۔

اوہ اچھا میں زیادہ ایکسپینسیو سمجھ رہی تھی۔ وہ کچھ مطمئن ہوگی اور دوبارہ ناول پڑھنے

لگی۔ وہ اسکا چہرہ دیکھنے لگا۔۔ اسے فریب دینا بہلانا بہت آسان تھا۔

امامہ نے چند لمحے بعد اسکی نظروں کو اپنے چہرے پہ محسوس کیا۔

کیا ہوا؟؟ وہ مسکرا دی۔۔ وہ ان نظروں کی عادی تھی۔

تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔

کیا؟؟

You are the best thing ever happened to me,

وہ ایک لمحے کے لیے حیران ہوئی پھر ہنس پڑی۔۔

آئی لو یو۔۔ وہ پھر ہنس پڑی اور بلش ہوئی۔۔۔

تھینک یو۔۔۔ جو اب وہی تھا جو ہمیشہ آتا تھا۔ اس بار وہ ہنس پڑا

*****_-----*****_-----*****

امامہ۔۔۔ وہ گاڑی کے دروازے کو بند کرتے ہوئے کرنٹ کھا کر پلٹی۔۔۔

وہ جلال تھا۔۔۔ پارکنگ میں اسکے برابر والی گاڑی سے اسے نکلتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹکا
تھا۔۔۔

اوہ مائی گاڈ۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج تم سے یہاں ملاقات ہوگی۔۔۔

ہاؤ آر یو۔۔۔ وہ بے حد ایکساٹڈ انداز میں اسکی طرف آیا تھا۔

وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ اسکی اڑی رنگت پہ غور کیجیے بنا بے تکلف دوستوں
کی طرح کہہ رہا تھا۔۔۔

امامہ نے بلا آخر مسکرانے کی کوشش کی۔۔۔ یہ ضروری تھا۔۔۔ بے حد ضروری

تھا۔۔۔ جلال سے زیادہ خود اسکے لیئے۔۔۔ اسے نہ وہ پرانا دوست سمجھ سکتی تھی نہ بے
تکلف ہو سکتی تھی۔۔۔

میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں۔۔۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔۔ نظریں تو وہ اس سے اب بھی نہیں ملا سکتی تھی وہ
ویسا ہی تھا جیسے اس نے آخری بار کلینک پر دیکھا تھا۔۔

میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔۔ میں نے چند ماہ پہلے شادی کر لی ہے۔۔

اسکی سمجھ میں نہیں آیا اس نے اسے یہ خبر دینا کیوں ضروری سمجھا۔۔ کیا اسکا اس سے
کوئی تعلق تھا۔۔

بہت اچھی ہے میری بیوی، وہ بھی ڈاکٹر ہے۔۔ برٹش نیشنل ہے۔ اسپیشلائزیشن بھی
اس نے وہی سے کی ہے۔۔ امیزنگ وو مین۔۔ اس نے چار جملوں میں اس پر اپنی
بیوی کی حیثیت واضح کی۔۔

ایک لمحے کے لیے وہ بھول گئی کہ وہ بھی کسی کی بیوی ہے۔۔ اسکے منہ سے کسی دوسری
عورت کے لیے اپنی بیوی کے الفاظ نے اسے چند لمحوں کے لیے ادھیڑا تھا۔۔

مبارک ہو۔۔ اس نے بلا آخر وہ الفاظ کہہ دیے جو اسے کہنا چاہئے تھے۔

تھینکس۔۔ میں تمہیں ضرور بلاتا لیکن تمہارا کنٹیکٹ نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ پہلی
بار تو نہیں بلا سکا تھا لیکن دوسری بار تو بلا سکتا تھا۔۔ جلال نے بات کرتے کرتے جیسے

مذاق کیا تھا۔۔ وہ مسکرا نہ سکی۔۔

تم نے تو اسکے بعد کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔۔ کوئی فون کوئی وزٹ کچھ نہیں۔۔ میں تو انتظار ہی کرتا رہا۔۔ وہ اب اسکا جائزہ لے رہا تھا۔۔

یہ امامہ سات آٹھ ماہ پہلے والی امامہ سے بے حد مختلف تھی۔۔۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح ایک چادر میں ملبوس تھی لیکن اسکی چادر اور لباس بے حد نفیس اور مہنگے تھے۔۔ اسکے ہاتھوں اور کانوں میں پہنی ہوئی جیولری نے جلال کو اور بھی چونکا دیا۔۔ اسکی فنگر میں ایک رنگ تھی لیکن یہ وہ وہم تھا جسکی وہ تصدیق نہیں چاہتا تھا۔۔ امامہ ہاشم بہت بدل چکی تھی۔۔۔ کیسے۔۔۔ اس سوال نے اسے بے چین کیا۔۔۔

اسکے عقب میں کھڑی اس قیمتی گاڑی کو بظاہر سرسری دیکھتے ہوئے جلال نے اس سے پوچھا۔۔

تم اب بھی اسی فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتی ہو؟؟ اس کا جی چاہا تھا کہ کاش اس میں آنے والی ساری تبدیلیاں کسی بونس یا کسی بینڈ سم پیسج کی مرہون منت ہو۔۔ مرد کو اپنی متروکہ عورت کو مووڈون دیکھ کر ہتک کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس احساس سے بچنا

چاہتا تھا۔۔

نہیں میں مے جا ب چھوڑ دی تھی۔۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔۔

اوہ اچھا۔۔ وہ بڑ بڑایا۔۔

تو تم کچھ نہیں کر رہی آجکل؟؟؟

امامہ چند لمحے خاموش رہی۔

میری شادی ہو گئی ہے۔۔ وہ اب بھی یہ نہ کہہ سکی کہ میں نے شادی کر لی ہے۔۔ جلال کے چہرے سے ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔۔

اوہ اچھا۔۔ مبارک ہو۔۔ وہ بروقت سنبھلا۔۔

تم نے بتایا ہی نہیں۔۔ نہ انوائٹ کیا۔۔ کیا کرتا ہے وہ۔۔؟؟

آپ جانتے ہیں اسے۔۔ سالار سکندر۔۔ اس نے گلا صاف کر کے کہا۔۔

اوہ۔۔ ایک لمحے کے لیے جلال کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔

وہ بنکر ہے۔۔ میں جانتا ہوں۔۔ جلال اسکی بات کاٹ کر اسے سالار کابنک اور اسکے

عہدے کے بارے میں بتانے لگا۔

آپ کو کیسے پتا؟ وہ حیران ہوئی۔

آدھے شہر کو تمہارے شوہر کے بارے میں پتا ہوگا۔

آؤ لہجہ کرتے ہیں۔۔ گپ شپ لگائیں گے۔ اتنے عرصہ بعد ملے ہیں بہت ساری باتیں

کرنی ہیں۔ اس نے بے تکلفی اور گرمجوشی سے کہا۔

نہیں میں گروسری کے لیے آئی ہوں۔۔ ڈنر کے لیے مجھے کچھ چیزیں چاہیے

تھی

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے اسے ٹالنا چاہا اسے یقین تھا وہ اصرار نہیں کریگا۔ جلال کے بارے میں اسکا

اندازہ آج بھی غلط تھا۔

یار گروسری بھی ہو جائے گی میں خود کروادوں گا لیکن لہجہ کے بعد۔۔ وہ سامنے

ریسٹورنٹ ہے ایک گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے ہم۔۔ جلال نے اسے بات مکمل

نہیں کرنے دی۔

میں۔۔۔۔۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن جلال کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں

تھا۔۔ وہ بادل نخواستہ اسکے ساتھ ریستورنٹ آگئی۔۔۔

تو کیسی گزر رہی ہے تمہاری لائف اپنے شوہر کیساتھ۔۔۔ مینیو آرڈر کرتے ہوئے جلال نے بے تکلفی سے کہا۔۔۔ اما مہ نے اس کا چہرہ دیکھا وہ صرف سوال نہیں تھا۔۔۔ وہ جیسے جاننا چاہتا تھا کہ وہ اسکے علاوہ کسی اور مرد کیساتھ خوش رہ سکتی ہے یا نہیں۔۔۔

بہت اچھی گزر رہی ہے میں بہت خوش ہوں سالار کیسات گڈ۔۔۔ اریج میرج تو نہیں ہوگی؟؟ سالار اور تم نے اپنی مرضی سے کی ہوگی۔۔۔ اس نے جلال کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔۔۔ وہ اس سوال سے کیا جاننا چاہتا تھا۔۔۔

ہاں سالار نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کی ہے۔۔۔ اس نے فیملی سے پوچھا نہیں تھا بلکہ بتایا تھا۔۔۔ سالار کا خیال تھا کہ مرد کو شادی کرتے ہوئے اپنی مرضی دیکھنی چاہیے فیملی کی نہیں۔۔۔

جلال کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔۔۔

بہت زیادہ انڈیپینڈنٹ سوچ رکھتا ہے وہ۔۔۔ اس نے چند لمحوں بعد جلال کو جیسے تاویل دینے کی کوشش کی۔۔۔ تاویل پچھلے جملے سے بھی زیادہ چھبی تھی۔۔۔

ظاہر ہے۔۔۔ سالانہ لاکھوں کمانے والے شوہر کی تعریف بیوی پر فرض ہوتی ہے۔۔

اس بار اسکا ہنس کر کہا ہوا جملہ امامہ کو چھباتا تھا۔۔۔

لاکھوں کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن اچھے شوہر کی تعریف بیوی پہ فرض ہوتی ہے۔۔

جلال نے اسکے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔۔۔ تو پتار کھا کر ونا اسکے

لاکھوں کا۔۔ کیسی بیوی ہو تم؟؟ ڈیڑھ دو کروڑ تو بنا ہی لیتا ہو گا سال میں۔۔۔ بہت

بڑے بڑے مر جرز کروا رہا ہے تمہارا شوہر تمہیں پتا نہیں؟؟

نہیں۔۔۔ ہم اور چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔۔۔ ضروری چیزوں

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کے بارے میں۔۔۔

اسکا لہجہ بے حد سادہ تھا لیکن جلال کے پیٹ میں گرہیں پڑی تھی۔ اس نے زور دار

قہقہہ لگایا۔ بعض دفعہ ہنسی کی شدید ضرورت پڑ جاتی ہے۔۔

چالاک مردوں کو ایسی ہی بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔۔ تم لوگوں کی رہائش کہاں

ہے۔۔؟؟

اس نے جو تارا۔۔ پھر معصومیت سے سوال کیا۔ امامہ نے اسکے تبصرے پر کچھ کہنے

کی بجائے اسے اپنا ایڈریس بتا دیا۔۔۔ وہ اسکے ساتھ سالار کو مزید ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔

اوہ۔۔۔ اپارٹمنٹ۔۔۔ وہ بھی ریبنڈ۔۔۔ کوئی گھر ورلینا چاہیے تھا تم لوگوں کو۔۔۔ اگر تم لوگ انٹر سٹڈ ہو تو میرے دو تین گھر ہیں پوش ایریا میں۔۔۔ تم لوگ ریبنڈ کر لو۔۔۔ جلال نے فیاضانہ آفر کی۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں ضرورت نہیں۔۔۔ ہم کم فرٹیبیل ہے وہاں۔۔۔ امامہ نے کہا۔۔۔
تم سالار کیساتھ کسی دن آؤنا کھانے پر۔۔۔ بات کرتے کرتے اس نے یوں کہا جیسے وہ صرف دوست ہی تھے اور دوست رہے تھے۔۔۔ وہ بول نہ سکی۔۔۔ اگر وہ بے حس تھا تو بہت زیادہ۔۔۔ اگر ظالم تھا تو انتہا کا۔۔۔

جلال میں اب چلتی ہوں۔۔۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔۔۔

اسے پتا نہیں اچانک کیا ہوا وہ اپنا بیگ اٹھا کر یکدم کھڑی ہو گئی۔ جلال کیساتھ وہ کپیل بھی چونکا۔۔۔ نہیں کھانا آنے والا ہے کھا کر نکلتے ہیں۔۔۔

نہیں مجھے گروسری کر کے پھر کوکنگ بھی کرنی ہے۔ اور میرے شوہر کو تو گھر آتے ہی

کھانا تیار ملنا چاہیے۔۔ آج ویسے بھی اس نے کچھ خاص ڈشز کہی ہیں۔۔۔

اسکا انداز اتنا ختمی تھا کہ جلال اس بار اصرار نہ کر سکا۔۔

اچھا سالار کا کوئی ویزٹنگ کارڈ اور اپنا کانٹیکٹ نمبر تو دے دو۔ اس نے امامہ سے کہا۔ اسکے بیگ میں سالار کے چند کارڈز تھے۔۔ اس نے ایک کارڈ نکال کر جلال کے سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا۔۔۔

اپنا فون نمبر بھی لکھ دو۔

وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچائی پھر اس نے کارڈ کی پشت پر اپنا سیل نمبر لکھ دیا۔۔

جلال کے پاس کھڑا آدمی تب تک کارڈ پر نام پڑھ چکا تھا۔۔۔

اوہ۔۔ آپ سالار سکندر کی بیوی ہیں؟؟ وہ اسکے سوال پہ بری طرح چونکی۔۔

فاروق صاحب بھی بنکر ہے سالار کو جانتے ہونگے۔۔ جلال نے فوراً کہا۔۔

بہت اچھی طرح سے۔۔۔ اس آدمی کا انداز اب بالکل بدل چکا تھا۔۔ اس نے امامہ کو

اپنی بیوی سے متعارف کرایا۔۔

آپ کے شوہر بہت بریلیئنٹ بنکر ہے۔۔

فاروق نے اسکے لیے ستائشی کلمات ادا کیئے۔

ہمیں انوائٹ کیا تھا اس نے کچھ ماہ پہلے ویڈنگ ریسیپشن پہ لیکن ہم امریکہ میں تھے۔ مسز فاروق اب بڑی گرمجوشی سے کہہ رہی تھی۔۔ اور امامہ کی جان پہ بن آئی تھی۔۔ وہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ سالار کے کتنے قریب تھے یا صرف سوشل سرکل کا حصہ تھے۔۔۔

بہت کلوز فرینڈ شپ ہے امامہ اور سالار کیساتھ میری بلکہ فیملی ٹائیز ہیں۔۔۔ بس درمیان میں کچھ عرصہ آؤٹ آف ٹچ رہے ہیں ہم۔۔ دس بارہ سال تو ہو گئے ہونگے ہماری فرینڈ شپ کو امامہ؟؟ اسکی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے کچھ حیرانی سے جلال کو دیکھا۔۔

ویری نائس۔۔۔ آپ سالار کیساتھ آئیں کسی دن ہماری طرف۔۔۔ فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کی بعد وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی لیکن وہ بہت اپ سیٹ تھی۔۔۔ وہ سٹور میں کیا خریدنے آئی تھی بھول گئی تھی۔۔۔ وہ ٹرالی لیے ایک شیلف سے دوسرے شیلف کو دیکھتے گزرتی رہی۔۔ پھر خالی ٹرالی پر نظر پڑنے پر اس نے سوچا کہ وہ کیا خریدنے آئی تھی لیکن ذہن کی سکریں پہ کچھ

بھی نمودار نہیں ہوا۔۔ اس نے بے مقصد چند چیزیں اٹھائی اور باہر آگئی۔۔ پارکنگ سے گاڑی نکالنے کے بعد اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ گھر نہیں جانا چاہتی پھر اسے وہ ساری چیزیں یاد آنے لگی جسے وہ خریدنے آئی تھی۔۔ لیکن اب وہ دوبارہ کہی گروسری کے لیے جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔۔ بے مقصد دوپہر میں سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے اسے خود اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے کچھ غلط ٹرن لی تھی اور اب رستہ بھول گئی ہے۔۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لاشعوری طور پر اس روڈ پر جا رہی تھی۔۔ جس طرف سالار کا آفس تھا۔۔ وہ مال روڈ پر تھی اور ون وے کی وجہ سے اب پلٹ نہیں سکتی تھی۔۔ ایک سگنل پر ایک لمبے چھوڑے ٹریفک جام میں پھنسے اسے وہ سڑک اور اپنی زندگی ایل جتنا لمبے لگے تھے۔۔۔

گاڑی بند ہوگی اور سگنل کھل گیا تھا۔۔ بے تحاشہ ہارن کی آوازوں پر اس نے چونک کر گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کی وہ ناکام رہی اور بری طرح نروس ہوئی۔۔ ایک ٹریفک وارڈن اسکے قریب آیا۔۔

گاڑی سٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔۔ امامہ نے اس سے کہا۔۔

پھر لفٹر سے اسے ہٹانا پڑے گا۔۔ ورنہ ٹریفک جام ہو جائے گا۔۔ اس نے اسے

بتایا۔۔ سگنل تب تک دوبارہ بند ہو چکا تھا۔۔ وہ وائر لیس پر لفٹر کو بلانے لگا۔۔ اور وہ بے حد ہڑبڑانے والے انداز میں گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔۔ وہ ناکام رہی۔۔ لفٹر آنے پر وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ لفٹر میں بیٹھا آدمی اسے قریبی پارکنگ میں اسے پہنچانے کے بارے میں بتاتا ہوا کسی ٹیکسی میں اسے وہاں تک جانے کا کہہ کر غائب ہو گیا۔۔ مال روڈ پر اس ٹریفک میں اسے کوئی ٹیکسی یا رکشہ نہیں مل سکتا تھا۔۔ لیکن واحد کام جو وہ کر سکتی تھی وہ سڑک کر اس کر کے کچھ فاصلے پر سالار کے آفس جانا تھا۔۔ اس نے سیل نکال کر سالار کو فون کرنا شروع کر دیا لیکن اسکا سیل آف تھا۔۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ اسکو اسکے آفس ہی جانا تھا۔۔ چند منٹ اور چلنے کے بعد اسکے جوتے کاسٹریپ نکل گیا۔ آج برا نہیں بلکہ بدترین دن تھا۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے جوتے کیساتھ اسکے آفس نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔۔ اسے اپنی حالت پہ رونا آنے لگا تھا۔۔

اسکے بنک کے اس شاندار عمارت کے سامنے جوتا گھسیٹتے ایک لمحہ لے لیے ہچکچائی لیکن پھر اسکے ذہن میں آیا کہ وہ سیدھی اسکے آفس چلی جائے۔۔ گارڈ کو اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے انکی آنکھوں میں اتنی حیرانی اور بے یقینی دیکھی تھی کہ اسکے عزت نفس

میں کچھ اور کمی بھی آئی تھی۔ لیکن مین ریسپشن میں داخل ہوتے ہی اسکی عزت نفس مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ شاندار انٹیریور والا وسیع و عریض ماربلڈ ہال اس وقت سوٹڈ بوٹڈ کورپوریٹ کلائمنٹس سے بھرا ہوا تھا۔ آفس کا یہ لے آؤٹ کبھی اسکے تصور میں آجاتا تھا تو وہ وہاں کبھی نہ آتی لیکن اب وہ آچکی تھی۔۔۔ ریسپشن کاؤنٹر پر اس نے سالار سکندر سے اپنا رشتہ ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔۔۔

مجھے سالار سکندر سے ملنا ہے۔۔۔

کیا آپ نے اپوائنٹمنٹ لیا ہے میڈم؟؟؟
 ریسپشنسٹ نے بے حد پرو فیشنل انداز میں کہا۔۔ اسکا ذہن ایک لمحہ کے لیے بلینک ہو گیا تھا۔۔۔

اپوائنٹمنٹ۔۔۔۔ وہ حیان ہوئی۔۔ اس نے جواب دینے کی بجائے ہاتھ میں پکڑے سیل پر ایک بار پھر اسکا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار کال ریسیو نہیں ہوئی لیکن بیل بجی تھی۔۔۔ میں اسکی دوست ہوں۔۔ اس نے کال ختم کرتے ہوئے بے ربطی سے کہا۔۔۔

ابھی وہ ایک میٹنگ میں ہے انہیں تھوڑی دیر میں انفارم کر دیتی ہوں۔۔۔ آپ کا نام؟؟؟

ریسپنسنٹ نے کہا۔۔۔

امامہ۔۔۔ وہ اپنا نام بتا کر ہال میں پڑے صوفوں میں سے ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔۔۔
اسے تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔۔۔

پندرہ منٹ بعد اس نے چند افراد کے ساتھ سالار کو بات چیت کرتے ریسیپشن پر نمودار ہوتے دیکھا۔۔۔ ان لوگوں کو دروازے تک چھوڑ کر وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر لمبے لمبے
ڈگ بھرتا ہوا واپس جانے لگا۔۔۔ ریسیپشنسٹ نے اسے روکا۔۔۔ امامہ نے سالار کو اسکی
بات سنتے اور پھر ٹھٹکتے دیکھا۔۔۔ وہ اپنی ایرٹھیوں پر گھوم گیا۔۔۔ اسے اتنی دور سے بھی
سالار کے چہرے پہ حیرت نظر آئی تھی۔۔۔ پھر وہ مسکرایا۔۔۔

اس نے پلٹ کر ریسیپشنسٹ سے یقیناً اسکا تعارف کرایا تھا۔۔۔ پھر وہ ر کے بغیر اسکی
طرف آیا۔۔۔ اگر وہ اس وقت اس سے گھر میں سامنا کر رہی ہوتی تو اس وقت اس سے
لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہوتی۔۔۔

واٹ اے پلیزنٹ سر پرازیز۔۔۔

اس نے قریب آتے ہوئے کہا وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔۔۔

میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔۔ اس نے بے ربطی سے جواب دیا اس نے سالار سے نظریں
ملائے بغیر کہا وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی آنکھیں پڑنا جانتا تھا۔

سامنے سگنل پہ میری گاڑی خراب ہو گئی اور لفٹر اسے کہی لے گیا ہے۔ اور یہاں تمہارا
آفس تھا تو یہی آگی۔۔ لیکن شاید نہیں آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ تم مصروف ہو بس تم مجھے
گھر بھجوادو۔۔ وہ ایک کے بعد ایک مسئلہ بتاتے ہوئے اسے بند بے ڈھنگے انداز میں
کہا۔۔

نو پرا بلیم۔۔ سالار نے اسکے چہرے کو دیکھتے ہوئے اسی تسلی دی۔۔

سوری میم آپ مجھے اپنا تعارف کرا دیتی تو میں آپکو آفس میں بٹھاتی۔۔

ڈیسک پہ بیٹھی لڑکی نے قریب آکر معذرت کی۔۔

اٹس اوکے۔۔۔ کسی کو بھیج کر یہاں قریبی کسی شو سٹور سے اس سائز کے جوتے
منگوائیں۔

اس نے لڑکی سے کہا اور پھر اگلا جملہ امامہ سے کہا۔۔

امامہ یہ ٹوٹا ہوا جوتا اتار دو۔۔

اتار دوں؟؟ وہ ہچکچائی۔

ہاں کوئی حرج نہیں میرے ہاتھ روم میں وضو لے سلپرز ہیں وہ پہن کر پاؤں دھولینا
تب تک نیا جوتا آجائے گا۔۔ اور کس سگنل سے گاڑی لیکر گئے ہے۔۔ امامہ نے اسے
اندازے سے بتایا۔۔ اس نے ڈیسک سے آنے والی لڑکی کو گاڑی کا نمبر دیا اور کچھ
ہدایات دی۔۔ وہ تب تک ٹوٹے ہوئے جوتے اتار چکی تھا۔ اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لیے وہ اسے وہاں سے لے آیا۔ اپنے ہاتھ پر اسکی گرفت محسوس کرتی ہوئے امامہ نے
سوچا اسے اس وقت اس سہارے کی بے حد ضرورت تھی۔۔ وہ راستے میں ملنے والے
افراد سے ریلیکس انداز میں اسکا تعارف کرتے ہوئے اپنے آفس لے آیا۔۔
ویسے تم یہاں آکیسے گئی۔۔ اس نے آفس کا دروازہ بند کرتے ہوئے امامہ سے پوچھا

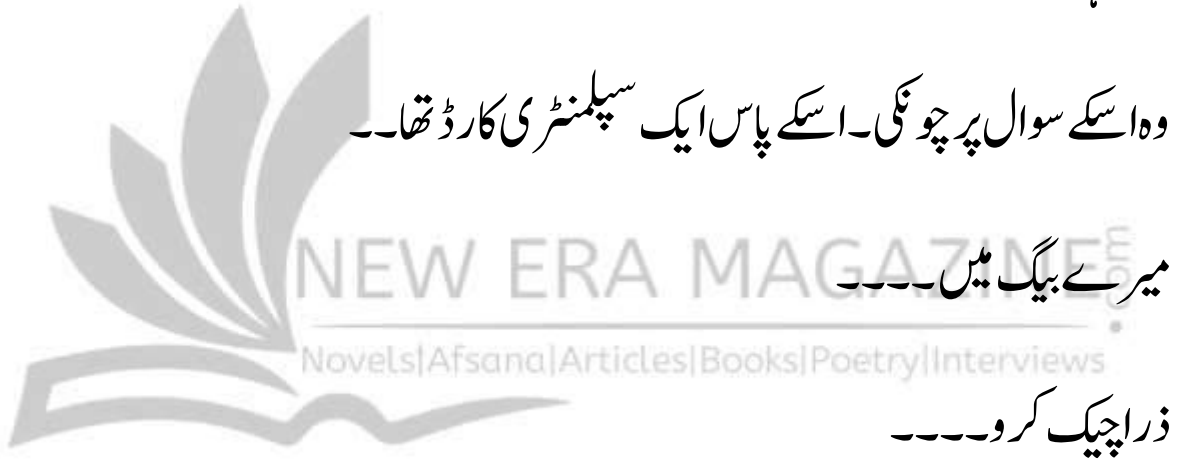
میں؟؟؟؟ اسے بہانہ یاد نہیں آیا۔۔ سالار نے کچھ لمحے اسکے جواب کا انتظار کیا پھر
بات بدل دی۔۔

تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔۔

اپنی ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے اس نے انٹرکام کاریسیور اٹھاتے ہوئے اس سے
کہا۔۔۔۔۔

وہ انٹرکام پر اسکے لیئے کوئی جو س لانے کا کہہ رہا تھا۔ جب اسکا فون بجنے لگا۔ اس نے کال
ریسیو کی۔۔ چند لمحے بات کرتا رہا پھر اس نے امامہ سے کہا۔۔ امامہ تمہارا کریڈٹ کارڈ
کہا ہے؟؟

وہ اسکے سوال پر چونکی۔ اسکے پاس ایک سپلمنٹری کارڈ تھا۔۔



اس نے بیگ سے والٹ نکالا اور پھر باری باری بیگ کا ہر حصہ چیک کیا۔۔ کارڈ وہاں
نہیں تھا۔۔۔

اسکے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔۔

اس میں نہیں ہے۔۔ اس نے اڑی ہوئی رنگت کیساتھ سالار سے کہا۔۔

اس نے جواب دینے کی بجائے فون پر کہا۔۔۔

بلکل میری بیوی چھوڑ آئی تھی وہاں۔۔ میں منگوا لیتا ہوں۔۔ تھینک یو۔۔ اس نے فون بند کر دیا۔۔۔ امامہ کی جان میں جان آئی۔۔

کہاں ہے کارڈ؟؟ امامہ نے پوچھا۔۔

کہاں شاپنگ کی ہے تم نے؟؟ سالار نے اسکی طرف آتے پوچھا۔۔

اسے ڈپارٹمنٹل سٹوریڈ آیا۔۔

وہاں چھوڑ دیا تھا میں نے؟؟؟ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔۔۔

ہاں سٹور کے مینیجر نے ہیلپ لائن کو انفارم کیا وہ تمہارے سیل پر ٹائی کر رہے لیکن تم نے کال ریسیو نہیں کی۔۔ اب انہوں نے مجھے کال کیا ہے۔

ایک آدمی ٹرے میں پانی اور جوس کا ایک گلاس لے آیا تھا۔۔ اسے اس وقت اسکی

شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔۔

سالار دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔۔ اس بار انٹرکام دوبارہ بجا اور وہ اٹھ گیا۔۔ گاڑی

کاپتا چل گیا تھا امامہ گاڑی کے پیپر ز کہاں ہیں؟؟ اس نے ایک بار پھر فون ہولڈ پر رکھتے

ہوئے اس سے پوچھا۔۔

امامہ کو اپنی اگلی حماقت یاد آئی۔۔ گاڑی کے پیپر زگاڑی میں ہی تھے۔ وہ پیپر زاور لائسنس گاڑی میں چھوڑ آئی تھی۔ اس برانڈ نیو گاڑی پر اگر کوئی ہاتھ صاف کرتا تو یہ دونوں چیزیں انعام میں ملتی۔ کیونکہ لفٹرا سے مطلوبہ پارکنگ میں چھوڑ کر وہاں سے جا چکا تھا۔۔ جو س ایکدم اسکے خلق میں اٹکنے لگا۔۔

گاڑی میں۔۔۔ اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔۔ جو اباً سے ملامت نہیں کی گی تھی جسکی وہ توقع کر رہی تھی۔۔

آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہے؟؟ وہ کسی کو گاڑی لانے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔۔ وہ گلاس رکھ کر ایک بار پھر آئی ڈی کارڈ اپنے بیگ میں ڈھونڈنے لگی۔۔ وہاں اسکا کوئی وجود نہیں تھا۔۔ اسے یاد آیا کہ وہ دوسرے بیگ میں ہے۔۔ اسکا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا اسے خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔۔ اس دفعہ سالار نے اسکے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔ میرے پیپر ز میں دیکھو میری وائف کی آئی ڈی کارڈ کاپی یوگی۔ وہ ڈرائور کو دے دو اور کار کی چابیاں بھی بھجوادیتا ہوں۔۔ اس نے فون پر کہا۔۔۔

تمہیں اگر فریش ہونا ہو تو میرے سلپر زیہاں پڑے ہیں۔۔۔

یہ آفر بروقت آئی تھی۔۔۔ اسے واقعی اس وقت کوئی ایسی جگہ چاہیے تھی جہاں وہ اپنا

منہ چھپا لیتی۔ ہاتھ روم کادر وازہ بند کیئے وہ اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتی گی۔

سنا ہے تمہاری کوئی گرل فرینڈ آئی ہوئی ہے۔؟؟

اس نے باہر رمشہ کی آواز سنی۔۔ وہ سالار کو چھیڑ رہی تھی۔۔ وہ جواباً ہنسا۔۔

ہاں آج کی تھکا دینے والی میٹنگ کے بعد کسی گرل فرینڈ کا ایک وزٹ تو ڈیزرو کرتا تھا میں۔۔ وہ آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے انکی باتیں سنتی رہی۔۔ وہ دونوں اب کسی کلائنٹ اور آج کی میٹنگ کو ڈسکس کر رہے تھے۔ اسکا دل چاہا کہ وہ واپس کمرے میں نہ جائے وہ اس سین سے غائب ہونا چاہتی تھی۔۔

ہاتھ روم کادر وازہ کھلنے پر رمشہ خیر مقدمی انداز میں اسکی طرف آئی۔۔

چلو کسی بہانے تمہاری بیگم تو یہاں آئی۔ رمشہ نے اس سے ملتے ہوئے کہا۔۔

سالار جواب دینے کی بجائے صرف مسکرایا۔۔

چند منٹ وہ کھڑی باتیں کرتی رہی پھر اس نے کہا۔۔

اب اگلی میٹنگ ہے۔۔ تو تم آرہے ہو کیا۔۔؟؟

ہاں میں آتا ہوں۔۔ تم سٹارٹ کر لو میٹنگ میں دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔۔ اس

نے کہا۔۔۔

رمشہ امامہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے نکل گی۔

تم چلے جاؤ۔۔ گاڑی آئیگی تو میں چلی جاؤں گی۔۔ اس نے کمرے میں پڑے جوتے کے
ڈبے سے نیا جوتا نکالتے ہوئے سالار سے کہا۔۔

تم سینڈوچ کھاؤ۔ تم نے ہی صبح بنا کر دیئے تھے۔ آج کلائمنٹس کے ساتھ لنچ کی یہ کھانہ
سکا۔۔ وہ ٹیبل پر پڑے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کہہ رہا تھا۔۔

مجھے بھوک نہیں ہے۔۔۔ اس وقت خلق سے کچھ اتارنا بہت مشکل تھا۔۔۔

کیوں بھوک نہیں ہے۔۔۔ لنچ کیا ہے کیا تم نے /؟؟؟

نہیں لیکن بھوک نہیں۔۔۔

پھر کھاؤ صرف ایک کھاؤ۔۔۔ وہ اسے بہلا رہا تھا۔۔

امامہ کیساتھ کوئی مسئلہ تھا اور اس وقت پوچھنا بے کار تھا۔۔۔ وہ جب پریشان ہوتی تھی تو
اسی طرح چیزیں بھولتی تھی۔ وہ سر جھکائے سینڈوچ کھانے لگی جو اس نے اسکے سامنے
پلیٹ میں رکھا تھا۔۔

اسکا خیال تھا کہ سالار اسکی ان حرکات پہ اب تبصرہ کریگا لیکن وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔۔۔ سینڈ وچ ختم ہونے کے بعد اس نے امامہ سے چائے کا پوچھا۔۔۔ اور اسکے انکار پر اس نے انٹرکام پر کسی سے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔۔۔

میں تمہیں اپنی گاڑی میں بھجوا رہا ہوں تمہاری گاڑی جب آئیگی تو میں بھجوادیتا ہوں۔۔۔ میں خود ڈرائیو کر کے چلی جاتی ہوں۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔

تمہیں ڈرائیور ڈراپ کر دے گا تم اپ سیٹ ہو اور میں نہیں چاہتا تم ڈرائیو کرو۔۔۔ وہ بول نہ سکی۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میں خود چلی جاتی ہوں۔۔۔ اس نے بنک ایگزٹ پر سالار سے کہا۔۔۔

یار کلائنٹس کو بھی یہاں تک چھوڑنے آتا ہوں تم تو بیوی ہو میری۔۔۔ وہ مسکرایا تھا۔۔۔

ڈرائیور پارکنگ میں کھڑی گاڑی دروازے کے سامنے لایا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولنے آیا۔ مگر اس سے پہلے سالار اسکے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول چکا تھا۔۔۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے اسے رک کر دیکھنے لگی۔۔۔ وہ اسکا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن اسکے خلق میں ایک بار پھر گرہیں پڑنے لگی تھیں۔۔۔

Anything else ma'am

سالار نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

تھینک یو۔۔ اس نے بلاخر کہا۔۔

Always at your disposal ma'am

اس نے اپنا بازو اس کے گرد پھیلاتے ہوئے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔۔ سالار نے دروازہ بند کر دیا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں امامہ نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا وہ ابھی وہی کھڑا تھا۔۔ وہ یقیناً گاڑی کے مین روڈ پہ جانے کا انتظار کر رہا تھا اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔۔

جسکی ذمہ داری تھی وہ شخص کے لیے کھڑا تھا۔۔ وہ جلال کی ذمہ داری نہیں تھی۔۔ وی پھر کیوں یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اسکے لیے اتنی کرٹسی دکھاتا۔۔ اس نے ٹھیک کیا تھا اسکے ساتھ ڈرائیور بھیج کر وہ واقعی اس وقت ڈرائیور کرنے کے قابل نہیں تھی۔۔ گھر آ کر بھی وہ بے مقصد لاؤنج میں بیٹھی رہی۔۔ آج کا دن بے حد برا

تھا۔ تکلیف دہ یادوں کا سلسلہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔ سالار نے اس رات کھانے کی ٹیبل پہ اس سے پوچھا۔

کچھ نہیں۔۔۔ جواب حسب توقع تھا۔

سالار نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

کوئی پریشانی نہیں۔۔۔ بس اپنی فیملی کو مس کر رہی ہوں۔۔۔ اس نے جھوٹ بولا۔

سالار نے اسے کرید نہیں۔ وہ اسے صرف بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ڈنر کے

بعد کام کے لیے سٹڈی روم میں چلا گیا امامہ نے سونے کی کوشش کی لیکن سونہ

سکی۔۔۔ کتنا وقت اس نے اندھیرے میں بستر پر چت لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے

گزارا اسکو پتہ ہی نہ چلا۔۔۔ سوچوں کا تسلسل تب ٹوٹا جب اسے دروازہ کھلنے کی آواز

آئی۔۔۔۔ سالار سونے کے لیے حتی الامکان آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔ پھر وہ

دروازہ بند کر لے لائٹ آن کیسے بغیر اسی طرح احتیاط سے دبے پاؤں واش روم کی

طرف گیا۔

امامہ نے آنکھیں بند کر لی۔۔۔ نیند اب بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کپڑے

تبدیل کر کے سونے کے لیے آکر لیٹا تھا۔ اس نے امامہ کی طرف کروٹ لی۔ اور
پھر امامہ نے اسکی آواز سنی۔۔

تم جاگ رہی ہو؟۔۔۔۔

تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے۔۔ وہ کچھ جھلائی۔۔

پتا نہیں کیسے؟ بس پتا چل ہی جاتا ہے۔۔ کیا پریشانی ہے؟؟ ایک لمحہ کے لیے اسکا دل چاہا
کہ وہ اسے بتادے اپنی اور جلال کی ملاقات کے بارے میں لیکن دوسرے ہی لمحے اس
نے اس خیال کو جھٹک دیا۔۔
کچھ نہیں بس میں ڈپریسڈ تھی۔

اسی لیے تو کہا تھا باہر چلتے ہیں۔۔ سالار نے کہا۔۔

میں ٹھیک ہوں اب۔۔ امامہ نے ایک دم کسی ننھے بچے کی طرح اس کے سینے میں منہ
چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ اسکے سر کو چومتے ہوئے زاسے تھسکنے لگا۔۔ امامہ کا دل بھر
آیا۔۔

اگر اسکی زندگی میں جلال انصر نام کا کوئی باب نہ آیا ہوتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا۔۔ وہ اس

شخص کیساتھ بہت خوش رہ سکتی تھی۔۔

*****_----+*****_----*****

جلال کیساتھ اسکی ہونے والی ملاقات اتفاقی تھی ایک ایسا اتفاق جسے وہ دوبارہ نہیں چاہتی تھی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ یہ اتفاقی ملاقات اسکے لیئے کتنے خطرناک اثرات لیکر آنے والی تھی۔۔ مہینوں یا سالوں میں نہیں بلکہ دنوں میں۔۔

دو دنوں بعد وہ ایک ڈنر میں مدعو تھے۔۔ وہ اس وقت سالار کیساتھ کھڑی چند لوگوں سے مل رہی تھی۔۔ جب اس نے ہیلو کی ایک شناسائی آواز سنی۔ امامہ نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر وہ ہل نہ سکی۔۔ وہ فاروق تھا جو بے حد گرمجوشی کیساتھ سالار سے مل رہا تھا۔۔

میری بیوی۔۔۔۔۔ سالار اب اسکا تعارف کروا رہا تھا۔ تعارف کی ضرورت نہیں ہے میں پہلے ہی ان سے مل چکا ہوں۔۔ سالار نے کچھ حیران سا ہو کر فاروق کو دیکھا۔۔

آپ مل چکے ہیں امامہ سے؟؟؟

بلکل ابھی پرسوں ہی تو ملے ہیں۔۔ ڈاکٹر جلال انصر کیساتھ لہجہ کر رہی تھی۔۔ دراصل جلال ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔۔ انہوں نے بتایا کہ یہ انکی پرانی کلاس فیلو ہے اور جب انہوں نے اسکو آپکا ویزٹنگ کارڈ دیا تب مجھے پتہ چلا کہ یہ آپکی وائف ہیں۔۔۔

فاروق بڑے خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا۔۔۔

میں نے اور میری مسز نے تو کھانے پہ بھی انوائٹ کیا تھا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ آپ آجکل مصروف ہیں۔۔

فاروق نے نہ امامہ کی فٹ ہوتی رنگت کو دیکھنا سالار کے بے تاثر چہرے کو۔۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا سالار کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسکے کان جیسے سن ہو رہے تھے۔۔ وہ جلال انصر سے مل رہی ہے؟؟ لیکن کب سے۔۔۔

فاروق کی بات سنتے ہوئے امامہ نے اسے خشک ہوتے گلے کیساتھ دیکھا۔۔ اس نے اسکے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر غلط اندازہ لگایا تھا۔۔

میں اسے سب کچھ بتا دوں گی وہ میری بات سمجھ لے گا اسکے بے تاثر چہرے نے امامہ کو عجب خوش فہمی میں مبتلا کر دیا۔

آپ ظہیر صاحب سے ملے ہیں؟؟ اس نے ایک دم سالار کو فاروق کی بات کاٹتے
دیکھا۔۔۔

آئے ہوئے ہیں کیا؟؟

ہاں ابھی ہم لوگ آپ ہی کی بات کر رہے تھے۔۔ آئیے میں آپ کو ملواتا ہوں۔۔ سالار
فاروق کو لیئے ایک طرف چلا گیا۔۔

وہ دوبارہ پلٹ کر اسکی طرف نہیں آیا۔۔ ایسا پہلی سار ہوا تھا کہ وہ کسی پارٹی میں اسکے
پاس نہیں آیا تھا۔۔ وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ لیکن اسے ابھی بھی یقین تھا کہ سالار اس
چیز کو بڑا ایشو نہیں بنائے گا۔۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی اسکی خاموشی ویسے ہی تھی۔۔ گاڑی کے مین روڈ پر آنے
کے چند منٹوں بعد امامہ نے اسکی طویل خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔۔

تم مجھ سے ناراض ہو۔۔۔؟؟

Will you please shut up

وہ فریز ہو گئی تھی۔۔۔

میں اس وقت گاڑی ڈرائیو کرنا چاہتا ہوں۔۔ تمہاری بکو اس سننا نہیں چاہتا۔۔ وہ اس پر چلایا نہیں تھا لیکن جو کچھ اسکی نظروں میں اور اسکے ٹھنڈے لہجے میں تھا۔۔ وہ امامہ کو مارنے کے لیے کافی تھا۔ وہ اسے دوبارہ مخاطب کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔۔ اتنے مہینوں میں اس نے اسے اندھا دھند گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھا۔۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کی بعد وہ اپنی جیکٹ لاؤنچ میں صوفے صوفے پر پھینکتے ہوئے سیدھا کچن میں گیا۔۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کچن میں جائے یا اسکے بیڈروم میں آنے کا انتظار کرے۔۔ اپنی چادر اتارتے ہوئے وہ کچھ دیر اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی اس کا ذہن اب ماؤف ہونے لگا تھا۔۔ وہ اتنے عرصہ کے بعد ایک دوست اور ایک عشق کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن آج پہلی بار ایک شوہر کا سامنا کر رہی تھی۔

کوریدور میں کھڑے کھڑے اس نے سینڈلز اتارے۔۔ تب ہی اس نے سالار کو کچن ایریا سے پانی کا گلاس لے جاتے اور پھر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔۔ اب اسکی پشت امامہ کی طرف تھی۔۔ پانی کا گلاس حالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اب اپنی ٹائی اتار رہا تھا

وہ اب اپنے گلے سے ٹائی اتار رہا تھا۔۔۔ وہ بچند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ آئی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھی ہی تھی کہ وہ کرسی دھکیلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

سالار میری بات سنو۔۔۔

ابھی کچھ اور رہ گیا ہے جو تم نے مجھے بتانا ہے؟؟ اس نے سالار کی آنکھوں میں پہلے کبھی تحقیر نہیں دیکھی تھی لیکن آج دیکھ رہی تھی۔۔۔

مجھے وضاحت کا موقع تو دو۔۔۔

وضاحت؟؟ کس چیز کی وضاحت؟؟ تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ تم نے اپنے ایکس بوائے فرینڈ کے لیے اپنے شوہر کو دھوکہ دینا کیوں ضروری سمجھا۔۔۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔۔

یا تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ تمہاری ایکس بوائے فرینڈ کی وہ کونسی خوبی ہے جو تمہیں اپنے شوہر میں نظر نہیں آئی۔ وہ اپنے لہجے سے اسے کاٹ رہا تھا۔ اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کب سے اس سے مل رہی ہو۔۔۔

میں اتفاقاً اس سے ملی وہ بھی صرف ایک بار۔۔۔۔۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کچھ

کہنا چاہا۔۔ سالار نے پوری قوت سے ڈاننگ ٹیبل پر ہاتھ مارا۔۔

Stop befooling me women...

وہ پوری قوت سے چلایا۔۔ امامہ کی ہاتھ کانپنے لگے۔۔

تم سمجھتی ہو میں اب تم پہ اعتبار کر لوں گا۔۔ تم نے میری نظروں میں اپنی عزت ختم کر دی آج۔۔

You are nothing but a bloody cheater.

وہ کہتے ہوئے وہاں رکائس تھا۔ بیڈ روم میں جانے کی بعد وہ سٹڈی روم میں چلا گیا۔۔

اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر جیسے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ دور کرنے کوشش کی۔۔ اسکے الفاظ بار بار اسکے کانوں میں گونج رہے تھے۔۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی سالار نے بنالی تھی لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی جتنا امامہ سمجھی تھی۔۔ وہ اسکے اور جلال کے ماضی کے تعلق سے اگر واقف نہ ہوتا تو کبھی بھی کسی کلاس فیلو کیساتھ کھانے کھانے پر اتنا ہنگامہ کھڑا نہ کرتا۔۔

وہ اٹھ کر بیڈ روم آگئی۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔۔ وہ ساری رات جاگتی

رہی سالار بیڈ روم نہیں آیا۔ اسے یقین تھا کہ صبح تک اس کا غصہ ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گا۔ اور وہ اس سے دوبارہ بات کرنا چاہتی تھی۔۔

وہ فجر کے وقت کمرے میں آیا تھا اس پر ایک نظر ڈالے بغیر وہ کہتے تبدیل کر کے نماز کے لیے چلا گیا۔ اسکی واپسی معمول کے مطابق جم اور جاگنگ کے بعد آفس جانے سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔۔ اس نے امامہ کو تب بھی مخاطب نہیں کیا۔ امامہ کے نکالے ہوئے کپڑوں کی بجائے وہ اپنے نکالے ہوئے کپڑے لیکر واش روم گیا۔

وہ کچھ دلبرداشتہ ہو کر کچن میں ناشتہ بنانے لگی۔ سالار تیار ہو کر لاؤنج آیا لیکن ناشتے کی ٹیبل پر جانے کی بجائے سٹڈی روم چلا گیا۔ اسے پتا تھا۔ وہ اپنا لیپ ٹاپ لینے گیا ہوگا وہاں لیکن ایسا وہ ناشتہ کرنے کے بعد کرتا تھا آج پہلے لینے کا مطلب تھا کہ۔۔۔

سالار ناشتہ لگا دیا ہے میں نے۔۔ امامہ نے اس سے کہا۔۔

اس کے لیے تم جلال کو بلا لو۔۔ اس نے بات نہیں کہی تھی اسے کوڑا مارا تھا۔۔ وہ سفید پڑ گئی۔ وہ ایک لمحہ ر کے بنا پارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ کتنی دیر وہاں کھڑی رہی اسکے لفظ کسی خاردار تار کی طرح اسے اپنی گرفت میں لیے

ہوئے تھے۔۔۔

وہ سارا دن کچھ کھانہ سکی۔۔ اس نے دو بار سالار کو کال کی لیکن اس نے ریسیو نہیں کی۔۔ اس نے ٹیکسٹ میسج کے ذریعے اس سے معافی مانگی۔۔ اس نے ٹیکسٹ کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔۔ وہ روزانہ سات یا آٹھ بجے کے قریب گھراتا تھا اگر اسے کبھی دیر سے آنا ہوتا تو اسے مطلع کر دیتا تھا۔۔ لیکن اس دن وہ رات کو تقریباً دس بجے آیا تھا۔۔۔

آج بہت دیر ہو گئی؟ امامہ نے دروازہ کھولنے پر پوچھا۔۔ سالار نے جواب نہیں دیا۔۔ وہ کھڑی صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔

لاؤنج میں ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے وہ بیڈروم میں چلا گیا۔۔ یہ جیسے اشارہ تھا کہ وہ دوبارہ ٹی وی دیکھنے کے لیے وہاں آئے گا۔ امامہ کو یقین تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا لیکن پھر بھی بو جھل دل سے وہ کھانا لگانے لگی۔۔

وہ دس پندرہ منٹ بعد کپڑے تبدیل کر کے لائونج میں آ گیا تھا۔۔ فریج سے انرجی ڈرنک نکال کر وہ صوفے پر بیٹھ کر چینل سرفنگ کرنے لگا۔

کھانا تیار ہے۔۔ امامہ نے اسے انفارم کیا۔۔ وہ ٹی وی دیکھتا رہا۔۔

تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔۔ وہ آگے بڑھی۔۔ اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔۔

یہ میرا گھر ہے، یہاں موجود ہر چیز میری ہے، اور کھانا کھانا نہ کھانا میرا مسئلہ ہے تمہارا

نہیں۔۔ اسکی آنکھوں میں بے رخی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔۔

میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔۔

Stop this bullshit

NEW ERA MAGAZINE.COM
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔۔

میں تمہارے ہاتھوں بے وقوف ضرور بن گیا ہوں لیکن بے وقوف ہوں نہیں۔۔

سالار تم جو سمجھ رہے ہو ایسا بالکل نہیں۔۔ وہ اسکے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔۔

بالکل تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں جو تمہیں سمجھا تھا وہ غلط تھا۔۔

امامہ کے خلق میں پھر گرہیں پڑنے لگی۔۔

تم میری بات کیوں نہیں سن لیتے۔۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔۔

امامہ۔۔۔ آج میرے سامنے رونامت، تم مجھے استعمال کر رہی ہو ایکسپلائٹ کر رہی ہو،،، کرو۔۔ لیکن ایموشنلی بلیک میل مت کرو

۔ وہ اسکے آنسو دیکھ کر بری طرح مشتعل ہوا تھا۔۔

ٹھیک ہے تم بات سننا نہیں چاہتے۔۔ مت سنو۔۔ لیکن معاف کر دو مجھے۔۔ میری غلطی ہے مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔۔

اس طرح ملنے کی بجائے تمہیں اس سے شادی کر لینی چاہیے۔ اس نے اسکی بات کاٹ کر کہا۔۔

سالار وہ شادی شدہ ہے۔۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ اس کے آنسو بہنے لگے تھے اور اسکے بات ادھورا چھوڑنے پر وہ سلگا تھا۔۔

بہت دکھ ہے تمہیں اسکے شادی شدہ ہونے کا؟؟ تو کہو اس سے تم سے دوسری شادی کر لے یا بیوی کو طلاق دے لیکن اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے تم تو ویسے ہی اسے دستیاب ہو۔۔

وہ سانس نہ لے سکی۔۔ کم از کم اسے اسکی زبان سے پی سننے کی توقع نہیں تھی۔۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟؟ اس نے بے یقینی سے کہا۔۔

تم جو مطلب نکالنا چاہتی ہو نکال لو۔۔ اس نے کہا۔۔

میرے کیریئر پر بات کر رہے ہو تم؟؟ اسکا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔۔

کیریئر ہے تمہارا؟؟ اس نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔۔

کیریئر تھا تو شادی کی تھی تم نے۔۔۔ اسے اپنی بھرائی ہوئی آواز اے خود ہی جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔۔

شادی نہیں غلطی کی تھی۔ and i regret it وہ اسکا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ خاموشی

کا ایک لمبا وقفہ آیا تھا۔۔ پھر اس نے اپنے خلق میں پھنسا آنسوؤں کا گولہ نگلتے ہوئے

کہا۔۔

میری فیملی ہوتی نا تو میں تم سے اس طرح کی ایک بات بھی نہ سنتی۔ لیکن اب اور کچھ

مت کہنا ورنہ میں تمہارا گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔۔

سالار نے جواب میں ٹیبل پر پڑا اپنا سیل اٹھایا۔۔ اس نے فرقان کو کال کی۔

تمہارا ڈرائیور سو تو نہیں گیا۔۔

نہیں۔۔۔ دوسری طرف سے فرقان نے کہا۔۔

تمہیں ضرورت ہے؟؟

ہاں۔۔۔۔

اچھا میں اسے بتاتا ہوں۔۔ سالار نے سیل فون بند کر دیا۔۔

ڈرائیور تمہیں چھوڑ آتا ہے تم پیکنگ کر کے جاسکتی ہو۔۔ لیکن مجھے کبھی گھر چھوڑنے کی دھمکی مت دینا۔۔ جو کچھ تم میرے گھر میں رہ کے کر رہی ہو بہتر ہے یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔ وہ اٹھ کر بیڈ روم چلا گیا۔۔

وہ بت کی طرح وہی بیٹھی رہی۔۔ اس نے اسے دھکے دیکر نہیں نکالا تھا لیکن وہ یہی سمجھی۔۔۔ چند لمحے بعد وہ اٹھ کر اپارٹمنٹ سے باہر آئی۔۔

لفٹ میں اس نے اپنے دوپٹے سے بھیگی آنکھوں اور چہرے کو رگڑ کر خشک کیا۔۔ وہ ڈرائیور کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی۔۔

مجھے سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دو۔۔ اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کہا۔۔

سعیدہ اماں نے نیند سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور امامہ کو دیکھ کر بری طرح پریشان ہوئی۔۔ مگر اس سے زیادہ پریشان وہ اسے اندر آ کر بلک بلک کر روتے دیکھ کر ہوئی تھی۔۔

سالار نے گھر سے نکال دیا؟ وہ سن کر حواس باختہ ہو گئی تھی۔۔ وجہ کیا تھی۔۔ وہ سعیدہ اماں کو تو کیا کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔۔

بھائی جان کو فون ملا کر دو۔۔ میں ان سے بات کرتی ہوں۔۔ ایسے کیسے گھر سے نکال سکتا ہے وہ۔۔ سعیدہ اماں کو غصہ آنے لگا۔۔

امامہ نے اسکے اصرار کے باوجود آدھی رات کو ڈاکٹر سبٹ علی کو فون نہیں کیا۔۔ یہ مصیبت اسکی تھی وہ اسکے لیئے لوگوں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔

وہ خود پچھلی رات نہیں سوئی اور اب اس طرح روتے روتے اسکا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔۔ فجر کی نماز کے بعد وہ سونے کے لیئے لیٹ گئی۔ نیند مشکل سے آئی لیکن آگئی تھی۔۔

دوبارہ اسکی آنکھ دوپہر کو کھلی اور آنکھ کھلنے پر اسے یہ سب ایک بھیانک خواب کی طرح

لگا تھا۔۔۔

سالار نے کوئی فون تو نہیں کیا؟؟ اس نے سعیدہ اماں کے کمرے میں آنے پر پوچھا۔۔

نہیں۔۔۔ تم نہالو میں کھانا لگانے لگی ہوں۔۔ پھر بھائی صاحب کی طرف چلتے

ہیں۔۔ سعیدہ اماں کہہ کر نکل گئی۔۔ پتا نہیں اسے کیوں امید تھی کہ وہ پچھتا رہا ہوگا

شاید اسکے چلے جانے کے بعد اسے احساس ہو گیا ہوگا کہ اس نے زیادتی کی ہے۔ بارہ

گھنٹے غصہ ختم ہونے کے لیے کافی تھے اگر یہ سب کچھ اس نے غصے میں کیا تھا

تو۔۔۔۔۔

اس نے بوجھل دل کیساتھ شاور لیا اور سعیدہ اماں کے گھر پڑے ہوئے اپنے کپڑوں

میں سے ایک جوڑا نکال کر پہن لیا۔۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی لیکن دو لقمے لیتے

ہی اسکی بھوک مر گئی۔۔

سعیدہ اماں نے زبردستی اسے کھانا کھلایا۔۔ وہ کھانے کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کی

طرف جانا چاہتی تھی لیکن اماں ڈاکٹر صاحب کو انکے آفس فون پر اس طرح کی گفتگو

سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن سعیدہ اماں اس پر تیار نہیں تھی وہ اسے زبردستی ڈاکٹر صاحب کے گھر لے آئی۔۔ کلثوم آنٹی سب کچھ سن کر سعیدہ اماں کی طرح حواس باختہ ہوئی۔۔ ڈاکٹر صاحب ابھی آفس سے نہیں آئے تھے۔۔

لیکن بیٹا جھگڑا کس بات پر ہوا۔۔؟؟؟ امامہ کے پاس اس ایک سوال کا جواب نہیں تھا۔۔

سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی کے ہر بار پوچھنے پر اسے احساس ہوتا کہ اس سوال کا جواب اسکی نیت صاف ہونے کے باوجود اسکو مجرم بنا رہا تھا۔۔ اگر وہ انکو یہ بتاتی کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ کھانے پر گئی تھی تو وہ کبھی کسی اچھے رد عمل کا اظہار نہیں کرتے۔۔ وہ یہ سب ڈاکٹر صاحب کو بھی نہیں بتا سکتی تھی جو گھر آتے ہی اسے اس طرح دیکھ کر پریشان ہوئے تھے۔

اسے میرے کیریئر پر شک ہے۔۔ اس نے انکے بار بار پوچھنے پر سر جھکائے ہوئے کہا۔۔ ڈاکٹر سبط علی کو جیسے شاک لگا تھا۔۔ سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی بھی بول نہ سکی۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکے بعد کوئی سوال نہیں کیا اس سے۔۔۔

وہ رات کو آئے گا تو میں اس سے بات کروں گا۔۔ پریشانی کی بات نہیں۔۔ ٹھیک

ہو جائے گا سب۔۔۔ اس نے امامہ کو تسلی دی۔۔

میں اسکے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔۔ میں جا ب کر لوں گی لیکن اب اسکے گھر نہیں جاؤں گی۔۔ ڈاکٹر سبط علی نے اسکی کسی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔۔ وہ اب بھی شاک میں تھے۔ سالار سکندر کے بارے میں جو تاثر وہ آج تک بنائے بیٹھے تھے وہ بری طرح مسخ ہوا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہو سکتا ہے ورنہ سالار اس لڑکی کو آدھی رات اس طرح کا الزام لگا کر نہیں نکال سکتا جس کو وہ اپنی بیٹی کہتے تھے۔۔

فرقان اس رات اکیلا آیا تھا۔۔ سالار اسکے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لیکچر کے بعد اسے روک لیا اور سالار لے بارے میں پوچھا۔۔

وہ کچھ مصروف تھا اس لیے وہ نہیں آسکا۔۔ فرقان نے اطمینان سے کہا۔۔

آپ کو اس نے بتایا ہے کہ اس نے امامہ کو گھر سے نکال دیا ہے؟؟ فرقان چند لمحے بول نہ سکا۔۔

امامہ کو؟؟؟ اس نے بے یقینی سے کہا۔۔

نہیں۔۔۔ امامہ آپکے ساتھ نہیں جائیگی۔ اس نے نکالا ہے خود ہی آکر معذرت کر کے لے جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو ٹوک انداز میں کہا۔۔

آپ اسے جا کر میرا پیغام دے۔۔ فرقان نے ڈاکٹر سبط علی کو کبھی اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا۔۔۔۔۔

*****-----*****-----*****-----

سالار نے بیل کی آواز کو چند بار نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ فرقان جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اسکا یہ ارادہ کیوں تھا وہ جانتا تھا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آ گیا۔۔۔

تم نے امامہ کو گھر سے نکال دیا ہے؟؟ فرقان نے اندر آتے ہی اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔۔

میں نے نہیں نکالا وہ خود گھر چھوڑ کر گئی ہے۔۔ سالار نے پیچھے دیکھے بغیر سٹی روم میں جاتے ہوئے کہا۔۔

مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ تم نے خود مجھے ڈرائیور کو بھیجنے کا کہا تھا۔۔

فرقان اسکے پیچھے سٹڈی روم میں آگیا۔۔۔

ہاں۔۔ کہا تھا کیونکہ اس نے مجھے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی۔۔ تو میں نے کہا ٹھیک ہے تمہیں کل جانا ہے تم آج چلی جاؤ۔۔ لیکن میں نے اسے نکالا نہیں۔۔۔

اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے تاثر چہرے سے کہا۔۔ فرقان نے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے کو دیکھا اور پھر اس سلگتے ہوئے سگریٹ کو جسے وہ دوبارہ اٹھا رہا تھا۔۔

بیویاں گھر چھوڑنے کی دھمکیاں دیتی رہتی ہیں اسکا یہ مطلب نہیں کہ اسے اس طرح گھر سے نکال دو۔۔ فرقان نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔۔

دیتی ہوگی..... but she dare not do that to me.

اس نے فرقان کی بات کاٹ کر کہا۔۔

ڈاکٹر صاحب کتنے پریشان ہیں تمہیں اندازہ ہے؟؟

یہ میرا اور اسکا معاملہ ہے وہ ڈاکٹر صاحب کو بیچ میں کیوں لائی ہے۔۔ وہ سلگا تھا۔۔

وہ کیسے نہ لیکر آتی تم اسے گھر سے نکالتے اور ڈاکٹر صاحب کو پتانا چلتا؟؟؟

وہ چاہتی تو نہ پتا چلتا۔ اگر اتنی جرات تھی کہ گھر چھوڑ کر چلی گی تو پھر اتنا حوصلہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ منہ بند رکھتی۔۔۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینکتے ہوئے کہا۔۔۔

تمہیں کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔

کچھ نہیں۔۔۔۔۔

کس بات پہ جھگڑا ہوا ہے تم دونوں کا۔۔۔؟؟

بس ہو گیا کسی بات پر۔۔۔ وہ کم از کم وجہ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

فرقان آدھے گھنٹے بحث کے بعد اس سے وجہ معلوم نہ ہو سکی اور پھر اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ٹھیک ہے جو ہو گیا سو ہو گیا اب تم اسے لے آؤ۔

یہ میں نہیں کروں گا۔۔۔ نہ میں نے اسے نکالا ہے نہ میں اسے لیکر آؤں گا۔ وہ خود آنا چاہتی ہے تو آ جائے۔۔۔ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

اور ڈاکٹر صاحب یہ سب نہیں ہونے دینگے۔۔۔ انکا پیغام یہی ہے کہ تم جا کر معذرت کر

کے اسے لے آؤ۔۔ سالار خاموش رہا۔۔۔

میرے ساتھ چلو ابھی اسے لے آتے ہیں۔۔

میں نہیں جاؤں گا۔۔ ڈاکٹر صاحب سے میں خود بات کر لوں گا۔۔

ابھی کرو بات۔۔۔۔۔

میں ابھی بات نہیں کرنا چاہتا۔۔ میں چاہتا ہوں وہ کچھ دن وہاں رہے یہ اسکے لیئے اچھا

ہوگا۔۔ فرقان اگلے دو گھنٹے بیٹھے اسے یہی سمجھاتا رہا۔۔ لیکن وہ اسکے انکار کو اقرار میں

نہ بدل سکا۔۔ وہ بے حد ناخوش سالار کے اپارٹمنٹ سے گیا۔ اسکی خفگی نے سالار کے

فرسٹریشن میں اور بھی اضافہ کیا۔۔

*****_****_****_*

ڈاکٹر سبط علی اگلے چار دن اسکا انتظار کرتے رہے وہ نہیں آیا نہ ہی اسکا کوئی فون آیا

تھا۔۔ انہیں خود اسکو فون کرنے میں عار تھا۔۔ انہیں کہی نہ کہی یہ توقع تھی کہ وہ انکا اتنا

احترام ضرور کرتا ہے کہ اسکا پیغام ملنے پر آجاتا۔۔ لیکن اسکی مکمل خاموشی نے جیسے

انہیں ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔۔ امامہ اس دن سے انکے گھر پر تھی۔

فرقان ڈاکٹر سبط علی اور سالار کے اپارٹمنٹ کے درمیان گھن چکر بنے ہوئے تھے۔۔ اس ساری صورت حال میں میں سب سے زیادہ ابتر ذہنی حالت امامہ کی تھی۔۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسکے معاملے میں اس طرح کا رویہ دکھا سکتا ہے۔۔

چوتھے دن ڈاکٹر سبط علی نے سالار کو فون کر دیا۔۔ وہ آفس میں بیٹھا ہوا تھا اور سیل پر ڈاکٹر صاحب کا نمبر دیکھ کر چند لمحے وہ ہل نہ سکا۔۔ یہ ایک ایسی کال تھی جس سے وہ بچنا بھی چاہتا تھا اور جسے وہ اٹینڈ نہ کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔ رسمی سلام۔ دعا کے بعد ڈاکٹر سبط علی نے بغیر کسی تمہید کے اس سے کہا۔۔

آپ اگر شام کو میری طرف آ سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں آجاتا ہوں۔۔ اگر معاملہ ختم کر لیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ معاملہ ختم کر لیں گے۔۔

انکے الفاظ میں اسکے لیئے کسی بھی قسم کا ابہام نہیں تھا۔۔

میں آجاؤں گا۔۔

مہربانی ہوگی آپکی۔۔۔ اس نے مزید کوئی بات کیئے بنا سلام کر کے فون بند کر دیا۔۔

وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھا ہاڈاکٹر سبٹ علی کا یہ لہجہ اسکے لیے نیا تھا اور غیر متوقع وہ جملہ تھا جو اس نے آخر میں کہا۔۔ معاملہ ختم کرنے تک نوبت کیسے آگئی تھی۔ اسکے نزدیک یہ ایک جھگڑا تھا۔۔ پہلی بار اسکے پیٹ میں گرہیں پڑی تھی۔۔

اس شام پہلے کی طرح ڈاکٹر سبٹ علی نے اسے دروازے سے ریسیو نہیں کیا۔ نہ اس سے مصافحہ کیا نہ اسکے لیے اٹھے تھے۔۔ وہ لاؤنج میں کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔۔ اس کے آنے پر اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھی۔ سالار سلام کر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں تم سے بہت لمبی چھوڑی بات نہیں کروں گا سالار۔۔ سالار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔۔ وہ انکے منہ سے پہلی بات تم کا طرز تخاطب سن رہا تھا ورنہ وہ تو اپنے ملازم کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔۔

میں پچھلے چار دن سے صرف اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میں نے امامہ کی شادی تم سے کیوں کرائی۔ تم اس قابل نہیں تھے۔۔ محبت کے دعوے کرنا اور بات ہوتی ہے لیکن کسی عورت کو اپنے گھر میں عزت سے رکھنا ایک بالکل الگ بات ہے۔۔ تم صرف پہلا کام کر سکتے تھے۔۔

لاؤنج سے منسلک کمرے میں وہ ڈاکٹر صاحب کی آواز اور اسکی خاموشی کو سن رہی تھی۔۔

اپنی بیوی کو اس طرح نکالنے والے مرد کو میں مرد تو کیا انسان بھی نہیں سمجھتا۔۔ تمہیں اگر اس بات کا پاس نہیں تھا کہ وہ تمہاری بیوی ہے تو اس بات کا پاس ہونا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔۔

میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا وہ خود۔۔۔۔۔ سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکی بات کاٹ دی۔

تم نے گاڑی اریج کی تھی۔۔ اندر بیٹھی امامہ کانپنے لگی تھی۔۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی اتنی بلند آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔

تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم اسکے کردار کے بارے میں بات کرو۔۔

سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا انکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔۔

آپ نے اس سے یہ پوچھا کہ یہ بات میں نے کیوں کی تھی۔۔ اندر بیٹھی امامہ کا چہرہ فق ہو گیا۔۔

میں اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا میں تمہارے کردار کو نہیں جانتا لیکن وہ نو سال سے میرے پاس ہے وی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس پر تم اسکے کردار پر انگلی اٹھاؤ۔۔

اسے یقین تھا وہ اب جلال کا نام لے گا۔۔۔۔۔ اب لے گا۔۔۔۔۔ اسکا پورا جسم سرد پڑا تھا۔۔ سالار کا ایک جملہ اسے اس وقت ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں گرانے والا تھا۔۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین۔۔۔۔۔ چار۔۔۔۔۔ اسکا دل سیکنڈز سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا۔۔۔

پھر امامہ نے اسکی آواز سنی، ایک لمحے کے لیے اسکا دل رک گیا۔۔۔
 آئی ایم سوری۔۔۔ اسے یقین نہیں آیا۔۔۔ یہ وہ جملہ نہیں تھا جسکی وہ توقع کر رہی تھی۔۔ اسکی سوری نے اسے شاک کیا تو ڈاکٹر صاحب کو اور بھی مشتعل کر دیا۔۔۔

ایک بات یاد رکھنا تم سالار۔۔ جو کچھ تم کو زندگی میں ملنا ہے اس عورت کے مقدر سے ملنا ہے یہ تمہاری زندگی سے نکل گی تو خواری کے سوا کچھ تمہارے ہاتھ نہیں آئیگا۔۔ ہاتھ ملو گے ساری عمر تم۔۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے تمہیں امامہ کا کفیل بنایا کبھی رازق بننے کی کوشش بھی مت کرنا رازق تم نہیں ہو اسکے اللہ اسکو تم سے بہتر کفیل دے دیگا۔۔۔

وہ کاٹو تو لہو نہیں کے مصداق بنا بیٹھا تھا۔۔

شر مساری سی شر مساری تھی جو وہ محسوس کر رہا تھا۔ اور اندر بیٹھی امامہ بھی اسی طرح
ندامت کے سمندر میں غرق تھی۔۔۔

اسے گھر میں رکھنا ہے تو عزت سے رکھو ورنہ ابھی اور اسی وقت اسے چھوڑ دو۔ تم سے
کی گنا چھ انسان کیسا تھا اسکو بیاہ دوں گا۔

میں آپ سے اور اس سے بہت شر مندہ ہوں۔۔ آپ اسے بلائیں میں اس سے

معذرت کر لیتا ہوں۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اندر بیٹھی امامہ جیسے زمین میں گرگی تھی۔۔

کلثوم آنٹی اسے بلانے آئی تھی اور اسکا دل چاہا کہ وہ کہی بھاگ جائے۔ زندگی میں اپنے

شوہر کا جھکا ہوا سر دیکھنے سے بڑی ندامت کا سامنا اس نے آج تک نہیں کیا تھا۔

میں بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں جو کچھ ہوا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو کچھ کیا غلط کیا میں

نے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سالار نے نظریں اٹھائے بغیر اسکے بیٹھتے ہی

کہا۔۔ امامہ کے رنج میں کچھ اور اضافہ ہوا۔۔ آج سالار کیساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اسکا

ذمہ دار وہ خود کو ٹھہرا رہی تھی۔۔

بیٹا آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں اور نہیں جانا چاہیں تو۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا۔۔

نہیں۔۔۔ میں جانا چاہتی ہوں۔۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔۔

ٹھیک ہے پھر اپنا سامان پیک کر لیں۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا۔۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے سامان بیگ میں رکھا۔ ڈاکٹر صاحب امامہ کے اٹھتے ہی سٹڈی روم میں چلے گئے اور وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔۔

بیٹا کھانا لگواؤں؟؟ کلثوم آنٹی نے جیسے ماحول بہتر کرنے کی کوشش کی۔۔

نہیں۔۔۔ میں کھانا کھا کر آیا تھا۔۔

اس نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائی۔ وہ نظریں اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔۔

ملازم سوفٹ ڈرنک کا ایک گلاس اسے دیکر گیا سالار نے چند گھونٹ لیکر گلاس واپس رکھ دیا۔۔

امامہ کو پیکنگ میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے سالار نے کھڑے ہو کر خاموشی

کیا۔ کچھ دیر بیٹھے رہے پھر وہ آدمی اور انکی مسز آگئیں۔۔ مجھے دیر ہو رہی تھی تو میں وہاں سے گھر آگئی۔ بس اتنی سی بات تھی میری غلطی بس یہ تھی کہ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔

اور میری غلطی یہ تھی کہ میں نے تمہاری بات سنی نہیں۔ سن لینی چاہیے تھی۔۔ آئی اور ری ایکٹڈ۔۔

وہ اب مدہم آواز میں اعتراف کر رہا تھا۔۔

بے عزتی کروانی تھی اس لیے۔۔۔ وہ بڑ بڑایا۔۔۔
 وہ اسے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسکی کتنی احسان مند ہو رہی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔۔ اسے ایک لمحے کی چپ نے اسکی عزت رکھ کہ جیسے سارے دنوں کے رویوں کا کفارہ ادا کر دیا۔۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں کسی آدمی کیساتھ میرا ملنا اتنا برا لگے گا۔۔ ورنہ میں تو کبھی۔۔۔۔۔ کچھ دیر کے بعد امامہ نے کہا۔۔۔

سالار نے اسکی بات کاٹ لی۔۔۔ وہ کوئی آدمی نہیں تھا امامہ۔۔۔

وہ اب میرے لیے صرف کوئی آدمی ہے۔۔ سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اس نے ناک رگڑتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کی۔۔

طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟

ہاں ٹھیک ہے۔۔ اس نے امامہ کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے جیسے ٹمپیرچر چیک کیا۔۔

بخار ہے؟؟

تھوڑا سا ہے۔۔

ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔۔

نہیں۔۔ میڈیسن لے رہی ہوں میں۔ بیگ میں ہے۔۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس ایک

واقعے نے اعتماد کے اس رشتے میں عجیب دراڑیں پیدا کر دی تھی۔۔

اس رات گھر آ کر انکے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ امامہ میڈیسن لیکر سو گئی اور

سالار سٹی روم جا کر سگریٹ پیتا رہا۔۔

وہ پچھلے کی مہینوں سے اسے خوش کرنے کی آخری حد تک جا رہا تھا اسکے سارے ناز

نخرے اٹھا رہا تھا اسے یقین تھا وہ سب کچھ امامہ کے دل سے جلال انصر نامی شخص سے

متعلقہ ہر طرح کے جذبات نکال دے گا۔۔ وہ اسکے قریب آرہی تھی۔۔ لیکن جلال کسی بھوت کی طرح دوبارہ نمودار ہو گیا تھا۔۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے اتنی خوبصورتی سے دھوکا دے رہی تھی۔۔ وہ دو دن پہلے ہونے والی ایک ایک بات کو یاد کر کے سلگتا رہا۔ وہ ملاقت اگر اتفاقی تھی تو اسکے بعد اس نے امامہ کی جو حالت دیکھی تھی وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔۔ اس دن اسکے آفس میں امامہ جو آخری چیز بھولی تھی وہ باتھ روم بیسن کی سل پہ رکھی ہوئی اسکی شادی کی رنگ تھی۔۔ وہ رنگ اسکے جانے کے بعد سالار کو وہاں سے ملی تھی۔۔ اسکا خیال تھا گھر پہنچ کر اسے رنگ یاد آجائے گی لیکن اس دن تو کیا گلے دو دن تک امامہ کو کچھ یاد نہیں آیا۔۔ وہ مسلسل انگلی میں رہنے والی اتنی قیمتی چیز کو کیسے فراموش کر سکتی ہے۔

جلال سے ہونے والی اس ملاقات کے بعد اس نے اسکے رنگ اتارنے کو جیسے نیا مفہوم پہنایا تھا۔۔

*****_***_***_***_***

باجی آپ کہاں تھی۔۔؟

اگلی صبح وہ ملازمہ کے بیل دینے پر جاگی۔۔

میں چند دن اپنے گھر رہنے گی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ واپس آئی تو ملازمہ سٹیڈی روم کی صفائی کر رہی تھی۔ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے نے اسے چونکا دیا۔۔۔

مجھے لگتا ہے باجی سالار صاحب سگریٹ پینے لگے ہیں۔۔ ہر روز اسی طرح ایش ٹرے بھرا ہوتا ہے۔۔ اب روز روز تو کوئی مہمان نہیں آتا ہو گھس۔۔

وہ جواب دیئے بغیر وہاں سے نکل گئی۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اگلی صبح اس نے ایش ٹرے پھر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ وہ اس بات سے پریشان ہوئی کہ وہ سمو کر نہیں تھا لیکن عادی بن رہا ہے۔۔ کی دنوں کے بعد اس رات سالار نے کھانا بڑی رغبت سے کھایا۔ وہ عام طور پر ایک چپاتی سے زیادہ نہیں کھاتا تھا۔ لیکن آج اس نے دو چھاتیاں کھائی۔

اور بنا دوں؟؟ اما مہ نے اسے دوسری چپاتی لیتے ہوئی دیکھ کر پوچھا۔

نہیں میں پہلے ہی اوور ایکٹنگ کر رہا ہوں۔ اس نے منع کیا۔۔

امامہ نے اسکی پلیٹ میں کچھ سبزی ڈالنے کی کوشش کی اس نے روک دیا۔
 نہیں میں ویسے ہی کھانا چاہ رہا ہوں۔۔ امامہ نے کچھ حیرانی سے اسکا چہرہ دیکھا۔ وہ جانتی
 تھی اسے اسکے ہاتھ کی چپاتی پسند ہے۔ اس دن پہلی بار اس نے آخری لقمہ اسے نہیں
 دیا۔۔ وہ کھانا کھانے کے بعد ٹیبل سے اٹھ گیا۔۔ وہ برتن اکٹھے کر رہی تھی جب وہ کچھ
 پیپرز لیئے آیا۔۔۔۔۔

یہ کیا ہے؟؟ امامہ نے کچھ حیرانی سے پیپرز کو دیکھا۔۔۔

بیٹھ کر دیکھ لو۔۔۔ وہ اسکے قریب کر سی کھینچ کر بیٹھ گیا۔۔۔

وہ بھی کچھ الجھے انداز میں پیپرز لیکر بیٹھ گئی۔۔

پیپرز پر ایک نظر ڈالتے ہی اسکا رنگ فق ہوا۔۔

طلاق کے پیپرز ہیں یہ؟؟ وہ بمشکل بول سکی۔۔۔

نہیں یہ میں نے اپنے وکیل سے ایک ڈائیورس ڈیڈ تیار کروایا ہے۔۔ اگر کبھی

خدا نخواستہ ایسی صورت حال ہوگی تو یہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے کرنے کی

ایک کوشش ہے۔۔

مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی۔۔ وہ اب حواس باختہ تھی۔۔۔۔۔

ڈرومت یہ کوئی دھمکی نہیں ہے۔ میں نے یہ پیپرز تمہارے تحفظ کے لیے تیار کروائے ہیں۔۔ سالار نے اسکے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔۔

کیسا تحفظ؟؟ اسے اب بھی ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔۔

میں نے علیحدگی کی صورت میں فنانشل سیکورٹی اور بچوں کی کسٹڈی تمہیں دی ہے۔

لیکن میں تو طلاق نہیں مانگ رہی۔ اسکی ساری گفتگو اسکے سر پر سے گزر رہی تھی۔

میں بھی تمہیں طلاق نہیں دے رہا صرف قانونی طور پر خود کو پابند کر رہا ہوں کہ میں

علیحدگی کے کیس کو کورٹ میں نہیں لیکر جاؤں گا۔۔ تمہیں علیحدگی کا حق اور بچوں کی

کسٹڈی دے دوں گا۔۔ جو بھی چیزیں اس عرصے میں حق مہر تحائف جیولری یا روپے

اور پر اپرٹی کی صورت میں تمہیں دوں گا وہ سب خلع یا طلاق دونوں صورتوں میں

تمہاری ملکیت ہوگی۔ میں انکا دعویٰ نہیں کروں گا۔۔۔

یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟؟ اس نے بے حد خائف انداز میں اسکی بات کاٹی۔۔

میں اپنے آپ سے ڈر گیا ہوں امامہ۔۔۔ وہ سنجیدہ تھا۔۔۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ مجھے تم پہ اتنا غصہ آسکتا ہے۔ میں نے تمہیں گھر سے نہیں نکالا لیکن اس رات میں نے پرواہ نہیں کی کہ تم گھر سے کیوں اور کہاں جا رہی ہو۔۔ میں اتنا مشتعل تھا کہ میں نے یہ پرواہ بھی نہیں کی کہ تم بحفاظت کہی پہنچی بھی ہو یا نہیں۔ وہ بے حد صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔۔ اور پھر اتنے دن میں نے ڈاکٹر صاحب کی بات بھی نہیں سنی۔

I just wanted to punish you

وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔۔

اور اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ میرا غصہ ختم ہوا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔۔ کہ میں

اتنا گر سکتا ہوں میں تمہارے ساتھ اس طرح بیہو کر سکتا ہوں۔۔ لیکن میں نے

کیا۔۔ بہر حال میں ایک انسان ہوں تم کو ساتھی کی بجائے حریف سمجھوں گا تو شاید

آئندہ بھی کبھی ایسا کروں۔۔ ابھی شادی کو تھوڑا وقت ہوا ہے۔ مجھے بہت محبت ہے تم

سے میں خوشی خوشی یہ سارے وعدے تم سے کر سکتا ہوں سب کچھ دے سکتا ہوں

تمہیں لیکن کچھ عرصہ بعد اگر ایسی کوئی سچویشن آگی تو پتا نہیں ہمارے درمیان کتنی

تلخی ہو جائے تب شاید میں اتنی سخاوت نہ دکھا سکوں اور ایک عام مرد کی طرح

تمہاری گاڑی فی الحال میں استعمال کر رہا ہوں۔ دو چار دن میں میری گاڑی آجائے گی تو

تمہاری چھوڑ دوں گا۔ اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے امامہ سے کہا۔

تمہاری گاڑی کہاں ہے۔۔۔

ورکشاپ میں ہے لگ گی تھی۔ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔۔۔ وہ چونک گئی۔

کیسے لگ گی؟؟؟

میں نے کسی گاڑی کے پیچھے ماردی تھی۔۔۔ وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں اسے بتا رہا

تھا۔ وہ اسکا چہرہ دیکھتی رہی وہ سلاٹس پر مکھن لگا رہا تھا۔ وہ ایکسپریٹ ڈریور تھا اور یہ

ناممکن تھا کہ وہ کسی گاڑی کو پیچھے سے ٹکرا دے۔

گھر میں آنے والی دراڑیں مرد اور عورت پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتی

ہے۔۔ عورت کی پریشانی آنسو بہانے کھانا چھوڑ دینے اور بیمار ہونے تک ہوتی ہے مرد

اس میں کچھ نہیں کرتا اسکا ہر رد عمل اسکے آس پاس کی دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے۔۔۔۔۔

امامہ نے اسکے چہرے سے نظریں ہٹالی

&&-----&-----*&

اس رات وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر اس واقعے کے بعد پہلی بار لیکچر کے لیے گیا تھا امامہ ہمیشہ کی طرح آج بھی انکے ساتھ تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے آج بھی سالار کا استقبال کسی گرمجوشی کے بغیر صرف ہاتھ ملا کر کیا تھا۔ لیکچر کے بعد ڈنر پہ بھی انہوں نے سالار کے لیے وہی پرانی توجہ نہیں دکھائی۔ ڈنر پر فرقان بھی تھا اور ڈاکٹر صاحب فرقان سے گفتگو میں مصروف رہے۔۔ سالار سے آئی نے تھوڑی سی بات چیت کی تھی۔ سالار سے زیادہ اس رات اس رویے کو امامہ نے محسوس کیا تھا۔ امامہ کو ڈاکٹر سبط علی کا سالار کو نظر انداز کرنا بری طرح چھبیا تھا۔ واپس آتے ہوئے وہ پریشان تھی۔

اس رات وہ سونے کے لیے نہیں گئی تھی۔ ایک ناول لیکر وہ سٹڈی روم میں آگئی تھی۔ وہ کام کرنے کی بجائے سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا اسے دیکھ کر سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں مسل دیا

کمرے میں اکیلی بیٹھی بور ہوتی اس لیے سوچا یہاں آجاؤں۔۔ اس نے سگریٹ کو نظر انداز کر کے سالار کو تاویل دی۔

تم ڈسٹرب تو نہیں ہو گے؟؟ اس نے سالار سے پوچھا۔

نہیں۔۔ بلکل نہیں۔۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔۔

وہ راکنگ چیئر پہ جا کر بیٹھ گئی اور ناول کھول لیا۔۔ وہ سگریٹ پینا چاہتا تھا لیکن اسکے سامنے نہیں پیتا تھا۔۔ امامہ یہ جانتی تھی اس لیے وہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

کچھ دیر وہ بے مقصد اسے دیکھتا رہا۔۔ پھر اپنا لپ ٹاپ نکال کر نہ چاہتے ہوئے بھی کام کرنے لگا تھا۔ کافی دنوں کے بعد اس رات اس نے پریشان ہو کر سگریٹ کی بجائے کام کیا تھا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے میں صرف گھر آ کر نہیں بلکہ آفس میں بھی اسی طرح چین سموکنگ کر رہا تھا اب اسے عادتاً طلب ہو رہی تھی۔۔۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد اس نے بلا آخر امامہ کو مخاطب کیا۔

تم سو جاؤ کافی رات ہو گئی ہے۔۔ امامہ نے چونک کر اسے دیکھا

تم فارغ ہو گئے ہو؟؟

نہیں مجھے ابھی کافی کام ہے۔

تو پھر میں بیٹھی ہوں ابھی تم کام ختم کر لو میرا بھی ایک چیپٹر رہتا ہے۔۔

سالار بے اختیار گہرا سانس لیکر رہ گیا۔۔ یعنی آج رات وہ مزید کوئی سگریٹ نہیں پی سکتا

تھا۔ اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں کو قدرے مایوسی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

مزید ایک گھنٹہ بعد جب وہ فارغ ہوا تو تب تک وہ اسی راکنگ چیئر پہ سوچکی تھی۔۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا بے مقصد اسے دیکھتا رہا۔۔

اگلے چند دن بھی اسی طرح ہوتا رہا۔ انکے درمیان آہستہ آہستہ گفتگو ہونے لگی تھی اور اسکا آغاز بھی امامہ کرتی تھی۔۔ سالار بے حد شرمندہ تھا اور اسکی خاموشی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ وہ اس پورے واقعے سے بری طرح ہرٹ ہونے کے باوجود اسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔۔

ڈاکٹر سبط علی نے اگلے ہفتے بھی سالار کیساتھ ویسے ہی سلوک کیا تھا اس بار امامہ کو پہلے سے بھی زیادہ رنج ہوا۔۔۔

*****_*****_*****

ابو۔۔ آپ سالار سے اچھی طرح بات کیوں نہیں کرتے؟؟

امامہ اگلے دن سہ پہر کو ڈاکٹر سبط علی کے آفس سے آنے کے بعد انکے گھر آئی

تھی۔۔۔

کیسے بات کرنی چاہیے؟ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

جیسے آپ پہلے بات کرتے تھے۔۔

پہلے سالار نے یہ سب نہیں کیا تھا۔ اسکے بارے میں مجھے بڑی خوش گمانیاں

تھی۔۔ وہ مدھم آواز میں بولے۔۔

ابو وہ برا نہیں ہے۔۔ وہ بہت اچھا ہے۔ میری غلطی تھی۔ ورنہ بات شاید اتنی نہ

بڑھتی۔ وہ بہت عزت کرتا ہے میری بہت خیال رکھتا ہے لیکن اب یہ سب ہونے کے

بعد وہ بہت پریشان ہے۔۔۔ وہ سر جھکائے وضاحتیں دے رہی تھی۔۔ آپ جب اسے

انگور کرتے ہیں تو مجھے بہت ہتک محسوس ہوتی ہے۔۔ وہ یہ سلوک ڈیزرو نہیں

کرتا۔۔ فرقان بھائی کے سامنے کتنی بے عزتی محسوس ہوتی ہوگی اسے۔۔۔ وہ بے حد

رنجیدہ تھی۔۔۔۔

ڈاکٹر سبط علی بے ساختہ ہنس پڑے۔۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔۔

میں جانتا ہوں سالار برا آدمی نہیں ہے وہ پریشان اور نادام ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ

قصور اسکا زیادہ نہیں اور میرا اسکے ساتھ رویہ آپکو برا لگتا ہوگا۔۔ وہ حیرانی سے ڈاکٹر سبط علی کی چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔

پیٹا میں آپکو اسی بات کا احساس دلانا چاہتا تھا مرد جب غصے میں گھر چھوڑ کر جاتا ہے تو ویسے ہی واپس آجاتا ہے۔ اسکے گھر سے جانے پر اسکی عزت پہ کوئی حرف نہیں آتا نہ اسکی بیوی کی عزت پر حرف آتا ہے لیکن عورت جب غصے میں گھر سے نکلتی ہے تو اپنی اور مرد دونوں کی عزت لیکر باہر آتی ہے وہ واپس بھی آئے تو دونوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔۔ جھگڑا ہوا تھا، کوئی بات نہیں۔۔ اس نے غصے میں برا بھلا کہہ دیا جانے کا کہہ دیا آپ گھر کے کسی دوسرے کمرے میں چلی جاتی وہ ہاتھ پکڑ کر تو نہیں نکال رہا تھا نا۔۔ صبح تک اسکا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔۔ ایک آدھ دن میں بات ختم ہو جاتی اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتا۔۔ وہ رسائیت سے اسے سمجھا رہے تھے۔۔

مرد کے دل میں اس عورت کی کوئی عزت نہیں ہوتی جسے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ گھر کی دہلیز پار کرنے کی عادت ہو۔۔ اور یہ دوسری بار ہوا ہے۔۔ اس نے چونک کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا۔۔

یاد ہے شادی کے دوسرے دن بھی آپ ناراض ہو کر سعیدہ اماں کے پاس رہ گئی

تھی۔۔۔

امامہ نے نادم ہو کر سر جھکا لیا تھا۔۔۔ اسے یہ واقعہ یاد نہیں رہا تھا۔۔۔

مرد کیساتھ انا کا مقابلہ کرنے والی عورت بیوقوف ہوتی ہے وہ اسے اپنا دشمن بنا لیتی ہے اکھڑپن اور ضد سے مرد سے بات منوائی جاسکتی ہے لیکن اسکے دل میں اپنی محبت اور عزت نہیں بڑھائی جاسکتی۔۔۔ اللہ نے آپکو محبت کرنے والا اور بہت سی خوبیوں والا شوہر دیا ہے اس نے آپکی عیب جوئی نہیں کی بلکہ آپ کو اپنے ساتھ لے گیا بہت کم مردوں میں یہ صفت ہوتی ہے۔ تو اگر کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے اس سے تو اسکی مہربانیاں یاد کر لیا کریں

وہ سر جھکائے خاموشی سے انکی باتیں سنتی رہی۔۔۔ اگر میں یہ سب باتیں اس وقت آپکو سمجھاتا جب آپ یہاں آئی تھی تو آپ کبھی میری بات نہ سمجھتی۔۔۔ آپکو لگتا کہ اگر اس وقت آپکے والدین ہوتے تو اس سچویشن میں آپکو سپورٹ کرتے اس لیے یہ باتیں تب نہیں سمجھائی میں نے۔۔۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے وہ اسے اس وقت کچھ کہتے تو وہ بری طرح دلبرداشتہ ہو جاتی۔

اس نے کچھ کہے بغیر وہ پیپر ز نکال کر انہیں دیئے جو سالار نے اسے دیئے تھے۔ یہ

اس دن وہ پورا راستہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی انہوں نے اسے کبھی نصیحت نہیں کی تھی یہ پہلا موقع تھا۔ کوئی نہ کوئی غلطی اس نے بھی محسوس کی تھی۔۔۔

تم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی تھی؟؟ سالار نے شام کو گھر آتے ہی سوال کیا۔۔

ہاں تمہیں کیسے پتا چلا؟؟ وہ کھانے کے برتن ٹیبل پر لگا رہی تھی۔۔

انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔۔ وہ گردن سے ٹائی نکالتے ہوئے بولا۔۔

اوہ۔۔۔ کچھ کہا انہوں نے تم سے؟؟؟ اس نے سالار کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

پوچھا۔۔

نہیں ویسے ہی کچھ دیر باتیں کرتے رہیں۔۔

امامہ کو محسوس ہوا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔۔ ہمیشہ کی طرح کپڑے تبدیل کرنے

کے لیے بیڈروم میں جانے کی بجائے ٹائی نکال کر بے مقصد کچن کے کاؤنٹر سے ٹیک

لگائے سلاد کھا رہا تھا۔

آج کیا ہے کھانے میں؟؟ شادی کے اتنے مہینوں میں پہلی دفعہ اس نے یہ سوال کیا

تھا۔ امامہ نے اسے بتایا لیکن وہ حیران ہوئی تھی۔

اور سویٹ ڈش؟؟؟ یہ سوال پہلے سے بھی زیادہ اچھنبے والا تھا۔ وہ میٹھے کاشوقین نہیں تھا۔۔۔

کل چائینیز بنانا۔ وہ ایک بار پھر حیرانی سے اسکا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ کھانے کے معاملے میں فرمائشیں کرنے کا کہاں عادی تھا۔

کل بھی چائینیز تھا۔۔ فریج سے پانی کی بوتل نکلتے ہوئے اس نے سالار کو جیسے یاد دلایا۔ وہ گڑ بڑا گیا۔۔۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
ہاں کل بھی چائینیز تھا کوئی بات نہیں کل پھر سہی۔۔۔

آئی مین اس میں کوئی ہرج نہیں۔ امامہ نے صرف سر ہلایا۔ وہ اب فریج سے چپاتیاں بنانے کے لیے آماز کال رہی تھی۔

ایکوا بلیو کلر تم پہ بہت اچھا لگتا ہے۔ اس نے حیرت سے سالار کو دیکھا۔۔

آ۔۔۔۔ آ۔۔۔۔ ایکوا بلیو نہیں ہے یہ؟؟ اس کی آنکھوں کے تاثر نے اسے گڑ بڑایا تھا۔

سالار تمہارے ساتھ مسلہ کیا ہے /؟ امامہ نے کہا۔۔۔

کیوں کیا ہوا؟؟ مجھے لگا یہ ایکو ابلو ہے۔۔۔

یہ ایکو ابلو ہی ہے۔۔۔ اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ مسلہ کیا ہے۔۔۔

وہ اسکی بات پہ ہنس پڑا۔۔۔ پھر کچھ کہے بغیر آگے بڑھا اور اسے ساتھ لگا لیا۔۔۔

میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ امامہ نے اسے کہتے سنا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس

چیز کے لیے شکر یہ ادا کر رہا تھا۔۔۔

آئی ایم ریٹلی سوری۔ اینڈ آئی مین اٹ۔۔۔

وہ اب دوبارہ معذرت کر رہا تھا۔۔۔

آئی نو۔۔۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔۔۔

آئی لو یو۔۔۔ امامہ کا دل بھر آیا۔۔۔۔۔

تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ ایکو ابلو ہے۔؟

اپنی پوروں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے امامہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

تم ہمیشہ عجیب نام لیتی ہو کلرز کے۔ ایکوا بلیو واحد عجیب نام تھا جو مجھے بلیو کلر کے لیے
اس وقت یاد آیا۔ اس نے سادہ لہجے میں کہا۔۔۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی وہ کلر بلا سنڈ تھا
اسے اب اندازہ ہو چکا تھا۔۔

ویری سمارٹ۔۔ اس نے جیسے اسے داد دی۔۔

یوتنگ سو۔۔ وہ ہنسا۔۔

یس آئی ڈو۔۔

تھینک یو دن۔۔۔ وہ کہتا ہوا کچن سے نکل گیا تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کچن کے وسط میں کھڑی وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔۔

*****_****_****_****_****

کیا لوگی تم؟؟ سالار نے مینیو کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔۔

میں تو شرمپ کی ڈشز میں سے کوئی ٹرائی کروں گا۔۔۔

وہ اسلام آباد میں دوسری بار کھانا کھانے نکلے تھے۔ پندرہ منٹ بعد کھانا سرو ہو گیا اور

کھانا کھانے کے دوران ویٹر نے ایک چٹ لاکر سالار کو دی اس نے حیرانی سے چٹ پر

لکھی تحریر کو دیکھا۔۔۔

آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دے۔ سالار نے حیرانی سے سراٹھا کے ویٹر کو دیکھا۔۔۔ یہ کیا ہے/؟؟

اس نے ویٹر سے پوچھا۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا ایک کرنٹ اسے چھو کر گزرا۔۔۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کیا تھا۔۔۔

بے حد برق رفتاری سے چند کرنسی نوٹ نکال کر اس نے ٹیبیل پر رکھتے ہوئے اس نے ویٹر کو بل کلیئر کرنے کا کہا۔۔۔ امامہ حیرانی سے اسکی شکل دیکھنے لگی۔۔۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
کھانا چھوڑ دو ہمیں جانا ہے۔۔۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا۔۔۔

لیکن کیوں۔۔۔ وہ نہ سمجھی تھی۔۔۔

امامہ یہ تمہیں باہر جا کر بتانا ہوں تم بیگ لے لو اپنا۔۔۔ وہ کرسی دھکیلتا ہوا پلٹا اور پھر ساکت ہو گیا۔۔۔ انہیں نکلنے میں دیر ہوگی تھی۔۔۔ اس نے کچھ فاصلے پر امامہ کے والد اور بڑے بھائی کو دیکھا اور وہ انہی کی طرف آرہے تھے۔۔۔

وہ برق رفتاری سے امامہ کی کرسی کی طرف آیا۔۔۔ امامہ ٹیبیل کے نیچھے اپنے قدموں

میں رکھا ہوا بیگ اٹھا رہی تھی اس نے ابھی انہیں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سالار کے اپنے قریب آنے پر بیگ اٹھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے بھی اپنی فیملی کے افراد کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ ایک لمحہ میں اس کا خون خشک ہو گیا۔ سالار نے کچھ کہنے کی بجائے اسے اپنے اوٹ میں کیا۔۔۔

سامنے سے ہٹو۔۔۔ ہاشم مبین نے پاس آتے ہی بلند آواز میں اس سے کہا۔۔۔
 آس پاس ٹیبلز پر بیٹھے لوگ یکدم انکی طرف متوجہ ہوئے۔۔۔ نہ صرف کسٹمرز بلکہ ویٹرز بھی۔۔۔
 آپ ہمارے ساتھ گھر چلیں وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔۔۔ سالار نے تحمل سے ہاشم مبین کو کہا۔۔۔

اس نے جو ابا ایک گالی دیتے ہوئے اسے گریبان سے پکڑا اور کھینچ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی۔۔۔ وسیم اور عظیم سے امامہ کو وہاں سے لے جانے کا کہا۔۔۔ ہاشم کے برعکس وسیم اور عظیم دونوں کچھ متامل تھے۔۔۔ وہ جانتے تھے اس طرح زبردستی اس ریستورنٹ سے کسی کو ہال سے باہر نہیں لے جاسکتے کیونکہ سیکیورٹی کا سامنا کیئے بغیر امامہ کو بحفاظت وہاں سے لے جانا مشکل تھا۔۔۔

وہ سالار کے عقب میں اسکی شرٹ پکڑے تھر تھر کانپتی ہوئی تقریباً اس سے چپکی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ جب ہاشم نے سالار کا گریبان پکڑتے ہوئے اسے کھینچا۔۔۔۔۔

سالار نے اپنا دفاع کرتے ہوئے گریبان چھڑاتے ہاشم مبین کو ذرا سا پیچھے دھکیلا۔ انکے لیے یہ دھکا کافی ثابت ہوا۔ وہ پیر پھسلنے سے بے اختیار نیچھے گرے۔۔۔۔۔ ریسپشن تب تک باہر موجود سیکورٹی کو انفارم کر چکا تھا۔ اس دھکے نے عظیم کو بھی مشتعل کر دیا تھا وہ بھی بلند آواز سے گالیاں دیتے ہوئے جوش میں آیا اور بے حد غیر متوقع انداز میں سالار کے جبرے پر ایک گھونسا رسید کیا۔۔۔۔۔ چند لمحوں کے لیے اسکی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا وہ اسکے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ وہ ذرا سا جھکا اور عظیم اسکے پیچھے کھڑی امامہ تک جا پہنچا۔ اس نے کانپتے ہوئے سالار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن عظیم نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے نہ صرف سالار سے الگ کرنے کی کوشش کی بلکہ اسکے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔۔۔۔۔ سالار تب تک سنبھل کر سیدھا ہو کر اسے چھڑانے کے لیے پلٹا تھا جب اسکے بائیں کندھے کی پشت پر درد کی ایک تیز لہر اٹھی اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخ رو کی۔۔۔۔۔ وہ ہاشم مبین تھے جس نے ٹیبل پر پڑا ہوا چاقو اس کی پشت میں مارنے کی کوشش کی۔ لیکن آخری

لمحے میں ہلنے کی وجہ سے وہ اسکے بائیں کندھے میں جا کر لگا تھا۔

سیکوریٹی اور دوسرے ویٹرز تک قریب پہنچ چکے تھے اور ان تینوں کو پکڑ چکے تھے۔ امامہ نے نہ تو ہاشم مبین کو سالار کو وہ چاقو ماتے دیکھا تھا اور نہ ہی سالار کو چاقو کندھے سے نکالتے دیکھا۔ سالار اپنی جینز کی جیب سے سیل نکال کر سکندر کو فون پر وہاں آنے کے لیے کہہ رہے تھے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے لیکن اسکے باوجود اپنا لہجہ نارمل رکھ کر سکندر سے بات کر رہا تھا۔ وہ اپنے کندھے سے کمر تک خون کی نمی محسوس کر رہا تھا۔

آپ کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے آپ آجائے۔۔۔ میجنر نے اس کے پشت پر بہنے والے خون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

امامہ نے میجنر کی اس بات پر حیران ہو کر سالار کو دیکھا وہ اب فون ہر بات ختم کر رہا تھا۔ امامہ نے اس کے ہاتھ کو پہلی بار نوٹس کیا تھا جو وہ کندھے کے اوپر رکھے ہوئے تھا۔

کیا ہوا ہے؟؟ امامہ نے قدرے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

کچھ نہیں۔۔۔۔ سالار نے اپنا بازو سیدھا کیا۔۔ امامہ نے اسکی خون آلود انگلیاں دیکھی
۔۔ اس نے سمجھا شاید اسکا ہاتھ زخمی ہے۔

اسے کیا ہوا؟؟؟ اس نے کچھ حواس باختہ ہو کر پوچھا۔۔ اس نے جواب دینے کی بجائے
قریبی ٹیبل سے نیپکن اٹھا کر اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے امامہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔۔ وہ
مینجر کے کمرے میں آگئے۔۔ وہ پولیس کو جال کر چکا تھا۔ اور اب وی پولیس کے آنے
تک انہیں وہاں روکنا چاہتا تھا لیکن سالار زخمی تھا اسے فرسٹ ایڈ کی ضرورت
تھی۔۔ امامہ نے پہلی بار سالار کی خون آلود پشت دیکھی اور دھک سے رہ گئی
تھی۔۔۔۔

اگلے پانچ منٹ میں پولیس ایسبولینس اور سکندر آگے پیچھے پہنچے تھے۔۔ سکندر کے آتے
ہی سالار نے امامہ کو گھر کی بجائے فوری طور پر کہی اور بھیجنے کا کہا۔۔ سکندر خود سالار کو
ہاسپٹل لیجا رہے تھے۔۔ وہ چاہنے کے باوجود اس سے یہ نہ کہہ سکی کہ وہ اسکے ساتھ جانا
چاہتی ہے۔

سکندر نے اسے فوری طور پر اپنے بڑے بھائی شاہنواز کے گھر بھیج دیا۔۔

وہ وہاں بت کی طرح آکر گیسٹ روم میں بیٹھ گئی۔ سالار کو کسی نے چاقو سے زخمی کر لیا

تھا یہ اس نے سن لیا تھا مگر یہ اسکے باپ نے کیا تھا یا بھائیوں میں سے کسی نے۔۔۔ یہ وہ
نہ جان سکی۔۔۔

ریسٹورنٹ کی سیکورٹی نے پولیس کے آنے تک ان تینوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا
تھا۔

اسے ابھی آئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ سالار کی کال آگئی۔

تم پہنچ گئی۔۔۔ اس نے امامہ کی آواز سنتے ہی کہا۔۔۔

ہاں۔۔۔ تم کہاں ہو؟؟؟

ابھی کلینک پر ہوں۔۔۔ سالار نے کہا۔۔۔

اور ابو؟؟؟

پاپا ساتھ ہیں میرے۔۔۔ سالار نے اسکے لف ظوں پر غور نہیں کیا۔۔۔

میں اپنے ابو کا پوچھ رہی ہوں۔۔۔ اس نے بے ساختہ کہا۔۔۔

اسے امامہ کی یہ تشویش بہت بری لگی۔۔۔

وہ تینوں پولیس کسٹڈی میں ہیں یہاں سے فارغ ہو کر ہم وہی جائینگے۔۔ امامہ کا دل ڈوبا۔۔۔

باپ اور بھائیوں کے حوالات میں ہونے کے تصور نے چند لمحوں کے لیے اسے سالار کے زخمی ہونے سے لاپرواہ کر دیا۔۔

سالارا نہیں پلیز معاف کر دو۔۔۔ اور ریلیز کروادو۔۔

سکندر اس وقت اسکے پاس تھے۔۔ وہ امامہ سے کچھ کہہ نہ سکا لیکن وہ خفا ہوا تھا۔۔ وہ اس سے زیادہ اپنی فیملی کے لیے پریشان تھی۔۔

وہ زخمی تھا لیکن اس نے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اب کیسا ہے؟

میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔۔ اس نے کچھ کہنے کی بجائے فون بند کر دیا۔

کلینک میں اس کے چیک اپ میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ خوش قسمتی سے اسکی کوئی رگ کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔۔۔

کلینک میں ہی سکندر کی فیملی کے افراد نے آنا شروع کر دیا اور سالار کو سکندر کے اشتعال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ سنجیدہ نوعیت اختیار کر گیا ہے وہ خود بے حد

ناراض ہونے کے باوجود معاملے کو ختم کرنے کے خواہشمند تھے لیکن سکندر نہیں مان رہے تھے۔۔۔

امامہ نے دوبار سالار سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ایک دفعہ اس نے فون نہیں اٹھایا اور دوسری دفعہ اس نے فون بند کر دیا۔۔۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے اپنا سیل اسکی وجہ سے آف کیا تھا۔۔۔

کیوں پیروی نہ کروں اس کیس کی؟؟؟ انہیں چھوڑ دوں تاکہ اگلی بار وہ تمہیں شوٹ کر دے۔۔۔

اس نے ہسپتال سے پولیس سٹیشن جاتے ہوئے گاڑی میں سکندر سے کہا تھا۔۔۔ میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔۔۔

بات بڑھ چکی ہے اب اور اسکی ابتدا انہوں نے ہی کی ہے۔۔۔ سکندر بے حد مشتعل تھے۔۔۔ پاپا وہ امامہ کی فیملی ہے۔۔۔ اس نے بلا آخر کہا۔۔۔

نہیں۔۔۔۔ وہ امامہ کی فیملی تھی۔۔۔ اگر اسے امامہ کی پرواہ ہوتی تو اسکے شوہر پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتے۔ اور اگر انہیں پرواہ نہیں تو امامہ کو بھی انکی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔۔۔ بی ایک

حد تھی جو میں کبھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پار کرے لیکن انہوں نے یہ حد پار کر لی ہے۔ میری فیملی میں سے کسی کو تکلیف پہنچے گی تو میں ہاشم فیملی کو کسی سیف ہیون میں نہیں رہنے دوں گا میں انہیں انہی کی زبان میں جواب دوں گا یہ بات تم اپنی بیوی کو بتا بھی دو اور سمجھا بھی دو۔۔

پاپاپلیز اس ایشو کو حل ہونا چاہیے۔۔ سالار نے باپ سے کہا۔۔

یہ خواہش انکو کرنی چاہیے تب ہی یہ مسئلہ حل ہوگا۔ اسے میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی جرات کیسے ہوئی اسکا خیال ہے میں یہ غنڈہ گردی براشت کر لوں گا؟؟ اب وہ مجھے پولیس سٹیشن سے نکل کر دکھائے۔۔ انہیں ٹھنڈا کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

معاملہ کس حد تک بڑھ جائے گا اسکا اندازہ سالار کو نہیں تھا۔ یہ صرف دو بار سوخ فیملیز کا مسئلہ نہیں رہا تھا بلکہ یہ کمیونٹیز کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اسلام آباد پولیس کے تمام اعلیٰ افسران اس معاملے کو حل کرنے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہاشم مبین کو سب سے زیادہ مسئلہ ریسٹورنٹ کی انتظامیہ کی وجہ سے ہو رہا تھا جہاں یہ سب کچھ ہوا۔۔

ابتدائی غصے اور اشتعال کے بعد بلا آخر ہاشم فیملی نے واقعے کی سنگینی کو محسوس کرنا شروع

کر دیا مگر مسئلہ یہ ہو رہا تھا کہ سکندر فیملی کسی قسم کی لچک دکھانے کو تیار نہ تھے۔۔

فجر تک وہاں بیٹھنے کے بعد بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا اور وہ گھر واپس آگئے۔۔

سالار واپسی پر سارا رستہ سکندر کو کیس واپس لینے پر قائل کرتا رہا اور ناکام رہا۔۔

شاہنواز کے گھر گیٹ روم میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے پوچھا۔

ابو اور بھائی ریلیز ہو گئے؟؟ اسکا دماغ گھوم گیا تھا۔ واحد چیز جسکی امامہ کو پرواہ تھی وہ یہ

تھی کہ اسکے ابو اور بھائی ریدیکھا۔۔۔ اسکا زخم کیسا تھا۔ اسکی طبیعت کیسی

تھی۔ امامہ کو جیسے اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔۔ اور ہونگے بھی نہیں۔۔۔ وہ بے حد خفگی سے کہتا ہوا واش روم چلا گیا۔

۔۔۔ پین کلرز لینے کے باوجود اس وقت تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اسکی حالت واقعی

خراب تھی اور رہی سہی کسر امامہ کی عدم استحکام و جہی نے ہو رہی کر دی تھی۔۔۔

وہ پولیس سٹیشن میں ہیں /؟ اسکے واش روم سے نکلتے ہی اس نے سرخ سو جی ہوئی

آنکھوں کیساتھ اس سے پوچھا تھا۔۔۔ وہ جواب دیئے بغیر بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹ

گیا۔۔ اور آنکھیں بند کر لی۔۔

میں تمہیں تو الزام نہیں دے رہی میں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے خائف ہوتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔۔

کچھ میرے ساتھ بھی وفاداری کا مظاہرہ کرو۔۔۔ ویسی وفاداری جیسے تم اپنے باپ اور بھائیوں کے لیے دکھا رہی ہو۔۔۔ وہ بول نہیں سکی۔۔ اس نے جیسے اسے جو تا کھینچ مارا تھا۔۔ اسکا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔۔۔

وہ ایک لفظ کہے بغیر اسکے بستر سے اٹھ گی سالار نے آنکھیں بند کر لی۔۔

دوبارہ اسکی آنکھ ساڑھے بارہ بجے کندھے میں ہونے والی تکلیف سے کھلی۔ اسے ٹمپریچر بھی ہو رہا تھا۔ کندھے کو حرکت دینا مشکل ہو گیا تھا۔۔ بستر سے اٹھتے ہی اسکی نظر امامہ پر پڑی۔۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔۔ وہ ر کے بغیر واش روم چلا گیا ۔

نہا کر تیار ہونے کے بعد وہ باہر نکلا اور امامہ سے بات کیئے بغیر وہ بیڈ روم سے چلا گیا۔۔ اسے اپنا آپ وہاں اجنبی لگنے لگا تھا وہ واحد انسان تھا جو اسکی سپورٹ تھا اب وہ بھی اس سے برگشتہ ہو رہا تھا۔۔۔

میں کیس واپس لے رہا ہوں۔۔ لنچ ٹیبل پر بیٹھے اس نے اعلانیہ انداز میں

رسک تو کیس چلنے کی صورت میں بھی ہوگا۔۔۔ وہ جانتا تھا وہ جو کہہ رہا ہے اس سے پوری فیملی کی کتنی ملامت اسے ملنے والی تھی۔۔۔ وہ امامہ کو خوش کر سکتا تھا یا اپنی فیملی کو۔۔۔ اور اپنی فیملی کو ناخوش کرنا اسکے لیے زیادہ بہتر تھا۔۔۔

امامہ رات کے نو بجے تک ویسے ہی کمرے میں بیٹھی رہی۔۔۔ سالار کا کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ وہ تھکن کے عالم میں صوفے پر کب سوگی اُسے اندازہ نہیں ہوا۔۔۔

رات گئے اسکی آنکھ سالار کے کندھا ہلانے پر کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑاگی۔

اٹھ جاؤ ہمیں جانا ہے۔۔۔ وہ کمرے سے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ کچھ دیر بیٹھی آنکھیں رگڑتی رہی .

کیس واپس لے لیا ہے میں نے تمہاری فیملی ریلیز ہوگی ہے۔ وہ ٹھٹکی تھی۔

وہ بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔۔۔ کسی نے جیسے امامہ کے کندھوں سے منوں بوجھ ہٹا دیا

تھا۔۔۔ اسکے چہرے پر آنے والے اطمینان کو وہ نوٹس کیئے بغیر نہ رہ سکا۔۔۔

اسکے پیچھے باہر لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے ماحول میں موجود تناؤ اور کشیدگی محسوس

کی تھی۔۔۔ شاہنواز اور سکندر دونوں ہی بے حد سنجیدہ تھے اور طیبہ کے ماتھے پر شکنیں

بولو۔۔۔ بلا آخر اس نے کہا۔۔

زخم گہرا تو نہیں تھا؟؟ نزم آواز سے اس نے پوچھا تھا۔

کون سا والا؟؟ ٹھنڈے لہجے میں کیا ہوا سوال اسے لاجواب کر گیا۔۔۔

تمہیں درد تو نہیں ہو رہا؟؟

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوال بدلا تھا۔۔۔

اگر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔۔ میرا زخم ہے۔ میرا درد ہے۔۔

وہ پھر لاجواب ہوئی۔۔
NEW ERA MAGAZINE.COM
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry

بخار ہو رہا ہے تمہیں کیا؟؟ اسکا ہاتھ کندھے سے ہٹ کر پیشانی پہ گیا۔۔ اسکا ہاتھ

ہٹاتے ہوئے سالار نے بیڈ سائڈ لیپ آن کر دیا۔

اما تم وہ کیوں نہیں پوچھتی جو پوچھنا چاہتی ہو؟؟ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

اس نے۔

وہ چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔۔

ابو سے کیا بات ہوئی تمہاری؟؟

اس نے جواب میں ہاشم مبین کی گالیوں کو بے حد بلنٹ انداز میں انگلش میں ٹرانسلیٹ کیا۔۔ امامہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔

میں گالیوں کا نہیں پوچھ رہی ویسے کیا کہا تھا انہوں نے۔۔

امامہ نے خفگی سے اسکی بات کاٹ دی۔۔

اوہ سوری۔۔ انکی گفتگو میں ستر فیصد گالیاں تھی اور کتنا ایڈیٹ کرونگا۔۔ باقی باتوں میں انہوں نے مجھے کہا کہ میں سوری ہوں لیکن کتے کی موت کروں گا اور جو کچھ میں نے انکی بیٹی کیساتھ کیا وہ میری بیٹی اور بہن کیساتھ ہو۔۔ اسکے لیے وہ خصوصی طور پہ بددعا فرمائیں گے۔۔ تمہارے لیے بھی انکے کچھ پیغامات ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں کہ تمہیں بتا سکوں۔۔ یہ تھی انکی گفتگو۔۔ وہ نم آنکھوں کیساتھ گنگ بیٹھی اسکا چہرہ دیکھتی رہی۔

انہوں نے تم سے ایکسکیوز نہیں کی؟ بھرائی آواز میں اس نے پوچھا۔

کی تھی انہوں نے۔۔ انہیں بڑا افسوس تھا کہ اس وقت انکے پاس کوئی پستل کیوں

نہیں تھا یا کوئی اچھا والا چاقو۔۔ کیونکہ وہ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر بے حد ناخوش
تھے۔۔ اسکا لہجہ طنزیہ تھا۔۔

پھر تم نے کیس کیوں ختم کر دیا۔۔؟؟

تمہارے لیئے کیا۔۔ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی۔

میں تم اور تمہاری فیملی سے کتنی شرمندہ ہوں میں بتا نہیں سکتی۔۔ اس سے تو اچھا تھا وہ
مجھے مار دیتے۔۔۔

میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟؟ وہ سنجیدہ تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔۔ لیکن تم مجھ سے ٹھیک طرح بات نہیں کر رہے کوئی بھی نہیں کر رہا۔

میں کل رات سے خوار ہو رہا تھا مجھے تو تم رہنے دو مجھے اس حوالے سے تم سے کوئی

شکایت نہیں لیکن جہاں تک میری فیملی کا تعلق ہے تو وہ تھوڑا بہت توری ایکٹ

کریں گے۔۔۔ یہ فطری بات ہے۔۔ دو چار ہفتے گزر جائیں پھر سب ٹھیک ہو جائیں

گے۔۔ اس نے رسائیت سے کہا۔۔

امامہ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

میری کوئی عزت نہیں کرتا۔۔۔

سالار نے اسکی بات کاٹ دی۔۔ یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔۔ کسی نے تم سے کچھ کہا؟؟ پاپا
نے؟ مہی نے کسی اور نے؟

کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن۔۔۔۔۔

سالار نے پھر اسکی بات کاٹ دی۔۔ اور کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں تم سے۔ جس دن تم
سے کوئی کچھ کہے تب کہنا کہ تمہاری عزت نہیں کرتا کوئی۔۔۔ وہ بے حد سنجیدہ

تھا۔۔۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
میں تمہیں کبھی اپنے باپ کے گھر بھی نہیں لیکر آتا اگر مجھے یہ حدشہ ہوتا کہ تمہیں

عزت نہیں ملے گی۔ تم سے شادی جیسے بھی ہوئی تھی تم میری بیوی ہو اور ہمارے
سرکل میں ایسا کوئی نہیں جو یہ بات نہیں جانتا۔۔

اب یہ رونادھونا بند کر دو۔۔۔ اس نے قدرے جھڑکنے والے انداز میں کہا۔

ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ ہے۔۔ سو جاؤ اب۔ اس نے آنکھیں بند کر لی وہ اسکا چہرہ
دیکھنے لگی۔۔ کچھ بھی کہے بنا وہ اس کے سینے پہ سر رکھ کر لیٹ گئی یہ پرواہ کیئے بغیر کہ اس کے

سر رکھنے سے اسکے کندھے میں تکلیف ہو سکتی ہے۔۔ وہ جانتی تھی وہ اسے کبھی نہیں ہٹائے گا۔۔ اور سالار نے اسکو نہیں ہٹایا۔۔ بازو سے گرد جھائل کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے لائٹ آف کر دی۔۔

مئی ٹھیک کہتی ہے۔۔ اس کے سینے پہ سر رکھے اس نے سالار کو بڑ بڑاتے سنا۔۔
کیا؟؟؟ وہ چونکی۔۔

تم نے مجھ پر جادو کیا ہوا ہے۔۔ وہ ہنس پڑی۔۔

NEW ERA MAGAZINE &
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اس واقعے کے چند ہفتوں بعد وہ لاہور میں بھی بڑے محتاط رہے لیکن آہستہ آہستہ ہر ڈر اور خوف ختم ہونے لگا۔ امامہ کی فیملی کی طرف سے اس بار اس طرح کی دھمکیاں بھی نہیں ملی تھی جیسی امامہ کے چلے جانے کے بعد وہ سکندر کو دیتے تھے۔۔

پولیس سٹیشن میں تصفیہ کے دوران سکندر نے ہاشم مبین کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ سالار اور امامہ کو کسی بھی طرح پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری وہ ہاشم کے خاندان کے علاوہ کسی پہ نہیں ڈالے گے۔۔

سالار نے ٹھیک کہا تھا کچھ عرصہ بعد انکی فیملی کا رویہ بھی امامہ کیساتھ ٹھیک ہو گیا طیبہ کی تلخی بھی ختم ہوگی اور اس میں زیادہ ہاتھ امامہ کا ہی تھا وہ فطرتاً صلح جو اور فرمانبرار تھی اور احسان مند ہونے کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ اس انسان کی فیملی تھی جو اسے سر پہ آٹھائے پھرتا تھا۔

*****-----*****

کوئی وسیم ہاشم صاحب ملنا چاہتے ہیں آپ سے۔۔ اپنی آفس کی کرسی میں جھولتا سالار ایک دم ساکت ہو گیا۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کہاں سے آئے ہیں؟؟

اسلام آباد سے۔۔ کہہ رہے ہیں کہ آپکے دوست ہیں۔ ریسپنشنٹ نے مزید بتایا۔۔

بھیج دو۔۔۔ اس نے انٹر کام رکھ دیا اور خود سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وسیم کے آنے کا وہاں مقصد کیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا

تب وسیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں ساکت ہوئے۔۔ پھر سالار نے ہاتھ بڑھایا۔ ایک طویل عرصے کی بعد دونوں کی ہونے والی

یہ پہلی ملاقات تھی۔۔

کیا لوگے؟ چائے؟ کافی؟ سالار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ نہیں۔۔۔ میں صرف چند منٹ کے لیے آیا ہوں۔۔۔ وسیم نے جواباً کہا۔۔۔ وہ دونوں کسی زمانے میں گہرے دوست تھے لیکن اس وقت انکو اپنے درمیان موجود تکلف کی دیوار کو ختم کرنا بالکل مشکل لگ رہا تھا۔

سالار نے دوبارہ کچھ پوچھنے کی بجائے انٹرکام اٹھا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔۔۔

امامہ کیسی ہے؟؟ اسکے ریسپورر رکھتے ہی وسیم نے پوچھا۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

شی از فائن۔۔۔ سالار نے نارمل انداز میں جواب دیا۔۔۔

میں اس سے ملنا چاہتا تھا تمہارے گھر کا ایڈریس تھا میرے پاس لیکن میں تم سے پوچھنا

چاہتا تھا۔۔۔ وسیم نے جتانے والے انداز میں کہا۔۔۔

ظاہر ہے تمہیں یہ پتا چل سکتا ہے کہ میں کہاں کام کرتا ہوں تو ہوم ایڈریس معلوم کرنا

زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سالار نے معمول کے انداز میں کہا۔۔۔

میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔۔۔۔۔ وسیم نے کہا۔۔۔

مناسب تو شاید نہ لگے لیکن پھر بھی پوچھوں گا۔۔۔ کس لیے۔۔۔؟؟ سالار نے جواباً فرینک انداز میں کہا .

کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس . وسیم نے جواباً کہا۔ اس دن ریسٹورنٹ میں جو چٹ۔۔۔۔

وہ تم نے بھیجی تھی میں جانتا ہوں۔۔ سالار نے اسکی بات کاٹی تھی۔ وسیم ایک لمحے کے لیے بول نہ سکا۔۔

تم نے اور امامہ نے جو کچھ کیا وہ بہت غلط کیا۔ لیکن اب جو بھی ہو اوہ ہو چکا۔۔ میں امامہ سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔

تمہاری فیملی کو پتا ہے؟ سالار نے پوچھا۔۔

نہیں۔۔۔ انہیں اگر پتا چل گیا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔۔ سالار اسکا چہرہ دیکھ رہا تھا سچ اور جھوٹ جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکی نیت کیا تھی وہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اور امامہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے وہ یہ جانتا تھا۔ لیکن سالار کے لیے پھر بھی یہ مشکل تھا کہ اسے ملنے کی اجازت دے .

وسیم میں نہیں سمجھتا کہ اب اسکا کوئی فائدہ ہے۔ امامہ میرے ساتھ خوش ہے اپنی زندگی میں سیٹلڈ ہے۔ میں نہیں چاہتا وہ اپ سیٹ ہو جائے یا اسے کوئی نقصان پہنچے۔۔۔

میں ناتوا سے اپ سیٹ کرنا چاہتا ہوں نا ہی اسے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں بس کبھی کبھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وسیم نے بے تابی سے کہا۔۔

میں اس پر سوچوں گا وسیم لیکن یہ بڑا مشکل ہے۔۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں استعمال کر کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وسیم نے اسکی بات کاٹ دی۔۔

میں بھی نہیں چاہتا کہ اسے کوئی نقصان پہنچے۔ ایسی کوئی خواہش ہوتی تو اتنے سالوں میں تم سے پہلے رابطہ کر لیا ہوتا۔ میں جانتا تھا وہ شادی کر کے تمہارے ساتھ گی تھی۔ تم انوالوڈ تھے پورے معاملے میں لیکن میں نے فیملی کو یہ نہیں بتایا۔۔

سالار ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے کہا۔۔ وہ اتنے عرصے سے میرے ساتھ نہیں تھی۔۔۔۔۔۔

نہیں ہوگی۔۔ لیکن وہ تم سے شادی کر کے گی تھی۔ یہ میں جانتا تھا۔۔

میں سوچوں گا وسیم۔۔۔ سالار نے بحث کرنے کی بجائے پھر وہی جملہ دہرایا۔۔۔ وسیم مایوس ہوا تھا۔۔۔

میں دو دن کے لیے ہوں لاہور میں۔۔۔ اور یہ میرا کارڈ ہے۔ میں اس سے واقعی ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ وسیم نے کارڈ اسکے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اس رات وہ خلاف معمول کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ امامہ نے نوٹس کیا لیکن وجہ معلوم نہیں تھی اسکو۔

وہ کھانے کے بعد کام کرنے کے لیے معمول کے مطابق اسٹڈی میں جانے کی بجائے اسکے پاس آکر لاؤنج میں بیٹھ گیا۔۔۔ پانچ دس منٹ کی خاموشی کے بعد امامہ نے بلا آخر ایک گہرا سانس لیکر اسے کہتے سنا۔۔۔

امامہ۔۔۔۔۔ اگر تم وعدہ کرو کہ تم خاموشی اور تحمل سے میری بات سنو گی آنسو بہائے بغیر تو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔

وہ چونک کر اسکی طرف متوجہ ہوئی۔ کیا کہنا ہے؟ وہ کچھ حیران تھی۔۔۔

وسیم تم سے ملنا چاہتا ہے۔۔۔ اس نے بلا تمہید کہا۔۔۔

وہ ہل نہ سکی۔۔۔ وسیم۔۔۔ میرا بھائی؟؟ امامہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ سالار نے سر

ہلا دیا اور اسکو اپنی آج کی ملاقات کی تفصیلات بتانے لگا اور اس دوران برسات شروع ہو چکی تھی۔۔

سالار نے بے حد تحمل کا مظاہرہ کیا۔۔ اسکے علاوہ وہ اور کس چیز کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔۔۔
تم نے کیوں اسے یہاں آنے نہیں دیا۔۔ تم اسے ساتھ لیکر آتے۔ اس نے ہچکیوں میں روتے ہوئے اسکی بات کاٹی۔۔

مجھے پتا تھا وسیم مجھے معاف کر دے گا وہ بھی مجھے اتنا مس کرتا ہو گا جتنا میں اسکو مس کرتی ہوں۔۔ میں تم سے کہتی تھی نا کہ وہ۔۔۔۔۔ سالار نے اسکی بات کاٹی۔۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
جذبائی ہونے کی ضرورت نہیں ہے امامہ۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیوں ملنا چاہتا ہے تم سے لیکن اسکے تمہارے ساتھ ملنے سے بڑے نقصان دہ نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔۔ سالار اسکے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا تھا۔۔ وہ وسیم کے حوالے سے واقعہ خدشات کا شکار تھا۔۔

کچھ نہیں ہو گا۔۔ مجھے پتا ہے کچھ نہیں ہو گا۔۔ وہ بہت اچھا ہے۔۔ تم اسے فون کر کے ابھی بلا لو۔

میں اسے کل بلواؤں گا لیکن وہ اگر کبھی اکیلے یہاں آنا چاہے یا تمہیں کہی بلائے تو تم نہیں جاؤ گی۔۔ سالار نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔

اور میں ایک بار پھر دہرا رہا ہوں نہ وہ یہاں اکیلا آئے گا نہ تم اس کے فون کرنے پہ کہی جاؤ گی۔۔ سالار نے بڑی سختی سے اسے تاکید کی۔

میں اسکے بلانے پہ کہی نہیں جاؤں گی لیکن اسکے یہاں آنے پر کیوں اعتراض ہے تمہیں۔۔؟؟ اس نے احتجاج کیا۔

وہ میرے گھر پر ہوتے ہوئے آئے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اکیلا یہاں نہ آئے وہ تو خیر میں نیچھے سیکورٹی والوں کو بھی بتا دوں گا۔

وہ میرا بھائی ہے سالار۔۔۔ امامہ کو بے عزتی محسوس ہوئی۔

جانتا ہوں، اسی لیے تم سے یہ سب کہہ رہا ہوں میں تمہارے حوالے سے اس پر یا کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔۔

لیکن،،،،،

تم مجھے صرف یہ بتاؤ تمہیں اس سے ملنا ہے یا نہیں۔۔۔ اگر تمہیں بحث کرنی ہے اس

ایشوپر تو بہتر ہے و سیم آئے ہی نا۔۔ سالار نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔۔

ٹھیک ہے میں اسے اکیلے نہیں بلاؤں گی یہاں۔۔ امامہ نے گٹھنے ٹیک دیئے۔۔

مجھے اس سے فون پر بات کرنی ہے۔۔ سالار نے کچھ کہنے کی بجائے و سیم کا وز ٹنگ

کارڈ لا کر اسے دیا۔۔ وہ خود اسٹڈی میں چلا گیا۔۔ چند بار بیل ہونے ہر و سیم نے فون

اٹھایا تھا اور اسکی آواز سننے پر امامہ کے خلق میں آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔

ہیلو۔۔۔ میں امامہ ہوں۔۔

و سیم دوسری طرف کچھ دیر بول نہ سکا اسکی آواز بھرانے لگی تھی وہ دو گھنٹے ایک

دوسرے کیساتھ بات کرتے رہے تھے۔ و سیم شادی کر چکا تھا اور اسکے تین بچے تھے وہ

بہتے آنسوؤں کیساتھ یہ سب سنتی رہی۔۔

سالار دو گھنٹے بعد اسٹڈی سے نکلا تھا وہ اس وقت بھی فون کان سے لگائے سرخ آنکھوں

کیساتھ فون پر و سیم سے گفتگو میں مصروف تھی۔۔ وہ اسکے پاس سے گزر کر بیڈ روم گیا

تھا۔ اور امامہ نے ایک بار بھی اسے سراٹھا کر نہیں دیکھا۔۔ وہ اسکا انتظار کرتے کرتے

سو گیا۔۔ فجر کی نماز کے لیے جب وہ مسجد جانے کے لیے اٹھا تو وہ اس وقت بھی بستر پر

نہیں تھی۔ لاؤنج میں آتے ہی وہ کچھ دیر کے لیے ہل نہ سکا۔۔ وہاں کا انٹیریر راتوں رات بدل چکا تھا۔۔

تم ساری رات یہ کرتی رہی ہو؟؟ سالار پانی پینے کے لیے کچن میں گیا تھا۔ تو اس نے کچن کے فرش کو کیبنٹ سے نکالی گی چیزوں سے بھرا ہوا پایا۔ اسکا دماغ گھوم کر رہ گیا۔۔ کیا؟؟ وہ اسی طرح کام میں مصروف اطمینان سے بولی۔۔

تمہیں پتا ہے، کیا کرتی رہی ہو تم۔۔ سالار نے پانی کا گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پہ رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔۔ بیرونی دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت واپس آیا تھا۔۔۔

امامہ۔۔۔ آج سنڈے ہے اور میں ابھی مسجد سے آکر سوؤں گا۔ خبردار تم نے بیڈروم کی صفائی اس وقت شروع کی۔

پھر میں کس وقت صفائی کروں گی بیڈروم کی۔۔۔ میں نے وسیم کو لنچ پہ بلوایا ہے۔۔ امامہ نے پلٹ کر کہا۔۔ سالار کی چھٹی حس نے بروقت کام کیا تھا۔۔۔ بیڈروم کی صفائی کا وسیم کے لنچ کیساتھ کیا تعلق ہے؟ وہ حیران ہوا تھا۔ تم نے اسے

بیڈروم میں بٹھانا ہے؟؟

نہیں۔۔۔ لیکن،،، وہ اٹکی تھی۔۔۔

امامہ بیڈروم میں کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ مجھے سونا ہے آکر ابھی۔۔۔ اس نے امامہ کو ایک بار پھر یاد دہانی کرائی تھی۔۔۔

یہ سامان لادینا مجھے سونے سے پہلے، کھانے کی تیاری کرنی ہے مجھے۔۔۔ امامہ نے کاؤنٹر پہ پڑی ایک لسٹ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔

میں فجر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں اور یہ سامان تمہیں سو کر اٹھنے کے بعد لا کر دوں گا۔۔۔ وہ لسٹ کو ہاتھ لگائے بغیر چلا گیا۔۔۔

تمام حدشأت کے باوجود واپسی پر اس نے اپنے بیڈروم کو اسی حالت میں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔۔۔

اس نے دس بجے مطلوبہ اشیاء لا کر دی تھیں۔۔۔ کچن تب تک کسی ہوٹل کے کچن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔۔۔ وہ پتا نہیں کون کونسی ڈشز بنا رہی تھی۔ وہ کم از کم 25 افراد کا کھانا تھا۔۔۔ جو وہ اپنے بھائی کے لیے بنا رہی تھی۔ سالار نے اسے کوئی نصیحت نہیں کی

-- وہ لاؤنج میں بیٹھا نگلش لیگ کا کوئی میچ دیکھتا رہا۔۔

و سیم دو بجے آیا تھا اور دو بجے تک امامہ کو گھر میں کسی مرد کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔

و سیم کا استقبال اس نے سالار سے بھی پہلے دروازے پر کیا تھا۔ بہن اور بھائی کے درمیان ایک جذباتی سین ہوا۔۔

اسکے بعد ساڑھے چھ بجے تک و سیم کی موجودگی میں وہ ایک خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا رہا۔۔ وہ کھانے کی ٹیبل پر موجود تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسکا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ امامہ کو بھائی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ امامہ نے کھانے کی ٹیبل پر اسے کچھ سرو بھی نہیں کیا۔

و سیم کے جانے کے بعد سالار کی توقع کے عین مطابق بچا ہوا تقریباً سارا کھانا ملازمہ فرقان اور چند دوسرے گھروں میں بھیج دیا گیا۔۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تو وہ اسکے لیے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا کر خود سو رہی تھی۔۔ وہ ویک اینڈ پر رات کا کھانا ہمیشہ باہر کھاتے تھے۔۔

اس نے پہلی بار امامہ کے گھر پہ موجودگی کے باوجود اکیلے ڈنر کیا اور وہ بری طرح پچھتایا
و سیم کو امامہ سے ملنے کی اجازت دے کر

*****_****_*_*_*_*_*_**

امامہ۔۔۔۔۔ یہ و سیم نامہ بند ہو سکتا ہے اب۔۔۔؟؟ وہ تیسرا دن تھا جب ڈنر پر بلا آخر سالار
کی قوت برداشت جواب دے گی تھی۔

کیا مطلب؟؟ وہ حیران ہوئی تھی۔

مطلب یہ کہ دنیا میں و سیم کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں جنکی تمہیں پرواہ کرنی چاہیے
۔۔ سالار نے ان ڈائریکٹ انداز میں کہا۔۔۔

مثلاً کون؟؟ اس نے جواباً اتنی سنجیدگی سے پوچھا تھا کہ وہ کچھ بول نہ سکا۔۔

اور کون ہے جسکی مجھے پرواہ کرنی چاہیے۔۔ وہ اب بڑبڑاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تم گھر پہ توجہ دو اب۔۔

وہ اب اسکے علاوہ اور کیا کہتا۔۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پہ توجہ دو۔۔

گھر کو کیا ہوا؟؟ وہ مزید حیران ہوئی۔۔ وہ اس بار مزید کوئی تاویل نہ دے سکا۔۔

تمہیں میرا وسیم کے بارے میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا؟؟ اس نے یکدم جیسے اندازہ لگایا۔۔ اسکے لہجے میں ایسے بے یقینی تھی کہ وہ ہاں نہ کہہ سکا۔۔۔

میں نے کب کہا کہ مجھے برا لگتا ہے۔۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں تمہیں۔ وہ بے ساختہ بات بدل گیا۔

ہاں میں بھی یہ سوچ رہی تھی تم ایسا کیسے سوچ سکتے ہو وہ تمہارا بیسٹ فرینڈ ہے۔۔ وہ یکدم مطمئن ہوئی۔

سالارا اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ وہ اسکا فرینڈ ہے نہیں کبھی تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا وہ۔۔

سالارا کھانا کھاتے کھاتے رکا۔۔ میرے بارے میں کیا؟؟

سب کچھ۔۔ وہ روانی سے بولی۔۔

سالارا کے پیٹ میں گرہیں سی پڑی۔۔ سب کچھ کیا؟؟ مطلب جو بھی تم کرتے تھے۔

سالارا کی بھوک اڑی تھی۔

مثلاً کیا؟؟؟ وہ پتا نہیں اپنے کن حدشات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔۔ وہ سوچ میں پڑی۔۔

جیسے تم جن سے ڈر گزرتے تھے انکے بارے میں،، اور جب تم لاہور میں اپنے کچھ دوسرے دوستوں کیساتھ ریڈلائٹ ایریا گئے تھے۔۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ پانی پیتے ہوئے سالار کو اچھو کا لگا۔

تمہیں اس نے بی بھی بتایا ہے کہ میں۔۔۔۔۔ سالار خود بھی اپنا سوال پورا دہرانہ سکا۔۔۔

جب بھی جاتے تھے تو بتاتا تھا۔۔

سالار کے منہ سے بے اختیار و سیم کے لیے زیر لب گالی نکلی تھی اور امامہ نے اس کے ہونٹوں کی حرکت کو پڑھا تھا۔۔ وہ بری طرح اپ سیٹ ہوئی

تم نے اسے گالی دی ہے؟؟ اس نے شاکڈ ہو کر سالار سے کہا۔۔

ہاں وہ سامنے ہوتا تو میں اسکی دو چار ہڈیاں بھی توڑ دیتا۔ وہ اپنی بہن سے یہ باتیں جا کر کرتا تھا۔

میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔ وی واقعی بری طرح برہم ہوا۔ سب کچھ کی دو جھلکیوں نے اسے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے تھے۔ امامہ اس کے بارے میں کیا کچھ جانتی ہے اسکا

اندازی اسے آج ہوا۔۔۔

تم میرے بھائی کو دوبارہ گالی مت دینا۔ امامہ کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا۔ وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔ سالار کچھ کہنے کی بجائے بے حد خفگی سے کھانے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔۔۔

وہ تقریباً دو گھنٹے بعد بیڈ روم میں سونے کے لیے آئی تھی۔۔۔ وی اس وقت معمول کے مطابق اپنی ای میلز چیک کرنے میں مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔۔۔

میں نے وسیم کو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم اس طرح ناراض ہو کر بیٹھو۔۔۔

سالار نے مفاہمت کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔۔۔۔۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی رہی۔۔۔

امامہ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ سالار نے کمبل کھینچا تھا۔۔۔

تم اپنے چھوٹے بھائی عمار کو وہی گالی دے کر دکھاؤ۔ اس کے تیسری بار کمبل کھینچنے پر وہ بے حد خفگی سے اسکی طرف کروٹ بدل کر بولی۔

سالار نے بلا توقف وہی گالی عمار کو دی۔ چند لمحوں کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے اس سے۔ اگر دنیا میں ڈھٹائی کی کوئی معراج تھی تو وہ سالار تھا۔

میں پاپا کو بتاؤں گی۔ امامہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

تم نے کہا تھا عمار کو گالی دینے کو۔ ویسے تمہارے بھائی کو اس سے زیادہ خراب گالیاں میں اسکے منہ پر دے چکا ہوں اور اس نے کبھی مائنڈ نہیں کیا۔ اگر تم چاہو تو اگلی بار جب وہ یہاں آئے تو میں تمہیں دکھا دوں گا۔

وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی تھی۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 تم و سیم کو یہاں میرے سامنے گالیاں دو گے؟؟ اسے بے حد رنج ہوا تھا۔

جو کچھ اس نے کیا ہے میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسے گالیاں ہی دیتا اور وہ بھی اس سے بری۔ سالار نے لگی لپٹی کے بغیر کہا۔

لیکن چلو آئی ایم سوری۔۔ وہ اسکی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

سکندر ٹھیک کہتے تھے انکی یہ اولاد سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔

لیکن پاپا۔۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں میری کوئی بات نہیں ٹالتے ہر خواہش پوری

کرتے ہیں۔۔۔

اس نے ایک بار سکندر کے پوچھنے پر کی وہ اسکا خیال رکھتا تھا کہ جواب میں سالار کی تعریف کی تھی۔۔۔

امامہ یہ جو تمہارا شوہر ہے یہ اللہ نے اس دنیا میں صرف ایک پیس پیدا کیا ہے تیس سال میں نے باپ کے طور پر جس طرح اسکے ساتھ گزارے ہیں وہ میں ہی جانتا ہوں۔۔۔ یہ تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے اور تمہیں کبھی پتا بھی نہیں چلے گا۔۔۔ اس نے جو کرنا ہوتا ہے وہ کر کے ہی رہتا ہے چاہے ساری دنیا ختم ہو جائے اسے سمجھا سمجھا کر اور کبھی اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ یہ تمہاری بات مان کر اپنی مرضی نہیں کریگا۔۔۔ سالار سر جھکائے مسکرا کر باپ کی باتیں سنتا رہا۔ اور امامہ کچھ الجھی ہوئی کبھی اسے اور کبھی سکندر کو دیکھتی۔ آہستہ آہستہ چل جائے گا۔ تمہیں پتا کہ سالار کیا چیز ہے۔۔۔

یہ پانی میں آگ لگانے والی گفتگو کا ماہر ہے۔

تمہارا امہریشن بہت خراب ہے پاپا۔۔۔ تمہیں کوئی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔۔۔

کیسی وضاحت؟؟ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ تمہیں انکی باتیں غور سے سنا چاہیے تھی۔

وہ تب بھی اسکا منہ دیکھتی رہ گی تھی اور اب بھی۔۔۔

آئی ایم سوری۔۔ وہ پھر کہہ رہا تھا۔

تم شرمندہ تو نہیں ہو۔۔ اس نے اسے شرمندہ کرنے کی آخری کوشش کی۔

ہاں وہ تو میں نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ تمہیں میرا سوری کرنا اچھا لگتا ہے اس لیے آئی ایم سوری۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اس نے تپانے والی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔ امامہ جواب دینے کی بجائے بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑاپانی کا پورا گلاس پی لیا اور دوبارہ کنبل کھینچ کر لیٹ گی۔

پانی اور لادوں؟؟ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔۔ امامہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔۔

وہ نیند میں سیل فون کی آواز پہ بڑبڑائی تھی۔۔ وہ سالار کا سیل فون تھا۔۔

ہیلو۔۔۔ سالار نے نیند میں کروٹ لیتے ہوئے کال ریسیو کی۔ امامہ نے دوبارہ

آنکھیں بند کر لی۔

ہاں بات کر رہا ہوں۔۔ اس نے سالار کو کہتے سنا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ یکدم بستر سے نکل گیا تھا۔۔ امامہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے نیم تاریکی میں اسے دیکھنے کی کوشش کی وہ لائٹ آن کیے بغیر اندھیرے میں ہی لاؤنج میں چلا گیا تھا۔

وہ کچھ حیران ہوئی تھی وہ کس کا فون ہو سکتا ہے۔ جسکے لیے وہ رات کے اس پہریوں اٹھ کر کمرے سے باہر گیا تھا۔

ایک جینز اور شرٹ پیک کر دو میری۔۔ مجھے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے ابھی۔۔

کیوں خیریت تو ہے؟؟ وہ پریشان ہو گی تھی۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 سکول میں آگ لگ گئی ہے۔

اسکی نیند پلک جھپکتے غائب ہو گی تھی۔

سالار اب دوبارہ فون پر بات کر رہا تھا بے حد تشویش کے عالم میں کمرے میں واپس آ کر اس نے اسکا بیگ تیار کیا وہ تب تک کمرے میں واپس آچکا تھا۔

آگ کیسے لگی؟؟

بی تو وہاں جا کر پتا آیا۔

ے گا۔۔ وہ بے حد عجلت میں اپنے کپڑے لیکر واش روم چلا گیا۔ وہ بیٹھی رہی وہ اسکی پریشانی کا اندازہ کر سکتی تھی۔۔۔

دس منٹ میں تیار ہو کر وہ نکل گیا اور امامہ نے باقی ساری رات اسی پریشانی میں دعائیں کرتے ہوئے کاٹی۔۔

سالار کے گاؤں پہنچنے کے بعد بھی آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا۔۔ وجہ بروقت فائر بریگیڈ کا دستیاب نہ ہونا تھا اور اسکا اتنے گھنٹوں تک نہ بجھ پانے کا کیا مطلب تھا وہ امامہ سمجھ چکی تھی۔۔

وہ پورا دن جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھر میں پھرتی رہی۔ سالار نے اسے بلا آخر آگ پر قابو پانے کی اطلاع دے دی۔ مگر ساتھ یہ بھی کہ وہ اسکورات کو فون کریگا اور اس رات وی اسلام آباد میں رہنے والا تھا۔۔

سالار سے آدھی رات کے قریب اسکی بات ہوئی وہ آواز سے اتنا تھکا ہوا لگ رہا تھا کہ امامہ نے اس سے زیادہ دیر بات کرنے کی بجائے سونے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔۔ لیکن وہ خود ساری رات سونہ سکی۔۔ آگ عمارت میں لگائی گئی تھی۔۔ وہاں پولیس کو ابتدائی طور پر ایسے شواہد ملے تھے۔ اور یہ بات امامہ کی نیند اور حواس باطل کرنے کے لیے

کافی تھی۔۔

وہ صرف سالار کا سکول نہیں تھا وہ پورا پورا پروجیکٹ اب ایک ٹرسٹ کے تحت چل رہا تھا۔ جسکی مین ٹرسٹی سالار کی فیملی تھی۔۔

اور اس پروجیکٹ کو اس طرح کا نقصان ایک دم کون پہنچا سکتا ہے؟؟

یہی وہ سوال تھا جو اسے ہولار ہا تھا۔۔

اگلی رات کو وہ گھر پہنچا اور اسکے چہرے پر تھکن کے علاوہ اور کوئی تاثر نہیں تھا۔ امامہ کو جیسے حوصلہ ہوا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

بلڈنگ کے سٹرکچر کو نقصان پہنچا ہے جس کمپنی نے بلڈنگ بنائی ہے وہ کچھ ایگزامن کر رہے ہیں اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔۔ شاید بلڈنگ گرا کر دوبارہ بنانی پڑ جائے۔۔

کھانے کی ٹیبل پر امامہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔۔

بہت نقصان ہوا ہو گا۔۔ یہ سوال احمقانہ تھا لیکن امامہ کو اس باختہ تھی۔۔

ہاں۔۔۔۔۔ جواب مختصر تھا۔

سکول بند ہو گیا؟؟ ایک اور احمقانہ سوال۔۔

نہیں۔۔۔ گاؤں کے چند گھر فوری طور پر خالی کروائے ہیں اور کرائے پر لیکر سکول کے مختلف بلاکس کو شفٹ کیا ہے وہاں پر۔۔۔ ابھی کچھ دنوں میں سمربریک آجائے گی تو بچوں کا زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔۔۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بتا رہا تھا۔

اور پو پو لیس نے کیا کہا؟؟؟ ادھر ادھر کے سوالوں کے بعد امامہ نے بلاآخر وہ سوال کیا جو اسے پریشان کیئے ہوئے تھا۔

ابھی تفتیش شروع ہوئی ہے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔۔۔ سالار نے گول مول بات کی تھی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ دو دن اسلام آباد میں وہ اپنی فیملی کے ہر فرد سے اس کیس کے مشتبہ افراد میں امامہ کی فیملی کو شامل کرنے کے لیے دباؤ کا سامنا کرتا رہا تھا۔

اب کیا ہوگا؟؟؟ تیسرا حتمی سوال۔۔۔

سب کچھ دوبارہ بنانا پڑے گا اور بس۔۔۔ جواب اتنا ہی سادہ تھا۔۔۔

اور فنڈز۔۔۔۔۔ وہ کہاں سے آئینگے۔؟؟؟ یہ پہلا سمجھدارانہ سوال تھا۔

انڈوومنٹ فنڈ ہے سکول کا۔۔۔ اسکو استعمال کریں گے کچھ انویسمنٹ کی ہے میں نے وہاں

سے رقم نکلاؤں گا۔ وہ اسلام آباد کا پلاٹ بیچ دوں گا۔۔۔ فوری طور پر تو تھوڑا بہت

کر لوں گا۔۔

پلاٹس کیوں؟؟ وہ بری طرح بد کی تھی۔۔ امامہ نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ پلاٹس نہیں پلاٹ کہہ رہا تھا۔۔

اس سے فوری طور پر رقم مل جائے گی۔ بعد میں لے لوں ابھی تو مجھے اس میس سے نکلنا ہے۔۔

تم وہ حق مہر کی رقم لے لو، آٹھ دس لاکھ کے قریب ویڈنگ پر ملنے والی گفٹ کی رقم بھی ہوگی اور اتنے ہی میرے اکاؤنٹ میں پہلے سے بھی ہونگے۔ پچاس ساٹھ لاکھ تو یہ ہو جائے گا اور۔۔۔۔۔ سالار نے اسکی بات کاٹی۔۔

یہ میں کبھی نہیں کروں گا۔۔

قرض لے لو مجھ سے بعد میں دے دینا۔

نو۔۔۔ اسکا انداز ختمی تھا۔۔

میرے پاس بے کار پڑے ہیں سالار تمہارے کام آئیں گے تو۔۔۔۔۔ اس نے پھر امامہ کی بات کاٹ دی۔

میں نے کہا نا نہیں۔۔۔۔۔ اس نے اس بار ترشی سے کہا۔

میرے پیسے اور تمہارے پیسے میں کوئی فرق ہے کیا؟؟

ہاں ہے۔۔۔ اس نے اسی انداز میں کہا۔۔

وہ حق مہر اور شادی پر گفٹ میں ملنے والی رقم ہے میں کیسے لے لوں تم سے۔۔ میں بے

شرم ہو سکتا ہوں لیکن بے غیرت نہیں۔۔

اب تم خواہو مجھ جاتی ہو رہے ہو اور۔۔۔۔۔

سالار نے اسکی بات کاٹی۔۔ کون جذباتی ہو رہا ہے۔۔ کم از کم میں تو نہیں ہو رہا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔۔

میں تمہیں قرض دے رہی ہوں سالار۔۔

بہت شکریہ۔ مگر مجھے اسکی ضرورت نہیں۔۔ مجھے قرض لینا تو بڑے دوست ہیں

میرے پاس۔

دوستوں سے قرض لوگے بیوی سے نہیں؟؟

نہیں۔۔۔۔

میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں سالار۔۔

ایمو شنلی کرو فنانشلی نہیں۔

وہ اسے دیکھتی رہ گی۔ اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح قائل کرے۔۔

اور اگر میں یہ رقم ڈونیٹ کرنا چاہوں تو؟؟؟ اسے بلا آخر ایک خیال آیا۔

ضرور کرو۔۔۔ اس ملک میں بہت سارے خیراتی ادارے ہیں۔۔ تمہارا پیسہ ہے چاہے

آگ لگا دو۔ لیکن میں یا میرا ادارہ نہیں لے گا۔ اس نے ختمی انداز میں کہا۔۔۔

تم مجھے کچھ ڈونیٹ نہیں کرنے دو گے۔۔۔

ضرور کرنا لیکن مجھے فی الحال ضرورت نہیں۔۔

وہ ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔

وہ بے حد اہ سیٹ اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اسکے لیے وہ دو پلاس اسکے گھر کی پہلی دو اینٹیں

تھی۔ اور یہی چیز اسکے لیے تکلیف دہ تھی۔ اور وہ احساس جرم بھی تھا جو وہ اس سارے

معاملے میں اپنی فیملی کے انوالو ہونے کی وجہ سے محسوس کر رہی تھی۔۔ وہ کہی نہ کہی

اس رقم سے جیسے اس نقصان کی تلافی کرنا چاہتی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ سالار نے اسکی سوچ کو پہلے سے پڑھ لیا تھا۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ امامہ یہ کوششیں کیوں کر رہی۔

*****_****_****

جو کچھ ہو اس میں میرا کوئی قصور نہیں نہ ہی میری کوئی انوومنٹ ہے۔۔۔

اسکے سامنے بیٹھا و سیم بڑی سنجیدگی سے اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب ابونے کیا ہے۔ میں نے گھر میں ایسا کچھ نہیں سنا۔۔

و سیم نے ہاشم کا بھی دفاع کرنے کی کوشش کی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔ وہ سالار کے سامنے اپنی فیملی کا دفاع کرنے کی کوشش کر سکتی تھی و سیم کے سامنے نہیں۔۔۔۔۔ یہ

جو کچھ ہوا تھا اس میں اسکے اپنے ہی باپ کا ہاتھ تھا۔۔

ابو سے کہنا بی سب کرنے سے کچھ نہیں ملے گا سالار کو کیا نقصان ہو گا یا مجھے کیا نقصان ہو گا۔ ایک سکول ہی جلا ہے۔ پھر بن جائے گا۔۔ ان سے کہنا وہ کچھ بھی کر لے ہم کو

فرق نہیں پڑے گا۔۔

میں ابو سے بی سب نہیں کہہ سکتا۔۔ میں بہت بزدل ہوں۔۔ تمہاری طرح بہادر

نہیں۔۔

تمہارے جانے کے بعد اتنے سالوں میں بہت دفعہ کمزور پڑا میں بہت دفعہ شش و پنج کا شکار بھی ہوا اور شک و شبہ کا بھی۔۔ بہت دفعہ دل چاہتا تھا زندگی کے اس غبار کو میں بھی ختم کر لوں جس سے میری بینائی دھندلائی ہوئی ہے لیکن میں بہت بزدل ہوں۔ تمہاری طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہیں جاسکتا۔۔۔

اب آجاؤ۔۔ امامہ کو خود احساس نہیں ہوا اس نے یہ بات کیوں اس سے کہہ دی۔
وسیم نے اس سے نظریں نہیں ملائی پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔ اب تو بہت مشکل ہے جب اکیلا تھا تب کچھ نہ کر سکا اب تو بیوی بچے ہیں۔۔۔

ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔۔ میں اور سالار۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا تمہیں۔۔ اور تمہاری فیملی کو تم ایک بار کوشش تو کرو۔۔۔

امامہ بھول گئی تھی اس نے وسیم کو کیا ڈسکس کرنے کے لیے بلایا تھا۔ اور کیا باتیں لیکر بیٹھ گئی۔

انسان بہت خود غرض اور بے شرم ہوتا ہے امامہ بی جو ضرورت ہوتی ہے نایہ صحیح اور

غلط کی سب تمیز ختم کر دیتی ہے۔ کاش میں زندگی میں مذہب کو پہلی ترجیح بنا سکتا۔۔ مگر مذہب پہلی ترجیح نہیں ہے میری۔ وسیم نے گہرا سانس لیا تھا۔ جیسے کوئی رنج تھا جس نے بگولہ بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

میں تمہاری طرح فیملی نہیں چھوڑ سکتا مذہب کے لیے۔۔ تمہاری قربانی بہت بڑی ہے۔

تم جانتے بوجھتے جہنم کا انتخاب کر رہے ہو صرف دنیا کے لیے؟؟ اپنی بیوی بچوں کو بھی اسی راستے پہ لے جاؤ گے کیونکہ تم میں صرف جرات نہیں ہے۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی۔۔

وہ اب بھائی کو چیلنج کر رہی تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔ جیسے بے قرار تھا۔۔ تم مجھے بہت بڑی آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہو۔۔۔

آزمائش سے بچانا چاہتی ہوں۔۔۔ آزمائش تو وہ ہے جسمیں تم نے خود کو ڈال رکھا ہے۔۔

اس نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھالی۔۔ میں صرف اسی لیے تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔۔ وہ

اسے سنجیدگی سے سمجھایا۔

بات اس نے ضرور کی تھی۔۔ امامہ نے جیسے اپنا دفاع کیا۔

اور خود بات شروع کرنے کہ بعد اب وہ تمہاری کال نہیں اٹھا رہا تو تم انتظار کرو جب

اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا خود ہی تمہیں کال کر لے گا۔۔ سالار کہہ کر دوبارہ کھانا

کھانے لگا۔۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

اب کیا ہوا؟؟؟ سالار نے سلاد کھاتے ہوئے اسکی خاموشی نوٹس کی۔۔

میری خواہش ہے وہ بھی مسلمان ہو جائے اور گمراہی کے اس دلدل سے نکل آئے۔۔

سالار نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہا۔۔

تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔۔ یہ اسکی زندگی اسکا فیصلہ ہے۔۔ تم اپنی خواہش

اس پر لاگو نہیں کر سکتی۔۔ اور تم دوبارہ کبھی اس سے اس مسئلے ہر بات نہیں کرو گی نہ

ہی سکول کے حوالے سے کسی گلے شکوے کے لیے اسے بلاؤ گی۔ میں اپنے مسئلے خود

ہینڈل کر سکتا ہوں۔۔ وہ کہہ کر کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گیا۔ امامہ اسی طرح حالی

پلیٹ لیے بیٹھی رہی۔۔

****_****_****_****

اسکول کی بلڈنگ کے سٹرکچر کو واقعی نقصان پہنچا تھا۔ یہ سالار کے لیئے حالیہ زندگی کا سب سے بڑا مالیاتی نقصان تھا۔ مختلف کیمیکلز سے انتہائی مہارت کیساتھ عمارت کے مختلف حصوں میں آگ لگائی گئی تھی۔ یہ کسی عام چور اچکے کا کام نہیں تھا۔ اگر مقصد سالار کو نقصان پہنچانا تھا تو اسے بے حد نقصان ہوا اگر مقصد اسے چوٹ پہنچانا تھا تو یہ پیٹ پر ضرب لگانے جیسا تھا۔ وہ دہرا ہوا تھا لیکن منہ کے بل نہیں گرا تھا۔

اسے چھوڑ دو سالار۔۔۔ وہ دوسرے ویک اینڈ پر اسلام آباد میں تھے اور طیبہ اس بار جیسے گڑ گڑا رہی تھی۔ تمہیں شادی کا شوق تھا اب پورا ہو گیا۔ اب چھوڑ دو اسے۔۔۔

آپکو اندازہ نہیں آپ کتنا تکلیف پہنچاتی ہے مجھے جب آپ مجھ سے اس طرح بات کرتی ہے۔ سالار نے انکوبات مکمل نہیں کرنے دی۔

تم نے دیکھا نہیں انہوں نے کیا کیا ہے۔۔۔

ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔ اس نے پھر ماں کی بات کاٹی۔۔

تم عقل کے اندھے ہو سکتے ہو ہم نہیں۔۔۔ اور کون ہے دشمن تمہارا امامہ کی فیملی کے
سوا۔۔۔ طیبہ برہم تھی۔۔۔

اس سب میں امامہ کا کیا قصور ہے۔۔۔

یہ سب اسکی وجہ سے ہو رہا ہے تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے۔۔۔

نہیں سمجھتا۔۔۔ اور نہ ہی سمجھوں گا۔ میں کل بھی آپ سے کہہ رہا تھا آج بھی کہتا ہوں

اور

آئندہ بھی کہوں گا میں امامہ کو طلاق نہیں دوں گا۔ آپ کو کوئی اور بات کرنی ہے تو میں
بیٹھتا ہوں اس ایشوپہ مجھے نہ آج اور نہ ہی دوبارہ بات کرنی ہے۔

طیبہ کچھ بول نہ سکی تھی۔ وہ آدھ گھنٹہ بعد وہاں بیٹھا رہا پھر واپس بیڈروم آ گیا امامہ ٹی

دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ اپنا لپ ٹاپ نکال کر کچھ کام کرنے لگا تھا۔ اسے عجیب سا احساس

ہوا تھا وہ جس چینل کو دیکھ رہی تھی اس پر مسلسل اشتہار چل رہے تھے اور وہ انہیں

بڑی یکسوئی سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ سالار نے وقتاً فوقتاً دو تین مرتبہ اسکو اور ٹی وی کو

دیکھا۔ اس نے دس منٹ کے دوران ایک بار بھی اسے چائے کا مگ اٹھاتے نہیں دیکھا

تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور اسکے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ امامہ نے مسکرائے کی کوشش کی سالار نے اسکے ہاتھ سے ریمورٹ لیکر ٹی وی آف کر دیا۔

تم نے میری اور ممی کی باتیں سنی ہیں کیا؟؟ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی۔ وہ جن

یا جادو گر نہیں تھا۔۔۔ شیطان تھا اور اگر شیطان نہیں تھا تو شیطان کا سینئر منسٹر

تھا۔ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جھوٹ بولنا بیکار تھا۔ اس نے گردن سیدھی

کر لی۔

ہاں چائے بنانے کی تھی میں اور تم دونوں لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے میں نے

پکچن میں سناسب۔۔۔

وہ اسے یہ نہ بتا سکی کہ طیبہ کے مطالبے نے چند لمحوں کے لیے اسکے پیروں تلے زمین

نکال دی تھی۔

تم جب یہاں آتے ہو تو وہ یہ کہتی ہیں تم سے؟؟

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے سالار سے پوچھا جو اسے تسلی دینے کے لیے کچھ الفاظ

ڈھونڈ رہا تھا۔

نہیں۔۔۔ ہر بار نہیں کہتی۔۔۔ کبھی کبھی وہ اوورری ایکٹ کر جاتی ہیں۔۔۔ اس نے ہموار لہجے میں کہا۔۔۔

میں اب اسلام آباد کبھی نہیں آؤں گی۔ اس نے ایک دم کہا۔

لیکن میں تو آؤں گا اور میں آؤں گا تو تمہیں بھی آنا پڑے گا۔۔۔ الفاظ سیدھے تھے لہجہ نہیں۔۔۔

تم اپنی مٹی کی ساٹھ لے رہے ہو؟؟

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہاں۔۔۔ جیسے میں نے انکے سامنے تمہاری ساٹھ لی تھی۔

وہ اسکے جواب پر چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

خاموشی کا ایک اور لمبا وقفہ آیا۔۔۔ پھر سالار نے کہا۔

زندگی میں اگر کبھی میرے اور تمہارے درمیان علیحدگی جیسی کوئی چیز ہوئی تو اسکی وجہ میرے پیرنٹس یا میری فیملی نہیں بنے گی۔۔۔ کم از کم یہ ضمانت میں تمہیں دیتا ہوں۔۔۔

وہ پھر بھی خاموش رہی تھی

کچھ بولو۔۔۔

کیا بولوں؟؟

جب تم خاموش ہوتی ہو تو بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا وہ سنجیدہ تھا۔

مجھے لگتا ہے تم پتا نہیں اس بات کو کیسے استعمال کرو گی میرے خلاف۔۔۔۔۔

کبھی۔۔۔ اس نے جملہ مکمل کرنے کے بعد کچھ توقف سے ایک آخری لفظ کا اضافہ کیا۔۔۔ وہ اسے دیکھتی رہی لیکن خاموش تھی۔ سالار نے اسکا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔۔۔

تم میری بیوی ہو امامہ وہ میری ماں ہیں۔۔۔ میں تمہیں شٹ اپ کہہ سکتا ہوں انہیں نہیں۔ وہ ایک ماں کی طرح سوچ رہی ہیں اور ماں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں جب تم ماں بنو گی تو تم بھی اسی طرح ری ایکٹ کرنے لگو گی۔ انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا مجھ سے کہا۔۔۔ میں نے اگنور کر دیا۔ جس چیز کو میں نے اگنور کر دیا اسے تم سیریسلی لو گی تو بی حماقت ہو گی۔

وہ اسے سمجھا رہا تھا وہ خاموشی سے سنتی رہی جب وہ خاموش ہوا تو اس نے مدہم آواز میں کہا۔۔۔

میرے لئے سب کچھ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔۔۔ جب سے شادی ہوئی ہے یہی سب کچھ ہو رہا ہے تمہارے لئے ایک کے بعد ایک مسئلہ آجاتا ہے مجھ سے شادی اچھی ثابت نہیں ہوئی تمہارے لئے۔۔۔ ابھی سے اتنے مسئلے ہو رہے ہیں تو پھر بعد میں پتا نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سالار نے اسکی بات کاٹ دی۔۔۔
 شادی ایک دوسرے کی قسمت سے نہیں کی جاتی ایک دوسرے کے وجود سے کی جاتی ہے اچھے دنوں کے ساتھ کے لئے لوگ فرینڈ شپ کرتے ہیں شادی نہیں۔۔۔ ہم دونوں کا ماضی حال مستقبل جو بھی ہے جیسا بھی ہے ایک ساتھ ہی ہے اب اگر تم کو یہ لگتا ہے کہ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ تم سے شادی کے بعد پہلے میرا پرانز بانڈ نکلے گا یا پھر کوئی بونس ملے گا یا پروموشن ہوگی تو سوری مجھے ایسی توقعات نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بے وقت ہو سکتا ہے میرے لئے لیکن غیر متوقع نہیں۔۔۔

میں تمہارے لئے کس حد تک جاسکتا ہوں کتنا سینسر ہوں وہ وقت بتا سکتا ہے اس لئے

تم خاموشی سے وقت کو گزرنے دو۔۔ یہ چائے ٹھنڈی ہوگی ہے جاؤ دوبارہ چائے بنا لاؤ
 -- پیتے ہیں۔۔۔ وی اسکا چہرہ دیکھتی رہی۔۔ کوئی چیز اسکی آنکھوں میں اٹڈنے لگی
 تھی۔۔

اسکی ضرورت نہیں ہے امامہ۔۔ سالار نے اسکے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھتے
 ہوئے اس سے نرمی سے کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اپنی ناک رگڑتی اٹھ گی۔۔

*****_&*_*****_*

سالار نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا تھا یہ امامہ نہیں جانتی تھی۔ سکول کی دوبارہ تعمیر کیسے
 شروع ہوئی تھی اسے یہ بھی نہیں پتا تھا سالار پہلے سے زیادہ مصروف تھا اور اسکی زندگی
 میں آنے والا طوفان کسی تباہی کے بغیر گزر گیا تھا۔

مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سالار نے دو ٹوک انکار کرتے ہوئے کہا
 تھا۔

لیکن مجھے ہے۔۔ امامہ اصرار کر رہی تھی۔

یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔۔ سالار نے اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کی۔
 کوئی بات نہیں، ایک بار دکھانے سے کیا ہو گا۔ اسکے انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔
 تم کیا جاننا چاہتی ہو اپنے مستقبل کے بارے میں مجھ سے پوچھ لو۔۔
 سالار اسے پامسٹ کے پاس لیجانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جو اس فائیسٹار ہوٹل کی
 لابی میں تھا جہاں وہ کھانا کھانے آئے تھے۔

ویری فنی۔۔ اس نے مذاق اڑایا تھا۔ اپنے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں میرا کیا ہو گا۔
 کیوں۔ تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں کیا۔۔ سالار نے مسکرا کر اسے بتایا۔
 اسی لیے تو کہتی ہوں پامسٹ کے پاس چلتے ہیں اس سے پوچھتے ہیں۔ امامہ کا اصرار بڑھا
 تھا۔

دیکھو ہمارا آج ٹھیک ہے۔۔ کافی ہے۔۔ تمہیں کل کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے۔۔ وہ اب
 بھی رضامند نہیں تھا۔

مجھے ہے کل کا مسئلہ۔۔ وہ کچھ جھلا کر بولی۔

کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو۔۔ تمہیں پتا ہے میرے کو لیگنز کو اس

نے انکے فیوچر کے بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا بھابھی کی بھی کتنی کزنز آئی تھی اسکے پاس۔۔۔۔۔ امامہ اب اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بھابھی آئی تھی انکے پاس؟؟ سالار نے جو ابا پوچھا تھا۔

نہیں۔۔۔۔۔ وہ اٹکی۔۔

تو؟؟

تو یہ کہ انکوانٹرسٹ نہیں لیکن مجھے تو ہے۔ اور تم نہیں لیکر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔۔۔ وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE.com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کس دن؟؟ سالار نے جیسے ٹالا۔۔

ابھی۔۔۔

وہ بے اختیار ہنسا اور اس نے جیسے ہتھیار ڈال کر کہا۔۔

پامسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم اے ایسی حماقت کی توقع نہیں رکھتا تھا لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔۔ تم دکھا لو ہاتھ۔۔

تم نہیں دکھاؤ گے؟؟ اسکے ساتھ لابی کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔۔

نہیں۔۔۔ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔۔

چلو کوئی بات نہیں۔۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ
میرے بارے میں پامسٹ بتائے گا وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہوگا۔۔ امامہ اسے
چھیڑ رہی تھی۔

مثلاً۔۔۔ سالار نے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

مثلاً اچھی خوشگوار ازدواجی زندگی۔۔ اگر میری ہوگی تو تمہاری بھی ہوگی۔۔

ضروری نہیں ہے۔۔۔ وہ اسے اب تنگ کرنے لگا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہو سکتا ہے شوہر کے طور پر میری زندگی بڑی بری گزرے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔

تو مجھے کیا؟؟ میری تو اچھی گزر رہی ہوگی۔۔ امامہ نے کندھے اچکا کر بے نیازی

دکھائی۔

تم عورتیں بڑی سیلفش ہوتی ہو۔ سالار نے چلتے چلتے جیسے اسکے رویے کی مذمت کی۔

تو نہ کیا کرو پھر ہم سے شادی۔۔ نہ کیا کرو ہم سے محبت۔۔۔ ہم کونسا مری جا رہی

ہوتی ہیں تم مردوں کے لیے۔۔۔۔

امامہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔۔۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔

ہاں ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم عورتوں پر۔۔۔۔ عزت کی زندگی راس نہیں آتی شاید اس لیے۔ وہ چند لمحوں بعد بڑ بڑایا۔۔

تمہارا مطلب ہے تم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے۔؟؟ امامہ ہمیشہ کی طرح فوراً برامان گی تھی۔

ہم شاید جنرل لائز کر رہے تھے۔۔ سالار اسکا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑ بڑایا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔۔ تم صرف اپنی بات کرو۔

تم آگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پامسٹ کی طرف نہیں جاتے۔۔ سالار نے اسے بے حد سہولت سے موضوع سے ہٹایا۔

نہیں میں کب ناراض ہوں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔۔ امامہ کا موڈ یکدم بدلا۔

ویسے تم کیا پوچھو گی پامسٹ سے؟؟ سالار نے بات کو مزید گھمایا۔۔

بڑی چیزیں ہیں۔۔ امامہ سنجیدہ تھی۔۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تب تک وہ پامسٹ تک پہنچ چکے تھے۔۔۔

پامسٹ اب امامہ کا ہاتھ پکڑے عدسے کی مدد سے اسکی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔۔

لکیروں کا علم نہ تو ختمی ہوتا ہے نہ الہامی۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں بہر حال مقدر سنوارتا اور بگاڑتا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا۔ پھر اس نے جیسے حیرانی سے اس کے ہاتھ پر کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اسکا چہرہ دیکھا۔ اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اسکے شوہر کو دیکھا جو اس وقت بلیک بیری پر میسجز دیکھنے میں مصروف تھا۔۔

بڑی حیرانی کی بات ہے۔۔ پامسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔۔

کیا؟؟؟ امامہ نے کچھ بے تاب ہو کر پامسٹ سے پوچھا۔

آپکی یہ پہلی شادی ہے؟؟ سالار نے نظر اٹھا کر پامسٹ کو دیکھا۔۔ اسکا خیال تھا یہ سوال

اسکے لیے تھا۔۔ لیکن وہ امامہ سے مخاطب تھا۔۔

ہاں۔۔ امامہ نے کچھ حیران ہو کر پہلے پامسٹ کو اور پھر اسے دیکھا۔۔

اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ پامسٹ پھر کسی غور و حوض میں مصروف ہو گیا۔۔

آپکے ہاتھ پر دوسری شادی کی لکیر ہے۔۔ ایک مضبوط لکیر۔۔ ایک خوشگوار کامیاب
دوسری شادی۔۔۔

پامسٹ نے امامہ کو دیکھتے ہوئے ختمی انداز میں کہا۔۔ امامہ کارنگ اڑ گیا۔۔ اس نے
گردن موڑ کر سالار کو دیکھا۔۔ وہ اپنی جگہ ساکت تھا۔۔

آپ کو یقین ہے؟؟ امامہ کو لگا جیسے پامسٹ نے کچھ غلط پڑھا تھا۔

جہاں تک میرا علم ہے اسکے مطابق تو آپکے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں اور دوسری
لکیر پہلی کی نسبت زیادہ واضح ہے۔۔

پامسٹ اب بھی اسکے ہاتھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔۔ سالار نے امامہ کے کسی اگلے
سوال سے پہلے والٹ سے ایک کرنسی نوٹ نکال کر پامسٹ کے سامنے میز پر رکھا پھر
بڑی شائستگی سے کہتے ہوئے اٹھ گیا۔۔

تھینک یو۔۔ بس اتنی انفارمیشن کافی ہے۔۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں ہمیں جانا

ہے۔۔۔ اسے اٹھ کر وہاں سے چلتا دیکھ کر امامہ نہ چاہنے کے باوجود اٹھ کر اسکے پیچھے

آئی تھی۔۔۔

مجھے ابھی اور بہت کچھ پوچھنا تھا اس سے۔۔ امامہ نے خفگی سے کہا۔۔

مثلاً؟؟؟ سالار نے کچھ تیکھے انداز میں کہا۔

اس نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے۔۔ امامہ نے اسکے سوال کا جواب نہیں دیا۔۔ لیکن

جب وہ پارکنگ میں آگئے تو اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سالار سے کہا۔۔

یہ تمہارا اپنا انتخاب تھا اس نے تمہیں نہیں بلایا تھا تم خود گی اپنا مستقبل دیکھنے۔۔ سالار

نے بے رخی سے کہا۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار تم مجھے چھوڑ دو گے کیا؟؟؟ امامہ نے پوچھا۔

یہ نتیجہ اگر تم نے پامسٹ کی پیش گوئی کے بعد نکالا ہے تو مجھے تم پر افسوس ہے۔۔ سا

لار کو غصہ آیا تھا اس پر۔۔

ایسے ہی پوچھا ہے میں نے۔۔۔۔۔۔۔

تمہیں پہلے کم وہم تھے میرے بارے میں کہ کسی پامسٹ کی مدد کی ضرورت

پڑتی۔۔ سالار کی خفگی کم نہیں ہوئی تھی۔

دوسری شادی تو وہ تمہاری پریڈیکٹ کر رہا ہے۔۔۔ ایک کامیاب خوشگوار ازدواجی زندگی اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم مجھے چھوڑو۔۔۔ سالار نے اس بار چھتے ہوئے انداز میں کہا۔ اس کی گاڑی اب مین روڈ پر آچکی تھی۔۔۔

میں تو تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔ امامہ نے سالار کو دیکھے بغیر بے ساختہ کہا۔۔۔ پھر ہو سکتا ہے میں مرجاؤں اور اسکے بعد تمہاری دوسری شادی ہو۔۔۔ سالار کو یکدم اسے چڑانے کی سوجھی۔۔۔

امامہ نے اس بار اسے خفگی سے دیکھا۔ تم بے وقوفی کی بات مت کرو۔

ویسے تم کر لینا شادی اگر میں مر گیا تو۔۔۔ اکیلی مت رہنا۔۔۔ امامہ نے کچھ اور برا مانا۔۔۔۔۔

میں کچھ اور بات کر رہی ہوں تم کچھ اور بات کرنا شروع کر دیتے ہو۔۔۔ اور تمہیں اتنی ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں۔

تم اصل میں یہ چاہتے ہو کہ اگر میں مرجاؤں تو تم دوسری شادی کر لینا۔ وہ کچھ لمحوں

کی بعد یکدم بولی۔۔ وہ اسکی ذہانت پر عیش عیش کراٹھا۔۔

تو کیا میں نہ کروں /؟؟؟ سالار نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

مجھے پامسٹ کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ پچھتائی تھی۔

تم مجھے سود کے بارے میں سوال کرتی ہو اور خود یہ یقین رکھتی ہو کہ اللہ کے علاوہ کسی

انسان کو دوسرے انسان کی قسمت کا حال پتا ہوتا ہے؟؟؟ وہ ہمیشہ سے صاف گو تھا۔ مگر

اسکی صاف گوئی نے امامہ کو پہلے کبھی اتنا شرمندہ نہیں کیا تھا جتنا اس وقت کیا۔ گھڑوں

پانی پڑنے کا مطلب اب سمجھ آیا تھا اسے۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

انسان ہوں۔۔ فرشتہ تو نہیں ہوں میں۔۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

جانتا ہوں۔۔ اور تمہیں کبھی فرشتہ سمجھا بھی نہیں میں نے، مار جن آف ایر ردیتا ہوں

تمہیں لیکن تم مجھے نہیں دیتی۔۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ بہت کم کوئی بات غلط کرتا تھا امامہ کو اسکا

اعتراف تھا۔۔

زندگی اور قسمت کا پتا اگر ان چیزوں سے چلتا تو پھر اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی عقل نہیں

دیتا۔ صرف یہی چیزیں دیکر اسے دنیا میں اتار دیتا۔۔۔

وہ گاڑی چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ شرمندگی سے سن رہی تھی۔ جب مستقبل نہیں بدل سکتے تو پھر جاننے کا کیا فائدہ۔ بہتر ہے غیب غیب ہی رہے اللہ سے اسکی خبر کی بجائے اسکا رحم و کرم مانگنا زیادہ بہتر ہے۔

وی بول ہی نہیں سکی تھی۔ سالار بعض دفعہ اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑتا یہ یقین یہ اعتماد تو اسکا اثاثہ تھا۔۔۔ یہ اسکے پاس کیسے چلا گیا۔ امامہ کو اس رات پہلی بار یہ بے چینی ہوئی تھی۔۔۔ وہ ساتھی تھے رقیب نہیں تھے۔ وہ ایمان کے درجوں میں اس سے پیچھے تھا وہ اسے پیچھے چھوڑنے لگا تھا اب۔۔۔

*****_*****_*****_*

وہ سالار کیساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار انکے دائیں جانب تھا یہ وہاں انکی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے وہاں تھے۔ اور اپنی شادی کے ساتویں مہینے عمرے کے لیے آئے تھے۔ احرام میں ملبوس سالار کے برہنہ کندھے کو دیکھتے ہوئے امامہ کو ایک لمبے عرصے کے بعد وہ خواب یاد آیا تھا۔۔۔ سالار کے دائیں کندھے پر کوئی زخم نہیں تھا لیکن اسکے بائیں کندھے کی پشت پر اب بھی اس ڈرنائف کا

نشان تھا۔ جو ہاشم مبین نے مارا تھا۔

تم نے پہلے کبھی مجھے اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ امامہ کے منہ سے اس خواب کے بارے میں سن کر شاکڈ تھا۔ کب دیکھا تھا تم نے یہ خواب؟؟

امامہ کو تاریخ مہینہ دن سب یاد ہے تھا۔ کیسے بھولتی۔۔ اس دن وہ جلال سے ملی تھی اتنے سالوں کے لا حاصل انتظار کے بعد۔۔۔۔۔

سالار گنگ تھا۔۔ وہ وہی رات تھی جب وہ یہاں امامہ کے لیے گڑ گڑا رہا تھا۔ اس آس میں کہ اسکی دعا قبول ہو جائے۔۔ بی جانے بغیر کہ اسکی دعا قبول ہو رہی تھی۔

اس دن میں یہاں تھا۔۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ کو بتایا۔ اس بار وہ ساکت ہوئی۔

عمرہ کے لیے؟؟

سالار نے سر ہلایا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہونٹ کاٹھا رہا۔ وہ کچھ بول نہ سکی صرف اسکو دیکھتی رہی۔

اس دن تم یہاں نہ ہوتے تو شاید۔۔

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔

شاید؟؟ سالار نے سراٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ یوں جیسے وہ چاہتا تھا کہ وہ بات مکمل کر لے۔۔ وہ کیسے کہتی کہ وہ اس دن یہاں نہ ہوتا تو شاید جلال اس سے اتنی سرد مہری نہ برتا۔۔ وہ سب کچھ نہیں کہتا جو اس نے کہا تھا۔ وہ اسکے اور جلال کے بیچ اللہ کو لے آیا تھا۔ اور اس کے لیے اللہ نے سالار کو چنا تھا۔۔

سالار کی باتیں اسکی سماعتوں سے چپک گئی تھی۔

اتنے سالوں میں جب بھی یہاں آیا تمہارے لیے بھی عمرہ کرتا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ بڑے سادہ لہجے میں امامہ کو بتا رہا تھا اسے رلا رہا تھا۔۔۔

تمہاری طرف سے ہر سال عید پر قربانی بھی کرتا رہا ہوں میں۔۔

کیوں؟؟ امامہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا تھا۔۔

تم منکوحہ تھی میری۔ دور تھی لیکن میری زندگی کا حصہ تھی۔۔

وہ روتی گئی۔۔ اسکے لیے سب کچھ اسی شخص نے کرنا تھا کیا۔۔۔

اسے سالار کے حافظ قرآن ہونے کا بھی اس وقت پتا چلا تھا۔۔۔ وہ جلال کی نعت سن

کر مسحور ہو جاتی تھی۔ وہاں حرم میں سالار کی قرأت سن کر گنگ تھی۔

ایسی قرأت کہاں سے سیکھی تم نے؟؟ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

جب قرآن پاک حفظ کیا تب،،،، اب تو پرانی بات ہو گی ہے۔ اس نے بڑے سادہ لہجے میں کہا۔۔

امامہ کو چند لمحوں کے لیے جیسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔

تم نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے؟؟ ڈاکٹر صاحب نے کبھی نہیں بتایا۔ وہ شاکڈ تھی۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تم نے بھی کبھی نہیں بتایا اتنے مہینوں میں۔۔

پتا نہیں۔۔ کبھی خیال نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والے زیادہ لوگ حفاظ

ہیں۔۔ میرا حافظ قرآن ہونا نکلے لیے انوکھی بات نہیں ہو گی۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔

تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔۔

آنسوؤں کا ایک ریلہ امامہ کی آنکھوں میں آیا۔

جلال کو پیڈ سٹل پر رکھنے کی ایک وجہ اسکا حافظ قرآن ہونا بھی تھا۔ اور آج وہ جسکی

بیوی تھی حافظ قرآن وہ بھی تھا۔ اللہ اسکے سامنے ہوتا تو وہ اسکے آگے گر کر روتی بہت کچھ مانگا تھا پر یہ تو صرف چاہا تھا۔ وہ اتنا کچھ دے رہا ہے اسکا دل چاہا وہ ایک بار پھر بھاگ کے حرم میں چلی جائے جہاں سے وہ ابھی آئی تھی۔

رو کیوں رہی ہو؟؟

وہ اسکے آنسوؤں کی وجہ جان نہ پایا۔۔ وہ روتے روتے ہنسی۔۔

بہت خوش ہوں اس لیے۔ تمہاری احسانمند ہوں اس لیے۔۔ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر

ہا رہی اس لیے۔۔ وہ روتی ہنستی اور کہتی جا رہی تھی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

بے وقوف ہو اس لیے۔۔ سالار نے جیسے خلاصہ کیا۔۔

ہاں وہ بھی ہوں۔۔ اس نے پہلی بار سالار کی زبان سے اپنے لیے بے وقوف کا لفظ سن

کر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے امامہ نے آنکھیں بند کی پھر آنکھیں کھول کر حرم کے صحن میں خانہ

کعبہ کے بلکل سامنے برابر میں بیٹھے سالار کو دیکھا جو بہت خوش الحانی سے قرآن پاک

کی تلاوت کر رہا تھا۔۔

فبای آلاء ربکما تکذبن۔۔

اور تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔

تم جو کچھ کر رہی ہو امامہ تم اس پر بہت پچھتاؤ گی، تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔۔

نو سال پہلے یہ ہاشم مبین نے اسکو تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔

ساری دنیا کی ذلت رسوائی بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔۔ انہوں نے اسکے چہرے پر ایک اور تھپڑ ماری تھا۔۔

تمہاری جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔۔ امامہ کی آنکھیں نم ہوگی۔۔ ایک وقت آئے گا تم ہماری طرف لوٹو گی، منت سماجت کرو گی، گڑ گڑاؤ گی تب ہم تمہیں دھتکار دیں گے تب تم چیخ چیخ کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی کہو گی کہ میں غلط تھی۔۔ امامہ اشکبار آنکھوں سے مسکرائی۔۔

میری خواہش ہے بابا۔۔ وہ زیر لب مسکرائی۔۔ کہ زندگی میں ایک بار آپکے سامنے آؤں اور آپکو بتا دوں کہ دیکھ لیجئے۔ میرے چہرے پر کوی ذلت و رسوائی نہیں

ہے۔ میرے اللہ نے میری حفاظت کی مجھے دنیا کے سامنے تماشہ نہیں بنایا میں اگر آج یہاں بیٹھی ہوں تو صرف اس لیے کیونکہ میں سیدھے رستے پہ ہوں اور یہاں بیٹھے میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔۔ اس کے بعد نہ کوئی پیغمبر آیا ہے اور نہ آئے گا۔۔ وہی پیر کامل ہیں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے میری آنے والی زندگی میں بھی اپنے ساتھ شرک کروائے نہ ہی مجھے اپنے آخری پیغمبر کے برابر کسی کو لاکھڑا کرنے کی جرات ہو

بے شک میں اسکے کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتی۔

سالار نے سورہ رحمن کی تلاوت ختم کر لی تھی چند لمحوں کے لیے وہ رکا پھر سجدے میں چلا گیا۔ سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوتے رک گیا۔ امامہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا مانگ رہی تھی۔ وہ اسکی دعا ختم ہونے کے انتظار میں وہی بیٹھ گیا۔ امامہ نے دعا ختم کی۔ سالار نے ایک بار پھر اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہ پایا۔ امامہ نے بہت نرمی سے اسکا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔۔

یہ جو لوگ کہتے ہیں ناکہ جس سے محبت ہوئی وہ نہیں ملا۔ ایسا پتا ہے کیوں ہوتا ہے۔۔۔ محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نو سال پہلے جب میں نے جلال سے

محبت کی تو پورے صدق کیساتھ کی۔۔ دعائیں و خفیہ منتیں۔۔ کیا تھا جو میں نے نہیں کیا
 لیکن وہ مجھے نہیں ملا۔ پتا ہے کیوں؟؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے
 تھے اور تمہاری محبت میں میری محبت سے زیادہ صدق تھا۔ سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا
 اسکی ٹھوڑی سے ٹپکنے والے آنسو اب اسکے ہاتھ پر گر رہے تھے سالار نے دوبارہ امامہ
 کے چہرے کو دیکھا۔۔۔

مجھے اب لگتا ہے اللہ نے مجھے بڑے پیار سے بنایا ہے وہ مجھے ایسے کسی شخص کو سونپنے پر
 تیار نہیں تھا جو میری قدر نہ کرتا۔۔ اور جلال کبھی میری قدر نہیں کرتا۔ اللہ نے مجھے
 سالار سکندر کو سونپا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم وہ شخص ہو جسکی محبت میں صدق
 ہے۔ تمہارے علاوہ اور کون تھا جو مجھے یہاں لیکر آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا تم مجھ سے
 پاک محبت کرتے ہو۔۔

وہ بے حس و حرکت سا سے دیکھ رہا تھا اس نے اس اعتراف اس اظہار کے لیے کونسی
 جگہ چنی تھی۔ وہ اسکے ہاتھ کو نرمی اور احترام سے چومتے ہوئے باری باری اپنی آنکھوں
 سے لگا رہی تھی۔

مجھے تم سے کتنی محبت ہوگی میں یہ نہیں جانتی۔۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں

جتنی بھی زندگی تمہارے ساتھ گزاروں گی تمہاری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔۔ زندگی کے ہر مشکل مرحلے ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں اچھے دنوں میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں میں برے دنوں میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔

اس نے جتنی نرمی سے اسکا ہاتھ پکڑا تھا اسی نرمی سے چھوڑ دیا۔۔ سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا بلاشبہ اسے زمین پر اتاری جانے والی صالح اور بہترین عورتوں میں سے ایک دی گئی تھی وہ عورت جسکے لیے سالار نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لیے نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی؟؟ اور جب وہ عورت اسکے ساتھ تھی تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کیسی بھاری ذمہ داری لیے بیٹھا تھا اسے اس عورت کا کفیل بنادیا گیا تھا جو نیکی اور پارسائی میں اس سے کی زیادہ تھی۔

سالار تم سے ایک چیز مانگوں۔۔؟؟ امامہ نے جیسے اسکے سوچ کے تسلسل کو روکا تھا۔ سالار نے رک کر اسکا چہرہ دیکھا وہ جانتا تھا وہ اس سے کیا مانگنے والی ہے۔۔

تم ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خطبہ پڑھو۔۔ سالار کو اندازہ نہیں

تھا۔ وہ اس سے یہ مطالبہ کرنے والی تھی۔۔

آخری خطبہ؟؟ وہ بڑ بڑایا۔

ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے جبل رحمت کے دامن میں دیا تھا۔ اس پہاڑ پر جہاں چالیس سال بعد آدم و حوا بچھڑ کر ملے اور بخشے گئے تھے۔۔ امامہ نے مدہم آواز میں کہا۔۔

ایک جھماکے کے ساتھ سالار کو پتا چل گیا تھا وہ اس سے آخری خطبہ کیوں پڑھوانا چاہتی ہے

اس نے آخری خطبے کے بارے میں سالار سے ایک دن پہلے بھی پوچھا تھا۔۔ تب وہ جبل رحمت پر کھڑے تھے۔۔

تمہیں آخری خطبہ کیوں یاد آگیا؟؟ سالار نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

یہیں پر آخری حج کے اجتماع سے خطاب کیا تھا نا انہوں نے؟؟ وہ جبل رحمت کی چوٹی کے دامن کو دیکھ رہی تھی۔۔

ہاں۔۔۔ سالار نے اسکی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے نیچھے جھانکا۔۔

تمہیں انکا خطبہ یاد ہے؟؟ امامہ نے پوچھا۔۔

سارا تو نہیں۔۔۔ سالار یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اڑکا۔ بس چند احکامات یاد ہونگے۔ اس نے بات مکمل کر لی تھی۔

جیسے؟؟۔۔ امامہ نے دل گردہ نکال دینی والی بے رحمی کیساتھ انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔۔ وہ اسے بڑی نازک جگہ پر کھڑا کر کے زندگی کا مشکل ترین سوال پوچھ رہی تھی۔

مجھے ٹھیک طرح سے وہ احکامات یاد نہیں میں ایک بار آخری خطبہ کو دوبارہ پڑھوں گا۔ پھر تم پوچھ لینا جو پوچھنا چاہتی ہو۔۔ سالار نے بچنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

مجھے پورا یاد ہے اور آج یہاں کھڑی ہوں تو اور بھی یاد آرہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ انہوں نے وہ آخری خطبہ یہاں کیوں دیا تھا جہاں آدم و حوا ملے تھے۔۔ شاید اس لیے کیونکہ دنیا کا آغاز انہی دو انسانوں سے ہوا اور دین مکمل ہونے کا اعلان بھی اسی میدان میں ہوا۔۔۔

اور اسی میدان میں ایک دن دنیا کا خاتمہ بھی ہوگا۔۔ سالار لقمہ دیئے بغیر نہ رہ سکا۔۔ امامہ ہنس پڑی۔۔۔

تم ہنسی کیوں۔۔ سالارا الجھا۔

تم تو کہہ رہے تھے تم کو وہ چند احکامات بھی یاد نہیں اب یہ کیسے یاد آ گیا کہ انہوں نے دین مکمل ہونے کا اعلان یہاں کیا تھا۔۔

سالارا جواب ہوا تھا۔۔ امامہ اسی پر سوچ انداز میں کہنے لگی .

مجھے لگتا ہے وہ خطبہ دنیا کے ہر انسان کے لیے تھا ہم سب کے لیے۔۔ اگر وہ سارے احکامات جو اس آخری خطبہ میں تھے ہم سب نے اپنائے ہوتے یا اپنالیں تو دنیا بے سکونی کا شکار نہ ہوتی۔ جہاں آج ہم کھڑے ہیں اگر وہ نبی کریم کی اپنی امت کے لیے آخری وصیت تھی تو ہم بہت بد قسمت ہیں کہ انکی سنت تو ایک طرف ان کی وصیت تک ہمیں یاد نہیں۔۔ عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ وہ کچھ جذباتی انداز میں بولتی گی۔ وہ عورت نو سال پہلے بھی اسکے پیروں تلے سے زمین نکال سکتی تھی اور آج بھی نکال رہی تھی۔۔۔

تمہیں سود کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات پتا ہے نا اس خطبے کے؟؟ وہ تلوار سالار کی گردن پہ آگری تھی جس سے وہ بچنے کی آج تک کوشش کرتا آیا تھا۔۔ وہ کس جگہ پر کھڑی اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔ ایسی ندامت تو کبھی خانہ

کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اللہ کے سامنے بھی نہیں ہوئی تھی اسے جتنی اسے اس جگہ کھڑے ہو کر ہوئی۔ سالار کو اس وقت ایسا لگا جیسے جبلِ رحمت پہ پڑے ہر پتھر نے اس پر لعنت بھیجی تھی۔ پسینہ ماتھے پر نہیں پیروں کے تلووں تک آیا تھا اسے لگا جیسے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہے پھر وہ وہاں پر ٹہرنہ سکا اور امامہ کا انتظار کیئے بغیر جبلِ رحمت سے اترتا چلا گیا۔ وہ رحمت کا حقدار نہیں تھا تو وہاں کیسے کھڑا ہوتا۔ اسے نیچھے آکر محسوس ہوا۔ اور آج امامہ نے وہ سوال حرم میں کر دیا تھا۔ سالار نے اس بار اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اس سے کیا مانگے گی۔ اس نے انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حرم کے صحن سے نکلنے سے پہلے امامہ سے کہا تھا۔

میں جب بھی سود چھوڑوں گا تمہارے لیئے نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔۔۔ بلکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے چھوڑوں گا۔ امامہ نے بڑی ٹھنڈی آواز میں کہا۔ تو پھر انہی کے لیئے چھوڑ دو۔

سالار ہل نہ سکا۔۔ یہ عورت اسکی زندگی میں پتا نہیں کس لیئے آئی یا لائی گی تھی۔ اسکو اکناکس اور حساب کے ہر سوال کا جواب آتا تھا سوائے اس ایک جواب کے۔۔

تم تو حافظ قرآن ہو سالار پھر بھی اتنی بڑی خلاف ورزی کر رہے ہو قرآن پاک اور اللہ

سود جن لوگوں کے خون میں رزق بن کے دوڑنے لگے۔ وہ سود کو مٹانے کا کبھی نہیں سوچیں گے۔

سالار کو لگا امامہ نے اسکو طمانچہ مارا ہے۔ بات کڑوی تھی پر سچی تھی۔۔۔

میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اگر تم چیزوں کو بدل نہیں سکتے تو اپنی قابلیت ایک غلط کام کو عروج پہ پہنچانے کے لیے استعمال مت کرو۔

سالار سکندر کو ایک بار پھر حسد ہوا تھا۔ کیا زندگی میں ایسا کوئی وقت آنا تھا جب وہ امامہ ہاشم کے سامنے دیوبنتا۔۔۔ کبھی بونانہ بنتا۔۔۔ فرشتہ دکھتا شیطان نہیں دکھتا۔؟؟؟

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میں آخری خطبہ پڑھوں گا۔۔۔ کہنا وہ کچھ اور چاہتا تھا اور کہہ کچھ اور دیا۔۔۔

مجھ سے سنو گے؟؟ امامہ نے اسکا ہاتھ تھام کر بڑے اشتیاق سے کہا۔۔

تمہیں زبانی یاد ہے؟؟ سالار نے پوچھا۔

اتنی بار پڑھا ہے زبانی دہرا سکتی ہوں۔۔

سناؤ۔۔ سالار نے اسکے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

****_****_****_****_*

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد و مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور اسی کے سامنے توبہ کرتے ہیں اور اسی کے سامنے اپنے نفس کی خرابیوں اور برے اعمال سے پناہ چاہتے ہیں۔۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ محمد اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔

اے لوگوں میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اسکی اطاعت کا حکم دیتا ہوں۔ اور اپنے خطبے کا آغاز نیک بات سے کرتا ہوں۔۔ لوگوں سنو۔۔ میں تمہیں وضاحت سے بتاتا ہوں کیونکہ شاید اسکے بعد کبھی تم سے اس جگہ نہ مل سکوں۔ اچھی طرح سن لو۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور میں آج سے تمام سود کا عدم قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے وہ سود معاف کرتا ہوں جو لوگوں نے میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کو ادا کرنا ہے۔ البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے۔ جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے نہ تمہارا۔۔

*****_**_*****_**_*****_**_

پینتیس سالہ غلام فرید ذات کے لحاظ سے کمہار تھا اور پیشے کے لحاظ سے سکول کا چوکیدار تھا۔ گاؤں میں رہتا تھا لیکن شہر میں بسنے کے خواب دیکھتا تھا۔ اسے راتوں رات امیر بننے کا بھی بڑا شوق تھا۔

وہ سات بہنوں کا اکلوتا اور سب سے بڑا بھائی تھا۔ جسکی شادی کا خواب اسکے پیدا ہوتے ہی ماں نے سجالیا تھا۔ دھوم دھام کی شادی نے اگلے کی سال غلام فرید کو وہ قرض چکانے میں مصروف رکھا۔ جب وہ قرض ختم ہوا تو پھر اسکی بہنوں کی شادیوں کے لیے قرض لینا پڑا اور اس بار خاندان والوں کے انکار پر اس نے سود پر قرضہ لیا۔ سات بہنیں تھی اگلے سال کسی نہ کسی کی شادی آجاتی تھی۔۔ پچھلا قرضہ وہی کا وہی کھڑا رہتا۔ مزید قرضہ سرچڑھ جاتا اور پھر ایک کے بعد ایک بچے کی پیدائش۔۔۔ غلام فرید کو کبھی کبھی لگتا تھا کہ اسکا نام غلام قرض ہونا چاہیے۔۔ شادی کے تیرہ سالوں میں قرضہ تو اس نے ادا کر دیا لیکن سود کی رقم اسکے سر پر اسکے بالوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اسکی بیوی بھی سکول میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ دو بڑے بچے بھی گاؤں کی دودکانوں پہ کام کرتے تھے کی سالوں سے سود کی وہ سل پھر بھی اسکے سینے سے ہٹی ہی نہیں۔ بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی گیا۔ کی بار وہ سوچتا تھا کہ ایک رات چپکے سے بیوی بچوں سمیت گاؤں سے بھاگ

وقت نہیں تھا۔ اسکے سر کا بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔

دو کمروں کا وہ گھر جو غلام فرید کا واحد خاندانی ترکہ تھا چینی کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد سوڈ میں گروی رکھا گیا تھا۔ اسکول والوں نے اس وقت میں غلام فرید کی مدد کی اور اسے ایک کوارٹر دے دیا جسمیں صرف ایک کمرہ تھا لیکن بی بھی غنیمت تھا۔ چینی کی پیدائش اپنے ماں باپ کو خوب یاد رہی کہ اسکی پیدائش نے انہیں بے گھر کیا۔۔۔ لیکن چینی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ روایتی انداز میں اس ہر منحوس کا لیبل نہیں لگا۔

نجیف و نزار سانولی رنگت والی چینی سارا دن گرمی میں بان کی ایک چارپائی پر پڑی رہتی روتی کھلبلاتی پھر خود ہی اپنا انگوٹھا چوستی اور سو جاتی۔۔۔ کسی بہن کو خیال آجاتا تو چینی کو اسکے سستے سے پلاسٹک کے اس فیڈر میں دودھ مل جاتا جسمیں اسکے ہر بہن بھائی نے دودھ پیا تھا جو اتنے سالوں میں اتنا گدلا میلا اور گھس گیا تھا کہ اسمیں ڈالا جانے والا دودھ بھی میلا لگنے لگتا تھا۔ وہ بلاشبہ جراثیم کی آماجگاہ تھی۔ لیکن وہ غریب کی اولاد تھی اور غریب کی اولاد بھوک سے مر جاتی ہے۔۔۔ گندگی سے نہیں۔۔۔

پورے دن میں ایک بار ملنے والا دودھ کافی ڈر وہ واحد غذا تھی جس پر چینی سارا دن گزارا کرتی تھی۔ نسیمہ شام کو تھکی ہاری آتی تھی جو بھی روکھی سوکھی ملتی کھا کر کمرے میں

لیٹ کر اپنے کسی بچے سے اپنی ٹانگیں دبوا لیتی تھی اور وہی سو جاتی تھی اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ اسکے کمرے میں ایک نوزائیدہ اولاد ہے۔ ہاں کبھی کبھار وہ اس وقت چنی کو دیکھنے بیٹھ جاتی تھی جب بڑی بچیوں کو اچانک وہم ہوتا تھا کہ چنی مر گئی ہے کیونکہ وہ کبھی سانس نہیں لے پاتی اور کبھی اسکا جسم اتنا ٹھنڈا ہو جاتا کہ نسیمہ کو لگتا انکا بوجھ واقعی کم ہو گیا ہے۔۔۔ لیکن چنی اپنے ماں باپ کے سارے ارمانوں پر پانی پھیرتے ہوئے پھر سانس لینا شروع کر دیتی تھی۔

بھوک واحد مسئلہ نہیں تھا چنی کو۔۔۔ سارا سارا دن وہ پیشاب اور پاخانہ میں لتھڑی پڑی رہتی تھی۔ چنی کے جسم پر کھجلی ہوئی اور پھر ایسے بڑھ گئی جیسے اسکی جلد عادی ہو کر خود ہی ٹھیک ہوتی گی۔

کی ہفتوں تک کسی کو خیال نہیں آیا کہ چنی کی پیدائش رجسٹر کروانی ہے۔۔۔ اسکا کوئی نام ہونا چاہیے۔ چنی نام اسے اسکی ماں نے اسکی جسامت دیکھ کر دیا تھا پھر گاؤں میں حفاظتی ٹیکوں کی مہم والے آئے تو غلام فرید کو چنی کا نام اور پیدائش رجسٹر کروانی پڑی غلام فرید نے اسکے لیئے بھی تین سو روپے کسی سے ادھار لیئے تھے۔ اور وہ ادھار بھی گاؤں کی مسجد کے امام سے۔ اور ان تین سو روپوں نے اسکی زندگی میں کیا کردار ادا کرنا

تھا۔ اسکا اندازہ نہ غلام فرید کو تھا نہ ہی اس بچی کو جسکا نام کنیز رکھ دیا گیا تھا۔ گاؤں میں کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ کنیز ولد غلام فرید عرف چنی کو اس نام کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسکو اللہ نے کسی اور کام کے لیے چنا تھا۔

++++*****++++*****+

دیکھو میں نے حق پہنچا دیا ہے بس اگر کسی کے پاس امانت رکھوئی گئی ہے تو وہ اسکا پابند ہے کہ اس امانت رکھوانے والے کو اسکی امانت پہنچاے اور بیشک تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا اور حساب دینا ہے۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

++++-----++++-----++++

امام صاحب سے تین سو کا وہ قرض ہی تھا جس نے پہلی بار غلام فرید کو یہ احساس دلایا کہ امیر بننا کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ مولوی نے اسکو قرض دینے کیساتھ یہ ذمہ داری بھی سوچنی تھی کہ وہ سکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندہ لیکر انہیں دے۔ مولوی ان لوگوں میں سے تھا جو آخرت میں بھی جنت چاہتا تھا اور دنیا میں بھی جنت جیسا عیش و آرام۔

غلام فرید نے اسکو یقین دلایا کہ سکول کے مالکان اسکی بہت مانتے ہیں۔ مولوی سے جھوٹ تو بول دیا اس نے مگر اب مولوی کے بار بار اصرار کرنے پر اس نے سکول کے مالکان سے مسجد کے چندے کی بات کر ہی لی۔۔۔ اسکو سکول کے مالک نے مولوی کو بلایا اور اس سے تفصیلات مانگی کہ کس لیئے رقم چاہیئے۔۔۔ اس نے چھوٹے موٹے اخراجات کی ایک لمبی تفصیل پیش کر دی۔ سکول کے مالک نے تفصیلات جاننے کے بعد نہ صرف اس وقت کچھ دم مہیا کی بلکہ ہر مہینے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ بھی کر لیا۔۔۔ مولوی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسکی نظروں میں غلام فرید کی عزت ایک دم بڑھ گئی اور گاؤں میں پہلی دفعہ غلام فرید کو کسی نے عزت دی تھی۔۔۔ وہ بھی مسجد کے امام نے۔۔۔ جس نے نہ صرف جمعے کے خطبے میں لاؤڈ سپیکر پر سکول مالکان اور انتظامیہ کی دردمندی کے قصیدے پڑے بلکہ غلام فرید کی کوششوں کو بھی سراہا۔۔۔

سکول کے مالک نے یہ رقم غلام فرید کے ہی ہاتھوں مولوی کو پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ اسکو سو نپی جانے والی ذمہ داری نے اسکی اہمیت مولوی کی نظر میں دو گنی کر دی۔ اگر مولوی کو یہ رقم مسجد کے انتظام و انصرام کے لیئے چاہیئے ہوتی تو وہ اسکی بالکل عزت نہ کرتا۔۔۔ مگر مولوی کو یہ رقم اپنے لیئے چاہیئے تھی۔ گاؤں کے دوسرے

ہزار کی رقم جس مشکل سے مولوی کو دے رہا تھا یہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔ مگر اسے خوف تھا تو صرف اللہ کا۔ کیونکہ وہ مسجد کا پیسہ تھا۔ اسکے دل سے چندے کے حوالے سے اللہ کا خوف ختم کرنے میں مولوی نے بنیادی کردار ادا کیا۔۔۔ اگر مولوی مسجد کے پیسوں کو لوٹ کا مال سمجھ کر کھا رہا تھا تو غلام فرید کو بھی حق تھا۔ اسکے سر پہ بھی تو قرضہ تھا وہ چار مہینے خود میں یہ ہمت پیدا کرتا رہا کہ وہ مولوی سے اس سلسلے میں بات کر سکے۔ اسے ان پیسوں میں حصہ چاہیے تھا۔۔۔ آدھا آدھا یا کم از کم پانچ ہزار تو بنتا ہی تھا۔ سکول کے مالک کو اطمینان ہو گیا تھا کہ مولوی نے مسجد کی حالت کو بہتر کر لیا ہو گا اسکے ماہانہ بھیجے گئے پیسوں سے قرآن پاک کی تعلیم کے لیے آنے والے بچوں اور مسجد کے بنیادی قسم کے اخراجات پورے ہوتے رہینگے۔۔۔ غلام فرید نگران تھا کہ وہ یہ دیکھے

لہ مسجد میں آنے والے بچوں کو قرآن پاک قاعدے سپارے مسجد ہی مہیا کرے۔ غلام فرید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مسجد میں آنے والے کسی بچے کو مسجد سے کچھ نہیں مل رہا اور اگر کچھ مل رہا تو بلکل بھی مفت نہیں مل رہا۔ یہ اسکی بے چینی کا آغاز تھا۔۔۔ اور اس وقت اسکی بے چینی اپنے انتہا پر پہنچ گئی جب چوتھے مہینے مولوی نے نیا موٹر سائیکل خرید لیا۔ وی اسکی نی موٹر سائیکل کو دیکھ کر اس قدر حسد اور خفگی کا شکار ہوا کہ وہ پیسوں کا ذکر کیئے بغیر صرف مٹھائی کھا کر آ گیا تھا۔ مولوی نے ماہانہ چندے کا

پوچھا کیونکہ وہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ غلام فرید نے اس دن مسجد میں بیٹھ کر پہلا جھوٹ بولا تھا کہ سکول کا مالک ملک سے باہر چلا گیا ہے اور ابھی واپس نہیں آیا۔ مولوی کو ایک دم فکر لاحق ہوئی کہ اگر سکول کا مالک فوری طور پہ واپس نہ آیا تو پھر اس مہینے کے پیسے کون دے گا۔ غلام فرید نے اسکو سکول کے مالک کا فون نمبر دے دیا تھا جو غلط تھا۔۔۔۔۔

وہ بیس ہزار کی رقم جیب میں لیے اس دن ایک عجیب سی کیفیت کیساتھ مسجد سے نکلا تھا یوں جیسے اسکی لاٹری نکلی تھی۔ اسے پتا تھا مولوی ہر سال مختلف چیزوں سے اکٹھی ہونے والی رقم کو اپنی رقم کے طور پر گاؤں کے انہی سود خوروں کو بزنس میں سرمایہ کاری کے لیے دیتے تھے جو سود خور غلام فرید جیسے ضرور تمندوں کو وہ رقم دیکر انہیں ساری عمر کے لیے چوپایہ بنا دیتے ہیں۔

مولوی نے ایک ڈیڑھ ہفتہ مزید رقم کا انتظار کیا اور پھر کچھ بے صبری میں وہ نمبر گھما دیا تھا۔ نمبر آف تھا۔ دو دن وقفے وقفے سے کی بار فون کرنے پر بھی جب فون بند ملا تو مولوی غلام۔ فرید کی بجائے سکول پہنچ گئے۔

اور وہاں جا کر انہیں یہ خبر ملی کہ سکول کا مالک کچھ دن پہلے سکول سے ہو کر جا چکے

تھے۔۔ مولوی کا پارہ اب ہائی ہو گیا تھا۔ اس نے غلام فرید کو اسکے کوارٹر پر جالیا اور جب غلام فرید نے انہیں ایک بار پھر وہی کہہ کر ٹرخانے کی کوشش کی تو مولوی نے اسکے جھوٹ کا پول کھول دیا کہ وہ سکول سے ہو کر آیا ہے اور سب جانتا ہے۔۔ غلام فرید نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہ آیا ہو اور اس دن میری چھٹی ہو اور مالک کی ملاقات مجھ سے نہیں ہوئی۔

مولوی اس پر کچھ زیادہ بھڑکے۔۔ غلام فرید کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اب مولوی سے مزید جھوٹ نہیں بول سکتا اسے اب دو ٹوک صاف بات کرنی پڑی۔۔ اس نے مولوی کو بتایا کہ اسے ہر مہینے اس رقم میں اپنا حصہ چاہیے۔۔ کچھ لمحوں کے لیے مولوی کو یقین نہ آیا کہ گاؤں کا ایک کمی مین مسجد کے امام سے کیا مطالبہ کر رہا ہے۔ جب انہیں یقین آیا تو اسکے منہ سے غصہ میں جھاگ نکلنے لگا تھا۔ تم اللہ کے گھر کے لیے ملنے والے ہدیے سے اپنا حصہ مانگ رہے ہو دوزخی انسان۔۔

انہوں نے غلام فرید کو ڈرانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ دوزخ جیسی زندگی گزار کر وہ موت کے بعد دوزخ سے کیا ڈرتا۔۔

اللہ کے گھر کے پیسے اگر اللہ کے گھر پہ لگتے تو کبھی نہ مانگتا مولوی صاحب۔۔ اس نے

بھی تن کر کہہ دیا اس سے۔۔ مولوی نے اسکو دھمکایا کہ وہ سکول کے مالک سے بات کریں گے۔ اور اسے سارا کچا چٹھا سنا دیں گے۔۔

جو اباعلام فرید نے اسے دھمکایا کہ وہ بھی سکول کے مالک کو یہ بتادے گا کہ مولوی چندے والی رقم کو خود استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے مسجد کے پیسوں کو ایک سود خور کو دے رکھا ہے اور وہ اسکا سود کھا رہے ہیں۔۔ بلکہ وہ پورے گاؤں میں انکو بدنام کر دے گا۔ مولوی کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اسکا بس چلتا تو غلام فرید کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈال دیتا۔۔ وہ اسے جی بھر کے برا بھلا کہتا رہا۔ اس دن مولوی نے غلام فرید کو دنیا بھر کی ہر وہ گالی دی جو اس نے کبھی بھی کسی سے سنی تھی لیکن غلام فرید ڈھٹائی سے اپنے پیلے دانتوں کیساتھ منہ کھول کر انکے سامنے ہنستا رہا۔۔

ٹھیک ہے مولوی صاحب مجھے تو کیڑے پڑے گے سانپ اور بچھو قبر میں میری لاش نوچیں گے اور مجھے مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ جو بھی مرنے کے بعد ہوگا لیکن آپکے بیس ہزار تو آپکی زندگی میں بند ہو جائیں گے۔۔ اسی مہینے سے۔۔ میں مالک کو کہہ دیتا ہوں کہ میں نے اس لیے آپکو پیسے نہیں دیے کیونکہ آپ تو مسجد میں پیسہ لگا ہی نہیں رہے ہیں تو سوچیں زیادہ نقصان جنتی کا ہو یا دوزخی

*****_*****

اے لوگوں عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے اللہ کو گواہ بنا کر اسکو خود پر حلال کیا۔ اور انہیں اپنی امان میں لیا۔ تمہیں اپنی عورتوں پر حقوق حاصل ہیں بلکہ ویسے ہی جیسے تمہاری عورتوں کو تم پر حقوق حاصل ہیں۔۔۔ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کیساتھ دوستی نہ کرے جسے تم پسند نہیں کرتے اور تمہاری حرمت کی نگہبانی کرے۔ اور اگر وہ تمہاری فرمانبردار رہتی ہیں تو پھر یہ انکا حق ہے کہ تم انکے ساتھ اچھا سلوک کرو اور انکے نان نفقہ کی ذمہ داری اٹھاؤ۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | A***** | Books | Poetry *****

احسن سعد نے تین سال کی عمر میں اپنی ماں کو اپنے باپ کے ہاتھوں پہلی بار پٹے دیکھا تھا اس نے کوئی بے حیائی کا کام کیا تھا وہ کام کیا تھا وہ تین سال کی عمر میں جان نہ سکا۔ لیکن اپنے باپ کی زبان سے بار بار ادا ہونے والا وہ لفظ اسکے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اسکے باپ نے اسکی ماں کے چہرے پہ دو تین تھپڑ بھی مارے تھے اسکا بازو بھی مروڑا تھا اور پھر اسے دھکا دیکر زمین پر گرالیا تھا۔ اسے وہ چاروں غلیظ

گالیاں بھی یاد تھی۔ جو اسکے باپ نے اسکی ماں کو دی تھی۔۔

وہ خوف کے مارے کمرے میں موجود صوفے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔۔ کیونکہ اسکو پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اسکا باپ اب اسکو پٹے گا۔

اس کے باپ نے اسے چھپتے دیکھا تھا۔ مار کٹائی کے اس سین کے بعد فوراً اسکے باپ نے اسے صوفے کے پیچھے سے بڑے پیار سے نکالا تھا۔ پھر اسے گود میں اٹھا کر گھر سے باہر لے گیا۔ اگلے دو گھنٹے وہ باپ کیساتھ من پسند جگہوں کی سیر کرتا اور من پسند چیزیں کھاتا رہا لیکن اسکا ذہن وہی اڑکا ہوا تھا۔۔

تم تو میرے پیارے بیٹے ہو سب سے زیادہ پیارے ہو مجھے۔۔ اس کا باپ ان دو گھنٹوں میں مسلسل بہلاتا رہا اسکو۔۔ وہ باپ کے گلے بھی لگ جاتا اور باپ کے کہنے پر اسکو چومتا بھی لیکن وہ اس دن بہت خوفزدہ ہوا تھا۔۔

واپسی پر اس نے اپنی ماں کو معمول کے کاموں میں مصروف پایا تھا۔ وہ کھانا پکا رہی تھی۔ جیسے روز پکاتی تھی۔۔ اسکے باپ کو چائے بنا کر دی تھی جیسے روز دیتی تھی۔ مگر فرق صرف یہ تھا کہ آج انکے چہرے پہ انگلیوں کے چند نشان تھے اور انکی آنکھیں سرخ اور سو جھی ہوئی تھی۔ اس دن اسکا دل ماں کے پاس سونے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی

پانچ سالہ بہن کے بستر میں سونے لے لیئے گیا تھا اور بہت دیر تک سونہ سکا۔

گلے چند روز وہ پریشان رہا اور خاموش بھی۔ اسکی ماں نے اسکی خاموشی نوٹس کی یا نہیں لیکن اسکے باپ نے کی تھی۔ وہ اسکا اکلوتا بیٹا تھا اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اب وہ باپ سے ہلکا سا کھنچا تھا تو اس کے لیئے اسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا گلے کی دن اسکا باپ اس پر معمول سے زیادہ توجہ دیتا رہا اسکے سارے نخرے اٹھاتا اور ہر فرمائش پوری کرتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ نارمل ہوتا گیا اور وہ پہلی اور آخری بار ہوا تھا جب اسکے باپ نے اسکی ماں کو مارنے کے بعد اسکے اتنے نخرے اٹھائے تھے۔ بعد کے سالوں میں اسکی ماں کی بار اسکے سامنے پٹی تھی اس نے ان غلیظ گالیوں کو معمول کے الفاظ میں تبدیل ہوتے دیکھا جب بھی انکے باپ کو غصہ آتا تھا تو وہ ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتا تھا۔ اب وہ خاموش تماشائی کی طرح وہ منظر دیکھتا تھا۔ اور ایسے ہر منظر کے بعد اسکا باپ اسکو شام کی سیر کے لیئے لیکر جاتا تھا اور اسے بتایا کرتا تھا کہ اللہ بے حیائی کو کتنا ناپسند کرتا ہے اور عورت سب سے زیادہ بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہے۔ اور بے حیائی کرنے والوں کو سزا دینی چاہیئے۔

پانچ سال کی عمر میں قرآن پاک کی بہت ساری آیات اسکو اسے باپ نے یاد کروائی تھی

اور بے حیائی کے کاموں کی وہ فہرست بھی جس کے کرنے پر عورت کو سزا دینا واجب ہو جاتا تھا۔ اور بے حیائی کے ان کاموں میں شوہر کی نافرمانی، پردے کی پابندی نہ کرنا۔ کسی نامحرم سے ملنا یا بات کرنا، گھر سے اجازت کے بغیر جانا، کسی قسم کا فیشن کا سنگھار کرنا، شوہر سے اونچی آواز میں بات کرنا، کھانا دیر سے یا بد مزہ بنانا، ٹی وی دیکھنا، میوزک سننا، نماز روزے کی پابندی نہ کرنا اسکے دادا دادی کی خدمت نہ کرنا اور اس طرح کے کی کام تھے جو اسے مکمل از بر تھے۔

وہ جن قاری سے قرآن سیکھتا تھا ان سے ماں باپ کے ادب کے بارے میں احکامات بھی سنتا تھا۔ خاص طور پر ماں کے حوالے سے۔۔۔

مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بے حیائی کے کام کرنے والی عورت کی وہ کیسے عزت کر سکتا تھا۔ آسان تشریح اسکے باپ نے اسکو کی کہ وہ بڑا ہو کر مرد بننے والا ہے ایک ایسا مرد جو کسی بھی عورت کو بے حیائی کے کاموں پر سزا دینے کا اور گالیاں دینے کا پورا حق رکھتا ہے۔ اسکا آئیڈیل اسکا باپ تھا۔ بار لیش داڑھی کیسا تھا اسلامی شعائر پر سختی سے کار بند پانچ وقت نماز پڑھنے والا ایک بے حد خوش اخلاق نرم خوان انسان اور سعادت مند پیٹا۔۔۔ جو زندگی کا ایک بڑا حصہ مغرب میں گزارنے کے بعد بھی ایک مثالی اور عملی

مسلمان تھا وہ بھی بڑا ہو کر ویسا ہی بننا چاہتا تھا۔

اے لوگوں تمہارے خون تمہارے مال ایک دوسرے کے لیے اس طرح محترم ہیں جیسے آج کا یہ دن (عرفہ کا دن) یہ مہینہ اور یہ شہر۔

خبردار زمانہ جاہلیت کی ہر رسم اور طریقہ آج میری قدموں کے نیچھے ہے اور جاہلیت کے خون معاف کر دیئے گئے ہیں اور پہلا خون جو میں اپنے خونوں سے معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ حارث کا خون ہے۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ پھر ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگ جاؤ۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

*****-----*****

غلام فرید کی زندگی میں صرف چند اچھے مہینے آئے تھے۔ ایسے مہینے جسمیں پہلی بار اس نے راتوں کو سکون سے سونا سیکھا تھا۔

غلام فرید بہت معصوم تھا یا شاید بہت بے وقوف۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ جیسے امیر بننے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ مولوی کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا اسکے بعد کی دن تک مولوی کی نیندیں اڑی

رہی۔ بیس ہزار کی رقم بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار رہ گئی تھی۔ اسکا صدمہ تو تھا ہی لیکن ساتھ اس بات کا اندیشہ بھی اسے ہو گیا کہ مسجد کی رقم کو سود خوری کے کاروبار میں لگانے کی خبر اگر کسی طرح گاؤں میں پھیل گی تو اور کچھ ہونا ہو لیکن مستقبل میں اسکے چندے بند ہو جائینگے۔۔۔

بدنامی کی تو خیر اسے فکر نہیں تھی وہ اگر بدنام ہو بھی جاتا تو بھی کوئی اسے مسجد کی امامت سے نہیں ہٹا سکتا تھا کیونکہ یہ اسکو باپ داد کی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی تھی۔ اور گاؤں والوں کو تو صحیح طرح وضو کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ امام مسجد کو دینی لحاظ سے کیا جانتے۔ اور اگر ہٹا بھی دیتے تو اسکی جگہ لاتے کس کو؟؟

بیوی مولوی کو سودی کاروبار میں لگائی رقم واپس لینے نہیں دے رہی تھی۔ وہ پہلا خیال تھا جو غلام فرید کی دھمکی کے بعد مولوی کو آیا تھا۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی رقم واپس لے۔ تاکہ وہ غلام فرید کو جھوٹا ثابت کر سکیں۔۔

بیوی کا کہنا تھا اور کونسی ایسی جگہ ہے جہاں پیسہ لگانے پر پچیس فیصد منافع مل جائے۔ بنک والے تو آٹھ یا نو بھی رو دھو کر دیتے ہیں۔۔ بیٹیوں کے جہیز کہاں سے بنے گے۔ انکی شادی کے اخراجات کیسے پورے ہونگے۔۔ مسجد کی امامت تو تین وقت

کی روٹی ہی پوری کر سکتی ہے۔ مولوی کو بیوی کی باتیں سمجھ تو آرہی تھی لیکن ساتھ انکو یہ دھڑکا بھی لاحق تھا کہ کہیں کسی دن غلام فرید باقی پندرہ ہزار دینے سے انکاری نہ ہو جائے۔ اور انکا حدشہ ٹھیک نکلا۔

دو ماہ بعد غلام فرید نے اپنے گھر کے کچھ ناگزیر اخراجات کی بناء پر مولوی کو رقم دینے سے معذرت کر لی۔ اور ان سے اگلے ماہ کی مہلت مانگی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مولوی نے گالم گلوچ لعنت و ملامت نہیں کی تھی انہیں۔ مولوی نے اسکو جہنم سے ڈرانے کی بجائے خود اسکی زندگی جہنم بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر گاؤں کے اس شخص سے رقم کا مطالبہ یہ کہہ کر کیا تھا کہ مسجد کی تزئین و آرائش کی لیے فوری طور پہ ایک بڑی رقم چاہیے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اپنی رقم میں سے کچھ مسجد میں چندہ کرے جو جواب مولوی کو ملا تھا وہ اسکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس آدمی نے رقم واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسکا کہنا تھا کہ فی الحال رقم کاروبار میں لگی ہوئی ہے اور وہ اگلے دو تین سال تک اسکا منافع تو دے سکتا ہے لیکن اصل رقم واپس نہیں کر سکتا۔ مولوی کو وہاں کھڑے کھڑے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اس نے پانچ لاکھ کی رقم اس آدمی کو دی ہوئی تھی۔

اس دن غلام فرید سے مولوی کی نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ گھر جا کر انہوں نے بیوی کو یہ قصہ سنایا۔ وہ بھی دل تھام کر رہ گئی مگر اس نے مولوی کو یہ کہہ کر تسلی دی۔

چلیں مولوی صاحب دو تین سال بعد ہی سہی دے گا تو دے گا نا۔۔۔ اور شکر ہے اس نے منافع دینے سے انکار نہیں کیا میں تو پہلے ہی آپکو روک رہی تھی۔ لیکن پتا نہیں آپکو کیا سو جھی کہ لگی لگائی روزی پہ لات مارنے چلے۔۔۔ اسے مولوی سے یہ کہتے ہوئے یہ پتا نہیں تھا کہ یہ لگی لگائی روزی خود ہی انہیں لات مار دینے والی تھی۔۔۔

اگلے مہینے پھر مولوی کو غلام فرید سے پیسے نہیں ملے۔۔۔ اور اس مہینے ساہوکار نے اس کو منافع کی رقم بھی نہیں دی تھی۔ ایک ماہ پہلے مولوی کے رقم کے مطالبے نے جیسے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ کہ وہ پارٹی ٹوٹنے والی ہے تو وہ کیوں منہ بھر بھر کے اسکو منافع کھلاتا۔۔۔ اب اسکی باری تھی دیا گیا سارا منافع واپس وصول کرنے کی۔ لیکن اس نے مولوی سے یہ باتیں نہیں کی۔ بلکہ اس سے چھ مہینے کی مہلت مانگی اور یہ کہا تھا کہ چھ ماہ کا منافع وہ اکٹھا دے گا پھر اس پر شدید مالی بحران آیا تھا اس نے مولوی سے ناصرف دعا کی درخواست کی بلکہ کوئی قرآنی وظیفہ بھی مانگا تھا۔

مولوی کو ٹھنڈے پسینے آگئے تھے اس کی باتیں سن کر۔ اور کچھ بعید نہیں کہ ہارٹ ہی

فیل ہو جاتا۔ وہ لکھ پتی سے لکھ پتی بن گئے تھے وہ بھی دن دہاڑے۔۔

مولوی صاحب چپ چاپ وہاں سے تو اٹھ کر آگئے لیکن اس نے اپنے مالی نقصان کا سارا غصہ غلام فرید پہ اتارا تھا۔

انہوں نے سکول سے اسکے مالک کا نمبر لیا تھا اور پھر اسے فون کر کے غلام فرید پر جی بھر کر الزامات لگائے۔ مالک کا رد عمل فوری تھا۔ وہ پہلی فرصت میں گاؤں آیا تھا اور مولوی سے ملاقات کے بعد غلام فرید کی صفائیاں اور وضاحتیں سننے کے باوجود اسے نوکری سے فارغ کر دیا

غلام فرید کے سر پہ جیسے پہاڑ آگرا تھا۔ صرف اسے نہیں اسکی بیوی کو بھی نکال دیا گیا تھا اور ان سے کوارٹر بھی حالی کر والیا گیا تھا۔۔

گیارہ لوگوں کا وہ خاندان چھت سے بے چھت ہو گیا تھا۔ وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ گاؤں میں کوئی مکان کرائے پر لے لیتے۔ مولوی کے طفیل غلام فرید پورے گاؤں میں بیوی سمیت بدنام ہو گیا تھا۔ وہ ایک چور تھا جس نے اللہ کے پیسوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گاؤں والوں نے مولوی کے دہرے گئے قصے سن سن کر غلام فرید کا سوشل

بازکٹ کر دیا۔ غلام فرید نے بھی مولوی کے کارنامے گاؤں والوں کو بتانے کی کوشش

کی لیکن ایک کمین اور چور کی بات پہ کون یقین کرتا۔۔ مولوی بری الذمہ اور معصوم
قرار پایا .

پتا نہیں وہ کونسا لمحہ تھا جب غلام فرید اپنا ذہنی توازن کھونا شروع ہوا۔ بھوک اور
تنگدستی نے اسکا دماغ خراب کر دیا۔ گاؤں والوں کی باتوں اور طعنوں نے۔۔ لڑکپن
میں

داخل ہوتی بیٹیوں پر پڑتی گاؤں کے لڑکوں کی گندی نظروں اور اپنی بے بسی نے۔ یا پھر
ان سود خوروں کی دھمکیوں نے جو اسے سود کی قسطیں ادا نہ کرنے پر بار بار اس احاطے
کے ٹوٹے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر مار پیٹ کرتے جہاں جانوروں کے ایک
باڑے کے برابر غلام فرید نے بھی لکڑی کی چھت ڈال کر وقتی طور پہ اپنے خاندان کو
چھت فراہم کی تھی۔۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا غلام فرید کو۔ چنی ایک سال کی تھی جب غلام فرید نے ایک رات
اپنے خاندان کے نو کے نو افراد کو ذبح کر دیا۔ چنی واحد بچ گئی تھی۔ وہ غلام فرید کو مری
ہوئی لگی۔ نو انسانوں کو مارنے کے بعد غلام فرید نے اپنی جان نہیں لی تھی۔ وہ زندہ تھا
ہی کب۔۔ خاندان کو مار دینا ہی وہ حل تھا جیسے جو ایک ان پڑھ شخص نے غربت اور

قرض سے نجات کے لیے نکالا تھا جب کوئی حل ہی باقی نہ رہا تھا۔۔

ایک سال کی چنی کو کچھ یاد نہیں تھا۔۔ نہ قاتل نہ مقتول۔۔

*****-----*****

اے لوگوں نا تو میرے بعد کوئی پیغمبر یا نبی آئے گا نہ تمہارے بعد کوئی نئی امت، میں تمہارے پاس اللہ کی کتاب اور اپنی سنت چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان پر عمل کرو گے تو کبھی گمراہ نہ ہونگے

NEW ERA MAGAZINE
*****-----*****
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ رات ہاشم مبین کی زندگی کی مشکل ترین راتوں میں سے ایک تھی۔ انہوں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا کچھ دیر پہلے۔ مگر خواب انسان جاگتی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے اور خواب میں بھی انسان کی اپنی اولاد اپنے والدین کے ساتھ ایسی بے رحمی کا سلوک کیسے کر سکتی ہے۔ کہ انسان ایک لمحے کے لیے اس کے اپنی سگی اولاد ہونے پر شبہ کرے۔۔۔

وہ اسٹڈی میں بیٹھے اپنی جائداد اور بنک بیلنس اور دوسرے اثاثہ جات کی فائلز اپنے

سامنے میز پر ڈھیر لیئے صرف یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب انکے ساتھ کیوں ہو رہا تھا۔
 اولاد باپ کے مرنے کے بعد ترکہ پر لڑے تو سمجھ میں آتا ہے مگر اولاد ماں باپ کی
 زندگی میں ہی انکے سامنے اس طرح جائداد کے حصوں اوت پائی پائی پر لڑے جیسے ماں
 باپ مر گئے ہو تو ماں باپ کو کونسی صلیب پر چڑھنا پڑتا ہے۔۔۔ ہاشم مبین آجکل اسی
 صلیب پر چڑھے ہوئے تھے۔ ہاشم مبین نے ساری زندگی ایک بادشاہ کی طرح گزاری
 تھی وہ سب پر حاوی رہے تھے اور انکی کسی بھی اولاد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اسکے
 سامنے سراٹھائے۔ اور اب اسی ہاشم مبین پر وہی اولاد انگلیاں بھی اٹھا رہی تھی اور
 گستاخانہ باتیں بھی کر رہی تھی۔ اس نے ساری زندگی اپنی اولاد کو بہترین لائف سٹائل
 دینے کے لیئے کی سمجھوتے کیئے۔۔ جس میں وہ صحیح اور غلط کی تمیز بھی بھول
 گئے۔۔ کب کب اس نے ضمیر کا سودا کیا تھا وہ بھی اسے یاد آ رہا تھا اور کب کب انسانیت
 کا اور کب اپنے مذہب کا۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگے مال و زر کا وہ ڈھیر جو اس نے اپنا مذہب
 بیچ اور بدل کر اکٹھا کیا تھا وہ شاید اسی قابل تھا کہ اسکی اولاد اسے لوٹ لیتی۔
 اور پھر زندگی کے اس لمحے پر اسے ایک غلطی اور اس ایک غلطی کیساتھ امامہ یاد آئی۔

انہوں نے اسے ذہن سے جھٹکا۔۔ پھر جھٹکا۔۔ پھر جھٹکا۔۔ اور پھر وہ رک گئے۔ فائدہ کیا تھا اس کوشش کا پہلے کبھی اس میں کامیاب ہوئے تھے جو آج ہوتے؟؟

کتنے سال ہوئے تھے اسے دیکھے ہوئے۔۔ اس سے ملے ہوئے۔۔ آخری بار انہوں نے اسے ہوٹل میں دیکھا تھا سالار کیساتھ۔۔ اور آخری بار انہوں نے اسکی آواز کب سنی اس سے کب بات کی تھی انہیں یہ بھی یاد تھا۔۔۔

یہ کیسے بھول جاتا۔۔ وسیم کی موت پر۔۔

کتنے سال گزر گئے تھے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی صاف کی۔۔ پتا نہیں یہ نمی وسیم کے لیے آئی تھی یا امامہ کے لیے۔۔

آنے والے ہفتے میں سب کچھ بکنا اور بٹنا تھا۔۔ یہ گھر یہ فیکٹری زمین پلاٹس اکاؤنٹس گاڑیاں۔۔ سب اٹانے۔۔ اگر کچھ بٹنے کے قابل نہ تھا تو وہ ہاشم مبین اور اسکی بیوی تھی۔ جنہیں کوئی بھی ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھا۔۔۔

یہ وہی رات تھی جب انہوں نے ای بار امامہ سے ملنے کا سوچا تھا یہ وہی رات تھی جب انہوں نے سوچا کہ شاید انکی باقی اولاد کی طرح امامہ کو بھی جائداد میں حصہ دینا

چاہیے۔۔ اور وہ بی جانتے تھے کہ وہ اس سوچ پر کبھی عمل نہیں کر سکتے۔ وہ امامہ کو اپنی جائیداد کا وارث نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ اس کے لیے اسے بہت سارے اعترافات کرنے پڑتے۔ عمر کے اس حصے میں اس نے پہلی دفعہ یہ سوچا کہ وہ کچھ اعتراف کر لیں تاکہ ضمیر کا بوجھ تھوڑا کم ہو۔۔ گناہ کا بوجھ گھٹانا تو اب ناممکن رہا۔

*****-----*****

اور شیطان سے خبردار رہو وہ اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ زمین پر اسکی پرستش کی جائے لیکن وہ اس بات پر راضی ہے کہ تمہارے درمیان فتنہ و فساد پیدا کرتا رہے اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرو۔۔

*****-----*****

مویشیوں کے اس احاطے میں اپنے خاندان کی لاشوں کے پاس چند گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد غلام فرید اس رات پہلی بار جا کر جانوروں کے باڑے میں سویا تھا۔ اس کے خاندان کی لاشیں صبح سویرے دودھ لینے والے کچھ لوگوں نے دیکھی تھی اور اسکے بعد گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ غلام فرید اس کہرام کے دوران بھی جانوروں کے

دی ہے۔۔ اس برائی پر جو اس نے مولوی کیساتھ کی تھی۔ اور یہ بات وہ اگلے کی مہینے جمعے کے خطبے میں دہراتے رہے۔ اپنی مومنیت رجسٹر کروانے کا اس سے اچھا اور کونسا موقع ہو سکتا تھا۔۔

پولیس کے پہنچنے پر مولوی صاحب نے ہی انکا استقبال کیا تھا اور وہ شیطان دکھایا تھا جو پھانسی کا حقدار تھا۔ اس شیطان نے کسی بھی مزاحمت کے بغیر خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ہاں میں نے ہی مارا ہے سب کو اور صرف اس لیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی ویسی زندگی جیسے غلام فرید جی رہا تھا۔ میں کچھ بھی کر لیتا کسی جائز طریقے سے اپنا قرض نہیں اتار سکتا تھا۔ غلام فرید نے پولیس کے سامنے اپنے اعترافی بیان میں کہا۔۔

*****_*****_*****

جان جاؤ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک امت ہے۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے سوائے اسکے جسے اسکا بھائی رضامندی سے دے اور اپنے نفس پر اور دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

*****_*****

بھوک سے روتی بلکتی اور خون میں لتھڑی ہوئی چینی کو سب سے پہلے جس نے دیکھا اس نے اسے بھی زخمی سمجھا تھا لیکن جب اسکی مدد کرنے اور اسے طبی امداد دینے کے لیے اٹھایا گیا تو یہ پتا چل گیا کہ وہ صحیح سلامت تھی۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا۔ غلام فرید کا کوئی بھائی نہیں تھا اور بہنوں میں سے صرف ایک اس بات پر تیار ہوئی کہ وہ چینی کو انکے پاس رکھے گی۔ نسیمہ کے خاندان میں کوئی بھی اس پر تیار نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک قاتل کی بیٹی کو اپنے گھر میں پالے۔

لیکن فوری طور پر چینی کی دیکھ بھال صلہ رحمی کے جذبے کے تحت انکے ایک پرانے ہمسائے نے کرنا شروع کر دی۔ چینی کو پیدائش کے بعد زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر خوراک اور اچھے کپڑے اور بستر نصیب ہوا تھا اس دن۔۔ جس دن اسکا خاندان قتل ہوا۔ وہ چینی جسکو کبھی ماں باپ نے غور سے نہیں دیکھا تھا اسے دیکھنے پورا گاؤں اٹھ آیا۔ سوائے اسکے دودھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے۔ جنہیں یہ حدشہ تھا کہ کہی یہ ذمہ داری انکے گلے نہ پڑ جائے۔۔ غربت اتنی بڑی لعنت ہوتی ہے کہ انسان کے اندر سے خونی رشتوں اور انسانیت کے بنیادی صفات مٹا دیتی ہے۔۔

صرف غلام فرید کی ایک بہن ایسی تھی جسکے چار بچے تھے اور ان میں سے بھی تین بیٹے تو دونوں خاندانوں کا دباؤ اسی پر پڑا تھا۔۔۔ صدمے اور غم سے بے حالی کی کیفیت میں وہ اپنے اکلوتے بھائی کی آخری نشانی کو اپنے پاس رکھنے پر تیار تو ہو گی تھی۔ لیکن اسکے شوہر اور سسرال والوں نے اسکا وہ صدمہ اس حادثے کے دوسرے دن ہی اپنے تیوروں اور ناراضگی سے ختم کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ باقیوں کی طرح چینی کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھاتی اس علاقے میں انتظامی عہدیداران اور سیاست دانوں اور سماجی شخصیات کی آمد شروع ہو گی۔ اور جو بھی آ رہا تھا وہ چینی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ساتھ کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی کرتے جاتے تھے۔

مالی امداد کے لیے دیے جانے والے چیکوں اور کیش رقومات کے سلسلے نے ایک دم چینی کے رشتہ داروں کے اندر صلہ رحمی جگا دی۔ چینی بوجھ نہیں بلکہ بوجھ ہٹانے والی تھی۔ اسکا اندازہ سب کو ہو گیا۔ اور یہاں سے چینی کی کفالت کے لیے جھگڑوں کا آغاز ہو گیا۔۔۔

دونوں سائڈ سے پورے کے پورے خاندان والے اس ہمسایہ کے گھر دھرنا دیکر بیٹھ گئے۔۔۔ اور نوبت لڑائی تک پہنچی تو اس ہمسایہ نے پولیس کو بلوا لیا۔۔۔ پولیس نے چینی

کو اس ہمسایہ کی کفالت میں رہنے دیا اور فریقین سے کہا کہ وہ چینی کی کسٹڈی کے لیے عدالت سے رجوع کرے تب تک بچی اسی گھر میں رہے گی۔۔

چینی کو اپنے پاس رکھنے والے ہمسایہ نے اس کے لیے ملنے والی نقد رقومات کو چینی پر خرچ کرنے کے بہانے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ ایک بہتی گنگا تھی جس میں ہر کوئی ہاتھ دھورہا تھا۔

کیش رقوم کا وہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ لوگوں کی ہمدردیاں اسکی یاداشتوں کے ساتھ کم ہوتی گئی۔۔ اور پھر ایک وقت آیا جب چینی ہمسایوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی۔۔ سرکاری امداد کا وہ چیک جسکو استعمال کرنے پر فی الحال پابندی تھی اور وہ صرف اسکول مل سکتا تھا جسے چینی کی کسٹڈی ملتی اور وہ اسکے رشتہ داروں میں ہی کسی کو ملنا تھی۔ سو اس سے پہلے کہ عدالت کیس کا فیصلہ کرتی ہمسائے چینی کے سب سے بڑے ماموں کو کچھ رقم کے عوض چینی تھما گئے تھے اور ساتھ انہوں نے عدالت میں بیان بھی دیا کہ چینی اسی ماموں کے گھر سب سے زیادہ اچھی پرورش پاسکتی ہے۔۔

تین مہینے بعد تمام رشتہ داروں کی آہ و بکا کے باوجود چینی کا وہ ماموں چینی کی کسٹڈی اور دس لاکھ روپے کی رقم کا چیک عدالت سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا

سونے کی چڑیاں اب ماموں کے سر پر بیٹھ گئی تھی اس سے پہلے ایک ریڑھا چلا کر پھل سبزیاں ادھر سے ادھر ڈھونڈتا تھا دس لاکھ سے اس نے فوراً زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کاشتکاری کا آغاز کر دیا۔ چنی کی اس طرح ناز برداری یہاں نہیں کی گئی جیسی وقتی طور پر سہی لیکن اس کے ہمسایہ نے کی تھی۔

ماموں کے بچوں نے زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کے پاس اتنا پیسہ دیکھا تھا جس سے وہ انہیں سب کچھ لیکر دے سکتا تھا۔ اللہ نے معجزاتی طور پر انکی زندگی بدل دی تھی لیکن اس معجزے کا سہرا کوئی بھی چنی کے سر باندھنے کو تیار نہیں تھا۔ چنی کی صحیح خوش قسمتی کا آغاز اس دن ہوا تھا جب چنی کے خاندان کیساتھ ہونے والے حادثے کے تقریباً چھ مہینے کے بعد سکول کا مالک چنی کو دیکھنے آیا تھا۔ جہاں غلام فرید کام کرتا تھا اور ایک سزا کے طور پر نکالے جانے نے چنی سے اس کا خاندان چھین لیا تھا۔

*****_____*****

تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے۔ اور اپنے غلاموں کا خیال رکھو جو تم کھاؤ اس میں سے انکو کھلاؤ اور جو تم پہنوا سی میں

سے انکو پہناؤ اور اگر وہ ایسی خطا کرے جو تم معاف نہ کرنا چاہو تو انہیں فروخت کر دو
لیکن کوئی سزا مت دو۔۔

*****&&*****

بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی میڈ نے کھولا تھا۔ سالار نے ابھی
ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا ہی تھا جب ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اسکے دونوں
بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آگئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا وہ پسینے میں شرابور تھا۔
السلام علیکم۔۔ گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا ماتھا اور چہرہ
صاف کیا۔۔ دو سالہ عنایہ ہانپتی کانپتی شور مچاتی گرتی پڑتی اسکے پاس آگئی تھی۔۔ اس نے
ہمیشہ کی طرح اسے گود میں لیا تھا ہے زور سے اسے بھینچنے کی بعد اس نے باری باری
بیٹی کے دونوں گال چومے۔ جبریل تب تک گاڑی کا دروازہ بند کر چکا تھا۔
اس نے عنایہ کو نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کی بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے
تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس
اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندر ونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔۔

امامہ تب تک اسکے استقبال کے لیے دروازے تک آچکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھی۔ وہ اسکے پاس آتی ہوئی مسکرائی۔۔

تم جلدی آگئے آج۔؟؟

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔۔ ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔
تو ڈھونڈ لیتے۔۔ وہ اسکے ہاتھ سے جیکٹ لیکر ہنسی۔۔ وہ جواب دینے کی بجائے مسکرایا۔
وہ اس کے لیے پانی لے آئی۔

تمہاری طبیعت ٹھیک ہے /؟ وہ اسکے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا۔ جب
امامہ نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک کر اسکی شکل دیکھی۔

ہاں۔۔ بلکل۔۔ کیوں؟؟

نہیں مجھے تھکے ہوئے لگے ہو اس لیے پوچھ رہی ہوں۔۔ سالار نے جواب دینے کی
بجائے گلاس منہ سے لگایا وہ ٹرے لیکر چلی گئی۔۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ سننگ ایریا میں آ گیا تھا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا
اسکی وجہ وہ بارش تھی جو کسی بھی وقت شروع ہو سکتی تھی اور اب بھی شاید کچھ دیر میں

پھر شروع ہونے والی تھی۔

چائے۔۔۔ وہ امامہ کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے ہوئے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے

میں چائے کے دوگ اور ایک پلیٹ میں چند بسکٹ لیئے کھڑی تھی۔۔۔

تھینکس۔۔۔ وہ مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔۔۔

باہر چلتے ہیں بچوں کے پاس۔۔۔ وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔۔۔

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔۔۔ چند منٹوں بعد اس نے امامہ کو لان میں نمودار ہوتے

دیکھا تھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے وہ کھڑکی میں سالار کو دیکھ کر

مسکرائی تھی۔ وہ بھی جو اب مسکرا دیا تھا۔۔۔

امامہ اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔۔۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دائیں

کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک فی زندگی پرورش پارہی

تھی۔ انکے ہاں تیسرے بچے کی آمد متوقع تھی۔

سالار کے ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک گہری سانس لیکر اس نے مگ

کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو۔۔ اپنے حاکم کی اطاعت کرو۔۔ چاہے وہ ایک ناک کٹا حبشی ہی کیوں ناہو۔۔ اور اس طرح اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔۔

افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک کانگو پچھلی کی دہائیوں سے دنیا میں صرف پانچ چیزوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔

خانہ جنگی۔۔۔ جس میں اب تک پینتالیس لاکھ لوگ جان گنوا چکے تھے۔۔۔ غربت کے لحاظ سے یو این کے اکنامک اینڈ کٹر میں کانگو یو این کے 188 ممالک کی فہرست میں 187 ویں نمبر پر تھا۔۔ معدنی وسائل کے ذخائر کے لحاظ سے کانگو دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔۔ گھنے جنگلات سے بھرا ہوا اور پگمیز یعنی پستہ قامت سیاہ فام لوگ کانگو کے ان جنگلات میں صدیوں سے پائی جانے والی انسانوں کی ایک ایسی نسل جو مہذب زمانے کے واحد غلام جنہیں غلام بنانا قانوناً جائز تھا۔۔ ورلڈ بینک نے یو این کی خوراک کے عالمی ادارے کیساتھ ملکر کانگو میں ان جنگلات کی تباہی کے ایک عظیم الشان پراجیکٹ کا آغاز کیا۔۔

سالار سکندر جس وقت اس پراجیکٹ کے ہیڈ کے طور پر کانگو پہنچا تو اس منصوبے کو تین

سال گزر چکے تھے۔۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ورلڈ بینک اسے کس طرح استعمال کرنے والا تھا لیکن اسے یہ اندازہ بہت جلد ہو گیا تھا ایبا کا سے ملاقات کے بعد۔۔

*****_____*****

پیٹرس ایبا کا سے سالار کی پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اسے کانگو میں آئے تقریباً ایک سال ہونے والا تھا جب لامو کو نامی جگہ کو اپنی ٹیم کیساتھ وزٹ کرتے ہوئے پیٹرس ایبا کا تقریباً دو درجن کے قریب پگمیز کیساتھ اچانک وہاں آ گیا تھا گارڈز نے ایبا کا اور اسکے گروپ کو یکدم نمودار ہوتے دیکھ کر حواس باختگی کے عالم میں بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔

سالار نے دو پگمیز کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا اور باقیوں کو درختوں کی اوٹ میں چھپتے اور پھر بلند آواز میں ایبا کا کو کسی درخت کی اوٹ سے انگریزی زبان میں یہ پکارتے سنا تھا کہ وہ حملہ کرنے نہیں آئے بات کرنے آئے ہیں۔ سالار اس وقت اپنی گاڑی کی اوٹ میں تھا سب سے پہلے اس نے ایبا کا کی پکار سنی۔۔ چند لمحوں کے لیے وہ حیران رہ گیا تھا کسی پگمیز کا انگریزی بولنا۔۔ یقیناً حیران کن تھا لیکن اس سے زیادہ حیران کن اس کا امریکی لب ولہجہ تھا جس میں ایبا کا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے بات کرنی ہے وہ صرف ملنا

چاہتا ہے اسکے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔۔

سالار نے گارڈز سے کہا کہ وہ اس پکارنے والے آدمی سے بات کرنا چاہتا ہے فائرنگ بند کر دیں۔۔ کیونکہ دوسری طرف سے نہ تو فائرنگ ہو رہی اور نہ ہی کسی ہتھیار کا

استعمال۔۔۔۔

اسکے گارڈز کچھ دیر تک اس سے بحث کرتے رہے اور اس بحث کو ختم کرنے کا واحد حل

سالار نے نکالا تھا۔۔ جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی ثابت ہو سکتی

تھی۔ اگر دوسرا گروپ واقعی مسلح ہوتا وہ یکدم زمین سے اٹھ کر گاڑی کی اوٹ سے

باہر نکل آیا تھا اسکے گارڈز پگمیز کی اچانک آمد پر اتنے حواس باختہ نہیں ہوئے تھے جتنے

اسکے بلکل اس طرح سامنے آجانے سے ہوئے تھے۔ سالار انکی حواس باختگی سمجھ سکتا

تھا یہ پاکستان نہیں تھا بلکہ خانہ جنگی کا شکار کانگو تھا۔۔ جہاں کسی کی جان لینا چھڑکے

برابر تھا۔۔۔

فائرنگ اب بند ہوگی تھی اسکی تقلید میں اسکے گارڈز بھی باہر نکل آئے تھے۔ فائرنگ

کے تھمتے ہی ایسا کا بھی نکل آیا تھا۔ سالار نے چلا کر گارڈز کو گولی چلانے سے منع

کیا۔ پھر وہ اس ساڑھے چار فٹ قد کے بے حد سیاہ پچھپی ناک والے اور موٹی سیاہ

آنکھوں والے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اپنے ساتھیوں کے برعکس جینز اور شرٹ میں تھا۔ ان ننگے پاؤں والے پگمیز کے درمیان جا کر زپہنے وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

پیٹرس ایباکا۔۔ اس پستہ قامت شخص نے آگے بڑھتے ہوئے سالار سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے سالار سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے تھامنے سے پہلے سالار نے بڑے نپے تلے انداز میں اسکا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وی بھی ان مفلوک الحال لوگوں میں ہوگا جو ملکوں کی گاڑیاں سامنے آنے پر امداد کے لیے انکے سامنے آجاتے ہیں۔۔ سالار بھی ایباکا سے کسی ایسی ہی ڈیمانڈ کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جو اب ایباکا کی زبان سے اپنا نام سن کر حیران رہ گیا۔ اس نے ایباکا سے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا تو پھر وہ اسے کیسے جانتا تھا۔ وہ ایباکا سے یہ سوال کیسے بنا نہ رہ سکا۔ اس نے بتایا کہ وہ اسکے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے لومو کا مین ہونے والے وزٹ کے بارے میں بھی، اسے بنک کے آفس میں کام کرنے والے کسی مقامی آدمی نے بتایا تھا جس نے ایباکا کی سر توڑ کوششوں کے باوجود سالار سے ملاقات کے لیے اپوائنٹمنٹ کے حصول میں مدد سے انکار کر دیا تھا۔ وی سالار کے آفس نمبر زپر روزانہ

ڈھیروں کا لڑکھاتا تھا۔ ویب سائٹ پر موجود اسکی ای میل پر اس نے سینکڑوں ای میلز کی تھی۔ جنکا جواب ہر بار صرف موصولی ہی کا آیا تھا۔ فون کا لڑکیو کرنے والے سالار کے عملے کے افراد اسکی ملاقات کا مقصد جان کر اسے بڑے نارمل انداز میں ٹال دیتے تھے۔ اسکی گفتگو سنتے ہوئے سالار اسکے بیان و زبان سے متاثر ہوئے بنانہ رہ سکا۔ یہ ناقابل یقین بات تھی لیکن اسکے بعد سالار نے جو کچھ سنا تھا اس نے اسکے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔۔ پیٹرس ایبا کا ہاورڈ بزنس اسکول کا گریجویٹ اور وال سٹریٹ میں جے پی مارگن گروپ کیساتھ پانچ سال کام کرنے کی بعد کانگو آیا تھا۔۔ اپنے والٹ سے نکالے ہوئے کچھ ویزٹنگ کارڈز اس نے سالار کی طرف بڑھادیئے۔۔ اس نے بے حد بے یقینی سے اسے پکڑا تھا۔ کانگو کے جنگلات میں تیروں اور نیزوں سے شکار کر کے بھوک مٹانے والا جنگلی ہاورڈ سکول تک کیسے پہنچ گیا اور پھر وہ جے پی مارگن گروپ کے ساتھ منسلک رہنا۔۔ تو پھر وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔۔

اس سوال کا جواب ایبا کا نے سالار سکندر کو اسکے آفس میں دوسرے دن اپنی دوسری ملاقات میں کاغذات کے ایک انبار کیساتھ دیا تھا جو وہ اس ملاقات میں سالار سکندر کو دینے آیا تھا۔۔

ایبا کا دس سال کی عمر میں لو موکا میں ایک بچے کے طور پر ایک مشنری سے متعارف ہوا تھا جو اسے اپنے ساتھ کانگو کے جنگلات میں وہاں کے لوگوں کیساتھ رابطہ اور کمیونیکیشن کے لیے ساتھ لیے پھرتا رہا اور پھر اسے اس حد تک اس بچے سے لگاؤ ہو گیا کہ بیماری کی وجہ سے کانگو چھوڑنے پر وہ ایبا کا کو بھی اپنے ساتھ امریکہ لے گیا تھا جہاں اس نے اسے پیٹریس کا نام دیا۔

ایک نیا مذہب بھی،،، لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ایبا کا کو تعلیم دلوائی۔۔ ایبا کا بے حد ذہین تھا اور رپورنڈ جانسن نے اسکی ذہانت کو جانچ لیا۔ وہ ایبا کا کو اسکے بعد ہر سال کانگو لاتا رہا جہاں ایبا کا کا خاندان اسی طرح جی رہا تھا۔ دس سالہ ایبا کا نے اگلے پچیس سال امریکہ میں گزارے مگر اسکے بعد وہ امریکہ چھوڑ آیا تھا

وہ اپنے لوگوں کے پاس رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ انہیں اس کی ضرورت تھی اور انہیں اسکی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ ورلڈ بینک سے ہونے والے تعاون سے بہت سے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ جنگل کے اس حصے میں شروع ہو گیا تھا۔۔ جہاں ایبا کا کا قبیلہ آباد تھا۔ اس کا خاندان اور اس سے بڑھ کر وہ دس ہزار لوگ جو جنگل کے اس حصے سے بے دخل کیئے جا رہے تھے۔ جسمیں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ جنگل کٹنے جا رہا

تھا وہ ساری زمین صاف ہوتی پھر وہاں اس معدنیات کی تلاش شروع ہوتی جو اس منصوبے کا دوسرا حصہ تھا۔ اور ایبا کا کامسہ اس کا اپنا خاندان نہیں تھا۔ اس کا مسلہ وہ پورا جنگلات کا حصہ تھا جو اب جگہ جگہ زونز بنا کر کاٹا جا رہا تھا۔

ہم پانچ لاکھ لوگ ہیں لیکن یہ جنگل تو کانگو کے ساڑھے تین کروڑ لوگوں کو روزگار دے رہا ہے۔ ورلڈ بینک ڈمبر انڈسٹری کو معاونت دے رہا ہے کیونکہ اس سے ہماری غربت ختم ہوگی جب جنگل ہی غائب ہو کر یورپ اور امریکہ کی فیکٹریز اور شور و مز میں مہنگے داموں بننے والی لکڑی کی اشیاء میں تبدیل ہو جائیں گی تو کانگو کے لوگ کیا کریں گے۔ تم لوگ ہم سے وہ بھی چھیننا چاہتے ہو جو اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ اگر ہم ویسٹ میں ان سے سب کچھ چھیننے پہنچ جائے تو تمہیں کیسا لگے گا۔؟؟ ایبا کا نے اپنا کیس بہت تہذیب سے پیش کیا تھا۔

سالار کے پاس اسکے سوالوں کے رٹے رٹائے جوابات تھے اس پراجیکٹ کی طرح کانگو میں ہونے والی اور بہت سی پراجیکٹس کی تفصیلات اسکی انگلیوں پر تھی وہ وہاں ورلڈ بینک کا کنٹری ہیڈ تھا۔ مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ پیٹرس ایبا کا کے انکشافات اور سوالات اسے پریشان کرنے لگے تھے بہت کچھ ایسا تھا جو اسکی ناک کے نیچے ہو رہا تھا لیکن اسکو پتا

نہیں تھا لیکن وہ اس سب کا حصہ دار تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ اسی کے دستخطوں سے منظور ہو رہا تھا۔

ایباکالے فائلوں کے انبار وہ کی ہفتوں تک پڑھتا رہا۔ کی ہفتے وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا۔ ورلڈ بینک کی ایما پروہاں ایسی کمپنیوں کو لکڑی استعمال کرنے کی اجازت دے دی گی تھی جنکا ٹریک ریکارڈ افریقہ کے دوسرے بہت سے ممالک میں اسی حوالے سے قابل اعتراض رہا تھا۔ لکڑی کٹ رہی تھی جنگل صاف ہو رہا تھا آبادی بے دخل ہو رہی تھی اور جن شرائط پر ان کمپنیز کو لائسنس دیا گیا تھا وہ ان شرائط کو بھی پورا نہیں کر رہی تھی انہیں لکڑی کے عوض اس علاقے کے لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے کا فریضہ دیا گیا تھا۔ اور وہ کمپنیاں کروڑوں ڈالرز کی لکڑی لے جانے کے عوض چند عارضی نوعیت کے سکول اور ڈسپنسریز لوگوں کو فراہم کر رہی تھی۔ خوراک خشک دودھ نمک اور مسالاجات کی شکل میں دی جا رہی تھی۔ اور یہ سب ورلڈ بینک آفیشلز کے نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا کیونکہ پگمیز کو اس ملک میں اچھوت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ ان کمپنیز کے خلاف عدالت نہیں جاسکتے تھے۔ اگلے دو ماہ سالار کو ایبا کا کیسا تھ انفرادی حیثیت میں ان جگہوں کو خود جا کر دیکھنے میں لگے جنکے بارے میں ایباکانے سے

دستاویزات دی تھی۔۔ اور پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ دستاویزات اور ان میں پائی جانے والی معلومات بالکل ٹھیک تھی۔ ضمیر کا فیصلہ بہت آسان تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا غلط ہو رہا تھا۔ وہ اس کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اب وہ کیا کرے۔ ایک استغفی دیکر اس ساری صورت حال کو اسی طرح چھوڑ کر نکل جاتا یا وہ وہاں پر ہونے والی بے ضابطگیوں کے خلاف آواز بلند کرتا۔ جو کچھ ورلڈ بینک وہاں کر رہا تھا۔ وہ انسانیت کی دھجیاں اڑانے کے برابر تھا۔

افریقہ میں ایبا کا سے ملنے کے بعد زندگی میں پہلی بار سالار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خطبے کے ان الفاظ کو سمجھا تھا کہ کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی سبقت نہیں۔۔ وہ ہمیشہ ان الفاظ کو صرف ذات برادری اور اونچ نیچ کے حوالے سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ اس سیاہ فام آبادی کا استحصال دیکھ رہا تھا جو دنیا کے ایک بڑے خطے پر بستی تھی۔ اور پھر اس گوری آبادی کی ذہنی پسماندگی کی ہوس کو دیکھ رہا تھا جس کا وہ بھی حصہ تھا۔ اسے خوف محسوس ہوا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آخری الفاظ آنے والے زمانوں کے حوالے سے اسی سیاہ فام آبادی کے حوالے سے پیش گوئی کی گئی تھی۔ یا کوئی تشبیہ جسے صرف سفید فام لوگ ہی نہیں مسلمان بھی نظر

انداز کیسے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے غلامی کا جو طوق سیاہ فاموں سے ہٹایا گیا تھا اکیسویں صدی کے مہذب زمانے میں افریقہ میں استعماریت نے وہ طوق ایک بار پھر اسکے گلوں میں ڈال دیا تھا۔

انہیں سیاہ فام لوگوں میں ایک ایسا کا بھی تھا جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنی زندگی کے پچیس سال گزارنے کے بعد بھی وہاں سے اس سیاہ دور میں لوٹ آیا تھا صرف اپنے لوگوں کی بقاء کے لیے۔ بقاء کے لفظ کا مفہوم سالار نے ایسا کا سے سیکھا تھا اور اسکے لیے کیا کیا قربان کیا جاسکتا ہے وہ ابھی اس سے سیکھ رہا تھا۔ وہ اگر سالار سکندر کو متاثر کر رہا تھا تو وہ کسی کو بھی متاثر کر سکتا تھا۔

وہ دنیا کے دو ذہین ترین انسانوں کا آ مناسب منا تھا یہ کیسے ممکن تھا ایک متاثر ہوتا اور دوسرا نہیں ہوتا۔

سالار سکندر۔۔ میں زندگی میں تم سے زیادہ قابل اور ذہین انسان سے نہیں ملا۔ سالار مسکرا کر رہ گیا۔

میں خود انٹر نیشنل آرگنائزیشنز میں کام کر چکا ہوں اور ان میں کام کرنے والے مختلف افراد سے مل چکا ہوں لیکن تم ان سب میں سے مختلف ہو اور مجھے یقین ہے تم میری مدد

کرو گے۔۔

تعریف کا شکر یہ۔۔۔ لیکن اگر تم اس خوشامد کا سہارا لیکر میری مدد چاہتے ہو اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے منہ سے یہ سب سننے کے بعد آنکھیں بند کر کے تمہاری خاطر اس صلیب پر چڑھ جاؤں گا تو میرے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں جو کچھ بھی کروں گا سوچ سمجھ کے کروں گا۔۔

ایبا کا کی اس فیاضانہ تعریف کو خوشامد قرار دینے کے باوجود سالار جانتا تھا ایبا کا کوا سکی شکل میں ایک مسیحا مل گیا ہے۔ مسیحا بھی وہ جو ورلڈ بینک میں کام کرنے کے باوجود اپنا ضمیر زبردستی بے ہوش تو کر سکتا تھا سلا نہیں سکتا تھا۔۔

تمہارا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے۔۔ ایبا کا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ چیز مجھ میں نہیں پائی جاتی۔

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔۔ اور جس صورت حال میں تم مجھے ڈال بیٹھے ہو اس کے بعد تو کی سالوں بھی اسکے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہیں۔۔۔

میں بہت سارے مسلمانوں کیساتھ پڑھتا رہا ہوں کام کرتا رہا ہوں ملتارہا ہوں مگر تم ان

سے مختلف ہو۔۔ وہ عجیب تبصرہ تھا۔

میں کس طرح مختلف ہوں۔۔ سالار پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

تم ایک اچھے مسلمان ہونے کیساتھ ایک اچھے انسان بھی ہو۔ جن سے میرا واسطہ پڑا تھا

وہ یا تو اچھے مسلمان تھے یا اچھے انسان۔۔۔

سالار کچھ دیر بول نہ سکا۔۔ بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا اسے افریقہ کے اس بے

دین انسان نے۔

اچھا مسلمان تمہاری نظر میں کیا ہے؟؟ سالار نے بہت دیر خاموش رہنے کی بعد پوچھا۔

تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی۔۔ ایسا کا ایک دم محتاط ہو گیا۔

نہیں مجھے تمہاری بات انٹر سٹنگ لگی۔ مگر تمہاری زبان سے ادا ہونے والا یہ پہلا جملہ

تھا جس میں تمہاری کم علمی جھلکی۔۔

اس بار ایسا کا الجھا۔۔ وہ مذہب ڈسکس کرنے نہیں بیٹھے تھے وہاں لیکن مذہب ڈسکس

ہو رہا تھا۔

اچھا مسلمان؟؟ جو با عمل ہو ساری عبادات کرتا ہے پورک نہیں کھاتا شراب نہیں پیتا

نائٹ کلب نہیں جاتا میرے نزدیک وہ ایک اچھا مسلمان ہے جیسے ایک اچھا عیسائی یا
ایک اچھا یہودی۔۔۔

ایبا کا کو اندازہ نہیں تھا وہ اپنی کم علمی میں جو باتیں کر رہا تھا وہ سالار کو شرمسار کرنے کے
لیئے کافی تھیں۔۔ ایبا کا اسے اچھا مسلمان بھی مان رہا تھا اور اچھا انسان بھی لیکن کیا وی
اس معیار پہ پورا اترتا تھا۔۔۔

ریونڈ جانسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ سالار نے بے ساختہ کہا۔

ویل۔۔ ایبا کا کہہ کر مسکرایا تھا انکے مجھ پر بہت احسانات ہیں لیکن وہ کبھی میرے
آئڈیل نہ بن سکے۔۔۔

کیوں؟؟ وہ سوال و جواب سالار کو عجیب لطف دے رہے تھے۔

انکے احسانوں کی ایک قیمت تھی وہ مجھے کر سچن بنانا چاہتے تھے جب میں نے وہ مذہب
اپنا لیا تو انہوں نے وہ سارے احسانات ایک کر سچن بچے پر کیئے۔ ایک انسان کے طور پہ
ایک انسان سمجھ کر تو اس نے میرے لیئے کچھ نہیں کی۔ مذہب کسی کے دل و دماغ میں
زبردستی نہیں ڈالا جاسکتا۔

میں نے تھوڑا بہت سب مذاہب کا مطالعہ کیا لیکن پتہ نہیں کیوں جو انسان ان مذاہب کا پیروکار ہو جاتا ہے وہ اپنی اچھائیاں کھو بیٹھتا ہے۔ تمہیں لگ رہا ہو گا میں فلاسفر ہوں۔

ایبا کا کوبات کرتے کرتے احساس ہوا تھا۔ سالار بہت دیر سے خاموش تھا۔

نہیں اتنا فلاسفر تو میں بھی ہوں۔۔ سالار نے مسکرا کر کہا۔۔ تم امریکہ سے یہاں واپس

کیسے آگے۔ سالار نے اس سے وہ سوال کیا جو اسے اکثر الجھاتا تھا۔

ایک چیز جو میں نے ریونڈ جانسن سے سیکھی تھی وہ اپنے لوگوں کے لیے ایثار تھا اپنی

ذات سے آگے کسی دوسرے کے لئے سوچنا۔ امریکہ بہت اچھا تھا وہاں میرا مستقبل

تھا۔ لیکن صرف میرا مستقبل تھا۔ میری قوم کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کانگو میں کچھ

اور بننے کا خواب لیکر آیا ہوں۔ ایبا کا کہہ رہا تھا۔

اور وہ کیا؟؟ سالار کو پھر تجسس ہوا۔

کانگو کا صدر بننے کا۔۔۔۔۔ سالار کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

تم ہنسے نہیں؟؟ ایبا کا نے جواباً کہا تھا۔

تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس پہ میں ہنس پڑوں۔ ہارورڈ سکول سے پڑھنے کے بعد

تمہیں اتنے ہی بڑے خواب دیکھنے چاہیے۔۔ ایبا کا اسکی بات پر مسکرا دیا تھا۔۔
وہ مہینے سالار کے لیئے بے حد پریشانی کے تھے۔۔ کیا کرنا چاہیے اور کیا کر سکتا تھا کے
درمیان فاصلہ تھا۔۔ وہ ایبا کا کی مدد نہ بھی کرتا تب بھی وہ جتنی جنفشانی سے اپنی
حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا سالار کو یقین تھا جلد یا بدیر ورلڈ بینک کے چہرے پر کالک ملنے
والا ایک بڑا سکینڈل سامنے آنے والا ہے۔ حفاظتی اقدامات کا وقت اب گزر چکا تھا
پیٹرس ایبا کا صرف کنگالا یا سوا حلی بولنے والی ایک پگمی نہ تھا جسے کانگو کے جنگلات تک
محدود کیا جاسکتا ہے۔ وہ امریکہ میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارنے والا شخص تھا جسکے
کانٹیکٹس تھے اگرچہ وہ اس وقت اس کے کام نہیں آرہے تھے لیکن اس سے وہ کمزور
نہیں پڑا تھا بلکہ زیادہ طاقتور بن کر ابھرا تھا۔ وہ نہ صرف پگمیز بلکہ بانٹو قبیلے کی آواز بھی
بن چکا تھا جنگل انحصار جنگلات پہ تھا۔۔

اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی ایبا کا کیسا تھ اسکا میل جول ان لوگوں کی نظروں میں
آگیا تھا جنکے مفادات ورلڈ بینک کے ذریعے پورے ہو رہے تھے۔ سالار پہ نظر رکھی
جانے لگی تھی اس سے پہلے کے اس کے خلاف کوئی کاروائی ہوتی انگلینڈ کے ایک اخبار
نے ایبا کا کی فراہم کی گئی معلومات کی تحقیق کرنے کے بعد کانگو کے پگمیز اور ورلڈ بینک

کے کانگو بارانی جنگلات میں ہونے والے پراجیکٹس کے بارے میں ایک کورسٹوری کی تھی۔ جس میں ورلڈ بینک کے کردار کے حوالے سے بہت سارے اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ ورلڈ میڈیا میں اس معاملے کی رپورٹنگ اور کوریج کو دبانے کی کوشش کی گئی مگر اس سے پہلے ہی یورپ اور ایشیاء کے بہت سارے ممالک کے ممتاز اخبارات اس آرٹیکل کوری پرنٹ کر چکے تھے اور ورلڈ بینک میں وہ ہلچل اس وقت عروج پر پہنچی جب سالار سکندر کی طرف سے ہیڈ آفس کو کانگو میں چلنے والے ان پراجیکٹس کے حوالے سے ایک تفصیلی ای میل کی گئی۔ اور یہی وہ وقت تھا جب سالار کو نامعلوم ذرائع سے دھمکیاں ملنے کا آغاز ہوا۔ وہ پراجیکٹس جو ان چلانے والی کمپنیوں کو اربوں ڈالر کی آمدنی دے رہے تھے بنک کے اپنے کنٹری ہیڈ کی مخالفت کا باعث بنتے تو وہ کمپنیز اور انکے پیچھے کھڑی بین الاقوامی خاموش طاقتیں خاموش تماشائی تو نہ بنے رہتے۔ کوئی عام صورت حال ہوتی تو اس وقت تک سالار سے استعفیٰ لیکر اسے بڑے ہتک آمیز طریقے سے ملازمت سے فارغ کیا جا چکا ہوتا۔ مگر اس وقت اسکا استعفیٰ انٹرنیشنل میڈیا کے تجسس کو ابھار دیتا۔

ای میل کا جواب سالار کو ایک تشبیہ کی شکل میں دیا گیا تھا جو سادہ الفاظ میں خاموش ہو جانے کی تاکید کی تھی۔

بنک نے نہ صرف اس ای میل میں ہونے والے اسکے تجزیہ کو ناپسند کیا تھا بلکہ پیٹرس ایبا کا کی فراہم کردہ معلومات پر گارڈین میں شائع ہونے والی کورسٹوری کا ملبہ بھی اسکے سرپرڈالتے ہوئے اسے ایبا کا اور اس کورسٹوری میں استعمال ہونے والی معلومات کا ذریعہ قرار دیا گیا۔۔۔

یہ الزام سالار سکندر کے فرو فیشنل کام پر ایک دھبہ تھا۔ پیٹرس ایبا کا سے ہمدردی رکھنے متاثر ہونے اور میل جول رکھنے کے باوجود سالار نے اسے بنک کے کسی انفارمیشن یا دستاویزات کی بات بھی نہیں کی تھی۔ ایبا کا نے ساری معلومات کہاں سے لی تھی وہ ایبا کا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس تشبیہ کے جواب میں سالار نے بنک کو اپنے استغفی کی پیشکش کی تھی۔ اسے اب یہ محسوس ہوا کہ اسے مانیٹر کیا جاتا تھا۔ اسکی فون کالز ٹیپ ہو رہی تھی۔ اور اسکی اس میلز ہیل ہو رہی تھی۔ دنوں میں اسکی آفس کا ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے بنک کی ناراضی اور ہدایات کے باوجود ایبا کا سے نہ تو اپنا میل جول ختم کیا نہ ہی رابطہ۔۔۔

استغنی کی پیشکش کیساتھ اس نے بنک کو کانگو میں چلنے والے جنگلات پراجیکٹ کے خلاف اپنی تفصیلی رپورٹ بھی بھیجی تھی جو سالار کی اپنی معلومات تھی۔ اور توقع کے مطابق انہیں واشنگٹن طلب کر لیا گیا تھا۔

امامہ کو اس ساری صورت حال کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ امید سے تھی اور سالار سے اس ٹینشن کا حصہ دار نہیں بنانا چاہتا تھا جس سے وہ گزر رہا تھا۔۔۔ وہ صرف ایسا کا اور اسکے جدوجہد کے بارے میں جانتی تھی۔

امامہ کو صحیح معنوں میں تشویش تب ہوئی جب اس نے میڈیا میں سالار سکندر کا نام بھی نمودار ہوتے دیکھا جسکے بارے میں میڈیا کہہ رہا تھا کہ وہ اس پراجیکٹ کے حوالے سے ہیڈ آفس کو اختلافی رپورٹ دے چکا تھا۔

اور انہی حالات میں اچانک واشنگٹن سے اسکا بلاوا آ گیا تھا اور یہ وہ وزٹ تھا جس پر امامہ نے آخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

سب کچھ ٹھیک ہے سالار؟؟؟ وہ اس رات سالار کی پیکنگ کر رہی تھی۔ جب اس نے اچانک پوچھا۔۔ وہ وپنا بریف کیس تیار کر رہا تھا۔

ہاں یار۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟؟ سالار نے جو اباً اس سے پوچھا۔

تم واشنگٹن کیوں جا رہے ہو؟؟ وہ اپنے خدشوں کو کسی مناسب سوال کی شکل میں نہ ڈھال سکی۔

میٹنگ ہے۔۔ اور میں تو اکثر آتا جاتا رہتا ہوں اس بار تم اس طرح سوال کیوں کر رہی ہو۔ اس نے اپنا بریف کیس بند کر کے امامہ سے کہا۔

پہلے کبھی تم اتنے پریشان نہیں لگے۔

نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بڑی پریشانی نہیں ہے۔ بس شاید یہ ہو گا کہ مجھے اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی۔ امامہ کے کندھے ہر ہاتھ رکھ کر اس نے ممکنہ حد تک اپنا لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ اس بار بھونچکا ہونے کی باری امامہ کی تھی۔

جاب چھوڑنی پڑے گی؟؟ تم تو اپنی جاب سے بہت خوش تھے۔۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

تھا۔۔۔ لیکن اب نہیں ہوں۔۔۔۔۔ سالار نے مختصر آگاہا۔ کچھ مسئلے ہیں تمہیں آکر بتاؤں گا تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ کہاں ہیں دونوں؟؟

سالار نے بات بڑی سہولت سے بدل دی تھی۔ ایک لمحہ اسے خیال آیا کہ ان حالات میں اسے اپنے بچوں اور امامہ کو کنشاسا میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ لیکن حل کیا تھا اسکے پاس۔ امامہ کی پریگننسی کے آخری مراحل چل رہے تھے۔ وہ ہوائی جہاز کا سفر نہیں کر سکتی تھی۔۔

تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ میں صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں جلدی واپس آؤں گا۔ وہ اب بچوں کے کمرے میں سوئے ہوئے جبریل اور عنایہ کو پیار کر رہا تھا۔ اسکی فلائٹ چند گھنٹوں بعد تھی۔

ملازمہ کو اپنے پاس گھر پہ رکھنا میری غیر موجودگی میں۔۔ اس نے امامہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

تم ہماری فکر مت کرو تین دن کی ہی تو بات ہے تم صرف اپنی میٹنگ کو دیکھو آئی ہو ف وہ ٹھیک رہے۔ امامہ کو اس وقت تشویش اس میٹنگ کی تھی۔

اسے آدھے گھنٹے میں نکلنا تھا اسکا سامان پیک تھا۔ وہ دونوں چائے کا ایک آخری کپ پینے کے لیے لاؤنج میں ساتھ بیٹھے تھے۔ اور اس وقت چائے کا پہلا گھونٹ پینے سے پہلے سالار نے اس سے کہا۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔۔۔

امامہ اپنی چائے اٹھاتے ہوئے ٹھٹکی پھر ہنسی۔۔۔

آج بہت عرصہ بعد تم کہی جانے سے پہلے ایسی کوئی بات کہی ہے۔۔۔ خیریت ہے۔؟؟

وہ اب اسکا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ سالار نے مسکرا کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

ہاں خیریت ہے لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لیے فکر مند ہوں۔۔۔۔

اکیلی تو نہیں ہوں میں۔۔۔۔ جبریل اور عنایہ میرے ساتھ ہے تم پریشان مت

ہونا۔۔۔۔۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار چائے کا گھونٹ بھرتا رہا امامہ بھی چائے پینے لگی۔ لیکن اسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ

اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔۔۔

تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔۔۔ وہ چائے پیتے ہوئے چونکا پھر

مسکرایا۔۔

وہ ہمیشہ اسے بوجھ لیتی تھی۔۔۔۔۔

ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کروں گا واپس آ کر کروں گا۔۔۔ اس نے

چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

مجھے تمہاری بی عادت سخت ناپسند ہے۔۔۔۔۔ ہر دفعہ کہی جاتے ہوئے مجھے الجھا جاتے ہو میں سوچتی رہوں گی کہ پتا نہیں کیا اعتراف کرنا ہے۔۔

امامہ نے ہمیشہ کی طرح برامانا تھا اور اس کا گلہ غلط نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اور جان بوجھ کر کرتا تھا۔۔

اچھا دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔۔ وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ باز و پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح جانے سے پہلے امامہ سے آخری بار مل رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح گرجوش معانقہ۔

آئی ویل مس یو۔۔ جلدی آنا۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہوئی تھی اور وہی کلمات دہرائے تھے۔۔ جو وہ ہمیشہ دہراتی تھی۔

پورچ میں کھڑے ایک آخری بار اسکو خدا حافظ کہنے کے لیے اس نے الوداعیہ انداز میں سالار کی گاڑی کے چلتے ہی ہاتھ ملا یا تھا۔۔ گاڑی تیز رفتاری سے طویل پورچ کو عبور کرتے ہوئے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ امامہ کو لگا تھا وقت اور زندگی

وہ اس جانی نقصان پر رنجیدہ بھی ہوئی تھی۔ ایک انسان کے طور پر۔ مگر اسکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں میں اسکے دو اتنے قریبی لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔۔۔ اسے شبہ ہوتا بھی کیسے۔۔۔ وہ اسلام آباد کی عبادت گاہ نہیں تھی کسی اور شہر کی تھی سعد اور وسیم وہاں کیسے جا سکتے ہیں۔ اور وسیم تو اپنی عبادت گاہ بھی بہت کم جاتا تھا۔۔۔ بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک ہفتہ بعد وہ اور سعد نیویارک آنے والے تھے وہ دس سال بعد سعد سے مل رہی تھی۔۔۔ بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ وسیم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے عقائد سے تائب ہو جائے گا۔ اور وہ سعد کو بھی سمجھائے گا جو اس سے زیادہ کٹر تھا اپنے عقائد میں۔۔۔ ایک دن پہلے تو اس نے وسیم سے بات کی تھی۔۔۔

اور سالار۔۔۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔۔۔ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔

وہ صبر نہیں تھا۔۔۔ وہ شاک بھی نہیں تھا۔۔۔ وہ بے یقینی تھی۔۔۔ سالار کو اندازہ تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ اسے اس انکشاف کے بعد اس سے کیسے نکالے۔۔۔

وہ کی گھنٹے گم صم آنسو بہائے بغیر سالار کے کسی سوال اور بات کا جواب دیئے بغیر ایک

بت کی طرح وہی بستر پہ بیٹھی رہی یوں جیسے انسان نہیں برف کی سل بن گئی تھی۔۔ اسکی حالت کو دیکھ کر سالار کو شدید کچھتا واہوا۔ کہ اس نے سکندر کی بات نہ مان کر غلطی کر دی ہے۔۔ سالار اپنے ڈاکٹر کزن کو بلالایا تھا گھر پر ہی اسے دیکھنے۔۔۔ اسکے بعد کیا ہوا تھا امامہ کو ٹھیک سے یاد نہیں۔۔ سالار کو لمحہ لمحہ یاد تھا۔ وہ کی ہفتے اس نے اسے پاگل پن کی سرحد پر جاتے اور وہاں سے پلٹتے دیکھا۔ وہ چپ ہوتی تو کی کی دن چپ رہتی روتی تو گھنٹوں روتی سوتی تو پورا دن اور رات آنکھیں نہیں کھولتی اور جاگتی تو دو دو دن بستر پر چند لمحوں کے لیے بھی لیٹے بغیر لاؤنج سے بیڈ روم اور بیڈ روم سے لاؤنج کے چکر کاٹے کاٹے اپنے پاؤں سجالتی۔۔۔ یہ صرف ایک معجزہ تھا کہ اسکی ذہنی حالت اور کیفیت میں بھی جبریل کو کچھ نہیں ہوا تھا وہ جیسے یہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ اسکے اندر ایک اور زندگی پرورش پارہی تھی۔۔۔

اور وہشت جب کچھ کم ہوئی تو اس نے سالار سے پاکستان جانے کا کہا۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔۔ سالار نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کس گھر کو اپنا گھر کہہ رہی ہے۔۔ اس نے خاموشی سے دو سیٹیں بک کروالی تھی۔۔۔

مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ اس نے سالار کے پوچھنے پر کہا تو اس نے بحث نہیں کی

تھی۔ اگر اسکے گھر والوں سے ملاقات اسکو نارمل کر دیتی تو وہ اس ملاقات کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا تھا

ہاشم مبین انکے ہمسائے تھے۔ انکے گھر آنے والی قیامت سے سالار کا خاندان بے خبر نہیں تھا۔۔ مذہب کا فرق تھا۔۔ خاندانی اختلافات تھے دشمنی تھی لیکن اسکے باوجود انکی یہ خواہش کبھی نہ تھی کہ ہاشم مبین کیساتھ ایسا ہوتا۔۔ بڑھاپے میں دو بیٹوں کی موت کیسا صدمہ تھا سکندر اندازہ کر سکتے تھے۔۔ وہ خود باپ تھے۔ انہوں نے ہاشم مبین کے گھر جا کر ان سے تعزیت کی تھی۔۔ اس صدمے میں بھی بہت سرد مہری سے ہاشم مبین نے اسکی تعزیت قبول کی تھی

سکندر کو امید نہیں تھی کہ وہ امامہ سے ملیں گے اس نے سالار سے اپنی خدشات کا اظہار ضرور کیا تھا لیکن امامہ کو جس حالت میں انہوں نے دیکھا تھا وہ سالار کو ایک کوشش کرنے سے روک نہ سکے تھے۔۔ انہیں امامہ کو دیکھ کر دلی رنج ہوا۔۔ ہاشم مبین نے نہ صرف فون پر سکندر سے بات کرنے سے انکار کیا تھا بلکہ سالار کو گھر پر گیٹ سے اندر جانے نہیں دیا۔ سکندر اور وہ دونوں مایوسی کے عالم میں واپس آگئے۔ امامہ کی سمجھ میں اسکی مایوسی اور بے بسی نہ آسکی تھی۔

سالار اسکے سامنے بے بس تھا لیکن پہلی بار اس نے امامہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔۔

تمہیں اگر اپنے گھر جانا ہے تو پہلے اپنے باپ سے بات کر لو وہ اجازت دے تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن میں تمہیں بغیر اجازت کے وہاں گیٹ پر گارڈز کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔۔

اسکے رونے اور گڑ گڑانے کے باوجود سالار نہیں پگھلا تھا۔ امامہ نے اپنے باپ سے فون پر بات کر کے اجازت لے لی تھی۔ مگر اس فون کال نے سب کچھ بدل دیا۔ جو چیز سالار اسے نہیں سمجھا سکا تھا وہ ہاشم مبین نے اسکو سمجھا دی تھی۔

بی جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے ہوا ہے تم جن لوگوں کیساتھ بیٹھی ہو انہی لوگوں نے جان لی ہے میرے دونوں بیٹوں کی۔ اور تم اب میرے گھر آنا چاہتی ہو۔ قاتلوں کیساتھ میرے گھر آنا چاہتی ہو۔ وہ ہذیبانی انداز میں چلاتے اور گالیاں دیتے رہے۔۔

تم لوگ۔۔۔ اور ہم لوگ۔۔ فرق کتنا بڑا تھا امامہ کو یاد آ گیا تھا۔ ہاشم مبین کی مزید کوئی بات سننے اس نے فون بند کر دیا۔ اسکے بعد وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ اس گھر میں

صرف وسیم اسکا تھا اور وسیم جاچکا تھا۔

وہ سالار کیساتھ واپس نیویارک آگئی تھی۔۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ نارمل ہوگی تھی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا وہاں کی تنہائی نے امامہ کے اعصاب کو مفلوج کرنا شروع کیا۔ سالار پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ایک آرگنائزیشن میں پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو آٹھ بجے اسکی واپسی ہوتی تھی اور وہ واپسی پہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ ایک دو گھنٹہ ٹی وی دیکھ کر کھانا کھا کر سو جاتا۔ امامہ بارہ چودہ گھنٹے ایک بیڈروم کے آٹھویں منزل کے اس اپارٹمنٹ میں بالکل تنہا ہوتی تھی۔۔۔ وسیم اسکے ذہن سے نہیں نکلتا تھا وہ روز اپنے فون میں موجود اسکے اور اپنے میسجز کو جو سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے پڑھنا شروع کر دیتی اور پھر گھنٹوں اسی میں گزار دیتی۔۔ تسلی دلاسا اور دل جوئی کے لیے سالار جو کر سکتا تھا کر چکا تھا۔

وہ صبح سویرے گھر سے اسکے بارے میں سوچتے ہوئے نکلتا اور رات کو جب گھر واپس آتا تو بھی اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوتا۔ امامہ کی ذہنی کیفیت نے جیسے اسکے اعصاب شل کرنا شروع کر دیئے۔ جبریل کی پیدائش میں ابھی بہت وقت تھا۔ اور وہ اسے اس جہنم سے نکالنا چاہتا تھا۔ جس میں وہ ہر وقت نظر آتی تھی۔

سائیکالوجسٹ اسکی پریگننسی کی وجہ سے اسکو تیز دوائیاں نہیں دے رہے تھے۔

ضروری ہے۔۔۔۔۔ سالار نے جواباً کہا۔۔۔۔۔

کچھ کہنے کی کوشش میں امامہ کی آواز بھرائی وہ کہہ نہ پائی اس نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی اور اس بار وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

نہیں تم ساتھ نہیں آؤ گے۔۔۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ساری زندگی تم قربانیاں ہی دیتے رہو میرے لیے۔۔۔ اب پی ایچ ڈی چھوڑ دو۔۔۔ اپنا کیریئر چھوڑو۔۔۔ تمہاری زندگی ہے۔ قیمتی ہے تمہارا وقت تم کیوں اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال میرے لیے ضائع کرو۔۔۔

سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی کوئی اور موقع ہوتا تو اس کا یہ اعتراف اس کو خوشی دیتا لیکن اب اسے تکلیف دے رہی تھی۔۔۔ وہ روتے ہوئے اسی طرح کہہ رہی تھی۔۔۔ آئی ایم ناٹ سیو ٹیبیل فار یو۔۔۔۔۔ جتنا سوچتی ہوں مجھے یہی احساس ہوتا ہے تمہارا ایک برائٹ فیوچر ہے لیکن میرا وجود تمہاری ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ مجھے احساس جرم ہوتا ہے۔

وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ رورہی تھی اور بول رہی تھی۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں لیکن میں بے بس ہوں میں کوشش کے باوجود بھی اپنے آپ کو نارمل

نہیں رکھ پاتی۔۔۔ اور اب۔۔۔ و سیم کو دیکھنے کے بعد تو میں اور بھی۔۔۔۔۔ اور
 بھی۔۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے رک گئی۔۔۔ صرف اسکے آنسو اور ہچکیاں نہیں تھی
 تھی۔۔۔

سالار تم بہت اچھے انسان ہو بہت اچھے ہو تم بہت قابل ہو۔۔۔۔۔ تم مجھ سے بہتر
 عورت ڈیزرو کرتے ہو میں نہیں۔۔۔ تمہیں ایسی عورت ملنی چاہیے جو تمہارے جیسی
 ہو۔۔۔ تمہیں زندگی میں آگے بڑھنے میں سپورٹ کرے میری طرح تمہارے پاؤں
 کی بیڑی نہ بنے۔۔۔

اور یہ سب کچھ تم آج کہہ رہی ہو جب ہم اپنا پہلا بچہ ایکسپکٹ کر رہے ہیں؟؟
 مجھے لگتا ہے یہ بچہ بھی مر جائے گا۔ اس نے عجیب بات کہی تھی۔۔۔ سالار نے اسکا ہاتھ
 پکڑنے کی کوشش کی اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔۔۔

تم کیوں اس طرح سوچ رہی ہو۔۔۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ سالار پتا نہیں کس کو تسلی دینا
 چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت امامہ سے زیادہ اسکی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔۔۔
 تم بس مجھے پاکستان بھیج دو۔ امامہ نے اسکی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔۔۔ اس

نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا تھا۔

میں تمہیں اسلام آباد نہیں بھیجوں گا۔ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

مجھے وہاں جانا بھی نہیں۔۔۔ میں سعیدہ اماں کے پاس رہ لوں گی۔ وہ اسکی بات پر حیران

ہوا تھا۔ سعیدہ اماں نہیں تم ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤ اگر وہاں رہنے پر تیار ہو تو

میں تمہیں بھیج دیتا ہوں۔۔ سالار نے کچھ سوچ کر کہا۔

ٹھیک ہے مجھے انہی کے پاس بھیج دو۔۔۔ وہ تیار ہوگی تھی۔۔۔

اگر تم وہاں جا کر خوش رہ سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔۔ واپس کب آؤ گی؟؟

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ خاموش رہی۔۔۔

واپس آجانا۔۔ اسکی لمبی خاموشی کو سالار نے مختصر زبان دی تھی۔۔ مشورہ نہیں

تھا۔ منت تھی۔ خواہش نہیں تھی بے بسی تھی۔۔ اماں نے اسکی بات خاموشی سے

سن کر خاموشی سے ہی اسکا جواب دیا۔

وہ ایک ہفتہ بعد پاکستان واپس چلی آئی تھی اور جیسے کسی قید سے چھوٹ آئی تھی۔ وہ

واپس نہ آنے کے لیے جارہی تھی سالار کو اسکا احساس اسکی ہر حرکت سے ہو رہا

تھا۔ لیکن وہ پھر بھی اسے جانے دینا چاہتا تھا۔ اگر دوری سے وہ صحتیاب ہو سکتی تھی تو

دور ہو جائے لیکن وہ ٹھیک ہو جائے۔۔۔ چار مہینے اور گزرتے تو اسکی اولاد دنیا میں

آجاتی۔ اور وی اسکی بقا بھی چاہتا تھا اور ہمت بھی اپنی جانتا تھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی

تھی۔ وہ ڈپریشن امامہ کے وجود سے جیسے اسکے وجود میں داخل ہونے لگا تھا۔۔۔

جس شام اسکی فلائٹ تھی وہ ایک بار پھر دل گرفتہ ہو رہا تھا اسے لگا اب وہ گھر ٹوٹنے والا

تھا جسے اس نے بہت مشکل سے بنایا تھا۔ امامہ بھی خاموش تھی لیکن پتا نہیں کیوں

سالار کو وہ پر سکون لگی۔۔۔ پر سکون مطمئن۔۔۔ خوش۔۔۔ وہ اسکے چہرے کی کتاب پر اس

دن یہ نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔۔۔

مت جاؤ۔۔۔۔۔ وہ ٹیکسی کے آنے پر اسکا بیگ اٹھا کر لاؤنج میں لے آیا تھا۔ وہ اپنا ہینڈ

کیری کھینچتے ہوئے اسکے پیچھے آئی تھی۔۔۔ اور وہ بھی دوسرے سامان کی طرح سالار کو

تھمانے کی کوشش کی جب سالار نے اسکا ہاتھ تھام لیا۔۔۔ اس نے خلاف توقع ہاتھ نہیں

کھینچا تھا بس ہاتھ اسکے ہاتھ میں رہنے دیا تھا۔۔۔ بہت دیر سالار اسکا ہاتھ یوں ہی پکڑے

رہا تھا پھر اس نے بہت دل گرفتگی سے اسکا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ لمس امامہ کیساتھ آیا

تھا۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی اسے بے قرار کرتا تھا۔ وہ کی سال بعد ایک

دفعہ پھر ڈاکٹر سبط علی کے گھر پناہ لینے آئی تھی۔ اور اس بار بھی پناہ مل گئی۔ ڈاکٹر صاحب اور اسکی بیوی اسکی ذہنی حالت سے واقف تھے۔ کچھ دنوں کے لیے امامہ نے یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی قید تنہائی سے نکل آئی تھی۔ مگر یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ سکون یہاں بھی نہیں تھا۔۔۔ سالار اسے روز فون کرتا تھا کبھی وہ ریسپو کر لیتی اور کبھی نہیں۔۔۔ کبھی وہ اس سے لمبی بات کرتی کبھی مختصر۔۔۔

پتہ نہیں کتنے دن تھے جو اس نے اسی طرح گزارے۔

نہر کے کنارے اونچے لمبے درخت ہو اسے ہلتے تو انکے پتوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر نہر کے پانی پر پڑتی لحظہ بھر کے لیے اسے روشن کرتی غائب ہوتی۔۔۔ بس ایک لمحہ تھا جب اس نے سوچا کہ اسے اس پانی میں اترنا چاہیے۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم اٹھاتی کسی عورت کی آواز پر ٹھٹک گئی تھی۔۔۔

یہ ذرا گھٹا تو بند ہو اداے میرے ساتھ بیٹا۔۔۔

وہ ایک ستر اسی سالہ بوڑھی عورت تھی۔ جو ایندھن کے لیے وہاں درختوں کی خشک لکڑیاں چننے کے بعد اسے ایک چادر نما کپڑے میں باندھ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہے

بنانہر کے کنارے سے ہٹتے ہوئے اسکی طرف قدم بڑھا دیے۔۔ گھٹا اتنا بڑا تھا کہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اسکو اپنے سر پر اٹھالے گی لیکن اس نے امامہ کی مدد سے وہ گھٹا بڑی آرام سے سر پر اٹھالیا۔۔

ذرا میری بکری کی رسی مجھے پکڑانا۔ امامہ کو تامل ہوا لیکن پھر اس نے جا کر تھوڑی بہت جدوجہد کے بعد اس بکری کی رسی پکڑ ہی لی تھی۔

آپ چلیں میں ساتھ چلتی ہوں۔۔ کہاں جانا ہے آپکو۔۔

بس یہ یہاں آگے ہی جانا ہے سڑک کے دوسری طرف۔ بوڑھی عورت نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔۔

امامہ بکری کی رسی کھینچتی ہوئی چپ چاہ اسکے پیچھے چل پڑی۔

سڑک پار کرتے ہی امامہ کو دس بیس کے قریب وہ جھگیاں نظر آگئیں جنہیں اماں اپنا گھر کہتی تھی۔ وہ کچھ تامل کے بعد ایسی ہی ایک جھگی میں اماں کے پیچھے چلتی ہوئی داخل ہوئی۔

اس نے احاطے کے ایک کونے میں سر پر لاد ا ہوا گھڑا اتار پھینکا تھا۔ ایک چولہے پر مٹی

کی ایک ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک آسودہ سی حرارت تھی جیسے وہ کسی گرم آغوش میں آگی تھی۔

اری تو کھڑی کیوں ہے اب تک۔۔ بیٹھ کر دم تولے۔ میری خاطر کتنا چلنا پڑ گیا تجھے۔ میں نے کہا بھی تھا میں لے جاتی ہوں بکری کو میرا تو روز کا کام ہے۔ پر تو تو شہر کی کڑی ہے تجھ سے کہاں ہوتی ہے کوئی مشقت۔۔۔

اس نے کچھ فاصلے ہر ہڑی چوکی کو اسکی طرف کھسکایا۔

میں بھی مشقت ہی کاٹی آئی ہوں اماں۔۔ یہ مشقت تو کچھ بھی نہیں۔۔۔

امامہ اس سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔۔ وہ بوڑھی عورت ہنس پڑی۔۔۔

بس مجھے مشقت نہیں لگتی۔۔۔ تجھے لگتی ہے۔۔ یہی تو فرق ہے۔۔

امامہ اسکا چہرہ دیکھنے لگی وہ اس حلیے اور اس جگہ رہنے والی عورت سے ایسی بات کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

آدمی کیا کرتا ہے تیرا؟؟ وہ اماں کے اس سوال پر اچانک چونکی۔۔۔

کیا کرتا ہے؟؟ اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔۔ کام کرتا ہے۔

کیا کام کرتا ہے۔۔ اماں نے پھر پوچھا۔۔

باہر کام کرتا ہے۔۔ وہ بڑ بڑائی۔۔

پر دیس میں ہے؟ بوڑھی عورت نے پوچھا۔

ہاں۔۔۔ وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

تو یہاں کس کے پاس ہے؟ سسرال ولوں کے پاس؟؟

نہیں۔۔۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE.com

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews پھر؟؟؟

میں کسی کے پاس نہیں۔۔۔

آدمی نے گھر سے نکال دیا کیا۔۔ اس نے چونک کر اماں کا چہرہ دیکھا۔

نہیں۔۔۔۔۔

تو پھر لڑ کر آئی ہے کیا؟؟

نہیں۔۔ اس نے بے ساختہ سر ہلا دیا۔۔

تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟؟

سکون کے لیے۔۔ اس نے بے اختیار کہا۔

سکون کہاں نہیں ہے۔۔ وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔

جو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا۔ اس نے حیرت سے اس عورت

کو دیکھا۔ وہ گہری بات کر گئی تھی۔

پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں اگر بے سکون ہی رہنا ہے۔۔ وہ اس سے یہ سوال نہیں

پوچھنا چاہتی تھی جو پوچھ لیا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تو پھر کہاں رہے؟؟ وہ لاجواب ہوئی۔

تیرا آدمی کہتا نہیں واپس آنے کو؟

پہلے کہتا تھا اب نہیں کہتا۔

بیچارہ اکیلا ہے وہاں؟؟

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ ہاں۔۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟؟ کیا سوال آیا تھا۔

کبھی پیار کیا ہے؟؟ آنکھوں میں سیلاب آیا۔

کیا تھا۔۔ اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا۔

پھر کیا ہوا۔۔

نہیں ملا۔۔ سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ لکڑیاں ڈالی۔

ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا۔۔ اسکے منہ میں جیسے ہری مرچ آئی۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|...
اس نے چھوڑ دیا۔۔

پیار نہیں کرتا ہوگا۔۔ اماں نے بے ساختہ کہا۔۔

پیار کرتا تھا لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔۔ اس نے پتا نہیں کیوں صفائی دی اسکی۔

جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔ جو اب کھٹاک سے آیا تھا۔

اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟؟

نہیں بس وہاں بے سکونی تھی مجھے اس لیے۔۔

کیا بے سکونی تھی۔۔ وہ برستی آنکھوں کیساتھ بتاتی گی۔۔۔

اماں چپ چاپ سنتی رہی اسکے خاموش ہونے پر بھی وہ کچھ نہ بولی۔

وہاں نہر کنارے کیا کر رہی تھی /؟

بہت بزدل ہوں اماں۔۔ مرنے کے لیے نہیں کھڑی تھی۔

یعنی تم تو بڑی بہادر ہو۔ مجھ سے بھی زیادہ بہادر۔۔

نہیں میں تو بہت کمزور ہوں۔۔ امامہ نے کہا۔

تجھے اپنی ہونے والی اولاد کا بھی خیال نہیں آتا۔۔ پیار نہیں آتا اس پر۔۔ اسکی آنکھیں

ایک بار پھر برسنے لگی۔

کوئی اس طرح گھر چھوڑ کے آتا ہے جیسے تم چھوڑ کر آ گی۔۔۔ مر جاتے ہیں بڑے بڑے

پیارے مر جاتے ہیں پر کوئی ایک کے مرنے پر باقیوں کو چھوڑ دیتا ہے؟؟؟

میں اب کسی سے پیار نہیں کرنا چاہتی اماں۔۔ میں جس سے بھی پیار کرتی ہوں وہ مجھ

سے چھن جاتا ہے۔۔ بار بار پیار کروں۔۔ بار بار گنوا دوں۔۔ میں اب اس تکلیف سے

نہیں گزر سکتی۔۔

وہ روتی جا رہی تھی۔۔

یہ تو نہیں بلکہ یہ تو کوئی انسان بھی نہیں کر سکتا کہ اپنوں کو اس لیے چھوڑ دے کہ اسکے
بچھڑنے کی تکلیف سے بچ جائے۔ ایک کا درد جھیل نہیں پار ہی ہو تو سب کو اکٹھا چھوڑ
کر سہ پاؤگی؟؟ امامہ کے پاس جواب نہیں تھا۔۔

اس جھگی کے اندر میرا جوان بیٹا ہے ٹھہر و ذرا میں اسے لیکر آتی ہوں۔۔

وہ عورت ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد وی ایک ریڑھی نماڑالی کو
دھکیلتی ہوئی باہر لائی۔ جس میں ایک دبلا پتلا مرد ایک بستر پر لیٹا ہوا قہقہے لگا رہا
تھا۔ جیسے وہ ماں کی توجہ ملنے پر خوش ہو۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور تھا۔

میرا کلوتا بیٹا ہے یہ۔ اڑتیس سال میں نے اسکے سہارے گزارے ہیں اللہ کے بعد۔

پانچ بیٹے پیدا ہوئے پر ختم ہو گئے۔ پھر یہ پیدا ہوا تو شوہر نے کہا اسے کسی درگاہ پہ چھوڑ
آتے ہیں۔ میں نہیں پال سکتا ایسی اولاد کو۔۔ پر میں کیسے مان سکتی تھی مجھے تو پیار ہی بڑا
تھا اس سے۔۔

شوہر دو چار سال سمجھاتا رہا پر میں نہ مانی۔۔ اللہ کی دی ہوئی چیز کو کیسے پھینک دیتی۔۔

شوہر کو بڑا پیار تھا مجھ سے پر اسے اولاد بھی چاہیے تھی۔ وہ مر گیا تو ساری جائیداد رشتہ داروں نے چھین لی بس بیٹا میرے پاس رہنے دیا۔ یہ ٹھیک ہوتا تو پی بھی چھین لیتے۔۔ اڑتیس سال سے اسکا اور میرا ساتھ ہے۔ اسکو شوہر کے کہنے پر درگاہ چھوڑ آتی تو میرا کیا ہوتا۔

کوئی بوجھ تھا جو امامہ کے کندھوں سے ہٹ رہا تھا۔ کوئی سحر تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔ جو چھوڑا اللہ دیا اس پر صبر کر اور خود کسی کو چھوڑا نہ دے۔ اللہ پسند نہیں کرتا یہ۔ غم بہت بڑا تھا میرا ماں۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اللہ نے تجھے غم دیا تم نے اپنے آدمی کو۔۔ تو کونسا اپنا غم اپنے اندر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے سالار یاد آیا۔ اسکی آنکھیں دھندلائی۔

اسکی محبت اسکی عنایات یاد آئی اور اس اولاد کا خیال آیا جسے اس نے بڑی دعاؤں میں مانگا تھا اور جب دعا پوری ہوئی تو وہ کسی چیز کی قدر نہیں کر رہی تھی۔

وی جانے سے پہلے ایک بار پھر اس بوڑھی عورت سے ملنے آئی تھی اسکے لیے کچھ چیزیں لیکر اسے بے حد کوشش کے باوجود نہ وہ جھگی ملی نہ وہ عورت۔

جبریل سکندر اپنی پیدائش سے بھی پہلے اپنی ماں کے بہت سارے رازوں کا امین تھا۔۔۔

امریکہ کے ہسپتال کے نیوروسرجری کے ڈیپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ آبادی کے اس 2.5 فیصد سے تعلق رکھتا تھا جو 150 آئی کیو لیول رکھتے تھے۔ اور اسکے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔۔۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور نجانے مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا۔ ڈاکٹر کی اس ٹیم کو لیڈ کرنے والا ڈاکٹر دنیا کے قابل ترین سرجن میں سے ایک مانا جاتا تھا۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں وہ سالار سکندر کی پہلی میٹنگ نہیں تھی وہ درجنوں بار وہاں آ جا چکا تھا۔ مگر اپنی زندگی میں وہ کبھی کسی بورڈ روم میں دماغ پر اتنا بوجھ لیکر نہیں بیٹھا تھا جتنا اس دن بیٹھا تھا۔

وہ فلائٹ کے دوران دو گھنٹے سویا تھا اور باقی کا وقت اس نے اس پریزنٹیشن کو بار بار دیکھتے اور اس میں تبدیلیاں اور اضافے کرتا گزارا جو وہ اس میٹنگ میں پیش کرنے آیا تھا۔ سالار کو سانپوں کے بل میں بیٹھ کر اسکا زہر نکالنے کی تجویز پیش کرنی تھی۔ اور

اسے اپنی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی۔

اس کی فلائٹ واشنگٹن میں جس وقت پہنچی اس کے ٹھیک چار گھنٹے بعد ورلڈ بینک کے دربار میں اسکی حاضری تھی وہ ایک بار پھر ہوٹل کے کمرے میں سوئے بغیر کاغذات کا وہ پلندہ دیکھتا رہا جو اسے پریزنٹیشن کیساتھ بورڈ روم میں تقسیم کرنا تھے۔ ان کاغذات کے ڈھیر کو اگر وہ کورٹ میں پیش کر دیتا تو وہ کیس جیت جاتا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ دنیا میں ایسی کونسی عدالت تھی جو اس کیس کو سنتی۔ ایسا عالمی عدالت انصاف میں جانے کے وسائل نہیں رکھتا تھا اور وہ ورلڈ بینک میں کام کرتا تھا وہ اپنے پروفیشنل معاملات خفیہ رکھنے کا پابند تھا۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ پیٹرس ایسا کا اس وقت نیویارک کے ایک ہسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

*****_____*****

اس بورڈ روم کا ماحول ویسا نہیں تھا جیسا اس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔ سنجیدگی ہر بورڈ روم کا حصہ ہوتی ہے لیکن جو اس نے اس دن وہاں دیکھی وہ سرد مہری تھی۔ وہاں بیٹھے سات کے سات لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں ایک جیسی سرد مہری تھی۔ ایسی سرد مہری جو کسی بھی کمزور اعصاب کے انسان کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ بے

تاثر چہرے اور اوسان خطا کرنے والی نظریں۔۔ ایک بیضوی شکل کی میز کے گرد ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے وہ پانچ مرد اور دو عورتیں اس کام کے ماہر تھے جو وہ اس وقت کر رہے تھے۔۔ ورلڈ بینک کے سالار سکندر جیسے کی باضمیر ایمپلائیز کا دھڑن تختہ کر چکے تھے۔ سالار سکندر ان کے سامنے کیا شے تھا کم از کم اس میٹنگ کے آغاز سے پہلے وہ یہی سوچ کر آئے تھے۔

سالار سکندر نے میٹنگ کے آغاز میں اس میٹنگ کی سربراہی کرنے والے ہیڈ کے ابتدائی کلمات بڑے تحمل سے سنے تھے۔ وہ سالار سکندر کی نااہلی ناکامیوں اور کوتاہیوں کو ڈسکس کر رہے تھے۔ سالار نے باقی چھ لوگوں کی نظریں خود پر جمی محسوس کی۔

میں ان میں سے کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے اس پراجیکٹ کے حوالے سے ایک پریزنٹیشن دینا چاہتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ ان میں سے بہت سارے سوالات اور اعتراضات کے جواب موجود ہے جو آپ لوگ مجھ پر کر رہے ہیں۔۔۔۔۔

سالار نے مائیکل کے ابتدائی کلمات کے بعد اسکے کسی الزام کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

سالار ایک کے بعد ایک سلائیڈ پر اجیکٹر پر دکھاتا گیا۔۔ ان سات لوگوں نے وہ پریزنٹیشن بے تاثر چہرے کیساتھ ساکت بیٹھے دم سادھے دیکھی۔

لیکن اسکے ختم ہونے کے بعد ان ساتوں کے ذہن میں جو خدشہ ابھرا تھا وہ ایک ہی تھا۔ سالار سکندر کے ہاتھ میں وہ گرینیٹ تھا جسکی پن وہ نکالے بیٹھا تھا۔ وہ جہاں بھی پھٹتا تھا ہی پھیلا دیتا۔

پروجیکٹر کی سکریں تاریک ہوئی۔۔ سالار نے اپنے لیپ ٹاپ کو بند کرتے ہوئے ان ساتوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ اتنے سالوں کی پبلک ڈیکنگ کے بعد وہ اتنا اندازہ تو لگا پایا تھا کہ اس نے وہ پریزنٹیشن وہاں پیش کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا تھا۔

تو تم اس پراجیکٹ میں کام نہیں کرنا چاہتے؟؟

مائیکل نے خاموشی توڑتے ہوئے اس سے جو سوال کیا تھا اس نے سالار کے خدشات کی تصدیق کی۔

میں چاہتا ہوں کہ ورلڈ بینک کانگو میں اس پراجیکٹ کو ختم کر دے۔۔ سالار نے بھی وقت ضائع کیئے بغیر کہا۔

تم مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو۔ اتنے سالوں سے شروع کیئے جانے والے ایک پراجیکٹ کو ورلڈ بینک ایک چھوٹے سے عہدیدار کے کہنے پر ختم کر دے کیونکہ اسے بیٹھے بٹھائے یہ فوبیا ہو گیا ہے کہ بینک کانگو میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے پراجیکٹس کو سپورٹ کر رہا ہے۔۔

وہ جو لیاپٹورڈ تھی جس نے بے حد تضحیک آمیز انداز میں سلگا دینے والی مسکراہٹ کیساتھ سالار سے کہا تھا۔

اگر میں فوبیا کا شکار یا یہ میرا دماغی خلل ہے تو یہ بیماری اس وقت ان جنگلات میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کو لاحق ہو چکی ہے۔۔۔ سالار نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

تم کیا ہو؟ کس حیثیت میں کانگو میں بیٹھے ہو؟ ورلڈ بینک کے ایک ایمپلوائی کے طور پر یا ایک ہیومن رائٹ ایکٹوسٹ کے طور پر؟؟ کانگو کے لوگ یا پگمیز تمہارا درد سر نہیں ہے تمہاری ترجیح صرف ایک ہونی چاہیے کہ تم مقررہ وقت پر پراجیکٹ مکمل کرو۔۔

اس بار بات کو ترشی سے کاٹنے والا الیگزینڈر رائیل تھا۔ جو ورلڈ بینک کے صدر کے قریبی معاونین میں سے ایک تھا۔

تم نے وہ کانٹریکٹ پڑھا ہے۔۔ وہ شرائط و ضوابط پڑھے ہیں جس سے اتفاق کرتے ہوئے تم نے سائن کیئے تھے۔ تم اپنے کانٹریکٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔۔۔ اور بنک تمہیں جاب سے نکالنے کا پورا اختیار رکھتا ہے اسکے بدلے میں۔

میں نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے اور ورلڈ بینک کا چارٹر بھی پڑھا ہے دونوں میں کہی بھی یہ نہیں لکھا کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنا پڑے گا جو بنیادی انسانی حقوق اور کسی ملک کے قوانین کی دھجیاں اڑا کر ہو سکے۔۔ اگر ایسی کوئی شق میرے کانٹریکٹ میں شامل تھی تو آپ مجھے ریفرنس دے۔

الیکٹرانڈ ررافیل چند لمحے بول نہ سکا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اور مسلسل تناؤ میں رہنے کی وجہ سے وہ مستقل جھریوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اور تم اپنے آپ کو ان لوگوں سے زیادہ قابل سمجھتے ہو جنہوں نے یہ پراجیکٹ کی سال کی تحقیق کے بعد شروع کیا تھا۔ تم سمجھتے ہو جن لوگوں نے فنر بلٹی بنائی تھی وہ ایڈیٹس تھے۔۔۔ وہ اب تضحیک آمیز انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔۔

نہیں۔۔۔ وہ ایڈیٹس نہیں تھے۔۔۔ نہ میں ایڈیٹ ہوں۔۔۔ وہ فیئر نہیں تھے اور میں ہوں۔ بات صرف اس دیانت کی ہے جو فنر بلٹی تیار کرتے وقت نظر انداز کی گئی ہے

ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس پراجیکٹ کی فزبلٹی رپورٹ تیار کرنے والے اتنے عقل کے اندھے اور نااہل ہو کہ انہیں وہ سب نظر نہ آیا ہو جو مجھے نظر آیا ہے اور میرے علاوہ لاکھوں مقامی لوگوں کو نظر آرہا ہے۔۔۔ ورلڈ بینک کو اس پراجیکٹ کے حوالے سے زیادہ انویسٹمنٹ کرنی چاہئے ایک انکوائری کمیٹی بنا کر۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کمیٹی نے دیانت داری سے کام کیا تو انہیں بھی یہ سب نظر آجائے گا جو مجھے نظر آرہا ہے۔۔۔ سالار نے رافیل کے ہتک آمیز جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں بہتر ہے کہ اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے لیے ایک کام کیا جائے جو واشنگٹن اور گومبے میں تمہارے آفس میں اس پراجیکٹ کے حوالے سے پیدا ہو گیا ہے۔

اس بار بولنے والا بل جاؤ لڑ تھا۔۔۔ تم ریزائن کر دو۔ جیسے تم نے پریزنٹیشن اور بینک کے ساتھ ہونے والی آفیشل خط و کتابت میں بھی آفر کیا تھا کہ اس پراجیکٹ کو تم اس طرح نہیں چلا سکتے۔۔۔ وہ بڑے تحمل اور رسانیت سے جیسے سالار سکندر کو صلاح دے رہا تھا۔

اگر یہ آپشن ورلڈ بینک کو مناسب لگتا ہے تو مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ مجھے

بھی اس مسئلے کا حل صرف میرا استعفیٰ نظر آ رہا ہے۔ لیکن میں اپنی استعفیٰ کی وجوہات میں اس پریزنٹیشن میں دیئے جانے والے سارے اعداد و شمار کو بھی شامل کروں گا اور اپنے تحفظات بھی لکھوں گا اور میں اس استعفیٰ کو پبلک کروں گا۔

بورڈ روم میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی تھی۔ وہ بلا آخر اس ایک نکتے پر آ گئے تھے جسکے لیے اس نے سالار کو واشنگٹن طلب کیا تھا۔ جو ورلڈ بینک کے گلے میں ہڈی کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ بورڈ روم میں بیٹھے ان سات افراد کے صرف دو ٹاسک تھے۔ یا سالار کو اس پراجیکٹ کے چلانے کے لیے راضی کر لیا جائے یا پھر اس سے خاموشی سے استعفیٰ لیا جائے اور وہ ذاتی وجوہات کی بناء پر ہو۔ اب مسئلہ اس سے بڑھ گیا تھا۔ وہ نہ صرف استعفیٰ میں یہ سب کچھ لکھنا چاہتا تھا بلکہ اسے پبلک بھی کرنا چاہتا تھا۔

اگلے تین گھنٹے وہ ساتوں سالار کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے ہر حربہ استعمال کر لیا تھا۔ جب دلیلوں سے کام نہیں بنا تو انہوں نے بینک کے کانٹریکٹ میں استعفیٰ کے حوالے سے کچھ شقوں کو اٹھا کر اسے دھمکی دی تھی کہ وہ جاب کے دوران اپنے علم میں لائے گئے تمام فرو فیشنل معلومات کو صیغہ راز میں رکھنے کا پابند ہے۔ اور استعفیٰ کو پبلک کرنے اور اس رپورٹ کو میڈیا پر لانے پر اس کے خلاف قانونی

کاروائی کی جاسکتی تھی۔ اور اسے نہ صرف مالی طور پر لمبا چوڑا ہر جانہ بھرنا پڑتا بلکہ وہ آئندہ بینک یا اس سے منسلک کسی بھی چھوٹے بڑے ادارے کی جاب کرنے کے لیے نااہل قرار دیا جاتا۔۔۔ سالار کو پتا تھا یہ دھمکی نہیں تھی۔۔۔ بہت بڑی دھمکی تھی۔۔۔

دباؤ اور دھمکیاں جتنی بڑھتی گی سالار سکندر کی ضد بھی اتنی ہی بڑھتی گی۔ اگر سکندر عثمان کہتے تھے کہ ڈھٹائی میں اسکا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تو وہ ٹھیک کہتے تھے۔

تم کیا چاہتے ہو؟؟ تین گھنٹے کے بعد بلا آخر مائل نے اسکی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے

ہوئے اس سے پوچھا۔۔۔۔۔

ایک غیر جانبدارانہ انکوائری ٹیم جو نئے سرے سے اس پراجیکٹ کا جائزہ لے۔ اور

اسکے بعد پگمیز اور ان بارانی جنگلات کے بہترین مفاد میں اس پراجیکٹ کو ختم۔ کیا

جائے۔ یا کوئی ایسا حل نکالا جائے جو اس جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے لیے

قابل قبول ہو اور میں مقامی لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہاں کی مقامی حکومت کی بات

نہیں کر رہا۔۔

سالار نے جو اب اوہی مطالبہ دہرایا۔

تمہاری قیمت کیا ہے؟ الیگزینڈر نے سالار کو جیسے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔۔ کوئی تو ایسی چیز ہوگی جسکے لیے تم اس مطالبے سے ہٹ جاؤ۔۔ ہمیں بتاؤ وہ کونسی ایسی چیز ہے جس پر تم ہم سے سودا کر لو۔۔ رائیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ سالار نے ٹیبل پر رکھی اپنی چیزیں سمیٹنی شروع کر دی۔

میری کوئی قیمت نہیں۔۔ اور میں نے ورلڈ بینک کو اسی غلط فہمی میں جوائن کیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کروں گا جو دنیا میں اپنی پروفیشنل مہارت اور قابلیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ اگر بروکرز کے ساتھ کام کرنا ہوتا تو بیچنے خریدنے اور قیمت لگانے والا تو اسٹاک ایکسچینج میں کرتا یا کسی بینک میں انویسمنٹ بنگنگ۔۔۔

وہ نرم لہجے میں انکے منہ پر جو تمار گیا تھا۔ اور اس چوٹ کی شدت وہاں بیٹھے ساتوں نے ایک ساتھ محسوس کی۔ وہ سادہ زبان میں انہیں دلالت کہہ رہا تھا اور ٹھیک کہہ رہا تھا۔

ان ساتوں میں سے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا۔۔۔ سستے ہوئے اور تنے ہوئے چہروں کیساتھ وہ بھی اپنے کاغذات اور لیپ ٹاپ سنبھالنے لگے تھے۔ میٹنگ بغیر کسی نتیجے کے ختم ہوگی تھی۔ اور سالار کو اندازہ ہوا تھا کہ اسکے بعد ورلڈ بینک میں اسکا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔۔۔۔

وہ میٹنگ ہیڈ کوارٹر میں ہونے والی ہر میٹنگ کی طرح ریکارڈ ہوئی تھی۔۔۔ لیکن سالار کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ میٹنگ براہ راست کسی دوسری جگہ بھی پیش کی جا رہی تھی۔ سالار کے اس بورڈ روم سے نکلنے سے پہلے اس سے نمٹنے کے لیے دوسری حکمت عملی طے ہو گئی تھی۔

الیگزینڈر رائیل سالار کے پیچھے آیا تھا اور اس نے چند منٹوں کے لیے سالار سے علیحدگی میں بات کرنا چاہی۔۔۔ سالار کچھ الجھا لیکن پھر آمادہ ہو گیا۔ وہ کونسی بات تھی جو میٹنگ میں نہیں کہی جاسکتی تھی اور یہاں کہی جا رہی تھی۔ الیگزینڈر رائیل کے آفس میں وہ مزید اسی پیرائے کی کوئی گفتگو سننے کی توقع کیسا تھا گیا تھا مگر اپنے آفس میں الیگزینڈر رائیل کا رویہ ان کے ساتھ حیران کن طور پر مختلف تھا۔

مجھے یہ ماننے میں کوئی شبہ نہیں کہ میں تمہاری رپورٹ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور صرف میں نہیں پریزیڈنٹ بھی۔۔۔ اسکے پہلے ہی جملے نے سالار کو حیران کر دیا۔ صدر ہمیشہ تم سے بہت ساری توقعات رکھتے تھے۔ افریقہ کے لیے جو وژن انکا ہے انکو صرف تم عملی جامہ پہنا سکتے ہو اور یہ پراجیکٹ ان سینکڑوں پراجیکٹس میں سے بہت چھوٹا پراجیکٹ ہے جو وہ تمہارے لیے سوچتے ہیں وہ بہت بڑی شے

ہے۔ تمہارے ذریعے افریقہ کی تقدیر بدلی جاسکتی ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صدر افریقہ لے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں۔ وہ وہاں سے غربت اور بھوک مٹانا چاہتے ہیں۔ ایسا کا ایک بے وقوف آدمی ہے۔۔ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے جو افریقہ کی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔

تم نے کوئی سوال نہیں کیا۔۔ رائیل کو اسکی خاموشی چھپی۔ اگر وہ سالار کو صدر کے حوالے سے تعریفی کلمات پہنچا کر جوش دلانا چاہتا تھا تو وہ ناکام ہو رہا تھا۔ سالار کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

میرے پاس جو بھی سوال تھے وہ میں اپنی رپورٹ میں اٹھا چکا ہوں مجھے خوشی ہے کہ صدر افریقہ میں میرے کام سے اور اس رپورٹ سے متاثر ہے۔ لیکن میں زیادہ خوش تب ہوں گا جب اس رپورٹ پر مجھے ورلڈ بینک سے کوئی پازمیٹورسپانس آئے گا۔

بنک تمہیں وائس پریزیڈنٹ کا عہدہ دینا چاہتا ہے اوت یہ پریزیڈنٹ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں امریکن گورنمنٹ سے بھی بات ہوئی ہے انکی۔

رائیل ایسے بات کر رہا تھا جیسے بہت بڑے راز افشا کر رہا ہو اس پر۔۔ اسکی مایوسی کی انتہا نہ رہی تھی جب اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے اپنے سے پندرہ سال چھوٹے اس

مرد کے چہرے کو اس خبر پہ بھی بے تاثر پایا۔۔

اور اس عہدے کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہے؟؟ رافیل کو اتنی لمبی تقریر کے بعد اتنا دو ٹوک سوال سننے کی توقع نہیں تھی۔۔

پریزیڈنٹ کو اس پراجیکٹ پر تمہاری سپورٹ چاہیے۔۔ مطلق اور غیر مشروط سپورٹ۔۔

رافیل نے اب تمہیدوں میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔۔

میرا خیال ہے وہ میں نہیں دے سکوں گا۔۔ اس پراجیکٹ کے حوالے سے میں اپنی رائے بتا چکا ہوں۔۔۔ مراعات اور عہدے میرے سٹینڈ کو نہیں بدل سکتے۔۔ کیا کچھ اور کہنا ہے؟؟

سالار سکندر کو رافیل اس ملاقات سے پہلے کچھ نہیں سمجھتا تھا اور اب اسے بے وقوف سمجھ رہا تھا۔۔ اتنا بڑا عہدہ اسے پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔۔ غرور تھا تو بے جا تھا۔۔ بے وقوفی تھی تو انتہا کی۔

تمہیں سب کچھ آتا ہے۔ ٹیکٹ نہیں آتے اس لیے تم کامیابی کے سب سے اوپر والے

زینے پر کبھی کھڑے نہیں ہو سکو گے۔ وہ اس سے ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا پھر بھی کہہ بیٹھا تھا۔۔

اگر ٹیکٹ فل کا مطلب بے ضمیر اور بددیانت ہونا ہے تو پھر یہ خصوصیت میں کبھی اپنے اندر پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔۔ میں اپنا استعفیٰ آج ہی میل کر دوں گا۔۔۔ سالاراٹھ کھڑا ہوا۔۔

*****-----*****

سالار جب ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر سے نکلا اس وقت بوند اباندی ہو رہی تھی۔ وہ کیب پر وہاں آیا تھا اور واپس بھی اسی میں جانا تھا مگر جو کچھ پچھلے چند گھنٹوں میں اندر بھگت آیا تھا۔ اسکے بعد وہ بے مقصد پیدل فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ چلتے چلتے اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند دن پہلے تک اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین انسان سمجھتا تھا اور اب چند گھنٹوں بعد دنیا کا بے کار ترین انسان۔۔

کچھ عجیب سی ذہنی کیفیت تھی اسکی۔ فی الحال کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔۔ کوئی میٹنگ کوئی وزٹ کوئی ایجنڈا۔۔ کوئی فون کال ای میل کوئی پریزنٹیشن بھی نہیں۔۔ لیکن سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ایک لمحے کے لیے چلتے چلتے اسے خیال آیا

کیا ہوا اگر وہ سمجھوتہ کر لے وہی سے واپس ہیڈ کوارٹر چلا جائے۔ وہ پیش کش قبول کر لے جو ابھی اسے کی گئی تھی۔ کوئی مشکل اور ناممکن تو نہیں تھا یہ۔۔ ابھی سب کچھ اسکے ہاتھ میں تھا۔۔ ورلڈ بینک میں پہلے سے بھی بڑا عہدہ مل جاتا اسے۔ کیا برائی تھی اگر وہ کچھ دیر کے لیے ضمیر کو سلا دیتا۔۔ کانگواس کا ملک نہیں۔۔ نا ہی پگمیرا اسکے لوگ۔۔۔۔ پھر؟؟؟

واقعی ٹھیک کہا تھا رافیل نے وہ کیوں یہ سب کر رہا تھا انکے لیے۔۔ اور یہ سب کرتے کرتے اپنے آپکو یہاں لایا تھا۔ جہاں آگے کنواں تھا پیچھے کھائی۔۔ لیکن پھر اسے وہ غربت اور بد حالی نظر آئی جو اس نے وہاں کے لوگوں میں دیکھی تھی۔ وہ امید بھری نظریں یاد آئی تھی۔۔ جن سے وہ اسے دیکھتے تھے۔ کاغذات کا وہ پلندہ یاد آیا جس کا ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا کہ وہاں انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ وہ غلامانہ استحصال تھا جو اس کا مذہب چودہ سو سال پہلے ختم کر چکا تھا۔۔

اور یہ سب یاد کرتے ہوئے اسے امامہ بھی یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے سیل فون نکال کر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی پر نہیں ہوا۔ ایک عجیب سی اداسی اور تنہائی نے اسے آگھیرا تھا۔

سوچوں کی رفتار ایک دم ٹوٹی تھی۔ وہ کس بحران میں کیا سوچنے بیٹھ گیا۔ اس نے ہر منفی سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ شاید یہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہو رہا تھا اس نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ رکھ کر اس نے معمول کے انداز میں ٹی وی آن کیا تھا۔ ایک مقامی چینل پر واشنگٹن میں صبح سویرے ہونے والے ایک ٹریفک حادثے کی خبر چل رہی تھی۔ جس میں دو مسافر موقع پر مر گئے تھے۔ جبکہ تیسرا شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں تھا سالار نے ہاتھ میں پکڑے ریمورٹ سے چینل بدلنا چاہا لیکن پھر سکریں پر چلنے والی ایک ٹکر کو دیکھتے ہوئے جامد ہو گیا۔ اسکرین میں اسکرول پر اب اس حادثے کی تفصیلات دی جا رہی تھی اس میں زخمی ہونے والے شخص کا نام پیٹرس ایبا کا بتایا جا رہا تھا جو کہ ایک انقلابی تھا۔ اور سی این این کے ایک پروگرام میں شرکت کے لیے آ رہا تھا۔ سالار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

سالار جانتا تھا کہ وہ امریکہ میں ہے کی دنوں سے۔ وہ امریکہ روانہ ہونے سے پہلے اس سے ملنے آیا تھا اور اس نے سالار کو بتایا تھا کہ اس کے کچھ دوستوں نے بلا آخر بڑی

کوششوں کے بعد کچھ بڑے نیوز چینلز کے نیوز پروگرامز میں اسکی شرکت کے انتظامات کیئے تھے۔

اسکا مطلب ہے کہ چھری میری گردن پر گرنے والی ہے۔ سالار نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ تم اگر اس پراجیکٹ کے حوالے سے ورلڈ بینک اور اسکے عہدیداران پر تنقید کرو گے تو سب سے پہلے میں ہی نظر میں آؤں گا۔ اور یہ چینلز مجھ سے رسپانس کے لیے رابطہ کریں گے۔

سالار کو اس مشکل صورت حال کا اندازہ ہونے لگا تھا جس میں وہ پیٹرس ایبا کا کے انٹرویوز کے بعد پھنستا۔ وہ آتش فشاں جو عرصے سے پک رہا تھا اب پھٹنے والا تھا۔ اور بہت سو کو ڈبونے والا تھا۔

میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ ایبا کا نے اسے یقین دلایا تھا۔ میں تم پر کوئی تنقید نہیں کروں گا۔ بلکہ تمہاری سپورٹ کے لیے تمہاری تعریف کروں گا۔ تم اب آئے ہو یہ پراجیکٹ تو پہلے سے جاری ہے۔

ایبا کا بے حد سنجیدہ تھا لیکن سالار کیساتھ ساتھ وہ خود بھی یہ جانتا تھا کہ اسکی یہ یقین دہانی ایک خوش فہمی تھی۔ سالار اس پراجیکٹ کی سربراہی کر رہا تھا۔ اور نہ ہی اسے جمعہ

جمعہ چار دن ہوئے تھے وہاں آئے۔۔۔

اسے بھی میڈیا کی شدید تنقید کا سامنا ہونے والا تھا۔

تم جلد سے جلد ورلڈ بینک چھوڑ دو۔ میں تمہاری رپورٹ کا حوالہ دوں گا کہ تم اس

پراجیکٹ سے ناخوش تھے اور تمہارے اس پوزیشن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہی

ہے۔۔۔ ایسا کانے جیسے اسے ایک راہ دکھائی تھی۔

میں اس سے پہلے ایک کوشش ضرور کروں گا کہ بینک کو مجبور کر سکوں کہ اس

پراجیکٹ پر نظر ثانی کرے۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ دونوں کا آخری رابطہ تھا۔ نیوز چینل بتا رہا تھا کہ بچنے والے مسافر کی حالت تشویش

ناک تھی۔ اس نے اپنا فون نکال کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ایسا کہاں لے جایا

گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا لیکن ایک دم اس کا فون رابطوں کے مسائل کا شکار ہونے لگا

تھا۔ کچھ دیر پہلے امامہ اور اب بھی وہ یہاں لوکل کال بھی نہیں کر پارہا تھا۔ کچھ دیر سیل

فون کیساتھ مصروف رہنے کے بعد اس نے جھنجھلا کر کمرے میں موجود فون لائن اٹھا

کر اسے استعمال کرنے کی کوشش کی وہ لائن بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ سالار حیران

ہوا تھا۔ وہ ایک فائبر آپٹک ہوٹل میں تھا اور اسکی فون لائن کا کام نہ کرنا حیران کن ہی

تھا۔ اس نے انٹرکام پر آپریٹر کے ذریعے ایک کال بک کروائی تھی۔۔۔

اگلا آدھا گھنٹہ وہ آپریٹر کی کال کا انتظار کرتا رہا۔۔ سالار کو لگا جیسے س کو کسی سے بھی رابطہ کرنے سے روکا جا رہا ہے۔۔ اس بار کبھی بھی خود کال کرنے کی بجائے اس نے ریسیپشنسٹ سے کہا تھا کہ وہ اسے پولیس انکوائری سے پتا کر کے بتائے کہ آج صبح واشنگٹن میں ہونے والے اس ٹریفک حادثے کے زخمی کو کہاں لے جایا گیا تھا۔۔ اس نے چند ہی منٹوں میں سالار کو اسپتال کا نام بتا دیا۔ سالار نے اسکو کانگو میں اپنا گھر اور امامہ کا سیل فون نمبر دیا تھا۔ وہ اگلی کال وہاں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں رابطہ نہ ہو سکا۔ اسپتال پہنچ کر پیٹرس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا لیکن اسے ایبا کا سے ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ مخدوش حالت میں تھا اور اسکی سرجری کے بعد اسے مصنوعی تنفس پر رکھا گیا تھا۔ اپنے آپ کو ایبا کا کا رشتہ دار ظاہر کرنے پر اسے بحر حال دور سے دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ مگر استقبالیہ پر موجود شخص نے اسے بے یقینی اور شبہ کی نظر سے دیکھا۔ ایک پگمی اور ایک ایشیائی کی رشتہ داری کیسے ممکن تھی۔

اسپتال کی آئی سی یو میں نلیوں تاروں اور پیٹیوں میں جکڑے ایبا کا کو وہ پہلی نظر میں پہچان نہ پایا۔ سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔۔ اسکا اور ایبا کا کا انسانیت کا

رشتہ تھا صرف پھر بھی وہ عجیب غمزہ حالت میں کھڑا تھا وہاں۔

وہاں کھڑے کھڑے سالار کو ایک بار پھر خیال آیا کہ وہ چاہتا تو اب بھی سب ٹھیک کر سکتا تھا ایسا کام رہا تھا اور اسکے مرنے کیساتھ ہی وہ سارے حقائق و شواہد بھی غائب ہونے والے تھے۔۔۔ پگمیز کو فوری طور پر ایسا کا متبادل نہیں مل سکتا تھا۔ جو کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے حق کی بات اس دبنگ انداز میں کہہ سکتے جس انداز میں ایسا کہتا تھا۔۔۔ شاید یہ ایک موقع اسے قدرت دے رہی تھی۔۔۔ وہ

الجھا۔۔۔ بھٹکا۔۔۔ ضمیر کا چابک ایک بار پھر اس پر برسایا تھا۔

اسکے اپنے ہوٹل واپسی پر ایک اور بڑا سانحہ اسکا منتظر تھا۔ اسکے کمرے میں اسکا لاکر کھلا ہوا تھا۔ اور اس میں موجود اسکا پاسپورٹ اور کچھ دوسرے اہم ڈاکو مینٹس غائب تھے اور اس کا وہ بیگ بھی غائب تھا جس میں اسکا لیپ ٹاپ اور اس رپورٹ سے متعلقہ تمام ثبوتوں کی کاپیاں تھی۔ سالار کو چند لمحے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ اسکا کمرہ ہے۔

بے حد طیش کے عالم۔ میں اس نے فون اٹھا کر فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کی اطلاع مینیجر کو دی اور اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ مینیجر اور سیکیورٹی گارڈز کے اسکے کمرے میں آنے پر اسکا دماغ یہ جان کر بھک سے اڑ گیا کہ اس

پورے فلور پر صفائی سے متعلقہ کام کرنے کے لیے پچھلے دو گھنٹے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمرے آف کیئے گئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے اسکے ہاتھ پاؤں کٹ گئے۔ اسکے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اس لیپ ٹاپ اور اس بیگ میں تھا۔ اسکی ایک کاپی اسکے پاس اور ایک گومبے میں اسکے گھر کے باس لاکر میں جو امامہ کی تحویل میں دیکر آیا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے ایک عجیب سا خوف سا محسوس کیا تھا۔ ایبا کا ایک حادثے میں زخمی ہونا اب اسے ایک اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی تھا جو ایبا کو نقصان پہنچانے کے بعد اسکے ہاتھ پیر کاٹ رہا تھا۔ اسے بے بس کر رہا تھا۔ پہلا خیال جو اس وقت اسے آیا تھا وہ امامہ اور اپنے بچوں کا تحفظ تھا۔ ان سے رابطہ ہر قیمت پر ضروری تھا۔ اسے امامہ کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ ان ڈاکو مینٹس کیساتھ پاکستان ایبمیسسی یا کسی پولیس اسٹیشن چلی جائے کم از کم تب تک جب تک وہ خود وہاں نہیں پہنچ جاتا۔

اس نے مینیجر سے کہا تھا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کروانا چاہتا ہے اسکی قیمتی چیزوں کی حفاظت یقیناً ہوٹل کی ذمہ داری نہیں تھی لیکن کم از کم ہوٹل اتنی ذمہ داری تو دکھاتا کہ اسکی عدم موجودگی میں اس فلور کے سی سی ٹی وی سسٹم کو آف نہ کیا جاتا۔

مینجر نے معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر اسے اس نقصان کی تلافی کی آفر کی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ پولیس کو اس معاملے میں انوالونہ کرے۔ لیکن سالار اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا وہ اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلا تھا وہ اس ہوٹل سے بھی باہر نکل آیا تھا۔۔۔

ایک فون بوتھ سے اس نے ایک بار پھر کانگو میں گھر اور امامہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی نتیجہ وہی آیا تھا اسکا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔۔۔

اس نے بلاخر پاکستان میں سکندر عثمان کو فون کیا تھا اور جب اسے فون پر انکی آواز سنائی دی تو کچھ دیر کے لیے اسے یقین نہیں آیا کہ وہ بلاخر کسی سے بات کرنے میں کامیاب ہو پارہا تھا۔ سکندر کو بھی اسکی آواز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ پریشان تھا۔

سالار نے کوئی تفصیلات بتائے بغیر مختصر انہیں بتایا کہ وہ اپنے سفری دستاویزات گم کر چکا ہے اور اس وجہ سے وہ فوری طور پر اگلی فلائٹ سے واپس نہیں جاسکتا۔ اور وہ امامہ سے رابطہ نہیں کر پارہا۔ اس نے سکندر سے کہا کہ وہ پاکستان سے امامہ کو کال کریں اور اگر رابطہ نہ ہو سکے تو پھر فارن آفس میں اپنے جاننے والوں کے ذریعے کنشاسا میں پاکستان ایمبیسی کے ذریعے انہیں تلاش کریں

اور فوری طور پر اس سے کہے کہ لا کر میں پڑے سارے ڈاکو مینٹس سمیت ایم بی سی چلی جائے۔۔ سکندر عثمان بری طرح ٹھٹکے۔

ایسا کیا ہوا ہے کہ تمہیں یہ سب کرنا پڑ رہا ہے۔ سالار سب ٹھیک ہے نا۔۔

پاپا اس وقت آپ صرف وہ کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔۔ میں تفصیل آپکو بعد میں بتاؤں گا۔۔ وہ جھنجھلا گیا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک آپکو خود کال کر کے پوچھتا ہوں آپ میرے فون پر کال مت کریں نہ ہی میرے نمبر پر میرے لیے کوئی میسج چھوڑیں۔۔ اس نے باپ کو مزید تاکید کی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سالار تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔ سکندر عثمان کا ان ہدایات کو سن کر خوفزدہ ہونا لازمی تھا۔

سالار نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ باپ کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اسکے اپنے حواس اس وقت اس سے زیادہ خراب ہو رہے تھے۔ فون بوتھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک بیچ پر بیٹھے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو ملامت کی تھی اسے اپنی فیملی کو کانگو میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔۔ اور ان حالات میں۔۔۔ میٹنگ جاتی بھاڑ میں۔۔۔ وہ اسے آگے

پیچھے کروا دیتا۔۔۔ کیا ضرورت تھی اتنی مستعدی دکھانے کی۔۔۔

اب رات ہو رہی تھی اور صبح سے لیکر اس وقت تک اسکے سیل پر نہ کوئی کال آئی تھی نہ ٹیکسٹ میسج۔۔۔ فون سگنلز کو بہترین حالت میں دکھا رہا تھا مگر سالار کو یقین تھا اس کا فون اور فون کے ذریعے ہوئے اسکے رابطوں کو کنٹرول کیا جا رہا تھا۔۔۔ اور کس لیے۔۔۔ وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔۔۔

وہ اگر اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو ان سب ہتھکنڈوں کے بغیر نقصان پہنچاتے جیسے ایسا کا پروا کیا تھا۔۔۔ اور اگر اسے بنک سے نکالنا تھا تو یہ کام تو وہ خود کر رہا تھا۔ پھر یہ سب کیوں؟؟؟

اسکی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے سنسناہٹ ہوئی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا وہ لوگ اسے احساس دلانا چاہتے تھے کہ اسے مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ اسے نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ اور کس کس قسم کا۔۔۔ اور اسے یہ بھی بتایا جا رہا تھا اور یہ سب ورلڈ بینک نہیں کر سکتا۔۔۔ صرف ورلڈ بینک نہیں۔۔۔ اسے سی آئی اے چیک کر رہی تھی۔۔۔ پتا نہیں جو پسینے چھوٹے تھے وہ جسم کے ٹھنڈا ہونے پر چھوٹے تھے یا گرم ہونے پر۔۔۔۔۔۔ لیکن سالار کچھ دیر کے لیے پانی میں نہا گیا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل

خالی تھا۔۔ یہ اسکے فرشتوں نے بھی کبھی نہیں سوچا ہو گا کہ وہ کبھی ایسے معاملے میں انوالو ہو سکتا ہے کہ سی آئی اے اسکے پیچھے پڑ جاتی اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پراجیکٹ ورلڈ بینک کی خواہش نہیں امریکہ کی خواہش تھا۔ اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔۔۔

وہ ڈیڑھ گھنٹہ وہاں بت کی طرح بیٹھا رہا۔۔ اسے تین دن کے لیے واشنگٹن میں رہنا تھا لیکن اب اپنی سفری دستاویزات گم ہو جانے کے بعد اسے یقین تھا وہ فوری طور پر واپس نہیں جاسکتا۔ کم از کم تب تک جب تک وہ ان مطالبات میں کوئی لچک نہ دکھاتا جو وہ ان سے کر رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹہ بعد اس نے سکندر عثمان کو دوبارہ فون کیا تھا اور انہوں نے اسے بتایا کہ امامہ اور اسکے بچے گھر پر نہیں ہے۔ گھر لاکڈ ہے اور وہاں کوئی ملازم یا گارڈ نہیں ہے۔ جو انکے بارے میں کوئی اطلاع دیتا۔۔ ایم بی سی کے افسران نے اس سلسلے میں کانگو کے وزارت داخلہ سے رابطہ کیا تھا مگر جو بھی پتا چلتا اسکی فیملی کے بارے میں وہ فوری پتا نہیں چل سکتا تھا۔۔ کچھ وقت تو لگتا ہے۔۔۔

جو کچھ وہ فون پر سن رہا تھا۔ اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ امامہ

اور اسکے بچے کہی نہیں جاسکتے تھے۔۔ اس سے پوچھے اور اسے اطلاع دیے
 بغیر۔۔۔۔۔ گارڈبنک کے فراہم کیئے ہوئے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گھر لاکڈ ہونے پر
 وہ بھی وہاں سے چلے گئے۔۔۔

میں کوشش کر رہا ہوں فوری طور پر ایمبیسی میرے ویزے کا انتظام کرے اور میں
 وہاں جا کر خود اس سارے معاملے کو دیکھوں۔۔۔۔۔ سکندر اسے تسلی دینے کی
 کوشش کر رہے تھے۔

تم بھی کوشش کرو کہ فوری طور پر وہاں پہنچو۔۔ امریکن ایمبیسی کو اسکی گمشدگی کی
 اطلاع دو۔ تم تو امریکن نیشنل ہو تمہارے بچے بھی۔۔۔ وہ ہماری ایمبیسی سے زیادہ
 مستعدی سے انہیں تلاش کر لینگے۔۔۔

سکندر نے ایک راستہ دکھایا تھا اور بالکل ٹھیک دکھایا تھا۔ لیکن وہ باپ کو اس وقت یہ
 کہہ نہ پایا کہ وہ امریکن گورنمنٹ کیساتھ ہی الجھ پڑا ہے۔۔۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے
 گا سالار تم پریشان مت ہو۔۔ کانگو میں ابھی اتنا بھی اندھیر نہیں مچا کہ تمہاری فیملی اس
 طرح غائب ہو جائے۔۔۔۔۔ جواب میں کہنے کے لیے سالار کے پاس کچھ نہ
 تھا۔۔۔ مزید کچھ کہے اس نے فون رکھا اور فون بوتھ سے آگیا تھا۔۔۔ اس فون بوتھ

سے واپس ہوٹل جانے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے لیکن اس وقت وہ پانچ منٹ سے پانچ ہزار سال لگ رہے تھے۔۔۔ آزمائش تھی کہ بلا کی طرح اسکے سر پر آئی تھی اور اس بھی زیادہ اسکی فیملی کے سر پر۔۔۔

وہ ہوٹل لے کرے میں آکر دروازہ بند کر کے خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔۔۔ وہ بے اختیار چیخیں مارتا رہا تھا۔ اس ہوٹل کے ساتویں فلور کے ایک ڈبل گلیز ڈیشیوں والے ساؤنڈ پروف کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیئے وہ اسکے ساتھ چپکا پاگلوں کی طرح چلاتا رہا۔۔۔ بلکل اس طرح جب کی سال پہلے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک۔ تاریک رات میں ایک درخت سے بندھا چلاتا رہا تھا۔۔۔ بے بسی کی وہی انتہا اس نے آج بھی محسوس کی تھی۔۔۔ اور اس سے زیادہ شدت سے محسوس کی تھی کیونکہ تب جو بھی گزر رہا تھا اسکے اپنے اوپر گزر رہا تھا اور آج جو بھی گزر رہا تھا اسکی بیوی اور کم سن بچوں پر گزر رہا تھا۔ اور انکو پہنچنے والی تکلیف کا تصور بھی سالار کو جیسے صلیب پر لٹکا رہا تھا۔۔۔ وہ لوگ جو اسکے اعصاب کو شل کرنا چاہتے تھے وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ اگر اسے اونڈھے منہ دیکھنا چاہتے تھے تو وہ اونڈھے منہ پڑا تھا۔۔۔

وہ رات سالار پر بہت بھاری تھی۔۔۔ وہ ساری رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں

سویا۔۔ امامہ۔۔ جبریل اور عنایہ کے چہرے اسکی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے تھے۔
 اگلی صبح وہ آفس کے اوقات شروع ہونے سے بہت دیر پہلے ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر
 پہنچا تھا۔۔۔

الیکزنڈر رافیل نے سالار کو اپنے کمرے کی طرف آتا ہوا بڑے اطمینان سے دیکھا
 تھا۔ یہ وہ سالار نہیں تھا جو کل یہاں آیا تھا۔ ایک دن اور ایک رات نے اسے پہاڑ سے
 مٹی کر دیا تھا۔

مجھے صدر سے ملنا ہے۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 اس نے آتے ہی جو جملہ کہا رافیل اس جملے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ وہ
 اس سے کہے گا کہ وہ اسکی تمام شرائط ماننے کے لیئے تیار ہے۔

پریزیڈنٹ سے ملاقات۔۔۔۔۔ بہت مشکل ہے یہ تو۔۔۔۔۔ کم از کم اس مہینے میں تو یہ
 ممکن نہیں۔۔۔ اور پھر اس ملاقات کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی تمہیں۔۔۔ اگر
 تمہیں وہ سب دہرانا ہے جو کل کہا تھا تو وہ میں ان تک پہنچا چکا ہوں۔۔۔

کچھ لمحوں کے لیئے سالار کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔۔۔ وہ ورلڈ بینک کے اس دفتر

میں رونا نہیں چاہتا تھا لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا۔۔۔

کنشاسا میں کل سے میری فیملی غائب ہے۔ میری بیوی۔۔۔ میرا بیٹا اور میری بیٹی۔۔۔ اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس نے رافیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔۔۔

اوہ۔۔۔۔۔ بہت افسوس ہوا۔۔۔ تمہیں فوری طور پر واپس جانا چاہیے کانگو، تاکہ پولیس کی مدد سے اپنی فیملی کو برآمد کروا سکو۔۔۔

میرا پاسپورٹ اور سارے ڈاکو مینٹس گم ہو چکے ہیں ہوٹل کے کمرے سے سب کچھ غائب ہوا ہے کل۔۔۔ اور اب میں کل واپس کنشاسا نہیں جاسکتا۔۔۔ مجھے نہیڈ کوارٹر کی مدد چاہیے اپنے پاسپورٹ اور دوسرے دستاویزات کے لیے۔۔۔ اور مجھے ورلڈ بینک سے فوری طور پر ڈاکو مینٹس چاہیے تاکہ میں اپنا پاسپورٹ لے سکوں۔۔۔

رافیل نے اسکی بات خاموشی سے سننے کے بعد اسے بڑی سرد مہری سے کہا۔۔۔

ان حالات میں ورلڈ بینک تمہیں نئے پاسپورٹ کے لیے کوئی لیٹر جاری نہیں کر سکتا

کیونکہ تم آج ریزائن کر رہے ہو۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں معمول کے طریقہ کار کے مطابق پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرنا چاہیے اور پھر کانگو جانا چاہیے۔۔۔ ایک ویزٹ کے طور پر۔۔۔۔۔ اگر تم ورلڈبنک کے ایمپلائی ہوتے تو ہم تمہاری فیملی کے لیے کسی بھی حد تک جاتے لیکن اب انکا تحفظ ہماری ذمہ داری نہیں۔۔۔ تمہارے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم کنٹنٹس میں امریکن ایمبسی سے رابطہ کرو یا پاکستان ایمبسی سے۔۔۔ تم اور بچنلی پاکستان سے ہونا؟؟

سالار اس کے اس تضحیک آمیز جملے کو شہد کے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ رافیل کے دو ٹوک انکار نے اسکے ذہنی ہیجان میں اضافہ کر دیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی مغربی ادارے سے اتنی شدید نفرت نہیں ہوئی جتنی اس وقت اسے ورلڈبنک سے ہوئی تھی۔۔۔ وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اور صلاحیتیں مغرب کو دیتا آیا تھا۔ اقوام متحدہ اور اسکے باقی ادارے اور اب ورلڈبنک۔۔۔ کل تک وہ وہاں ایک خاص اسٹیٹس کیساتھ آتا رہا تھا اور آج وہ اس سے ایسا سلوک کر رہے تھے جیسے وہ ایک بھکاری ہو۔ جسکے لیے ورلڈبنک کے پاس کچھ نہیں۔

بعض لمحے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی کے لمحے ہوتے ہیں۔۔۔ صرف ایک لمحے کی

ضرورت ہوتی ہے۔۔ پہلی دفعہ مارگلہ کی پہاڑی پر موت کے خوف سے وہ اس طرز زندگی سے تائب ہوا تھا جو وہ گزارتا آیا تھا اور آج دوسری بار امامہ اور اپنے بچوں کی موت کے خوف اور ورلڈ بینک میں اپنے سینئرز کے ہاتھوں ملنے والی تذلیل کے بعد وہ فیصلہ کر بیٹھا تھا۔ جو وہ اب تک کتر اتار ہا تھا۔۔۔ بعض خوف سارے خوف کھا جاتے ہیں۔۔۔ سالار کیساتھ بھی اس دن وہی ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے اس نے اس دن یہ طے کیا تھا کہ وہ اگلے دس سال میں ورلڈ بینک سے بڑا ادارہ بنائے گا۔ وہ دنیا کے اس مالیاتی نظام کو الٹ دے گا جس پر مغرب قابض تھا۔۔

تم مزید کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟؟ رافیل نے بظاہر بے نیازی جتاتے ہوئے اس سے کہا۔

نہیں۔۔۔۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گیا۔۔۔ رافیل بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ اسے اپنی بیوی بچوں کی زندگی کے لیے گڑ گڑاتا دیکھنا چاہتا تھا۔۔ لیکن سالار سکندر ان حالات میں بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔۔۔ رافیل کو لگا اسکا ذہنی توازن خراب ہو چکا تھا۔۔۔

ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے اس طرح نکلتے ہوئے سالار کو خود بھی ایسے لگا تھا جیسے اسکا ذہنی توازن خراب ہو چکا تھا۔ اور وہ اتنا بے حس اور بے رحم تو نہیں ہو سکتا تھا کہ امامہ

اور بچوں کے لیے وہاں کچھ بھی کیئے بغیر آجائے۔ وہ وہاں کمپرو مائز کرنے گیا تھا اپنی بیوی اور بچوں کی زندگی بچانے لے لیے انکی شرائط ماننے کی نیت سے گیا تھا لیکن رائیل لے رویے نے جیسے اسکا ذہن الٹ کر رکھ دیا تھا۔

میں ان میں سے کسی سے بھی اپنی فیملی کی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ ان میں سے کسی کے سامنے نہیں گر گڑاؤں گا۔ عزت اور ذلت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے ہمیشہ مجھے عزت دی ہے ورنہ جب بھی میرا مقدر بنی ہے میرے اپنے فیصلوں کی وجہ سے بنی ہے۔۔۔

میں آج بھی اللہ سے ہی عزت مانگوں گا پھر اگر اللہ مجھے ذلت دے گا تو میں اللہ کی دی ہوئی ذلت بھی قبول کر لوں گا۔ لیکن میں دنیا کے کسی اور شخص سے ذلت نہیں لوں گا۔ نہ جھکوں گا۔ نہ کمپرو مائز کروں گا۔

وہ ریت کا ٹیلا بن کر اندر گیا تھا اور آتش فشاں بن کر باہر آیا تھا۔ وہ وہی لمحہ تھا جب اس نے امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دی تھی۔۔۔

سالار سکندر کو پھانسنے کے لیے جو پھندا تیار کیا گیا تھا وہ اس سے بچ کر نکل گیا تھا اور جن لوگوں نے وہ پھندا تیار کیا تھا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بساط کس طرح پلٹنے والی ہے۔۔۔ وہ

اسکومات دینا چاہتے تھے وہ انہیں شہ مات دینا چاہتا تھا۔ اور اللہ بیشک بہترین تدبیر کرنے والا ہے

*****_*****

وہ دن ورلڈبنک کے لیے بڑی خوشخبری لیکر آیا تھا پیٹرس ایبا کا کوما کی حالت میں مر گیا تھا۔ سالار نے وہ خبر بنک سے واپس آ کر ٹی وی پر سنی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور دھچکا تھا۔ لیکن وہ رات ورلڈبنک کے لیے سیاہ ترین رات تھی۔۔ ایبا کا مرنے سے پہلے ورلڈبنک کی موت کا سامان کر گیا تھا۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

*****_*****

ایکسیوزمی۔۔۔۔ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گی۔۔ اسکی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔۔

اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا۔ بہت عرصے بعد وہ کسی عورت کیساتھ اکیلا بار میں بیٹھا تھا۔

وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا جب جیکی دو شیمپین لے گلاس

لیکرواپس آگی۔۔

میں نہیں پیتا۔۔۔ اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھنے پر چونک کر اسے یاد دلایا۔

یہ۔۔ شیمپین ہے۔۔۔ جیکی نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔۔

شیمپین شراب نہیں ہے کیا؟؟ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ

نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔۔

جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑے سہولت کیساتھ اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال

لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ اب اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپین کا

گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔۔

اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لی۔

آوڈانس کریں۔۔۔ وہ۔۔ جیکی کی آفر پر ایک بار پھر چونکا۔

میں ڈانس نہیں کرتا۔۔ اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔

آتا نہیں ہے۔۔۔ جیکی ہنسی تھی۔۔۔

پسند نہیں ہے۔۔۔ وہ مسکرایا تھا۔

شراب کبھی نہیں پی تم نے؟؟ جیکی نے پوچھا۔

بہت عرصہ پہلے۔۔۔ اس نے جیسے اعتراف کیا۔۔۔

شیمپینن؟؟ جیکی نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

یہ بھی۔۔۔۔ بے تاثر چہرے کیساتھ اس نے کہا۔

وہ دعویٰ کیساتھ کہہ سکتی تھی کہ یہ مرد کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا اور وہ بھی بری طرح اسکی طرف ملتفت ہو رہی تھی۔۔۔

تمہاری شیمپینن۔۔۔ جیکی نے ایک بار پھر یاد دلایا۔

تم لے سکتی ہو۔۔۔ اس نے جو اب گلاس اسکی طرف بڑھا دیا۔۔۔

اگر پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آئی تمہیں۔۔۔ جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

لطف حاصل کرنے کے لیے پیتا تھا جب لطف ختم ہو گیا تو شراب بھی چھوڑ دی۔

وہ اسکی بات پہ بے اختیار ہنسی تھی۔۔۔ وہ آگے جھکی اور اسکی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔

کیا تم جانتے ہو مجھے تم میں ایک ساحرانہ کشش محسوس ہوتی ہے۔۔۔

وہ مسکرایا تھا۔۔۔ جیسے اس کے جملے سے محفوظ ہوا تھا۔۔۔

زہے نصیب۔۔۔ اس نے جواباً کہا۔۔۔

جیکي نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ ہٹانا
چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہ ہٹا سکا۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔۔۔

پھر جیکي نے کہا۔۔۔

کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو/؟؟

جواب فوری آیا تھا۔۔۔

بلکل۔۔۔۔

××××-----×××××××-----××××

اینڈرسن کو پودو ہفتے بعد کانگو میں بارانی جنگلات کے حوالے سے ایک پروگرام کرنے جا رہا تھا اس نے انگلینڈ اور یورپ کے اخبارات میں ایبا کا کے انٹرویوز اور پگمیز کی بقاء کے لیے چلائی جان والی مہم کے بارے میں بنیادی معلومات لینے کے بعد اپنی ٹیم کے ایک فرد کے ذریعے اس سے رابطہ کیا تھا۔۔۔ اور آج ایبا کا کو کو پودو سے خفیہ ملاقات کرنی تھی اور ایبا کا خوشی سے بے قابو تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنی جلدی ہو سکتا ہے۔ وہ واشنگٹن میں کی دونوں سے کی چینلز کے لوگوں سے ملتا رہا تھا اور امید و ناامیدی کے درمیان لڑھک رہا تھا۔۔۔ ایبا کا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اینڈرسن کو پودو کی طرف سے ملنے والی کال نے اسکی زندگی اور موت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر تاخیر بس تھوڑی سی ہوئی تھی اسکی نگرانی کرنے والوں سے۔۔۔ ایک سر اسیمبلی اور بدحواسی پھیلی تھی ان لوگوں میں جنہوں نے یہ طے کرنا تھا کہ اب اچانک سی این این کے منظر میں آجانے کے بعد وہ فوری طور پر ایبا کا کا کیا کریں۔۔۔ تشویش اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ اگر ایبا کا اور پگمیز کے حوالے سے کو پودو نے پروگرام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تو اور کتنے ایسے صحافی تھے جو اس پراجیکٹ کے حوالے سے پروگرام کرنے کی تیاریوں میں تھے۔۔۔

ایبا کا جن چھوٹے موٹے چینلز اور جرنلسٹس کو بڑا اور طاقتور سمجھ کر واشنگٹن میں انکے ساتھ ساتھ وقت گزارتا آ رہا تھا وہ سب پہلے ہی ایبا کا کی نگرانی کرنے والوں کی فہرست میں شامل تھے۔ اور یہاں بھی ایبا کا کو مانیٹر کرنے والے لوگوں کو اچانک دعوے پیش آنے والا چیلنج یہی تھا اگر وہ پروگرام کو اوپر ایبا کا سے پہلے پیش کرنے کا ارادہ نہ کر چکا ہوتا تو سی آئی اے کے لیے کوپر کو اس آفیشنسی صحافت سے روکنے کا واحد حل یہ تھا کہ ایبا کا کو اس تک کسی بھی قیمت پر نہ پہنچنے دیا جاتا۔ لیکن یہاں کوپر ایبا کا سے اس اسٹیج پر رابطہ کر رہا تھا جب مبادہ اور اسکی ٹیم پہلے ہی اس ایشوپر بہت زیادہ کام کرنے کے بعد کانگو روانگی کی تیاریوں میں تھی۔ یہ تھا وہ چیلنج جس نے فوری طور پر ایبا کا اور کوپر کی ملاقات کے حوالے سے سی آئی اے کو پریشان کیا تھا۔ اور اس پریشانی میں اضافہ تب ہوا تھا جب ایبا کا اس کال ملنے کے فوراً بعد ہی واشنگٹن سے نیویارک کے لیے چل پڑا تھا۔ اور جب تک انکا اگلا لائحہ عمل طے ہوتا ایبا کا ٹائم وارنر سینٹر پہنچ چکا تھا۔

اینڈرسن کوپر کیساتھ دو گھنٹوں کی ایک گرما گرم نشست کے بعد وہ جب سی این این اسٹوڈیوز سے باہر نکلا تھا تو ایبا کا کا جوش پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔

اسے پہلی بار سالار سے رابطے کا خیال آیا۔۔۔

اینڈران کو پور کے ساتھ سوال و جواب کے اس آف کیمرہ سیشن میں سالار سکندر کا ذکر بار بار آیا تھا۔ کہ کیسے اس نے اس پراجیکٹ کے حوالے سے اسکے تحفظات کو سنجیدگی سے سنا اور چھ ماہ ان کے ساتھ ان جنگلات میں جا جا کر مقامی لوگوں سے حقائق اکٹھے کرتا رہا۔ سالار سکندر کے لیے اپنے ستائشی جذبات کو پور تک پہنچاتے ہوئے ایبا کا کو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے سالار سکندر کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

ایبا کا نے اس عمارت سے نکلنے کے بعد سینٹرل پارک کی طرف جاتے ہوئے بے حد خوشی کے عالم میں سالار کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب سی این این تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ وہ ٹیکسٹ بہت لمبا تھا اور اس میں بہت کچھ تھا۔ سالار اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور کچھ گھنٹوں بعد جب وہ واشنگٹن میں اترتا تک اس کے رابطوں کے تمام ذرائع زیر نگرانی آچکے تھے۔ ایبا کا کی آخری ای میل سالار سکندر کو اسکی موت کے بعد ملی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو سالار سکندر کے جہاز اترنے سے بھی کی گھنٹہ پہلے مل گئی تھی جو ایبا کا کی زندگی اور موت کے حوالے سے فیصلہ کر رہے تھے۔ ایبا کا کی فوری موت انہیں نہیں چاہیے تھی۔ انہیں فی الحال کچھ گھنٹوں کے لیے اسکی زندگی چاہیے تھی۔ اپنی تحویل میں ایبا کا کو رکھتے ہوئے وہ اب اسی کے ذریعے

اس کیس کو بند کرنا چاہتے تھے۔۔ اور اسکے بعد وہ ایبا کا سے جان چھڑا لیتے۔۔ اسکی طبعی موت کے ذریعے۔۔۔

کو پور سے ایبا کا کی ہونے والی اچانک ملاقات نے سی آئی اے کو ایک دم پسپا کر دیا تھا۔۔ وہ ایبا کا اور سالار دونوں کو اکٹھے نہیں مار سکتے تھے۔

سالار کو فی الحال صرف خوفزدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اور سی آئی اے کو اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے غلط حکمت عملی غلط آدمی پر لاگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔۔

ایبا کا کو چند گھنٹوں کی بعد بروکلین کے ایک ایسے علاقے کی تنگ و تاریک گلی میں روکا گیا تھا جہاں ایک قریبی عمارت میں ایبا کا کو اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔ سی آئی اے سمجھتے تھے کہ ایبا کا انکے لیے حلوہ ہے جسے وہ آسانی سے قابو کر لیتے۔۔ ایسا نہیں ہوا

تھا۔ ایبا کا ان دو افراد سے بڑی بے جگری سے لڑا تھا جنہوں نے اچانک اسکے قریب گاڑی روک کر اسے ریوالور دکھا کر اندر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔۔ اس نے ساری زندگی امریکہ کی مہذب دنیا میں گزاری تھی لیکن جنگلی زندگی اسکی سرشت میں تھی اسے اپنا دفاع کرنا آتا تھا۔ وہ خود لہو لہان تھا تو ان دونوں افراد کو بھی لہو لہان کر چکا تھا۔۔ پتا نہیں یہ ایبا کا کی بد قسمتی تھی ان دونوں ایجنٹس کی یا سی آئی اے کی۔۔۔ کہ

لڑتے لڑتے ریوالور ایباکا کے ہاتھ میں آگیا تھا اور پھر اس نے آؤدیکھانہ تاؤان دونوں افراد پر گولی چلا دی۔۔ گولی ایک کو لگی تھی لیکن دوسرا خود پر ہونے والے فائر سے بہت پہلے اپنا ریوالور نکال کر ایباکا پر دو فائر کر چکا تھا جو اسکے سینے میں لگے تھے۔۔

ان فائر نے اس سڑک پر چلتے راہ گیر کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان ہی میں سے کسی نے پولیس کو بھی فون کیا تھا لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہ دونوں ایجنٹس شدید زخمی حالت میں تڑپتے ایباکا کو گاڑی میں ڈال کر فرار ہو گئے تھے۔۔ جس ایجنٹ کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ وہ ہوش و حواس میں تھا اور ایباکا کو گاڑی میں لیکر فرار ہوتے ہوئے اس نے اپنے سر پر ستوں کو سارے واقعے سے آگاہ کر دیا تھا۔

ایباکا کی وہ حالت اس دن سی آئی اے کے لیے دوسرا جھٹکا تھی۔ انہیں ایباکا کی زندگی چند گھنٹوں کے لیے چاہیے تھی تاکہ وہ ان تمام چیزوں کو بھی نابود کرے جو ایباکا کے مرنے کے بعد کسی اور کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں انکے لیے کوئی اور ایباکا کھڑا کر دیتا۔۔ ایباکا سے پہلے چند لوگوں نے رابطہ کر کے اسے اس سارے معاملے سے ہٹ جانے کے لیے رشوت کے طور پر بلینک چیک پیش کیا تھا۔۔ لیکن ایباکا کا انکار اقرار میں نہیں بدلا تھا۔۔ قیمت ہمیشہ اقرار کی ہوتی ہے۔ انکار انمول ہوتا ہے۔۔ ان پیش

کشتوں کے انکار کے بعد ایبا کا کو پہلی بار یہ حدشات لاحق ہونے لگے تھے کہ اگر اسے خرید نہیں جاسکتا تو اسے مارا جاسکتا ہے۔ اور اسی وجہ اس ایبا کا نے اپنے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کے پاس ان دستاویزات کی کاپیاں رکھ دی تھی۔ سی آئی اے کو اسکی خبر بھی تھی ایبا کا نے اگر سینکڑوں کاپیاں امریکہ کانگو اور انگلینڈ میں اپنے دوستوں کے پاس رکھوائی تھی تو سی آئی اے کو ان سینکڑوں لوگوں کی معلومات تھی۔ وہ دستاویزات ہر اس جگہ سے چوری کر کے انکی جگہ کچھ اور ڈاکو منٹس رکھ دیئے جاتے تھے۔ اور ایبا کا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کہ اسکے پیچھے اس پراجیکٹ کے حوالے سے سارے سراغ مٹائے جا رہے تھے۔

فی الحال دنیا میں صرف دو شخص تھے جنکے پاس وہ دستاویزات اپنی اصل شکل میں موجود تھی۔ پیٹرس ایبا کا۔ اور سالار سکندر۔۔۔ ایبا کا اب زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا اور سالار اگلے دن خوار ہونے والا تھا مگر سی آئی اے کو اسوقت سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ ایبا کا کے دستخط کیسے حاصل کر سکتے جسکی انہیں فوری ضرورت تھی۔ تاکہ وہ اسکے لاکر ز کھلوا سکتے جہاں اسکی اصل دستاویزات تھی۔ انکی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ان اصلی دستاویزات کو حاصل کرنے کے بعد ایبا کا کو ختم کر دے مگر سب کچھ الٹ ہوا۔

پلان اے اور پلان بی ناکام ہو چکا تھا۔ اب سی آئی اے کو پلان سی سے کام لینا تھا۔ لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایبا کا کے پاس ایک پلان ڈی تھا جس کا انہیں کبھی پتہ نہ چل سکا۔۔۔ وہ کانگو میں اپنی۔ گرل فرینڈ کے پاس ایک وصیت چھوڑ آیا تھا۔

*****_*****_*****

امامہ کو اندازہ نہیں تھا وہ کتنی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں رہی یا رکھی گی تھی مگر بے ہوشی جب ختم ہو نا شروع ہوئی تو اس نے جیسے بے اختیار ہی کے عالم میں سب سے پہلے اس وجود کو ڈھونڈنا شروع کیا جسے اس نے پہلی بار اور آخری بار آپریشن تھیٹر میں بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔۔۔ تکلیف کی حالت میں بھی اسے یاد تھا کسی نے اسے بتایا تھا کہ وہ لڑکا تھا۔۔۔

درد سے بے حال اس نے محمد حمین سکندر کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے چوما تھا اور پھر اسے چومتی چلی گی۔ وہ بے حد کمزور تھا۔ اور وجہ اسکی قبل از وقت پیدائش تھی۔ وہ تین ہفتے قبل دنیا میں آیا تھا۔۔۔ نیم غنودگی میں وہ اپنا بستر ٹٹولتی رہی اس بات کا احساس کیئے بغیر کے وہ نوزائیدہ بچہ اسکے بستر پر نہیں سو سکتا تھا۔ بے ہوشی ختم ہو رہی تھی اسکی یادداشت آہستہ آہستہ واپس آرہی تھی دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا

-- جبریل ---- عنایہ ---- سالار ---- وہ کچھ بے چین ہوئی تھی۔ امامہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ کہ وہ وہاں کیسے آئی۔ ذہن پر زور دیکر ----

___*_*_*_*_*_*_*___*_*_*___*_*_*___*_*_*___*_*_*___

سی آئی اے کے لیے سب سے بڑی پریشانی سالار کی فیملی۔ تھی۔ انہیں غائب کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مگر انہیں یہ احساس دلائے بغیر غائب کرنا کہ انہیں غائب کیا جا رہا ہے بہت مشکل تھا۔ سالار جس رات واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا تھا اسکے اگلے دن امامہ کی گائناکالوجسٹ نے اسے فون کیا تھا۔ امامہ کے معائنہ کی تاریخ تین دن بعد کی تھی۔ اس کی امریکن ڈاکٹر نے اسے اسی دن ایمرجنسی میں آنے کے لیے کہا تھا۔۔۔ امامہ نے کسی غور و حوض کے بغیر جانے کی ہامی بھر لی۔۔

وہ ہمیشہ کی طرح جبریل اور عنایہ کیساتھ پیڈی کو بھی ہسپتال لیکر گئی تھی۔ اسکی ڈاکٹر نے اسکا لٹراساؤنڈ کرنے کے بعد کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا تھا کہ اسے بچے کی حرکت اپنا رمل محسوس ہو رہی ہے اس کو کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہونگے اور ساتھ انہیں کچھ انجیکشن لینا ہونگے۔ امامہ کو تشویش ہوئی تھی تو صرف یہ کہ سالار وہاں نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کے ساتھ وہاں آتی تھی ایسے معائنوں کے

لیئے۔۔۔ ڈاکٹر نے انہیں فوری طور پر ہاسپٹل میں کچھ گھنٹوں کے لیئے یہ کہہ کر ایڈمٹ کیا تھا کہ انہیں اسکوزیر نگرانی رکھنا تھا۔

اسے ایک کمرے میں شفٹ کیا گیا اور جو انجکشن امامہ کو دیئے گئے وہ درد بڑھانے والے انجکشن تھے۔ امامہ کو گھر سے غائب اور سالار اور اپنی کسی فیملی ممبر سے رابطہ منقطع رکھنے کے لیئے سی آئی اے کے پاس اس سے بہترین حل نہیں تھا کہ اسکے بچے کی قبل از وقت پیدائش عمل میں لائی جائے۔۔۔

امامہ انجکشن لگوانے سے قبل ہسپتال کے کمرے میں ہی پیڈی جبریل اور عنایہ کو لے آئی تھی۔ اس وقت بھی اسکا یہی خیال تھا کہ چند گھنٹوں بعد وہ واپس گھر چلی جائے گی۔ لیکن اسے پہلی بار تشویش تب ہوئی جب اسے درد زہ ہونا شروع ہوا اور ڈاکٹر نے اسکی تصدیق بھی کر دی کہ انجیکشن کے ری ایکشن میں شاید انہیں بچے کی زندگی بچانے کے لیئے اسے فوری طور پر دنیا میں لانا پڑے۔۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ بری طرح پریشان ہوئی تھی۔۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ بچوں کو کہاں بھیجے۔ اسکے ڈاکٹر نے مدد کی پیشکش کی لیکن امامہ کے لیئے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ اپنی اولاد کے بارے میں جنون کی حد تک محتاط تھی۔ وہ پہلی بار جبریل کو گود میں

لینے پر بلک بلک کر روی تھی لگتا تھا اولاد نہیں معجزہ تھا اسکے لیے۔۔ سالار کہتا تھا وہ
 جبریل کی عاشق تھی۔ اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے جبریل کے سامنے واقعی کچھ نظر نہیں
 آتا تھا۔ عنایہ۔۔۔ سالار دونوں کہی پیچھے چلے جاتے تھے۔ وہ اس پر بھروسا کرتی تھی
 اور چار سال کے اس بیٹے کو ہر جگہ اپنے ساتھ یوں رکھتی تھی جیسے وہ بہت بڑا
 ہو۔ جبریل عام بچوں جیسی عادات نہیں رکھتا تھا۔ ذہانت باپ سے ورثے میں ملی تھی
 لیکن برداشت اس نے کہاں سے سیکھ لی یہ اماہ نہیں جان پائی۔۔ جبریل میں عجیب سی
 سنجیدگی اور ذمہ داری تھی جو اسکے معصوم چہرے پر بلا کی سجتی تھی۔۔۔
 وہ ہر چیز کا بے حد خاموشی سے مشاہدہ کرنے کا عادی تھا۔۔۔ اماہ کو نسی چیز کہاں رکھتی
 تھی یہ جبریل کو یاد رہتا تھا وہ سالار سکندر کی غیر موجودگی میں اس گھر کا بڑا تھ اماہ کو
 اب بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ چاہتی تھی اسکی ڈلیوری کم از کم تب تک ٹل جائے
 جب تک سالار امریکہ پہنچ جائے اور وہ اس سے بات کر لے۔ اسے صورت حال سے
 آگاہ کر لے وہ اسکے اور بچوں کی فوری دیکھ بھال کے لیے تو کچھ کرتا ہی لیکن کم از کم وہ
 اس سے ڈلیوری سے پہلے ایک بار بات تو کر لیتی۔۔۔ وہ خوف جو ہمیشہ اسے اپنے حصار
 میں لیتا رہا تھا وہ اب بھی لے رہا تھا۔۔۔ اور کیا ہوا۔۔۔۔۔ اگر ڈلیوری کے دوران وہ مر

جائے تو۔۔۔ اور یہ تو تھی جو اسے ہر بار آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے سالار سے ایک بار معافی مانگنے پر مجبور کرتی۔ اپنی احسان مندی جتانے پر مجبور کرتی لیکن بس زبان اگر ایک جملے پر آکر اٹکتی تھی تو وہ اس سے محبت کا اظہار تھا۔ وہ حمین کی پیدائش سے پہلے موت کے خوف میں مبتلا ہوئی تھی۔ اور اس بار پہلے سے کی گنا زیادہ۔۔۔ کیونکہ سالار دور تھا۔۔۔۔۔ وہ تنہا تھی اور اسکے بچے کمسن۔۔۔ اسکی خواہش پوری نہ ہو سکی درد بڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر میں لیجانا چاہتی تھی۔ کیونکہ کیس نارمل نہیں تھا۔ اسے آپریشن کرنا تھا۔۔۔ امامہ نے جبریل کو عنایہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اسے بہن کا خیال رکھنے اور اسے کبھی اکیلا نہ چھوڑنے کا کہا تھا۔ جبریل نے ہمیشہ کی طرح سر ہلایا تھا فرمانبرداری سے۔۔۔ آپ نیا بے بی لے آئیں میں اس بے بی کا خیال رکھوں

گا۔۔۔

چار سالہ جبریل نے انگلش میں ماں کو تسلی دی۔۔۔ اور اسکی تسلی سے امامہ کے ہونٹوں پر اس تکلیف میں بھی مسکراہٹ آئی تھی۔۔۔ آپریشن تھیٹر جانے سے قبل اس نے دونوں کو گلے لگا کر چوما۔۔۔

*****_*****_*****

یوٹیوب پر کسی نے ایک ویڈیو اپلوڈ کی تھی جس میں ایک سیاہ فام بروکلین کے پس ماندہ حصہ میں ایک پاس سے گزرنے والی گاڑی سے یکدم نکلنے والے دو سفید فاموں سے لڑتا نظر آیا۔ ویڈیو اس بلڈنگ میں رہنے والے ایک سیاہ فام نو عمر بچے نے ہینڈ کیمر سے بنائی تھی جو اس جگہ سے بالکل قریب ایک بلڈنگ کی دوسری منزل کی کھڑکی سے اسکول پراجیکٹ کے سلسلے میں ایک ویڈیو شوٹ کر رہا تھا۔ میرے

پڑوسی۔۔۔۔۔ اس نے اپنی گلی میں شروع ہونے والی اس لڑائی کو اتفاقاً لیکن بڑی دلچسپی سے یہ سوچتے اور کمنٹری کرتے ہوئے ریکارڈ کیا تھا کہ وہ اس علاقے میں ہونے والی اسٹریٹ فائٹ کو بھی اپنے اہل طرف کے امتیازی فیچر کے طور پر پزیر کریگا۔ لیکن اسے اندازی نہیں تھا کہ وہ سٹریٹ فائٹ گولیاں مارنے پر ختم ہوگی۔۔

سی آئی اے کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ ویڈیو بہت قریب سے بنائی گئی تھی اور اس میں نظر آنے والے تینوں افراد کے چہرے واضح تھے۔ اس بچے نے ویڈیو شوٹ کرتے ہوئے بھی چلا چلا کر ان دونوں افراد کو سیاہ فام کو کھینچ کر گاڑی میں ڈالنے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے گاڑی کا نمبر پلیٹ زوم کر کے ریکارڈ کیا تھا۔

پولیس کو وہ ویڈیو دینے سے پہلے اس نے وہ ویڈیو سیاہ فاموں کے ساتھ امریکہ میں ہونے والی زیادتیوں پر مبنی ایک ویب سائٹ پر منتقل کی تھی اور اس ویب سائٹ نے اسے یوٹیوب پر۔۔ اس پر بے شمار لوگوں نے رد عمل کا اظہار کیا وہ ویڈیو یوٹیوب سے اب نیوز چینلز پر آگئی تھی اور وہاں سے بین الاقوامی نیٹ ورکس پر۔۔

پیٹرس ایبا کا پہچانا مشکل نہیں تھا وہ جلد پہچانا گیا۔۔ طوفان یوٹیوب پر کیا مچا تھا طوفان تو وہ تھا جو سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹرز میں آیا تھا۔ ایک آسان ترین سمجھنے والا آپریشن سی آئی اے کے منہ پر ذلت اور بدنامی تھوپنے والا تھا۔۔ ساتھ امریکی حکومت اور ورلڈ بینک بھی پھسنے والے تھا۔ کبھی کبھی انسان کو اسکی بے وقوفی نہیں اسکی ضرورت سے زیادہ چالاکی لے ڈوبتی ہے اور سی آئی اے کیساتھ بھی اس وقت یہی ہوا تھا۔ وہ اسے کسی زخمی کا حادثہ دکھا کر اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور یہ کام وہ واشنگٹن میں کرنا چاہتے تھے جہاں سالار سکندر موجود تھا۔ اور اس دن واشنگٹن میں صرف ایک حادثہ ہوا تھا۔ جسکا ایک زخمی پیٹرس ایبا کو ظاہر کر کے دونوں کا تبادلہ کیا گیا تھا ہاسپٹل انتظامیہ کو ایبا کا کے حوالے سے معلومات تھی۔۔

اسکی حالت مسلسل بگڑ رہی تھی اور سی آئی اے سرجری کے بعد ہاسپٹل سے اسے اپنے

ٹھکانے پر لیجا کر بھی اس سے کوئی کام کی بات نہ پوچھ سکی۔ تو اب انہیں اس سے وہ آخری کام لینا تھا جسکے لیے اسے واشنگٹن پہنچایا گیا تھا اور جس کے لیے نیوز چینل پر بار بار اس حادثے کے زخمی اور مرنے والوں کے نہ صرف نام چلائے گئے تھے بلکہ انکی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بھی۔۔۔ سی آئی اے کو یقین تھا کہ نیوز چینل پر چلنے والی یہ خبر سالار کے علم میں ضرور آئے گی اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ سالار اس سے ملنے ضرور جاتا۔

اندازے درست ثابت ہوئے وہ خبر سالار نے دیکھ بھی لی تھی اور وہ فوری طور پر اس سے ملنے بھی چلا گیا۔ سالار کو ہاسپٹل آنے جانے میں تقریباً دو گھنٹے لگے اور اتنا ہی وقت چاہیے تھا سی آئی اے کو اسکے کمرے سے لیپ ٹاپ سمیت ہر اس چیز کا صفایا کرنے کے لیے جسے وہ کام کی سمجھتے تھے۔۔۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے اسکا پلان تھا۔ لیکن نتیجہ وہ نہیں نکلا جسکی انہیں توقع تھی۔۔۔

وہ ویڈیو انہیں لے ڈوبی تھی۔ کوئی بھی اس ویڈیو میں نظر آنے والے چہرے کے نقوش نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ حادثے میں زخمی ہو کر مرنے والے ایبا کا کی شناخت نہیں بدل سکتے تھے۔۔۔ وہ نیوز چینلز پر ایبا کا کی تصویریں نہ چلو اچکے ہوتے تو اس

اس رات اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ان تمام نیوز چینلز کی کوریج ماؤف دماغ کیساتھ سالار بھی دیکھ رہا تھا۔۔۔ سی آئی اے بھی دیکھ رہی تھی اور ورلڈ بینک کے وہ سارے کرتادھرتا بھی جو دو دن سے سالار سکندر کو ہراساں کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا بیٹھے تھے۔۔۔

پیٹرس ایبا کا کو اس ویڈیو میں نشانہ بنتے دیکھ کر سالار کو اس رات یقین ہو گیا تھا کہ اسکی فیملی زندہ نہیں ہے۔ وہ لوگ اگر ایبا کو مار سکتے تھے تو وہ اور اسکی فیملی کیا شے تھی۔۔۔ اس رات اگر اسے کسی شے میں دلچسپی تھی تو وہ صرف اپنی فیملی کی زندگی تھی۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔ اپنا آپ بھی نہیں۔۔۔

اور سی آئی اے میں اس آپریشن کو کرنے والے لوگ اس رات صرف ایک بات سوچ رہے تھے کہ سالار سکندر کا کیا کرنا تھا اب۔۔۔ زندہ رکھنا تھا۔۔۔ مار دینا تھا۔۔۔ زندہ رکھنا تھا تو پھر اسکی کھلنے والی وہ زبان کیسے بند رکھے ج ورلڈ بینک سمیت بہت سے دار لکھو متوں میں بھونچال برپا کرتی۔۔۔ مار دیتے تو کیسے مارتے۔۔۔ کہ اسکی موت ایبا کی طرح سی آئی اے کے منہ پر ایک اور بدنامی کے دھبے کا اضافہ کر دیتی۔۔۔ یا پھر کنشاسا میں موجود اسکی فیملی کی زندگی کے ذریعے اسے بلیک میل کرتے۔۔۔ قید میں وہ

اسے رکھ نہیں سکتے تھے۔۔۔

زندگی یا موت۔۔۔ زندگی۔۔۔ موت۔۔۔

پھر فیصلہ ہو گیا تھا لیکن وہ سی آئی اے نے نہیں بلکہ کانگو کے عوام نے کیا تھا۔۔۔

+++++*****+++++

چار سالہ جبریل نے اپنے خاندان کو درپیش آنے والے بحران میں جو رول ادا کیا وہ اس نے زندگی میں کی بار ادا کرنا تھا۔

امامہ کے جانے کے بعد پیڈی کو اچانک خیال آیا کہ امامہ اسے گھر سے کچھ چیزیں لانے کا کہہ گی تھی پیڈی نے سوچا کہ وہ وہاں بچوں کو اکیلا چھوڑنے کی بجائے اپنے ساتھ لے جائے گی پھر واپس لے آئے گی۔ جبریل نے اس ساتھ لیجانے والی کوشش کے جواب میں صاف انکار کرتے ہوئے اسے یاد دلا یا تھا کہ مُمی نے اس سے کہا تھا کہ وہ وہی رہینگے۔ وی انہیں ساتھ نہیں لے جائے گی۔ پیڈی کو یاد آیا اور اس نے دوبارہ اصرار نہیں کیا۔۔۔

وہ جبریل کو جانتی تھی۔ چار سال کی عمر میں بھی وہ بچہ کسی طوطے کی طرح ماں باپ کی

باتیں رٹ کر پھر وہی کرتا تھا اور مجال تھی کہ کسی دوسرے کی باتوں میں آکر وہ امامہ اور سالار کی کسی ہدایت کو فراموش کرتا۔ پیڈی انہیں امامہ کی ڈاکٹر کی ایک اسٹنٹ کے پاس چھوڑ کر فوری طور پر گھر چلی گئی۔ انکی عدم موجودگی میں عنایہ کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی اسٹنٹ نے نیند میں جھولتی ہوئی دو سال کی اس بچی کو اٹھا کر ایک بیچ پر لٹانے کی کوشش کی اور جبریل نے اسے روک دیا۔ وہ وہاں سے عنایہ سمیت ہٹنا نہیں چاہتا تھا جہاں پیڈی انہیں بٹھا کر گئی تھی۔ اسٹنٹ کچھ حیران ہو کر واپس اپنی ٹیبل پر گئی۔ وہ ایک انٹر سٹنگ بچہ تھا۔۔۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے دیکھ کر سوچا۔ دو سالہ عنایہ اب جبریل کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی اور وہ بے حد چوکنا بیٹھا بہن کے سر کو اپنے ننھے ننھے بازوؤں کے خلقے میں لیے ملاقاتی کمرے میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور تب وہ عورت ان دونوں کے برابر آکر بیٹھ گئی اور اس نے جبریل کو ایک مسکراہٹ دیتے ہوئے اسکا سر تھپتھپایا۔ اور جو اب اس بچے کے تاثرات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی۔ اس عورت نے دوسری بار سوئی ہوئی عنایہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے کی کوشش کی تو اس بار جبریل نے اسکا ہاتھ بڑی نرمی سے پرے کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔۔

She is sleeping

اوہ سوری۔۔ امریکن عورت اسے دیکھ کر مسکرائی۔۔

اس عورت نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے چاکلیٹ کی ایک بار نکال کر جبریل کی طرف بڑھائی۔۔

No thanks

جواب چاکلیٹ بڑھانے سے بھی پہلے آگیا تھا۔۔

میرے پاس کچھ کھلونے ہیں۔۔۔ اس بار اس عورت نے زمین پر رکھے ایک بیگ سے ایک اسٹنڈ کھلونا نکال کر جبریل کی طرف بڑھایا۔ اسکی سرد مہری کی دیوار توڑنے کی یہ آخری کوشش تھی۔

جبریل نے اس کھلونے پر نظر ڈالتے ہوئے نہایت شائستگی سے اس سے کہا۔۔

آپ ہمیں تنگ کرنا بند کریں گی پلیز۔۔۔

ایک لمحے کے لیے وہ عورت چپ ہی رہ گئی تھی۔ یہ جیسے شٹ اپ کال تھی۔ مگر وہ وہاں منہ بند کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔۔ انہیں ان دونوں بچوں کو وہاں سے لے

جانا تھا اور ان کا خیال تھا آتے جاتے ملاقاتیوں میں دو کمسن بچوں کو بہلا پھسلا کر وہاں سے لیجانا کونسا مشکل تھا۔ زور زبردستی وہ اتنے لوگوں کے سامنے عنایہ کے ساتھ کر سکتے تھے جبریل کیساتھ نہیں۔۔۔۔

اب وہ منتظر تھی کہ عنایہ کی طرح وہ چار سالہ بچہ بھی تھک کر سو جائے پھر شاید انکو کسی طرح وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ وہ دس پندرہ منٹ بیٹھے رہنے کے بعد وہاں سے اٹھ گئی تھی۔۔۔ اسے ان بچوں کے حوالے سے نئی ہدایات لینی تھی اور پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو پیڈی وہاں انکے پاس موجود تھی۔۔۔۔

وہ عورت ایک گہرا سانس لیکر رہ گئی۔ وہ ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے صرف اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے جب تک امریکہ میں سالار کیساتھ معاملات طے نہ ہو جاتے۔۔

عنایہ اب جاگ گئی تھی اسے ہاتھ روم جانا تھا۔ پیڈی اسے ہاتھ روم لیکر جانا چاہتی تھی اس نے جبریل کو ایک بار پھر وہی ٹھہرنے کا کہا لیکن وہ نہیں ٹھہرا۔ وہ کسی بھی طرح عنایہ کو اپنی آنکھوں سے او جھل کرنے پہ تیار نہیں تھا۔ پیڈی کو اسے بھی ہاتھ روم لے جانا پڑا۔ وہ عورت بھی انکے پیچھے ہاتھ روم آئی تھی۔ اور جبریل نے اس عورت کو ایک

بار پھر نوٹس کیا تھا۔۔

تم ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہو۔

واش بیسن میں ہاتھ دھونے میں مصروف وہ عورت اس بچے کا جملہ سن کر جیسے
ایڑھیوں پر گھومی تھی۔۔ پیڈی نے اس عورت کو دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز میں
مسکرائی جیسے وہ جبریل کی اس بات سے متفق نہیں تھی۔۔ سینتالیس سال کی اس
عورت نے مسکراتے ہوئے اس چار سالہ بچے کو سراہا تھا۔ وہ پہلی بار ایک چار سالہ بچے
سے پسپا ہوئی تھی۔ وہ جن بھی ماں باپ کی اولاد تھا کمال تربیت ہوئی تھی اسکی۔۔ پیڈی
ان دونوں کو لیکر وہاں سے چلی گئی تھی لیکن وہ عورت نہیں گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس
بچے سے وہ جملہ نہیں سننا چاہتی تھی۔ بہتر تھا اسکے بھینچنے والے اسکی جگہ کسی اور کو بھیج
دیتے۔

پیڈی امامہ سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد بھی نہ مل سکی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے کہا تھا وہ ہوش میں
نہیں۔ آپریشن ٹھیک ہوا تھا لیکن اسے خواب آوردوائیاں دی جا رہی تھی۔ پیڈی نے
امامہ کے فون سے بار بار سالار کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکام ہوئی۔ وہ اسے
اسکے بیٹے کی خبر دینا چاہتی تھی اور ساتھ یہ اطلاع بھی کہ اسکے بچے انکے پاس محفوظ

ہیں۔۔۔ پیڈی نے بار بار امامہ سے ملنے کی کوشش کی کیونکہ اب عنایہ بھی بے قرار ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ان کو پیٹر میں پڑا حمین تو دکھا دیا تھا لیکن امامہ تک رسائی نہیں دی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے دونوں بچوں کو اسکی تحویل میں دینے کا کہا اور ہمیشہ کی طرح جبریل اڑ گیا تھا۔۔۔ نیند سے بوجھل آنکھوں اور تھکاوٹ کے باوجود عنایہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے بیٹھا ہوا تھا کیونکہ ممی نے اسے عنایہ کا خیال رکھنے کا کہا تھا۔ اس نے وہ بے بی بوائے بھی دیکھ لیا تھا جسے ممی لینے گی تھی لیکن ممی کہاں تھی یہ سوال اب صرف اسے ہی نہیں پیڈی کو بھی پریشان کر رہا تھا وہ اب کنشاسا میں سالار کے آفس کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے میں مصروف تھی لیکن سالار غائب تھا اور کانگو میں ورلڈ بینک پر قیامت ٹوٹنے والی تھی۔۔۔۔

-----*****-----

پیٹرس ایبا کا اپنی موت کے چوبیس گھنٹوں میں ہی صرف کانگو کے پگمیز کا نہیں بلکہ پورے افریقہ کا ہیر و بن گیا تھا۔ اس خطے نے آج تک صرف بننے والے حکمران دیکھے تھے اس خطے نے ہیر و پہلی بار دیکھا تھا۔ جان دینے والا ہیر و۔ ایبا کا ساری زندگی پر امن طریقوں سے جدوجہد کرنے والا تھا اور اس کا درس دیتا تھا لیکن اپنی موت کے بعد اسکی

جو وصیت منظر عام پر آئی تھی اس میں اس نے پہلی بار غیر متوقع اور غیر فطری موت کی صورت میں اپنے لوگوں کو لڑنے کے لیے اکسایا تھا۔ اس جنگل کو بچانے کے لیے انہیں سفید فاموں کو مار بھگانا تھا۔ چاہے اسکے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ اپنی اس وصیت میں اس نے ورلڈ بینک امریکہ اور ان دوسری عالمی طاقتوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں ان سب کے خلاف جہاد کرنے کا کہا تھا۔۔۔ وہ مسلمان نہیں تھا لیکن مذاہب کا تقابلی جائزہ لیتا رہا تھا اور اسے اپنے لوگوں کیساتھ ہونے والی نا انصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کے لیے جہاد سے زیادہ موزوں لفظ نہیں ملا تھا۔ اس نے صرف پگمیز کو مخاطب کی تھا صرف انہیں جنگلوں سے نکل کر شہروں میں آکر لڑنے کا کہا تھا۔ ورلڈ بینک اور ان آرگنائزیشنز کے ہر دفتر پر حملہ کر کے وہاں کام کرنے والوں کو مار بھگانے کا کہا تھا لیکن اس رات وہ صرف پگمیز نہیں تھے جو ایبا کا کی کال پر ورلڈ بینک کیساتھ ان غیر ملکی آرگنائزیشنز پر چڑھ دوڑے تھے۔ وہ کانگو کے استعماریت کے ہاتھوں سالوں سے استحصال کا شکار ہوتے ہوئے عوام تھے جو باہر نکل آئے تھے۔۔۔ کنشاسا میں اس رات تاریخ کے وہ سب سے بڑے فسادات ہوئے تھے جس میں کوئی سیاہ فام نہیں صرف سفید فام مارے گئے تھے۔۔۔ ورلڈ بینک کے آفسوں پر حملہ کر کے

اسے لوٹنے کے بعد اسکو آگ لگادی گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ صرف وہاں تک نہیں رکا تھا۔۔ ورلڈ بینک کے حکام کی رہائش گاہوں پر بھی حملے لوٹ مار اور قتل و غارت ہوئی تھی اور ان میں سالار سکندر کا گھر بھی تھا۔۔ وہ سالار سکندر کا گھر نہیں تھا جسے آگ

لگائی گئی تھی وہ ورلڈ بینک کے سربراہ کا گھر تھا جسے ہجوم نے اس رات تباہ کیا

تھا۔۔ ورلڈ بینک کے چالیس افراد ان فسادات میں مارے گئے تھے۔ اور یہ نچلے

عہدوں پر کام کرنے والے لوگ نہیں تھے وہ ورلڈ بینک کی سینئر اور جونیئر مینجمنٹ

تھی۔۔ اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر اور نامور لوگ۔۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ورلڈ بینک اور سی آئی اے اے ہیڈ کوارٹرز میں آپریشن روم کی دیواروں

پر لگی سکریٹوں پر تینوں اداروں کے سینئر حکام دم سادھے بے بسی کیساتھ کانگو میں

ہونے والے ان فسادات کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ انہیں بچانے کی کوششیں ہو رہی

تھی لیکن فوری طور پر کوئی بھی کانگو کے ان فسادات میں عملی طور پر کود سکتا تھا۔ جو

جانی اور مالی نقصان ہوا تھا وہ پورا کر لیا جاتا لیکن جو ساکھ اور نام ڈوبا تھا اسے بحال کرنے

کے لیے کوئی معجزہ چاہیے تھا۔۔

ان فسادات کے آغاز سے بالکل پہلے اینڈرسن کو وپرنے ایسا کیساتھ ہونے والے سے

آف کیمرہ سیشن کو اپنے پروگرام میں چلا دیا تھا تب تک اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس رات کانگو میں کیا ہونے والا تھا۔ اس سیشن میں ایباکانے امریکہ اور ورلڈ بینک پر شدید تنقید کرتے ہوئے انہیں گدھ اور ڈاکو قرار دیا تھا جو کانگو کو نوح نوح کر کھا رہے تھے۔ اور کوئی انکا ہاتھ نہیں روک پارہا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا وہ آخری انٹرویو افریقہ میں لوگوں نے اسٹیڈیم اور چوکوں پر روتے ہوئے بڑی سکریٹوں پر سنا تھا۔ اور اس کی گفتگو میں ورلڈ بینک کے صرف ایک عہدیدار کی تعریف تھی جو بینک کو اس پراجیکٹ کی انکوائری پر مجبور کر رہا تھا۔ اور ایسا نہ کرنے پر وہ ورلڈ بینک کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ایباکانے اپنی زندگی کو لاحق ہونے والے خطرات کی بات بھی کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ طاقتیں جو اسے مار ڈالنا چاہتی ہیں وہ سالار سکندر کو بھی مار ڈالیں گے۔

سالار سکندر کا نام پیٹرس ایباکا کے بعد ایک رات میں افریقہ میں زبان زد عام ہو گیا تھا۔ افریقہ میں ویسی شہرت پہلی بار کسی غیر ملکی کو نصیب ہوئی تھی۔ اور وہ غیر ملکی اس وقت واشنگٹن میں اپنے کمرے میں ٹی وی پر پی سب دیکھ رہا تھا۔ پھر بار بار باہر جا کر پاکستان فون کر کے اپنی فیملی کے بارے میں سکندر سے پتا کرنے کی کوشش کر رہا

تھا۔۔۔ کاش اسے وہ نام وری نہ ملتی۔۔۔ اس نے سوچا۔

نیوز چینلز یہ بتا رہے تھے کہ کنڑی ہیڈ سمیت سارے گھروں کو لوٹا گیا تھا اور بہت سے گھروں میں اموات بھی ہوئی۔ کچھ افسران کی بیویوں پر حملے ہوئے اور کسی کے بچے مارے گئے۔۔۔

ٹی وی پر وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ شدید پریشان تھا۔

-----*****-----

میرے بچے کہاں ہیں؟؟ اس نے اٹینڈنٹ کی شکل دیکھتے ہی ہوش و حواس سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

وہ کچھ دیر میں آپکے پاس آجائیں گے آپکو ہاسپٹل سے کہی منتقل کرنا ہے۔ اٹینڈنٹ نے بے حد مودب انداز میں کہا۔ امامہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی اور بے اختیار کراہ کر رہ گئی۔ زخم والی جگہ اب سن نہیں رہی تھی۔ اسے لگا جیسے کسی نے ایک خنجر اسکے پیٹ میں گھونپا ہے۔۔۔ اٹینڈنٹ نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں لٹانے میں مدد دی۔ اور پھر ٹرے میں ایک انجیکشن اٹھا کر سرنج میں بھرنے لگی جو وہ لائی تھی۔۔۔

مجھے کوئی انجکشن نہیں لگوانا میں نے اپنے بچوں کو دیکھنا ہے۔ امامہ نے بے حد ترشی سے اسے کہا۔۔۔

یہ آپکی تکلیف کم کر دے گا۔ آپکی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ اٹینڈنٹ نے کہتے ہوئے گلو کوز کی بوتل میں سرنج کی سوئی گھونپ دی۔

امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ٹیپ کیساتھ چیپکائی ہوئی سرنج نکال لی۔۔۔

مجھے فی الحال کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں مجھے اپنے بچوں سے ملنا ہے اور اپنے شوہر سے بات کرنی ہے۔۔۔

وہ اس بار زخم کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور اس نے اٹینڈنٹ کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔۔۔ وہ کچھ دیر چپ کھڑی رہی پھر خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

اسکی واپسی آدھ گھنٹہ بعد پیڈی جبریل اور عنایہ کیساتھ ہوئی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی ماں پر پہلی نظر پڑتے ہی جبریل اور عنایہ شور مچاتے ہوئے اس کی طرف آئے۔ اور اسکے بستر پر چڑھ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ دو دن کے بعد ماں کو دیکھ رہے تھے۔ پیڈی بھی بے اختیار لپک کر انکے پاس آئی۔ دو دن سے امامہ کو نہ دیکھنے پر اور

ڈاکٹرز کی بار بار کی لیت لعل پر امامہ کے حوالے سے اسکے ذہن میں عجیب و ہم آ رہے تھے۔ اور اب امامہ کو بخیریت دیکھ کر وہ بھی جذباتی ہوئے بنانہ رہ سکی۔۔۔

تم نے سالار کو اطلاع دی؟؟ امامہ نے پیڈی کو دیکھتے ہی اس سے پوچھا۔

میں کل سے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن انکا نمبر نہیں مل رہا میں نے انکے آفس کے سٹاف سے بھی رابطہ کیا لیکن وہ کہہ رہے کہ سالار صاحب کے ساتھ انکا بھی رابطہ نہیں ہو پارہا

امامہ کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کل؟؟ وہ بڑبڑائی۔۔ آج کیا تاریخ ہے؟؟

پیڈی نے جو تاریخ بتائی وہ اس دن کی نہیں تھی جس دن اسے ہاسپٹل لایا گیا تھا۔ اس نے اپنا بیگ لیکر اس میں سے فون نکال کر اس پر کال کرنے کی کوشش کی۔۔ اٹینڈنٹ نے انہیں بتایا کہ ہاسپٹل کے اس حصے میں سگنلز نہیں آتے۔ وہ اسکا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اپنے سیل فون پر اس نے سب چیٹ ایپس اور ٹیکسٹ میسجز چیک کر لیئے تھے کل سے آج تک اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیڈی سے کچھ پوچھتی اس

نے اسے کانگو میں ہونے والے فسادات کے بارے میں بتایا تھا۔ اور ساتھ یہ بھی کہ انکے گھر پر بھی حملہ کیا گیا تھا۔۔۔۔ امامہ سکتے میں آگئی۔۔

یہ وہ پہلے لمحہ تھا جب امامہ کو سالار کے حوالے سے بے قراری ہوئی۔ پیٹرس ایبا کا مارا گیا تھا تو سالار کہاں تھا؟ وہ بھی تو واشنگٹن میں تھا۔ پیڈی نے اسے نیوز چینل پر چلنے والی ساری خبریں بتادی تھی۔ ایبا کا کیسے مارا گیا اور کیسے اسکی موت سامنے آئی اور اس سے آخری بار ملنے کے لیے جانے والا سالار سکندر تھا اور وہ اسی وقت سے غائب ہے۔

امامہ کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اسکا خیال تھا کہ اسے دنیا میں سب سے زیادہ محبت جبریل سے تھی لیکن اب جب سالار اس کی زندگی سے کچھ دیر کے لیے عجیب طرح سے غائب ہوا تھا تو اسکے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔

وہ جبریل اور عنایہ کو اسی طرح بستر پر چھوڑ کر درد سے بے حال ہوتے ہوئے بھی لڑکھڑاتے قدموں سے فون لیے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسے ہاسپٹل میں اس جگہ جانا تھا جہاں سے وہ اس سے بات کر سکتی۔ اسے اسکے گجرتباہ ہونے کا بھی خیال نہیں آیا تھا گھر بچے سب کچھ یکدم اس ایک شخص کے سامنے بے معنی ہو گیا تھا جو اسکا سائبان تھا۔ جو زندگی کی دھوپ میں اسکے لیے تب چھاؤں بنا تھا جب اسکا وجود حدت سے

جھلس رہا تھا۔

اٹینڈنٹ اور پیڈی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ رکی۔ وہ ننگے پاؤں پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کیساتھ کوریڈور میں نکل آئی تھی۔۔

سالار وہاں ہوتا تو اسے اس حالت میں بستر سے بھی اٹھنے نہیں دیتا لیکن مسئلہ ہی یہی تھا کہ سالار وہاں نہیں تھا۔ اسکا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ یہ موسم نہیں تھا جو اسے لرزا رہا تھا خوف تھا جو رگوں میں خون جمار رہا تھا۔ اسکا پورا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

آپکے شوہر بلکل ٹھیک ہیں میں تھوڑی دیر میں آپکی ان سے بات کروادیتی ہوں۔۔

امامہ چلتے چلتے ساکت ہوئی اور اٹینڈنٹ کی آواز پر پلٹی۔۔۔ اور پھر وہاں کھڑے

کھڑے موم کی طرح پگھلنے لگی۔۔۔۔۔

-----+++++-----

سی آئی اے اور ورلڈ بینک کے ساتھ امریکن گورنمنٹ کو ایک ہی وقت میں سالار کی ضرورت پڑی تھی۔ کانگو میں اگر اس وقت کوئی انکی عزت بحال کرنے کی پوزیشن میں تھا تو وہ سالار سکندر ہی تھا۔ پاور گیم ون مین شو بن گیا تھا۔ افریقہ میں جو آگ ایبا کا کی

موت نے لگائی تھی وی سالار سکندر کی زندگی ہی بجھا سکتی تھی۔ فیصلہ تاخیر سے ہوا تھا
لیکن ہو گیا۔۔۔

اس آپریشن کے تباہ کن نتائج نہ صرف سی آئی اے میں بہت سے لوگوں کی کرسیاں
لے جانے والے تھے بلکہ ورلڈ بینک میں بھی بہت سے سرکٹنے والے تھے۔ تاج کہی
اور رکھا جانے والا تھا۔

سالار اس سب سے بے خبر ہوٹل کے کمرے میں اب بھی نیوز چینلز دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ
دیر پہلے اپنے باپ سے بات کر کے آیا تھا سالار کے سر میں درد شروع ہوا تھا۔

What is next to exstasy

آہ کیا سوال تھا۔۔۔ کیا یاد دلا یا تھا۔۔۔ کیا یاد آیا تھا۔

Pain.....

And what is next to pain

اتنے سالوں بعد ایک بار پھر وہ سوال وجواب اسکے ذہن میں چلنے لگے تھے۔ آخر کتنے
مواقع آئے تھے زندگی میں اسے سمجھانے کہ اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔۔۔ عدم

وجود۔۔ خالی پن۔۔۔۔۔

And what is next to nothingness

اسکا اپنا سوال ایک بار پھر اسکا منہ چھڑانے آیا تھا۔۔

Hell,,,,

جہنم کوئی اور جگہ تھی کیا؟ اس نے بے اختیار کراہتے ہوئے سوچا۔

دو دن بعد اسکا سیل فون جیسے موت کی نیند سے جاگا تھا۔۔ وہ میوزک اور وہ روشنی۔۔ اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔۔ وہ میوزک اس نے امامہ کی کالر آئی ڈی کیساتھ محفوظ کیا ہوا تھا۔۔

سیل فون پر اسکا مسکراتا چہرہ اسکا نام۔ سالار کو لگا وہ واقعی جنت میں کہی تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کالر ریسیو کی۔ لیکن ہیلو نہیں کہہ سکا۔ وہ امامہ نے کہا تھا۔ بے قرار بے آواز۔ وہ بول ہی نہ سکا۔ سانس لینا تو بہت بڑی بات تھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا تو کمال تھا۔۔۔۔۔

دوسری طرف سے وہ بے قراری سے اسکا نام لے رہی تھی۔۔ بار بار۔۔ سالار کا پورا

وجود کا نپنے لگا تھا۔ وہ آواز سے ہرا کر رہی تھی۔۔ کسی بنجر سوکھے پیڑ پر بارش کے بعد بہار میں پھوٹنے والی سبز کونپلوں کی طرح۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن اسکے سامنے رو نہیں سکتا تھا۔۔ وہ مرد تھا۔۔ بولنا مشکل تھا پر بولنا ضروری تھا۔

امامہ۔۔۔ اس نے اپنے خلق میں پھنسے ہوئے نام کو آزاد کیا تھا۔۔

دوسری طرف وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ عورت تھی یہ کام آسانی سے کر سکتی تھی۔ وہ بے آواز و تارہا۔۔ وہ دوزخ سے گزر کر آئے تھے۔۔

بے آواز روتے ہوئے سالار نے اسی طرح کھڑے کھڑے اس کمرے کے درمیان میں امامہ کی ہچکیاں اور سسکیاں سنتے اپنے جوتے اتارے۔۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل سجدے میں جا گرا تھا۔۔

کی سال پہلے وہ ریڈ لائٹ ایریا میں امامہ کے نہ ہونے پر اسی طرح ایک طوائف کے کوٹھے پر سجدے میں جا گرا تھا۔۔ آج وہ امامہ کے ہونے پر سجدے میں گرا تھا۔۔

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔۔ وہ کن کہتا ہے اور چیزیں ہو جاتی ہیں۔۔ گمان سے آگے بیان سے باہر۔ بیشک اللہ ہی سب سے بڑا اور طاقتور ہے۔۔

نہیں۔۔۔ وہ جھوٹ نہیں بولتی لیکن تم چھوٹی ہو اس لیے وہ تم سے کہتی
ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں بہن کو سمجھایا تھا۔

وہ اس وقت امریکن ایمبسی کے اندر موجود ایک چھوٹے سے میڈیکل یونٹ میں
تھے۔ وہ طوفان جوانگی زندگی اڑانے آیا تھا۔ کچھ بھی تہس نہس کیئے بغیر قریب سے
گزرنا چلا گیا۔ امامہ اپنے بچوں کیساتھ سالار سے بات چیت کے بعد اب پر سکون
تھی۔ اس نے وقفے وقفے سے پاکستان میں سب سے بات کی تھی اور سب سے حمین کی
پیدائش پر مبارکباد وصول کی تھی۔۔۔۔۔

سالار نے اسے ہر بات سے بے خبر رکھا تھا۔ فون پر انکی لمبی بات نہیں ہو سکی
تھی۔ سالار نے اسے آرام کرنے کا کہا تھا۔ اس نے امامہ سے کہا تھا کومی سگنلز اور
سیٹلائٹ کا مسئلہ تھا جسکی وجہ سے اسکا رابطہ اس سے نہیں ہو پارہا تھا۔ اور اسی وجہ سے
وہ اس قدر پریشان تھا۔

امامہ نے اس سے ایبا کا کے حوالے سے بات کی تو اس نے اسے تسلی دی کہ سب ٹھیک
ہے وہ پریشان نہ ہو اسکی زندگی کو خطرہ نہیں۔۔۔ وہ اس سلسلے میں پولیس سے رابطے میں

ہے۔

امامہ مطمئن ہو گئی تھی۔

پیڈی اب بھی اسکے ساتھ تھی اور وہ کمرے میں چلتے ہوئے ٹی وی پر کانگو کے حالات کے حوالے سے چلنے والی خبریں دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایبا کا ذکر آ رہا تھا وہاں سالار سکندر کا بھی ذکر ہو رہا تھا اس انٹرویو کی جھلکیاں بھی بار بار چل رہی تھی جس میں ایبا کا نے بار بار سالار کے بارے میں اچھے الفاظ میں بتایا تھا اور اسکی اور اپنی زندگی کے حوالے سے لاحق خطرات کا بھی ذکر کیا تھا۔۔۔

سالار سے بات کرنے کے بعد امامہ کی جو پریشانی ختم ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر سر اٹھانے لگی۔ وہ مصیبت میں تھا لیکن اسے کیوں بے خبر رکھ رہا تھا۔ امامہ کو اسکا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر اس سے فون پر سوالات کرنا نہیں چاہتی تھی وہ اسکے سامنے بیٹھ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ کہ اسکے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

ممی۔۔۔۔۔ جبریل نے اسے مخاطب کیا۔۔۔

پاپا کو کون مارنا چاہتا ہے۔

وہ اسکے سوال پر منجمد ہو گئی تھی۔ امامہ کوٹی وی دیکھتے ہوئے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی اسکے ساتھ بیٹھا ہوا وہ سب دیکھ اور سن رہا ہے۔۔۔ وہ بلا کا ذہین تھا اپنے باپ کی طرح۔۔۔ امامہ اور سالار اسکے سامنے گفتگو میں بہت محتاط رہتے تھے۔

امامہ نے ٹی وی آف کر دیا وہ اب اسے ٹالنا چاہتی تھی۔

کوئی آپکے پاپا کو نہیں مارنا چاہتا۔۔۔ اس نے جبریل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اللہ آپکے پاپا کی حفاظت کر رہا ہے اور ہم سب کی بھی۔۔۔ وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

اللہ نے پیٹرس ایبا کا کی حفاظت کیوں نہیں کی؟؟

امامہ لاجواب ہو گئی۔۔۔ جبریل کے سوال سے ہمیشہ لاجواب کر دیتے۔۔۔ وہ بحث نہیں کرتا تھا صرف پوچھتا تھا۔ جواب سنتا تھا سوچتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا۔ مگر امامہ سمجھ نہ پاتی کہ اسکے جواب نے اسے قائل کیا تھا یا نہیں۔۔۔ وہ بچہ گہرا تھا۔ اس کا احساس اسے تھا۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے حوالے سے بہت ساری باتیں سوچتا تھا۔ جو وہ ان سے پوچھتا کبھی نہیں تھا۔

دیکھو تمہارا چھوٹا بھائی کیسا لگتا ہے تمہیں۔۔۔ امامہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

ہی از کیوٹ۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

تمہارے جیسا لگتا ہے نا۔ امامہ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔۔

مجھے تو نہیں لگتا۔۔ جبریل کو شاید ماں کی یہ مماثلت اچھی نہیں لگی۔

اچھا تم سے کیسے ڈفرنٹ ہے۔۔ امامہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

اسکی مونچھیں ہیں۔۔ میری تو نہیں ہیں۔

امامہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ حمین کے چہرے اور بالائی لب پر آنے والی روئیں کو دیکھ کر

کہہ رہا تھا۔

یہ میری طرح لگتا ہے۔۔۔ عنایہ نے بڑی مدھم آواز میں اٹکتے ہوئے امامہ کو مطلع کیا

تھا۔

وہ عنایہ کی مدھم آواز پر ہنس پڑی تھی۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ سویا ہوا بھائی بیدار نہ

ہو جائے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا وہ سویا ہوا بھائی نہیں سویا ہوا جن تھا جو بیدار ہونے کے

لیئے اپنے باپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔

سی آئی اے نے جس بچے کو تین ہفتے پہلے دواں کے اثر سے قبل از وقت دنیا میں لانے کی کوشش کی تھی اگر انہیں محمد حمین سکندر کا تعارف ہو جاتا تو وہ اس پیدائش کو کم از کم تین سو سال تک روکتے۔۔۔

مستقبل سے بے خبر امامہ بڑی محبت سے اسے سوئے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جو دو دن بعد ہی خراٹیں لے رہا تھا۔

کیا یہ خراٹے لیتا ہے؟ جبریل نے اسے خراٹے نوٹس کرتے ہوئے بے یقینی دے ماں کو دیکھا۔

امامہ اس کے مشاہدے پر حیران ہوئی تھی۔۔۔ جبریل کے احساس دلانے پر اس نے پہلی بار غور کیا تھا۔

نہیں۔۔۔ وہ بس گہرے سانس لے رہا ہے۔۔۔

ممی کیا یہ آپکا لاسٹ بے بی ہے۔۔۔ سوال ڈائریکٹ آیا تھا اور سنجیدگی سے کیا گیا تھا۔ امامہ کو سمجھ نہ آیا کہ وہ ہنسے یا شرمندہ ہو۔۔۔ پیڈی ہنس پڑی تھی۔۔۔

ہاں سویٹ ہارٹ یہ لاسٹ بے بی ہے۔۔۔ اس نے جیسے جبریل کو تسلی دی۔

ہم دو بھائی اور ایک بہن ہے۔۔۔ جبریل نے انگلیوں کو چھو کر گنا۔۔۔
 ہاں ڈیئر۔۔۔ امامہ نے اسکا منہ چوم کر اسے یقین دلایا۔۔۔ اسے پتا نہیں تھا اسکے گھر
 ایک اور بچی نے پرورش پانی تھی۔۔۔ کنیز غلام فرید عرف چنی۔۔۔۔۔

-----*****-----

سکندر عثمان کے گھر آنے والا وہ مہمان ناقابل یقین تھا۔ وہ انکے گھر کی بارگئے تھے
 مصالحت کے طور پر۔ تعزیت کے لیے۔ لیکن ہاشم مبین کبھی اس کے گھر نہیں آیا
 تھا۔۔۔ وہ اب اسکے پڑوس میں نہیں رہے تھے وہ گھر بک چکا تھا۔ سکندر پہلی نظر میں
 اسے پہچان نہ پایا۔۔۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسکے ساتھ کیا رویہ رکھیں۔۔۔
 مجھے امامہ سے بات کرنی اور ملنا ہے۔ چند ہی جملوں کے بعد ہاشم مبین نے ان سے کہا
 تھا۔

وہ یہاں نہیں ہے۔۔۔ سکندر نے بڑے محتاط انداز میں بتایا۔
 میں جانتا ہوں وہ کانگو میں ہے میں وہاں کا نمبر لینا چاہتا ہوں وہاں کے حالات خراب
 ہیں وہ ٹھیک تو ہے نا؟؟؟

انہوں نے رک رک کر ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہی۔

ہاں وہ سالار اور بچے ٹھیک ہیں۔۔۔ وہ فون نمبر کا مطالبہ گول کر گئے تھے۔

میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنا مطالبہ نہیں

بھولا تھا۔

میں امامہ سے پوچھے بنا آپکو اسکا نمبر یا ایڈریس نہیں دے سکتا۔۔۔ سکندر نے بلا تمہید

کہا۔۔

میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اب۔۔۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

آپ اسے بہت زیادہ نقصان پہنچا ہی چکے ہیں وہ اب اپنی زندگی میں سیٹ ہے اپنے بچوں

کیساتھ بہت خوش مطمئن زندگی گزار رہی ہے آپ کیوں ایک بار پھر اسے ڈسٹرب

کرنا چاہتے ہیں آپکی بیٹی نے پہلے ہی آپکی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے آپ اب اسے

چھوڑ دے بخش دے اسے۔۔۔

ہاشم مبین کے چہرے کی جھریاں ایک دم بڑھی تھی پھر انہوں نے مدہم آواز میں

کہا۔

میں جانتا ہوں مجھے احساس ہے۔

سکندر عثمان بول نہ سکے اسے یہ جملہ سننے کی توقع نہیں تھی۔ بس ایک آخری بار اس سے ملنا چاہتا ہوں اسکی ایک امانت ہے وہ دینی ہے مجھے۔ اور اس سے معافی مانگنی ہے۔

آپ مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے میں اس سے بات کروں گا پھر آپ سے رابطہ کروں گا آپ کہاں رہتے ہیں اب۔۔۔۔ سکندر نے اس سے پوچھا۔

ایک اولڈ ہوم میں۔۔۔۔ سکندر چپ کے چپ رہ گئے۔ ہاشم مبین اٹھ کھڑے

ہوئے تھے۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
امامہ کو بتادیں کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔۔ پھر وہ مجھ سے بات ضرور کرے

گی۔۔

اپنی نشست سے کھڑے ہوئے سکندر عثمان اگلے جملے پر دم بخود رہ گئے تھے۔۔

*****-----*****

جیکلی بے اختیار ہنسی۔۔ جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ کوئی مرد اسکی کشش کے سامنے نہیں ٹہر سکتا تھا۔۔

اوہ واؤ گریٹ۔۔۔ جبکی نے شیمپین کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے قاتلانہ مسکراہٹ
کیساتھ اس سے کہا۔

میں ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتا ہوں لیکن صرف حوروں کے ساتھ۔۔۔
اس شخص کا اگلا جملہ اسکی سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔

حور۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ سالار سکندر نے اپنے والٹ سے
ایک وزٹنگ کارڈ نکال کر اسکی پشت پر پین سے کچھ لکھا اور انگلیوں کے نیچھے دبائے
ہوئے اسے جبکی کی طرف بڑھا دیا۔ جبکی نے عربی میں لکھا ایک جملہ دیکھا۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
یہ کیا ہے۔۔۔ میں اسے پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔ اس نے کندھے اچکا کر سالار کو دیکھا جو
اب اپنے گلاس کے نیچھے کچھ نوٹ دباتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ میں نے تمہارے
ڈرنکس کی ادائیگی کر دی ہے۔۔۔ جبکی نے انگلی اور انگوٹھے میں دبے اس کارڈ کو سالار کو
دکھایا اور دوبارہ کہا۔۔۔ میں یہ پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔۔۔۔۔

جنہوں نے آپکو بھیجا ہے وہ پڑھ بھی لیں گے سمجھ بھی لیں گے اور سمجھا بھی دیں گے۔

جبکی کو اسکے جملے پر کرنٹ لگا۔ اسکی مسکراہٹ سب سے پہلے غائب ہوئی۔۔۔

Excuse me....

اس نے لاعلمی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔۔

Exceeded

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے ہوٹل کے اس کمرے کو کنڈکٹ کر کے اور خفیہ
کیمرے اور مائیکروفون کی مدد سے گفتگو سنتے ان پانچ لوگوں کو پسینہ آیا
انہوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور اس شخص کو گالی دی تھی۔۔ وہ اس
شخص کو پیش کیا جانے والا خراج تحسین تھا۔ وہ اس پھندے سے بچ کر نکلنے والا پہلا مرد
تھا۔

اس کارڈ پر کیا لکھا ہے۔۔ سی آئی اے کی سٹنگ ٹیم کے لیڈر نے آدھ گھنٹہ بعد جبکی

کے اس کمرے میں آنے سے پہلے وہاں بلوائے عربی مترجم سے پوچھا۔۔

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔۔ مترجم نے وہ تحریر پڑھی۔۔

مطلب؟؟

میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔۔ مترجم نے روانی سے انگریزی میں
ترجمہ کیا۔

ان سب لوگوں نے جیکی اور جیکی نے انہیں دیکھا۔۔ پھر قاتلانہ انداز میں مسکراتے
ہوئے کہا۔۔

مجھے یقین ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں۔۔۔

-----+++++-----

آپریشن کے دوران نیوروسرجن چند لمحوں کے لیے رکا۔ ایک نرس نے بنا کہے اسکے
ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے قطروں کو صاف کیا۔ وہ ایک بار پھر اپنے سامنے ٹیبل
پر کھلے پڑے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا۔ اور جو
ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اسکے سامنے تھا۔ وہ امریکہ کی تاریخ کا کم عمر اور سب
سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج اسے پہلی بار لگ ریاتھا کہ اسکا ہنڈرڈ پرنٹ کا میابی کا
ریکارڈ ختم ہونے والا ہے۔ وہ ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس
آپریشن میں کامیابی کے لیے۔۔۔

کھڑکی سے سالار نے واشنگٹن میں ڈوبتے ہوئے سورج پر اک آخری نظر ڈالی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی شعاعیں جہاز کے دودھیا پروں کو بھی ایک روپہلا رنگ دے رہی تھی۔۔۔ جہاز اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا۔ نہ آسمان پر نہ زمین پر۔۔۔ اور یہی کیفیت سالار کی بھی تھی۔۔۔ 37 سال کی عمر میں وہ ورلڈ بینک کا کم عمر ترین وائس پریزڈنٹ تھا۔ اور اسکی تعیناتی چار دن پہلے ہوئی تھی۔

ورلڈ بینک کے بورڈ آف گورنرز کے ایک ہنگامی اجلاس نے متفقہ طور پر اسے افریقہ کے لیے نیا نائب صدر۔۔۔ نیا چہرہ چنا تھا۔۔۔

امریکا کا ہر چھوٹا بڑا چینل اس وقت ایک یہی خبر بریکنگ نیوز کی طرح چلا رہا تھا کہ سالار سکندر کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ غائب کیوں تھا۔ وہ اس صورت حال کے بارے میں کوئی بیان کیوں نہیں دے رہا۔ ایسا کہ بارے میں خاموش کیوں تھا ادھر سالار ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کی تیاری کر رہا تھا۔ جو ورلڈ بینک کے صدر کی درخواست پر ہو رہی تھی۔۔۔ صدر کی منت بھری درخواستوں ہر وہاں صدر کے ذاتی استعمال میں آنے والی کاروں میں سے ایک شو فر سمیت لیموزین میں بادشاہوں کی طرح پروٹوکول کیساتھ وہاں بلا یا جا رہا تھا۔۔۔

ہیڈ کوارٹرز کے باہر پریس موجود تھا، اپنے مشین گن جیسے کیمروں اور مائیکس
کیساتھ۔۔۔ بجلی کی طرح فلش لائٹس کے جھماکوں کیساتھ۔۔۔ انہیں اطلاع کس نے
دی تھی یہ سالار کے لیے حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ سرکس کا وہ جانور تھا جسے بنک
اور سی آئی اے اب نچا کر تماشہ لوٹنا چاہتے تھے۔ اور وہ اپنی اگلی حکمت عملی ترتیب دے
رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے اگر ناچنا ہی تھا تو اپنی شرطوں پر۔۔۔

وہ لیموزین سے اتر کر اپنے کھلے کوٹ کے بٹن بند کرتا فلش لائٹس کے جھماکوں سے
کچھ فاصلے پر ڈرائیوے کے دونوں اطراف میں لگی ہوئی وارننگ ٹیپ کے پار کیمرہ
مینوں اور جرنلسٹس کی بھیڑ کی طرف ایک نظر ڈالے بغیر عملے کے افراد کی رہنمائی
میں لمبے لمبے قدموں کیساتھ اندر چلا گیا۔

کچھ نئے لوگوں کے علاوہ بورڈ روم میں وہ سب لوگ موجود تھے جس سے وہ کچھ دن
پہلے بھی ملا تھا۔۔۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ سالار کا استقبال وہاں ایک ہیروں
کے طور پر تالیاں بجاتے اور خیر مقدمی نعروں سے ہوا۔۔۔ یوں جیسے وہ کوئی جنگ
جیت کر کسی بادشاہ کے دربار میں اپنی خدمات کا کوئی اعزاز لینے آیا ہو۔ ان سب کے
چہروں پر مسکراہٹیں اور نرمی تھی۔ آنکھوں میں ستائش اور ہونٹوں پر دادو

تحسین۔۔۔ سالار سکندر صرف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کر کے کیا آیا تھا جسکے لیے ایسا استقبال کیا گیا۔۔۔ میز پر صدر کی سیٹ کے دائیں جانب پہلی نشست پر اسے بٹھایا گیا۔۔۔

اسکی آمد کے پانچ منٹ بعد ورلڈ بینک کا صدر بورڈ روم میں آ گیا۔۔۔ سالار سکندر بھی باقی سب کی طرح احتراماً گھڑا ہو گیا۔۔۔

ورلڈ بینک کو آپ پر فخر ہے۔۔۔ اسکے ساتھ ہی استقبالی کلمات کی ادائیگی کے بعد صدر کے منہ سے نکلنے والے پہلے حملے کو سن کر سالار کا دل قہقہہ مار کر ہنسنے کو چاہا۔۔۔ صدر کے جملے پر بورڈ روم نے تالیاں بجائیں۔

صدر نے کانگو کی صورت حال سے گفتگو کا آغاز کیا تھا اور وہاں ورلڈ بینک کے ملازمین پر ہونے والے حملوں میں زخمی اور مارے جانے والوں کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ اسکے بعد ایبا کا کوشاندار خراج عقیدت پیش کیا تھا چند جملوں میں اور پھر وہ سالار سکندر کی رپورٹ پر آ گیا تھا۔ جو بینک کے بورڈ آف گورنرز نے پڑھ لی تھی نہ صرف پڑھ لی تھی بلکہ اس رپورٹ کی تمام سفارشات کو ماننے ہوئے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا تھا۔

سالار سکندر نہ حیران ہوا تھا نہ متاثر۔۔۔ اسے اندازہ تھا ورلڈ بینک اس سے کم میں کانگو میں داخل نہیں ہو سکتا۔ انہیں اب وہ پراجیکٹ ختم کرنا ہی تھا۔۔۔ وہ خاموشی سے صدر کی گفتگو سنتا رہا۔ اور گفتگو کے اختتام پر سالار سکندر کو دی جانے والی فی ذمہ داریوں کا اعلان کیا۔۔۔ بورڈ روم میں بچتی تالیوں کیساتھ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی بے وقعت خدمات کے صلے میں ملنے والے ایم ترین عہدہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ سالار کو وہاں بیٹھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا کے طاقتور ترین مالیاتی ادارے کے ہیڈ کوارٹرز میں نہیں کسی گھٹیا تھیٹر میں چلنے والے مزاحیہ ڈرامے کے سامنے بیٹھا ہے۔۔۔ جس میں ہر ایک ٹرا اور ایکٹنگ کر رہا تھا۔

میں صدر اور بورڈ میں موجود تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہاں آنے کا موقع دیا اور مجھے خوشی ہے کہ اس رپورٹ کو بنیاد بناتے ہوئے اسکی تمام سفارشات کو مان لیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اس قدم کے اٹھانے سے ورلڈ بینک کو ایک بار پھر کانگو میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں مدد ملے گی۔۔۔ سالار نے بہت مختصر بات کی تھی۔ ٹودی پوائنٹ۔۔۔ پروفیشنل۔۔۔ جذباتیت کے بغیر۔۔۔ اور اسی دو ٹوک انداز میں جسکے لیے وہ مشہور تھا۔۔۔

میں شکر گزار ہوں کہ ورلڈ بینک اور بورڈ آف گورنرز نے مجھے نائب صدر کے لیے منتخب کیا ہے لیکن میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے یہ عہدہ سنبھال نہیں پاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ بنک کی ٹیم میں اس عہدے کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں لوگ موجود ہیں۔

صدر نے بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔۔۔ اسے اپنی ساکھ بچانا تھی اور یہ کام اس وقت صرف سالار کر سکتا تھا۔ میٹنگ اس کے بعد ختم ہوئی اور اس کے بعد سالار ورلڈ بینک کے صدر سے اکیلے میں ملا تھا۔ وہاں کا ماحول کچھ اور تھا اور باتیں بھی۔ مجھے اپنے کمرے سے چوری ہونے والی تمام چیزیں چاہیے۔۔۔ لیپ ٹاپ۔۔۔ ٹریول ڈاکو منٹس۔۔۔ میرے باقی ڈاکو منٹس۔۔۔ سالار نے اس کمرے میں میٹنگ کے شروع میں ہی ایجنڈا سیٹ کیا تھا۔ وہ اپنی باتیں منوانے آیا تھا آج۔۔۔

آپ کے کمرے سے چوری ہونے والی چیزوں سے ورلڈ بینک کا کیا تعلق۔۔۔

صدر نے انجان بننے کی کوشش کی سالار نے اسکی بات کاٹ دی۔۔۔

اگر میری چیزیں نہیں مل سکتی تو پھر مجھے کسی بھی ایشوپر بات کرنے یہاں نہیں

بیٹھنا۔۔۔۔

صدر نے لہجہ نرم کرتے ہوئے جسے اسے چمکارا۔۔ میں ہدایت جاری کرتا ہوں کہ فوری طور پر آپکے نقصان کی تلافی کی جائے اور آپکے ڈاکو منٹس کا متبادل۔۔۔۔

سالار نے اسی اکھڑ پن سے اسکی بات کاٹی۔۔ مجھے اپنی چیزیں چاہیے۔۔ نہ تلافی چاہیے نہ متبادل۔۔ مجھے اپنے اور یجنل ڈاکو منٹس چاہیے۔۔

خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد صدر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔۔ ٹھیک ہے مل جائیں گے۔۔ لیکن ورلڈ بینک اور امریکہ کو کانگو میں آپکی ضرورت ہے۔ ایک شرط اس نے منوایٰ ایک شرط انہوں نے رکھ دی۔

میں کسی کی کٹھ پتلی بن کر کانگو میں وہاں کے انسانوں کا استعمال نہیں کر سکتا نہ ہی کروں گا۔ اس نے دو ٹوک کہا۔

آپ کانگو میں جا کر وہ کریں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔۔ صدر نے کہا۔۔

میں بندھے ہاتھوں سے کہی کچھ نہیں کر سکتا۔

نائب صدر کے طور پر آپ کو محدود اختیارات دیئے جائینگے۔۔ آپ پراجیکٹ کو روکنا

چاہیں آپکو ہیڈ کوارٹر کی منظوری کی ضرورت نہیں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔
 چند لمحوں تک سالار بول نہ سکا۔۔۔ یہ جھانسنہ تھا تو پکا تھا۔۔۔۔۔ جتنے اختیارات آپ مجھے
 دیکر کانگو بھیجنا چاہتے ہیں اتنے آپ کسی کو بھی دیں وہ صورت حال سنبھال لے
 گا۔۔۔ سالار نے کہا۔

ایشوا اختیارات کا نہیں ہے نیت کا ہے۔۔۔ جو کچھ تم افریقہ میں کرنا چاہتے ہو وہ کوئی
 دوسرا نہیں کرنا چاہے گا۔

کچھ وقت لو سوچو پھر فیصلہ کرو۔۔۔۔۔ اسے قید کر کے آزاد کیا گیا تھا۔۔۔۔۔
 اس نے واپسی پر میڈیا سے بات نہیں کی۔۔۔۔۔ الجھن تھی کہ اور بڑھی تھی۔ ہوٹل
 واپس آتے ہی اس نے کمرے میں ٹی وی پر نہ صرف ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر جاتے اپنی
 فوٹیج دیکھ لی بلکہ نیوز چینل پر اپنی تعیناتی کی بریکنگ نیوز بھی پڑھ لی۔

وہ اسکے لیے انکار کو مشکل بنا رہے تھے جال کی ڈوریاں کستے جا رہے تھے۔۔۔۔۔ اسکا سیل
 فون منٹوں میں مبارکباد کے پیغامات اور کالز سے بجنے لگا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ورلڈ بینک جوائن کرنے کے فیصلے سے امامہ خوش نہیں تھی اسکا اعتراض وہی تھا اور وہی

تھا۔۔۔ تم بیشک ورلڈ بینک کے پراجیکٹس سے منسلک ہو رہے ہو لیکن وہ کرتا تو سود کا کاروبار ہی ہے نا۔ چھوٹے بنک افراد کا استعمال کرتا ہے اور ورلڈ بینک قوموں کا۔۔۔ مجھے بتاؤ فرق کیا ہوا۔۔۔ آسان قرضہ۔۔۔ سستا قرضہ۔۔۔ لونگ ٹرم قرضہ۔۔۔ شارٹ ٹرم قرضہ۔۔۔ آسان شرائط قرضہ۔۔۔ کوئی ایسا قرضہ ہے ورلڈ بینک کیساتھ جس پر وہ سود نہ لیتا ہو۔۔۔۔۔ اس نے سالار کے ساتھ بحث کی تھی۔۔۔

اگر ہم اسی طرح ایک ایک چیز میں میخ نکالتے رہیں گے تو پھر اس معاشرے اور اس سسٹم میں تو کبھی بھی کام نہیں کر سکیں گے کیونکہ یہ تو پورا معاشرہ سود پر کھڑا ہے اور وہ ہمارے لیے اپنے سسٹم کو نہیں بدلیں گے۔۔۔ اس نے امامہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ پھر تو ہمیں حلال کھانے کی کوشش بھی ترک کرنی چاہیے۔۔۔ پھر تم سپر سٹور میں ڈبوں پر انکے اجزاء کیوں چیک کرتے رہتے ہو۔۔۔ بس یہ سمجھ کر کھالینا یہ سب کچھ کہ یہ ہمارا نہیں انکا معاشرہ ہے اور اپنے سپر سٹور میں وہ چیزیں رکھیں گے جو انہیں پسند ہو۔۔۔۔۔

امامہ نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔۔۔ وہ بحث جاری رکھنے کی بجائے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔۔۔ لیکن امامہ کی ناراضگی کے باوجود اس نے ورلڈ بینک جوائن کر لیا۔ اور امامہ کو

اس نے اپنا ایگریمنٹ اور جاب پر وفا نل کے کاغذات زبردستی پڑھ پڑھ کر سنائے
 -- اس نے سب کچھ سننے کے بعد اس پیپر ز کو واپس لفافے میں ڈال کر اسے دیتے
 ہوئے کہا۔۔

تم سود کے پیسے سے انسانیت کی خدمت اور بہتری کے خواب دیکھ رہے ہو اور تمہیں لگتا
 ہے اس میں فلاح ہے۔۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔۔ سود کا شمار انسانوں کی زندگی بدل سکتا
 ہے مگر تباہی میں۔۔۔۔ بہتری میں نہیں۔۔۔۔ اسکی یہ بر ملا تنقید سالار کو خفا بھی کرتی
 تھی اور کمزور بھی۔۔ اس دن امامہ کو فون کرتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ اس سے
 کیا سننے جا رہا ہے لیکن خلاف توقع اس نے اس نئے عہدے کے حوالے سے کوئی بات
 نہیں کی۔۔ وہ اس سے جبریل عنایہ اور حمین کی باتیں کرتی رہی۔۔۔ یہاں تک کہ
 سالار کا احساس جرم حد سے گزر گیا۔ وہ جیسے چاہتا تھا کہ وہ اسے ملامت کرے۔۔ کوئی
 تو مبارکباد دینے کی بجائے اسکے ضمیر کو کچھ لگائے۔۔۔۔۔
 تمہیں پتا ہے ورلڈ بینک نے مجھے وائس پریزیڈنٹ۔۔۔۔۔
 امامہ نے اسکو بات مکمل نہیں کرنے دی۔۔۔ ہاں۔۔۔ یک حرفی جواب آیا۔۔
 تو؟؟ سالار کو تسلی نہیں ہوئی۔۔

بلکل۔۔۔۔۔ جواب تڑاخ سے آیا تھا۔۔۔۔۔

اس بار دونوں ہنس پڑے تھے۔۔۔ پھر سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

یہی وہ بات تھی جو کانگو سے آتے ہوئے تم سے کہنا چاہتا تھا۔

امامہ کو یاد آ گیا تھا اسے ایک اعتراف کرنا تھا واپس آ کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اوہ۔۔۔۔۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا کہنا چاہتے ہو۔ وہ دھیرے سے ہنسی اور کہا۔ ایسا کیا

ہوا جو تم یہ بات کر رہے ہو مجھ سے یا تب کہنا چاہ رہے تھے۔۔۔۔۔

سالار کی سمجھ میں اسکا جواب نہیں آیا۔۔۔۔۔

تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ امامہ نے اسکی خاموشی کو ایک پہیلی کی طرح بوجھا۔

ابھی نہیں۔۔۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔

یہاں کب آؤ گے؟ امامہ نے بات بدل دی تھی۔

ابھی فلائٹس بند ہیں کنشاسا کے لیے۔۔۔ لیکن تم تو پریشان نہیں ہونا؟؟ سالار نے

پوچھا۔۔۔

اب نہیں ہوں اور تم بھی پریشان مت ہونا۔ مجھے اور حمین کو علاج کی تمام سہولیات مل رہی ہیں۔ امامہ نے اسکے لہجے میں نمودار ہوتی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔۔۔ سالار نے مطمئن ہو کر کچھ دیر جبریل اور عنایہ سے بات چیت کی اور اسکے بعد کال ختم کر کے وہ اس لیپ ٹاپ اور کاغذات کی طرف متوجہ ہوا جو ابھی کچھ دیر پہلے ایک سر بہ مہر تھیلے میں ایک شخص اسکے کمرے میں دے گیا تھا سب کچھ بالکل محفوظ حالت میں تھا۔ کوئی چیز ڈیلیٹ یا غائب نہیں ہوئی تھی۔ اسکے باوجود سالار کو انباکس میں جاتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس سے پہلے بھی وہاں تھا کیونکہ انباکس میں موجود سات گھنٹے پہلے تک آنے والی ہر ای میل کھولے اور پڑھے جانے کی نشاندہی کر رہی تھی۔۔۔ انباکس میں موجود ای میلز پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک ای میل پر ایک لمحہ کے لیے اسکا دل رکا۔۔۔ وہ پیٹرس ایبا کا کا آخری پیغام تھا۔۔۔

تمہیں پتا ہے میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں۔۔۔ ٹائم وارنر سینٹر۔۔۔ اور کس لیے؟؟

۔۔۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے اینڈرسن کو پوچھا تھا سی این این سٹوڈیوز میں۔ اسکے شو میں شرکت سے پہلے ابتدائی بات چیت کے سیشن کے لیے۔۔۔ مجھے پتا ہے اس وقت تم کہو گے۔۔۔ اوہ مائی گاڈ۔ man you did it

جس چیز نے اس وقت سالار کی آنکھوں کو دھندلایا تھا وہ مسکراہٹیں تھی ایبا کا کہ جملے کے اختتام پر۔۔ اینڈرسن کو اوپر سے ملنے کے بعد میں نے سب سے پہلا میسج تمہیں کیا ہے۔ کیونکہ میں یہاں تک کبھی نہیں پہنچتا اگر مجھے تمہاری صورت میں ورلڈ بینک کی بے ضمیر دنیا میں ضمیر کی جھلک نہ دکھائی دیتی۔ میں ان دیوؤں کے سامنے واقعی بونا تھا جو میرے ملک کو لوٹنا چاہتے تھے لیکن پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا کہ مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہیے۔۔ واشنگٹن پہنچ جاؤ تو مجھے انفارم کرنا ہم دونوں کو ملنا ہے۔ کافی دن ہو گئے سٹار بکس کی کافی پیئے۔ اور اس دفعہ بل میں پے کرونگا۔ ای میل کا اختتام ایک اور مسکراہٹ سے ہوا تھا۔ ایک آنکھ مارتی شرارتی مسکراہٹ سے۔۔

کانگو کی تاریخ کو ایبا کا نہیں اپنے خون سے بدلاتھا۔۔ سالار نے ای میل بند کر دیا۔۔

اس رات وہ مصلے پر بیٹھا گڑ گڑاتا رہا۔۔ اللہ سے آزمائش میں آسانی کی بھیک،،

سیدھے رستے کی بھیک جس سے وہ بھٹک گیا تھا اور ان لوگوں میں شامل نہ کرنے کی

بھیک جن پر اللہ کا عذاب آتا ہے۔۔

فجر کے وقت اسے ڈاکٹر سبط علی کی خیال آیا تھا۔ اور خیال نہیں آیا تھا وہ جیسے دیوانہ وار

انکی طرف لپکا تھا۔۔ وہ ایمر جنسی میں ٹکٹ حاصل کر کے اگلی رات پاکستان دوڑا چلا

آیا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی اس سے ہمیشہ کی طرح گرمجوشی سے ملے اور کچھ حیرانی سے۔۔ وہ
 کی سالوں بعد اچانک اس طرح اس کی پاس بھاگتا ہوا آیا تھا۔۔ انہوں نے سالار سے
 بھاری بھاری سب کی خیریت دریافت کی۔۔

امامہ ٹھیک ہے؟

جی۔۔۔

جبریل کیسا ہے؟

وہ بھی ٹھیک ہے۔

NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

عناویہ؟؟

وہ بھی۔۔

اور حمین؟؟

وہ بھی۔۔ وہ ایک ایک کے بارے میں بتاتا گیا اور ڈاکٹر سبط علی الحمد للہ کہتے رہے۔ پھر

انہوں نے پوچھا۔۔

اور تم؟؟؟

نہیں۔۔۔ میں ٹھیک نہیں ہوں۔۔ اس بار سالار بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ دم بخود سے دیکھتے رہے۔۔ وہ پہلی بار ایسے ٹوٹ کر رویا تھا۔۔۔

مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اس نے روتے ہوئے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔۔۔

مجھے مت بتانا۔۔ سالار نے حیران ہو کر انکا چہرہ دیکھا۔۔

آپ کو بتانے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔۔۔

میں تمہارا گناہ جان کر کیا کروں گا۔۔ اب روک نہیں سکتا تمہیں۔۔۔ چھتاوا دیکھ چکا ہوں۔ بہتر ہے اپنے اور اللہ کے درمیان رکھو اسے۔۔۔ جو پردہ ہے اسے پڑا رہنے دو۔ اللہ غفور الرحیم ہے۔۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح تحمل سے انہیں سمجھایا تھا۔۔

میں بتاؤں گا نہیں توہیں ری گمراہی ختم نہیں ہونگی۔ آپکو اندازہ نہیں میں کتنی تاریکی میں کھڑا ہوں۔۔ مجھے اس تاریکی سے خوف آنے لگا ہے۔۔۔ میں نے سود والا رزق چن کر اللہ کی حد توڑ دی ہے۔ اور مجھے ایک کے بعد ایک پریشانی آرہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

توبہ کر لو اور وہ رزق چھوڑ دو۔۔۔ اس نے بلا توقف بڑی سہولت سے کہا۔

توبہ آسان ہے مگر دلدل سے نکلنا آسان نہیں میرے لیئے۔۔۔

انہوں نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔۔۔ آسان تو دنیا میں کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن ممکن بنا لیا جاتا ہے۔۔۔۔

میں سینتیس سال کا ہوں اپنی عمر کے دس سال میں نے دنیا کے بہترین مالیاتی اداروں میں کام کیا سارا رزق سود سے کمایا

حمین بہت خوش قسمت ثابت ہوا ہے تمہارے لیئے۔ سکندر عثمان نے فون پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ گہری سانس لیکر رہ گیا۔

وہ ٹھیک ہے نا؟؟؟

ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ سٹیبل ہے۔۔۔ سالار نے انہیں بتایا۔۔۔ تب سکندر کو سکول کا کوئی چوکیدار یاد آیا تھا۔ جو ان سے کچھ رقم ادھار لینے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ سود پر کوئی رقم لی تھی اس کے ماں باپ نے اسکی بہنوں کی شادی کے لیئے۔۔۔ اور وہ ابھی تک سود اتار رہا۔ اب شاید کوئی اور مسئلہ آن پڑا ہے انہیں۔۔۔۔

سکندر عثمان سالار کو بتا رہے تھے اور سالار کو لگا کسی نے اسکے گلے کی رسی میں ایک گرہ اور ڈال دی تھی بعض دفعہ جب اللہ کوئی چیز منہ پر مار کر تشبیہ کرنا چاہتا ہے تو پھر ہر جگہ سے وہی بات بار بار گشت کرتی ہوئی آتی ہے۔۔

اسکے پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ جانے کے بعد سکندر عثمان ہی گاؤں کے اسکول کو دیکھتے رہے تھے ہفتے میں ایک بار وہاں جاتے اور اسکول کی انتظامیہ اور ملازمین کے معاملات دیکھتے۔۔

آپ اس مدد کریں اسکا قرضہ اتار دیں۔۔۔ سالار نے ان سے کہا۔۔

ہاں۔۔ تاکہ وہاں لائن لگ جائے قرض مانگنے والوں کی۔ ہمیں کیا پتا وہ سچ بول رہا یا

جھوٹ۔۔۔ یہاں گاؤں دیہات میں ستر فیصد لوگ سوڈ پر ایک دوسرے سے قرض لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی۔۔ یہ انکی زندگی اور کاروبار کا سائیکل ہے۔۔ تم یا میں اسے روک سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔۔۔ سالار یہ بات سن کر دنگ رہ گیا تھا کہ وہ وہاں کہاں کہاں تک ناسور کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔۔۔

اسی رات اپنے ہوٹل میں ورلڈ بینک کے کچھ ساتھیوں سے اسکی ملاقات تھی انہیں کانگو

کے لیے اپنا لائحہ عمل ڈسکس کرنا تھا۔۔۔ گپ شپ کے بعد وہ اس ہوٹل کے نائٹ

کلب میں ان سب کے اصرار پر ایک اسپینی گلوکارہ کو سننے کے لیے گیا تھا اور وہاں جبکی اس سے آٹکرائی تھی۔۔۔ ایسی جگہ پر اتنی پرکشش عورت کا اس پر یوں فدا ہونا اور اسکے ساتھیوں کا اسکے اطراف سے ایک دم ایک ایک کر کے غائب ہونا سالار نظر انداز نہیں کر سکا۔۔۔ اسے ہنسی آئی تھی۔۔۔

مغرب کو ہر فرسٹریشن کا علاج الکحل اور عورت کی شکل میں کیوں سو جھتا ہے۔۔ انکی ہر ترغیب کی ابتدا اور انتہا عورت ہی کیوں ہوتی ہے۔۔ اور سی آئی اے کو آخر جلدی کس بات کی تھی۔۔ اسکو ٹریپ کرنا تھا تو اتنا گھسا پٹا منصوبہ تو نہیں بناتے۔۔۔ مستقبل میں اسکو استعمال کرنے کے لیے کوئی کمزوری چاہیے تھی تو کچھ انتظار تو کرتے۔۔۔ وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا۔۔ اور اب وہ اس جہاز پر تھا۔۔ اس سفر میں اس نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی نوکری سے کمائے جانے والے پیسوں سے اپنے خاندان کی کفالت نہیں کریگا۔۔ اسکے لیے کسی بھی ذریعے سے انکی کفالت کوئی مسئلہ نہیں تھا۔۔۔ وہ بہت سی امریکن یونیورسٹیز میں لیکچرز کے لیے مدعو ہوتا رہا تھا۔ اور اسکے لیے اسے معاوضہ بھی دیا جاتا رہا تھا۔۔۔

اسے اب ورلڈ بینک کی نائب صدارت صرف دو چیزوں کے لیے درکار تھی۔ وہ قرض

سر سے اتار دیتا جو ایسا کانے اسکے لیئے چھوڑا تھا۔ اور وہ کچھ مہلت حاصل کر لیتا۔۔۔ سود سے پاک پہلے بین الاقوامی مالیاتی ادارے کی تشکیل کے لیئے۔۔۔ مقصد بڑا تھا۔ وسائل بھی اتنے ہی درکار تھے دل کہتا تھا یہ بے وقوفی ہے اور ضمیر کہتا تھا کہ راستہ ہے تو یہی ہے۔۔۔۔۔

اس کا ہاتھ پکڑے اب وہ اسے کسی راستے پر لے جانے لگا تھا۔ وہ ایک جھیل تھی۔۔۔ ہلکی نیلی رنگت کے شفاف پانی کی ایک جھیل۔۔۔ جس کے پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی ہوئی وہ دیکھ سکتی تھی۔۔۔

اور اسکی تہہ میں بے شمار رنگوں کے موتی اور سپیاں۔۔۔۔۔ جھیل کے چاروں اطراف پر پھول تھے۔۔۔ اسکے قدموں کو روکنے والی شے جھیل کے کنارے پر موجود لکڑی کی وہ خوبصورت کشتی تھی۔۔۔

یہ میری ہے۔۔۔ وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر بچوں کی طرح بھاگتی ہوئی کشتی کی طرف گئی۔ وہ اسکے پیچھے لپکا۔ وہ دونوں کشتی میں بیٹھ گئے ہوا کا ایک تیز جھونکا کشتی کو پانی میں لے گیا۔ دونوں بے اختیار ہنسے تھے۔ پانی پر تیرتا ایک ہنس اسکی طرف آگیا تھا۔۔۔ پھر

دوسرا۔۔۔ پھر تیسرا۔۔۔ وی کشتی کے گرداب دائری بنا کر تیر رہے تھے۔۔۔ وہ پاس سے گزرتے ہر ہنس کو چھوتی کھلکھلا رہی تھی۔۔۔

امامہ ہڑبڑا کراٹھی تھی نیند سے۔۔۔ اس نے اپنی کلامی پر کسی کا لمس محسوس کیا تھا۔ سالار اسکے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خواب آور دواؤں کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی ایک دم اپنا ہاتھ اسکے ہاتھوں سے کھینچتی ہوئی کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھنے لگی تھی سالار نے اسے روکا۔۔۔

اٹھو مت۔۔۔۔۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 تم واقعی آگئے ہو۔۔۔ اسے اب بھی جیسے یقین نہیں آیا تھا۔۔۔

وہ دھیرے سے ہنسا۔۔۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ آ جاؤں گا۔۔۔

یہ تو نہیں بتایا تھا کہ کب آؤ گے۔۔۔ اور تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔

بس میں نے سوچا تمہاری نیند خراب ہوگی۔ وہ مدہم آواز میں بات کر رہا تھا۔ دوسرے بستر پر جبریل اور عنایہ گہری نیند سو رہے تھے۔

تمہیں کیا ہوا ہے؟؟ امامہ نے سالار کے چہرے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔۔۔ اسکی

آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ خلتے اور آنکھیں سرخ اور یوں سو جھمی ہوئی تھی جیسے کی راتوں سے نہیں سویا ہو۔

کچھ نہیں۔۔۔ بس اتنے دن گھر سے دور رہا شاید اس لیے پھر،،،،،،،،،،

سالار نے اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ امامہ نے اسکی بات کاٹ دی اسے یکدم اپنا خواب یاد آ گیا۔۔

سالار تمہیں پتا ہے ابھی میں کیا خواب دیکھ رہی تھی۔۔ سالار نے چونک کر اسے دیکھا



کیا؟؟؟

میں نے خواب میں ایک گھر دیکھا جھیل کنارے۔ جہاں تم مجھے لیکر جا رہے تھے ایک کشتی میں بٹھا کر۔۔۔

وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ جو گھر اس نے امریکہ میں اسکے لیے mortgage کیا تھا وہ سمندر کے ایک جھیل نما ٹکڑے کے کنارے تھا۔ اس نے ابھی امامہ کو بتایا نہیں تھا وہ اسے سر پر اتر دینا چاہتا تھا اس کی اگلی سالگرہ پر۔۔

جس جھیل کے کنارے وہ گھر تھا وہ بے پناہ خوبصورت تھی۔ سفید کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی نیلے پانی کی جھیل۔۔ جس میں ہر طرف راج ہنس تیر رہے تھے۔ اور پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں۔

وہ بول نہیں پارہا تھا۔ جس جھیل کنارے اس نے وہ گھر خریدا تھا وہ بھی کچھ ایسی ہی تھی ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا شاید امامہ کو اس گھر کا پتالگ گیا ہے شاید اس نے لیپ ٹاپ میں اس گھر کی تصویر دیکھ لی تھی۔۔ اور اب جان بوجھ کر اسے چھپڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

لیکن ایسا تھا تو اس نے لیپ ٹاپ کب دیکھا تھا۔ پچھلے کی دنوں میں تو یہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسکا لیپ ٹاپ اسکے پاس تھا۔ اور گھر کیسا تھا۔۔ وہ کریدے بغیر نہ رہ سکا۔

شیشے کا۔۔۔

سالار کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔۔ وہ گھر بھی شیشے کا تھا۔ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟؟ امامہ کو اسکی نظریں عجیب سی لگی۔

اس نے امامہ سے نظریں ہٹالی وہ اسے ی نہیں بتا سکا کہ کنٹاسا آنے سے پہلے ڈاکٹر سبٹ علی سے مل کر واشنگٹن آنے کے بعد اس گھر کی mortgage کینسل کروا چکا تھا۔ امامہ کے خوابوں کا گھر اسکے ہاتھ سے جا چکا تھا۔۔۔ ایک لمحے کے لیے اسے عجیب پچھتاوا ہوا۔۔۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ وہ اس گھر کو واپس حاصل کر لے فوری طور پر امریکہ بات کر کے۔ وہ اس وقت جس پوزیشن میں تھا وہ یہ۔ کر سکتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ذہن کو جھٹکا تھا۔۔۔ بی صرف سی آئی اے نہیں تھی جو اسکے لیے جال بچھا رہی تھی۔۔۔ شیطان بھی وہی تھا۔ اسکے بندوں کو اپنے بندوں میں بدلنے کے لیے کمر بستہ۔۔۔۔۔ جال سی آئی اے نے عورت کا پھینکا تھا تو شیطان نے گھر کا۔۔۔ زن زر زمین انسان انہی تین چیزوں کی وجہ سے سردار بنتا ہے اور انہی کی وجہ سے سردار تک جاتے ہیں۔۔۔ سالار سی آئی اے کو اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہہ کر جو تمار آیا تھا تو کیسے ممکن تھا شیطان خود اٹھ کر سامنے نہ کھڑا ہوتا۔ اور شیطان کے منہ پر تھوک کر آنے والا جسکی پناہ اور حفاظت کا دعویٰ کر کے وہ آیا تھا یہ کیسے ممکن تھا۔۔۔ وہ رب اپنے بندے کی حفاظت کے لیے وہاں نہ ہوتا۔۔۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ گناہ پر اسکے لیے سزا زیادہ تھی تو نیکی پر اسکے لیے انعام بھی بے پناہ۔۔۔۔۔

حمین کیسا ہے؟؟ وہ ایک دم بات کو وہی چھوڑ کر حمین کے انکو بیٹر کی طرف آیا تھا۔ شیطان نے افسوس سے ہاتھ ملے۔۔ وہ بات چھوڑ کر کیسے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ وہ جس برق رفتاری سے آیا تھا اور پل بھر میں غائب ہوا۔۔ بس وسوسہ اور وہم ڈالنا تھا وہ ڈال گیا۔۔۔۔۔

بالکل ٹھیک ہے۔۔ دیکھو سو رہا ہے۔۔ امامہ نے وہی تکیے سے ٹیک لگائے کہا۔۔ سالار نے انکو بیٹر کو کھول کر پہلی بار حمین سالار کو گود میں لیا۔۔ اسے جھکے جھکے سینے سے لگایا اور چوما۔۔ وہ کمزور بچہ باپ کے لمس پر کسمسا یا پھر اس نے آنکھیں کھولی۔۔ سیاہ موٹی گول آنکھیں۔۔ اس نے باپ کو دیکھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ اسے دیکھتا رہا۔۔ سالار بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسکے ماتھے پر چند بل آئے تھے ناک اوپر چڑھی اور پھر حمین نے پوری قوت سے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ اسکی آواز اتنی باریک اور تیز تھی کہ چند لمحوں کے لیے سالار ہکا بکارہ گیا۔ اسکے ننھے وجود کے اندر اتنی جان کہاں سے آئی تھی۔۔ جبریل اور عنایہ اسکی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔ پیڈی ایک دم اندر آگئی۔ سالار حمین کو واپس انکو بیٹر میں رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا لیکن وہ ایک ہفتے کا بچہ ایک بار انکو بیٹر سے نکلنے کے بعد دوبارہ واپس اندر نہ

جانے کے لیے جتنی جدوجہد کر سکتا تھا وہ کر رہا تھا۔۔۔ اسکا بس چلتا تو اہنے ہاتھوں کی پشت سینے ناک اور جسم کے ہر حصہ پر لگی نالیوں اور تاروں کو کھینچ کر اتار دیتا۔۔۔ وہ ان میں سے کسی چیز کو تو نہیں اتار سکا لیکن وہ ہلکا سا ڈا پیر اس کے جسم کے مسلسل جھٹکوں سے کھل گیا تھا جو صرف رسما ہی اسے باندھا گیا تھا۔ وہ یکدم ٹارزن کے بچے جیسے خلیے میں آ گیا تھا۔ بستر سے چھلانگ لگا کر باپ کی طرف بھاگتے جبریل نے اہنے چھوٹے بھائی کے اس دلیرانہ اقدام پر بے اختیار چیخ مار کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھا۔۔۔

Baba..baby is naked

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Reviews بابا۔۔۔ بے بی ننگا ہے۔۔۔

وہ آنکھیں بند نہ کرتا تو بے شرمی کے اگلے مظاہرے پر یقیناً پتھر کا ہو جاتا کیونکہ بے بی اب اس پانی سے فراغت حاصل کر رہا تھا جو ٹیوبز کے ذریعے اسکے اندر منتقل کیا جا رہا تھا۔ پیڈی کو حمین تھماتے ہوئے سالار بے یقینی سے پیشاب سے بھیگی اپنی شرٹ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ یہ کارنامہ اسکے پہلے دو بچے نہ کر سکے تھے۔۔۔

تم نے پتا نہیں اسے کیسے پکڑا ہے۔۔۔ کتنے سخت ہاتھ لگائے ہیں کہ وہ اس طرح رو رہا ہے۔۔۔ پیڈی لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔ بلکہ اسے مجھے دو۔۔۔ امامہ اسکی حالت کو مکمل طور پر

نظر انداز کرتے ہوئے اپنے روتے ہوئے بیٹے کی طرف متوجہ اپنے بستر سے بے قراری کے عالم میں اتر رہی تھی۔۔

بابا میں اپنی آنکھیں کھولو؟؟ جبریل اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے باپ کو ڈھونڈتے لڑکھڑاتے قدموں سے آنکھیں بند کیسے سالار کی طرف آیا تھا۔ وہ اس چھوٹے بھائی کی بے پردگی دیکھنے کو تیار نہیں تھا جو اس وقت لٹل سٹوارٹ کی طرح انکو بیٹر سے باہر کودنے کو تیار تھا۔۔

عنا یہ ایک بار ہڑ بڑا کر جاگنے کے بعد سالار کی طرف متوجہ ہوئے بغیر دوبارہ سوچکی تھی۔ سالار نے جبریل کے پھیلے ہاتھوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

Yes you can

اس نے جبریل کو خود سے لپٹائے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔ جبریل نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے چور نظروں سے انکو بیٹر کو دیکھا جہاں اب حمین پیڈی اور امامہ کے وجود کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

بابا آپ کیوں رو رہے ہیں۔۔ باپ کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس نے پہلی نظر میں اسکی

آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔۔ اور اسکے جملے نے امامہ کو بھی پلٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔۔

سالار کی پشت اب اسکی طرف تھی اور وہ جبریل کو پلٹائے چومے جا رہا تھا

گھر مکمل طور پر جل گیا تھا نقصان کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر یہ ورلڈ بینک کی طرف سے

فراہم کردہ رہائش گاہ تھی۔ سالار کنشاسا پہنچنے کے اگلے ہی دن اس گھر کو دیکھنے آیا

تھا۔ لوٹ مار کے بعد اب وہاں جو بچا تھا وہ ملبہ اور راکھ تھی۔۔۔ وہ پھر بھی خوش

نصیبوں میں تھا کیونکہ اس ملبے میں اسکے کسی پیارے کی ہڈیاں نہیں تھی۔۔ گھر کو لگنے

والی آگ میں وہ چھوٹی موٹی ساری جیولری سیونگ سرٹیفکیٹس اور اسکے بچوں کی

انشورنس کے پیپرز راکھ ہوئے تھے یا لوٹ لیئے گئے تھے۔۔ لیکن اس چھوٹی موٹی

جیولری کی قیمت بھی چالیس لاکھ سے کم نہیں تھی۔۔ اس گھر میں اور بھی بہت کچھ

چلا گیا تھا جس کا امامہ کو صدمہ تھا لیکن سالار کو نہیں۔۔ اسکے لیئے پی کافی تھا کہ اس کا

خاندان سلامت تھا۔۔

وہ ایمبسی سے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔۔

اسکی بات کاٹ دی۔

تمہیں لگتا ہے تم یہاں کانگو میں بیٹھے ہو گے تو میں اور بچے پاکستان میں عیش کریں گے؟؟
تم اپنے سکون کے لیے مجھے بے سکون کرنا چاہتے ہو۔ میں نہیں جاؤں گی
سالار۔۔۔ مجھے وہی رہنا ہے جہاں تم رہو گے۔ اگر یہاں خطرہ آئے تو پھر سب کے
لیئے آئے اور اگر تحفظ ہو تو بھی سب کے لیے۔۔۔

وہ اسکی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس ضد سے نہیں ہٹے گی۔

تم کچھ کرنا چاہ رہے ہو جسے مجھ سے چھپا رہے ہو لیکن تم چھپا نہیں سکو گے میں جان
جاؤں گی تم نہ بھی بتاؤ۔ وہ اب شکی بیویوں کی طرح اسے کرید رہی تھی۔۔۔

کچھ نہیں۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہے۔۔۔ جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں ایبا کا کے ساتھیوں
سے ملنے اور مذاکرات کرنے۔۔۔ سالار نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس
کر کہا۔۔۔

ایک مہینے تک پھر بھی پاکستان چلیں گے۔

تم چلو گے؟ امامہ نے پیچ میں ہی اسکی بات کاٹ دی۔

ہاں چلوں گا یار اب اتنی بھی بے اعتباری ٹھیک نہیں۔۔۔
اس نے جیسے برامانتے ہوئے کافی کا گھونٹ لیکر کپ رکھ دیا۔

کانگو کے عوام کے لیے سالار کا چہرہ استحصالی سامراج کا چہرہ نہیں تھا بلکہ وہ انکے لیے ایبا کا قریبی اور قابل اعتماد ساتھی کا چہرہ تھا۔ ایبا کا کے خاندان نے اسکی موت کے بعد کسی بھی غیر ملکی ادارے یا حکومت کے نمائندوں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن سالار کی ملاقات کی درخواست کو اس نے رد نہیں کیا وہ اس سے بڑی خوشدلی سے ملے۔۔ سالار نے ایبا کی آخری ای میل اسے دی تھی جو اس نے سالار کو کی تھی۔۔ اس ای میل کا پرنٹ آؤٹ اگلے دن بڑے بڑے مقامی اخبارات میں شائع ہوا۔

افریقہ اب پیٹرس ایبا کی جسد خاکی کے استقبال اور تدفین کی تیاریاں کر رہا تھا۔ امریکہ حکومت ابتدائی طور پر میت کو واپس نہیں بھیجنا چاہتی تھی کیونکہ انہیں خدشہ تھا پیٹرس ایبا کی تدفین کے لیے اکٹھا ہونے والا لاکھوں کا مجمع ایک بار پھر سے کانگو میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر سکتا ہے۔ مگر یہ سالار سکندر کیساتھ ہونے والی

ملاقات میں ایبا کا کی فیملی کا دباؤ اور اصرار تھا کہ وہ ایبا کا کی میت کی واپسی ممکن بنائے اور وہ اس بات کی گارنٹی دینے پر تیار تھے کہ ایبا کا کی تدفین پر امن ہوگی۔۔ سالار نے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے ذریعے امریکی حکومت کو یہ بات باور کرا کہ ایبا کا کی لاش کی باعزت واپسی کانگو کے عوام کے دلوں میں اس غصے کو ختم کرنے میں معاون ہوگی۔۔ امریکی حکومت دو ہفتے بعد اسکی میت بھیجنے پر تیار ہوگی تھی۔۔

ورلڈ بینک کی انتظامیہ نے سالار کو ایبا کا کی آخری رسومات میں شریک ہونے سے روکا تھا جس کے لیے اسے ایبا کا کی فیملی نے مدعو کیا تھا اور سالار نے اس دعوت نامے کو قبول کر لیا تھا۔۔

امامہ بھی اس فیصلے سے ناخوش اور خوفزدہ تھی اور اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔۔ سالار اسکی منت سماجت کے دوران ایئر پورٹ جانے سے پہلے دو نفل پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔۔ وہ بے بسی سے بچوں کو لیے بیٹھ گئی۔۔۔

اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم بچوں کو لیکر فوری پاکستان چلی جانا اس انتظار میں مت بیٹھی رہنا کہ میری ڈیڈ باڈی مل جائے۔۔۔

اس نے نفل پڑھنے کے بعد اس سے پہلا جملہ یہی کہا۔

امامہ کے دل پر چوٹ پڑی۔۔ تم بڑے بے رحم ہو۔۔ اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

تم سے کم۔۔۔۔ سالار نے ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔۔

جبریل باپ کے ساتھ ہی دروازے تک آیا۔۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ کو خدا حافظ کہا تو اس نے اسکا بازو پکڑ لیا۔۔۔

تم واپس آ جاؤ گے نا؟؟ وہ برستی آنکھوں سے منت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

اس نے امامہ سے نظریں ملانے بغیر اسکا ہاتھ نرمی سے ہٹا کر چوما۔۔ انشاء اللہ۔۔۔ پھر

جھک کر اپنی ٹانگ سے چپکے جبریل کو اٹھاتے ہوئے اسکا منہ چوما۔۔ اور کہا اپنی مٹی اور

بہن کا خیال رکھنا۔

I always do baba

بابا میں ہمیشہ ہی رکھتا ہوں۔۔۔ جبریل نے اسے یقین دلایا۔۔

سالار نے ایک بار پھر اسکا منہ چوما۔۔۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔۔ سالار نے اسے گود سے

اتار دیا اور سب کو خدا حافظ کہا۔۔ دروازے میں برستی آنکھوں کیساتھ کھڑی امامہ کو

دیکھے بغیر۔۔

لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں سالار نے ایئر پورٹ پر ایسا کاکمیٹ وصول کی۔ کوئی ہتھیاروں سے مسلح اس قبائلی ہجوم میں جانے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا جسکو جان لینے اور دینے کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔۔

وہ وہاں نہتا تھا۔ اور تن تنہا اسی دلیری سے اپنے ساتھ ایک بھی گارڈ لیئے بغیر اندر چلا گیا تھا۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

دنیا میں کروڑوں ٹی وی اسکرینز پر لائیو نشر ہونے والا وہ ایونٹ لاکھوں کے اس ہجوم میں صرف ایک شخص کو فوکس کیسے ہوئے تھا۔۔ اور بار بار۔۔ وہ اس مجمع کے سامنے بیٹھا تھا جس میں سے کوئی بھی اس پر گولی چلاتا تو یہ بھی پہچانا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کہاں تھا اور کون تھا۔۔

اگر وہ مجمع اس پر چڑھ دوڑتا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جو اس مجمع کے ہاتھوں اسکی بوٹیوں کے بھی ٹکڑے ہونے سے روک سکتا۔ اور یہ احساس سالار کو اسٹیج پر بیٹھے ان

لاکھوں لوگوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس کے دل پر لاکھوں لوگوں کی ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ اور اسکی زبان پر قرآنی آیات کا ورد تھا۔

امریکہ میں سی آئی اے اور ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں اسکرین پر نظر آنے والا وہ شخص ان سب کو اپنی ہیبت میں لے رہا تھا۔۔۔ جنکا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا۔۔۔ دلیری ہو تو ایسی۔۔۔ جرات ہو تو ایسی۔۔۔

وہ گنگ تھے۔۔۔ دم بخود اور مرعوب۔۔۔۔

وہ شخص اب پیٹرس ایبا کا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے نشست سے اپنا نام پکارے جانے پر اٹھ رہا تھا۔۔۔ لاکھوں لوگوں کا مجمع اسکے لیے تالیاں بجا کر داد تحسین دے رہے تھے۔ وہ اس وقت پوری دنیا کے کیمروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سٹیج کے بلکل اوپر کافی بلندی پر ایک بلیک ہاک ہیلی کاپٹر میں سی آئی اے کے کچھ کمانڈوز اس مجمع کوٹی وی سکوپس سے مانیٹر کر رہے تھے۔۔۔ چند اور بلیک ہاکس آس پاس کی عمارتوں کو۔۔۔۔ وہ سالار سکندر کی حفاظت اور زندگی کے لیے اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ سالار سکندر روسٹرم کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔۔۔ مجمع کو سانپ سونگھ

گیا۔۔۔ تھا۔۔۔ اب وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے بعد قرآنی آیات کی تلاوت کر رہا

تھا۔۔

وہ ٹی وی آن نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے بے چینی کے باعث بند کر کے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔۔۔ وہ سرد اور بے حس و حرکت وجود کیساتھ بت بنی اس شخص کو ٹی وی پر دیکھ رہی تھی۔۔ اگر اس کے وجود میں کہی حرکت تھی تو وہ اسکے دل کی دھڑکن تھی۔ سالار سکندر نے زندگی میں بہت ساری تقریریں کی تھی لیکن ان میں سے کوئی تقریر لاکھوں کے ایسے مجمع کے سامنے نہیں۔۔ جس سے وہ انسانی ہمدردی کے علاوہ کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ مقامی زبان میں ان سے بات کر رہا تھا اور وہ ترجمہ ہو کر اسکے ساتھ سکرین پر آ رہا تھا۔ نہ امامہ کو اندازہ تھا اور نہ سالار سکندر کو کہ وہ آج افریقہ کے اس سیاہ فام مجمعے کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خطبہ دہرائے گا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بسم اللہ سے تقریر کا آغاز کیا پھر قرآنی آیات سنائی کہ عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اسکے بعد اس نے سراٹھا کر مجمع کو دیکھا۔۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھول گیا کہ اسے کیا کہنا تھا۔۔ اس نے دوبارہ روسٹرم پر رکھے اس کاغذ پر نظر دوڑائی جس پر اس نے تقریر کے نکات لکھے تھے۔۔ وہ

ہمیشہ صرف نکات لکھ کر ہی تقریر کیا کرتا تھا۔۔۔ اسے اپنی یادداشت اور علم پر ایسا ہی اندھا یقین تھا۔ اور اب وہ بالکل خالی ذہن کیساتھ ہونقوں کی طرح اس مجمع کو دیکھ رہا تھا جو اسکے اگلے الفاظ کے منتظر تھے اسکے پچھلے الفاظ انکے سر سے گزرے تھے۔ افریقہ کے وہ قبائل جو اس وقت وہاں اکٹھے تھے وہ آج بھی اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے نہ ہی اللہ کے وجود کو مانتے اور پہچانتے تھے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اسے آخری خطبہ یاد آیا تھا۔۔۔ میں ایک ایسی تنظیم کا حصہ ہوں جنہوں نے ماضی میں اس خطے اور آپ لوگوں کیساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں آپ لوگوں کو کمتر سمجھا گیا۔ آپ لوگوں کے حقوق چھینے گئے اور آپ لوگوں کے وسائل پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔۔۔ میں ان سب کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں کیونکہ میں ایک ایسے مذہب کا ماننے والا ہوں جو یہ سب گناہ قرار دیتا ہے میں ایک ایسے مذہب کا ماننے والا ہوں جسکے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امانتوں میں خیانت سے منع کرتے تھے وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرنے کی تلقین کرتے تھے جو اپنے لیے۔۔۔۔۔ جنہوں نے بتایا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں۔ وہ انسانی مساوات کی بات کرتے تھے۔ ذات پات رنگ و نسل کو نہیں مانتے تھے۔ سالار سکندر حافظ تھا، مبلغ نہیں تھا، مقرر تھا مفسر نہیں تھا۔۔۔ زندگی میں کبھی اس نے اپنے پروفیشن میں مذہب کو لانے کی

کوشش نہیں کی تھی وہ آج بھی اسی نیت سے وہاں آیا تھا پر اس وقت جو زبان سے نکل رہا تھا وہ دل کی آواز تھی جو دلوں تک جا رہی تھی۔۔

افریقہ میں غیر انسانی حالات میں رہنے والا وہ سیاہ فام مجمع اسکی باتیں سن رہا تھا اور اب پہلی بار ساکت و صامت خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔۔ اور اس خاموشی کو ایک بے اختیار داد و تحسین نے توڑا تھا یہ داد سالار سکندر کے جملے پر نہیں ملی تھی یہ داد خاتم النبیین کے آخری خطبے کے ایک بنیادی فلسفے کو ملی تھی۔ آج چودہ سو سال بعد بھی وہ پیغام دلوں کو تسخیر کر رہا تھا ان پر مرہم۔ بھی رکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ پیغام انسانیت کے لیے تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے لوگ اب بھی گنگ تھے۔ لاکھوں کا وہ مجمع اس آدمی کو اپنے رعب میں نہیں لے پارہا تھا لیکن اسکی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس لاکھوں کے مجمعے کو جیسے اسکی مٹھی میں لے آئے تھے۔۔ سالار نے وہ اسم اعظم پڑھتے ہوئے افریقہ کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا جو چودہ سو سال پہلے بھیجا گیا تھا۔

امامہ بھی دم بخود تھی۔ وہ شخص کس جگہ کھڑا کیا دہرا رہا تھا۔۔

یہ لوگ بابا کے لیے تالیاں کیوں بجا رہے ہیں؟؟ وہ جبریل کے سوال پر جیسے چونک پڑی۔ امامہ اسکا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ تالیوں کی گونج اب تھم رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک

بجتی رہی تھی۔ اتنی دیر تک کہ سالار کو یاد آ گیا تھا کہ اسے آج وہاں کیا کہنا تھا۔ لیکن اب اپنے بھولے ہوئے الفاظ یاد آنے پر اتنی خوشی نہیں ہوئی۔۔۔ تاثر اس میں تھی جو بھول کر یاد آیا تھا۔۔۔

میں افریقہ میں اپنے مذہب کے انہی اصولوں اور اسی سوچ کیساتھ کام کرنے آیا ہوں اور میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ان اصولوں پر آپ لوگوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کر سکتا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن میں ان طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کرونگا جنکے خلاف پیٹرس ایباکانے جنگ کی اور جن سے لڑتے ہوئے اس نے جان دی۔ لیکن ایباکانے اپنی جان اس لیے قربان نہیں کی کہ وہ اپنے لوگوں کو بدترین حالت میں جیتا دیکھے وہ اپنے لوگوں کے لیے خواب دیکھتا تھا۔۔۔ ایک اچھی زندگی کا خواب۔۔۔ سالار سکندر اب انہیں ایباکانے کی آخری ای میل سنارہا تھا۔

لاکھوں کا وہ مجمع جو ناقابلِ تسخیر پہاڑ لگ رہا تھا اب تسخیر ہو چکا تھا۔ وہ سالار کے الفاظ پر رورہا تھا۔۔۔ تالیاں بجا رہا تھا۔ اسکے الفاظ پر نعرے لگا رہا تھا۔

سالار اپنی تقریر ختم کر کے روسٹرم سے ہٹ چکا تھا۔ واپس اپنی نشست کی طرف

جاتے ہوئے لاکھوں کا وہ مجمع سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ آنسو صرف اس مجمع کی آنکھوں سے نہیں بلکہ امامہ کی آنکھوں سے بھی روانہ ہو چکے تھے۔ وہ مجمع سالار کو اپنا نجات دہندہ کے طور پر دیکھتے ہوئے رورہا تھا اور امامہ اس نجات دہندہ کی جان ایک بار پھر بچ جانے پر۔۔۔۔۔

آپ کیوں رورہی ہیں مئی۔۔۔ جبریل نے کچھ پریشان ہو کر ماں کو دیکھا۔۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

تمہیں پتا ہے تمہارے اندر خود کشی کرنے کی خواہش آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح سترہ سال پہلے تھی۔ سالار سکندر نے لیپ ٹاپ پر آخری ای میل کا جواب دیتے ہوئے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے امامہ کی آخری پھٹکار سنی۔۔۔ وہ اب اپنا کام نمٹا چکا تو امامہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ پریشان تھی اسے اندازہ تھا۔ جو کچھ آج ہوا تھا اسکے بعد اسکے ذہنی تناؤ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ سالار نے لیپ ٹاپ بند کر کے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

تمہیں پتا ہے مجھے تمہاری کیوں ضرورت ہے اور میں کیوں فکر مند رہتی ہوں تمہارے لیے۔۔؟؟

وہ اسکے اعتراف پر برہم ہوئی تھی۔ کیونکہ بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ تم کوئی سپر مین نہیں ہو جو وہ تمہارے کمالات دیکھ کر تالیاں بجائیں گے۔ تمہیں کچھ ہوگا تو۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ بات کرتے کرتے رو ہانسی ہوگی۔ بات مکمل نہ کر سکی۔ وہ گہری خاموشی کیساتھ اسکی بات سنتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا جو اسکے بلقابل کھڑی تھی اور وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔ جو اب پہلے سے مدھم آواز میں آیا تھا۔۔۔ وہ اور برہم ہوئی۔

میں مذاق نہیں کر رہی۔۔ اسے لگا جیسے ہمیشہ کی طرح وہ اسے زچ کر رہا۔

اب اگر ایک بار پھر تم نے یہ جملہ دہرایا تو میں اس کمرے سے چلی جاؤں گی تمہیں

میری ہر بات احمقانہ لگ رہی ہے۔

یو آر رائٹ۔۔۔۔ وہ اس بار زچ ہو کر جھلاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ پھر اسکے پاس بستر

پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو۔

میں پہلا اسلامی مالیاتی نظام بنانا چاہتا ہوں جو سود سے پاک ہو لیکن پوری دنیا کے لیے ہو
باضابطہ قابل عمل اور جو اسکی جگہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جو اب اتنا غیر متوقع تھا کہ
وہ حیرانی سے سالار سکندر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

تمہیں لگتا ہے میں نہیں کر پاؤں گا؟؟؟ بہت دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے اس خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔

یہ کام دنیا میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ صرف تم کر سکتے ہو سالار۔

اس بار گنگ ہونے کی باری سالار کی تھی۔ یہ جواب نہیں وہ اعتماد تھا جسکی اسے
ضرورت تھی۔ اسکا خون بڑھا۔ اور سیروں کے حساب سے بڑھا تھا۔

تھینک یو۔۔ امامہ کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے سالار نے اپنا شکر اس تک پہنچا
دیا۔ شکر یہ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن وہ اسکا چہرہ دیکھتی رہی یوں جیسے وہ
منتظر تھی کہ وہ کچھ کہے۔۔۔۔

تمہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔ بلاخر سالار نے کہا۔ وہ ہنس پڑی یوں

جیسے اس نے کوئی عجیب بات کر دی ہو۔۔۔

تم مشکلات کی بات مجھ سے کر رہے ہو سالار؟ زندگی میں بڑے بڑے دن گزارے ہیں میں نے اس نے ایک گہرا سانس لیا۔۔۔۔

لیکن وہ بڑے دن میری وجہ سے نہیں آئے تھے اب شاید میری وجہ سے بھی آئے۔ سب سے مشکل چیز یہی ہے میرے لیے میں جو کرنے جا رہا ہوں اسکے اثرات تم تک اور بچوں تک آئیں گے۔ واحد کمزور کرنے والی شے یہی ہے مجھے۔۔

تم یہ مت سوچو۔۔ جو کرنا چاہتے ہو وہ کرو باقی دیکھا جائے گا۔۔۔ زندگی اس سے بدتر تو بحر حال نہیں ہوگی جیسی میں گزار آئی ہوں۔۔۔

امامہ کو اس وقت یہ بات کرتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ جن مشکلات سے سالار خوفزدہ تھا وہ یہ مشکلات نہیں تھی جو وہ سوچ رہی تھی۔۔۔ وہ صرف مالی مسائل کے حوالے سے اسے متنبہ کر رہا تھا۔

میں سونے کا چمچہ منہ میں لیکر پیدا ہوئی تھی بچپن سے دنیا کی ہر نعمت ملی پھر ایک اور وقت آیا جب اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی تھی دوسروں کے سر پر

محتاجی کی زندگی گزانی پڑی۔ نوکری کرنا پڑی۔ وہ وقت بھی گزر گیا پھر تمہارے ساتھ گزرے پچھلے ساتھ سال میں دنیا کی ہر نعمت و آسائش ملی۔ پہلے سے بڑھ کر اور بہتر۔۔۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں بھولی یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی انسان کا کوئی نعم البدل نہیں۔۔۔ توجہ تک بچے اور تم میرے پاس ہو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔۔۔

اس نے سالار کو دیکھا وہ خاموشی سے اسکی بات سن رہا تھا وہ اسے ہولانا نہیں چاہتا تھا یہ کہہ کر کے بچے اور وہ بھی کبھی اس سے چھن سکتے تھے۔ جیسے پہلے چھین لیے گئے تھے۔ اور ہر آزمائش مال پر شروع ہو کر مال پر ختم نہیں ہوتی۔

پہلی بار سالار کی نظر امامہ کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی پر پڑی تھی۔ جو اس نے اسے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ وہ بے حد حیرانی کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کچھ بولنا بھی بھول گیا۔ اسکا خیال تھا کہ یہ انگوٹھی بھی اس گھر میں موجود لا کر میں پڑے دوسرے زیورات کیساتھ جل گی ہوگی اس جگمگاتی بیش قیمت انگوٹھی کو اب اسکی مخروطی انگلی میں سجا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔ ناقابل بیان خوشی۔ اس نے امامہ کا ہاتھ تھام لیا۔

یہ کہاں سے آئی؟؟ گفتگو کا موضوع عجیب انداز میں بدلا تھا۔۔۔ امامہ ہنسی اور اس نے ہتھیلی پر ہی اپنا ہاتھ پھیلا دیا تھا۔ اسے سالار کی خوشی اور کیفیت کا اندازہ تو نہیں ہوا لیکن خود وہ اس انگوٹھی کو دیکھ کر کھل سی گئی۔ اس کیساتھ اسکی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ دیر سے ملا تھا لیکن منہ دکھائی کا تحفہ تھا۔ اور اسکے ہاتھ میں جب وہ پہنی ہوتی تھی اسکی خوبصورتی دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتی تھی اتنا تو۔ امامہ جانتی تھی لیکن اسکی قیمت کا اندازہ اسے آج بھی نہیں تھا۔۔ سالار نے اس کے ایررنگز اور چین کو نوٹس نہیں کیا اور وہ انگوٹھی پہ اٹک گیا تھا بس۔۔

تم نے میرے ایررنگز اور چین نہیں دیکھی؟؟ وہ اسے اب دونوں چیزیں ہاتھ سے چھوتے ہوئے دکھا رہی تھی کسی بچے کی طرح خوشی اور جوش سے۔۔ سالار نے مسکراتے ہوئے ان چیزوں کو دیکھا اور پھر امامہ کے یکدم سب بھول بھال کر جگمگاٹھنے والے چہرے پر نظر ڈالی تینوں چیزوں کو دیکھتے ہوئے اسے یاد آیا تھا۔۔ وہ چین ڈاکٹر سبط علی کی دی ہوئی تھی اور ایررنگز امامہ کو شادی کے تحائف میں اسکے ساس سسر نے دی تھی اور وہ انگوٹھی اس نے سکندر عثمان کی طرف سے ملنے والی جائداد میں سے ایک پلاٹ کو بیچ کر خریدی گئی۔ ان تینوں میں سے کوئی چیز سود اور حرام کے پیسے سے نہیں

خریدی گی تھی۔ اور وہ زیور واپس آ گیا تھا۔۔

تم کیا سوچ رہے ہو؟؟ امامہ نے اسے مخاطب کیا۔

کچھ نہیں ایسے ہی اک خیال آیا تھا۔۔ سالار گہر اسانس لیکر بات ٹال گیا تھا۔

اس انگوٹھی کی قیمت کیا ہے؟ پتا نہیں امامہ کو ایک دم سے اسکی قیمت کا خیال کیسے آ گیا۔

یہ انمول ہے۔ کیونکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔۔۔ سالار نے اسکا ہاتھ چوما اور وہی جواب

دیا جو اس انگوٹھی کے پہناتے وقت دیا تھا۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح سرشار ہوئی تھی۔ بی

بہت دفعہ پیش کیا جانے والا خراج تحسین تھا جو ہر بار نیا لگتا تھا کیونکہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

پیکنگ مکمل ہوگی؟؟ سالار نے موضوع بدل دیا۔

ہاں۔۔ مکمل ہوگی۔ امامہ اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ وہ تین دن بعد پاکستان جا رہے تھے۔

تم کتنے دن ٹھہرو گے وہاں؟ امامہ نے پوچھا۔

ایک ہفتہ۔۔۔ سالار نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔۔

کیوں؟؟ تم ہمارے ساتھ وہاں زیادہ دن کیوں نہیں ٹھہرو گے۔۔ امامہ کو اعتراض

ہوا۔

ایک ہفتہ بھی زیادہ ہے میرے لیئے۔ کام کا ڈھیر ہے یہاں اور مجھے تمہارے واپس آنے سے پہلے گھر کا بندوبست بھی کرنا ہے۔۔

میں بھی تمہارے ساتھ ہی ایک ہفتہ بعد واپس آ جاؤں گی۔ امامہ نے کہا۔

نہیں تم اب ایک ماہ بعد ہی آؤ تمہیں آرام کی ضرورت ہے وہاں گھر کا ماحول تبدیل ہو گا تو بہت اچھا محسوس کرو گی۔ یہاں بچوں کیساتھ بہت پریشانی ہوتی ہے تمہیں۔۔ سالار نے اسے کہا۔

مجھے بچوں سے زیادہ تمہاری پریشانی ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر وارڈروب کے سامنے کھڑی تھی۔ سالار نے لیٹے لیٹے اسے دیکھا۔ وہ وارڈروب سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور اسکے انداز میں کچھ تھا جس نے سالار کو چونکا دیا۔

میری کیا پریشانی؟ اس نے پوچھا تھا۔

پتا نہیں۔۔ بس مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس نے ادھی بات کر کے وارڈروب دوبارہ کھولی۔

کس چیز سے ڈر لگتا ہے۔۔ سالار نے پوچھا۔۔ امامہ نے ویسے ہی کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔۔ کس چیز سے ڈر لگتا ہو گا مجھے؟ وہ جیسے کسی سائیکالوسٹ

سے اپنے مسئلے کا حل پوچھ رہی تھی۔۔

میری موت سے؟؟ اوت وہ سائیکالوسٹ بے حد بے رحم تھا۔

امامہ ہل نہ سکی۔ اس نے جیسے نشتر اسکے جسم میں موجود ناسور پر سیدھا ہی مار دیا تھا۔

ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔۔ سالار اسکی نظروں سے الجھا تھا۔۔

تم بہت بے رحم ہو۔۔ اور ہمیشہ سے ہو۔۔

تم نے سوال کیا تھا مجھ سے میں نے اندازہ لگایا۔ صحیح اندازہ لگایا کیا؟ وہ جیسے داد چاہتا تھا۔

اب تمہیں پتا چلا میں تم سے کیوں کہتی ہوں کہ تمہارے اندر آج بھی موت کشش

رکھتی ہے۔ وہ جو کہنا چاہ رہی تھی وہ کہہ نہ سکی اور جو کہہ دیا اسکے غلط ہونے کا اندازہ

ہو گیا اسے۔۔۔

موت سے کون فیسی نیٹ ہوتا ہے امامہ۔۔۔ کوئی پاگل ہو گا جو ایسے سوچے گا۔ اور ایک

وقت میں میں پاگل تھا اب نہیں ہوں۔۔۔ وہ عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

اب بھی ہو۔۔۔ امامہ کہے بنانہ رہ سکی۔۔ وہ ہنساتھایوں جیسے اسکے جملے سے محفوظ ہوا

ہو۔۔۔

تم ہمیشہ ٹھیک کہتی ہو۔

اس کی ہنسی نے امامہ کو کم تپایا اور اسکے جملے نے زیادہ۔۔۔ وہ وارڈ روم کو پوری قوت سے بند کرتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔۔۔ اسے پتا تھا وہ اب اسے زچ کرے گا اور کرتا ہی جائے گا۔۔۔ یہ اسکا ذہنی تھکن اتارنے کا ایک طریقہ تھا۔۔۔ اسے زچ کرنا۔

کانگو بحران اور اس سے پہلے ہونے والے واقعات سی آئی اے کے لیے سالار سکندر کو اس لسٹ میں ڈالنے کا باعث بنا تھا جن پر باقاعدہ نظر رکھی جاتی تھی۔ وہ افریقہ میں اب انکاسب سے اہم کارندہ تھا۔ انکے لیے کام کر رہا تھا لیکن انکاسا تھی نہیں تھا۔ اس نے کانگو اور افریقہ میں ایک بے حد نازک صورت حال میں ان سب کو ایک شرمناک صورت حال سے نکالا تھا۔ اسکی تقریر میں اپنے ہی ادارے اور سامراجی قوتوں پر کی جانے والی تنقید کسی کو بری نہیں لگی۔ اگر صورت حال کنٹرول میں آجاتی تو وہ اس سے زیادہ گالیاں کھانے پر تیار تھے لیکن اگر کوئی چیز سالار سکندر کی تقریر میں انہیں قابل اعتراض لگی وہ اپنے مذہب اور پیغمبر کا حوالہ تھا۔ وہ افریقہ میں بے شک انکے لیے اہم تھا لیکن کوئی اہم ترین شخص بھی اسلامی سوچ کے پرچار کے لیے ورلڈ بینک کا عہدہ استعمال

نہیں کر سکتا تھا۔

سی آئی اے کو سالار سکندر کو مانیٹر کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اسلامی مالیاتی نظام کو قائم کرنے کا سوچ رہا ہے جو سود سے پاک ہو۔۔۔ انکے لیئے یہ پریشان کن بات نہیں تھی وہ اسکو ایک خیالی پلاؤ سے زیادہ

اہمیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ اگر کوئی بات پریشان کن تھی تو وہ سالار کا یکدم سامنے آنے والا مذہبی شخص تھا۔ جو انکے نزدیک افریقہ جیسی حساس جگہ پر انکے لیئے پریشانیوں کھڑی کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔۔۔ اسے ہر جگہ مانیٹر کیا جانے لگا۔۔۔ اور پہلی غیر معمولی سرگرمی جو سی آئی اے نے ریکارڈ کی تھی وہ ایبا کا کی تدفین کے تین ہفتے بعد مسقط میں سالار سکندر کی سمندر میں ایک لانچ پر پانچ لوگوں سے ایک ملاقات تھی۔ جس میں سے ایک مسقط کی رائٹل فیملی سے تھا۔ سالار سمیت وہ پانچوں پرانے شناسا اور دوست تھے ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔۔۔ وہ اپنی اپنی فیلڈ کے نامور لوگ تھے وہ سب دنیا کے انڈر فورٹی گلوبل لیڈرز کی فہرست میں شامل تھے جن کے بارے میں پیش گوئی تھی کہ وہ دس سال بعد دنیا کے ممتاز ترین لیڈرز میں سے ہوں گے۔۔۔ ان میں سے کوئی بات سی آئی اے کے لیئے پریشان کن نہیں تھی سوائے

اس آخری مماثلت کے۔۔۔ سالار سمیت وہ پانچ کے پانچ افراد مسلمان تھے باعمل اور حافظ قرآن تھے۔۔۔

-----+++++-----

وہ پاکستان میں امامہ کے قیام کا تیسرا ہفتہ تھا۔۔۔ وہ شروع کے دو ہفتے لاہور میں ڈاکٹر سبط علی اور سعیدہ اماں کے پاس گزار کر اب باقی دو ہفتے اسلام آباد رہنے آئی تھی۔۔۔

وہاں انکی آمد کا دوسرا دن تھا جب سالار نے اسے امریکہ میں کسی پرانے دوست کے بارے میں بتایا تھا جو اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان میں مقیم تھا اور سالار سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے مبارکباد دینے۔۔۔

کی سالوں بعد سعد اپنی فیملی کیساتھ سالار سے ملنے اسکے گھر آیا تھا وہ مکمل طور پر باریش تھا اسکی داڑھی سفید ہو چکی تھی جسکو اس نے رنگا نہیں تھا وہ بے حد مہنگے برانڈڈ شلوار قمیص میں ملبوس تھا لیکن شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی۔ اسکے ساتھ نقاب لیئے ہوئے اسکی بیوی ایک آٹھ سالہ بچہ اور دو بچیاں بھی تھی۔۔۔

وہ اور اسکی بیوی سالار اور امامہ سے بڑی گرمجوشی سے ملے۔۔۔ امامہ جانتی تھی سعد

سالار کے شناساؤں میں تھا قریبی دوستوں میں نہیں۔۔ لیکن اس کے باوجود سعد اپنی گپ شپ اور بلند بانگ قہقہوں کے دوران سالار کے اسکے ساتھ امریکہ میں گزرے ہوئے وقت کے بارے میں ایسے ایسے قصے نکال کر سناتا رہا جیسے وہ اور سالار گہرے دوست رہے ہو۔

مجھے تو ہمیشہ سے اندازہ تھا کہ سالار بہت ترقی کرنے والا ہے بس ذرا قبلہ خراب تھا اسکا۔۔ چائے پینے کے دوران اس نے امامہ پر انکشاف کیا جیسے۔۔ امامہ اور سالار نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئے۔

اور اب دیکھیے بھابھی کیسا بدلا ہے۔۔ میری کوششیں کیسے رنگ لائی ہے سعد کہہ رہا تھا اور سالار نے اپنا کپ رکھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کیسا تھ کہا۔۔

لیکن تم بالکل نہیں بدلے۔ میری کوششیں کوئی رنگ نہیں لاسکی۔ اسکا مجھے بڑا افسوس ہے۔ سالار نے جتانے والے انداز میں کہا۔۔ سعد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

ارے ہم پر کہاں کسی کارنگ چڑھنا تھا۔ ہم پر تو اپنا ہی رنگ بڑا پکا تھا۔ بھابھی یہ آپکا شوہر نائٹ کلب اور ڈسکو کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے بھی کھنچ کھنچ کر ساتھ لیجانے کی کوشش کرتا تھا۔ نت نئی لڑکیوں سے دوستی بڑی رنگین زندگی گزار رہی اس نے۔۔۔

سالار نے ٹھیک کہا تھا وہ نہیں بدلاتھا۔ پیشتر لوگ خود کو بہترین مسلمان ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے ہر عیب اور خامی کو دکھانے اور جتانے کی وبامیں مبتلا ہوتے ہیں اور انکا اسلام انہیں صرف مقابلہ اور موازنہ سکھاتا ہے۔۔۔ پردہ پوشی نہیں۔۔۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کتنے نیک شخص کی بیوی ہے۔۔۔ احساس کمتری کی یہ ایک بھیانک شکل ہوتی ہے۔۔۔ سعد اب اپنے انکشاف سے جیسے خود ہی محظوظ ہوا تھا اور پلیٹ میں ایک نیا کباب رکھتے ہوئے ہنس رہا تھا۔۔۔ امامہ کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

بھابھی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سعد میری کافی رنگ برنگی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن سعد کو صرف ایک ہی رنگ کی لڑکی پسند تھی اور میں ذرا شوقین مزاج تھا۔ ڈسکو اور کلبز آنا جاتا رہتا تھا لیکن سعد ظاہر ہے میرے جیسا شوقین مزاج نہیں تھا اس لیے وہ اپنی گرل فرینڈ کیساتھ گھر پر ہی رہنا پسند کرتا تھا۔۔۔

کباب تو سعد نے پلیٹ میں رکھ لیا تھا لیکن پلیٹ اسکے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بچی تھی۔ سالار نے کی سالوں بعد ایسی کم ظرفی اور بے لحاظی کا مظاہرہ کیا تھا جو ایک زمانے میں اسکا شناختی نشان تھا۔

کیا نام تھا اسکا۔۔۔ ہاں آسٹیفنی۔۔۔ اب تو علیک سلیک ہی رہ گی ہوگی یا وہ بھی نہیں۔۔۔ اسکی یادداشت سفاکانہ حد تک تیز تھی۔ اور اس وقت اس نے سعد کا قتل ہی کر دیا تھا۔۔۔ سعد کا اندر بکاسانس اندر اور باہر کاسانس باہر رہ گیا۔ اس سب کی ابتدا سعد نے کی تھی اور انتہا اب سالار کر رہا تھا۔۔۔ سعد جو اب کیا دیتا اسکا تو سانس لینا محال ہو گیا تھا۔

امامہ اسکی بیوی کے تاثرات دیکھ نہ پائی کیونکہ اسکے چہرے پر نقاب تھا لیکن اسکی آنکھیں یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ سالار کے انکشافات سے خوش نہیں ہوئی تھی۔۔۔ امامہ کو بھی سالار کا یہ جوابی وار کچھ بھایا نہیں۔۔۔

بھا بھی آپ کچھ لیں۔۔۔ اس نے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے بروقت سعد کی بیوی عالیہ کی توجہ اس گفتگو سے ہٹانے کی کوشش کی۔

نہیں۔۔۔ بچے اور یہ لے رہے ہیں بس کافی ہیں ہم کچھ دیر پہلے ہی کسی لہجے سے آئے ہیں تو مجھے طلب نہیں۔۔۔ امامہ کو عالیہ کا لہجہ بے حد کھردرا لگا۔۔۔

آپ تو ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتی تھی نا؟؟ کیا سوال تھا جو سعد کی بیوی کی زبان سے امامہ کے لیے نکلا تھا۔۔۔ کمرے میں ایک دم خاموشی نہیں سکتے چھایا تھا۔۔۔ وہ

تجسس نہیں تھا جو ابی وار تھا۔۔ سعد سے نہیں آیا تھا اسکی بیوی سے آیا تھا۔۔۔
 نہیں۔۔ الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔ چائے کا کپ ہونٹوں سے ہٹا کر امامہ نے بے حد
 مشکل سے مسکرانے کی کوشش کی۔۔

اوہ اچھا مجھے انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا۔۔ وہ اسے بے نیازی سے سعد کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے بولی۔۔ تو بھابھی آپ پھر کوئی ادارہ جو اُن کر لیں نا۔۔ آپکو تو بہت
 زیادہ اصلاح اور علم کی ضرورت ہوگی جب تک آپ پاکستان میں ہے آپ میرے
 ساتھ مدرسے چلیں وہاں درس قرآن بھی ہوتا ہے اور روحانی اور اخلاقی تربیت بھی۔
 آپکا بہت شکر یہ لیکن مجھے اسلام قبول کیئے اور قادیانیت چھوڑے سولہ سترہ سال ہو
 چکے ہیں۔۔ اور میں ایک حافظ قرآن کی بیوی ہوں۔۔ امامہ نے اسکی بات بڑی نرمی
 سے کاٹی۔۔

وہ تو میں بھی ہوں۔۔ عالیہ نے اسی انداز میں کہا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

آپکو نہیں پڑا ہوگا مجھے پڑا ہے۔۔۔

بھابھی آپکو اس حوالے سے جب بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑے ہم حاضر ہیں۔ اب

میل جول تو ہوتا رہے گا۔ میں انشاء اللہ اس سال وقت نکال کر تبلیغ کے لیے کچھ دن کانگو بھی آؤں گا۔ تو آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ ویسے بھی اچھا ہے ہمارے بچے آپس میں ملتے رہے۔۔ سعد نے اپنی طرف سے بروقت مداخلت کرتے ہوئے گفتگو سنبھالنے کی کوشش کی۔

جی بھابھی ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔ ہمارے بچوں کو آپس میں ملتے رہنا چاہیے اور ہمیں بھی۔۔۔ بہت سی چیزوں میں آپکو اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔۔۔ عالیہ نے اپنے شوہر کی گفتگو مکمل کرنے کی کوشش کی۔۔۔ اگر کبھی ایسی ضرورت پڑی تو میں اور امامہ ضرور آپ سے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے لیکن فی الحال ہمیں لگتا ہے ہمیں اسکی ضرورت نہیں۔۔۔ اس بار سالار نے گفتگو میں مداخلت کر کے جیسے ایک فل سٹاپ لگانے کی کوشش کی۔

یار بچے کہاں ہیں تمہارے؟؟ تم ان سے تو ملواتے۔۔۔ میں چاہتا ہوں احسن اور جبریل بھی آپس میں متعارف ہو۔۔۔

جی جی ضرور۔۔۔ بچے ابھی ملازم۔ لاہی رہا ہوگا۔ وہ لان میں کھیل رہے ہیں۔۔۔ اس سے پہلے وہاں کوئی اور بات ہوتی ملازم کیساتھ عنایہ اور جبریل کمرے میں داخل ہوئے

تھے۔ سعد نے دونوں بچوں کو بڑی گرمجوشی سے پیار کیا۔۔۔ پھر جبریل اور احسن کو ایک دوسرے سے متعارف کیا۔ وہ دونوں ایک جیسے تھے۔۔۔ ریزروڈ۔۔۔ تمیز دار۔

--

وہ لوگ آدھ گھنٹہ اور بیٹھے تھے اور پھر انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلے گئے۔ وہ ایک یادگار اور خوشگوار ملاقات نہیں تھی لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ انکی ہر ملاقات ایسا ہی تاثر لیے ہوئے رہنے والی تھی۔۔۔

سالار ایک ہفتہ بعد واپس کانگو چلا گیا تھا اور امامہ اسلام آباد سے لاہور سالار کیساتھ آئی تھی۔ وہاں سے واپس اسلام آباد آنے پر امامہ اور بچوں کو سکندر اور طیبہ کیساتھ بہت سا وقت گزارنے کو ملا تھا۔ اور اسکے جانے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ جب سکندر نے بڑے غور و خوض کے بعد اس کو ہاشم مبین کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ مجھ سے کی دفعہ ملنے آئے ہیں۔۔۔ تمہارا نمبر لینے کے لیے۔ لیکن میں اتنی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کہ تمہارا اور انکار ابطہ کرواتا۔۔۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پھر پریشان ہو۔

سکندر عثمان اس سے کہہ رہے تھے۔۔۔ لیکن مجھے لگا میں بہت زیادتی کروں گا تمہارے ساتھ بھی اور انکے ساتھ بھی۔۔۔ اگر انکی یہ خواہش پوری نہ کروں۔۔۔۔۔ وہ بے یقینی سے انکا چہرہ دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔۔۔؟؟

یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا۔ سکندر نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔ اسکے خلق میں جیسے پھندا لگا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا۔ لیکن اسے تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ اسکے ماں باپ بھی ہیں۔۔۔ زندگی کے سولہ سترہ سال انکے بغیر گزارے انکے ہوتے ہوئے بھی۔۔۔ وہ آج بھی ان سے محبت کرتی تھی آج بھی انکے لیے جذباتی تھی۔۔۔ لیکن پچھلے چند سالوں نے سب بدل دیا تھا۔

اب ملنے کا فائدہ نہیں۔۔۔

سکندر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے ملنے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے خاندان سے ملنے کے لیے منتیں کرتی رہی تھی انکار تو ہمیشہ دوسری طرف سے ہوتا تھا۔

ماں باپ کے بارے میں ہم فائدے اور نقصان نہیں سوچتے۔ صرف حق اور فرض سوچتے ہیں۔۔۔

انہوں نے اس بار بھی ٹھیک کہا تھا۔

پاپا میں اب اس معلق پل پر نہیں جھول سکتی میرے بچے ہیں اب میں اپنی ذہنی الجھنیں ان تک منتقل نہیں کرنا چاہتی میں بہت خوش اور پرسکون ہوں اپنی زندگی میں۔۔۔ بس ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ کسی لعنت ملامت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی اب۔ کسی معافی تلافی کی ضرورت بھی نہیں رہی اب۔۔۔ بس جو گزر گیا وہ گزر گیا میں واپس پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی۔۔۔

اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اسکی آنکھیں کب برسنا شروع ہوئی۔
 امامہ۔۔۔ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔۔۔ وہ جامد ہو گئی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیار د عمل دے۔۔۔ خوش ہو؟ وہ خوش تھی۔۔۔ روپڑے؟ وہ پہلے ہی رو رہی تھی۔۔۔ اللہ کا شکر ادا کرے؟ وہ ہمیشہ کرتی رہتی تھی۔۔۔

وہ مسلمان نہ ہوتے تب بھی میں تم سے کہتا کہ ان سے مل۔ لو۔۔۔ بعض گناہوں کی سزا جب اللہ دینا چاہتا ہے تو پھر ہمیں نہیں دینی چاہیے۔۔۔ سکندر نے انہیں سمجھایا تھا۔ وہ اسکی اندر کی کیفیت سے نے خبر تھا۔۔۔ سوال معافی کا تو تھا ہی نہیں۔۔۔ وہ انکا سامنا اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اپنے وجود کو بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اس نے بے

حد مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا تھا۔۔۔

اس نے سکندر عثمان سے بحث نہیں کی وہ اگلے دن ہاشم مبین سے ملنے پر بھی تیار ہوگی۔۔۔ لیکن وہ اس رات سونہ سکی تھی۔۔۔۔

وہ۔ اگلے سہ پہر انکے گھر آئے تھے۔۔ وہ کمرے میں آئی تو باپ پر پہلی نظر پڑتے ہی روئی نہ ہی رونے کا تہیہ کیئے ہوئے تھی۔۔۔ وہ بے حد ضعیف لگ رہے تھے۔ یہ تانتے والا وہ وجود نہیں تھا جس سے وہ ساری زندگی ڈرتی رہی تھی۔۔۔ ہاشم مبین نے انہیں گلے لگایا۔۔۔ وہ نم آنکھوں سے بڑے حوصلے سے اس سے ملکر الگ ہوئی تھی۔۔۔ پہلے کی طرح ان سے لپٹی نہیں رہی تھی۔ اور پھر وہ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں تھے اور طویل اور گہری خاموشی۔۔۔ پھر اس خاموشی کو ہاشم مبین کی ہچکیوں اور سسکیوں نے توڑا۔۔۔ وہ اب بچوں کی طرح بلک بلک کر رہا تھا۔۔۔ اما نہ انہیں چپ چاپ دیکھتی رہی۔۔۔ وہ بھی بے آواز روتی رہی۔ اسکی آنکھوں سے برسنے والے آنسو اسکی ٹھوڑی سے ٹپکتے ہوئے اسکی گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔۔۔۔

وقت واقعی بڑا ظالم ہوتا ہے۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔ میں نے بہت بڑا ظلم کیا اپنے

آپ پر۔۔ اپنے خاندان پر۔ پتا نہیں کیسے ہو گیا یہ سب کچھ۔۔۔۔۔

ہاشم مبین روتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے۔۔ اور امامہ کو یاد آ گیا تھا انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہی تھی وہ اس پر بہت پچھتائے گی۔۔ ایک وقت آئے گا اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اور وہ واپس پلٹ کر ان سے معافی مانگنے آئے گی۔۔ اور تب وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔۔

مجھے لگتا ہے امامہ مجھے تمہاری بد دعا لگ گئی ہے۔۔۔ ہاشم مبین نے روتے ہوئے

کہا۔۔۔

مجھے بد دعا کا کبھی خیال بھی نہیں آیا اب۔۔۔ آپ کے لیے کیا کسی کے لیے بھی

نہیں۔۔۔۔ اس نے بلا آخر ہاشم مبین سے کہا۔ آپ نے دیر سے کیا لیکن صحیح اور اچھا

فیصلہ کیا۔ یہ ایک جملہ کہتے ہوئے امامہ کو بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ اسے و سیم یاد آیا

تھا۔ اسے اپنا وہ خاندان یاد آیا تھا جو سارا غیر مسلم تھا اور غیر مسلم ہی رہنے والا تھا۔

۔ واپس تو یاد وہ پلٹی تھی یا ہاشم مبین۔۔۔

تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں بہت وقت لگا دیا میں نے تمہارے سامنے

آنے میں۔ لیکن بس معافی مانگنا چاہتا تھا اور تمہاری ایک امانت تھی میرے پاس

-- وی مرنے سے پہلے تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ وہ اب اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اسے دے رہے تھے۔۔

یہ کیا ہے؟ اس نے لفافہ تھامے بغیر ان سے پوچھا۔۔

جاندا میں تمہارا حصہ۔۔ اسی حصے کے لیے تمہارے بھائیوں کو خفا کر دیا ہے میں نے

۔۔ وہ یہ بھی لینا چاہتے تھے مجھ سے۔ لیکن میں تمہاری چیزا نہیں نہیں دے سکتا

تھا۔۔۔ ساری عمر تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔ کچھ تو دینا چاہتا تھا تمہیں مرنے سے

پہلے۔۔۔

وہ انکی بات پر روپڑی۔ ابواسکی ضرورت نہیں تھی مجھے میں اسے لیکر کیا کروں گی۔ اگر

میرے بھائیوں کو میرا حصہ دینے سے انکی زندگی میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نکلتی

ہے تو انہیں دیں۔۔۔۔

ہاشم مبین نے بے حد مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔۔ میں اب انکے لیے غیر مسلم ہوں

امامہ۔۔۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینک چکے ہیں جیسے کبھی میں نے تمہیں نکالا

تھا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں کہہ رہا تھا۔۔

پھر آپ میرا حصہ بیچ کر اپنے لیے کوئی گھر لے لیں۔۔۔ کوئی جگہ۔۔۔ میرے پاس

اب سب کچھ ہے۔ امامہ نے وہ لفافہ پکڑ کر انکے بیگ میں واپس رکھ دیا تھا۔۔

تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔۔؟ انہوں نے رنجیدگی سے کہا۔

میں آپ کو معاف کرنے والی کون ہوتی ہوں ابو۔۔۔ یہ فیصلہ تو آپ کے لیے اللہ نے کرنا

ہے۔ میں صرف یہ دعا کر سکتی ہوں کہ اللہ آپ کو معاف کر دے۔۔ بڑی معافی تو وہاں

سے آنی چاہیے۔۔۔

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تم ہم سے ملتی رہو گی نا؟؟ عجیب آس اور حسرت تھی۔ امامہ نے سر ہلادیا تھا۔ ماں باپ

کا یہ حال اسے دل گرفتہ کیئے ہوئے تھا۔ ہاشم مبین کے چہرے پر اس ملاقات کے

دوران پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔۔۔

میں جائداد کا یہ حصہ تمہارے بچوں کے نام کر دیتا ہوں امامہ۔۔

ابو میں آپکی جائداد اور روپے پیسے میں سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ میں لوں گی بھی تو

سالار واپس کر دے گا۔۔ اس نے ہاشم سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔۔۔

ہاشم مبین کچھ دیر بیٹھے رہے پھر اسے ساتھ لیکر اسکی ماں سے ملوانے لے گئے۔۔ سکندر اور انکی بیوی بھی ساتھ گئے تھے۔۔ وہ ایک اور جذباتی ملاقات تھی۔

تم اب بہت بہادر ہو گئی ہو۔۔ اس رات سالار نے اس سے کہا۔ اس نے اپنے اس دن کی روداد سنائی تھی اسے فون پر۔۔۔

کیسے؟؟ وہ اسکے تبصرے پر حیران ہوئی۔ تم آج ایک بار بھی نہیں روئی مجھے اپنے پیرنٹس سے ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے۔۔۔ وہ چپ رہی پھر اس نے سالار سے کہا۔

آج ایک اور بوجھ میرے کندھوں اور دل سے ہٹ گیا ہے۔۔۔ بہت دیر سے سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے گمراہی سے نکال لیا ہے میرے ماں باپ کو۔۔۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں سالار۔۔۔ دیر سے سہی لیکن قبول ہو جاتی ہے۔۔۔ امامہ کے لہجے میں عجیب طمانیت تھی جو ہزاروں میل دور بیٹھے سالار نے محسوس کی۔۔۔

تمہاری ہو جاتی ہے۔۔ اس نے مدھم آواز میں امامہ سے کہا۔

کیا تمہاری نہیں ہوتی؟ اس نے جو اب اگو چھا۔

میری بھی ہوتی ہیں لیکن تمہاری زیادہ ہوتی ہے۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔

الحمد للہ۔۔ امامہ نے جواباً کہا۔۔ وہ ہنس پڑا۔۔

تم میرے پیرنٹس کو اولڈ ہوم۔ سے نکال کر انہیں کوئی گھر لے دو انکے پاس میرے جائیداد کا جو حصہ ہے اسے بیچ کر۔۔ بے شک چھوٹا گھر ہو لیکن میں انہیں اولڈ ہوم میں نہیں دیکھ سکتی۔

میں پاپا سے کہہ دوں گا وہ۔ کر دیں گے یہ کام۔ انکا خیال بھی رکھیں گے۔ تم اسلام آباد میں مستقل رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ی امامہ۔۔۔۔۔ تم اور بچے وہاں۔۔۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے اسکی بات کاٹ دی۔ میں تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں اور اسی تاریخ کو واپس آرہی ہوں۔

سی آئی اے نے سالار سکندر کی اس سرگرمی کو صرف مانیٹر اور ریکارڈ نہیں کیا تھا اس ملاقات میں شامل پانچ افراد کو بھی اپنی وایج لسٹ میں ڈال دیا تھا۔ اگلے آنے والی مہینوں میں سالار سکندر اور ان پانچ افراد کے بہت سارے تفریحی دورے ہوتے رہے

تھے۔۔۔۔۔ لیکن اب سی آئی اے صرف سالار سکندر کی نہیں ان پانچ افراد کی نقل و حرکت کو بھی مانیٹر کر رہی تھی۔۔۔ وہ پانچ افراد سالار سے صرف چند ماہ ملتے رہے پھر اسکے بعد انکی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ پانچ افراد اب آپس میں نہیں مل رہے تھے لیکن انفرادی طور پر اسی طرح ملاقاتیں کر رہے تھے۔

وہ ایک اسلامی مالیاتی سسٹم پر کام کر رہے تھے اور یہ بات سی آئی اے جانتی تھی لیکن اس نظام کی شکل کیا تھی۔ وہ اسے بوجھنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ اور اسکی وجہ صرف ایک تھی۔۔۔ ایک جگسا پزل کی طرح اس نظام سے منسلک ہونے والے سب افراد کے پاس اسکا ایک ایک ٹکڑا تھا۔ اور وہ اس ٹکڑے کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا لیکن وہ ٹکڑا اس تصویر میں کہاں لگنا تھا یہ صرف ایک شخص جانتا تھا۔۔۔۔۔ سالار سکندر۔۔۔۔۔

-----++++-----

مئی۔۔۔۔۔ جمین کب بڑا ہو گا۔ اس دن جبریل نے اپنی آرٹ بک میں کچھ بناتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔

بڑا تو ہو گیا ہے۔۔۔ امامہ نے اسکے سوال اور انداز پر غور کیئے بغیر کہا۔۔۔

تو پھر روتا کیوں ہے۔۔۔ امامہ بے چارگی سے اپنے بڑے بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی۔۔۔

آپ اس سے پوچھیں کہ اسکو کیا چاہیے۔۔۔ وہ امامہ کو جیسے مسلے کا حل بتا رہا تھا۔

میں پوچھ نہیں سکتی اور یہ بتا نہیں سکتا۔ امامہ اب بھی اسے اٹھائے لاؤنج میں ٹہلتے

ہوئے اسے تھپک رہی تھی۔۔۔ وہ بغیر آنسوؤں کے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا۔ اور پھر

رونے کے بیچوں بیچ بھی دلچسپ چیز نظر آنے پر ایک دم رونا بند کر کے اسکا جائزہ لینے میں

مصروف ہو جاتا اور جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ایک بار پھر اپنے رونے کے سلسلے کو

وہی سے جاری رکھتا جہاں چھوڑا تھا۔۔۔

سات آٹھ ماہ کی عمر میں ہی اس نے بیک وقت چار دانت نکالنے شروع کیئے۔

اس کو جلدی کس بات کی ہے؟ بیک وقت چار دانتوں کو نکلتے دیکھ کر سالار نے

کہا۔ جبریل اور وہ حمین سکندر کے بارے میں ایل جیسے تاثرات رکھتے تھے۔

یہ تم خود اس سے پوچھ لو۔۔۔ امامہ نے جواب دیا۔

حمین ان چار دانتوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے بھی صرف بڑوں کے کھانے والی ہر

اس چیز میں دلچسپی لیتا تھا جو چٹخارے والی ہوتی تھی۔۔۔ اپنے پوپلے منہ کیساتھ بھی چپس

اسکی پسندیدہ خوراک تھی۔ جسے وہ صرف چبا نہیں سکتا تھا نگل بھی سکتا تھا۔ وہ چپس کا پیکٹ تک پہچانتا تھا اور ایسا ممکن نہیں تھا کہ جبریل اور عنایہ اسکے قریب بیٹھ کر کوئی چیز اطمینان سے اسے کھلائے بغیر خود کھالیتے۔۔

وہ عجیب و غریب بچہ تھا۔ اور یہ پیام اسکے بارے میں سالار نے دیا تھا۔ جسکا خیال تھا کہ اس نے ایسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔۔۔

سکندر عثمان نے اس سے کہا تھا۔ میں نے دیکھی ہے۔۔ وہ تمہاری کاپی ہے۔

یہ زیادتی ہے۔۔ سالار نے اسکی بات پر احتجاج کیا تھا۔۔ وہ اور طیہہ ان کے پاس کانگو آئے تھے۔۔ جب وہ دونوں حمین سکندر کے ہاتھوں بننے والی اسکی درگت دیکھ رہے

تھے۔ وہ تب دس ماہ کا تھا اور سب سے پہلے اس نے جو لفظ بولنا شروع کیا تھا وہ "سالار" تھا۔ اور ہر بار سالار کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے حد خوشی سے ہاتھ پاؤں مارتا سالار سالار چلاتے ہوئے اسکی طرف جانے کی کوشش کرتا۔۔۔

بیٹا بابا۔۔ پہلی بار سالار کے لیے وہ لفظ سن کر ہنسی سے بے حال ہونے کے باوجود امامہ نے اس لفظ کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سالار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے توڑ توڑ کر سکھا رہی تھی۔۔۔۔۔ با۔۔۔۔۔ با۔

"سالار" حمین نے ماں کی محنت پر پانی پھیرتے ہوئے سالار کے لیے وہی لفظ استعمال کیا جو وہ سالار کے لیے اپنی ماں کو پکارتے سنتا تھا۔

تم اسے بابا مت سکھاؤ صرف رگنود و میرے نام کیساتھ یہ بھی غنیمت ہے میرے لیے۔۔۔۔ سالار نے اسے مشورہ دیا تھا۔۔ وہ بحر حال کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا تھا اس طرز تخاطب سے جو سکندر اور طیبہ کے لیے ایک تفریح بن گئی تھی۔۔۔ جبریل تحمل سے اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کو دیکھتا رہتا تھا جس نے اس کے گھر کے امن و سکون کو تہ و بالا کر کے رکھا ہوا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ حمین بڑا ہو جائے اور چلنا شروع ہو جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جب اس نے چلنا شروع کیا تو یہ دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس مسئلے کا غلط حل تھا۔۔۔

حمین سکندر کو پیر نہیں پر مل گئے تھے۔ اور وہ اب کہی بھی جاسکتا تھا اور کہی سے مراد کہی بھی۔۔۔ اور اسکی فیورٹ جگہ باتھ روم تھی۔ وہ بھی وہاں اس وقت جانا پسند کرتا تھا جب جبریل اسے باتھ روم میں جاتا دکھائی دیتا۔ اور جبریل نے اسکے ہاتھوں کی بار خاصی شرمناک صورت حال کو سامنا کیا۔ جس باتھ روم کو بچے استعمال کرتے تھے اس میں لاک نہیں تھا اور دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے کھولنا حمین کے بائیں ہاتھ کا

کھیل تھا۔ جبریل کے لیے حمین کی موجودگی میں ہاتھ روم جانا جام جو کھوں کا کام تھا۔ وی ہاتھ روم کے دروازے کی اندرونی طرف ہاتھ روم میں پڑی ان سب چیزوں کو رکاوٹوں کے طور پر دروازے کے سامنے ڈھیر کرتا۔

سالار سکندر اگر اسے عجیب و غریب کہتا تھا تو حمین سکندر باپ کے دیے گئے اس ٹائٹل پر پورا اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پوری فل جمعی کیساتھ۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Fictions | Articles | Books | Poetry | Interviews

نائب صدر کے طور پر سالار نے افریقہ کے لیے کسی مشین کی طرح کام کیا تھا۔۔۔ وہ مشکل ترین اہداف کے حصول کے لیے نامساعد ترین حالات میں کام کر رہا تھا اور کامیابی سے کر رہا تھا۔

سالار سکندر کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے کے قریب آ رہا تھا۔۔۔ بنک نے یہ دورانیہ ختم ہونے سے دو سال پہلے ہی سالار سکندر کو ملازمت میں توسیع کی آفر کی تھی اور اس نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ پھر اس آفر کو بار بار بہتر پیکیجز کیساتھ اسے اصرار کیساتھ پیش کا جاتا رہا۔ لیکن سالار کا انکار قائم رہا تھا۔ وہ افریقہ میں اپنے قیام کو اب ختم کرنا

چاہتا تھا۔ اور ورلڈ بینک کیساتھ امریکن حکومت کے لیے بھی یہ تشویش کی بات تھی۔ افریقہ کو سالار سکندر سے بہتر کوئی نہیں چلا سکتا تھا اس نے پچھلے چند سالوں میں نہ صرف ورلڈ بینک کی ساکھ اور امیج کو ہی افریقہ میں بدل کر رکھ دیا تھا بلکہ اس نے امریکن حکومت کے لیے بھی وہاں خیر سگالی کے جذبات دوبارہ پیدا کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی تھی۔ اسکا ورلڈ بینک کو اس وقت چھوڑ کر جانا نکلے لیے بڑا دھچکا ہوتا۔ لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں تھا۔ اور امریکن حکومت کو سوچنا پڑ رہا تھا کہ وہ اسے ایسی کیا چیز پیش کرے جو اسے روک سکے۔

ورلڈ بینک کی صدارت ہی یقیناً ایک ایسا تاج تھا جو اسکو پہنا کر اسے روکا جاسکتا تھا۔ سالار اس عہدے کے لیے موزوں ترین اور کم عمر ترین امیدوار تھا۔ مگر اس عہدے پر سالار کی تعیناتی امریکی حکومت کے لیے خود ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ ایک بنیاد پرست مسلمان کو وہ ورلڈ بینک کو صدر نہیں بنا سکتے تھے۔ اور وہ اس بنیاد پرست مسلمان کو کسی اور چیز کی آفر کر کے روک بھی نہیں پارہے تھے۔ لیکن ابھی امریکی حکومت اور ورلڈ بینک کے پاس اس پر سوچنے کے لیے وقت تھا کیونکہ سالار کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا۔

اس ایک سال میں سالار سکندر کی زندگی میں تین بڑے واقعات ہوئے اور ان تینوں نے انکی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔۔۔ ان واقعات نے ایک بار پھر اسکی زندگی بدل دی۔۔۔

چنی سے سالار سکندر کا تعارف غائبانہ رہا تھا۔ غلام فرید کے حوالے سے سکندر عثمان سے اسے کی بار خبریں ملتی رہی تھی۔۔۔ سکندر عثمان نے غلام فرید کے ذریعے گاؤں کی مسجد کے امام کو پہنچائی جانے والی امداد کے بارے میں سالار کو مطلع کر دیا تھا کیونکہ یہ امداد سالار کے کہنے پر ہی اس نے شروع کی تھی۔ غلام فرید کو اس میں ہیر پھیر کے نتیجے میں ملازمت سے فارغ کرنے کا حکم سالار ہی کا تھا۔ بددیانتی اور بے ایمانی اسکے لیئے قطعی ناقابل برداشت تھی۔

غلام فرید کے ہاتھوں ایل پچی کے سو پورے خاندان کا قتل سکندر عثمان کو بری طرح ہلا گیا۔ وہ اب غلام فرید کے لیئے کچھ نہیں کر سکتے تھے اور اسکے اسکی بچ جانے والی واحد اولاد کی دیکھ بھال اور کفالت کی ذمہ داری اٹھائیں۔۔۔ اور سالار کے کہنے پر وہ سکندر عثمان نے اٹھالی تھی۔ وہ اسکے لیئے ماہانہ رقم دیتے تھے جو اسکے رشتہ دار آکر لے جاتے

تھے اور کبھی کبھار وہ سکندر عثمان کو چنی بھی دکھا دیتے تھے۔ تاکہ انہیں تسلی رہے کہ وہ رقم واقع اس پر خرچ ہو رہی ہے۔۔۔ یہ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر سالار اس سال اپنی فیملی کیساتھ دو ہفتوں کے لیے پاکستان نہ آیا ہوتا ایک لمبے عرصے کے بعد سکندر کی بجائے وہ خود گاؤں کا سکول دیکھنے گیا۔۔۔۔۔ اسکول انتظامیہ کے چند لوگوں کیساتھ سالار اچانک اسکے گھر گیا۔۔۔ جس ڈیڑھ سال کی چنی کو سالار نے دیکھا وہ اسے سات آٹھ ماہ کی ایک بچی لگی تھی۔۔۔ بے حد کمزور۔ دہلی پتلی۔۔۔ اسکی سانولی رنگت یرقان جیسی پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ اسکا چہرہ سیاہ پیپ زدہ دانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس وقت سالار اس گھر کے صحن میں داخل ہوا وہ دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پاس بیٹھی تھی۔ اور اس دانے اور گندگی کو بلا تکلف اپنے منہ میں ڈال رہی تھی وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسکی کفالت کے لیے معقول رقم بھیجنے کے باوجود وہ اس حال میں ہو سکتی ہے۔۔۔ چنی کے رشتہ دار نروس اور گھبرائے ہوئے تھے وہ لوگ ڈسپلے اور پریزنٹیشن کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اسے اب سجا سنوار نہیں سکتے تھے۔

یہ بس ایسے ہی رہتی ہے۔۔۔ جتنی بار بھی کپڑے بدلویہ جا کر مرغیوں میں گھس جاتی ہے۔۔۔ حمیدہ۔۔۔ اری او حمیدہ۔۔۔ ذرا چنی کو دیکھ۔۔۔ کپڑے بدلوا صاحب نے ملنا

ہے۔۔۔

وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے چنی کو بغور دیکھا۔

سالار نے چنی کو اٹھالیا اور وہ بھی بڑے آرام سے کسی جھک کے بغیر اسکے پاس آگئی۔۔۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس حلیے کا شخص دیکھا تھا۔ سالار نے اسے تھکتے ہوئے پچکارا تھا۔ وہ پلکیں جھپکاتی بغیر اسے دیکھتی رہی۔۔۔

ہاں بس تھوڑی بیمار ہی رہتی ہے۔ شروع سے ہی ایسی ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے بھی فرق نہیں پڑا۔ اب پیر صاحب سے دم کرا کے لائے ہیں۔ انہوں نے تعویذ بھی دیا ہے گلے میں ڈالنے کے لیے۔۔۔ حمیدہ وہ تو ابھی ڈالا نہیں تم نے۔۔۔

سالار میاں بیوی سے اب اس بچی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اور وہ گڑ بڑائے ہوئے اسکے چہرے اور جسم پر رستے ہوئے دانوں کی وجوہات اور علاج بیان کر رہے تھے۔

سالار کو احساس ہو گیا کہ وہ غلط جگہ پر تھی۔ اس کا خیال نہیں رکھا جا رہا تھا۔ اسکی کفالت کے لیے دی جانے والی امداد اس پر خرچ نہیں ہو رہی تھی۔۔۔ پتا نہیں وہ کونسی ذہنی رو تھی جس میں اس نے چنی کو فوری طور پر وہاں سے لیجانے اور کسی دارالامان میں

داخل۔ کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے یہ فیصلہ چنی کے رشتہ داروں کو بھی سنا دیا تھا۔ انکے احتجاج کے باوجود وہ چنی کو وہاں سے لے آیا تھا۔ اس گاؤں سے اسلام آباد واپسی پر سالار اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا رہا تھا اور چنی برابر والی سیٹ پر بیٹھی دروازے کی کھڑکی سے چپکی اطمینان سے پورا راستہ باہر دیکھتی رہی۔ وہ اگر بے چین ہوئی تھی تو صرف تب جب سالار نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اسے سیٹی بیلٹ باندھنے کی کوشش کی تھی۔ جو اسکے ہاتھ پاؤں مارنے پر سالار نے کھول دی تھی۔ اسے اس وقت حمین یاد آیا تھا۔ وہ بھی اس عمر میں اسی طرح سیٹ بیلٹ سے جان چھڑاتا تھا۔

بیلٹ کھولنے پر وہ ایک بار پھر پرسکون ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی سالار کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سالار اسکا انہماک دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ اس نے رستے میں ایک جگہ رک کر اسے ایک جوس کا ڈبہ اور بسکٹ کا ایک پیکٹ لیکر دیا۔ وہ منٹوں میں دونوں چیزیں کھا گی جیسے وہ کی دنوں کی بھوک تھی۔

اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی میں سفر کے دوران سالار اس بچی کی رہائش کے لیے مناسب ترین جگہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس وقت ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نہیں سوچا کہ وہ اسے خود پالے گا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے بارے میں سوچ بھی

نہیں سکتا تھا اور اگر سوچتا بھی تو امامہ سے پوچھے بنا نہیں کر سکتا تھا۔

اسلام آباد پہنچنے پر گھر کے گیراج میں اسکے بچوں نے بھاگتے ہوئے اسکا استقبال کیا گاڑی کے اندر سب سے پہلے چنی کو ساڑھے تین سالہ حمین سکندر نے دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح اسکی آنکھیں گول ہوگی تھی یوں جیسے اس نے جنگل کا کوئی جانور دیکھ لیا تھا۔۔۔ سالار نے حمین کو ہٹا کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور چنی کو باہر نکال لیا۔۔۔ چنی سے آنے والی بدبو کے بھہکے سب سے پہلے حمین نے ہی محسوس کیئے۔۔۔

اوہ مائی گاڈ۔۔۔ یہ کتنی بدبودار گندی اور بد صورت ہے۔۔۔ وہ بے اختیار ناک پہ ہاتھ رکھے کہتا گیا۔

حمین۔۔۔۔۔ سالار نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں پکار کے

گھورا۔۔۔۔۔

لیکن ٹھیک ہے۔ شاید اسے اس طرح رہنا پسند ہو۔ میرا مطلب ہے کچھ لوگ مختلف

ہوتے ہیں۔ مجھے اسکا ہیئر سٹائل اچھا لگا ہے۔۔۔ یہ کول ہے۔۔۔

حمین نے ہمیشہ کی طرح باپ کی پھٹکار کے بعد سیکنڈز میں اپنا بیان تبدیل کر دیا

تھا۔۔۔

بابا میں بھی اسکی طرح ہیئر سٹائل بنانا چاہتا ہوں۔ سالار نے اسکی زبان کی قینچی کو نظر انداز کیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سائز کا خاموش نہ ہونے والا جن تھا۔ جو اس گھر کے افراد کے گرد ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا۔ اور اسکے سوالات۔۔۔ ختم نہ ہونے والے سوالات نے امامہ اور سالار کی آنڈیل والدین بننے کی ہر خواہش اور معلومات کو ختم کر دیا تھا۔



I think she is goldi look

حمین کی تعریفوں کا سلسلہ جاری تھا۔

یہ گولڈی لوک نہیں ہے یہ گندی ہے اس نے کی ہفتوں سے اپنے بال نہیں دھوئے۔ جبریل نے اسے ٹوک کر بتایا۔۔۔ وہ تینوں اب سالار کے پیچھے اندر جا رہے تھے۔۔۔ آل رائٹ مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کول نہیں۔۔۔ جو اب پھر ٹراخ سے آیا تھا۔ جبریل بے اختیار پچھتا یا۔۔۔ اس نے اسکے تبصرے کا جواب دیکر سالار کے پیچھے لگنے والی بلا اپنے پیچھے لگالی تھی۔۔۔۔۔

اگر میں کی مہینوں تک اپنے بال نہ دھوؤں تو میرے بال بھی ایسے ہونگے؟ میرا مطلب ہے گولڈن براؤن یا ایش گرے یا مسٹر ڈیلو۔۔۔ اسکا ذہن اب کہی سے کہی پہنچ چکا تھا۔

نہیں۔۔۔۔۔ جبریل نے بے حد سخت لہجے میں فل سٹاپ لگایا۔۔

اوکے۔۔۔۔۔ حمین نے اطمینان سے کہا۔۔۔ لیکن میں اپنے بال ڈامی تو کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔

جبریل نے اس بار اسے مکمل طور پہ نظر انداز کیا۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 امامہ نے سالار کو اس بچی کو اٹھائے دیکھا۔ وہ طیبہ کیساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اور وہ چائے پینا ہی بھول گئی۔۔۔

یہ کون ہے؟؟

بعد میں بتاؤں گا۔۔۔ تم اسے نہلا کر کپڑے بدل دو اسکے۔ پھر میں اسکو ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں۔۔۔

امامہ کچھ الجھی تھی لیکن وہ اسے لیکر چلی گئی تھی اسے نہلانے کی کوشش کے آغاز میں

ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ اس بچی کے بالوں کو کاٹے بغیر اسکو نہلایا نہیں جاسکتا۔ اسکے سر میں بڑے بڑے پھوڑے تھے اور اس سے رسنے والی پیپ نے اسکی بالوں کی لٹوں کو آپس میں اسطرح جوڑ دیا تھا۔ کہ اب انکا کھلنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے شیونگ کٹ میں پڑی قینچی سے چنی کے سارے بال جڑ سے کاٹنے شروع کیئے وہ اسکا سر گنجا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ پھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ امامہ کو اس بچی کو نہلاتے ہوئے بہت رحم اور ترس آیا تھا۔ چنی چپ چاپ نہاتی رہی اس نے رونادھونا نہیں مچایا۔ نہ ہی بال کٹنے پر پھوڑوں سے ہاتھ لگنے پر کسی تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

وہ بلا آخر جب چنی کو مکمل یو کٹ میں نہلا دھلا کر حمین کا ہی ایک جوڑا پہنائے باہر لائی تو اسے دیکھ کر سب سے پہلے چیخ مارنے والا حمین تھا۔۔۔

اوہ مائی گاڈ می آپ نے اسے مزید بد صورت خو فناک بنا دیا ہے۔۔۔ اور آپ نے میری سب سے فیورٹ شرٹ بھی خراب کر لی۔۔۔ مئی یہ لڑکی تھی آپ نے اسے لڑکا بنا دیا اللہ اسکے لیے آپکو معاف نہیں کریگا۔ امامہ کو اسکی بات پر ہنسی آئی۔ سالار ٹھیک کہتا تھا وہ عجیب و غریب ہی تھا۔۔۔۔۔

---+-----++++-----+-----+

اس سال صرف چینی سالار سکندر کے خاندان میں نہیں آئی تھی اس سال کا دوسرا بڑا واقعہ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی تشخیص تھا

اور اب اسکا کیا کرو گے؟ امامہ نے اپنے بیڈ پر سالار اور اپنے درمیان پر سکون گہری نیند میں دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا اور وہ بھی اس وقت چینی کو ہی دیکھ رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے محبت اور شفقت سے اسکا پیٹ بھرنے تک اسے کھلایا تھا۔ اور وہ بے حد رغبت سے امامہ اور حمین کے ہاتھوں سے لقمے لے لے کر کھاتی رہی۔ خاص طور پر حمین کے ہاتھوں سے۔ جو بہت ضد کر کے اس کار خیر میں شامل ہوا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اوہ مائی گاڈ۔۔ حمین نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پہلا ہی لقمہ کھانے پر جیسے خوشی سے مخصوص انداز میں چیخ مارتے ہوئے نعرہ لگایا تھا۔۔ مئی یہ مجھے پسند کرتی ہے۔۔۔

چھ فٹ دور بیٹھے جبریل نے ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پھر بے حد تحمل سے اگلا صفحہ پلٹتے ہوئے جوانی سرگوشی کی۔۔

صرف یہی تمہیں پسند کرتی ہے۔۔

سالار نے کچھ دیر پہلے ہی امامہ کو اسکے اور اسکے باپ اور خاندان کے حوالے سے پیش آنے والے تمام واقعات کو اپنے احساس جرم کیساتھ آگاہ کیا تھا اور چینی کے لیے امامہ کی ہمدردی اور ترس میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔۔ لیکن اس کے باوجود اہم ترین سوال وہ تھا جو اس وقت امامہ نے پوچھا تھا۔

میں اسے کسی یتیم خانے یا ویلفیئر ہوم میں داخل کروانے لایا ہوں۔ جو کچھ اسکے ساتھ ہوا مجھ پہ اتنی ذمہ داری تو آتی ہے کہ میں اسکی زندگی خراب نہ ہونے دوں۔۔۔ سالار نے سنجیدگی سے امامہ سے کہا۔۔۔

تم احساس جرم کا شکار ہو رہے ہو؟؟ اسکے اعتراف کے باوجود امامہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔۔۔۔

ہاں۔۔۔ جو کچھ اسکے باپ نے اپنے خاندان کیساتھ کیا اس میں میں بھی قصور وار ہوں تھوڑی سی زیادہ کنسرن دکھاتا میں تو یہ سب نہ ہوتا جو ہو گیا۔۔۔ سالار اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امامہ نے اسکا ہاتھ تھپکا۔۔۔

تم اسے اپنے پاس رکھ کر کسی یتیم خانے میں داخل نہیں کروا سکتے۔ خاص طور پر اس صورت حال میں جب اسکے رشتہ دار موجود ہیں اور کورٹ نے انہیں اسکی گارڈین شپ بھی دے رکھی ہے۔ وہ تمہارے خلاف قانونی کارروائی کر سکتے ہیں۔۔۔ امامہ نے جیسے اسے خبردار کیا تھا۔۔۔

مجھے پرواہ نہیں۔۔۔ اسکا بھی کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گا۔ فی الحال میں نے اپنی لیگل ٹیم سے کہا ہے کہ وہ اسکے بارے میں مجھے ایڈوائس کریں۔۔۔ کورٹ کو اپروچ کیا جاسکتا ہے۔۔۔ اس بچی کے لیے گارڈین شپ بدلی جاسکتی ہے۔۔۔ وہ امامہ سے کہہ رہا تھا اور اس ساری گفتگو کے دوران سالار نے ایک لمحے کے لیے بھی اس بچی کو گود میں لینے کے آپشن پر سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اس بچی کی بہتر نگہداشت چاہتا تھا۔۔۔

یہ خیال پہلی بار اس گھر میں حمین کو آیا تھا جو دوسرے دن امامہ سے چنی کا نام پوچھنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔۔۔

مجھے یاد ہی نہیں رہا تمہارے بابا سے اسکا نام پوچھنا۔۔۔

امامہ کو اسکے استفسار پر یاد آیا۔۔۔

میں اسکا نام رکھ دوں؟؟ حمین نے ماں کی بات کے جواب میں اسے تجویز پیش کی۔۔

نہیں تم یہ نہیں کر سکتے۔۔ جبریل نے جیسے اسے لگام ڈالنے کی کوشش کی۔۔۔

کیوں؟؟ حمین نے اپنا پورا منہ اور آنکھیں بیک وقت پوری طرح کھول کر انہیں گول کرتے ہوئے تعجب کی انتہا پر پہنچتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

کیونکہ اسکا پہلے ہی ایک نام ہے۔۔ جبریل نے اسی ٹھنڈے انداز میں اس کے سوال کا ایسے جواب دیا جیسے وہ اسکی عقل پر افسوس کر رہا ہو۔

تمہیں اسکا نام پتا ہے؟ تڑاق سے اگلا سوال جبریل کی طرف اچھالا گیا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔۔۔۔ جبریل گڑ بڑایا۔۔۔۔۔

حمین نے اسی انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسی ڈرامائی انداز میں کہا۔۔ ممی

اسکا نام نہیں جانتی۔۔۔۔۔ وہ اب امامہ کی طرف متوجہ تھا۔ وی جیسے عدالت میں اسکا

کیس لڑنے کے لیے سردھڑکی بازی لگا رہا تھا۔

اور تم؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ اسکا کوئی نام ہو؟؟

اس کے انداز میں اس قدر ملامت تھی کہ ایک لمحہ کو جبریل کو بھی مدافعانہ انداز اختیار کرنا

پڑا۔

میں نے یہ تو نہیں کہا۔۔۔

میں نے خود سنا ہے۔۔۔ حمین نے اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں مکمل گول کرتے ہوئے

اہم گواہ کا رول ادا کیا۔۔۔۔

جبریل نے فوری طور پر اپنا چہرہ کتاب کے پیچھے چھپانے میں ہی عافیت سمجھی۔۔۔ وہ اس

چھوٹے بھائی کو توتب بھی چپ نہیں کروا سکا تھا جب اسے بولنا نہیں آتا تھا۔۔۔

حمین۔۔۔ اسکے پیرنٹس نے اسکا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔ وہ اتنی بڑی ہے۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

امامہ نے اس بار مداخلت کرنا ضروری سمجھا۔۔۔ حمین کو اسکی بات پر جیسے کرنٹ لگ

گیا۔۔۔

پیرنٹس۔۔۔۔۔ اس کے خلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ جبریل کو کتاب ہٹا کر اسے

دیکھنا پڑ گیا۔

اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔ حمین کی آواز صدمہ زدہ تھی۔۔۔ پھر یہ انکے پاس کیوں نہیں۔۔۔

اس نے اسی صدمے میں امامہ سے جیسے احتجاجا کہا تھا۔ اور یہ وہ سوال تھا جسکا جواب امامہ

نہ دے سکی۔ اسکی سمجھ میں نہیں آیا تھا

کیا اسکا کوئی بہن یا بھائی بھی نہیں؟؟

نہیں اسکا کوئی بھی نہیں۔۔ امامہ نے جواب دیا۔ حمین کا چہرہ کھل اٹھا۔۔

تب تو میں اسکا نام رکھ سکتا ہوں۔۔ گفتگو جہاں سے شروع ہوئی تھی گھوم پھر کر پھر

وہی آگئی تھی۔۔ حمین کوئی بات بھولتا نہیں تھا اور یہ اسکے ماں باپ کی بد قسمتی

تھی۔۔۔

اوکے۔۔ تم اسکا نام رکھ لو۔ امامہ نے جیسے ہاتھ جوڑنے والے انداز میں اسکے سامنے

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہتھیار ڈالے۔

مہی۔۔ کیا یہ ہمارے ساتھ رہے گی؟ حمین نے ایک اور سوال سے اسے مشکل میں

ڈالنا ضروری سمجھا۔۔۔

نہیں۔۔۔ امامہ نے اسی طرح کام میں مصروف اسکی طرف متوجہ ہوتے بغیر کہا۔۔۔

کیوں؟؟ حمین نے جیسے چیخ نما انداز میں سوال کیا۔ امامہ صرف گہری سانس لیکر رہ گئی

جب تمہارے بابا آئیں گے تو ان ہی سے پوچھنا۔ اس نے بلا کو اپنے سر سے ٹالنے کی

کوشش کی۔۔۔

مئی۔۔۔ کیا ہم اسے اڈاپٹ کر سکتے ہیں۔۔ امامہ کا دماغ گھوم گیا تھا اس سوال پر۔۔۔
نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔

تم اسے اڈاپٹ کیوں کر ناچاہتے ہو؟ جبریل نے جیسے ہول کر کہا۔

کیونکہ مجھے ایک بے بی چاہیے۔۔

اس نے بے حد نروٹھے انداز میں اعلان کیا۔۔۔ جبریل جیسے غش کھا گیا تھا۔۔ امامہ
دم بخود اپنے ساڑھے تین سالہ بیٹے کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔۔ جبکہ لاؤنج میں آتے ہوئے
سکندر عثمان اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔ حمین نے سکندر عثمان کو اندر آتے اور
ہنستے دیکھ لیا۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر انکی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔۔ اور اس نے
ایک بار پھر وہ مطالبہ پیش کیا۔۔

ایک دن آئے گا جب بے بی آپکے پاس ہوگا۔۔ انہوں نے اسے تھپکتے ہوئے تسلی
دی۔

ایک دن؟؟؟ حمین کی آنکھیں عادتاً گول ہوئی۔ آج کیوں نہیں۔۔۔

سکندر نے زمین پر بیٹھی کھلونوں سے کھیلتی چنی کو دیکھا جتنا ترحم اور احساس جرم سالار کے دل میں چنی کے لیے تھا اتنا ہی سکندر کے دل میں بھی اسکے لیے تھا۔۔ وہ جیسے ان دونوں کا مشترکہ احساس جرم تھا۔۔۔

بیٹا سے واپس جانا ہے۔۔ وہ آپکی بے بی نہیں ہو سکتی۔۔ سکندر نے اب حمین کو سمجھانے کی کوشش کا آغاز کیا۔۔

اسے کہاں جانا ہے؟ حمین کو سکندر کی بات پر ایک اور جھٹکا لگا۔۔۔

اپنی فیملی کے پاس۔۔ سکندر نے مختصر آگہا۔۔

لیکن ممی نے تو کہا تھا کہ اسکی کوئی فیملی نہیں ہے۔۔۔

سکندر نے امامہ اور امامہ نے انہیں دیکھا۔ آپکے بابا اسکو کسی نرسری میں داخل کروانا چاہتے ہیں۔۔ امامہ نے اسکے لیے ایک جواب ڈھونڈا۔

یہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی۔ ہمارا گھرا تنا بڑا ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر اتنا پر زور دیا۔۔۔

یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔۔ یہ آپکے دادا ابو کا گھر ہے۔۔ اندر آتے ہوئے سالار نے اسکے

سوال کا جواب پیش کیا۔

حمین سوچ میں پڑا۔۔

یہ ہمارے ساتھ کنٹاسا میں رہ سکتی ہے۔۔۔ اسے کنٹاسا والے گھر کا خیال آیا۔۔

لیکن وہ بھی ہمارا گھر نہیں ہم اسے جلد چھوڑ دیں گے۔

سالار نے بے حد سنجیدگی سے اسکے ساتھ یوں بات کرنی شروع کی جیسے وہ کسی بڑے

آدمی سے بات کر رہا ہو۔۔۔۔

حمین اب بھی سوچ میں پڑا تھا جیسے وہ چنی کے لیے ایک گھر کی تلاش میں تھا جہاں اسے

رکھا جاسکتا اور امامہ کو گھر کے ذکر پر جیسے اپنا گھر یاد آیا۔۔

ہمارے پاس اپنا گھر کیوں نہیں ہے؟

ہمارا اپنا گھر ہوگا۔۔ امامہ نے جیسے حمین کو بہلایا۔

کب۔۔۔۔

بہت جلد۔۔

امامہ چائے بنا کر سکندر اور سالار کو پیش کر رہی تھی۔

اسی لیے منع کرتا تھا میں کہ فضول خرچیاں مت کرو۔ وقت پر اپنا گھر بنا لو۔ جیسے تمہارے سارے بھائیوں نے بنا لیے۔ سکندر عثمان کو اس موضوع گفتگو سے وہ پلاٹ اور وہ انگوٹھی یاد آئی۔۔۔ وہ پلاٹ اس وقت ہوتا تو چار پانچ کروڑ کا ہوتا۔ اس رنگ کی اس وقت کی مارکیٹ پرائس سے ڈبل۔۔۔ سکندر نے روانی سے کہا۔۔۔ اپنے لیے چائے ڈالتی امامہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔

کس رنگ کی؟ اس نے جیسے حیران ہو کر سکندر سے پوچھا۔
 جو رنگ تم نے پہنی ہوئی ہے۔ سکندر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سالار کو غلطی کا احساس ہوا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ امامہ نے بے یقینی سے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا۔۔۔ پھر سالار کو اور پھر سکندر عثمان کو۔۔۔

یہ پلاٹ بیچ کر آئی ہے؟

ہاں۔۔ ایک کروڑ سینتیس لاکھ کی۔۔ ذرا سوچو دس گیارہ سال پہلے وہ پلاٹ نہ بکتا تو آج وہ اسلام آباد میں جس جگہ پر ہے اس سے چار گنا قیمت ہو چکی ہوتی۔۔۔

سکندر نے نہ امامہ کے تاثرات پر غور کیا نہ سالار کے۔۔۔ وہ روانی میں چائے پیتے ہوئے بات کہتے گئے۔۔۔

امامہ ساکت اور دم بخود سالار کو دیکھ رہی تھی جو اس سے نظریں چرائے چائے پینے میں مصروف تھا اس وقت وہ یہی کر سکتا تھا۔

کمرے میں یکدم اپنی بات کے اختتام پر چھانے والی خاموشی سے سکندر عثمان کو لگا کچھ ٹھیک نہیں۔۔۔

چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے وہر کے۔ انہوں نے ساکت بیٹھی امامہ کو دیکھا جو سالار کو گھور رہی تھی۔ پھر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں انہیں اس خاموشی کی وجہ سمجھ آگئی تھی۔

اسے اب بھی نہیں پتا؟ انہوں نے بے یقینی سے اپنے بیٹے سے پوچھا۔

اب پتا چل گیا ہے۔۔۔ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا وہ فوری طور پر اس انکشاف پر کیا رد عمل کرے۔ جو ایک راز کو غیر ارادی طور پر افشا کرنے پر انکی شرمندگی چھپا لیتا۔۔۔

امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت کو پھیلا کر اس انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر سکندر کو اور پھر سالار

کو۔۔۔ وہ اگر کہتا تھا کہ وہ انمول تھی تو غلط نہیں کہتا تھا۔ اسکی زندگی میں بہت سارے لمحے آئے جب اسکا دل بس سالار کے گلے لگ جانے کو چاہتا تھا۔ کسی لفظ اور کسی اظہار کے بغیر۔۔۔

*****_*****_*****

تم نے رنگ اتا ردی؟ اس رات امامہ کے ہاتھ میں اس رنگ کونہ پا کر وہ پوچھے بنانہ رہ سکا۔

میں بے وقوف نہیں ہوں جو اتنی قیمتی رنگ ہر وقت پہنے رہوں۔ امامہ نے جواباً کہا۔ تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھی اسکی قیمت۔۔۔ اس نے سالار سے کہا۔

صرف اس خدشے کے تحت نہیں بتایا تھا تمہیں۔۔۔ اور دیکھ لو میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تم اسے بھی اب لا کر میں رکھ دو گی۔

سالار کچھ ناخوش سا دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ خاموش رہی پھر اس نے کہا۔۔۔

تو اور کہاں رکھوں؟ ساتھ لیے پھرنا بے وقوفی ہے۔۔۔ گم ہو جائے تو؟ مجھے تو ہارٹ

اٹیک ہی ہو جائے گا جو ایک کروڑ سے بھی مہنگی انگوٹھی میں گم کر دوں۔

تقریباً سوادو کروڑ۔

سالارٹی وی پر نظریں جمائے بڑ بڑایا۔۔۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔

کیا؟

اسکی موجودہ قیمت۔۔۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

اس لیے تو نہیں پہن رہی۔۔۔ بے وقوفی تھی ویسے یہ۔۔۔ اس نے ایک ہی سانس میں کچھ توقف کے بعد کہا۔

کیا؟ سالار اس بار اسکی طرف متوجہ ہوا۔

ایک پلاٹ بیچ کر انگوٹھی خریدنا۔۔۔ اور وہ بھی اتنی مہنگی۔۔۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی نہ خریدتی۔

اسی لیے تم میری جگہ نہیں ہو امامہ۔۔۔ سالار نے جتانے والے انداز میں کہا۔ وہ نادام ہوئی لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔۔۔

وہ پلاٹ ہوتا تو آج اسے بیچ کر گھر بنا چکے ہوتے ہم۔۔۔ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے

بعد کہا۔

تمہارے خوابوں کا ایکڑوں پر پھیلا ہوا گھر چند کروڑ میں بن جاتا؟؟؟

وہ اب اسے چڑانے والے انداز میں کچھ یاد دلا رہا تھا۔ اور امامہ کو ایک جھماکے کیساتھ وہ

سکریپ بک یاد آئی جس میں اس نے اپنے ممکنہ گھر کی ڈھیروں ڈرائنگز بنا رکھی تھی۔

اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا۔ میں تو کل ہی وہ سکریپ بک نکالتی ہوں مدت ہوگی اسے دیکھے

ہوئے۔ اور اس میں کچھ ایڈ کیئے۔۔

امامہ کا ذہن برق رفتاری سے انگوٹھی سے ہٹ کر گھر پر چلا گیا تھا اور پھر سالار کو امریکہ

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میں خریدے اور بیچ دینے والے گھر کا خیال آیا۔۔

تمہیں ایک چیز دکھاؤں؟؟ سالار نے ٹیبل پر پڑے اپنے لیپ ٹاپ کو اٹھالیا۔۔

کیا؟؟ وہ چونکی۔

سالار اب لیپ ٹاپ کھول کر اس میں سے تصویروں والے حصے میں جا کر اس گھر کی

تصویریں ڈھونڈ رہا تھا اور وہ چند منٹوں میں سکرین پر نمودار ہو گئی تھی۔۔

یہ کیا ہے؟ امامہ نے ایک کے بعد ایک سکرین پر نمودار ہونے والی ان تصویروں کو

دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا۔۔

ایک گھر۔۔ ایک جھیل۔۔ اسکے گرد پھیلا لان۔۔

وہ اسکی بات پر ہنسی۔

وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے لیکن کس کا گھر ہے یہ۔

اس نے سالار سے پوچھا۔ اور مجھے کیوں دکھا رہے ہو؟

جب حمین پیدا ہوا تھا اور میں تمہارے پاس امریکہ سے آیا تھا تو اس رات تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے خواب میں ایک گھر دیکھا تھا۔ کیا وہ گھر ایسا تھا۔ تمہیں خواب یاد ہے نا؟
سالار نے اس سے پوچھا۔۔

ہاں یاد ہے۔۔۔ لیکن وہ گھر ایسا نہیں تھا۔ وہ جھیل بھی ایسی نہیں تھی۔۔ اور یہ کہہ کر

اس نے سالار کے احساس جرم سے جیسے ہوا نکال دی۔

کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو یہ سب؟ اور یہ گھر کس کا ہے۔۔ اما مہ کو اب الجھن ہوئی۔

تمہارے لیے خرید اتھا۔۔ سالار پھر تصویروں کو سکروول کرنے لگا۔

امامہ۔ کو اسکی بات پر جیسے جھٹکا لگا۔ کیا مطلب میرے لیئے۔۔۔

ہاں تمہارے لیئے mortgage کیا تھا امریکہ میں۔ تمہیں سر پر انرز دینا چاہتا تھا۔ تمہاری بر تھ ڈے پر گفٹ کر کے لیکن۔۔۔۔۔

لیکن؟ امامہ نے اسکے خاموش ہونے پر پوچھا۔۔۔

لیکن پھر میں نے اسے بیچ دیا۔ سود سے میں دنیا میں تو گھر لے سکتا تھا جنت میں گھر نہیں لے سکتا۔

تم لے بھی لیتے تو میں اس گھر میں کبھی نہیں جاتی۔ صرف ایک گھر ہی کی تو فرمائش کی ہے تم سے پوری زندگی میں وہ بھی حرام کے پیسے سے بنا کر دیتے مجھے۔۔ امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔۔

میں تمہارے خوابوں کا گھر بنا کر دینا چاہتا تھا ایکڑوں پر پھیلا۔۔ جھیل کنارے۔۔ سمر ہاؤس۔۔ اور جلدی بنا چاہتا تھا۔ بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے۔۔۔

امامہ نے سر جھٹکا۔۔ تم واقعی بے وقوف ہو۔ میرے خوابوں کے گھر کی اینٹیں حرام کے پیسوں سے رکھی جائے یہ خواہش نہیں کی تھی میں نے۔۔ اور ایکڑوں کا

گھر تم سے کہا تھا لیکن دعا اللہ سے کرتی تھی کہ وہ اسے مکمل کرے اور اتنے وسائل دے۔۔ تم سے ایک بار بھی میں نے نہیں کہا کہ اتنا کماؤ یا اسی سال گھر کھڑا کر کے دو۔ کبھی بھی یاد دہانی نہیں کرائی تمہیں۔ پھر کیوں جلدی تھی تمہیں اس گھر کے لیے۔۔۔

اسے افسوس ہو رہا تھا۔۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں کہا۔ مجھے ریمانڈ نہیں دیئے لیکن مجھے پتا تو تھا نا کہ تمہاری خواہش ہے یہ۔۔۔ میں چاہتا تھا میں تمہاری خواہش پوری کر دوں۔۔۔ تم نے صرف ایک چیز مانگی تھی مجھ سے اس لیے۔۔ وہ اس سے کہتا جا رہا تھا۔۔۔ امامہ ہنس پڑی۔

تم خواب دیکھ رہے ہو سود سے پاک ایک اسلامی مالیاتی نظام کا جسے دنیا میں رائج کر سکو۔ اور میں خواب دیکھتی ہوں ایکڑوں پر پھیلے ایک گھر کا۔ حلال کے پیسے سے بنے ہوئے گھر کا۔۔ خواب تمہارا بھی اللہ ہی پورا کر سکتا ہے اور میرا بھی۔۔ اس لیے اسے اللہ پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے سوچا ہے وہ انگوٹھی بیچ کر اس سے کوئی پلاٹ تو لیکر رکھ ہی سکتی ہوں میں۔۔۔۔

سالار نے بے حد خفگی سے اسکی بات کاٹی۔۔ تم اسے بیچ دو گی؟

وہ ہنس پڑی۔۔ نہیں۔۔ تم سمجھتے ہو میں اسے بیچ سکتی ہوں؟

ہاں۔۔۔ سالار نے اسی نروٹھے انداز میں کہا۔ وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ تمہیں پتا ہے دنیا میں صرف ایک مرد ہے جو میرے لیے ایسی انگوٹھی خرید سکتا ہے۔۔

اب تم رو کر مجھے جذباتی کرو گی۔۔ سالار نے اسکی آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دیکھ کر حفاظتی بند باندھنے کی کوشش کی۔۔

یہ انگوٹھی انمول ہے۔۔ تم انمول ہو۔۔ اس نے ٹھیک بھانپا تھا۔ امامہ کی آنکھیں برسنے لگی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

پھر ایک بات مانو۔۔ سالار نے اسکا ہاتھ تھاما۔

کیا؟

اسے ہاتھ میں پہن لو۔۔

گم ہو جائے گی۔۔ وہ روتے ہوئے بولی۔۔

میں اور لے دوں گا۔۔ اس نے امامہ کے آنسو پونچھے۔۔

تمہارے پاس بیچنے کے لیے اب کچھ ہے ہی نہیں۔۔ امامہ نے آنسوؤں کی بارش میں

بھی ہوشمندی دکھائی۔۔۔ وہ ہنسا۔۔

تم مجھے ایسٹیمیٹ کر رہی ہو۔۔

اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا باہر میسٹرس پر پڑا سویا ہوا حمین جاگ گیا۔

وہ دونوں بیک وقت اسکی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نیند میں کچھ بڑبڑایا تھا۔

اب کیا کہہ رہا ہے۔۔ سالار حیران ہوا۔

امامہ نے اسے دوبارہ لٹا کر تھپکنا شروع کر دیا اور اسکے برابر انگوٹھا منہ میں ڈالے لیٹی ہوئی چنی کو دیکھا۔

سالار اسکے بارے میں جو بھی طے کرنا ہے جلدی کرو۔۔ حمین جس طرح اس سے اٹیچ ہو رہا ہے میں نہیں چاہتی کچھ اور وقت یہاں رہنے کے بعد یہی یہاں سے جائے تو وہ اپ سیٹ ہو۔۔۔

امامہ نے چنی پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے سالار سے کہا۔۔

صبح طے کر لوں گا کہ اسے کہاں چھوڑ کر آنا ہے۔ جو دو چار ادارے مجھے مناسب لگ

رہے ہیں انکے بارے میں انفارمیشن لایا ہوں۔۔ اگلے دن وہ اس بچی کو لے کر ان

چاروں اداروں میں گئے تھے جہاں وہ اسے رکھنا چاہتے تھے۔ دو اداروں نے مناسب قانونی کارروائی کے بغیر اس بچی کو فوری طور پر اپنی تحویل میں لینے سے انکار کر دیا۔ جن دو اداروں نے اس بچی کو وقتی طور پر لینے پر آمادگی ظاہر کی وہاں بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے انتظامات دیکھ کر وہ دونوں خوش نہیں ہوئے۔۔۔

شام کو وہ پھر چینی کے ساتھ واپس گھر پہنچ چکے تھے اور حمین کی باچھیں چینی کو ایک بار پھر دیکھ کر کھل گئی تھی۔ وہ صبح بھی بڑی مشکل سے چینی کو رخصت کرنے پر تیار ہوا تھا۔۔۔ اور اب چینی کی واپس آمد اسکے لیے اک بگ نیوز تھی۔۔۔

اگلے چند دن سالار نے چینی کی گارڈین شپ کے حوالے سے قانونی کارروائی کرنے اور چینی کی پیدائش اور پیدائش اور اس سے متعلقہ باقی کاغذات پورے کرنے کی کوشش کی اور جب دو تین دنوں میں وہ ان کاموں میں پھنسا رہا تو حمین نے چینی کے بارے میں یہ بھی دریافت کیا کہ وہ گونگی تھی۔۔۔ کیونکہ وہ ان تین چار دنوں میں بالکل خاموش رہی۔۔۔

اور یہ چینی کے بارے میں ایک خوفناک انکشاف تھا جس نے امامہ اور سالار دونوں کو ہولادیا تھا۔

ممی یہ گونگی ہے۔۔ حمین نے کہا۔۔ مجھے ہوتا یقین ہے۔

نہیں۔۔ سن تو رہی ہے۔۔ امامہ نے چنی سے بات کرنے کی کوشش کے بعد نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔۔ وہ ہر آواز پر متوجہ ہوتی تھی۔

ممی یہ امپورٹنٹ نہیں ہے۔ اہم بات بولنا ہے۔ اور یہ بول نہیں سکتی۔۔ حمین نے اسکی معذوری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی آنکھوں میں حتی المقدور رنجیدگی اور افسوس شامل کیا۔

سب سے اہم بات سننا ہے۔ امامہ نے بڑے غلط موقع پر اپنے بیٹے کو نصیحت کی کوشش کی تھی۔۔

میں ایسا نہیں سمجھتا یہاں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو سن سکتی ہیں لیکن چند ہی ایسی ہے جو بول سکتی ہے۔

محمد حمین سکندر کی دانائی نے امامہ کو ہمیشہ کی طرح چاروں شانے چت گرایا تھا۔۔

-----*****-----

چنی کے نصیب میں کسی ادارے میں پرورش پانا نہیں لکھا تھا اسکے نصیب میں سالار

سکندر کے گھر میں ہی پلنا بڑھنا لکھا تھا۔۔۔ جب تک سالار قانونی معاملات کو نیپٹا کر چینی کے لیے ایک ادارے کا انتخاب کرتا۔ چینی کو شدید نمونیہ ہو گیا تھا۔ دو دن بعد ان لوگوں کو واپس کا نگو جانا تھا۔ انکی تین ہفتے کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔۔۔ ایک عجیب خدشہ ان دونوں کو لاحق ہوا تھا اگر اس بچی کی نگہداشت نہیں ہوتی اور اگر وہ اسکے اس طرح چھوڑ جانے پر خدا نخواستہ مر جاتی تو وہ خود کو کبھی معاف نہیں کرتے۔۔۔ سالار اور امامہ نے فیصلہ کیا کہ امامہ بچوں کیساتھ تب تک وہی رہے گی جب تک چینی کی حالت سنبھل نہیں جاتی۔۔۔ سالار واپس چلا گیا تھا۔

امامہ دو ہفتے اور پاکستان میں رہی۔ چینی کی حالت سنبھل گئی تھی۔ مگر اب وہ بچوں کیساتھ اور خاص طور پر حمین کیساتھ اس طرح اٹیچ ہو گئی تھی کہ وہ ان سے الگ ہونے پر تیار ہی نہیں تھی۔۔۔ سالار ان لوگوں کو پاکستان سے واپس لے جانے کے لیے آیا تھا اور حمین کو بتائے بنا وہ دوبارہ چینی کو ایک ادارے چھوڑنے گیا۔ وہ دونوں بار اس سے لپٹ کر چیخیں مار کر رونے لگی۔ وہ اسکے علاوہ کسی اور کی گود میں بھی جانے کو تیار نہیں تھی۔۔۔ وہ زبردستی اسے تھما کر باہر نکلتا اور اسکی چیخوں کی آواز سن کر کسی عجیب کیفیت میں واپس چلا آتا وہ اسکی۔ گود میں آتے ہی چپ ہو جاتی۔۔۔

وہ جبریل کو قرآن پاک خود حفظ کروا رہا تھا اور پاکستان سے چلے جانے کے بعد دو ہفتوں تک وہ روز اسکاٹپ پر جبریل کو پڑھاتا۔۔ پھر بچوں اور امامہ سے بات کرتا تو چنی بھی اس ماحول کا حصہ ہوتی۔ وہ سالار کو سکریٹری پر نمودار ہوتے دیکھ کر اسی طرح خوشی سے چیخیں مارتی۔ اوں آں کرتی۔۔۔ اور اس نے اپنی زندگی کا پہلا لفظ بھی سالار کے پاکستان آنے پر اسے دیکھ کر باقی بچوں کیساتھ اسکی طرف بھاگتے ہوئے ادا کیا تھا۔۔۔۔۔ با۔۔۔۔۔ وہ سالار کی طرف بھاگتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔۔ اور اس بات کو سب سے پہلے حمین نے نوٹس کیا۔۔۔۔۔

اوہ مائی گاڈ۔۔۔ یہ بول سکتی ہے۔۔۔ سالار کی طرف بھاگتے ہوئے حمین کو جیسے بریک لگ گئی۔ وہ اپنی موٹی آنکھیں گول کر کے چنی کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ جواب سالار کے پیروں سے لپٹی تھی۔ سالار عنایہ کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اور وہ اسکی ٹانگوں سے لپٹی با۔۔۔ با۔۔۔ بولتی جا رہی تھی۔ منہ اوپر کیئے ہوئے۔۔۔ چمکتی آنکھوں کیساتھ۔۔۔ پدرانہ شفقت اگر کوئی چیز تھی تو اس وقت سالار نے چنی کے لیے وہی محسوس کی۔ اور کس رشتے سے۔۔۔ یہ اسے سمجھ نہیں آیا۔۔۔

سالار نے عنایہ کو اتار اور اپنی ٹانگوں سے لپٹی چنی کو اٹھالیا۔۔۔ وہ کھلکھلائی۔۔۔ اس نے

عناویہ کی طرح باری باری سالار کے گال چومے۔ پھر وہ سالار کی گردن کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اسکے ساتھ یوں چپک گی کہ اب نیچے نہیں اترے گی۔ وہ کیسے انکے گھر اور زندگیوں کا حصہ بن گی انہیں احساس تک نہیں ہوا۔ سوائے حمین کے۔۔ جو دن میں تقریباً تین سو بار یہ اعلان کرتا تھا۔۔۔ کہ وہ اسکی بہن ہے۔۔

سالار واپس جانے سے پہلے امامہ کیساتھ بیٹھ کر چنی کے لیئے ہر امکان کو زیر غور لاتا رہا تھا۔ اور ہر امکان کو رد کرتا رہا یہاں تک کہ امامہ نے کہہ ہی دیا۔۔

تم اسے اڈاپٹ کرنا چاہتے ہو؟
 ہاں۔۔۔ لیکن یہ کام تمہاری مرضی کے بنا نہیں ہو سکتا۔ پالنا تو تمہیں ہے۔۔ تم پال سکتی ہو؟ سالار نے اس سے پوچھا۔

پہلے کون پال رہا ہے۔۔ امامہ نے عجب جواب دیکر جیسے سالار کو اس مشکل سے نکال لیا تھا۔

اگر اسکے نصیب میں ہمارے ہی گھر میں پرورش پانا لکھا ہے تو ہم کیسے روک سکتے ہیں۔
 چنی کو اڈاپٹ کرتے وقت سالار نے اسکو اپنی ولدیت بھی دی تھی۔۔۔

رئیسہ سالار اپنے نصیب میں اور اپنے سے منسلک ہر شخص کے نصیب میں خوش نصیبی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ خوش نصیبی کا وہ پرندہ جو جسکے سر پر بیٹھتا اسے بادشاہ بنا دیتا۔۔ اور اسے ایک بادشاہ ہی کی ملکہ بنا تھا۔۔

-----*****-----

کانگو کا آخری سال سالار کے لیے کی حوالوں سے بے حد ہنگامہ خیز رہا۔ وہ ورلڈ بینک کیساتھ اپنے آخری سال میں اپنے سارے معاملات کو وائسٹاپ کر رہا تھا۔۔ امریکی حکومت نے اسے صدر کے عہدے کی پیشکش کی تھی۔۔۔ ورلڈ بینک کا پہلا کم عمر ترین مسلمان صدر۔۔۔ بیالیس سال کی عمر میں اس عہدے پر کام کرنے کے لیے کوئی کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا تھا

وہ تاریخ کا حصہ بن سکتا تھا۔ بے حد آسانی سے۔ اس نے امریکہ میں ہونے والی میٹنگ اور اس آفر کے بارے میں سب سے پہلے کانگو واپس آنے پر امامہ کو بتایا تھا۔

تو؟؟ اس نے سالار سے پوچھا۔۔

تو کیا؟ سالار نے اسی انداز میں کہا۔۔

تم نے کیا کہا۔۔ امامہ نے اس سے پوچھا۔۔

میں نے سوچنے کے لیے ٹائم لیا ہے۔۔ امامہ اسکے جواب سے بے حد ناخوش ہوئی۔۔۔

سوچنے کے لیے ٹائم؟؟ تم انکار کر کے نہیں آئے؟ اس نے جیسے سالار کو یاد دلایا۔۔

انکار کیا تھا۔۔ قبول نہیں ہوا۔۔ مجھے سوچنے کے لیے کہا گیا ہے۔

تم کیا سوچ رہے ہو سالار؟ تم یہ آفر قبول کرنا چاہتے ہو؟ اس نے سالار سے ڈائریکٹ

سوال کیا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کرنی چاہیے کیا؟ سالار نے جواباً پوچھا۔۔

نہیں۔۔ اتنا ختمی اور دو ٹوک جواب آیا تھا کہ سالار بول ہی نہ سکا۔۔

تمہیں یاد نہیں تم کس مقصد کے لیے کام کر رہے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو۔۔ امامہ نے

جیسے اسے یاد دلایا۔۔

بلکل یاد ہے۔۔

پھر الجھن کس بات کی ہے۔۔ امامہ نے پوچھا۔۔

الجھن نہیں ہے صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی تھوڑا وقت چاہیے مجھے اپنے پروجیکٹ کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے لانے کے لیے۔۔۔ ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر کام کر لوں گا تو اس پروجیکٹ میں بہت مدد ملے گی۔ ڈھیروں کمپنیز اور انویسٹرز ہمارے پاس آئینگے۔۔۔ بہت سی جگہوں پر مجھے تعارف کروانا ہی نہیں پڑے گا۔۔

امامہ نے اسے ٹوکا۔۔۔ بس صرف یہ وجہ ہے؟ وہ ان چند انسانوں میں تھی جسکے سامنے وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا وہ اسکا جھوٹ پکڑ لیتی تھی پتا نہیں یہ خصوصیت ساری بیویوں کی ہوتی ہیں یا صرف امامہ ہاشم کی۔۔

ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر ایک مسلمان کی تعیناتی ایک اعزاز بھی تو ہے۔۔۔ سالار نے اس بار بے حد مدھم آواز میں وہ ترغیب بھی سامنے رکھی۔۔

ورلڈ بینک کیا ہے سالار؟ کچھ بھی نہیں۔ سود کا کام کرنے والی قوموں کا اجتماع اور کیا

ہے۔۔۔ کیا اعزاز والی بات ہے اس میں کہ سود کا کام کرنے والی ان قوموں کی

سربراہی ایک مسلمان کے پاس ہو۔۔۔ یہ اعزاز نہیں بلکہ شرم سے ڈوب مرنے والی

بات ہے ایک مسلمان کے لیے۔۔۔۔۔

امامہ نے جیسے اسے آئینہ نہیں جو تادکھایا تھا۔ جس پروجیکٹ پر تم کام کر رہے ہو اس

میں کامیابی تمہیں اللہ نے دینی ہے تمہارے علم تجربے اور قابلیت اور ورلڈ بینک کیساتھ منسلک شناخت نے نہیں۔۔۔ تم اب چالیس سال کے ہو چکے ہو بچے بڑے ہو رہے ہیں پانچ سال ورلڈ بینک کا صدر رہنے کے بعد تم سینتالیس سال کے ہو چکے ہو گے۔۔۔ پھر اسکے بعد تم ایک اسلامی مالیاتی نظام پر کام کرنا شروع کرو گے؟ جب تم اپنی ساری جوانی ورلڈ بینک کو دے چکے ہو گے۔۔۔ تم یقیناً مذاق کر رہے ہو پھر۔۔۔ اپنے ساتھ۔۔۔ اور ان لوگوں کیساتھ جنہیں تم ایک ممکنہ انقلاب کا حصہ بنائے بیٹھے ہو۔۔۔ وہ کہتے ہوئے اٹھ گی۔

تمہیں پتا ہے امامہ۔۔۔ میری زندگی کا سب سے بہترین اثاثہ کیا ہے۔۔۔ تمہاری یہ ظالمانہ صاف گوئی۔۔۔ جو مجھے میری اوقات میں لے آتی ہے۔ تم مجھ سے امپریس کیوں نہیں ہو جاتی۔

امامہ اس بار رک کر اسے دیکھنے لگی۔

میں الجھتا تھا لیکن گمراہ نہیں۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ وہ اب اپنا اعترافی بیان دے رہا تھا۔ امامہ کو چہرہ کھل اٹھا تھا۔۔۔

مجھے تم سے متاثر ہونے تمہارے گن گانے کے لیے بنایا ہی نہیں گیا سالار۔۔۔ اس کے

لیئے دنیا ہے۔۔

مجھے تمہیں چیلنج کر کے تمہیں آگے بڑھانے کے لیے تمہارا سا تھی بنایا گیا ہے۔۔۔ یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ وہ اب مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔۔

وہ آفر میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آئی تھی اور ورلڈ بینک کے اگلے ممکنہ صدر کے طور پر سالار سکندر کا نام بہت سی جگہوں پر اچھالا جانے لگا۔ یہ اسکے خاندان اور خلقہ احباب کے لیے بے حد فخر کا باعث بننے والی خبر تھی اور سالار کے انکار کرنے کے باوجود کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔

سکندر عثمان خاص طور پر اسکے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوئے تھے۔

تم عقل سے پیدل ہو اور ہمیشہ رہو گے۔۔ انہوں نے بے حد خفگی کا اظہار کرتے ہوئے سالار سے کہا۔

سالار چند دن کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا اور سکندر نے ضروری سمجھا تھا کہ وہ ایک بار

اسے سمجھانے کی کوشش کرتے اور اس کوشش کے دوران سالار کی بتائی ہوئی وجہ پر وہ سیخ پا ہو گئے۔

تم ورلڈ بینک کا صدر نہیں بننا چاہتے۔ تم سود سے پاک ایک اسلامی مالیاتی نظام بنانے کا خیالی پلاؤ پکاتے اور کھاتے رہنا چاہتے ہو۔ وہ اتنا تلخ ہونا نہیں چاہتے تھے جتنا ہو گئے تھے۔۔ تمہاری طرح ڈھیروں لوگ یہ خیالی پلاؤ بنا رہے ہیں ساری دنیا میں اور بناتے ہی جا رہے ہیں نہ پہلے کوئی کچھ کر سکا تھا نہ ہی آئندہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور مجھے یقین ہے تمہارے اس ذہنی فتور کے پیچھے امامہ کا ہاتھ ہو گا۔ اس سے مشورہ تو کیا ہو گا نام نہ۔

تم جانتے ہو سالار یہ جو موجودہ نظام ہے اسے ہٹانا کیوں مشکل ہے۔۔ کیونکہ یہ افراد کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے۔ ریاستوں کا بنایا ہوا نظام ہے۔ فلاحی ریاستوں کا نظام۔۔۔ وہ بے شک اسلامی نہ ہو لیکن اپنے اندر اس نظام کو چلا کر کم از کم اپنے معاشرے میں لوگوں کو ایک فلاحی سسٹم دیے ہوئے ہیں۔ تم افراد کو چیلنج کر سکتے ہو ریاستوں کو نہیں۔۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں جب تک کسی قوم کے افراد صرف اپنے لیے جیسے اور مرے گے تب تک کچھ نہیں بدلے گا۔ جب لوگ قوم کے لیے سوچنا شروع کر دیں گے سب کچھ

بدل جائے گا۔۔۔۔

اس نے سکندر عثمان سے کہا۔۔۔

جن معاشروں اور اقوام کی مثالیں آپ دے رہے ہیں انکے ڈھیروں افراد نے اپنی
زندگیاں لیبارٹریز لائبریریز پر صرف اس خواب اور عزم کیساتھ گزاری تھی کہ جو کام
وہ فرد کے طور پر کر رہے ہیں وہ انکی قوم کے لیے بہتر ثابت ہو ان میں سے کی بھی
پر سنل گلوری کے لیے زندگی قربان نہیں کر رہا تھا وہ بانی اور موجد کے طور پر کوئی
پہچان بنا کر تاریخ کا حصہ بنا چاہتے تھے۔۔۔ اور یہی خواہش میری بھی ہے۔۔۔ ایک
کوشش مجھے بھی اپنی قوم کے لیے کرنے دے۔۔۔

سکندر عثمان بہت دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے تھے۔۔ اس نے ان ہی کی باتوں کا حوالہ
دے کر ان سے بحث کی تھی اور ہمیشہ کی طرح وہ بحث جیت گیا۔۔

ورلڈ بینک کے کتنے صدر گزر چکے ہیں مجھ سے پہلے۔۔ کسی کو نام بھی یاد نہیں
ہوئے۔ کہ انہوں نے ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر کیا کارنامے سرانجام دیے
تھے۔۔ ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں شاید اس میں کامیاب ہو جاؤں اور اگر ناکام بھی رہا
تو بھی کوئی احساس جرم تو نہیں ہو گا کہ میں سود کھانے اور کھلانے والوں کیساتھ زندگی

گزار کر مرا۔۔۔۔۔

ٹھیک ہے تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرو۔ انہوں نے بے حد مایوسی سے کہا۔ تم نے پہلے
کبھی میری بات نہیں مانی تو اب کیسے مانو گے۔۔ سالار مسکرایا۔۔ وہ باپ کی مایوسی کو
سمجھ سکتا تھا۔ وہ انکا خواب توڑ رہا تھا۔۔۔

مجھے یقین ہے پاپا میں جو بھی کرنے جا رہا ہوں وہ صحیح ہو گا۔ اس لیے آپ پریشان نہ
ہو۔ اس نے سکندر کو تسلی دی۔۔۔۔

اور یہ یقین تمہیں کیوں ہے؟؟ سکندر طنز کیسے بغیر نہ رہ سکے۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کیونکہ آپ نے زندگی میں جب جب مجھے جس بھی فیصلے سے روکا ہے وہ میرے لیے
بہت اچھا ثابت ہوا ہے۔ آپکی ممانعت گڈ لک چارم ہے میرے لیے۔۔۔

سکندر ٹھیک کہتے تھے وہ واقعی ڈھیٹ تھا مگر اس نے سینس آف ہیومر باپ سے ہی لیا
تھا۔ جنکا پارہ لمحہ میں چڑھا اور اتر اور وہ ہنس پڑے۔۔۔

کمنے۔۔۔۔۔

شکر یہ۔۔۔ سالار نے جوابی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔۔۔

اور یہ فلوکب سے چل رہا ہے تمہارا؟ فرقان نے سالار سے پوچھا۔ وہ آٹھ مہینے کے بعد مل رہے تھے۔

یہ تو اب ایک ڈیڑھ ماہ سے کچھ مستقل ہی ہو گیا ہے۔ آتا جاتا رہتا ہے۔ سر درد کیسا تھ۔۔ شاید کسی چیز کی الرجی ہے۔ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔۔

تم کوئی میڈیسن لے رہے ہو؟ فرقان نے پوچھا۔

ہاں وہی اینٹی بائیوٹک لیکن اثر کبھی ہو جاتا ہے کبھی نہیں۔۔ سالار نے بتایا۔

تم بلڈ ٹیسٹ کروالو کہی کوئی اور مسئلہ نہ ہو۔۔ فرقان اس وقت مر کے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ مسئلہ اتنا بڑا ہو سکتا ہے۔۔ سالار کے کروائے جانے والے ٹیسٹس نے فرقان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔ اسے یہ یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ رپورٹس سالار کی ہو سکتی ہے۔۔

کیوں؟؟ مزید ٹیسٹس کیوں۔۔ کوئی ایسا سیریس مسئلہ تو نہیں مجھے۔۔ دوسرے دن مزید ٹیسٹ کا کہنے پر سالار نے ایک بار پھر لاپرواہی سے اسکی بات ہو میں اڑانے کی

کوشش کی۔۔ اسے لاہور میں کاموں کا ڈھیر نپٹانا تھا اور وہ اس ڈھیر میں کسی ہاسپٹل میں جا کر مزید ٹیسٹ کروانا اسکے لیئے بے حد مشکل کام تھا۔۔ فرقان خود میں ہمت پیدا نہیں کر سکا کہ وہ اسے بتاتا کہ اسکے ابتدائی ٹیسٹ کس چیز کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔۔

یہ ضروری ہے سالار۔ کام ہوتے رہینگے۔ لیکن صحت پر کپڑا مارتے نہیں کیا جاسکتا۔۔ فرقان نے جواب میں کہا۔۔

صحت بالکل ٹھیک ہے یا صحت کو کیا ہوا ہے۔ ایک معمولی فلو ہونے پر تم نے مجھے ڈاکٹروں کی طرح ہاسپٹلز کے چکروں پر لگا دیا۔۔ سالار نے اسی انداز میں کہا۔۔

اور ویسے بھی اگلے مہینے مجھے امریکہ جانا ہے وہاں میڈیکل چیک اپ کروانا ہے تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہے۔۔ وہ اب اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سب ٹھیک نہیں ہے سالار۔۔ فرقان کو بلا آخر اسے ٹوکنا پڑا۔۔

کیا مطلب۔۔ سالار اسکی بات پر ٹھٹکا۔۔

میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں آدھے گھنٹے میں۔۔ فرقان نے فون پر مزید کچھ کہے

فون رکھ دیا تھا۔

سالارا اسکے انداز پر الجھا تھا۔ لیکن وہ اسے صرف ایک ڈاکٹر کا فرو فیشنلزم سمجھا۔
تم فوری طور پر کہی نہیں جا رہے۔ مجھے اسی ہفتے میں تمہارے سارے ٹیسٹس کروانے
ہیں۔ اور اسکے بعد ہی تم کہی جا سکتے ہو۔

فرقان واقعی نہ صرف آدھے گھنٹے میں پہنچ گیا تھا بلکہ اس نے سالارا کو اپنی سیٹ کینسل
کروانے کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔

کیا مسئلہ ہے فرقان۔۔۔ تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے۔ کیا چھپا رہے
ہو۔ کیوں ضرورت ہے مجھے اتنے لمبے چوڑے ٹیسٹس کی۔۔۔؟؟ سالارا اب پہلی بار
واقعی کھٹکا تھا۔ فرقان کو احساس ہو گیا کہ اسے بتائے بغیر وہ اسے ٹیسٹس پر آمادہ نہیں کر
سکتا تھا۔۔۔

میں صرف یہ کنفرم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی ٹیو مر نہیں ہے۔۔۔ وہ دنیا کا مشکل ترین
جملہ تھا جسے ادا کرنے کے لیے فرقان نے وہ سارے لفظ اکھٹے کیسے یوں جیسے سالارا سے
زیادہ وہ اپنے آپ کو تسلی دینا چاہتا تھا۔

ہوئی۔

اور اب فرقان ایک بار پھر سالار کے فون پر تھا تو پی لاہور میں اسکی سالار سے تیسری ملاقات تھی ان چند دنوں میں۔۔ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔۔ وہ اب اس سے اسکا اور بچوں کا حال پوچھ رہا تھا لیکن اسکا انداز بہت عجیب تھا وہ خوش مزاجی جو اسکے طرز تخاطب کا حصہ ہوتی تھی وہ آج امامہ کو مکمل طور پر غائب محسوس ہوئی۔۔

سالار ابھی تھوڑی دیر میں فون کرتا ہے تمہیں۔۔ اس نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد

کہا۔

فون آپ کو کیسے دے دیا اس نے؟ یہ بات امامہ کو بے حد حیران کن لگی۔

ہاں وہ ہاسپٹل میں آئے ہوئے تھے اور سالار کو مجھ سے کام تھا۔ وہ ذرا واش روم تک گیا ہے تو فون یہی چھوڑ گیا۔

امامہ کے لیے یہ ناقابل یقین تھا۔ وہ واش روم جاتے ہوئے اپنا فون کہی چھوڑ کر جانے والوں میں نہیں تھا۔ لیکن اس نے مزید سوال جواب کی بجائے سالار کی کال کا انتظار مناسب سمجھا۔

سالار ایم آر آئی کروا رہا تھا۔ اور اسکے ہونے والے ٹیسٹ ان سارے خدشات کی تصدیق کر رہے تھے جو فرقان کو ہوئے تھے۔۔۔ اسے برین ٹیومر تھا۔ برین ٹیومر مہلک تھا اسکی بھی تصدیق ہو گئی۔ اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے پہلی بار بیٹھ کر اپنی زندگی کے بیالیس سالوں کے بارے میں سوچا۔ مہلت کا وہ۔ اصول جو قرآن مجید میں تھا اسے اب سمجھ آیا۔ لیکن یہ۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ۔ وہ قانون اب اسکی اپنی زندگی پر لاگو ہونے جا رہا تھا۔۔۔

میڈیکل سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہر چیز کا علاج ممکن ہے۔ اس ٹیومر کے مہلک ہونے کی تصدیق پر فرقان اس سے کم اپ سیٹ نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے گم صم بیٹھے سالار کو تسلی دینا شروع کی۔

تم اب صرف اتنا سوچو کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ اس نے سراٹھا کر فرقان کو دیکھا اور کہا۔۔۔ تم ڈاکٹر ہو کر مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ فرقان بول نہ پایا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے۔

تم فوری طور پر امریکہ چلے جاؤ بلکہ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں وہاں بہترین ڈاکٹر زاور اسپتال ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہاں اسکا علاج ہو جائے یا کوئی اور حل ہو۔۔۔ وہ اب ڈاکٹر

بن کر نہیں اسکا ایک عزیز دوست بن کر بات کر رہا تھا۔

امامہ۔۔ سے کیا کہوں؟؟ اس نے عجیب سوال کیا۔

ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔۔ ایک بار امریکہ۔۔ سے ٹیسٹ ہونے دو دیکھو وہاں

کے ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں۔۔۔ فرقان نے کہا۔

یہاں کے ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟؟ فرقان اسکے اس سوال کو نظر انداز کر گیا تھا۔

پاکستان میں برین ٹیومر کا علاج اور نیوروسرجری اتنی اڈوانسڈ نہیں جتنی امریکا

میں۔۔۔ اس لیے یہاں کے ڈاکٹرز کی رائے میرے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔۔۔

اسے فرقان کی بے بسی پر خود سے زیادہ ترس آ رہا تھا وہ اسے کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا

اور کچھ چھپانا بھی نہیں۔

*****-----

حمین جاؤ بھائی کو بلا کے لاؤ وہ سونے سے پہلے تم لوگوں کو دعا پڑھا دے پتا نہیں اتنی دیر

کیوں لگا دی اس نے،،،، بچوں کو پڑھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہیں سونے کے

لیئے لیٹنے کا کہتے ہوئے امامہ کو جبریل یاد آیا۔ اسے کمرے سے گئے کافی دیر ہو گئی

تھی۔۔

آج میں پڑھاتا ہوں۔۔ حمین نے اعلان کرتے ہی دونوں ہاتھ کسی نمازی کی طرح سینے پر باندھتے ہوئے جذب کے عالم میں دعا پڑھنے کے لیے اپنا منہ کھولا اور امامہ نے اسے ٹوکا۔۔

حمین۔۔۔ بھائی پڑھائے گا۔

حمین نے بند آنکھیں کھولی اور ہاتھ بھی۔۔۔ اس سے پہلے کے وہ کمرے سے نکل جاتا امامہ نے نائٹ سوٹ کے اس پاجامے پر لگی گرہ کو دیکھا جو وہ ابھی ابھی ہاتھ روم سے پہن کر نکلتا تھا۔ پاجامے کے اوپری حصے کو ازار بند کی بجائے ایک بڑی سی گرہ لگا کر کسا گیا تھا۔

ادھر آؤ۔۔ امامہ نے اسے بلایا۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔ اس نے جھک کر نیچھے بیٹھتے ہوئے اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی تاکہ پاجامہ کو ٹھیک کر سکے۔

حمین نے ایک چیخ ماری اور جھٹکا کھا کر اس گرہ پر دونوں ہاتھ رکھے پیچھے ہٹا۔۔۔۔۔ می نہیں۔۔۔

اسکی سٹرنگ کہاں ہے۔۔۔ امامہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گرہ کو باندھنے کی وجہ کیا تھی۔

میں نے سکول میں کسی کو دے دی۔۔۔

امامہ نے حیرانی سے پوچھا۔۔۔ کیوں۔۔۔

چیریٹی میں۔۔۔ حمین نے جملہ مکمل کر دیا

امامہ نے ہکا بکا ہو کر اپنے اس بیٹے کا اعتماد اور اطمینان دیکھا۔۔۔ چیریٹی میں؟؟ وہ واقعی

حیران تھی۔۔۔ صرف ایک ڈوری کو؟؟

نہیں۔۔۔ مختصر جواب آیا۔

پھر؟

ڈوری سے بیگ کو باندھا تھا۔

کس بیگ کو۔۔۔ امامہ کا ماتھا ٹھنکا۔

اس بیگ کو جس میں کھلونے تھے۔ جواب اب پورا آیا تھا۔

کس کے کھلونے۔۔ امامہ کے ماتھے پر بل پڑے۔۔

ویل۔۔۔ حمین نے اب ماں رنیسہ اور عنایہ کو باری باری۔۔ محتاط انداز میں دیکھا اور اپنے جواب کو گول مول کرنے کی بہترین کوشش کی۔۔ وہ کی لوگوں کے تھے۔

امامہ کو ایک لمحے میں سمجھ آیا۔۔۔

کون تھے۔ کس کو دیے۔ کیوں دیے۔ کس سے اجازت لی۔۔ اس نے یکے بعد دیگرے تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب حمین سکندر نے مہا تمبا دھ بننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کے کھلونے دان کیسے تھے اور اسکے بہن بھائیوں میں اگر بلا کا تحمل نہ ہوتا تو اس کے اس کار نامے پر ہر بار بلا کارن پڑتا۔۔۔۔۔

عنایہ کی آنکھیں اب آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھی۔ اس چھوٹے بھائی نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہ انکی ہر چیز کو کسی بھی وقت مشنری جذبہ کے تحت کسی کو بھی دے سکتا ہے۔۔

ممی۔۔۔ عنایہ بری طرح بلبلائی۔۔۔

چیریٹی گناہ نہیں ہے۔۔۔ حمین نے اپنی آنکھیں عادتاً گول کرتے ہوئے ان دو الفاظ کا ایک بار پھر استعمال کیا جو پچھلے کی دنوں سے بار بار اسکی گفتگو میں آرہے تھے۔۔۔
تم نے میرے کھلونے چرائے۔۔۔ عنایہ کابلس چلتا تو وہ اسے پیٹ ڈالتی۔ کم از کم رات کے اس پہر جب اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اسکا کون کون سا کھلونا چیریٹی میں دے آیا ہے۔۔۔

صبح بات کریں گے اس بارے میں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ امامہ نے مداخلت کی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی صوفی پڑا اسکا سیل فون بجنے لگا اسکا خیال تھا وہ سالار کی کال تھی۔۔۔

امامہ نے سیل فون پر سکندر عثمان کا نام چمکتے دیکھا اور کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے تینوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

سالار کہاں ہے۔۔۔ سکندر نے اسکے سلام کا جواب دیتے ہی عجیب اضطراب کے عالم میں پوچھا تھا۔

ایک ڈنر میں گئے ہیں بس ابھی آنے والے ہونگے۔

میں اسے کال کر رہا تھا وہ ریسپو نہیں کر رہا۔ امامہ کو انکے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ محسوس ہوئی۔۔

ہو سکتا ہے ڈنر میں آپکی کال نہ لے پارہے ہو وہ اکثر ایسی فنکشنز میں اپنا سیل ساٹلنٹ پر لگا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ خیریت ہے ناپاپا؟؟ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

تم لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی۔؟ سکندر عثمان حواس باخنگی میں کہتے چلے گئے انہیں کچھ دیر پہلے انکے ایک قریبی عزیز نے اس حوالے سے فون کیا تھا۔ اس عزیز نے سالار کی بیماری کے حوالے سے یہ خبر کسی چینل پر دیکھ لی تھی اور فوری طور پر افسوس کا اظہار کرنے کے لیے سکندر عثمان کو فون کیا۔۔۔ اور سکندر شاکڈ رہ گئے تھے۔ اس نے حواس باخنگی کے عالم میں سالار کو کالز کرنا شروع کر دی تھی جو اس نے ریسپو نہیں کی۔۔۔

اس ڈنر میں بیٹھنے سے پہلے سکندر عثمان کی کال آنے سے پہلے سالار کو پتا چل گیا تھا کہ میڈیا میں اسکی بیماری کی خبر بریک ہو چکی ہے۔ اسکے اسٹاف نے اسے اطلاع دی تھی اور وہ سکتے میں آ گیا تھا۔ سکندر عثمان کا نام اپنے فون پر چمکتا دیکھ کر سالار کی بھوک ختم

ہوگی تھی۔۔

اسے یقین تھا کہ وہ کال کس مقصد کے لیے کی جا رہی ہے۔ لیکن وہ وہاں بیٹھ کر سکندر سے بات کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکا۔ وہ بوجھ جس نے کی مہینوں سے اسے دہرا کر رکھا تھا ایک دم جیسے اور بہت سے لوگوں کی کمریں جھکا دینے والا تھا۔ اور اگر سکندر کو یہ خبر مل چکی تھی تو امامہ؟؟؟

وہ آگے نہیں سوچ سکا۔

کیا نہیں بتایا پاپا کیا چھپایا ہے آپ سے؟؟ امامہ کی سمجھ میں سکندر کی بات نہ آئی۔

برین ٹیومر کے بارے میں۔۔ سکندر نے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔۔ امامہ اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔۔

برین ٹیومر؟ کس کے برین ٹیومر کے بارے میں؟ وہ الجھی۔۔ اور وہ پہلا موقع تھا جب سکندر کو احساس ہوا کہ وہ بھی انکی طرح بے خبر تھی۔۔

پاپا آپ کس کے برین ٹیومر کی بات کر رہے ہیں؟؟ امامہ نے ایک بار پھر

پوچھا۔۔ جو اب سکندر عثمان کے خلق میں اٹک گیا۔

مجھے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔۔ وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کیسے بغیر رہ نہ سکے۔۔ امامہ نے فون بند کر دیا۔ سب کچھ یکدم ہی بے معنی ہو گیا تھا کسی بت کی طرح فون کو گود میں رکھے ساکت بیٹھی تھی وہ۔۔

مئی آپ ٹھیک ہیں؟

امامہ نے چونک کر حمین کو دیکھا۔ جواب دینے یا کوئی اوت سوال کرنے کی بجائے وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔ حمین کچھ اور الجھا تھا۔۔۔

تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟ سالار نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی وہاں پڑے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے جبریل کو دیکھ لیا تھا۔۔ باپ کی آواز جبریل کو کرنٹ کی طرح لگی تھی۔ برق رفتاری سے اس نے کمپیوٹر کی سکرین پر وہ سائٹ بند کی جو وہ کھولے بیٹھا تھا۔ اور وہ اب باپ کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔ امامہ ہارن کی آواز سن کر بھی نہیں آئی تھی۔ جبریل ہارن کی آواز سن ہی نہ سکا۔ اسکا ذہن جس گرداب میں پھنسا تھا وہاں وہ سن بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔۔

میں ایک اسائنمنٹ کی تیاری کر رہا تھا۔۔ جبریل نے اپنے سامنے کھڑے سالار کو دیکھے بنا نظریں ملائے بنا کہا۔ وہ باپ کا چہرہ کیوں نہیں دیکھ پارہا تھا۔

سالار نے جبریل کا چہرہ دیکھا۔ اسکے عقب میں ڈیسک ٹاپ پر ورلڈ بینک کا ہوم پیج دیکھا

-

بہت دیر ہو گئی ہے۔ ساڑھے دس ہو رہے ہیں اور تمہیں دس بجے سے پہلے پہلے سب

کام مکمل کر لینا چاہیے۔ یاد ہے؟؟

سالار نے اسے یاد دہانی کرائی۔۔۔

جبریل نے اس بار بھی باپ کو دیکھے بغیر سر ہلایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تمہاری مٹی کہاں ہے؟ سالار نے اس سے پوچھا۔ ہارن کی آواز کے باوجود بھی نہیں آئی

تھی وہ۔ اور جبریل رات کے اس پہر لاؤنج میں ڈیسک ٹاپ پر اکیلا موجود تھا۔ اسکے

گھر میں یہ خلاف معمول تھا۔

وہ خدشہ جو اسے ڈنر میں لاحق ہوا تھا وہ جسے یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔۔۔

جبریل کو جواب دینا نہیں پڑا۔ بچوں کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ باہر آگئی

تھی۔ سالار نے اسے دیکھا اور اسکے چہرے پر پڑنے والی ایک نظر ہی اسے یہ بتانے کے

لیئے کافی تھی کہ اسکے بدترین خدشات ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔ اس لاؤنج میں موجود

تینوں افراد عجیب ڈرامائی انداز میں وہاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔۔۔ وہ خاموشی جبریل نے پہلی بار اپنے گھر میں اپنے ماں باپ کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہوتی دیکھی تھی۔ اور اس خاموشی نے اسکے خوف کو اور بڑھایا تھا۔ وہ بلا کو ذہین تھا لیکن دنیا کی کوئی ذہانت انسانی رشتوں کے الجھے دھاگوں کو سلجھا نہیں سکتی۔ نہ خاموشی کی دیواریں چھید سکتی ہے۔

گڈنائٹ۔۔۔۔۔ اسے جیسے راہ فرار سو جھی تھی۔ وہ دو لفظ بول کر ماں باپ کو دیکھے بنا وہاں سے غیر متوازن چال کیساتھ گیا۔۔۔ لاؤنج میں کھڑے رہ جانے والے ان دونوں افراد نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔۔۔ ایک نظر۔۔۔ پھر دوسری اور پھر تیسری۔۔۔ پھر سالار پلٹ کر اپنے بیڈروم کی طرف گیا۔ وہ اس سے زیادہ ان نظروں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اسکے پیچھے میکانی انداز میں اندر آئی تھی یوں جیسے کسی ٹرانس میں ہو۔۔۔ وہ سحر زدہ نہیں تھی دہشت زدہ تھی۔

سالار اب بھی اسکی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ڈنر جیکٹ کو صوفے پر پھینکتے ہوئے اس نے فون ٹراؤزر کی جیب سے نکالا جو بج رہا تھا۔۔۔ وہ سکندر عثمان تھے۔ اسکی آواز سنتے ہی

سکندر اپنا حوصلہ کھو بیٹھے۔۔۔ سالار نے زندگی میں پہلی بار باپ کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔

تم نے طے کر رکھا ہے کہ تم ساری عمر مجھے چین نہیں لینے دو گے۔۔۔ سکندر نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔ وہ اولاد کی تکلیف پر پریشان ہونے والے باپ تھے روپڑ نے والے باپ نہیں تھے۔۔۔ آج انکا یہ زعم بھی اسی اولاد نے ختم کیا تھا۔ جو اتنے سالوں سے اسکے لیئے فخر کا باعث رہا تھا۔

اس بار تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا پاپا۔۔۔ اس جملے نے سکندر کو اور بھی زخمی کر دیا۔ میں اور تمہاری ممی کنشسا آرہے ہیں اسی ہفتے۔ انہوں نے اپنے آپ پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

پاپا کیا فائدہ ہے میں وقت نہیں دے پاؤں گا سب کچھ واسنڈاپ کر رہا ہوں میں یہاں پھر آ جاؤں گا پاکستان آپکے پاس۔۔۔ اس نے اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی وہ ان حالات میں ان دونوں کو اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

آپ پریشان نہ ہو میں بالکل ٹھیک ہوں ٹریٹمنٹ ہو رہا ہے۔ آپ صرف دعا

کرین۔۔ مٹی سے بات کروائیں میری۔۔ طیبہ بھی اسی کیفیت میں تھی جس میں سکندر عثمان تھے۔ اسکی بیماری کا انکشاف ایک آتش فشاں کی طرح تھا جس نے اس سے جڑے ہر شخص کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

کمرے میں ٹہلتے ہوئے فون کان سے لگائے وہ اپنے ماں باپ کو تسلیاں دیتے ہوئے اس وجود سے بے خبر نہیں تھا جو کمرے میں اس ساری گفتگو کے درمیان کسی بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

سالار نے بلا آخر فون بند کر دیا۔ اس نے فون رکھ کر امامہ کو دیکھا۔ اسکا چہرہ سفید تھا۔۔۔ بالکل بے رنگ یوں جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔۔

بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔۔ خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر امامہ۔ کا ہاتھ پکڑا اور اسے صوفے کی طرف لے آیا۔ وہ کھنچی چلی آئی تھی کسی روبرو کی مانند۔۔۔

تمہیں کس نے بتایا؟ گفتگو کا آغاز بھی اب اسی کو کرنا تھا۔

تم نے کیوں نہیں بتایا؟ سوال کا جواب غیر متوقع تھا۔

ہمت نہیں پڑی۔۔ جواب نے امامہ کی بھی ہمت توڑ دی۔ وہ کم حوصلہ تو کبھی نہیں تھا تو کیا وہ خبر اس بیماری کی نوعیت اس حد تک خراب تھی کہ وہ کم ہمت ہو رہا تھا۔
وہ اسے دیکھے بنا جو توں کے تسمے کھولتے ہوئے اسے اپنی بیماری کے بارے میں بتا رہا تھا۔

ٹیومر کی تشخیص۔۔ نوعیت۔ ممکنہ علاج۔۔ متوقع مضمرات۔ وہ دم سادھے سب کچھ سنتی گی۔

تم ٹھیک ہو جاؤ گے نا؟؟؟ اس نے ساری گفتگو کے بعد اسکا کندھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منت والے انداز میں پوچھا تھا۔ وہ جواب ہی نہ دے سکا۔

امامہ تم جا کر سو جاؤ۔۔ اس نے اپنے کندھے سے اسکے دونوں ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔۔ وہ اپنے جوتے اٹھا کر صوفے سے اٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہ سکا۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بچوں کی طرح اسکے کندھے سے لگی۔ وہ اسے سونے کا کہہ رہا تھا نیند تو ہمیشہ کے لیے اب اسکی زندگی سے چلی گی تھی۔ وہ جو ایک گھرا تنی مشکل سے بنایا تھا وہ ٹوٹنے جا رہا تھا۔۔ سائبان ہٹنے والا تھا۔ اور وہ اسے کہہ رہا تھا کہ وہ سو جائے

وہ اس سے لپٹی ہچکیوں کیساتھ روتی رہی۔۔ وہ مجرموں کی طرح چپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔۔

میں رپورٹس دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ روتے روتے یکدم بولی۔ سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر کیبنٹ سے فائلز کا ایک پلندہ لا کر اسکے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے رپورٹس دیکھنے لگی دھندلائی آنکھوں کیساتھ وہ ان کاغذات کو دیکھتے ہوئے جیسے یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ کچھ اور تو نہیں جو وہ چھپا رہا ہے۔ کوئی اور بری خبر۔۔ پیروں سے باقی ماندہ زمین بھی نکال دینے والا انکشاف۔۔ ہر کاغذ اسکی آنکھوں کی دھند کو گہرا کر رہا تھا۔ فائل کو بند کرتے ہوئے اس نے سالار کو دیکھا۔۔

میڈیکل سائنس غلط بھی تو کہہ سکتی ہے۔۔

سالار رندھی ہوئی آواز میں کہے گئے اس جملے پر ہنس پڑا۔۔ وہ غلط آدمی کو غلط جملے سے امید دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہاں۔۔ سائنس غلط بھی کہہ سکتی ہے۔۔ ڈاکٹر کی تشخیص اور علاج بھی۔ اس نے امامہ کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ وہ اسکی افیت کو اور بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔۔

تم ٹھیک ہو جاؤ گے نا؟ اسکا بازو ایک بار پھر تھا ما گیا تھا۔ سوال دہرایا گیا تھا۔

اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو ضرور۔۔۔ لیکن یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے ان شاء اللہ۔۔

وہ پھر ہچکیوں سے رو پڑی۔ اس بار سالار نے اسے لپٹا لیا۔ وہ مرد تھار ونا نہیں چاہتا تھا لیکن جذباتی ہو رہا تھا۔۔۔

امامہ تمہیں بہادر بن کر ان سب کا مقابلہ کرنا ہے۔۔ وہ روتی رہی سالار اسے ساتھ لگائے تھپکتا رہا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔۔ اس نے جیسے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

تم پھر سوال کر رہی ہو۔۔۔ سالار کو لگا اسکی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں۔

نہیں۔۔۔ بتا رہی ہوں۔۔ تمہیں بہادر بن کر ان سب کا مقابلہ کرنا ہے۔۔ وہ اسکا جملہ

اسی سے دہرا رہی تھی۔۔۔ بیماری ہے۔۔ موت تو نہیں۔۔۔ کیسی تسلی تھی جو اس نے

دی۔۔۔ امامہ سرخ سو جھی ہوئی آنکھوں سے اسے امید دل رہی تھی۔۔۔

تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔۔۔ وہ مسکرایا۔۔ امامہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک اور

سیلاب آیا۔۔

میں نے زندگی میں تمہیں بہت سارے آنسو دیے ہیں تمہارے رونے کی بہت ساری
وجوہات کا باعث بنا ہوں میں۔۔ اسکے آنسوؤں نے عجیب کا نٹا چھبویا تھا سالار کو۔۔۔
بہتے آنسوؤں کیساتھ سر ہلاتے ہوئے وہ ہنسی۔۔

ہاں پر میری زندگی میں خوشی اور ہنسی کے سارے لمحات کی وجہ بھی تم ہو۔

وہ اسکا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔۔ پھر یکدم کھڑا ہوا۔

سو جاؤ بہت رات ہو گئی ہے۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے واش روم چلا گیا۔

جب وہ واپس آیا وہ اسی طرح وہاں بیٹھی تھی۔ ان ہی فائلوں کے پلندے کو ایک بار پھر

گود میں لیے۔۔ یوں جیسے اس میں جھوٹ ڈھونڈ رہی ہو۔۔ کوئی غلطی کوئی غلط

فہمی۔۔ امید تو وہاں نہیں تھی۔۔

سالار نے کچھ کہے بنا خاموشی سے اسکی گود سے وہ ساری فائلیں اٹھالی۔

امامہ ایل وعدہ کرو۔۔

کیا؟ اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔

بچوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔۔۔ وہ بہت چھوٹے ہیں۔۔۔

امامہ نے سر ہلا دیا۔۔۔

-----++++-----

برین ٹیو مر کیا ہوتا ہے؟ حمین نے دعا کا آخری لفظ پڑھتے ہی جبریل سے پوچھا۔ جبریل

کارنگ اڑ گیا۔۔

تم کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔ جبریل نے دل میں دعا کی کہ اسے کچھ پتا نہ ہو۔۔۔

ہماری فیملی میں کسی کو برین ٹیو مر ہے۔۔۔ حمین نے بلا آخر اعلان کیا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ

دادا کو ہے۔ انہوں نے ممی کو بتایا ہے اور وہ اپ سیٹ ہو گئی۔

جبریل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ تو اسکی ماں تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ اور اسکے دادا تک

بھی۔۔۔ وہ بچہ سوچ رہا تھا۔

کیا دادا مرنے والے ہیں۔؟ حمین نے لیٹے لیٹے رازدارانہ انداز میں جبریل سے پوچھا۔

نہیں۔۔۔۔ اس نے بے اختیار کہا۔

تھینک گاڈ۔۔۔ مجھے ان سے بہت پیار ہے۔۔۔ حمین نے جیسے سکون کا سانس لیا۔

حمین تم یہ بات کسی کو مت بتانا۔۔ جبریل نے ایک دم اسے ٹوکا۔

دادا کے برین ٹیو مر والی؟ وہ۔۔ متجسس ہوا۔۔

ہاں۔۔

کیوں؟

اوہ۔۔ ہاں حمین کو سمجھ آ گیا تھا۔ دادا نے می کو بتایا تو وہ۔۔ اپ سیٹ ہوگی اب تم کسی اور کو

بتاؤ گے تو وہ بھی اپ سیٹ ہو جائے گا۔

جبریل جتنے حفاظتی بند باندھ سکتا تھا اس وقت باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ وہ ننھا

بچہ اپنے ماں باپ کے اس راز کو راز رکھنے کے لیے ہلکان ہو رہا تھا۔

اوہ مائی گاڈ۔۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ لوگوں کو اپ سیٹ کرنا گناہ ہے نا؟

ہاں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جبریل نے اسکو ڈرایا۔

آہاں۔۔۔ اوکے۔۔۔

حمین کی آواز میں خوف تھا وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

جبریل کچھ دیر اس طرح لیٹا رہا اور حمین کے سونے کا انتظار کرتا رہا۔ جب اسے یقین ہوا کہ وہ سوچکا ہے تو وہ بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھا اور دبے قدموں چلتا ہوا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آگیا۔ جبریل نے کمپیوٹر آن کیا اور دوبارہ ان ہی میڈیکل ویب سائٹ کو دیکھنے لگا جنہیں سالار کے آنے سے پہلے دیکھ دیا تھا۔

سالار اپنی بیماری کے بارے میں جتنا کچھ جانتا تھا جبریل اس ایک رات میں اس سے دس گنا زیادہ جان چکا تھا۔



NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

بیماری کے انکشاف کے اثرات اسے اگلے ہی دن پتا چلنا شروع ہوئے۔ بورڈ آف گورنرز کے پانچوں ارکان کے بعد باری باری بہت سے ایسے لوگوں نے اسے میسیجز اور کالز شروع کیے جو انکے اس مالیاتی نظام سے وابستہ ہونے کے لیے فنانشل امداد دے رہے تھے۔ وہ اس ادارے میں اپنے انویسمنٹ کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تھے۔

یہ سالار سکندر اور اسکے ساتھیوں کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔ اس اسٹیج پر اس طرح کی عدم اعتمادی انکے ادارے کی ساکھ کے لیے بہت نقصان دہ تھی۔۔۔ کچھ بڑے سرمایہ

کار پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اور واپس تب آنے کے لیے تیار تھے جب انہیں انکا ادارہ کام کرتا کامیاب ہوتا نظر آتا۔۔۔

+++++-----+++++

سالار کچھ دیر کے لیے یہ سب چھوڑ دو۔۔۔ امامہ نے اس رات بلا آخر اس سے کہا تھا۔ وہ بہت دیر تک فون پر کسی سے بات کرتا رہا تھا۔ امامہ بہت دیر تک کھانے کی ٹیبل پر اسکا انتظار کرنے کے بعد وقفے وقفے سے اسے دیکھنے بیڈ روم آتی رہی۔ لیکن اسے مسلسل مصروف دیکھ کر اس نے بچوں کو کھانا کھلا دیا اور جب وہ بیڈ روم آئی تو سالار فون ختم کر رہا تھا۔ کھانے کا پوچھنے پر اس نے انکار کر دی۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔

اور بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گی وہ جس کرائس میں تھا وہ اس سے بے خبر نہیں تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

کیا چھوڑ دوں؟ وہ آنکھیں مسلتے ہوئے چونکا۔

کام۔۔۔

اچھا۔۔۔۔۔ وہ ہنس پڑا۔

سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنے علاج پر توجہ دو۔ اپنی صحت اپنی زندگی پر۔ ہمارے لیے
صرف وہ اہم ہے۔ وہ اب جیسے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

امامہ۔۔ میرے پاس چوائس نہیں ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے کہ ایک
وقت میں صرف ایک کام کروں۔ وہ اسکی بات سن کر چند لمحے بول نہ پائی۔

میں ہر طرح سے مشکل میں ہوں آجکل۔۔۔ برے وقت میں نے پہلے بھی دیکھے ہیں

لیکن ایسا برا وقت نہیں کہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاؤں ریت ہو جائے

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ امامہ کی آنکھیں نم ہونے لگی۔۔۔ وہ کی ہفتوں سے لگاتار رو

رہی تھی اسکے باوجود آنکھیوں کا پانی ختم نہیں ہو رہا تھا وہ کنواں بن گی تھی۔

گناہگار تو ہوں میں،، ہمیشہ سے ہوں۔۔۔۔۔ گمان اور غرور تو کبھی نہیں کیا میں نے

۔۔ کیا بھی تو توبہ کر لی۔۔ لیکن پتا نہیں کیا گناہ کر بیٹھا ہوں کہ یوں پکڑ میں آیا

ہوں۔۔۔

آزمائش ہے سالار۔۔ گناہ کی سزا کیوں سمجھ رہے ہو۔۔ امامہ نے اسکی کلامی پر ہاتھ

رکھا۔۔

کاش آزمائش ہی ہو اور ختم ہو جائے نہ ختم ہونے والی سزا نہ ہو۔۔ وہ بڑبڑایا۔

تمہارے پاس کتنی سیونگنز ہے؟ اس نے بات کرتے کرتے موضوع بدل دیا۔

میرے پاس۔۔۔ وہ الجھی۔۔ پتا نہیں۔۔ پاکستان میں بینک میں کافی رقم ہوگی۔ مجھے

اماؤنٹ کا پتا نہیں۔۔ تمہیں ضرورت ہے کیا۔ اس نے ایک دم سالار سے پوچھا۔۔

نہیں۔۔ مجھے ضرورت نہیں لیکن شاید تمہیں اسے اب استعمال کرنا پڑے بچوں کے

لیئے۔۔ یہاں سے پاکستان جائیں گے تو وہاں کتنا عرصہ پاپا کے پاس تمہیں بچوں کیساتھ

ٹھہرنا پڑے مجھے ابھی اندازہ نہیں۔۔ وہاں پاپا کے پاس بچوں کی تعلیم کم از کم متاثر نہیں

ہوگی۔ امریکہ میں فی الحال تم سب کو رکھنا فورڈ نہیں کر سکتا میں خاص طور پر اب جب

میری جاب ختم ہو رہی ہے اور میں اپنے ادارے لے لانچ کرنے کی پروسس میں بھی

بے حد مسائل کا شکار ہوں اور اس پر یہ ٹیومر۔۔۔ ورلڈ بینک کی جاب کیساتھ

میڈیکل انشورنس بھی ختم ہو جائے گی۔ جو امریکہ میں میری ہیلتھ انشورنس ہے وہ

کینسر ٹریٹمنٹ کو نہیں کرتی۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آریا کہ میں کیا کروں اور

کیا نہیں۔۔۔۔۔

تو آج یہ ادارہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہو چکا ہوتا۔

مجھے یہ بیماری تب ہوئی ہوتی تو مجھے رنج نہ ہوتا کہ میں اپنے کیسے کا ازالہ نہ کر سکا۔۔۔ یہ بہت بڑا پچھتاوا ہے میرا جو کسی طوق کی طرح گردن میں لٹکا ہوا ہے۔۔۔ وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

تم کیوں سوچ رہے ہو ایسے۔۔۔ تم کو شش تو کر رہے ہو محنت تو کر رہے ہو۔۔۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔ وہ اسکی باتوں پر تڑپ اٹھی۔

ہاں لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
تم امید چھوڑ بیٹھے ہو؟؟

نہیں امید تو نہیں چھوڑی لیکن۔۔۔

وی بات کرتے کرتے ہونٹ کاٹنے لگا۔ مجھے کبھی یہ لگا ہی نہیں تھا کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ جب تک سب ٹھیک رہتا ہے ہمیں لگتا ہے ہمارے پاس وقت بہت ہے۔ ہم وہ سارے کام پہلے کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نفس کو پسند ہیں وہ سارے کام زندگی کے آخری حصے کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے۔ میں بھی مختلف نہیں تھا۔ میں

نے بھی ایسا ہی کیا۔ سالار اپنے ہاتھ مسل رہا تھا بے حد رنج کے عالم میں۔۔۔ مجھ سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ روز قیامت کیسی ہوگی۔ وہ ایک بار پھر دنیا میں لوٹانے کی پکار کیسی ہوگی۔۔۔ وہ ایک موقع اور مانگنے کی التجا کیا ہوگی۔۔۔ اسکی آواز بھراگی تھی۔۔۔۔۔ اب میں صرف اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ میری زندگی نہیں صرف مجھے اس کام کی تکمیل کر لینے دے جو میں کرنا چاہتا ہوں اور اگر یہ کام میں نہ کر سکا تو پھر میری دعا ہے کہ یہ کام میری اولاد پایہ تکمیل تک پہنچائے اگر میں نہ رہا تو پھر تم جبریل کو اکانو مسٹ۔۔۔

امامہ نے اسکی بات کاٹ دی۔۔۔ کیوں سوچتے ہو تم ایسے۔۔۔
سوچنا چاہیے امامہ۔۔۔

تم ہی یہ کام کرو گے سالار۔۔۔ کوئی اور نہیں کر سکے گا۔ تمہاری اولاد میں سے بھی کوئی نہیں۔۔۔ ہر کوئی سالار سکندر نہیں ہوتا۔

وہ زندگی میں پہلی بار اعتراف کر رہی تھی۔۔۔ اسکے غیر معمولی ہونے کا۔ اسکے خاص ہونے کا۔

سالار نے اس رات اس سے بحث نہیں کی تھی۔۔ اسکی اپنی ہمت جتنی ٹوٹی تھی۔ وہ
امامہ کی ہمت اس طرح توڑنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

ممی میں آپکو سیب کاٹ کر لا کر دوں۔۔؟ امامہ جبریل کی بات پر حیران ہوئی۔ یہ آفر
حمین کی طرف سے تو نارمل بات تھی لیکن جبریل اس طرح کے کام نہیں کرتا تھا۔۔
نہیں۔۔۔ تم کھانا چاہ رہے ہو تو میں تمہیں کاٹ دوں؟؟ امامہ نے جواباً سے آفر
کیا۔۔۔

نہیں۔۔۔ جبریل نے جواب دیا۔۔ اسکے بچے اسکی تکلیف اور پریشانی محسوس کرنا
شروع ہو گئے تھے اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔۔ اس نے جبریل کو غور سے
دیکھا۔۔۔

آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں۔۔۔ جبریل نے ماں کی نظریں خود پر مبذول پا کر پوچھا۔
وہ مسکرا دی۔

نے ایک عجیب سا سگنل دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتا تھا۔۔۔۔

جبریل۔۔۔۔

جی می۔۔۔ وہ اسکے مخاطب کرنے پر اسکی طرف متوجہ ہوا۔۔۔ وہ وال کرتے کرتے رہ

گی۔۔۔ وہ بات بدل گئی۔۔۔۔

تمہارا قرآن پاک ختم ہونے والا ہے پھر ماشاء اللہ تم حافظ قرآن بن جاؤ گے۔۔ تم نے قرآن پاک سے ابھی تک کیا سیکھا؟ وہ ماں کے سوال پر کام کرتے کرتے ٹھٹک گیا۔۔۔

بہت ساری چیزیں ہیں۔ اس نے ذرا سوچ کر ماں سے کہا۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

لیکن اگر کوئی ایک چیز ہو جو تمہیں سب سے امپورٹنٹ لگتی ہو اور اچھی بھی۔۔

آپ کو پتا ہے مجھے کیا چیز سب سے امپورٹنٹ لگتی ہے قرآن پاک میں۔۔ وہ اب دلچسپی

سے بات کرنے لگا۔۔۔

کیا؟؟؟

امید۔۔۔

امامہ اسکا منہ دیکھنے لگی۔۔ کیسے؟؟ جواب وہ ملا تھا جس نے کسی مرہم کی طرح اسکے

زخموں کو ڈھانپنا تھا۔۔۔

دیکھیں سارا قرآن ایک دعا ہے۔۔ تو دعا امید ہوتی ہے نا۔۔۔ ہر چیز کے لیے دعا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے نا کہ اللہ ہر مشکل میں ہمیں امید بھی دے رہا ہے۔ یہ مجھے سب سے اچھی چیز لگتی ہے قرآن میں کہ ہم کبھی نا امید نہ ہو۔ کوئی گناہ ہو جائے تب بھی اور کوئی مشکل آجائے تب بھی۔ کیونکہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔۔ اس کا دس سالہ بیٹا بے حد آسان الفاظ میں اسے وہ چیز تمہارا ہاتھ جو اسکے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔۔

جبریل بات کرتے کرتے رک گیا اس نے ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھی۔۔۔

کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟؟ اس نے ایک دم محتاط ہو کر ماں سے پوچھا۔۔۔

امامہ نے نم آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔۔ نہیں تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اور تم نے ٹھیک چیز چنی۔۔۔

ناشتے کی میز پر امامہ نے جبریل کی سو جھمی ہوئی آنکھیں دیکھی تھی جو سلام کر کے سالار یا امامہ سے نظریں ملائے بغیر آکر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟

امامہ نے اسکا ماتھا چھو کر جیسے ٹمپر پچر معلوم کرنے کی کوشش کی۔

جی میں ٹھیک ہوں۔۔۔ جبریل کچھ گھبرا یا۔۔۔

چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سالار نے بھی اسی لمحے جبریل کو دیکھا تھا لیکن کچھ کہا نہیں۔۔۔

تم جاگتے رہے ہو کیا ساری رات؟ امامہ کو اسکی آنکھیں ابھی بھی تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں مئی یہ بہت رویا ہے۔۔۔ اس سے پہلے کہ جبریل کوئی اور بہانہ بنانے کی کوشش کرتا حمین نے سلائس کا کونہ دانتوں سے کاٹتے ہوئے جبریل کو جیسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا۔۔۔ کم از کم جبریل کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔۔۔ ٹیبل پر موجود سب لوگوں کی نظریں بیک وقت جبریل کے چہرے پر گئیں۔۔۔ وہ جیسے پانی پانی ہوا۔۔۔

ایک لفظ بھی کہے بغیر امامہ نے سالار کو دیکھا سالات نے نظریں چرائی۔

سلائس کے کونے کترتا ہوا حمین بے حداطمینان سے رات کے اندھیرے میں بستر میں

چھپ کر بہائے گئے ان آنسوؤں کی تفصیلات کسی کمٹری کرنے والے انداز میں بغیر
رکے بتاتا چلا جا رہا تھا۔۔۔

جبریل روز روتا ہے۔ اور اسکی آوازوں کی وجہ سے میں سو نہیں پاتا اور جب میں اس
سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ جاگ رہا ہے تو جواب نہیں دیتا۔ ایسے ظاہر کرتا ہے جیسے سو
رہا ہے۔۔۔ مگر مجھے۔۔۔۔۔

ناشتے کی میز پر حمین کے انکشافات نے عجیب خاموشی پیدا کر دی تھی۔

اور می مجھے پتا ہے کہ یہ کیوں روتا ہے۔۔۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
حمین کے آخری جملے نے امامہ اور سالار کے پیروں کے نیچے سے نئے سرے سے زمین
کھینچی تھی۔

لیکن میں یہ بتاؤں گا نہیں کی کیونکہ میں نے جبریل سے پراس کیا ہے کہ میں کسی سے
اسکو شیئر نہیں کروں گا میں کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

حمین نے اعلان کرنے والے انداز میں انکو چوکا دیا اور دہلا دیا۔ سالار اور امامہ کی سمجھ
میں نہیں آیا کہ وہ کیارڈ عمل ظاہر کرے۔

میں نہیں روتا۔۔

حمین کے خاموش ہونے کے بعد ماں باپ کو دیکھتے ہوئے جبریل نے خلق میں پھنسی ہوئی آواز کیساتھ جیسے اپنا پہلا دفاع کرنے کی کوشش کی اور حمین نے اس پہلی کوشش کو پہلے ہی وار میں زمین بوس کر دیا۔۔۔

اوہ مائی گاڈ۔۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔

تم حافظ قرآن ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔۔

جبریل پر کچھ اور پانی پڑا۔۔ اسکا چہرہ کچھ اور سرخ ہوا۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

مئی جھوٹ بولنا گناہ ہے نا۔۔ اس نے ماں سے تصدیق کرنے کی کوشش کی۔

حمین خاموش ہو جاؤ اور ناشتہ کرو۔۔ اس بار سالار نے مداخلت کی اور اسے کچھ سخت لہجے میں گھر کا۔۔ اپنے حواس بحال کرنے کے بعد صورت حال کو سنبھالنے اور جبریل کو اس سے نکالنے کی یہ اسکی پہلی کوشش تھی۔

امامہ اب سرد ہاتھوں سے وہاں بیٹھی جبریل کو دیکھ رہی تھی۔ ناشتہ ختم کرنے تک سالار نے حمین کو دوبارہ اسکے احتجاج کے باوجود منہ کھولنے نہیں دیا۔

ان چاروں کو پورچ میں کھڑی گاڑی میں بٹھانے اور ڈرائیور کیساتھ سکول بھیجنے کے بعد امامہ سالار کے پیچھے اندر آگئی تھی۔۔

جبریل کو میری بیماری کے بارے میں پتا ہے۔۔۔

سالار نے اندر آتے ہوئے مدھم آواز میں اسے بتایا۔ وہ اسکے پیچھے آتے آتے رک گئی۔۔ پاؤں اٹھانا بھی کبھی دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔

رات کو بات ہوئی تھی میری اس سے۔۔۔ سالار اسے بتا رہا تھا۔۔۔

کب؟ اس نے بمشکل آواز نکالی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

رات گئے۔۔۔ تم سو رہی تھی میں لاؤنج میں کسی کام سے گیا تھا وہ کمپیوٹر پر برین ٹیوٹر

کے علاج کے بارے میں جاننے کے لیے میڈیکل ویب سائٹ کھولے بیٹھا تھا۔۔۔ وہ

کی ہفتوں سے ساری ساری رات یہی کرتا رہا ہے۔ میں نے پوچھا نہیں۔ اسے کس نے

بتایا کب پتا چلا لیکن مجھے لگتا ہے اسے شروع سے ہی پتا ہے۔۔۔

محمد جبریل سکندر کنویں سے زیادہ گہرا تھا۔ وہ ماں باپ کیساتھ ایک بار پھر ایک بے آواز

تماشائی کی طرح انکی زندگی کی تکلیف اور افیت کو جھیل رہا تھا۔۔۔

اس نے تم سے کیا کہا؟ امامہ کے خلق میں انکی چیز آنسوؤں کے گولے میں بدلی۔۔۔۔۔
 بابا۔۔ میں آپکو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مدھم آواز میں سالار کے جواب نے ایک
 نشتر کی طرح اسے کاٹا تھا۔۔۔۔۔

اس نے تم سے وہ کہا جو میں نہ کہہ سکی۔ سالار نے اپنے کندھے پر اسکے ہاتھوں کی نرمی
 اور اسکے لفظوں کی گرمی کو بیک وقت محسوس کیا۔

میں کچھ ہفتوں تک آپریشن کروا رہا ہوں۔۔۔ دو ہفتوں میں یہاں سے واپس پاکستان
 جائیں گے تم لوگوں کو وہاں چھوڑ کر پھر امریکہ جاؤں گا سر جری کے لیے۔
 مجھے تمہیں ایک کام سونپنا ہے امامہ۔۔۔ سالار نے امامہ سے کہا۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کیا؟ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

ابھی نہیں بتاؤں گا آپریشن کے لیے جانے سے پہلے بتا دوں گا۔۔۔

سالار مجھے کوئی کام مت دینا۔۔۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ وہ روپڑی۔

کوئی بڑا کام نہیں ہے۔۔۔۔۔

میں کوئی آسان کام بھی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ اس نے ست جھٹکتے بے بسی سے کہا۔ وہ

ہنس پڑا۔

اپنی آٹو بائو گرانی لکھ رہا ہوں پچھلے کچھ سالوں سے۔۔ سوچتا تھا بڑھاپے میں پبلش
کراؤں گا۔۔ وہ خاموش ہوا۔۔ پھر بولنے لگا۔۔ وہ نامکمل ہے ابھی۔ لیکن تمہارے پاس
رکھوانا چاہتا ہوں۔۔۔ یہ چاروں ابھی بہت چھوٹے ہیں مجھے نہیں پتا آپریشن کا کیا نتیجہ
نکلے گا مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ آگے کیا ہونے والا ہے لیکن پیچھے جو کچھ ہو چکا ہے وہ لکھ
چکا ہوں میں اور چاہتا ہوں تم اسے ان چاروں کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لو۔۔ وہ اس
سے کھل کر یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ اسکے مرنے کے بعد وہ اسکے بچوں کے نہوش
سنجھانے پر ان سے انکے باپ کا تعارف ان ہی کے لفظوں میں کرائے۔۔۔

کتنے چیپٹر ز ہیں اس کتاب کے۔۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھا۔

سینتیس سال کی عمر میں پہلا چیپٹر لکھا تھا۔۔ پھر ہر سال ایک چیپٹر لکھتا رہا ہوں۔ ہر
سال ایک لکھنا چاہتا تھا۔۔ زندگی کے پہلے پانچ سال۔۔ پھر اگلے۔۔ پھر اس سے
اگلے۔۔ ابھی زندگی کے صرف چالیس سال ریکارڈ کر پایا ہوں۔۔ وہ بات کرتے
کرتے رکا۔۔ چیپٹر گنوائے بغیر وہ عمر گنوانے بیٹھ گیا تھا۔

چالیس کے بعد بھی تو زندگی ہے۔ اکتالیس۔۔ بیالیس۔۔ وہ بات کرتے کرتے

انگی۔۔۔۔۔

وہ جو ہے اسے میں ڈاکومنٹ نہیں کرنا چاہتا۔ تم کرنا چاہتی ہو تو کر لو۔۔

کہاں ہے کتاب؟۔۔ وہ یہ سب نہیں پوچھنا چاہتی تھی پھر بھی ہو چھ رہی تھی۔

اسی کمپیوٹر میں ہے۔۔ وہ کمپیوٹر آن کرنے لگا۔ اور ڈیسک ٹاپ پر پڑے ایک فولڈر کو

کھول کر اس نے امامہ کو دکھایا۔۔ فولڈر کے اوپر ایک نام چمک رہا تھا تاش۔۔

تاش؟؟ امامہ نے رندھی آواز میں پوچھا۔

نام ہے میری آٹو بائیو گرافی کا۔۔ وہ اب اسے فائلز دکھا رہا تھا۔

انگلش میں لکھی جانے والی آٹو بائیو گرافی کا نام اردو میں رکھو گے؟؟ وہ اس کا چہرہ دیکھ

رہی تھی۔

میری زندگی کو اس لفظ سے زیادہ بہتر کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ کیا فرق پڑتا ہے تم لوگوں

کے لیے لکھی ہے تم لوگ تو سمجھ سکتے ہو تاش کیا ہے۔۔۔۔۔

وہ صفحات کو سکرو ل ڈاؤن کر رہا تھا لفظ بھاگتے جا رہے تھے پھر غائب ہو رہے تھے بلکل

ویسے ہی جیسے اسکی زندگی کے سال غائب ہوئے تھے۔۔ پھر وہ آخری صفحے پر جا رہا

تھا۔ آدھا صفحہ لکھا ہوا تھا آدھا خالی تھا۔۔ سالار نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔۔ نم آنکھوں کیساتھ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

تم پڑھنا چاہو گی؟ اس نے مدھم آواز میں امامہ سے پوچھا۔۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

+++++-----+++++

وہ کتاب اس دن امامہ نے اسکے آفس جانے اور بچوں کے سکول واپس آنے سے پہلے ختم کر لی تھی۔۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی زندگی کو رقم کیا تھا۔ وہ سفائی کی حد تک صاف گوئی دکھا رہا تھا۔ اپنے سارے عیب ساری غلطیاں ساری گمراہیاں۔۔۔۔۔

اور پھر اسکی زندگی میں امامہ ہاشم نے کیا رول ادا کیا۔۔ اسکی اولاد نے کیا تبدیلی کی تھی اور اسکے باپ نے اسکے لیئے کیا کیا۔ اور اس رزق نے کیا تباہی کی تھی وہ بھی جو سود سے کمایا۔۔۔

آٹھویں چیپٹر کے آخری لائن میں امامہ نے ایک لائن لگاتے ہوئے اگلا صفحہ کھولا

تھا۔۔۔۔

سالار سکندر کی زندگی کے نویں چھپٹر کا آغاز۔۔۔

*****_+++++*****

تم نے کتاب پڑھی؟ اس رات سالار نے واپس آ کر سونے سے پہلے پوچھا۔

نہیں۔۔۔ اس نے فوراً کہا۔

مجھے اس کتاب کو اس کمپیوٹر سے ہٹا دینا چاہیے۔ سالار کو اچانک خیال آیا۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry کیوں؟ وہ حیران ہوئی۔

میں نہیں چاہتا جبریل اسے پڑھے وہ اکثر یہی کمپیوٹر استعمال کرتا ہے۔ تمہارے لیپ

ٹاپ میں محفوظ کر لیتا ہوں۔

جب بچوں کے لیے لکھ رہے ہو تو بچوں سے چھپانا کیوں چاہتے ہو؟

میں اس عمر میں انہیں یہ سب نہیں پڑھانا چاہتا۔

تو پھر مجھے بھی مت پڑھاؤ۔۔۔ امامہ نے کہا۔۔۔

میں یہ کتاب کبھی نہیں پڑھوں گی اور میں کبھی اپنے بچوں کو بھی یہ کتاب نہیں پڑھاؤں
گی۔ امامہ نے جیسے اعلان کیا۔

ٹھیک ہے مت پڑھنا۔ پبلش کروادینا۔۔۔۔

تم سمجھتے کیا ہو۔۔ دنیا کیا کرے گی تمہاری آٹو باؤ گرانفی پڑھ کر؟ بے بسی کا شدید احساس
تھا جو غصے میں بدلا تھا۔

وہ اس کے اس انداز پہ چونکا اور پھر مسکرا دیا۔

آج کی مہینوں بعد تمہیں مجھ پہ غصہ آیا ہے۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اس نے امامہ کو چھیڑا۔۔ اس نے بھی کی مہینوں بعد اسے چڑایا تھا اسی انداز میں جس
سے وہ چڑتی تھی۔۔

وہ۔ واش روم کا دروازہ کھول کر اندر گھس گی تھی۔۔ وہ روز صبح طے کرتی تھی کہ

اسے آج نہیں رونا۔۔ مگر ہر روز شام تک آنسو سب کچھ تہس نہس کر چکے

ہوتے تھے۔۔۔ وہ اب بھی وہاں اندر باتھ ٹب کے کونے پر بیٹھی بے آواز رہی

تھی۔۔۔

++-----+++++-----++-----

کنشاسا سے پاکستان آنے سے پہلے اس نے چاروں بچوں کو اکٹھا بٹھا کر سمجھایا تھا۔

ہم اب جہاں جا رہے ہیں وہ ہمارا گھر نہیں ہے وہاں ہم گیسٹ ہیں اور ہمیں وہاں جتنی

دیر رہنا ہے اچھے مہمانوں کی طرح رہنا ہے اور اچھے مہمان کیا کرتے ہیں؟؟

اچھے گیسٹ ڈھیر ساری چیزیں لاتے ہیں۔۔۔ مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں اور

جلدی چلے جاتے ہیں اور کوئی بھی کام نہیں کرتے ریسٹ کرتے ہیں۔۔۔ حمین نے

حسب عادت سبقت کرتے ہوئے جواب دیکر امامہ کو ایک ہی وار میں لاجواب کر دیا۔

اسے ہنسی آگئی۔۔۔ ماں کو ہنستے دیکھ کر حمین بے حد جذباتی ہو گیا۔

ہرا۔۔۔۔ میں جیت گیا۔۔۔ اس نے ہوا میں مکالہراتے ہوئے صحیح جواب بوجھ لینے کا

اعلان کیا۔۔۔

کیا اس نے ٹھیک کہا ہے؟ عنایہ کو جیسے یقین نہیں آیا۔۔۔

نو۔۔۔۔ امامہ نے کہا۔۔۔ حمین کے چہرے پر بے یقینی جھلکی۔۔۔

اچھے مہمان کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ کسی سے کوئی فرمائش نہیں کرتے۔ کسی چیز میں

نقص نہیں نکالتے۔ اور ہر کام میزبان سے اجازت لیکر کرتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کا

بوجھ میزبان پر نہیں ڈالتے۔۔۔ امامہ نے انہیں سمجھانے والے انداز میں کہا۔۔۔

اوہ مائی گاڈ۔۔۔ مئی میں اچھا گیسٹ نہیں ہونا چاہتا میں بس گیسٹ بننا چاہتا

ہوں۔۔۔ حمین نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔۔۔

ہم داد ادا دی کے گھر جا رہے ہیں اور ہمیں وہاں ایسے رہنا ہے جس سے انہیں شکایت یا

کوئی تکلیف نہ ہو۔۔۔ امامہ نے حمین کو جواب دیا وہ مطمئن نہ ہوا۔۔۔

اوکے۔۔۔۔۔ عنایہ ریسہ اور جبریل نے بیک وقت ماں کو اطمینان دلایا تھا۔۔۔

اور یم اپنے گھر کب جائیں گے؟ حمین نے سوال بدلہ اور امامہ کو چپ لگ گئی۔۔۔

ہم نیا گھر خریدیں گے۔۔۔ عنایہ نے جیسے اس چپ کا دفاع کیا۔۔۔۔۔

کہاں؟؟؟ حمین کو مکمل جواب چاہیے تھا۔

جہاں بابا ہونگے۔۔۔ جبریل نے اس بار اسے مکمل جواب دینے کی کوشش کی۔

اور بابا کہاں ہونگے؟ حمین نے ایک اور منطقی سوال پوچھا جو امامہ کو چھباتا تھا۔۔۔

ابھی ہم پاکستان جا رہے ہیں پھر جہاں بابا جائیں گے ہم وہاں چلے جائیں

جیسے خلق میں آگیا تھا۔

میں جانتا ہوں آپ اپ سیٹ ہو۔ وہ کہہ رہا تھا اور امامہ جیسے کچھ اور زمین میں
گڑی۔۔۔ وہ اب اسکے اور قریب آگیا تھا۔۔۔ پلیز آپ اپ سیٹ نہ ہو۔۔۔ اس نے ماں کی
کمر کے گراف اپنے بازو لپیٹتے ہوئے کہا۔۔۔ جب آپ روتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں
لگتا۔۔۔۔

تم کیا جانتے ہو؟ وہ اتنا چھوٹا سا جملہ ادا نہیں کر پار ہی تھی۔۔۔ وہ صرف اسے

تھکنے لگی۔۔۔

دادا ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔ وہ اب اسے تسلی دینے لگا۔ امامہ کو لگا جیسے اس نے سننے میں

غلطی کر دی ہے۔ وہ شاید بابا کہہ رہا تھا۔۔۔

میں نے دادا سے پوچھا۔۔۔ امامہ مزید الجھی۔

کس سے کیا پوچھا؟

دادا سے پوچھا انہوں نے کہا وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔

دادا کو کیا ہوا؟ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

دادا کو برین ٹیومر نہیں ہوا۔ دادا کو الزائمر ہے۔۔۔ لیکن وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔

امامہ کو دماغ بھک سے اڑا تھا۔

-----* * * * *-----

سالار کو کچھ مت بتانا۔۔۔

پاکستان پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام جو کام تھا وہ امامہ نے یہی کیا تھا اس نے سکندر عثمان سے اس انکشاف کے بارے میں پوچھا تھا جو سکندر عثمان نے حمین کے برین ٹیومر کے حوالے سے سوالوں کے جواب میں کیا تھا اور انہوں نے جواباً سے بتایا تھا۔ کہ ایک مہینے پہلے روٹین کے ایک میڈیکل چیک اپ میں انکی اس بیماری کی تشخیص ہوئی تھی۔۔۔ لیکن انہیں سب سے پہلے پریشانی یہ تھی کہ کہی امامہ نے سالار سے اسکا ذکر نہ کیا ہو۔۔۔ اس لیے انہوں نے پہلی بات یہی بتادی۔

میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا اسکا آپریشن ہونے والا ہے۔۔۔ وہ اب بھی اپنے سے زیادہ سالار کے لیے فکر مند تھا۔۔۔

پاپا میں نہیں بتاؤں گی اسے۔۔۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ وہ پریشان ہو۔ امامہ نے انہیں

تسلی دی۔۔ آپ جانتے ہیں آپ سے بہت اٹیچڈ ہے وہ اپنی بیماری بھول جائے
گا۔۔۔۔۔

جانتا ہوں۔۔ سکندر نے ایک رنجیدہ مسکراہٹ سے سر ہلایا۔۔۔ اس عمر میں اپنی
بیماری کی فکر نہیں مجھے میں نے زندگی گزار لی اپنی اوت اللہ کا شکر ہے بہت اچھی
گزار رہی ہے۔ اس کو صحت مند رہنا چاہیے۔۔ انہوں نے آخری جملہ عجیب حسرت
سے کہا۔۔

اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسکی بیماری بھی خود لیتا اور اپنی زندگی کے جتنے سال باقی
ہیں وہ بھی اسے دے دیتا۔۔۔

امامہ نے انکے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔۔

آپ بس اس کے لیے دعا کریں پاپا۔ ماں باپ کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔۔۔

دعا کے علاوہ۔ اور کوئی کام نہیں ہے مجھے۔۔ میں سوچتا تھا اس نے مجھے نو عمری اور

جوانی میں بہت ستایا تھا۔۔۔ لیکن جو میرے بڑھاپے میں ستا رہا ہے یہ۔۔۔۔۔ وہ بات

مکمل نہ کر سکے۔۔۔ رو دیے۔۔۔

ایک کام کریں گے پاپا؟ امامہ نے انکا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

کیا؟

اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی اتارتے ہوئے امامہ نے انکے ہاتھ کھولتے ہوئے انکی ہتھیلی پر وہ انگوٹھی رکھ دی۔۔۔

اسے بیچ دیں۔۔۔۔۔ وہ اسکا چہرہ دیکھنے لگے۔۔۔

کیوں؟؟ انہوں نے بمشکل کہا۔۔۔

مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔۔۔

کتنے؟؟

جتنے مل سکیں۔۔۔

امامہ۔۔۔۔۔

انہوں نے کچھ کہنا چاہا امامہ نے روک دیا۔۔۔

انکار مت کریں۔۔۔ یہ کام میں آپکے علاوہ کسی اور سے نہیں کروا سکتی۔۔۔۔۔ وہ نم

آنکھوں کیساتھ چپ چاپ امامہ کو دیکھتے رہے۔۔۔

اپنے آپریشن سے دو ہفتے پہلے نیویارک میں سالار سکندر اور SIF کے بورڈ آف گورنرز نے پہلے گلوبل اسلامک انویسٹمنٹ فنڈ کے قیام کا اعلان کر دیا۔۔

پانچ ارب روپے کے سرمایہ سے قائم کیا گیا

Samar investment fund

یہ وہ پہلی اینٹ تھی اس مالیاتی نظام کی جو سالار اور اسکے پانچ ساتھی اگلے بیس سالوں میں دنیا کی بڑی فنانشل مارکیٹوں میں سوڈ پر مبنی نظام کے سامنے لیکر آنا چاہتے تھے۔ اگر سالار کی بیماری کا انکشاف میڈیا پر اتنے زور و شور سے نہیں کیا جاتا تو ایس آئی ایف کے بورڈ آف گورنرز اس فنڈ کا آغاز ایک ارب ڈالر کے سرمایہ سے دنیا کے پچاس ممالک میں بیک وقت کرتے اور وہ ٹارگٹ مشکل ضرور تھا نا ممکن نہیں تھا۔۔۔ سالار کی بیماری نے جیسے پہلے ہی قدم پر انکی کمر توڑ دی تھی۔۔۔ لیکن اسکے باوجود بورڈ آف گورنرز ٹوٹا نہیں تھا۔۔۔ وہ اکٹھے رہے تھے۔۔۔ جڑے رہے تھے۔۔۔ کیونکہ ان

چھ میں سے کوئی شخص بھی یہ کام کاروبار کے طور پر نہیں کر رہا تھا۔۔۔ وہ ایک اندھی کھائی میں کودنے کے مجاہدانہ جذبے سے کر رہے تھے۔۔۔۔

سالار سکندر عامل کلیم موسیٰ بن رافع ابوذر سلیم علی اکمل اور راکن مسعود پر مشتمل ایس ای ایف کا بورڈ آف گورنرز دنیا کے بہترین بورڈ آف گورنرز میں گردانا جاسکتا تھا۔۔۔۔ وہ چھ کے چھ افراد اپنی فیلڈ کا پورا ہاؤس تھے۔۔۔۔

یہ ایک بڑے کام کی طرف ایک چھوٹا قدم تھا۔ اتنا چھوٹا قدم کے بڑے مالیاتی اداروں نے اسکو سنجیدگی سے لیا بھی نہیں۔۔۔ فنانشل میڈیا نے اس پر پروگرامز کیئے اور خبریں لگائی دلچسپی دکھائی لیکن کسی نے بھی اسے آئندہ آنے والے سالوں کے لیئے اپنے لیئے کوئی خطرہ نہیں سمجھا تھا۔

ایک قابل عمل مالیاتی نظام کے طور پر دنیا میں موجود نظام کو ٹکر دینے کے لیئے ایس آئی ایف کو فنانشل viability دکھانی تھی۔۔۔ جو ابھی کسی کو نظر نہیں آئی تھی۔۔۔ صرف ان چھ دماغوں کے علاوہ جو اسکے پیچھے تھے۔۔۔ ایس آئی ایف کے قیام کا اعلان اپنے کندھوں پر لدے ایک بھاری بوجھ کو ہٹا دینے جیسا تھا۔۔۔۔ کم از سالار کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

امریکہ میں ایک ہفتے کے دوران اس نے درجنوں میٹنگز اور سیمینارز اٹینڈ کی تھی اور کچھ یہی حال بورڈ آف گورنرز کے دوسرے ممبرز کا بھی تھا۔ ایک ہفتہ بعد اسے پاکستان جا کر اپنے بچوں سے ملنا تھا اور پھر واپس آ کر امریکہ میں سرجری کروانی تھی۔ اسکا شیڈول اپائنٹمنٹس سے بھرا تھا۔

ایک ہفتہ کے اختتام تک وہ ایس آئی ایف کے ان سرمایہ کاروں میں سے کچھ کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو سالار کی بیماری کی خبر سن کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔۔۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔۔۔ بارش کا وہ پہلا قطرہ جسکا ان سب کو انتظار تھا۔۔۔ سالار ایس آئی ایف کے قیام کے لیے تو سرمایہ کار لانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ ذاتی طور پر خود اس میں کوئی بڑی انویسمنٹ نہیں کر سکا تھا۔ کچھ اثاثے جو اسکے پاس تھے انہیں بیچ کر بھی اسکا حصہ کروڑ سے بڑھ نہ سکا تھا۔۔۔

مگر اس فنڈ کی اناؤنسمنٹ کے ایک دن بعد سکندر نے اسے امریکہ فون کیا تھا۔

میں پانچ کروڑ کی انویسمنٹ کرنا چاہتا ہوں ایس آئی ایف میں۔۔۔ انہوں نے ابتدائی گپ شپ کے بعد کہا۔

آپ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے؟ وہ چونکا۔

باپ کو غریب سمجھتے ہو تم۔۔۔ وہ خفا ہوئے۔۔۔ سالار ہنس پڑا۔

اپنے سے زیادہ نہیں۔۔۔

تم سے مقابلہ نہیں ہے میرا۔۔۔ سکندر نے بے نیازی سے کہا۔۔۔ تمہیں میرے برابر

آنے کے لیے دس بیس سال لگیں گے۔۔۔

شاید نہ لگے۔۔۔

چلو دیکھیں گے۔۔۔ ابھی تو مجھے بتاؤ یہاں پاکستان میں لوکل آفس اور کیا طریقہ کار

ہے۔۔۔ انہوں نے بات بدلی تھی۔۔۔

آپ نے اب کیا بیچا ہے؟ سالار نے اسے بات بدلنے نہیں دی۔۔۔

فیکٹری۔۔۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔۔۔

اس عمر میں میں نہیں سنبھال سکتا اب۔۔۔ کامران سے بات کی۔۔۔ وہ اور اسکا ایک

دوست لینے پر تیار ہو گئے۔۔۔ مجھے ویسے بھی فیکٹری میں سب کا حصہ دینا تھا۔ وہ ایسے

اطمینان سے بات کر رہے تھے جیسے کوئی معمولی بات ہو۔۔۔

آپ کام کرتے تھے پاپا۔۔۔ آپ نے چلتا ہوا بزنس کیوں ختم کر دیا۔۔۔ کیا کریں گے اب آپ۔۔۔ وہ بے حد ناخوش ہوا تھا۔۔۔

کروں گا کچھ نہ کچھ۔۔۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔۔۔ اور نہیں بھی کروں گا تو بھی کیا ہے۔۔۔ تم باپ کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے کیا۔ باپ ساری عمر اٹھاتا رہا ہے۔ وہ اسے ڈانٹ رہے تھے۔

آپ نے میرے لیے کیا ہے یہ سب؟ سالار رنجیدہ تھا۔

ہاں۔۔۔۔ اس بار سکندر نے بات گھمائے پھر اے بغیر کہا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

پاپا مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا آپکو۔۔۔ مشورہ کرنا چاہیے تھا۔۔۔

تم زندگی میں کونسا کام میرے مشورے سے کرتے رہے ہو۔ ہمیشہ صرف اطلاع دیتے

ہو۔۔۔ وہ بات کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ محفوظ نہیں ہوا۔ اسکا دل عجیب طرح سے بوجھل ہوا تھا۔۔۔

کیا ہوا؟؟ سکندر نے اسکی خاموشی کو کریدا۔

آپ مجھ پر اتنے احسان کیوں کرتے ہیں۔ کب تک کرتے رہینگے۔ وہ کہے بنانا رہ

سکا۔۔۔

جب تک میں زندہ ہوں۔۔ سکندر اسکی زندگی کی بات نہیں کر سکے تھے۔

آپ مجھ سے زیادہ جیسے گے۔۔۔۔

وقت کا کس کو پتا ہوتا ہے۔۔ سکندر کو لہجہ پہلی بار سالار کو عجیب لگا۔۔

-----**-*-----

جبریل تم ان سب کا خیال رکھ لو گے؟؟ امامہ نے شاید کوئی دسویں بار اس سے پوچھا تھا

جی می میں رکھ لوں گا۔ یوڈونٹ وری۔۔ اور اس نے دسویں بار ایک ہی جواب دیا۔

وہ سالار کی سر جری کے وقت اسکے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اور سالار کے بے حد منع

کرنے کے باوجود وہ پاکستان میں بچوں کے پاس رہنے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔

اس وقت تمہیں میری ضرورت ہے بچے اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ وہ میرے بغیر ہفتہ

نہیں گزار سکتے۔۔ اس نے سالار سے کہا۔

اور اب جب سیٹ کنفرم ہوگی تھی تو اسے بچوں کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ وہ پہلی بار

انہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہی تھی وہ بھی اتنی لمبی مدت کے لیے۔۔

دادی بھی پاس ہوگی تمہارے انکا بھی خیال رکھنا۔۔

جی رکھوں گا۔۔۔

اور ہوم ورک کا بھی۔۔ ابھی تم سب کے سکولز نئے ہیں۔ تھوڑا ٹائم۔ لگے گا ایڈجسٹ

ہونے میں۔ چھوٹے بہن بھائی گھبرائے تو تم سمجھانا۔

جی۔۔۔۔۔

میں اور تمہارے پاپاروزبات کرینگے تم لوگوں سے۔

آپ واپس کب آئیں گی؟ جبریل نے اتنی دیر میں پہلی بار ماں سے پوچھا۔

ایک مہینہ تک۔۔ شاید تھوڑا زیادہ وقت لگے گا۔ سرجری ہو جائے تب پتا لگے گا

۔۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

زیادہ سے زیادہ بھی رکھیں گے تو دوسرے دن تک رکھیں گے اگر کوئی کمپلیکیشن نہ

ہوئی ورنہ دوسرے دن پاپا گھر آجائیں گے۔

امامہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔۔ تمہیں کیسے پتا؟

آئی ریڈا باؤٹ اٹ۔۔۔ اس نے ماں سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

کیوں؟؟

انفارمیشن کے لیئے۔۔ جبریل نے سادگی سے کہا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر نظریں ہٹالی۔۔۔ وہ اپنے ہینڈ بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگی۔۔۔ ایک دم اسے محسوس ہوا جیسے جبریل اسکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ امامہ نے ایک لمحہ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔۔۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔۔

کیا ہوا؟؟ اس نے جبریل سے پوچھا۔۔۔ اس نے جو اب امامہ کی کنپٹی کے قریب نظر آنے والے ایک سفید بال کو اپنی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ آپکے کافی بال سفید ہو گئے ہیں۔۔۔۔ وہ ساکت اسے دیکھتی رہی۔۔۔

امامہ نے اسکے ہاتھ سے اپنا بال چھڑا کر اسکا ہاتھ چوما۔۔۔ اب گرے ہیئر کے بارے میں پڑھنا شروع مت کرنا۔ امامہ نے۔ آنکھوں کیساتھ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔۔۔۔

وہ جھینپا پھر مدھم آواز میں بولا۔

میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں۔۔ سٹریس ان ہیلڈی ڈائٹ مین ریزن ہیں۔۔۔

وہ حمین نہیں جبریل تھا۔ سوال سے پہلے جواب ڈھونڈنے والا۔۔
 وہ اسکا چہرہ دیکھتی رہی۔۔ ایک وقت وہ تھا جب اسکا کوئی نہیں رہا تھا اور ایک وقت یہ تھا
 جب اسکی اولاد اسکے سفید بالوں سے بھی پریشان ہو رہی تھی۔۔۔۔

ساڑھے تین کروڑ کا وہ چیک دیکھ کر وہ کچھ دیر ہل نہ سکا تھا۔ وہ لفافہ امامہ نے کچھ دیر
 پہلے اسے دیا تھا۔ اس وقت وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اور لفافہ کھولتے ہوئے
 اس نے امامہ سے پوچھا۔۔
 اس میں کیا ہے؟ سوال کا جواب ملنے سے پہلے اسکے نام کاٹا گیا وہ چیک اس کے ہاتھ میں
 آ گیا تھا۔۔ سالار نے سراٹھا کر امامہ کو دیکھا۔

میں یہ۔ چاہتی ہوں کہ تم یہ رقم لے لو۔۔ اپنے پاس رکھو۔ یا ایس آئی ایف میں
 انویسٹ کرو۔۔

تم نے وہ انگوٹھی بیچ دی؟ سالار نے بے ساختہ پوچھا۔۔۔ وہ ایک لمحہ کچھ بول نہ سکی
 پھر مدھم آواز میں کہا۔۔

میری تھی۔۔۔ بیچ سکتی تھی۔

بیچنے کے لیے تمہیں نہیں دی تھی۔۔۔ وہ خفا تھا یا شاید رنجیدہ۔۔۔ تم چیزوں کی قدر نہیں کرتی۔۔۔ وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے امامہ نے ست ہلایا۔

ٹھیک کہتے ہو۔ میں چیزوں کی قدر نہیں کرتی انسانوں کی کرتی ہوں۔۔۔

انسانوں کی بھی نہیں کرتی۔۔۔ سالار خفا تھا۔

صرف تمہاری نہیں کی شاید اسی لیے سزا ملی۔۔۔ نمی آنکھوں میں آئی تھی۔۔۔ آواز

کیساتھ ہاتھ بھی کپکپایا۔۔۔ خاموشی آئی، رکی، ٹوٹی۔۔۔

تم بے وقوف ہو۔۔۔ وہ اب خفا نہیں تھا۔ اس نے چیک لفافے میں ڈال کر اسی طرح میز پر رکھ دیا۔۔۔

تھی۔۔۔ امامہ نے کہا۔

اب بھی ہو۔۔۔ سالار نے اصرار کیا۔۔۔

عقل مندی کا کرنا کیا ہے اب میں نے۔۔۔ اس نے جو ابابو چھا۔

یہ رقم اب اپنے پاس رکھو۔۔ بہت سی چیزوں میں ضرورت پڑے گی تمہیں۔۔۔ سالار نے کہا۔

میرے پاس کافی رقم ہے اکاؤنٹ خالی تو نہیں۔ بس میں چاہتی تھی کہ میں ایس آئی ایف میں کنٹری بیوٹ کروں۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی۔۔۔

زیور بیچ کر کنٹری بیوٹ نہیں کروانا چاہتا میں تم سے۔۔۔ تم صرف دعا کروا سکے لیئے۔ زیوت سے صرف پیسہ مل سکتا ہے۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں ویسے بھی زیور نہیں پہنتی سالوں سے لا کر میں پڑا ہے سوچ رہی تھی وہ بھی۔۔۔۔۔

سالار نے اسکو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ بے حد سختی سے کہا۔

تم اس زیور کو کچھ نہیں کرو گی وہ بچوں کے لیئے رکھا رہنے دو۔ میں کچھ نہیں لوں گا اب تم سے۔ وہ خاموش ہو گئی۔۔۔

سالار نے مگ رکھ دیا اور اسکی طرف مڑ کر جیسے بے بسی سے کہا۔۔

کیوں کر رہی ہو یہ سب کچھ؟

کچھ کہے بنا اسکے بازو پر ماتھا ٹکائے اس نے ہاتھ اسکے گرد لپیٹ لیے۔۔۔ وہ پہلا موقع تھا جب سالار کا احساس ہوا کہ جوں جوں اسکے آپریشن کی تاریخ قریب آرہی تھی وہ اس سے زیادہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔۔۔

تم میرے ساتھ مت جاؤ امامہ یہی رہو بچوں کیساتھ۔۔۔ سالار نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ انکو اکیلا چھوڑ کر تم میرے ساتھ کیسے رہو گی۔ وہ پریشان ہو جائیں گے۔۔۔

نہیں ہونگے۔۔۔ میں نے انہیں سمجھا دیا ہے۔۔۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

وہاں فرقان ہو گا میرے ساتھ پاپا ہونگے تمہیں یہی رہنا چاہیے بچوں کے پاس۔۔۔ سالار نے دوبارہ اصرار کیا۔

تمہیں میری ضرورت نہیں ہے؟ وہ خفا ہوئی۔

ہمیشہ۔۔۔ سالار نے اسکا سر چوما۔۔۔

ہمیشہ؟؟

میں نے کتاب پڑھ لی ہے۔ اس نے بلاخراعترا ف کر لیا۔

وہ چونکا نہیں تھا۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔

کوئی اپنی اولاد کے لیے ایسا تعارف چھوڑ کے جاتا ہے؟ اس نے جیسے شکایت کی۔

سچ نہ لکھتا؟ وہ ہو چھ رہا تھا۔

جس بات کو اللہ نے معاف کر دیا اسے بھول جانا چاہیے۔۔۔

پتا نہیں معاف کیا بھی ہے یا نہیں۔۔۔ یہ۔ تو اللہ جانتا ہے۔

اللہ نے پردہ تو ڈال دیا ہے نا۔۔۔ میں نہیں چاہتی میری اولاد یہ پڑھے۔۔۔ کہ انکے باپ

نے زندگی میں ایسی غلطیاں کی ہیں جو انکی نظروں میں تمہارا احترام ختم کر دے۔۔۔ وہ

اس سے کہہ رہی تھی۔۔۔

جھوٹ بولتا اور لکھتا کہ میں پارسا پیدا ہوا تھا اور فرشتوں جیسی زندگی گزارا؟؟

نہیں۔۔۔ بس انسانوں جیسی گزارا۔

وہ بے اختیار ہنسا۔۔۔ شیطان لگ رہا ہوں کیا اس کتاب میں؟

بات نہیں جسے پڑھ کر تمہاری اولاد تمہارے جیسا بننا چاہے۔ میں چاہتی ہوں تم اسے
آب حیات سمجھ کر لکھو تاکہ اسے پڑھ کر تمہاری اولاد ہی نہیں بلکہ کوئی بھی پڑھے تو
تمہارے جیسا بننا چاہے۔۔۔ وہ اس سے کہتی رہی۔۔۔

میرے پاس اب شاید مہلت نہیں اتنی۔ سالار نے مدھم آواز میں کہا۔
تم مانگو۔۔۔ جو چیز اللہ میرے مانگنے پر نہیں دیتا تمہارے مانگنے پر دیتا ہے۔ سالار نے
اسے عجیب لہجے میں کہا۔

مجھے یقین ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے سالار کا ہاتھ تھاما۔۔۔
مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔ وہ عجب رنجیدگی سے مسکرایا۔۔۔ ابھی تو بہت کچھ ہے جو
ہمیں ساتھ کرنا ہے۔۔۔ ساتھ حج کرنا ہے۔ تمہارے لیے اک گھر بنانا ہے۔۔۔۔۔
امامہ نے سر جھکا لیا۔۔۔ وہ بھی اندھیرے میں صرف جگنو چاہتی تھی اندھیرا نہیں

آپریشن ٹیبل پر لیٹے ۶ نیسٹ تھیز یا لینے کے بعد بے ہوشی میں جانے سے پہلے سالار ان
سب کے بارے میں سوچتا رہا جن سے وہ پیار کرتا تھا۔ امامہ جو آپریشن تھیٹر سے باہر

بیٹھی تھی سکندر عثمان جو اس عمر میں بھی اسکے منع کرنے کے باوجود اسکو اپنی نظروں کے سامنے سر جری کے لیے بھیج رہے تھے۔۔ اسکی ماں جو اسکے بچوں کو سنبھالے پاکستان میں بیٹھی تھی۔

اور اسکی اولاد جبریل حمین عنایہ رئیسہ اسکی نظروں کے سامنے باری باری ایک ایک کا چہرہ آرہا تھا۔ چہرے آوازیں سوچ آہستہ آہستہ مدھم ہونا شروع ہوئی اور پھر غائب ہوتی چلی گئی۔۔

چار گھنٹے کا آپریشن آٹھ گھنٹے تک چلا گیا تھا۔ سکندر فرقان اور سالار کے دونوں بڑے بھائی وہاں اسکو تسلیاں دے رہے تھے اور وہ گم صم صرف دعائیں کرتی رہی تھی۔ آٹھ گھنٹے میں وہ اپنی فیملی کے اصرار کے باوجود کچھ کھاپی نہ سکی۔۔۔ وہ پچھلی ساری رات بھی جاگتی رہی تھی .

اس آٹھ گھنٹوں میں پتا نہیں اس نے کتنی دعائیں کی و ظیفیں کیسے اللہ کے رحم کو کتنی بار پکارا اس نے گنتی نہیں کی تھی۔۔۔

آپریشن کا بڑھتا ہوا دورانیہ اسکی تکلیف ازیت اور خوف کو بڑھا رہا تھا۔۔۔
 آٹھ گھنٹے بعد بلا آخر اسے آپریشن کامیاب ہونے کی اطلاع تو مل گئی تھی ڈاکٹرز نے انکا
 ایک ٹیومر تو ختم کر دیا تھا لیکن دوسرا ختم نہ کر سکے اسے سرجری کے ذریعے ریمو کرنا
 انتہائی خطرناک تھا۔ وہ بے حد نازک جگہ پر تھا۔۔۔

آٹھ گھنٹے بعد امامہ اور سکندر عثمان نے اسے دیکھا تھا۔ وہ ابھی ہوش میں نہیں
 تھا۔۔۔ ہوش میں آنے کے بعد ہی ڈاکٹرز آپریشن کی صحیح طرح کامیابی مناسکتے
 تھے۔ جب وہ ہوش میں آنے کے بعد بات چیت شروع کرتا اپنی فیملی کو پہچانتا۔۔۔ اپنے
 ذہن کے متاثر نہ ہونے کا ثبوت دیتا۔۔۔ امامہ ایک دریا پار کر آئی تھی اب آگے ایک
 اور دریا کا سامنا تھا۔ امامہ بہت دیر تک اسے نہ دیکھ سکی۔۔۔ تاروں اور ٹیوبز میں جکڑا ہوا
 وہ اسے دیکھنے کی کوشش کرنے کے باوجود اس پر نظر نہ جما سکی وہ وہاں سے باہر
 آگئی۔۔۔

وہ لوگ اب اسپتال میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اسپتال سے
 واپس اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ میں آنا پڑا۔۔۔ سکندر عثمان اسکے ساتھ تھے سالار
 کے دونوں بھائی اور فرقان اسپتال کے قریب اپنے کچھ دوستوں کے پاس رہ رہے

تھے۔۔ سکندر عثمان کو انکے کمرے میں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آئی۔ وہاں عجیب
 سناٹا تھا یا شاید وحشت تھی۔۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ سونا چاہتی تھی پر سونہ
 سکی۔ اسکے سمارٹ فون پر جبریل سکائپ پر آن لائن نظر آ رہا تھا۔ وہ بے اختیار اسے کال
 کرنے لگی۔

بابا کیسے ہیں۔۔۔ اس نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال کیا۔

وہ ٹھیک ہیں آپریشن ٹھیک ہو گیا ڈاکٹر زاب انکے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے
 ہیں۔۔ وہ اسکو بتانے لگی۔

آپ پریشان نہ ہو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دے رہا تھا۔

جبریل تم تلاوت کرو کسی ایسی سورۃ کی کہ مجھے نیند آجائے۔۔ وہ اولاد کے سامنے اتنی
 بے بس اور کمزور ہو کر نہیں آنا چاہتی تھی لیکن ہوگی تھی۔۔۔۔

جبریل نے لیپ ٹاپ کی سکرین اور اسکا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔۔

آپ کو سورہ رحمان سناؤں؟؟

ہاں۔۔۔۔

او کے۔۔۔ میں وضو کر کے آتا ہوں۔۔۔ آپ بستر پہ لیٹ جائے۔۔۔ وہ پچھلے دو دن میں پہلی بار مسکرائی تھی۔۔۔۔۔

مہی آپ سو گئی؟ اس نے جبریل کی آواز پر ہڑبڑا کے آنکھیں کھولی۔۔۔

نہیں۔۔۔ امامہ نے کہا۔

میں شروع کروں؟ جبریل نے کہا۔

ہاں۔۔۔۔ سر پر ٹوپی رکھے ہاتھ سینے پر باندھے وہ اپنی خوبصورت آواز میں سورہ رحمان کی تلاوت کر رہا تھا۔۔۔ اسے سالار سکندر یاد آنا شروع ہو گیا تھا وہ اس سے یہی سورہ سنتی تھی اور جبریل کو یہ بات بھی یاد تھی۔۔۔ دس سال کا جبریل اس سورہ کی تلاوت کرتے ہوئے اپنی ماں کو مسحور اور دم بخود کر رہا تھا۔ اسکا جیسے دل پگھل رہا تھا۔

اور تم اپنے رب کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔۔۔

وہ پڑھتا رہا اور اسکا دل بھر آیا۔۔۔ بے شک اللہ کی نعمتیں بے شمار تھی وہ شکر ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی نعمت وہ اولاد تھی جس کی آواز میں اللہ کا وہ اعلان اسکے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

مئی۔۔۔ جبریل نے تلاوت ختم کرنے کے بعد بے حد مدھم آواز میں اسے پکارا۔ اسے یوں لگا جیسے تلاوت سنتے ہوئے وہ سوگی نہیں۔ وہ سوئی نہیں تھی۔ لیکن سکون میں بھی جیسے کسی نے اسکے سر اور کندھوں کا بوجھ اتار کر اسے ہلکا کر دیا ہو

جبریل تم عالم بننا۔ تمہاری آواز میں بھت تاثیر ہے۔۔ اس نے جبریل سے کہا۔

مئی مجھے نیوروسرجن بننا ہے۔ امامہ نے آنکھیں کھولی وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

میری خواہش ہے کہ تم عالم۔ بنو۔ امامہ نے اس بار زور دے کر کہا۔۔ وہ جانتی تھی وہ

نیوروسرجن کیوں بننا چاہتا ہے۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

حمین زیادہ اچھا عالم بن سکتا ہے میں نہیں۔۔۔۔۔ وہ الجھا جھجکا۔۔۔

تم زیادہ لائق اور قابل ہو بیٹا۔۔

سوچوں گا۔۔ آپ سو جائیں۔۔ اس نے ماں سے بحث نہیں کی۔۔ بات بدل دی۔۔

وہ دس سال کا تھا جب اسکے باپ کی موت ہوئی۔ اور اس موت نے اسکی پوری فیملی کو ہلا کر رکھ دیا۔۔ باپ کی موت اچانک ہوئی تھی اور وہ اس سے سنبھل نہ سکا۔۔ اگلے کئی

سال۔۔۔ وہ تعلیم میں دلچسپی لینے زندگی میں کچھ کرنے اور بڑا نام بنانے کے خاتمے کا سال تھا اور یہی وہ سال تھا جب اس نے اپنے باپ کے ایک اچھے جاننے والے اور انکے ہمسایہ میں رہنے والے خاندان میں بہت زیادہ آنا جانا شروع کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے دنیا کے ہر مذہب میں دلچسپی لینا شروع کی۔۔۔

گرینڈ حیات ہوٹل کا بال روم اس وقت سپیلنگ بی کے 92 ویں مقابلے کے دو فائنلسٹ سمیت دیگر شرکاء کے والدین بہن بھائیوں اور اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے موجود لوگوں سے کچھ کچ بھرا ہونے کے باوجود اس وقت پن ڈراپ سائنس کا منظر پیش کر رہا تھا۔۔۔ دونوں فائنلسٹ کے درمیان راؤنڈ فورٹین کھیلا جا رہا تھا۔ تیرہ سالہ نینسی اپنا لفظ اسپیل کرنے کے لیے اس وقت اپنی جگہ پر آچکی تھی۔ امریکہ کی مختلف ریاستوں کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں اسپیلنگ بی کے مقامی مقابلے جیت کر آنے والے پندرہ سال سے کم عمر کے بچے اس آخری راؤنڈ کو جیتنے کے لیے سر ہڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

Sassafras

نینسی نے رکی ہوئی سانس کیساتھ پروناؤ نسر کا لفظ سنا۔ اور پروناؤ نسر سے لفظ دہرانے کو کہا۔۔ اس نے دہرایا۔۔ وہ چمپیسن شپ ورڈز میں سے ایک تھا۔ لیکن فوری طور پر اسے یہ یاد نہ آسکا۔۔۔۔

نو سالہ دوسرا فائنلسٹ اپنی کرسی پر بیٹھا۔ نینسی کا ریگولر ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ اس نے لفظ اسپیل کرنا شروع کیا۔۔ s.a.s.s پہلے چار لیٹرز بتانے کے بعد وہ ایک لمحہ کو رکی۔۔ زیر لب اس نے باقی لیٹرز دہرائے اور پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

A.f.r
NEW ERA MAGAZINE

وہ ایک بار پھر رکی۔ دوسرے فائنلسٹ نے بیٹھے بیٹھے زیر لب آخری دو لیٹرز کو دہرایا U.s.a اور نینسی نے بھی بالکل اس وقت یہی دو لیٹرز بولے اور پھر بے یقینی سے اس گھنٹی کو بجاتے سنا جو اسپیلنگ کے غلط ہونے پر بجتی تھی۔۔ حیرت صرف اس کے چہرے پر نہیں تھی اس دوسرے فائنلسٹ کے چہرے پر بھی تھی۔۔ پروناؤ نسر اب درست اسپیلنگ دہرا رہا تھا۔

تقریباً فٹ ہوتی رنگت کیساتھ نینسی نے مقابلے کے شرکاء کے لیے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔۔ یہ رنر اپ کو کھڑے ہو کر داد

دی جا رہی تھی نو سالہ فائنلسٹ بھی اسکے لیے کھڑا ہو کرتالیاں بجا رہا تھا۔۔ ہال میں موجود لوگ دوبارہ اپنی نشست سنبھال چکے تھے اور دوسرا فائنلسٹ مانگ کے سامنے آچکا تھا۔ نینسی نے کسی موہوم امید کے تحت اسے دیکھنا شروع کیا۔۔ اگر وہ اپنے لفظ کو مس اسپیل کرتا تھا وہ دوبارہ فائنلسٹ میں آجاتی۔۔۔

اسٹیج پر اب وہ نو سالہ فائنلسٹ تھا۔ اپنی شرارتی مسکراہٹ اور گہری سیاہ چمکتی آنکھوں کیساتھ۔۔ اس نے چیف پروناؤنسر کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔۔ جو نا تھن جو اب مسکرایا تھا۔۔ وہ اس چیمپئن شپ کو دیکھنے والے کراؤڈ کا سویٹ ہارٹ تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔۔۔

Cappelletti

جو نا تھن نے لفظ ادا کیا۔

اس فائنلسٹ کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ آئی جیسے وہ اپنی ہنسی کو کنٹرول کر رہا ہو۔۔ اسکی آنکھیں پہلے کلاک وائس پھر اینٹی کلاک وائس گھومنا شروع ہو گئی تھی۔۔ ہال میں کچھ کھلکھلاہٹیں ابھری۔۔ اس نے اپنا ہر لفظ سننے کے بعد ایسا ہی ری ایکٹ کیا تھا جھینچی ہوئی مسکراہٹ اور گھومتی ہوئی آنکھیں۔۔۔ کمال کی خود اعتمادی

تھی۔ کی دیکھنے والوں نے اسے داد دی۔

Your finish time starts.

اسے ان آخری تیس سیکنڈز کے شروع ہونے کی اطلاع دی گئی جس میں اس نے اپنا لفظ اسپیل کرنا تھا۔ اسکی آنکھیں گھومنا بند ہوئی۔

Cappelletti

اس نے ایک بار پھر اپنے لفظ کو دہرایا۔ اور پھر اسپیل کرنا شروع کر دیا۔

NEW ERA MAGAZINE.COM
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

C,a,p,p,e,l,l

وہر کا اور پھر ایک سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ اسپیل کرنا شروع کیا۔

E.t.t.i

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اسپیلنگ بی کا چیمپئن اب صرف ایک لفظ کے فاصلے پر تھا۔

تالیوں کی گونج تھمنے کے بعد جو نا تھن نے اسے آگاہ کیا کہ اب اسے ایک اضافی لفظ

اسپیل کرنا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔۔۔۔ اس لفظ کو اسپیل نہ کر سکنے کی صورت میں
نینسی ایک بار پھر واپس مقابلے میں آجاتی۔

Weissnichtwo

اسکے لیئے لفظ پروناؤنس کیا گیا۔ ایک لمحے کے لیئے اسکے چہرے سے مسکراہٹ غائب
ہوئی۔۔ اوہ مائی گاڈ۔۔ اسکے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ شاکڈ تھا۔۔ یہ پہلا موقع تھا
جب اسکی آنکھیں اور وہ خود اس طرح جامد ہوا تھا۔

نینسی بے اختیار اپنی کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تو بلا آخر کوئی ایسا لفظ آگیا تھا جو اسے
چیمپئن شپ میں واپس لاسکتا تھا۔

اسکے والدین کو پہلی بار اسکے تاثرات نے پریشان کیا۔۔۔۔ حاضرین اسکی انگلیوں اور
ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑی آسانی سے اسکرین پر دیکھ سکتے تھے۔۔۔۔

ہال میں بیٹھا ہوا صرف ایک فرد ریلکسڈ تھا۔۔۔ یہ اسکی سات سالہ بہن تھی۔ جس نے
بھائی کے تاثرات پر پہلی بار بڑے اطمینان کیساتھ کرسی کی پشت کیساتھ مسکراتے
ہوئے ٹیک لگائی تھی۔۔۔۔ گود میں رکھے ہوئے اپنے ہاتھوں کو بہت آہستہ آہستہ اس

نے بے تابی کے انداز میں بجانا شروع کیا۔ اس کے ماں باپ نے بیک وقت اسکے تالی بجاتے ہاتھوں اور اسکے مسکراتے چہرے کو الجھے انداز میں دیکھا اور پھر اپنے لرزتے کانپتے کنفیوزیٹے کو دیکھا۔

ہال اب آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہا تھا۔ وہ اب اپنا کارڈ نیچے کر چکا تھا جیسے ذہنی تیاری کر چکا ہو۔۔۔ W.e.i.s.s.n.i.c.h.t.w.o

حمین سکندر نے ایک ہی سانس میں ر کے بغیر لفظ کے ہجے کیسے۔۔

NEW ERA MAGAZINE
An unknown place
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
ایک نامعلوم مقام۔۔۔ اس نے لفظ کے ہجے کرتے ہی اسی رفتار سے اسکا مطلب بتایا۔۔ پھر اسکی نظریں پروناؤنسر پر ٹکی۔

پروناؤنسر کے منہ سے نکلی درست کی آواز ہال میں گونج اٹھنے والی تالیوں میں گم ہو گئی۔۔ وہ اسپیلنگ بی کے نئے فاتح کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جو اسٹیج پر فلیش لائٹس اور ٹی وی کیمروں کی چکاچوند کر دینے والی روشنیوں میں ساکت کھڑا تھا۔ یوں جیسے وہ ابھی تک اس شاک سے نکل نہ پایا ہو کہ وہ جیت چکا ہے۔۔ یہ حمین سکندر

تھا اور یہ حمین سکندر ہی ہو سکتا تھا۔۔۔۔

پہلا جملہ جو اسکے سامنے لگے مانک نے حاضرین تک پہنچایا تھا اس نے تالیوں کی گونج میں ایک بلند شگاف قہقہے کی آواز کو بھی شامل کیا تھا۔

اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکا۔۔ حاضرین کی ہنسی نے اسے کچھ اور نروس کیا۔۔ پھر اس نے حاضرین کی تالیوں کا جواب دیا۔ اس نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں اسکے ماں باپ اور رنیسہ بیٹھے تھے۔ وہ اب سب کے ساتھ کھڑے اسکے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔۔۔ حمین سکندر تقریباً بھاگتا ہوا انکی طرف گیا اور اسکے ساتھ ہی وہ سپاٹ لائٹ بھی گی جو اس سے پہلے اسٹیج پر فوکس تھی۔۔ وہ تالیاں بجاتی اور آنسو بہاتی امامہ سے آکر لپٹا تھا۔۔۔ پھر وہ سالار سے لپٹ گیا۔۔۔ کیا آپ کو مجھ پر فخر ہوا؟ اس نے ہمیشہ کی طرح باپ سے پوچھا۔

بہت فخر۔۔۔۔۔ اس نے اسے تھکتے ہوئے کہا۔

اسکی آنکھیں چمکی مسکراہٹ گہری ہوئی پھر وہ رنیسہ کی طرف گیا دونوں ہتھیلیاں پھیلاتے ہوئے اس نے بازو ہوا میں بلند کرتے ہوئے رنیسہ کے پھیلائے ہوئے ہاتھوں پر ہائی فائی کیا۔۔ اپنے گلے میں لٹکا ہوا نمبر اتار کر اس نے رنیسہ کے گلے میں

ڈالا۔۔ پھر جھک کر اسے تھوڑا سا اٹھایا۔۔ وہ کھلکھلائی۔۔ حمین نے اسے نیچے اتارا اور پھر اسی طرح بھاگتا ہوا واپس اسٹیج کی طرف گیا۔۔

آخری لفظ کتنا مشکل تھا؟ ابتدائی کلمات کے بعد میزبان نے اس سے پوچھا
آخری لفظ تو بے حد آسان تھا۔ حمین نے بڑے اطمینان سے کہا۔۔ ہال میں قہقہہ
گو نجا۔۔

تو پھر مشکل کیا تھا۔۔ میزبان نے اسے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔
اس سے پہلے پوچھے جانے والے سارے الفاظ۔۔ حمین نے ترکی بہ ترکی کہا۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
کیوں؟؟؟؟

کیونکہ میں ہر لفظ بھول گیا تھا بس تکے لگاتا ہا ایک آخری لفظ تھا جو میں آنکھیں بند کر کے بھی جج کر سکتا تھا۔۔

آخری لفظ اتنا آسان کیوں لگا تھا آپکو۔۔۔ میزبان نے پوچھا۔۔۔
رئیسہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمین نے فخریہ انداز میں کہا۔ کیونکہ میں اور میری
بہن نامعلوم مقام سے آئے ہیں۔۔ ہال ایک بار پھر تالیوں اور قہقہوں سے گونج

اٹھا۔۔۔۔۔ ہال میں لگی سکرین پر گلاسز لگائے شرماتی رہی۔۔۔۔۔ امامہ اور سالار
بھی ہنس پڑے۔۔۔۔۔

زندگی میں اب تک ان سب کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی میں ایسے بہت سے فخر
کے لمحات آئے تھے۔۔۔

مئی اگلے سال میں بھی حصہ لوں گی۔۔۔۔۔ انکے درمیان بیٹھی ہوئی رہی۔۔۔۔۔ امامہ نے اپنے گلے
میں لٹکے حمین کے کارڈ کو ہلاتے ہوئے سرگوشی میں امامہ کو اطلاع دی۔۔۔۔۔ امامہ نے
اسے تھپکا جیسے اسے تسلی دے کر ہامی بھر رہی ہو۔۔۔۔۔

اسٹیج پر اب حمین کو ٹرائی دی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ حاضرین ایک بار پھر کھڑے ہو کر تالیاں
بجاتے ہوئے داد دے رہے تھے۔۔۔۔۔ وہاں سے کی کلومیٹر دور واشنگٹن کے ایک

قدرے نواحی علاقے کے ایک گھر میں بیٹھے جبریل اور عنایہ ٹی پراس پروگرام کی لائیو
کو ریج دیکھ رہے تھے۔ عنایہ کچھ دیر پہلے اپنے ٹیسٹ کی تیاری ختم کر کے بیٹھی تھی

جسکی وجہ سے وہ امامہ اور سالار کیساتھ نہ جاسکی اور جبریل اسکے ساتھ رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ اب
جب اس تیسری ٹرائی کے انکے گھر آنے کا فیصلہ ہو گیا تھا تو وہ بے حد خوش تھے۔ ان

سب کے درمیان مقابلہ ہوتا تھا۔۔۔۔۔ حسد اور رقابت تو ان چاروں میں تھی ہی

امریکن لب ولہجے میں ہمیشہ کی طرح بمشکل انہیں السلام علیکم کہا۔۔۔

مبارک ہو۔۔۔۔ ایرک نے وہی کھڑے کھڑے جبریل کے پیچھے جھانکتی عنایہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

تھینک یو۔۔۔ جبریل نے بھی اتنا ہی مختصر جواب دیا۔۔ وہ بات کرتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔۔ ایرک اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آ گیا۔۔

تم نے ٹیسٹ کی تیاری کر لی۔۔ عنایہ اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔۔ وہ چلتے ہوئے لاؤنج میں آ گیا تھا۔

کیوں؟؟؟

بس ایسے ہی۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

بیٹھ جاؤ۔۔۔ عنایہ نے اسے اسی طرح کھڑے دیکھ کر کہا۔ جبریل تب تک لاؤنج کے

ایک طرف موجود کچن ایریا میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔۔۔

ایرک تمہاری ممی کو پتا ہے کہ تم یہاں ہو؟؟ جبریل کو فریج میں سے دودھ نکالتے

ہوئے اچانک خیال آیا۔۔۔

میرا خیال ہے۔۔۔ ایرک نے کان سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا۔۔۔

انہیں نہیں پتا؟؟؟

وہ دودھ کی بوتل کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے ٹھٹکا۔۔۔

اسے پچھلے ہفتے کا خیال آیا تھا جب ایرک کی ممی اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئی تھی۔ اور انہوں نے شکایت کی تھی کہ وہ انہیں بتائے بغیر گھر سے نکلا تھا اور وہ اتفاقاً اسے ڈھونڈنے پر پتا چلا کہ وہ گھر پر تھا ہی نہیں۔۔۔ تب ہی وہ ان لوگوں کے گھر آئی تھی۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ وہ انہیں کہی اور نہیں تو وہاں مل جائے گا۔

ممی گھر پر نہیں ہے۔۔۔ ایرک نے جبریل کے تنبیہی انداز کو بھانپا۔۔۔

کہاں گی ہیں؟ جبریل اتنی پوچھ گچھ کبھی نہ کرتا اگر وہ ایرک نہ ہوتا۔۔۔

کسی دوست کے پاس گی ہے۔ سبل اور مارک بھی انکے ساتھ ہیں۔ اس نے جبریل کو

بتایا۔۔۔۔۔

تم ساتھ نہیں گئے۔۔۔ عنایہ نے اس سے پوچھا۔۔۔

میں نے ٹیسٹ کی تیاری کرنی تھی۔۔ اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔۔ عنایہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

چلو پھر ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہیں۔۔ عنایہ نے جواباً اسے کہا۔

یہ سب واپس کب آئیں گے۔۔ ایرک نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

واپس آرہے ہونگے۔۔ عنایہ نے اسے بتایا اور اسے دیکھنے لگی۔

میں کوئی گیم کھیل سکتا ہوں؟؟ اس نے کہا۔۔ عنایہ ہچکچائی۔۔

نہیں۔۔۔ عنایہ کی جگہ جبریل نے جواب دیتے ہوئے اسکے ہاتھ سے ریمورٹ

لے لیا۔

اس وقت ہمارے گھر میں کوئی گیمز نہیں کھیلنا کافی دیر ہو چکی ہے۔۔۔۔

جبریل نے اسے اپنے گھر کے قوانین نرمی سے بتائے۔۔

لیکن میں تو ایک آؤٹ سائڈر اور مہمان ہوں۔۔۔ ایرک نے جبریل سے کہا۔۔

نہیں تم باہر کے نہیں ہو۔۔ جبریل نے جواباً اس سے کہا۔ ایرک بول نہیں سکا۔۔ وہ

جیسے اس سے یہی سننا چاہتا تھا۔۔۔۔۔

میں ڈنر ٹیبل سیٹ کر دوں سب آنے والے ہونگے۔۔ عنایہ اٹھ کھڑی ہوئی۔۔ ایرک وقفے وقفے سے اسے اور جبریل کو دیکھتا رہا دونوں اپنے کاموں میں مصروف تھے اسے اپنی موجودگی بے مقصد نظر آئی لیکن وہ پھر بھی وہاں سے جانے پر تیار نہیں تھا۔۔ اس گھر میں زندگی تھی سکون تھا۔۔ جواب اسکے گھر میں نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر عنایہ کے پاس آیا اور کچھ کہے بنا خود ہی ٹیبل سیٹ کرنے میں اسکی مدد کرنے لگا۔۔ عنایہ نے سات سیٹس لگائی جو ایرک نے بھی نوٹس کیا اس نے جیسے بن کہے یہ جان لیا تھا کہ وہ وہاں سے کھانا کھا کر جائے گا۔۔

حمین اور ریسہ کیساتھ سالار اور امامہ کی آمد پر انکا پر جوش استقبال کیا گیا۔ اور اس میں ایرک بھی شامل تھا۔۔

کھانے کی میز پر انکے ساتھ کھانا کھاتے اور خوش گپیوں کرتے ہوئے ڈور بیل بجنے پر بھی ایرک کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اسکی ممی کیر لین ہوگی۔۔ وہ بے حد ناخوش تھی اور ہمیشہ کی طرح انکے گھر آنے پر اس نے معمول کے انداز میں خوشگوار رسمی جملوں کا تبادلہ نہیں کیا تھا اس نے اندر آتے ہی ایرک کا پوچھا اور وہاں ایرک کے ہونے کی تصدیق پر وہ اندر آگئی تھی۔۔ اس نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے ایرک کو ڈانٹنا شروع

کیا۔ وہ سبل اور مارک کو اسکے پاس چھوڑ کر کسی دوست کے ساتھ ڈنر پر گئی تھی۔۔ اور وہ سبل اور مارک کے سوتے ہی نکل آیا تھا۔۔ اور جب کیرولین واپس آئی تو اس نے سبل اور مارک دونوں کو گھر میں روتے ہوئے پریشان اور ایرک کو وہاں سے غائب پایا تھا۔۔۔۔۔

ایرک نے ماں کی ڈانٹ پھٹکار خاموشی سے سنی۔۔ شرمندگی اسے اس بات کی ہوئی کہ اسکا جھوٹ سب کے سامنے کھلا تھا۔۔۔ ایرک کے جانے کے کچھ دیر بعد بھی وہاں خاموشی چھائی رہی۔۔ یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس صورت حال پر کیا رد عمل ظاہر کرے۔ ایرک سے ان سب کو ہمدردی تھی اور انکی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اسے اپنے گھر سے دور رکھیں۔۔۔

اتنا اچھا بچہ تھا۔۔ پہلے کبھی جھوٹ نہیں بولتے دیکھا اسے۔ پتا نہیں اب کیا ہو گیا۔۔ امامہ نے ٹیبل سے برتن اٹھاتے ہوئے جیسے تبصرہ کیا۔۔۔

جیمز کی موت نے ایسا کر دیا ہے اسے۔۔ سالار نے جواب دیا۔۔ برتن سنک میں رکھتی ہوئی امامہ عجیب انداز میں ٹھنڈی پڑی تھی۔۔ دو دن بعد سالار کا طبی معائنہ تھا۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ اسکے دماغ میں موجود ٹیومر کس حالت میں ہے۔۔ بڑھنے لگا

تیار ہی نہیں تھا۔۔ وہ سرجری کے ایک ہفتہ بعد ہی دوبارہ ایس آئی ایف کے
 پروجیکٹس لیے بیٹھا تھا۔۔ اور وہ صرف بیٹھی اسے دیکھتی رہتی۔۔۔
 تیمارداری عیادت دیکھ بھال ان لفظوں کو سالار سکندر نے بے معنی کر کے رکھ دیا
 تھا۔۔۔۔۔۔۔

وہ اپنی ذمہ داری خود اٹھا رہا تھا۔۔ وہ پھر بھی اسے تنہا چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔۔۔ چھ
 سات ماہ کے بعد وہ بلا آخر صحت مند ہونا شروع ہوا تھا اسکے نئے بال اگ آئے تھے۔۔۔ اسکا
 وزن بڑھ گیا تھا اور وہ جھریاں بھی غائب ہوئی جو راتوں رات آئی تھی۔۔۔ وہ اب پہلے
 جیسا سالار نظر آتا تھا۔۔۔ لیکن وہ ٹیو مر اسکے اندر موجود تھا ایک خاموش آتش فشاں کی
 طرح۔۔۔ اثرات کے بغیر حرکت کے بغیر۔۔۔ لیکن اپنا بھیانک وجود رکھتے ہوئے
 ۔۔۔ جیسے نظر نہ آنے والی موت۔۔۔ کبھی بھی آسکتی ہے اور کہی بھی آجاتی ہے۔۔۔

لاؤنج میں حمین کسی بات پر ہنستے ہوئے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسکی سرجری کے بعد
 پہلی بار اسے دیکھنا یاد آیا تھا۔۔۔

آٹھ گھنٹے سرجری کے بعد پہلی بار اسے دیکھنا۔۔۔ پھر اگلی صبح اسپتال جا کر اسے دوبارہ
 دیکھنا۔۔۔ جب وہ ہوش میں آیا تھا۔۔۔ اسکے متورم پوٹے ہلنے لگے تھے۔۔۔ وہ

آنکھیں کھولنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔۔۔۔۔

سالار۔۔۔۔۔ سالار۔۔۔۔۔ وہ بے اختیار اسے پکارنے لگی تھی۔ اس نے بلا آخر
 آنکھیں کھول دی۔۔۔ اس نے سالار کو چہرہ چھوا اور پھر اسے پکارا۔۔ اس بار سالار
 نے اسے دیکھا لیکن ان آنکھوں میں اسکے لیئے کوئی پہچان نہیں تھی وہ صرف اسے دیکھ
 رہا تھا اسے پہچاننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ امامہ کو دھچکا لگا تھا۔ کیا وہ واقعی اسے
 پہچان نہیں پارہا تھا۔۔ ڈاکٹر نے اس خدشے کا اظہار آپریشن سے پہلے کیا تھا کہ اسکی
 یادداشت جاسکتی ہے۔۔ وہ شدید صدمے کا شکار ہوئی تھی۔۔ گنگ۔۔ دم بخود۔۔ وہ
 سرد ہاتھ پیروں سے ان آنکھوں کو دیکھتی رہی جو اسے اجنبی کی طرح دیکھ رہی
 تھی۔۔ پھر جیسے ان آنکھوں میں چمک آنا شروع ہوئی۔۔ جیسے اسکا عکس ابھرنا
 شروع ہوا اسکی پلکیں اب ساکت نہیں تھی۔ وہ جھپکنے لگی تھی مانوسیت کا احساس
 لیئے۔۔ بیڈ پر اسکے ہاتھ کے نیچے سالار کے ہاتھ میں حرکت ہوئی۔۔ سالار کی زبان
 سے جو پہلا لفظ نکلا تھا وہ اسکا نام نہیں تھا۔۔ وہ الحمد للہ تھا۔۔ اور امامہ کو پہلی بار
 الحمد للہ کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے امامہ کا نام اگلے جملے میں لیا اور امامہ کو لگا
 اس نے زندگی میں پہلی بار اپنا نام سنا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنا نام خوبصورت لگا

تھا۔ اس نے پہلی چیز پانی مانگی اور امامہ کو لگا دیا میں سب سے قیمتی چیز پانی ہی تو ہے اور اس نے کلمہ پڑھا تھا۔۔ کوئی مرتے ہوئے تو کلمہ پڑھتا ہے پھر زندہ ہو جانے پر اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے کسی کو پہلی بار دیکھا تھا اور ان سب کے دوران سالار نے امامہ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔۔ جنت تھی جو ہاتھ میں تھی۔۔۔

تمہیں نہیں آنا یہاں؟؟ سالار نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔۔ وہ ابھی بھی کچن کے سنک سے ٹیک لگائے وہی کھڑی تھی۔۔۔ دور تھی۔۔۔ اس لیے خود پر قابو پا گئی تھی۔۔۔ آنسو بھی چھپا گئی تھی۔۔۔

ہاں میں آتی ہوں۔۔۔ میں سب باتیں یہاں بھی تو سن رہی ہوں۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔

-----++++-----

عائشہ عابدین اپنے باپ کے انتقال کی سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ تین بہنوں میں سب سے چھوٹی۔۔ وہ ڈاکٹرز کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ عائشہ کی ماں نورین نے اپنی بیٹی کو تھوڑے عرصے کے لیے پاکستان میں اپنی ماں کے پاس بھیج دیا تھا۔۔ وہ امریکہ میں میڈیسن جیسے پروفیشن سے منسلک تھے۔ دونوں بیٹیوں کیساتھ اس نوزائیدہ بچی کو شوہر کی اچانک موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں سنبھال

نہیں سکتی تھی۔۔ عائشہ اگلے پانچ سال پاکستان میں رہی۔ عائشہ کی نانانانی کو اس سے اتنی انسیت ہوگی تھی اور وہ بھی انکے ساتھ خوش اور مطمئن تھی۔ کہ نورین اسے واپس نہ لے جاسکی۔۔ پانچ سال بعد بلاآخر وہ عائشہ کو امریکہ اپنے پاس لے آئی لیکن عائشہ کا دل وہاں نہ لگا۔۔ وہ اپنی بہنوں کیساتھ مانوس نہیں تھی۔ نورین بہت مصروف تھی اور کسی کے پاس عائشہ کے لیے وقت نہیں تھا۔۔ وہ دو سال وہاں کسی نہ کسی طرح گزارتی رہی لیکن سات سال کی عمر میں نورین کو ایک بار پھر اسکی ضد پر اسے پاکستان بھجنا پڑا لیکن اس بار نورین کو اسکے رہن سہن کے حوالے سے فکر ہونے لگی تھی۔ وہ عائشہ کو مستقل امریکہ میں ہی رکھنا چاہتی تھی کیونکہ پاکستان میں ان صرف انکے والدین رہ گئے تھے جو پاکستان چھوڑ کر امریکہ آنے پر تیار نہیں تھے۔

پاکستان بھیجنے کے باوجود نورین کی کوشش تھی کہ عائشہ اور اسکی بہنوں نریمان اور رائمہ میں لگاؤ پیدا ہو جائے اور انکی کوشش کامیاب ثابت ہوئی تھی۔۔ عائشہ اور اسکی دونوں بہنیں اب ایک دوسرے کے قریب آنے لگی تھی۔۔

دس سال کی عمر میں عائشہ ایک بار پھر امریکہ آئی تھی۔۔ اور اس بار اسے وہاں رہنے میں پہلے جیسے مسلے پیش نہیں آئے تھے۔۔ لیکن اب ایک نیا مسلہ درپیش تھا۔ وہ سکول

میں جا کر پریشان ہونے لگی تھی۔۔ وہ پاکستان میں بھی کو ایجوکیشن میں پڑھتی رہی تھی مگر وہاں اور یہاں کے ماحول میں فرق تھا۔۔ عائشہ کو سکول اچھا نہیں لگتا تھا نورین سمجھتی تھی کہ وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی لیکن جب ایک سال بعد اسکی حالت ٹھیک نہیں ہوئی اور گریڈز خراب آنے لگے تو نورین کو اسے ایک بار پھر پاکستان بھیجنا پڑا۔۔ وہ اب اسے اولیولز کے بعد وہاں بلوانا چاہتی تھی۔۔ کیونکہ انکا خیال تھا تب تک وہ کچھ سمجھدار ہو جائے گی۔۔۔

تیرہ سال کی عمر میں عائشہ عابدین ایک بار پھر امریکہ رہنے آئی تھی۔ لیکن اس بار وہاں وہ اپنے لیے ایک نیا مسلہ دیکھ رہی تھی۔۔ امریکہ اسے اسلامک ملک نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں کی شخصی آزادی اسکے لیے پریشان کن تھی۔۔۔۔۔ وہاں لباس کے بارے میں روارکھنے والی آزادی اسے ہولانے لگی تھی لیکن ان میں سب سے بڑا چیلنج اسکے لیے یہ تھا کہ وہ وہاں حجاب میں بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔۔۔ جو اس نے پاکستان میں لینا شروع کیا تھا اور جس سے نورین خوش نہیں تھی۔ اس بار نورین نے بلاخر گٹھنے ٹیک دیے۔ یہ مان لیا تھا کہ عائشہ کا امریکہ میں اب کوئی مستقبل نہیں تھا۔ انہوں نے اسے امریکہ سے ایک بار پھر واپس پاکستان بھیج دیا۔ یہ عائشہ عابدین کا

انتخاب تھا کہ اسے اپنی زندگی ایک اسلامک ملک میں گزارنی تھی۔۔۔ عائشہ کے نانانانی نے اسے کانٹونٹ میں پڑھانے کے باوجود بے باک انداز میں اسکی پرورش نہیں کی تھی۔۔۔ عائشہ کو انہوں نے گھر میں ایک ایسے مولوی سے قرآن پڑھایا تھا جو کسی کم فہم رکھنے والا کوئی روایتی مولوی نہیں تھا۔۔۔ وہ ایک اچھے ادارے کے طلباء کو قرآن اور حدیث کی تعلیم دیتا تھا۔۔۔ خود عائشہ کے نانانانی بھی دین اور دنیا کی بہت سمجھ رکھتے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔۔۔ عائشہ ایک ایسے ماحول میں جہاں دین کی سمجھ بوجھ اور اسمیں گہری دلچسپی کے ساتھ پیدا ہوئی تھی جہاں پر حرام اور حلال کی تلواروں سے ڈرانے کی بجائے دلیل اور منطق سے اچھائی اور برائی سمجھائی جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ عائشہ اپنے مذہب سے جذباتی لگاؤ رکھتی تھی۔۔۔

وہ نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھی اور حجاب اوڑھتی تھی روزے بھی رکھتی تھی اپنے نانا نانی کیساتھ حج بھی کر چکی تھی لیکن اسکے ساتھ وہ فنون لطیفہ کی ہر صنف میں بھی دلچسپی رکھتی تھی۔۔۔ پینٹنگز بنا لیتی تھی اسکول میں پورے لباس کیساتھ پیراکی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔۔۔ ہر وہ کام کرتی تھی جس میں اسے دلچسپی ہوتی اور نانانانی کی اجازت ہوتی۔۔۔۔۔۔۔

نورین اپنے ماں باپ کی اس حوالے سے بہت احسان مند تھی۔ نورین کی خواہش تھی کہ عائشہ ڈاکٹر بنتی۔۔۔ اگر نورین کی خواہش نہ ہوتی تو وہ ڈاکٹر بننے کی بجائے آرکیٹیکٹ بنتی۔۔۔ لیکن نورین کی خواہش کو مقدم سمجھتے ہوئے اس نے زندگی کے بہت سارے مقاصد بدل دیے تھے۔۔۔

-----++++-----

وہ اگلی صبح پھر انکے دروازے پر کھڑا تھا۔ امامہ نے لانڈری سے کپڑے نکال کر چند منٹ پہلے ڈراپئر میں ڈالے تھے اسے آج گیراج صاف کرنا تھا اور بیل بجنے پر اسکے بارے میں سوچتی ہوئی نکلی تھی۔۔۔ تو اس نے ایرک کو سامنے کھڑا پایا۔۔۔ لیکن وہ دروازے سے ہٹی نہیں۔۔۔ ایرک نے ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا تھا لیکن وہ پھر بھی وہی کھڑی رہی تھی۔۔۔

آپ اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟ ایرک نے بلاخر کہا۔۔۔

تم سکول نہیں گئے؟ امامہ نے اسکا سوال گول کیا۔

نو۔۔۔ دراصل میری طبیعت خراب ہے۔۔۔ ایرک نے نظریں ملائے بغیر کہا۔۔۔

طبیعت کو کیا ہوا۔۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نرم پڑی۔۔۔

مجھے لگتا ہے مجھے کینسر ہے۔۔ ایرک نے اطمینان سے کہا۔۔

وہ کچھ لمحے ہکا بکا رہی۔

فار گاڈ ایک۔۔ جو بھی منہ میں آئے بول دیتے ہو۔ ایسے ہوتا ہے کینسر۔

وہ اسے ڈانٹتی چلی۔ گی۔ ایرک کو مایوسی ہوئی۔ اسے امامہ سے ہمدردی کی توقع تھی۔

آپکو کیسے پتہ مجھے کینسر نہیں۔۔ اس نے امامہ سے کہا۔ امامہ نے خاموشی سے اسکا راستہ چھوڑا اور ایپرن کی ڈوریاں کمر کے گرد کستے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گی۔ ایرک نے اندر آتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

امامہ کچن میں اپنے کام میں مصروف ہو گی کاؤنٹر پر پڑے سیل فون سے کسی سورت کی تلاوت ہو رہی تھی جو وہ کام کرتے ہوئے سن رہی تھی۔۔ ایرک نے بھی وہ تلاوت سنی اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کھڑا رہے یا بیٹھ جائے بات کرے یا نہ کرے۔۔

اس نے جبریل کو کی بار تلاوت کرتے سنا تھا جب وہ تلاوت کرتا تھا تو کوئی اور بات نہیں کرتا تھا۔۔ اسکی یہ مشکل امامہ نے آسان کر دی اس نے سیل فون پر وہ تلاوت بند

کر دی۔۔

جبریل کی آواز ہے؟؟ اس نے پوچھا۔۔

ہاں۔۔۔

بہت پیاری ہے۔۔۔

امامہ اس بار مسکرائی۔۔

میں بھی سیکھنا چاہتا ہوں یہ قرآن۔۔ ایرک نے کہا۔۔ امامہ خاموش رہی۔۔

NEW ERA MAGAZINE.com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Ghazals|

میں سیکھ سکتا ہوں کیا؟

اس نے امامہ کو خاموش پا کر سوال کیا۔۔

دلچسپی ہو تو سب کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔۔ اس نے اپنے جواب کو مناسب کر کے پیش

کیا۔۔۔۔

آپ سکھا سکتی ہیں؟؟ اسکا اگلا سوال اور بھی گھما دینے والا تھا۔

نہیں میں نہیں سکھا سکتی۔۔ امامہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔۔

جبریل سکھا سکتا ہے؟ اس نے متبادل حل پیش کیا۔

وہ مصروف ہے بہت اجکل۔ اسے ہائی سکول ختم کرنا ہے اس سال۔۔۔ امامہ نے جیسے بہانہ پیش کر دیا۔۔۔

میں انتظار کر سکتا ہوں۔ ایرک کے پاس بھی متبادل حل تھا۔

مسز سالار آپ مجھے پسند نہیں کرتی۔۔۔ اس کے اگلے سوال پر وہ بری طرح چونکی۔۔

سب تمہیں بہت پسند کرتے ہیں پھر میں کیوں نہیں کروں گی۔۔۔ اس نے بڑے تحمل سے اسے سمجھایا۔

آپ مجھے ایڈاپٹ کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔؟؟؟ اگلا سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ اسکے لیے پراٹھا بنانا بھول گئی۔۔۔۔۔

ایرک تمہاری ممی ہیں دو بہن بھائی ہیں تمہاری فیملی ہے۔۔۔

پلیز۔۔۔۔۔ ایرک نے اسکی بات کاٹ کر پلیز کہہ کر جیسے اسکی منت کی۔

تمہاری ممی تم سے بہت پیار کرتی ہے ایرک۔ وہ کبھی تمہیں کسی اور کو نہیں دینگے۔ اور

تمہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ امامہ نے

انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔۔۔

ممی کے پاس ایک بوائے فرینڈ ہے وہ جلد ہی ان سے شادی کر لینگی کیا آپ تب مجھے ایڈیٹ کر سکتی ہیں؟ اس نے اس مسئلے کا بھی حل نکالا تھا۔

تم کیوں چاہتے ہو ہمارے پاس آنا۔۔؟ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

کیونکہ یہ مجھے گھر لگتا ہے۔۔۔ بہت مختصر جملے میں اس بچے کا ہر نفسیاتی مسئلہ۔ چھپا تھا۔۔ وہ کس تلاش میں کہاں کہاں پھر رہا تھا۔۔ امامہ کا دل اور پگھلا۔۔

تم اپنی ممی کو چھوڑ کر ہمارے پاس آنا چاہتے ہو یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ امامہ نے اسے جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔۔۔

ممی مجھے چھوڑ دیں گی میں نے آپکو بتایا نا انکا ایک بوائے فرینڈ ہے۔ ایرک کے پاس اس جذباتی حربے کا جواب تھا۔۔۔۔

وہ شادی کر لیں اپنے بوائے فرینڈ کے پاس رہیں کچھ بھی ہو لیکن تم انکے بیٹے رہو گے۔۔ تم سے انکی محبت کم نہیں ہوگی۔ وہ تمہیں اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتیں۔۔۔۔ اس نے کیرولین کی وکالت کر کے ایرک کی مایوسی کو اور بڑھایا۔۔۔

میں عنایہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔ اسکے اگلے جملے نے امامہ کا دماغ گھما دیا۔۔۔۔ وہ اگلے کی لمحے بول نہ سکی تھی۔۔۔

یہ بھی نہیں ہو سکتا۔۔ اس نے بلاخرایرک سے کہا۔

کیوں؟ وہ بے تاب ہوا۔

تم ابھی اس طرح کی بات کرنے کے لیے بہت چھوٹے ہو۔۔ اسے اس سے زیادہ مناسب جواب نہیں سوچھا۔۔۔

جب میں بڑا ہو جاؤں تب شادی کر سکتا ہوں اس سے؟؟

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔ اس بار اس نے صاف گوئی سے کہا۔۔۔

کیوں؟؟ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

اس سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو تم؟ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔۔۔

کیونکہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔۔۔۔

لیکن ہو سکتا ہے وہ تمہیں پسند نہ کرتی ہو اتنا کہ تم سے شادی پر تیار

ہو جائے۔۔ ایرک کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔۔۔

کیا اس نے آپ سے ایسا کہا؟ اس نے ایک بچگانہ سوال کیا۔۔۔۔۔

نہیں۔۔۔ وہ بہت چھوٹی ہے تمہیں پسند یا ناپسند کرنے کے بارے میں ابھی سوچ بھی نہیں سکتی لیکن یہ میں تم سے کہہ رہی ہوں ایرک اس طرح کی باتیں کرنا اور سوچنا چھوڑ دو۔۔۔۔۔ ورنہ ہمارے لیے شاید تم سے ملنا جلنا ممکن نہیں رہے گا۔۔۔ ایرک اسکی خفگی سے کچھ پریشان ہوا۔۔۔۔۔

تم کیا کر سکتے ہو عنایہ کے لیے؟ اس نے بے حد سنجیدگی سے ایرک سے پوچھا۔۔۔

سب کچھ۔۔۔ اسے وہی جواب ملا جسکی توقع تھی۔۔۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 اوکے پھر سکول جاؤ باقاعدگی سے۔۔۔ دل لگا کر پڑھو۔۔۔ اپنا کوئی کیریئر بناؤ۔۔۔ عنایہ کسی ایسے لڑکے کو تو کبھی پسند نہیں کر سکتی جو سکول نہ جاتا ہو اپنی ماں کی بات نہیں مانتا ہو اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ اور پھر جھوٹ بولتا ہو۔۔۔ ایرک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔۔۔ امامہ نے جیسے دو سیکنڈز میں اسکی زندگی کی پہلی محبت کا تیا پانچہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔

وہاں یکدم خاموشی چھائی تھی۔۔۔ پھر اس نے امامہ سے کہا۔۔۔

میں اپنے آپ کو ٹھیک کر لوں گا۔۔

یہ بہت اچھا ہو گا ایرک لیکن اسکے ساتھ ایک۔ وعدہ بھی کرنا ہے تم نے مجھ

سے۔۔۔۔۔

کیا؟ وہ الجھا۔۔

جب تک تم ہائی سکول پاس کر کے یونیورسٹی میں نہیں چلے جاتے تم عنایہ سے اس طرح

کی کوئی بات نہیں کرو گے۔۔

میں وعدہ کرتا ہوں میں ایسا ہی کروں گا۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اور جب تک تم یونیورسٹی نہیں پہنچ جاتے ہم دوبارہ اس ایشوپر بات نہیں کریں گے

۔۔ محبت۔۔ شادی۔۔ عنایہ۔۔ امامہ نے جیسے ان تین چیزوں کے گرد ریڈ زون

لگاتے ہوئے اس سے کہا۔

امامہ کا خیال تھا کہ اس نے حفاظتی بند باندھ دیا تھا۔۔۔ تھوڑے عرصے تک وہ بھول

جائے گا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایرک ایک عام امریکن بچہ نہیں تھا۔

احسن سعد کا باپ اس بات پر ہمیشہ فخر کرتا تھا کہ اسکا بیٹا آج کے زمانے میں پاکستان کے بہترین انگلش میڈیم اور کوائیجو کیشن میں پڑھنے کے باوجود ایک سچا اور پکا مسلمان تھا۔ داڑھی رکھتا تھا پانچ وقت کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا حج اور عمرے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔ لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ باعمل ہونے کیساتھ پوزیشن ہولڈر بھی تھا۔۔۔ سعد اور اسکی بیوی اس پر جتنا فخر کرتے کم تھا۔۔۔ اور یہ فخر وہ برملا لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ انکا گھرانے سوشل سرکل میں ایک آئیڈیل گھر سمجھا جاتا تھا۔۔۔ لیکن یہ صرف اسکی ماں کا خاندان تھا جو اس آئیڈیل گھر کی کھوکھلی بنیادوں سے واقف تھا اور احسن سعد کے باپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔۔۔

سعد نے ایک امیر اور اچھے خاندان میں شادی کی تھی لیکن اس کے بعد اپنی بیوی کو اس نے ایک اچھی اور مسلمان عورت بنانے کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ اسکے خاندان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اگر شادی کے پہلے سال ہی احسن پیدا نہ ہوا ہوتا تو اسکی بیوی کے ماں باپ کب کی اسکی علیحدگی کروا چکے ہوتے۔۔۔ سعد اپنی بیوی کو ایک باحجاب فرمانبردار دین سے قریب اور دنیا سے دور رہنے والی بیوی بنانا چاہتا تھا جسکے لیے وہ مذہب کا نام استعمال کرتا تھا۔۔۔ سعد میں اسکے علاوہ کوئی خرابی نہیں تھی کہ وہ اپنی بیوی کو اس

سانچے میں ڈھالنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا تھا۔۔ گالم۔ گلوچ سے لیکر مار کٹائی تک اور ماں باپ کے گھر جانے پر پابندی لگانے سے گھر میں قید کرنے تک۔۔ اسکی بیوی کے میکے والوں کے پاس ہزار دلیلوں کے باوجود سعد کے قرآن و حدیث اور مذہبی حوالوں کا جواب نہیں تھا۔ اگر انکے پاس دین کا علم ہوتا تو وہ سعد کے قرآن و حدیث کے حوالوں کا سیاق و سباق بھی انہیں بتا دیتے ۔

وقت بدلنے کیساتھ سعد نہیں بدلاتھا بلکہ اسکی بیوی بدلتی چلی گی۔ اس نے ذہنی طور پہ یہ مان لیا تھا کہ وہ واقعی اسلام سے دور تھی اور دین کی تعلیمات وہی تھی جو سعد اسکے کانوں میں ڈالتا تھا۔۔ اور اسے ویسا کرنا تھا جیسے اسکا شوہر کہتا۔۔ ایک سٹیج آگیا کہ دونوں میاں بیوی سوچ کے حساب سے ایک جیسے ہو گئے۔۔ اسکی بیوی بھی اب سعد کی طرح لوگوں پر فتوے نافذ کرنے لگی تھی۔۔ اسکا خیال تھا کہ جو خلاف اسلام کام وہ روک سکتے ہیں روک دیں اور جسے برا کہہ سکتے ہیں اسے برانہ کہیں بلکہ سب کے سامنے

اس طرح مطعون کریں کہ اگلا شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ اسلام میں حکم کے علاوہ حکمت نام کی بھی ایک چیز ہے جس سے وہ ناواقف تھے۔۔

احسن سعد نے ایک ایسے گھر میں پرورش پائی تھی جہاں پر اسکے ماں باپ نے اسے لوگوں کو اسی کسوٹی پر پرکھنا سکھایا جس پر وہ پرکھا کرتے تھے۔ اس نے ماں باپ کے درمیان بچپن میں ہی ہر قسم کے جھگڑے دیکھے تھے اور اس نے سیکھا تھا کہ شوہر اور بیوی کا تعلق ایسا ہی ہونا چاہیے۔۔۔ حاکم اور محکوم برتر اور کمتر کا۔۔۔ عزت اور احترام پیار و محبت کا نہیں۔۔۔۔۔

احسن سعد کو کچھ چیزوں سے شدید نفرت تھی جن میں ماڈرن عورت اور امریکہ سرفہرست تھے۔۔۔ احسن کی فیملی کی سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ اس گھر میں رہنے والا ہر فرد خود کو فریکٹ سمجھتا تھا۔۔۔ انہیں احساس تک نہیں تھا کہ ان میں بہت سارے نقائص بھی ہیں۔۔۔

احسن بھی اپنے آپ کو کامل سمجھتا تھا سب برائیوں سے مبرا اور سب اچھائیوں کا منبع۔۔۔ احسن نے اپنے باپ سعد سے بہت سی چیزیں وراثت میں پائی۔۔۔ شکل و صورت ذہانت مزاج اور عادات۔ لیکن جو سب سے بری چیز احسن نے اپنے باپ سے لی تھی وہ منافقت تھی۔ اسے ماڈرن عورت اور امریکہ سے نفرت بھی تھی اور وہ ایک ماڈرن عورت سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا جسکے پاس امریکن شہریت بھی ہو۔۔۔ اور وہ

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔ اسکا باپ ٹھیک کہتا تھا وہ جو مانگتا اسے مل جاتا اسے یہ دونوں چیزیں بھی ملنے والی تھی اسکی خوش قسمتی ایک اور خاندان کی بد قسمتی میں بدلنے والی تھی۔۔۔

تمہیں پتا ہے Jb لڑکیاں تمہیں ہاٹ سمجھتی ہیں۔۔ ڈنر ٹیبل پر ایک دم خاموشی چھاگی وہ ایسا ہی غیر متوقع جملہ تھا جو حمین نے پاستا کھاتے ہوئے بڑے بھائی کے گوش گزار کر دیا تھا۔۔ امامہ سالار عنایہ رئیسہ نے بیک وقت حمین کو دیکھا پھر جبریل کو جو سرخ ہوا تھا۔۔ وہ شرمندگی نہیں غصہ تھا جو اکثر اسے حمین کے بے لاگ تبصروں پہ آجاتا تھا۔۔ مجھے بھی کول کہتی ہے لیکن تمہیں تو ہاٹ سمجھتی ہے کس قدر افسوس کی بات ہے نا۔۔۔

اس نے ماں باپ کی نظروں کی پرواہ کی نا ہی جبریل کے سرخ ہوتے چہرے کی۔۔۔

Will you please shut up.....

جبریل نے اس دفعہ کچھ سخت لہجے میں اسے روکا۔۔۔

اس کی بہت سی ریزن ہیں۔۔ لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند نہیں کرتی جو بہت بولتے
ہو۔۔ اور جے بی بلکل بات نہیں کرتا۔۔۔

اور۔۔۔ سالار نے اسے آگے بولنے کی ترغیب دی۔۔

اور لڑکیوں کو وہ لڑکے اچھے لگتے ہیں جو انکی کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں سن سکتے ہو اور
جے بی سب کی باتیں سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی احمق ہو۔۔۔

اس بار سالار کو بھی ہنسی آئی جو اس نے گلا صاف کر کے چھپائی۔۔۔

بلا آخر جبریل نے اسے ٹوکا۔۔ تمہیں پتا ہے حمین لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہے جو
ایڈیٹ نہیں ہوتے۔۔ اسکا اشارہ حمین کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

ہاں یہ اسی صورت ممکن ہے اگر لڑکیاں خود احمق نہ ہو۔۔۔۔۔

بابا۔۔۔۔ اس بار عنایہ نے سالار کو پکارا۔۔ اور اس نے حمین کے تبصرے پر احتجاج کیا
تھا۔۔۔۔۔

تم ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں کیا کہو گے؟ سالار نے پوچھا۔۔۔۔۔

تین کہیں بابا۔۔ آپ می کو لڑکیوں کی صف سے کیوں نکال رہے ہیں۔ حمین نے

سوال کا جواب گول کیا۔۔ وہ سمارٹ نہیں سپر سمارٹ تھا۔۔ ہوشیار اور موقع شناس۔۔۔

حمین بس کر دو۔۔ امامہ نے اس بار اپنی ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اسے ڈانٹے یا اسکی باتوں پہ ہنسنے۔۔۔ وہ جو بھی کہہ رہا تھا غلط نہیں تھا۔۔ جبریل تیرہ سال کی عمر میں بھی اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے بڑا لگتا تھا۔۔۔ اسکی آنکھیں سالار کی آنکھیں تھے بڑی سیاہ اور بے حد گہری۔۔ وہ اسی کی طرح بے حد متحمل مزاج تھا۔۔ اور وہ اگر لڑکیوں میں مقبول تھا تو اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ سب کے لیے ایک پہلی تھا۔۔ جبریل اپنی کشش سے بے خبر تھا اور اسے اس کشش کو استعمال کرنے میں دلچسپی بھی نہیں تھی۔۔۔

لیکن دنیا میں اگر کوئی خاموشی اور متحمل مزاجی کے اس پہاڑ میں شگاف ڈال کر اسے برہم کر سکتا تھا تو وہ حمین تھا۔۔ جبریل کو تنگ کرنا اسکی زندگی کا دلچسپ اور پسندیدہ ترین کام تھا۔۔ اس نے جبریل کو ایک سال سے بھائی کہنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے لگتا تھا جے بی کول ہے۔۔۔ وہ ہر چیز میں کوننسیس نکالتا تھا۔۔۔

بابا جب میں اسپیلنگ بی جیت کر آؤں گی تو میں بھی اپنے سارے کلاس فیلوز کو بلاؤں

گی۔۔۔ رئیسہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سالار کو اپنی طرف متوجہ کیا۔۔۔۔۔
 رئیسہ سالار کی زندگی میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتی تھی۔۔۔ اس بات سے بے خبر کہ اسکی
 قسمت میں صرف بڑے کام لکھے ہیں۔۔۔۔۔

بابا مجھے آپکو حمین کے بارے میں کچھ بتانا ہے۔۔۔ رئیسہ کی منمناتی آواز پر سالار بیرونی
 دروازے سے نکلتے نکلتے ٹھٹک گیا تھا۔۔۔ وہ اس وقت واک کے لیے نکل رہا تھا اور رئیسہ
 ہمیشہ کی طرح اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔۔۔ سالار کو اچھنبا ہوا تھا۔۔۔ وہ
 کبھی کسی کی شکایت نہیں کرتی تھی اور حمین کی شکایت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا
 ۔۔۔ وہ اسکی سب سے بڑی رازدان تھی۔۔۔

سالار نے کچھ غور اور حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ کیا بتانا ہے؟
 رئیسہ نے جواب دینے کی بجائے پلٹ کر لاؤنج کی طرف دیکھا جہاں سے حمین کی آواز
 آرہی تھی۔۔۔ وہ امامہ سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔
 کچھ ہے جو میں آپکو بتانا چاہتی ہوں۔۔۔ اس نے سرگوشی نما آواز میں سالار سے

ایسی کیا بات ہے رئیسہ۔ سالار نے نرم آواز میں اسے کریدا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ حمین کے بارے میں جو بھی بات ہے وہ ایک سیکرٹ رہے گی۔۔۔ اس نے رئیسہ سے کہا۔۔۔ مگر وہ متاثر نہیں ہوئی۔

بابا آپ حمین سے بہت خفا ہو جائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی۔۔۔ اس بار رئیسہ نے اپنے خدشات کا اظہار کھل کر کیا۔۔۔ سالار کی چھٹی حس نے اسے سگنل دینا شروع کیے۔

رئیسہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ سالار نے اس بار سنجیدگی سے اسے گھر کا۔۔۔ اگر حمین نے ایسا کچھ کیا ہے جو تمہیں لگتا ہے ہمیں پتا ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ تو تمکو ہمیں بتا دینا چاہیے۔۔۔ اس طرح کوئی بھی چیز چھپانا ٹھیک نہیں۔۔۔ رئیسہ کی یہ پردہ پوشی سالار کو اس وقت بہت بری لگی تھی۔۔۔

مجھے ایک دن دیں۔ رئیسہ نے اسکے لہجے میں جھلکتی خفگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔۔۔ میں آپکو کل بتا دوں گی۔۔۔۔۔

وہ بے اختیار گہرا سانس لیکر رہ گیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش زور زبردستی سے نہیں کی تھی۔

ٹھیک ہے ایک دن اور سوچ لو اور پھر مجھے بتادو۔۔ اس نے بات ختم کر دی۔۔ لیکن
 رییسہ کے انکشاف سے پہلے ہی سکول سے امامہ کو کال آگئی تھی۔۔ اگلے دن سکول میں
 انہیں حمین کے بارے میں جو بتایا گیا اس نے کچھ دیر کے لیے اسکے ہوش و حواس اڑا
 دیے۔۔ وہ جو نیئر ونگ میں بزنس کر رہا تھا۔ اور ایسی ہی ایک بزنس ڈیل کے نتیجے میں
 ایک بچہ اپنا ایک بے حد مہنگا گیم گنوانے کے بعد اپنے ماں باپ کو اس لین دین کی
 تفصیلات سے آگاہ کر بیٹھا تھا اور اسکا پتا اسکے والدین کی شکایت سے چلا تھا۔ جسکے نتیجے
 میں سکول۔ نے تحقیقات کی تھی۔۔ اور حمین سکندر کو پہلا وار ننگ لیٹر ایشو ہوا تھا
 ۔ سالار کا داغ واقعی گھوم کر رہ گیا تھا۔۔

اس بزنس کے آغاز کو بہت وقت نہیں گزرا تھا۔ بزنس کا آغاز اتفاقی تھا۔۔ اسکی کلاس
 میں اسکا ایک کلاس فیلو ایسے جو گرز لیکر آیا تھا جنہیں دیکھ کر حمین سکندر مچل گیا
 تھا۔ امامہ نے ان برانڈڈ سنیکرز کی خواہش کو رد کر دیا تھا۔ کیونکہ۔ چند ہفتے پہلے حمین
 نے نئے سنیکرز لیے تھے۔۔ حمین سکندر ہر روز سپورٹس آورز میں اپنے اس کلاس فیلو
 کے سنیکرز دیکھتا اور انہیں حاصل کرنے کے طریقے سوچتا۔۔ اس نے ان سنیکرز کو
 بارٹر ٹریڈ کے ذریعے حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔۔

کوئی ایسی چیز جسکے بدلے میں وہ کلاس فیلو ان سنیکرز کو حمین کو دے دیتا۔۔۔ اسکا وہ کلاس فیلو حمین کے اتنے ڈائریکٹ سوال پر کچھ گڑ بڑا گیا۔۔۔ اس نے کچھ تامل کے بعد حمین کو یہ بتایا تھا کہ وہ ایک اور کلاس فیلو کی گھڑی کو پسند کرتا تھا اور اگر اسے وہ مل جائے تو اسکے بدلے وہ سنیکرز دے سکتا ہے۔ جس کلاس فیلو کی گھڑی اس نے مانگی تھی اسے ایک اور کلاس فیلو کی سائیکل میں دلچسپی تھی اور اور سائیکل والے کو ایک اور کلاس فیلو کے بیگ میں۔۔۔ یہ سلسلہ چلتے چلتے حمین سکندر کے پاس موجود ایک کی بورڈ تک آ گیا تھا جو وہ کبھی کبھار سکول لے جا کر بجاتا تھا۔ اور حمین نے فوری طور پر اس کی بورڈ کے بدلے وہ سنیکرز حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی دن اسکو عملی جامہ پہنا دیا۔۔۔ بزنس کا پہلا اصول مؤثر سٹریٹیجی اور دوسرا وقت پہ درست استعمال۔۔۔ سالار سکندر کے منہ سے دن رات سننے والے الفاظ کو اس کے نو سالہ بیٹے نے کس مہارت سے استعمال کیا تھا اگر سالار دیکھ لیتا تو عیش عیش کراٹھتا۔

حمین سکندر کی کلاس کے بارہ افراد نے اگلے دن سکول گراؤنڈ میں اپنی پسندیدہ ترین چیز کے حصول کے لیے اپنی کم فیورٹ چیز کا تبادلہ کیا تھا اور تبادلے کی اس چین کے ذریعے حمین سکندر وہ سنیکرز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔۔

کلائنٹس کا اطمینان کاروبار کا تیسرا اصول ہے اور نو سال کی عمر میں سالار سکندر اس بیٹے نے یہ تینوں چیزیں مد نظر رکھی تھی۔۔۔ وہ اس وقت گیارہ مسرور کسٹمرز کے درمیان راجہ اندر بنا تھا جو اس کا شکر یہ ادا کرتے نہیں تھک رہے تھے۔۔

اور اگر ان میں سے کسی نے اپنی کوئی چیز واپس مانگ لی تو؟ رئیسہ نے اسکے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔۔۔

ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ حمین نے پر اعتماد انداز میں کہا۔۔

کیوں؟؟ حمین نے اسکے کیوں کے جواب میں اپنی جیب سے ایک کانٹریکٹ نکال کر اسے دکھایا جس پر حمین سمیت بارہ لوگوں کے سائن تھے اور اس کانٹریکٹ پر اس لین دین کے حوالے سے شرائط و ضوابط درج تھے۔ جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ایک دفعہ چیزوں کا تبادلہ ہونے کے بعد واپس نہیں ہو سکتی تھی۔۔۔

اگر مئی بابا نے تمہارے سنیکرز دیکھ لیے تو؟ حمین نے اسکے سوال پہ سر کھجاتے ہوئے کہا اب یہی ایک الجھن ہے۔۔ میں انکے سامنے یہ نہیں پہنوں گا ہم انہیں بتائیں گے ہی نہیں۔۔۔

کیوں؟ رنیسہ اب بھی مطمئن نہیں تھی۔۔

پیرنٹس بہت سی باتیں نہیں سمجھتے۔۔ حمین نے جیسے کسی بزرگ کی طرح فلسفہ جھاڑا۔۔ اس بزنس ڈیل کے ایک ہفتہ بعد ان گیارہ لوگوں میں سے ایک اور لڑکا اسکے پاس آن موجود ہوا تھا۔ اس بار اسے کلاس کے ہی ایک لڑکے کے گلاسز چاہیئے تھے اور وہ حمین کے ذریعے یہ ڈیل کرنا چاہتا تھا اور اسکے لیئے وہ حمین کو پانچ ڈالر دینے پر تیار تھا۔ وہ رقم بڑی نہیں تھی لیکن حمین اس ترغیب کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ ایک بار پھر اس نے ایک پوری بارٹر چین کے ذریعے وہ برانڈڈ سن گلاسز اپنے کلائنٹ کو ڈیلیور کر دیئے تھے۔ اور پانچ ڈالر کمائیئے تھے۔۔۔ یہ اسکی زندگی کی پہلی کمائی تھی اور رنیسہ کو اسکا بھی پتا تھا۔ وہ اس بار بھی خوش نہیں تھی۔۔۔ یہ بزنس اسکی کلاس سے نکل کر اسکول میں پھیل گیا تھا۔ اسکول میں چند مہینوں میں سب کو یہ پتا تھا کہ اگر کسی کو اسکول میں کسی دوسرے بچے کی کوئی چیز پسند آجائے تو اسکے حصول کے لیئے حمین سکندر واحد نام تھا۔ جسکی خدمات وہ حاصل کر سکتے تھے۔۔ حمین کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا۔۔ تین ماہ کے اس عرصے میں حمین نے اس بزنس سے 175 ڈالر کمائیئے تھے۔۔۔ اور رنیسہ اسکے ہر لین دین سے واقف تھی۔۔۔

حمین کے پاس اب بہت سے پیسے تھے جو اس نے ممی بابا سے نہیں لیئے تھے۔

سالار اور امامہ نے اسکول میں حمین سے زیادہ بات چیت نہیں کی تھی۔۔ سالار نے اس سے کہا تھا وہ اس مسئلے پر گھر میں بات کریں گے اور پھر وہ چلے گئے۔۔ لیکن حمین پریشان ہو گیا تھا۔

چھٹی کے وقت حمین نے ریسہ کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا جو اسے پیش آئی تھی۔۔ وہ بے حد پریشان ہو گی تھی۔

وارننگ لیٹر؟؟؟ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ حمین کیسا تھوڑا سا ہو سکتا ہے۔۔ میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا تھا لیکن تم نے بات نہیں مانی۔۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ وہ دونوں سکول بس میں سوار ہونے کی بجائے اب اس مسئلے کو ڈسکس کرنے میں مصروف تھے۔۔

بابا اور ممی بہت خفہ ہوئے ہونگے۔؟ ریسہ نے اس سے پوچھا۔۔ تمہیں بہت ڈانٹا کیا۔۔

نہیں۔۔ یہاں تو نہیں ڈانٹا لیکن گھر جا کر ڈانٹیں گے۔ بابا نے کہا تھا۔۔ انہیں مجھ سے

ضروری باتیں کرنی ہے گھر جا کر۔۔۔ حمین کچھ فکر مند انداز میں کہہ رہا تھا۔۔

وہ تمہیں سکول سے نکال دیں گے کیا۔۔ ریسہ کو تشویش ہوئی۔

نہیں۔۔ ایسا تو نہیں ہو گا بابا نے معذرت کی ان سے۔ اور وہ مان بھی گئے۔۔ حمین نے

اسے بتایا۔۔

کتنی بری بات ہے۔۔ ریسہ کو اور افسوس ہوا۔ بابا کو کتنا برا لگا ہو گا۔ وہ بہت شرمندہ

ہو گئے ہونگے۔ اور می بھی ہو رہی ہوں گی۔۔۔

مجھے پتہ ہے۔۔۔ حمین کچھ حجل تھا۔۔۔

تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا حمین۔۔۔

جبریل اور عنایہ کو اس حوالے سے کچھ نہیں بتانا۔۔ سالار نے امامہ کو گھر ڈراپ کرتے

ہوئے اس سے کہا تھا۔۔

اس دن سکول سے واپسی پر حمین جتنا سنجیدہ تھا امامہ اس سے بھی زیادہ سنجیدہ

تھی۔۔۔ ہر روز کی طرح پر جوش سلام کا جواب سلام سے ملا تھا نہ ہی ہمیشہ کی طرح وہ

اس سے جا کر لپٹا تھا۔۔ اور نہ ہی امامہ نے ایسی کوشش کی تھی۔ اور یہ سرد مہری کا

کی۔۔ سالار نے اسے ترشی سے جھڑک دیا۔

شٹ اپ۔۔۔ حمین اور رنیسہ دونوں گم صم ہو گئے۔۔ انہوں نے سالار کے منہ سے اس طرح کے الفاظ اور اس انداز میں انکا اظہار پہلی بار دیکھا تھا۔۔

تم اب یہاں سے جاؤ۔۔ سالار نے رنیسہ سے کہا۔۔ جسکی آنکھیں اب آنسوؤں سے بھر رہی تھی اور سالار کو اندازہ تھا وہ چند لمحوں میں رونا شروع کر دینگی۔۔ اور وہ فی الحال وہاں بیٹھ کر اسے بہلانا نہیں چاہتا تھا۔

رنیسہ چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
تمہیں سکول میں بزنس کے لیے بھیجا تھا؟ سالار نے حمین سے بات چیت شروع

کر دی۔

نہیں۔۔۔

پھر کس کام کے لیے بھیجا تھا۔۔؟ سالار نے اگلا سوال کیا۔۔

پڑھنے کے لیے۔۔ حمین کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔

اور تم یہ پڑھ رہے تھے؟ سالار نے بے حد خفگی سے کہا۔۔

میں ناخوش ہوں۔۔۔ سالار نے اس سے کہا۔۔

آئی ایم سوری۔۔۔ جواب تڑ سے آیا تھا۔

تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

حمین نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ پھر اس نے باپ کو سنیکرز کے جوڑے کی وجہ سے سٹارٹ کیسے جانے والے اس بزنس کی تفصیلات بتانا شروع کی۔۔۔ سالار ٹکے بغیر سنتا رہا۔۔۔ حمین نے اب کچھ بھی نہیں چھپایا۔۔۔

جب وہ خاموش ہوا تو سالار نے اس سے پوچھا۔۔۔ وہ کانٹریکٹس کہاں ہیں جو تم نے ان سب سے سائن کروائے ہیں۔۔۔

حمین وہاں سے اٹھ کر کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد ایک فائل لیکر آگیا۔۔۔ سالار نے فائل کھول کر اسکے اندر موجود معاہدے کی شقوں پہ نظر ڈالی پھر حمین سے پوچھا۔۔۔
یہ کس نے لکھی ہے؟

میں نے خود۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ سالار اس معاہدے کو پڑھنے لگا سالار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

سالار نے فائل بند کی پھر اس سے پوچھا۔ اور جو رقم تم نے ان سب سے لی ہے وہ کہاں ہے۔۔۔۔

میرے پاس۔۔ حمین نے جواب دیا۔

کچھ خرچ کی؟ سالار نے پوچھا۔۔

نہیں۔۔ اس نے کہا۔۔۔۔

پھر سالار نے سر ہلایا اور فائل اسے دیتے ہوئے کہا۔۔ اب تم ایک لیٹر لکھو گے جس میں تم اپنے ان سب کلائنٹس سے معذرت کرو گے اور انہیں انکی رقم اور وہ چیزیں لوٹاؤ گے جو تمہارے پاس ہیں اس کے بعد تم وہ ساری چیزیں ان سب لوگوں تک واپس پہنچاؤ گے جو تم نے ایسکینج کی ہے۔۔ حمین چند لمحے ساکت رہا پھر سر ہلادیا۔

اوکے۔۔۔ اور میں یہ کیسے کروں؟ اس نے سالار سے کہا۔۔۔

تم ایک بزنس مین ہو تمہیں اگر وہ بزنس کرنا آتا تھا تو یہ بھی آنا چاہیے۔۔ سالار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر جب تم یہ کام ختم کر لو گے تو ہم دوبارہ بات کریں گے۔۔ تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔۔۔۔

اسے وہاں بیٹھے بیٹھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسکا باپ اسے کس پریشانی میں ڈال گیا تھا۔۔۔۔

اس بزنس کا وہ اگلا تجربہ حمین سکندر کی زندگی کا سب سے سبق آموز تجربہ تھا۔ وہ ایک ہفتہ کی بجائے ایک دن میں یہ کام کرنا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی دن اسے پتا چل گیا کہ سالار نے اس کام کے لیے اسے ایک ہفتہ کیوں دیا تھا۔۔۔

حمین سکندر اگلے دن سکول میں اس بزنس کے ذریعے ہونے والے بزنس معاہدوں کو ختم کرنے میں پہلی بار اسکول کے سب سے ناپسندیدہ سٹوڈنٹ کے درجے پر فائز ہو رہا تھا۔ کامیابی انسان کو ایک سبق سکھاتی ہے اور ناکامی دس۔۔۔ لیکن حمین سکندر نے پندرہ سیکھے۔۔۔

بابا آئی ایم سوری۔۔۔ گاڑی سے اترتے ہوئے سالار کو دیکھ کر لپکتی ہوئی رائیسہ اسکے پاس آئی تھی۔۔۔ وہ رائیسہ کی پہلی غلطی تھی جس پر سالار نے اسے ڈانٹا تھا اور اسے کل سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔۔۔

سالار نے اپنی اس منہ بولی بیٹی کو دیکھا جو پروانوں کی طرح اپنے ماں باپ کے گرد منڈلاتی پھرتی تھی۔۔۔

تمہیں پتا ہے تم نے کیا غلطی کی۔۔۔ سالار نے ایک دن کی خاموشی کے بعد اسکو معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یس۔۔۔ مجھے آپ کو اور مومی کو سب بتانا چاہیے تھا۔۔۔ ریسہ نے اپنے گلاسز ٹھیک کرتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔۔۔

اور؟؟ سالار نے مزید کریدا۔

اور مجھے حمین کو سپورٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن بابا میں نے اسکو سپورٹ کبھی نہیں کیا۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تم نے خاموش رہ کر اسے سپورٹ کیا۔۔۔ سالار نے کہا۔

بابا میں نے اسے منع کیا تھا لیکن اس نے مجھے کنوینس کر لیا تھا۔۔۔ ریسہ نے وضاحت دی۔

اگر اس نے تمہیں کنوینس کر لیا تھا تو پھر تم مجھے کیوں بتانا چاہتی تھی۔۔۔ سالار نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا۔۔۔ تم کنوینس نہیں ہوئی تھی تمہارے دل میں تھا کہ حمین ٹھیک کام نہیں کر رہا۔۔۔

رئیسہ نے سر ہلا دیا۔۔

یہ زیادہ بری بات تھی تمہیں پتا تھا وہ ایک غلط کام کر رہا ہے لیکن تم نے اسے کرنے

دیا۔۔ چھپایا۔۔

وہ مجھ سے ناراض ہو جاتا بابا۔۔ رئیسہ نے کہا۔

تو کیا ہوتا؟؟ سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

میں اسے ناراض نہیں کر سکتی۔۔ اس نے بے بسی سے کہا۔

اسکی ناراضگی اس سے بہتر تھی جتنی پریشانی وہ اب اٹھائے گا۔ تمہیں اندازہ ہے سکول

میں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑے گی اسے اب۔۔ رئیسہ نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔۔

وہ تمہارا بھائی ہے دوست ہے تم اس سے بہت پیار کرتی ہو میں جانتا ہوں لیکن اگر کوئی

ہمیں عزیز ہو تو اسکی غلطی ہمیں عزیز نہیں ہونی چاہیے۔۔ وہ سر ہلاتے سن رہی تھی اور

ذہن نشین کر رہی تھی۔۔۔

سالار خاموش ہوا تو رئیسہ نے سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔۔

کیا میں اب بھی آپکو اچھی لگتی ہوں بابا؟ سالار نے اسے گرد بازو پھیلا کر اسے سینے سے

ٹانگیں گھٹنوں کے بل اٹھائے۔۔۔ وہ بڑی دقت سے چل بلکہ ریگ رہا تھا لیکن رکے
 بغیر بے حد اطمینان سے وہ اس طرح ادھر سے ادھر جاتے ہوئے چہل قدمی میں
 مصروف تھا جیسے یہ اسکے چلنے کا نارمل طریقہ تھا۔ وہ جب تھک جاتا بیٹھ کر تھوڑی دیر
 سانس لیتا پھر اسی طرح چلنا شروع کر دیتا۔۔۔

یہ کیا کر رہا ہے؟ عنایہ نے اب کچھ پریشان ہو کر امامہ سے پوچھا۔۔
 پتا نہیں۔۔۔

کیا یہ چل نہیں سکتا۔۔۔ عنایہ کو تشویش ہوئی۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 پتا نہیں۔۔۔ امامہ اور کیا جواب دیتی۔۔۔

جبریل تم ذرا جا کر اسے اندر لے آؤ۔۔ جبریل اوپر والی منزل سے سیڑھی اتر رہا تھا
 ۔ جب امامہ نے پلٹ کر اسے کہا۔۔

کسے؟ جبریل نے جواباً گھڑکی کے پاس آتے ہوئے کہا اور امامہ کو اسکے سوال کا جواب
 دینے کی ضرورت نہ پڑی۔۔ اس نے ایرک کو دیکھ لیا تھا۔۔ پھر وہ رکے بنا باہر نکل
 آیا۔۔۔

کا یقین آگیا تھا۔

آج رات۔۔۔ ایرک نے پھولے ہوئے سانس کیساتھ کہا۔۔

اوہ۔۔۔۔ کیلٹریے اکثر رک کر آرام بھی کرتے ہیں، تم نہیں کرو گے؟ جبریل نے

بلاخرہ سے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔۔۔

ایرک کے لیے جیسے تنکے کو سہارا والی بات ہوئی تھی۔۔ وہ ڈھے جانے والے انداز میں

فٹ پاتھ پر چت لیٹے ہوئے بولا۔

اوہ لیس۔۔۔۔ میں بھول گیا تھا۔۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلادیا۔ اس نے جبریل کے

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

قدموں میں لیٹے لیٹے کہا۔۔

ڈونٹ مائنڈ کیلٹریے اتنی ایفرٹ کرنے کے بعد کھاتے پیتے بھی ہیں۔۔۔ جبریل نے

اسے اگلی بات یاد دلائی۔۔

آہاں۔۔۔۔ مجھے بھی کھانے کو کچھ چاہیے۔۔ ایرک کی بھوک واقعی اسکی بات سے

چمکی تھی۔ اسکے بازو اور کمر اس وقت شل ہو رہے تھے۔۔

ہمارے گھر میں کیلٹریوں کی کچھ خوراک ہے اگر تمہیں انٹرسٹ ہو تو تم جا کے کھا سکتے

ہو۔۔۔ جبریل نے کہا۔

ایرک ایک دم اسی طرح کیکڑا بنے بنے اسکے ساتھ چلنے۔ لگا جبریل رکا اور اس نے بڑی شائستگی سے اس سے کہا۔۔۔ مجھے اچھا لگے گا اگر تم کچھ دیر کے لیے دوبارہ انسان بن جاؤ۔ میری مٹی اور بہن کیکڑوں سے بہت ڈرتی ہیں۔۔۔

وہ رکا، بیٹھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جبریل کیساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے امامہ اور عنایہ کی حیران نظریں محسوس کر لی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ایرک تم کیا کر رہے تھے باہر؟ اس کے اندر آتے ہی عنایہ نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ جو اب آقا تخانہ انداز میں مسکرایا۔۔۔ یوں جیسے وہ جو چاہتا تھا حاصل کر لیا ہو۔۔۔

یہ ایرک نہیں ایک کیکڑا ہے۔ جبریل نے اس کا تعارف کرایا۔۔۔ اور بہتر ہے آئندہ اسے اسی نام سے پکارا جائے۔۔۔۔۔

تم اتنے دن سے آئے کیوں نہیں؟ امامہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

میں مصروف تھا۔۔۔ وہ اب اپنے بازو اور کلاسیاں دبا رہا تھا۔

جبریل اور عنایہ نے نظروں کا تبادلہ کیا اور ہنسی کو روکا۔ انہیں اندازہ تھا ایک کیلٹر ابن

کر پندرہ بیس منٹ چہل قدمی کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے اب۔۔۔۔

تم بعض دفعہ بے حد احمقانہ خراکتیں کرتے ہو۔ عنایہ نے اس سے کہا۔

تم واقعی ایسا سمجھتی ہو؟ ایرک اسکے تبصرے پر کچھ مضطرب ہوا۔

ہاں بلکل۔۔۔۔

ایرک کے چہرے پر اب کچھ مایوسی آئی۔

اگر تم ہمارے گھر کے اندر آنا چاہتے تھے تو اس کا سیدھا راستہ دروازے پر دستک دے کر

اجازت مانگنا ہے۔۔ کیلٹر ابن کر ہمارے گھر کے سامنے پھرنا نہیں۔۔۔ یا تم یہ چاہتے ہو

کہ ہم خود تمہیں کھینچ کھینچ کر اندر بلا لیں۔۔۔ عنایہ نے کچھ خفگی سے کہا۔

ایرک کا چہرہ سرخ ہوا۔۔ یہ شرمندگی تھی اس بات کی کہ وہ اسکی حرکت کو سمجھ گئے

تھے۔۔۔

مسز سالار مجھے پسند نہیں کرتی۔۔ ایرک نے اسکی بات کء جواب میں امامہ کو دیکھتے

ہوئے کہا۔۔ امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسکے پہلی بار سمجھانے کا

اثر ایرک پر یہ ہوگا۔۔۔۔

خیر وہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرتا خاص طور پر میں بٹ یو آر سٹل ویلکم۔۔۔ یہ
جبریل تھا۔ جو فریج سے سوفٹ ڈرنک نکال رہا تھا۔۔۔

میرے بھی تمہارے بارے میں ایسے ہی خیالات ہیں۔ ایرک نے اسے ٹکڑا توڑ جواب
دیا۔

اوہ ریٹلی۔۔۔۔ جبریل اسے زچ کر رہا تھا۔

مسز سالار۔۔۔۔ میں فریج سے کوئی ڈرنک لے سکتا ہوں؟

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں۔۔۔ جو آخری تھا وہ میں نے لے لیا لیکن تم یہ پی سکتے ہو۔۔۔ امامہ سے پہلے جبریل
نے اس سے کہا۔ اور اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ کین جس سے اس نے ابھی دو گھونٹ لیئے
تھے اسکے سامنے رکھ دیا۔ اور خود اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ عنایہ لاؤنج کی
صفائی میں امامہ کی مدد کر رہی تھی۔ ایرک کچھ دیر دیکھتا رہا پھر اس نے کین اٹھا کر
ایک ہی سانس میں اسے ختم کر لیا۔

اگر مدد کی ضرورت ہو تو میں مدد کر سکتا ہوں۔ ایرک نے انہیں آفر کی۔

تمہارے بازو اب دو دن تک کچھ اٹھانے کے قابل نہیں ہونگے اس لیے آرام کرو ہم
خود ہی کر لیں گے ایرک۔۔۔ امامہ نے جواباً اس سے کہا۔

میرا نام ایرک نہیں ہے۔۔ ایرک نے بے حد سنجیدگی سے امامہ کو جواب دیا۔۔

ہاں ہاں پتا ہے تمہارا نام اب کیلکٹرا ہے۔۔ عنایہ نے ہو اور چلاتے ہوئے مذاق اڑانے
والے انداز میں کہا۔۔

میرا نام عبداللہ ہے۔۔ امامہ اور عنایہ نے بیک وقت پہلے اسے پھر ایک دوسرے کو

دیکھا۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کیا مطلب؟ امامہ کچھ ہکا بکا سی رہ گئی۔۔۔

اب میرا نام ایرک نہیں عبداللہ ہے۔۔ ایرک نے اپنا جملہ سنجیدگی سے دہرایا۔

کس نے بدلا ہے تمہارا نام؟ عنایہ بھی دنگ تھی۔

میں نے خود۔۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

ایرک ایک بہت خوبصورت نام تھا۔۔ امامہ نے اس سے کہا۔ کیوں عنایہ؟ اس نے

روانی میں عنایہ سے پوچھا۔۔۔

عبداللہ زیادہ خوبصورت نام ہے مہی۔۔ عنایہ نے ماں کی تائید نہیں کی لیکن بڑے

جتانے والے انداز میں بتایا کہ وہ عبداللہ سے کیا مفہوم لے رہی۔۔۔

امامہ جس موضوع سے بچنا چاہتی تھی بات پھر وہی آگئی تھی۔۔۔

اس نام کا مطلب جانتے ہو؟ امامہ نے اگلا سوال کیا۔

ہاں۔۔۔ اللہ کا بندہ۔۔ اس نے ایک بار پھر امامہ کو لاجواب کر دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ

آپ سب مجھے عبداللہ کہا کرے اب۔۔ اس نے اگلا مطالبہ کیا۔۔۔

اس سے کیا ہوگا؟ اس بار امامہ کے سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔۔ واقعی اس سے کیا ہو سکتا

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تھا۔

وہ کچھ دیر ایسے ہی کھڑا رہا پھر کچھ کہے بغیر خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل

گیا۔۔۔ امامہ کو عجیب قلق ہوا۔۔۔

عبداللہ برا نہیں ہے۔۔۔ وہ عنایہ کی آواز پر کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔۔۔

عنایہ وہ ایرک ہے۔۔ صرف نام بدل لینے سے وہ عبداللہ نہیں ہو سکتا بیٹا۔۔ امامہ نے

کہنا ضروری سمجھا تھا۔ عنایہ خاموش رہی تھی۔

سالار نے اس فائل میں لگے کاغذات کو باری باری دیکھا آخری کاغذ فائل میں رکھنے کے بعد اس نے اپنے سامنے بیٹھے حمین کو دیکھا۔ فائل بند کی اور اسے واپس تھمادی۔

تو اس سارے تجربے سے تم نے کیا سیکھا؟

بہت سی باتیں۔۔ حمین نے گہرا سانس لیکر کہا۔ سالار نے اپنی ہنسی چھپائی۔۔۔

صرف دو باتیں بتادو۔

بچے اچھے کلائنٹس نہیں ہوتے۔۔۔ اس نے بے ساختہ کہا۔۔۔

اور؟؟ سالار نے پوچھا۔

بزنس آسان نہیں ہے۔۔ اس نے سالار سے کہا۔۔

درست۔۔۔ سالار نے اسکی تائید کی۔۔ پھر اس سے کہا۔۔۔ ہر وہ چیز جو اچھی لگے اور

دوسروں کی ملکیت ہو ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ ہماری پسندیدہ چیز وہی ہونی

چاہیے جو کہ ہمارے پاس ہے کسی دوسرے کی چیز چھیننے کا حق ہمیں نہیں۔۔۔

تمہیں پتا ہے انسان کے پاس سب سے طاقتور چیز کیا ہے؟ اس نے حمین سے پوچھا۔

کیا؟ حمین نے کہا۔

عقل۔۔ اگر اسکا درست استعمال آتا ہو۔ اور تمہیں پتا ہے انسان کے پاس سب سے
خطرناک چیز کیا ہے؟

کیا؟ حمین نے پھر اسی انداز میں کہا۔۔

عقل۔۔ اگر اسکا درست استعمال نہ آتا ہو تو یہ صرف دوسروں کو نہیں خود آپکو بھی تباہ
کر سکتی ہے۔

حمین جانتا تھا سالار کس کی عقل کی بات کر رہا تھا۔۔ وہ اسکی ہی بات کر رہا تھا۔۔

وہ دنیا کے دو ذہین ترین دماغ تھے۔۔ صرف باپ بیٹا نہیں۔۔ سینتالیس سال کی عمر

میں وہ ایک سود سے پاک اسلامی مالیاتی نظام کا ڈھانچہ کھڑا کر چکا تھا۔ وہ رسک لیتا تھا

چیلنج قبول کرتا تھا نئے راستے ڈھونڈنا اور بنانا جانتا تھا۔۔ برین ٹیومر سے لڑتے ہوئے

بھی وہ اپنی زندگی کے ایک ایک دن کو بامقصد گزار رہا تھا۔ ایک دنیا اسکے نام سے

واقف تھی۔۔ ایک دنیا سے مانتی تھی وہ جس فورم پہ کھڑا ہو کر بات کرتا تھا فنانس کی

دنیا کے گرو اسکو خاموشی اور توجہ سے سنتے تھے۔ وہ فنانس کی دنیا میں لیجنڈری کی

حیثیت اختیار کر چکا تھا۔۔۔۔

اس سارے تجربے نے حمین سکندر کو پہلی بار سنجیدہ کیا تھا۔ اس نے اس رات ایک بات اپنے باپ کو نہیں بتائی تھی اور وہ یہ تھی کہ اسے زندگی میں بزنس ہی کرنا تھا اپنے باپ سے زیادہ بڑا اور کامیاب بننا تھا۔ اسے دنیا کا امیر ترین آدمی بننا تھا۔۔

مئی میں قرآن پاک پڑھنا چاہتا ہوں۔ ڈنر ٹیبل پر اس رات ایرک اپنی فیملی کے ساتھ کی دنوں بعد ساتھ بیٹھا تھا۔۔ کیرولین کا بوائے فرینڈ بھی وہی تھا۔
 وہ کیا ہے؟ ایک لمحہ کو کیرولین کی سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ کہ وہ کس چیز کے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کر رہا ہے۔

مسلمز کی ہولی بک۔۔۔ جو عنایہ کی فیملی پڑھتی ہے۔ اس نے ماں کو وضاحت دی۔۔۔
 کیرولین کے پارٹنر الف نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر ان دونوں کو دیکھا۔
 تم ٹرانسلیشن پڑھنا چاہتے ہو؟ کیرولین نے کہا۔
 نہیں میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں۔۔۔ جیسے وہ پڑھتے ہیں۔۔۔ وہ سنجیدہ تھا۔

لیکن تمہیں عربی نہیں آتی۔۔ کیرولین بھی اب سنجیدہ تھی۔

ہاں لیکن جبریل مجھے سکھا دے گا۔ اس نے ماں سے کہا۔

اسکی ضرورت کیا ہے؟ کیرولین کو خاموش دیکھ کر رالف بولے بغیر نہ رہ سکا۔۔۔ یہ مسلمانوں کی ہولی بک ہے تمہیں اسکو پڑھنے کے لیے ایک نئی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ تم اسکی ٹرانسلیشن پڑھ سکتے ہو اگر تمہیں ایک کتاب کے طور پر اسے پڑھنے میں دلچسپی ہے تو۔ اس نے رالف کی بات کا جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کی۔۔۔ مئی۔۔۔ رالف کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اسنے سوالیہ انداز میں کیرولین کی طرف دیکھا۔

وہ ایک گہرا سانس لیکر رہ گئی۔ اسکے اور ایرک کے تعلقات آجکل جس نوعیت کے تھے اسمیں یہ بڑی بات تھی کہ وہ کسی کام کے لیے اس سے اجازت مانگ رہا تھا ورنہ وہ کوئی کام کر کے بھی اسے بتانے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

تمہاری اسٹڈیز متاثر ہونگی ایرک۔۔۔ کیرولین کو جو واحد مسئلہ تھا اس نے اسکا ذکر

کیا۔۔۔

وہ متاثر نہیں ہوگی امی پراس۔۔۔ اس نے فوراً ماں کو یقین دہانی کرا دی۔

اوکے ٹھیک ہے لیکن اگر تمہاری سٹڈیز متاثر ہوئی تو میں تمہیں روک دوں گی۔۔۔

ایرک کا چہرہ کھل اٹھا۔

تم کب جاؤ گے جبریل کے پاس قرآن پڑھنے؟ کیرولین نے پوچھا۔

ہفتے میں دو بار۔۔۔ ایرک نے کہا۔

ٹھیک ہے۔۔۔ وہ جیسے مطمئن ہوئی۔

آپ جبریل کی ممی کو فون کر کے بتادیں کہ آپ نے مجھے اجازت دے دی ہے

۔۔۔ ایرک نے کہا۔

ٹھیک ہے میں فون کر دوں گی۔۔۔ کیرولین نے کہا۔ ایرک شکر یہ ادا کرتے ہوئے

کھانا کھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

تم بے وقوفی کر رہی ہو۔۔۔ اس کے وہاں سے جاتے ہی رالف نے بے حد ناخوش انداز

میں کیرولین سے کہا۔

کیسی بے وقوفی؟ وہ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھی تھی۔۔۔

تمہارا بیٹا پہلے ہی تمہارے لیے درد سر بنا ہوا ہے اور تم اسے قرآن پاک اور عربی سیکھنے بھیج رہی ہو تاکہ وہ انتہا پسند ہو جائے۔۔۔ وہ بھی ایک۔ مسلمان خاندان کے پاس۔۔۔

کیرو لین ہنس پڑی تھی۔

تم اس خاندان کو جانتے نہیں ہو رالف۔۔۔ میں ساڑھے تین سال سے جانتی ہوں نیرز ہیں ہمارے۔۔۔ جیمز کی موت کے بعد انہوں نے ہمارا بہت خیال رکھا میں مارک اور سبل کو اکثر ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر جاتی تھی۔ وہ ایرک کو کچھ برا نہیں سکھائیں گے سکھانا ہوتا تو اسے میری اجازت کے بنا بھی سکھانا شروع کر دیتے۔ مجھے کیسے پتا چلتا۔۔۔

کیرو لین کہہ رہی تھی۔۔۔

تم پھر بھی سوچ لو۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ ایک ڈسٹر بڈ بچے کو قرآن پڑھانا۔ وہ اگر مسلمانوں کی طرح تشدد پسند ہو گیا تو؟ رالف کے اپنے خدشات تھے۔۔۔

ایرک اس اجازت کے اگلے ہی دن دوبارہ امامہ اور سالار کے گھر پہنچ گیا۔۔۔ جبریل کے

پاس قرآن پاک کا آغاز کرنے۔۔۔

وہ ایک دن پہلے بھی اسی طرح جبریل کے پاس گیا تھا وہ اس وقت قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ ایرک اسکے پاس جا کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اسکے پاس اتنی دیر تک بیٹھا رہا کہ جبریل کو بلا آخر تلاوت ختم کر کے اس سے پوچھنا پڑا تھا کہ وہ وہاں کسی کام سے تو نہیں آیا تھا۔؟ میں بھی ایسے قرآن پاک پڑھنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ جیسے تم پڑھ رہے ہو۔ اس نے جبریل کو جواب دیا۔ وہ اسکی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

میری تو یہ مذہبی کتاب ہے اس لیے پڑھ رہا ہوں میں تم پڑھ کر کیا کرو گے۔۔۔ اس نے ایرک کو سمجھانے کی کوشش کی۔

مجھے دلچسپی ہے جاننے میں اور مجھے اچھا لگتا ہے جب تم تلاوت کرتے ہو۔۔۔ ایرک نے جواباً کہا۔۔۔ تم انٹرنیٹ پر ٹرانسلیشن پڑھ سکتے ہو یا میں تمہیں دے دوں گا ایک انگلش ٹرانسلیشن۔۔۔ اور تمہیں تلاوت اچھی لگتی ہے تو تم وہ بھی وہاں سے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہو۔۔۔ تمہیں اسکے لیے قرآن پاک کی تلاوت سیکھنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ جبریل نے نرمی سے اسے جیسے راستہ دکھایا تھا۔

لیکن میں ٹرانسلیشن نہیں پڑھنا چاہتا اور میں تلاوت سننا نہیں خود کرنا چاہتا ہوں جیسے تم کرتے ہو۔

ایرک اب بھی مصر تھا۔

یہ بہت لمبا کام ہے ایرک ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ جبریل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ نہ ٹلا۔۔

کتنا لمبا کام ہے؟ ایرک نے پوچھا۔

تمہیں تو کی سال لگ جائیں گے۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اوہ تو کوئی مسئلہ نہیں میرے پاس بہت وقت ہے ایرک نے مطمئن ہو کر کہا۔

جبریل عجب مشکل میں پڑ گیا تھا۔

تم سب سے پہلے اپنی ممی سے پوچھو۔۔ جبریل نے بلا آخر کہا۔۔۔

ممی کو کوئی ایشو نہیں ہو گا مجھے پتا ہے۔۔ اس نے جبریل کو یقین دلانے کی کوشش کی۔۔

اگر انہیں کوئی ایشو نہیں ہو گا تو انہیں یہ بات ممی سے یا مجھ سے کہنی ہو گی۔۔۔ جبریل

اسکی یقین دہانی سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

میں اپنے لیے کچھ بھی فیصلہ کر سکتا ہوں۔۔۔ مجھے ہر کام مئی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ایرک نے اس سے کہا۔

تم ابھی چھوٹے ہو ایرک اور زیادہ سمجھدار بھی نہیں ہو جب تک تم اٹھارہ سال کے نہیں ہو جاتے۔ تمہیں اپنا ہر کام مئی سے پوچھ کر کرنا چاہیے۔۔۔ اور یہ کوئی بری بات نہیں۔۔۔ جبریل نے اسے سمجھایا تھا۔۔۔

بلاخر ایرک نے ہارمان لی۔ اور اگلے دن ماں کی اجازت کیساتھ آنے کا کہا۔۔۔

امامہ کے لیے کیرولین کی فون کال ایک سرپرائز تھی۔ اس نے بڑے خوشگوار انداز میں اس سے بات چیت کرتے ہوئے امامہ کو اس اجازت کے بارے میں بتایا تھا جو اس نے ایرک کو دی تھی اور امامہ حیران رہ گئی۔

اسے ایرک اور جبریل کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم نہیں تھا۔

مئی مجھے یقین تھا نہ وہ اپنی مئی سے بات کریگا نہ ہی وہ اسے اجازت دینگی۔۔۔ جبریل نے ماں کے استفسار پر اسے بتایا۔

لیکن اب اسکی ممی نے مجھے کال کر کے کہا ہے کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو اب کیا کریں؟؟؟ امامہ نے کہا۔

کیا کرنا ہے۔۔۔ وہ ہنس پڑا۔۔۔ قرآن پاک سکھاؤں گا سے اب۔۔۔ جبریل نے ماں سے کہا تھا۔۔۔

اسے اپنے جواب پہ امامہ کے چہرے پہ خوشی نظر نہیں آئی۔

آپ کو پریشانی کس بات کی ہے۔ جبریل نے جیسے ماں کو کریدنے کی کوشش کی۔ امامہ اس سے کہہ نہ سکی کہ اسے سارا مسئلہ عنایہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔۔۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ جو بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہی ہوتا ہے اور ہم کچھ بھی بدلنے پہ قادر نہیں ہے۔۔۔ ٹھیک ہے ایرک تم سے قرآن پاک سیکھنا چاہتا ہے تو تم اسے سکھاؤ۔۔۔ امامہ نے بلاخر جیسے ہتھیار ڈال دیے۔۔۔

گیارہ سال کی عمر میں قرآن پاک سے ایرک کا وہ پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ اس سے پہلے وہ اس کتاب کا صرف نام جانتا تھا۔۔۔ جنرل نانج کے طور پہ۔۔۔

وہ سالار اور امامہ کے گھر جا کر مسلمانوں کے قریب ہوا تھا اور جبریل کی تلاوت سن سن کر وہ قرآن پاک سے متاثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔۔۔ وہ زبان اور وہ تلاوت اسے جیسے کسی فینٹسی میں لے جاتی تھی۔۔

جس دن اس نے جبریل سے قرآنی قاعدہ کا پہلا سبق لیا تھا اس رات اس نے آنلائن قرآن پاک کا پورا انگلش ترجمہ پڑھ لیا تھا۔۔۔ وہ کتابیں پڑھنے کا شوقین اور عادی تھا اور اس نے قرآن کو بھی ایک کتاب کے طور پر پڑھا تھا۔ بہت ساری چیزوں کو سمجھتے ہوئے بہت سی چیزوں کو نہ سمجھتے ہوئے بہت سی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے بہت سے احکامات سے الجھتے ہوئے بہت سارے واقعات کو اپنی کتاب بائبل سے منسلک کرتے ہوئے۔

جبریل کو حیرت نہیں ہوئی تھی جب اگلے دن ایرک نے اسے قرآنی قاعدہ کا سبق بلکل ٹھیک ٹھیک سنایا تھا۔ لیکن وہ یہ جان کر خاموش ضرور ہو گیا تھا کہ ایرک نے ایک رات میں بیٹھ کر قرآن پاک کا پورا ترجمہ پڑھ لیا تھا۔۔

اس کا فائدہ کیا ہوا؟ جبریل نے اس سے پوچھا۔۔

کس چیز کا؟ قرآن پاک پڑھنے کا؟ ایرک نے اسکے سوال کی وضاحت چاہی۔

ہاں۔۔۔۔ جبریل نے جواب دیا۔

ایرک کو کوئی جواب نہیں سوچھا۔ اسکا خیال تھا کہ جبریل اس سے متاثر ہوگا۔ وہ متاثر نہیں ہوا تھا لٹا اس سے سوال کر رہا تھا۔

فائدہ تو نہیں سوچا میں نے۔۔ میں نے تو بس تجسس میں پڑھا ہے قرآن پاک۔۔ ایرک نے کہا۔

تو اب تمہاری کیا رائے ہے قرآن پاک کے بارے میں؟ اب بھی سیکھنا چاہتے ہو؟
جبریل نے اس سے پوچھا۔

ہاں۔۔۔ اب اور بھی زیادہ۔۔ ایرک نے کہا۔ مجھے یہ بے حد انٹر سٹنگ لگی ہے۔۔۔

جبریل اسکی بات پہ۔ مسکرایا تھا۔۔ مقدس کتابوں کو صرف پڑھ لینا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ جبریل نے اس سے کہا تھا۔ اسے پڑھنے کیساتھ ساتھ اس پہ عمل بھی ضروری ہے۔۔۔

ایرک اس کو بغور دیکھتے ہوئے اسکی بات سن رہا تھا۔

حقوق و فرائض کا خیال رکھیں۔ خاص طور پر انکا جو ہماری ذمہ داری ہے۔ جیسے تمہارے چھوٹے بہن بھائی اور تمہاری مئی تمہاری ذمہ داری ہیں۔۔۔ جبریل بڑی ذہانت سے گفتگو کو اس موضوع کی طرف موڑ رہا تھا جس پہ وہ ایرک سے بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔ تو اب تم نے دیکھنا ہے کہ۔ جس دن تم قرآن پڑھ کر جاتے ہو اس دن تمہارے اندر کیا تبدیلی آتی ہے۔ اس دن تم اپنی فیملی کے لیے اور دوسروں کے لیے کیا اچھا کام کرتے ہو۔۔۔ جبریل نے جیسے اسے چیلنج دیا تھا۔

میں کوشش کروں گا۔ ایرک نے وہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔ پھر اس نے جیسے اسکی مدد مانگی۔۔۔ تو آج میں گھر جا کر کیا کروں؟؟

تم آج ایسا کام مت کرنا جس سے تمہاری مئی اپ سیٹ ہوتی ہے۔۔

جبریل نے اس سے کہا۔ ایرک کچھ نخل ہوا۔

تم مجھے عبداللہ کہا کرو۔ ایرک نے جان بوجھ کر موضوع بدلنے کے لیے اسے ٹوکا۔

عبداللہ تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ مہربان سب کا خیال رکھنے والا اور سب کا

احساس کرنے والا۔۔ کسی کو تکلیف نہ دینے والا۔ میں تمہیں عبداللہ تب کہنا شروع

کروں گا جب تم سب سے پہلے اپنی ممی کو تکلیف دینا بند کرو گے۔

جبریل نے اسکی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ ایرک جیسے کچھ اور نجل ہوا۔ ایک۔ لمحے کے لیے اسے لگا کہ جبریل اس سے جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اسکی ممی کے کہنے پہ کہہ رہا تھا لیکن اس نے خاموشی سے بات مان لی۔۔

اس دن ایرک گھر جا کر پہلی بار رالف سے خوشدلی سے ملا تھا۔ رالف اور کیرولین کو ایک لمحے کے لیے لگا شاید ایرک سے غلطی ہوئی ہے یا پھر انہیں وہم ہو رہا ہے۔۔ اس نے پہلی بار رالف سے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا تھا۔۔۔

ایرک ر کے بغیر وہاں سے چلا گیا۔۔ رالف اور کیرولین نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔

اس کو کیا ہوا؟ رالف نے کچھ خوشگوار حیرت سے کہا۔۔۔

پتا نہیں۔۔۔ کیرولین نے لاعلمی۔ کا اظہار کیا۔

وہ پہلی تبدیلی نہیں تھی جو ایرک میں آئی تھی وہ آہستہ آہستہ مزید تبدیل ہوتا گیا۔۔۔ قرآن پاک کا سبق اب ہر روز وہ لینے جایا کرتا تھا اگر کبھی جبریل نہ ہوتا تو حمین یا

امامہ اسے سبق پڑھادیتے لیکن ایرک کو یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں تھا کہ جیسے جبریل اسے پڑھاتا تھا ویسے کوئی نہیں پڑھا سکتا تھا۔

اس گھر میں ایرک کی جڑیں اب زیادہ گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔۔ امامہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود۔۔۔

جبریل لوگوں کو نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں متاثر کرتا تھا۔۔ تیرہ سال کی عمر میں اسکا ٹھہراؤ عام بچوں کے برعکس تھا۔۔ سالار کی بیماری نے امامہ کے ساتھ اسے بھی بدل دیا تھا۔ اس نے امریکہ میں سالار کی سر جری اور اسکے بعد وہاں امامہ کے قیام کے دوران تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی پرواہ کسی باپ کی طرح کی تھی۔۔ سکندر اور طیبه سالار کے بچوں کی تربیت سے پہلے بھی متاثر تھے لیکن انکی غیر موجودگی میں جبریل نے جس طرح انکے گھر پر اپنے بہن بھائی کا خیال رکھا تھا وہ انکو مزید متاثر کر گیا تھا۔۔ ایک دس سالہ بچہ کی مہینے اپنے کھیل کو اپنی سر گرمیاں بھلا بیٹھا تھا اور یہی وہ وقت تھا۔ جب جبریل ذہنی طور پر بھی بدلتا گیا۔

تیرہ سال کی عمر میں ہائی سکول سے ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کر کے یونیورسٹی جانے

والا وہ اپنے سکول کا پہلا اسٹوڈنٹ تھا۔ اور وہ وہاں بل گیس فاؤنڈیشن کی ایک اسکالرشپ پر پہنچا تھا۔ وہ پہلی سیڑھی تھی جو میڈیسن کی طرف جاتے ہوئے اس نے چڑھی تھی۔ سالار سکندر کے خاندان کا پہلا پرندہ یونیورسٹی پہنچ چکا تھا۔۔۔

+++++-----+++++

گرینڈ حیات ہوٹل کا بال روم اس وقت نیشنل اسپیلنگ بی کے 93 ویں مقابلے کے فائنلسٹ کا پہلا راؤنڈ منعقد کروانے کے لیے تیار تھا۔ حمین سکندر اپنے ٹائٹل کا دفاع کر رہا تھا۔ اور رییس سالار اس مقابلے میں پہلی دفعہ حصہ لے رہی تھی۔۔۔

رییس اس وقت اسٹیج پر اپنے پہلے لفظ کے بولے جانے کے انتظار میں تھی۔ رییس نے پوچھا جانے والا لفظ بے حد غور سے سنا تھا۔ وہ لفظ غیر مانوس نہیں تھا۔ وہ انہی الفاظ میں شامل تھا جسکی اس نے تیاری کی تھی۔

Crustaceology

اس نے زیر لب اس لفظ کو دہرایا پھر بنا آواز کے اسکے جے کیسے اور پھر بلا آخر اس نے اس لفظ کو جے کرنا شروع کیا۔۔۔

C.r.u.s.t.a.c.o.l.o.g.y

رئیسہ نے بے یقینی کے عالم میں اس گھنٹی کو سنا تھا جو لفظ غلط ہونے پر بجی تھی۔ اسکا رنگ فق ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ حمین سکندر کا جسے اسکے بولنے کے دوران ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے کیا غلطی کی تھی۔۔ ہال میں امامہ اور سالار جبریل اور عنایہ کیساتھ عجیب سی کیفیت میں بیٹھے تھے وہ اس کی توقع بہت پہلے سے کر رہے تھے۔ رئیسہ کا فائنل راؤنڈ تک پہنچنا بھی انکے لیے ناقابل یقین ہی تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر پر فارمنس دکھائی تھی۔۔ وہ پہلا مکا تھا جو رئیسہ نے سیدھامنہ پہ کھایا تھا۔ حمین اس سے کچھ کرسیوں کے فاصلے پر تھا۔ انکے درمیان کچھ اور فائنلسٹ تھے۔۔ لیکن اسکے باوجود اس نے اٹھ کر رئیسہ کی کرسی پر آکر اسکا کندھا تھپکا تھا۔۔ حمین سکندر اسٹیج پر اب پہلے لفظ کے لیے کھڑا تھا اور اسکا استقبال تالیوں کیساتھ ہوا تھا۔ وہ اگر پچھلے سال ڈارلنگ آف دی کراؤڈ تھا تو اس سال بھی وہ ہاٹ فیورٹ کے طور پہ مقابلے میں کھڑا تھا۔ پچھلے سارے راؤنڈز میں اس نے مشکل ترین الفاظ کو حلوائے کی طرح بوجھا تھا۔۔۔

Vignettee

اسکا لفظ بولا جا رہا تھا۔۔ وہ حمین سکندر کے لیے ایک اور حلوہ تھا۔ وہ اس سے زیادہ مشکل اور لمبے الفاظ کے ہجے کر چکا تھا۔۔ رنیسہ نے بھی زیر لب کی دوسرے فائنلسٹس کی طرح وہ لفظ ہجوں کی طرح درست طور پر ادا کیا۔۔

V.i.g.n.e.t.t.e

بیل بجی۔۔ ہال میں سکتہ ہوا پھر سرگوشیاں ابھریں۔۔ پھر پروناؤنسر نے درست اسپیلنگ ادا کیے۔ حمین نے سر جھکا کر جیسے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اپنی کرسی کی طرف چلنا شروع کیا۔۔۔

وہ اس مقابلے کا پہلا اپ سیٹ تھا پچھلے سال کا چیمپئن اپنے پہلے ہی لفظ کو ہجے کرنے میں ناکام رہا تھا۔۔۔ ہال میں بیٹھے سالار امامہ جبریل اور عنایہ بیک وقت پریشانی کی ایک عجیب کیفیت سے گزر رہے تھے۔۔ وہ ایک ہی راؤنڈ میں رنیسہ کی ناکامی دیکھ کر حمین کی کامیابی پہ تالیاں نہیں بجانا چاہتے تھے اور انہیں بجانی بھی نہیں پڑی تھی لیکن حمین سے لفظ نہ بوجھنا غیر متوقع تھا۔۔

لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا اس دن انہیں وہاں بیٹھے مقابلے کے آخر تک اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔

رئیسہ اگلے دو لفظ بھی نہ بوجھ سکی تھی اور حمین سکندر بھی۔۔ وہ دونوں فائنل مقابلے کے ابتدائی مرحلے میں ہی مقابلے سے آؤٹ ہو گئے تھے۔۔

رئیسہ کی یہ پرفارمنس غیر متوقع نہیں تھی لیکن حمین سکندر کی ایسی پرفارمنس اس رات ایک بریکنگ نیوز تھی۔۔ پچھلے سال کا چیمپئن مقابلے سے آؤٹ ہو گیا تھا۔ اور حمین کے چہرے کا اطمینان ویسا ہی تھا جیسے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔۔۔ وہ دونوں مقابلے سے باہر ہونے کے بعد اپنے ماں باپ کے پاس آکت بیٹھ گئے تھے۔

دونوں نے ان دونوں کو تھپکا تھا۔۔ تسلی دی تھی۔۔ یہ ہی کام جبریل اور عنایہ نے بھی کیا تھا۔

بہت اچھے۔۔۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کا حوصلہ بندھایا تھا۔۔۔۔۔

انہوں نے اس سال کے نئے چیمپئن کو بھی دیکھا تھا اور ان انعامات کے ڈھیر کو بھی جو اس پر نچھاور کیے جا رہے تھے۔۔۔ رئیسہ کا غم جیسے کچھ اور بھی بڑھا۔۔ وہ سالار سکندر کا نام روشن نہ کر سکی تھی۔ جیسے انکے بڑے بہن بھائی کرتے تھے۔ وہ ان جیسی نہیں تھی۔ اسے شدید احساس کمتری ہوا۔۔۔ وہ سب اس سے بہتر شکل و صورت کے

تھے اس سے بہترین ذہنی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی طرح انکا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

انکے گھر میں لانے والی ٹرافیز میڈلز میں اسکا بہت تھوڑا حصہ تھا۔۔ آج پہلی بار وہ رنجیدہ ہوئی تھی۔

تم ادا اس ہو؟ یہ حمین کی سرگوشی تھی۔ جو اس نے گاڑی میں ہونے والی سب کی گفتگو کے درمیان اسکے کان میں کی تھی۔۔۔

نہیں۔۔۔ رئیسہ نے اسی انداز میں جواب دیا۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
مجھے پتا ہے تم ادا اس ہو حمین نے ایک اور سرگوشی کی۔۔

تم نیکسٹ ایئر جیت سکتی ہو۔۔ اس نے جیسے رئیسہ کو آس دلای۔

مجھے پتا ہے۔۔ لیکن اگلا سال بہت دور ہے۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔۔

حمین نے اسکی کمر میں گدگدی کرنے کی کوشش کی وہ سکڑ کر پیچھے ہٹی۔۔۔ اسے ہنسی نہیں آئی تھی۔۔۔ وہ ہنسنا چاہتی بھی نہیں تھی۔۔

میں بھی تو ہارا ہوں۔۔ حمین کو اسکے موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا۔

تم جیتے بھی تو تھے نا۔ اس نے جواباً کہا۔

وہ تو یوں ہی تکالگ گیا تھا۔ اس نے جیسے اپنا ہی مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

رئیسہ جو اب دینے کی بجائے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ یہ جیسے اعلان تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی .

رئیسہ اپ سیٹ ہے۔ اس رات سالار نے امامہ سے سونے سے پہلے کہا تھا۔

میں جانتی ہوں اور اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس مقابلے میں حصہ لیتی جن میں باقی تینوں ٹرافیز جیت چکے تھے لیکن تم نے منع نہیں کیا اسے۔۔ امامہ نے اس سے

کہا۔

میں کیسے اسے منع کرتا۔ یہ کہتا کہ تم نہیں جیت سکتی۔۔ اس لیے مت حصہ لو۔ اور پھر

وہ فائنل راؤنڈ تک پہنچی۔ بہت اچھا کھیلی ہے۔ یہ زیادہ اہم۔ چیز ہے۔ سالار نے اپنے

ہاتھ سے گھڑی اتارتے ہوئے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

وہ بہت سمجھدار ہے ایک دو دن تک ٹھیک ہو جائے گی جب میں اسے سمجھاؤں گی کہ

حمین بھی تو ہارا ہے لیکن اسے پرواہ تک نہیں۔۔ اسے اپنے سے زیادہ ریسہ ہی کی فکر تھی امامہ نے کہا۔

اسے فکر کیوں ہوگی۔ وہ تو اپنی مرضی سے ہارا ہے۔ سالار نے بے حد اطمینان سے کہا۔
امامہ ٹھٹک گئی۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔۔؟

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔۔ تمہیں اندازہ نہیں ہوا؟

کس بات کا؟ کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔ امامہ نے خود سوال پوچھا اور خود ہی جواب دیا۔

تم پوچھ لینا اس سے کہ۔ ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں۔۔ سالار نے بحث کیسے بغیر اس سے کہا۔۔ وہ اب سونے کے لیٹے لیٹ گیا۔ امامہ ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔۔ پھر جیسے اس نے جھلا کر کہا۔۔۔۔

تم باپ بیٹا عجیب ہو۔ بلکہ عجیب ایک مہذب لفظ ہے۔۔۔

تم جبریل کو مائنس کیوں کر جاتی ہو ہر بار۔۔ سالار نے اسے چھیڑا۔ شکر ہے وہ حمین اور تمہاری طرح نہیں ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا حمین کیوں اس طرح کریگا۔۔۔ وہ

اب الجھی ہوئی تھی۔۔۔

رئیسہ کے لینے۔۔۔ سالار نے جواباً اس سے کہا۔۔۔

اور مجھے اس پر فخر ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ لی اور سائڈ ٹیبل لیمپ آف

کر دیا۔۔۔

وہ غلط نہیں کہتی تھی وہ دونوں باپ بیٹا ہی عجیب تھے۔۔۔

-----+

رئیسہ تم سو کیوں نہیں رہی؟ عنایہ نے اسے ایک کتاب کھولے سٹڈی ٹیبل پر بیٹھے دیکھ

کر پوچھا تھا۔

میں وہ الفاظ دیکھنا اور یاد کرنا چاہتی ہوں جو مجھے نہیں آتے۔۔۔ عنایہ اسے دیکھ کر رہ

گی۔۔۔

انہیں ابھی گھر واپس آئے ایک گھنٹہ ہی ہوا ہو گا اور وہ ایک بار پھر سے کتاب لیکر بیٹھ گی

تھی۔۔۔

تم نے پہلے ہی بہت محنت کی ہے رئیسہ یہ صرف تمہاری بد قسمتی تھی۔۔۔ عنایہ کو اندازہ

نہیں ہو اوہ اسے تسلی دینے کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی وہ بڑے غلط تھے
۔۔ وہ الفاظ ریسہ کے دماغ میں جیسے کھب گئے تھے۔۔

اب سو جاؤ۔۔۔ عنایہ نے کسی بڑے کی طرح اسے تھپکا تھا۔

میں نہیں سو سکتی۔ مدھم آواز میں ریسہ نے کہا۔

عنایہ کو یوں لگا جیسے ریسہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔۔ ریسہ نے کتاب بند کر کے
ٹیبیل پہ رکھی اور پھر وہاں سے اٹھ کر بستر پہ آئی اور اوندھے منہ لیٹ کر اس نے بلک

بلک کر رونا شروع کر دیا۔۔۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ریسہ۔۔۔۔۔ ریسہ پلینز۔۔۔۔۔ عنایہ خود بھی روہانسی ہو گئی تھی۔ ریسہ چھوٹی

چھوٹی بات پہ رونے والی بچی نہیں۔ تھی اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ریسہ اپنے بد قسمت

ہونے پر رو رہی تھی۔۔۔

”تم کیا کر رہے ہو اس وقت؟“ امامہ لاؤنج میں ہونے والی کھڑکھڑاہٹوں کو سن کر

رات کے اُس وقت باہر نکل آئی تھی، وہ اُس وقت تہجد کے لیے اٹھی تھی جبریل اس

ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا اور کئی بار وہ بھی رات کے اس پہر پڑھنے کے لیے جاگتا اور پھر

کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے کچن جاتا۔ مگر اس بار اُس کا سامنا حمین سے ہوا تھا۔ وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑی ایک سٹول پر بیٹھا سلپنگ سوٹ میں ملبوس آئس کریم کا ایک لیٹر والا کین کھولے اُسی میں سے آئس کریم کھانے میں لگا ہوا تھا۔

امامہ کو سوال کرنے کے ساتھ ہی جواب مل گیا تھا اور اُس نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد خفگی کے عالم میں کاؤنٹر کے سامنے آتے ہوئے اُس سے کہا۔

”حمین یہ وقت ہے آئس کریم کھانے کا اور وہ بھی اس طرح؟“ اُس کا اشارہ اُس کے

کین کے اندر ہی آئس کریم کھانے کی طرف تھا۔

”میں نے صرف ایک سکوپ کھانی تھی“ وہ ماں کے یک دم نمودار ہونے اور اپنے

اس طرح پکڑے جانے پر گڑ بڑایا تھا۔

”لیکن یہ کھانے کا کوئی وقت نہیں ہے۔“ امامہ نے اُس کے ہاتھ سے چچ کھینچ لیا اور

ڈھکن سے کین بند کرنے لگی۔

”ابھی تو واقعی ایک چچ ہی کھائی ہے میں نے۔“ وہ بے اختیار کراہا۔ ”دانت صاف کر

کے سونا۔“ امامہ نے اُس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کین کو واپس فریزر میں

رکھ دیا۔ حمین جیسے احتجاجاً اسی انداز میں سٹول پر بیٹھا رہا۔

”ایک تو میں آج ہارا اور میں نے اپنا ٹائٹل کھو دیا... دوسرا آپ مجھے آؤس کریم کے دو سکوپس تک نہیں لینے دے رہیں۔“ اس نے جیسے ماں سے احتجاجاً کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے مدہم آواز میں کہا۔

”ٹائٹل تم نے اپنی مرضی سے کھویا ہے تمہاری اپنی چوائس تھی یہ۔“ حمین کو جیسے کرنٹ لگا تھا وہ ماں کو دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا ”who told you that?“

”یہ ضروری نہیں۔“ امامہ نے کہا۔ ”Alright ...“ مجھے پتہ ہے۔“ اُس نے ماں سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”کس نے؟“ امامہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”بابا نے۔“ اس کا جواب کھٹاک سے آیا تھا وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کو ہاتھ کی پشت کی طرح جانتے تھے۔

”بہت غلط کام تھا... تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ امامہ نے جیسے اسے ملامت کرنے

کی کوشش کی۔ ”تم نے یہ کیوں کیا؟“ امامہ کو پوچھنا پڑا۔ ”آپ جانتی ہیں مُمی“ وہ سٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”رئیسہ کے لیے؟“ امامہ نے وہ جواب دیا جس کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا۔ ”فیملی کے لیے...“ جواب کھٹاک سے آیا تھا ”آپ نے سکھایا تھا اپنے بہن بھائیوں سے مقابلہ نہیں ہوتا... میں جیت جاتا تو اُسے ہرا کے ہی جیتتا نا... اُسے بہت دکھ ہوتا۔“ امامہ بول نہیں سکی۔ وہ دس سال کو تھا لیکن بعض دفعہ وہ 100 سال کی عمر والوں جیسی باتیں کرتا تھا، اُسے سمجھ نہیں آئی، وہ اُس سے کیا کہتی۔ ڈانٹتی؟ نصیحت کرتی؟ حمین سکندر لاجواب نہیں کرتا تھا بے بس کر دیتا تھا۔

”Goodnight“ وہ اب وہاں سے چلا گیا تھا۔ امامہ اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اُن سب کا اُس کے بارے میں یہ خیال تھا کہ حمین صرف اپنے بارے میں سوچتا تھا... وہ لاپرواہ تھا... حساس نہیں تھا نہ ہی وہ دوسروں کا زیادہ احساس کرتا تھا۔

بڑوں کے بعض خیالات اور بعض اندازے بچے بڑے غلط موقع پر غلط ثابت کرتے ہیں۔ امامہ چپ چاپ کھڑی اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ سالار نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے اپنی اولاد پر فخر ہوا تھا۔

”بابا آپ رییسہ سے بات کر سکتے ہیں؟“ عنایہ نے ایک دو دن بعد سالار سے کہا، وہ اس وقت ابھی آفس سے واپس آیا تھا اور کچھ دیر میں اُسے پھر کہیں جانے کے لیے نکلنا تھا۔ جب عنایہ اس کے پاس آگئی تھی اور اُس نے بنا تمہید اس سے کہا تھا۔

”کس بارے میں؟“ سالار نے جیسے کچھ حیران ہو کر پوچھا فوری طور پر اُس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی، جس پر اُسے رییسہ سے بات کرنی پڑتی۔

”وہ اپ سیٹ ہے... وہی spelling bee کی وجہ سے۔“ عنایہ نے اُس کو بتانا شروع کیا۔ ”میں اس کو سمجھا رہی ہوں لیکن مجھے لگتا ہے میری بات اسے سمجھ نہیں آرہیں۔ وہ دوبارہ spelling bee میں حصہ لینا چاہتی ہے اور وہ ہر روز رات کو بیٹھ کر تیاری کرتی ہے اور مجھے بھی کہتی ہے کہ میں اُس کی تیاری کرواؤں۔“ عنایہ اب اُسے تفصیل سے مسئلہ سمجھا رہی تھی۔ ”پہلے تو حمین تیاری کروا رہا تھا اُسے۔“ سالار کو یاد آیا۔ ”ہاں حمین اور میں نے دونوں نے کروائی تھی لیکن اب وہ مجھ سے کہتی ہے کہ میں اُسے تیاری کرواؤں۔ I don't mind doing that... لیکن مجھے

نہیں پتہ کہ اسے دوبارہ حصہ لینا چاہیے یا نہیں... پھر ابھی تو ایک سال پڑا ہے اس مقابلے میں... اسے اپنی سٹڈیز پر زیادہ دھیان دینا چاہیے۔“ عنایہ دھیمے لہجے میں باپ کو

سب بتاتی گئی تھی۔ سالار کو غلطی کا احساس ہوا، انہیں ریسہ سے فوری طور پر بات کرنی چاہیے تھی یہ ان کی غلط فہمی تھی کہ وہ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جاتی۔ اُسے بھیجو۔ ”اُس نے عنایہ سے کہا، وہ چلی گئی۔ سالار نے اپنی گھڑی دیکھی اُس کے پاس 20 منٹ تھے گھر سے نکلنے کے لیے۔ وہ کپڑے پہلے ہی تبدیل کر چکا تھا اور اب کچھ فائلز دیکھ رہا تھا۔ ریسہ اور عنایہ امامہ کی نسبت اُس سے زیادہ قریب تھیں۔ انہیں جو بھی اہم بات کرنی ہوتی تھی وہ امامہ سے بھی پہلے سالار سے کرتی تھیں۔

”بابا“ دروازے پر دستک دے کر ریسہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ”آؤ بیٹا“ صوفے پر بیٹھے ہوئے سالار نے استقبالیہ انداز میں اپنا ایک بازو پھیلا یا تھا، وہ اُس کے قریب صوفہ پر آ کر بیٹھ گئی سالار نے اُسے صوفہ سے اٹھا کر سامنے پڑی سینٹر ٹیبل پر بٹھا دیا وہ کچھ جزبہ ہوئی تھی لیکن اُس نے احتجاج نہیں کیا، وہ دونوں اب بالکل آمنے سامنے تھے۔ سالار کچھ دیر کے لئے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ گول شیشوں والی عینک سے اُسے دیکھتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح بے حد توجہ سے اُس کی بات سننے کی منتظر تھی... اُس کے گھنے سیاہ بالوں میں بندھا ہوا ربن تھوڑا ڈھیلا تھا جو اُس کے کندھوں سے کچھ نیچے جانے والے بالوں کو گڈمی سے لے کر سر کے بالکل درمیان تک باندھے ہوئے تھا لیکن ایک

طرف ڈھلکا ہوا تھا... ماتھے پر آنے والے بالوں کو روکنے کے لئے رنگ برنگی ہیریز ربنز سے اُس کا سر بھرا ہوا تھا، یہ عنایہ کا کارنامہ تھا، رنیسہ کو ہیریز ربنز پسند تھے۔ سالار کو یاد بھی نہیں تھا وہ اُس کے لئے کتنے ربنز خرید چکا تھا لیکن ہر روز بدلے جانے والے کپڑوں کے ساتھ میچنگ ربنز دیکھ کر انہیں بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ رنیسہ اس معاملے میں خود کفیل تھی۔

”عنایہ نے مجھے بتایا تم اپ سیٹ ہو...“ سالار نے بالآخر بات کا آغاز کیا۔ وہ یک دم بلش ہوئی۔ ”نہیں... نہیں تو۔“ اس نے گڑ بڑا کر سالار سے کہا۔ سالار اُسے دیکھتا رہا، رنیسہ نے چند لمحے اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی، پھر نظریں چرائیں پھر جیسے کچھ مدافعانہ انداز میں ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”I am not very upset...Just a little bit“ اُس نے اب سر

جھکا لیا تھا۔ ”And why is that?“ سالار نے جواباً پوچھا۔

”Because I am very unlcky“ اس نے بے حد ہلکی آواز میں کہا

سالار بول ہی نہیں سکا۔ اُسے اُس سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔

”That’s so wrong to say Raeesa.“ سالار سیدھا بیٹھے بیٹھے

آگے کوچھک گیا، وہ اب کمنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اُس کے ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے گرے تھے۔ وہ سر جھکائے باپ کے سامنے بیٹھی اب رو رہی تھی۔ اُس کے گلاسز دھندلا گئے تھے۔ سالار کو تکلیف ہوئی، یہ پہلا موقع تھا اُس نے رنیسہ کو اس طرح روتے دیکھا تھا۔ عنایہ بات بات پر رو پڑنے والی تھی، رنیسہ نہیں۔

“I am” وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ “No you are not” سالار نے اُس کے گلاسز اتارتے ہوئے انہیں میز پر رکھا اور رنیسہ کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ وہ باپ کی گردن میں بازو ڈالے اُس کے ساتھ لپٹی ہوئی رو رہی تھی جیسے spelling bee آج ہی ہاری تھی۔ سالار کچھ کہے بغیر console کرنے والے انداز میں اُسے تھپکتا رہا۔

“I let you down Baba” ہچکیوں کے درمیان اُس نے رنیسہ کو کہتے سنا۔ ”بالکل بھی نہیں رنیسہ ” I am very proud of you ... سالار نے اُسے کہا امامہ بالکل اُسی لمحے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی تھی اور وہیں ٹھٹھک گئی تھی، سالار نے ہونٹوں پر انگلی کے اشارے

سے اُسے خاموش رہنے کا کہا تھا۔ ”میں نے اتنی محنت کی تھی لیکن میں کبھی حمین، جبریل بھائی اور عنایہ آپنی کی طرح کچھ بھی جیت نہیں سکتی کیوں کہ میں lucky نہیں ہوں۔“ وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ سالار کی طرح امامہ کو بھی عجیب تکلیف ہوئی تھی اُس کی اس بات سے۔ وہ صوفہ پر آکر سالار کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ کافی کا وہ مگ اُس نے ٹیبل پر رکھ دیا جو وہ سالار کو دینے آئی تھی۔ یہ سالار نہیں تھا امامہ تھی جس نے رنیسہ پر جان ماری تھی اُس کی learning disabilities دور کرنے کے لئے... اُسے بولنا اور درست بولنا سکھانے کے لئے۔ اُسے پڑھنا لکھنا سکھانے کے لئے... سالار نے صرف اُسے adopt کیا تھا، امامہ نے اُس کی زندگی بدل دی تھی اور اُس کا خیال تھا اب سب کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن وہ فرق جو وہ اپنے آپ میں اور اُن تینوں میں دیکھ رہی تھی اُس نے ان دونوں کو ہی پریشان کیا تھا۔

وہ رونے دھونے کے بعد اب خاموش ہو گئی تھی، سالار نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”Enough?“ رنیسہ نے گیلے چہرے کے ساتھ سر ہلایا۔ اُس کے بال ایک بار

پھر بے ترتیب تھے۔ ربن ایک بار پھر ڈھیلا ہو چکا تھا۔ سالار سے الگ ہوتے ہوئے اُس نے امامہ کو دیکھا تھا اور جیسے کچھ اور نادام ہوئی۔ سالار نے اُسے ایک بار پھر ٹیبل پر بٹھا دیا۔

”تمہیں کیوں لگتا ہے وہ تینوں lucky ہیں اور تم نہیں؟“ سالار نے اُسے بٹھانے کے بعد اُس کے گیلے گلاسز اٹھا کر ٹشو سے اس کے شیشے رگڑتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”کیوں کہ وہ جس چیز میں حصہ لیتے ہیں جیت جاتے ہیں، میں نہیں جیتی۔“ وہ ایک بار پھر رنجیدہ ہوئی۔ ”وہ ایگزامز میں مجھ سے اچھے گریڈز لیتے ہیں، میں کبھی اے پلس نہیں لے سکتی۔ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکتی جو وہ نہیں کر سکتے لیکن وہ بہت سے ایسے کام کر سکتے ہیں جو میں نہیں کر سکتی۔“ آٹھ سال کی وہ بچی above average تھی لیکن اُس کا تجزیہ excellent تھا۔

”دنیا میں صرف ہر مقابلہ جیتنے والے lucky نہیں ہوتے... سب کچھ کر جانے والے lucky نہیں ہوتے Lucky... وہ ہوتے ہیں جنہیں یہ پتہ چل جائے کہ وہ کس کام میں اچھے ہیں اور پھر وہ اُس کام میں excel کریں اور فالتو کاموں میں اپنی energy ضائع نہ کریں۔“ وہ اب اسے سمجھا رہا تھا ہاتھار بیسہ کے آنسو تھم چکے

تھے وہ اب باپ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”You have done exceptionally well ...“ لیکن بس تم spelling bee میں اتنا ہی اچھا پر فارم کر سکتی تھی وہاں کچھ بچے ایسے ہوں گے جو تم سے زیادہ اچھے تھے اور انہوں نے تمہیں ہرا دیا... لیکن اُن درجنوں بچوں کا سوچو جنہیں تم ہرا کر فائنل راؤنڈ میں پہنچی تھی، کیا وہ بھی unlucky ہیں... وہ کیا یہ سوچ لیں کہ وہ ہمیشہ ہارتے رہیں گے؟ ”سالار اُس سے پوچھ رہا تھا، ریسے نے بے اختیار سر نفی میں ہلایا۔

”حمین، جبریل اور عنایہ کبھی سپورٹس میں اتنے exceptional نہیں رہے جتنے بہت سے دوسرے بچے ہیں... اس لئے یہ مت کہو وہ سب کر سکتے ہیں۔“ اس بار امامہ نے اُسے سمجھایا، ریسے نے سر ہلایا۔ بات ٹھیک تھی، وہ سپورٹس میں اچھے تھے لیکن وہ سپورٹس میں اپنے سکولز کے سب سے نمایاں اسٹوڈنٹس نہیں تھے۔

”تمہیں اب یہ دیکھنا ہے کہ تم کس چیز میں بہت اچھا کر سکتی ہو اور پھر تمہیں اُسی چیز میں دل لگا کر کام کرنا ہے۔ کوئی بھی کام اس لئے نہیں کرنا کہ وہ جبریل، حمین اور عنایہ کر رہے ہیں۔“ سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

”یہ ضروری نہیں ہوتا کہ صرف اے پلس والا ہی زندگی میں بڑے کام کرے گا... بڑا کام اور کامیابی تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ تم دعا کیا کرو کہ اللہ تم سے بہت بڑے کام کروائے اور تمہیں بہت کامیابی دے۔“ ریسے نے اُن گلاسز کو ٹھیک کیا جو سالار نے اُسے لگائے تھے۔ ”تم ریسے ہو حمین، جبریل اور عنایہ نہیں ہو... اور ہاں تم اُن سے الگ ہو ... that's the best thing الگ ہونا بہت اچھی چیز ہوتا ہے ریسے... اور زندگی spelling bee کا ایک مقابلہ نہیں ہوتا جس میں کچھ لفظ spell کر کے ٹائٹل جیتنے کے بعد ہم خود کو lucky اور نہ جیتنے پر unlucky سمجھیں...“ وہ اب اُس کاربن دوبارہ باندھ رہا تھا بال ٹھیک کرتے ہوئے۔

”زندگی میں words کو spell کرنے کے علاوہ بھی بہت ساری skills چاہیے... ایک دو نہیں... 50-100... اور تمہارے پاس بہت ساری skills ہیں... اور بھی آئیں گی... You will shine like a star... جس جگہ بھی جاؤ گی، جو بھی کرو گی۔“

ریسے کی آنکھیں، چہرہ اور ہونٹ بیک وقت چمکے تھے۔

”اور پتہ ہے صحیح معنوں میں lucky کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی اچھائی اور اخلاق لوگوں کو اُسے یاد رکھنے پر مجبور کر دے اور تم میری بہت اچھی اور بہت اخلاق والی lucky بیٹی ہو۔“ وہ اب ٹیبل سے اتر کر باپ کے گلے لگی تھی، جیسے اُسے سمجھ آگئی تھی کہ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

”Yes I am“ اُس نے بڑی گرم جوشی سے سالار سے کہا، اُس سے الگ ہو کر وہ امامہ کے گلے

لگی... امامہ نے اُس کی ہیریزر بنز نکال کر ایک ٹھیک کیں۔
 سالار نے کافی کا ایک سپ لیا اور اُسے ادھورا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا، اُسے تاخیر ہو رہی تھی۔

”بابا مجھ سے خفا تو نہیں ہوئے نا؟“ سالار کے جانے کے بعد رئیسہ نے امامہ سے پوچھا۔ ”نہیں خفا نہیں ہوئے لیکن تمہارے رونے سے ہمارا دل دکھا۔“ امامہ نے جواباً کہا ”I am so sorry Mummy...“ میں دوبارہ کبھی نہیں روؤں گی۔“ اُس نے امامہ سے وعدہ کیا، امامہ نے اُسے تھپکا۔

”تم میری بہادر بیٹی ہو... عنایہ آپ کی طرح بات بات پر رونے والی تو نہیں...“ ریسہ نے پر جوش انداز میں سر ہلایا، اُس کے ماں باپ اُسے سب سے زیادہ بہادر اور اخلاق والا سمجھتے تھے اور یہ اُسے پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ بات چیت آٹھ سالہ ریسہ کے ذہن پر نقش ہو گئی تھی۔ امامہ اور سالار کو دوبارہ کبھی اُس کو ایسی کسی بات پر سمجھانا نہیں پڑا تھا۔ اُسے اب یہ طے کرنا تھا کہ وہ کس کام میں اچھی تھی کس کام میں excel کر سکتی تھی۔ اُس کے باپ نے اُسے کہا تھا lucky وہ تھا جو یہ بوجھ لیتا اور پھر اپنی energy کسی اور چیز میں ضائع کرنے کے بجائے اسی ایک چیز میں لگاتا۔ ریسہ بھی lucky کی اس نئی تعریف پر پورا اُترنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

حمین سکندر کا انتخاب MIT کے SPLASH پروگرام میں ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سکول کے اس پروگرام کے لئے منتخب ہونے والا پہلا اور واحد بچہ تھا۔ اس پروگرام کے تحت MIT ہر سال غیر معمولی ذہانت کے حامل کچھ بچوں کو دنیا کی اُس ممتاز ترین یونیورسٹی میں چند ہفتے گزارنے اور وہاں پڑھانے والے دُنیا کے قابل ترین اساتذہ سے سیکھنے کا موقع دیتی۔ یہ بہترین دماغوں کو بے حد کم عمری میں ہی کھوجنے، پرکھنے اور

چننے کا MIT کا اپنا ایک عمل تھا۔

امامہ اور سالار کے لئے حمین سکندر کے سکول کی طرح یہ بے حد اعزاز کی بات تھی لیکن اس کے باوجود وہ یہ جاننے پر کہ حمین سکندر کا انتخاب ہو گیا تھا فکر مند ہوئے تھے۔ وہ جبریل سکندر کو تنہا کہیں بھی بھیج سکتے تھے لیکن حمین کو اکیلے اس عمر میں اتنے ہفتوں کے لئے کہیں بھیجنا ان کے لئے بے حد مشکل فیصلہ تھا۔ خاص طور پر امامہ کے لئے جو اُس دس سال کے بچے کو خود سے الگ کر کے اس طرح اکیلے بھیجنے پر بالکل تیار نہیں تھی لیکن یہ سکول کا اصرار اور حمین کی ضد تھی جس نے اُسے گٹھنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہم ان کی قسمت کو کنٹرول نہیں کر سکتے... کل کیا ہوتا ہے... کس طرح ہوتا ہے... کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو میں مستقبل کے خوف کی وجہ سے انہیں گھر میں قید نہیں کروں گا کہ دنیا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچادے۔“ سالار نے واضح طور پر اُسے کہا تھا۔

”اُسے جانے دو... دیکھنے اور کھوجنے دو دنیا کو... ہماری تربیت اچھی ہوگی تو کچھ نہیں ہوگا اسے۔“ اُس نے امامہ کو تسلی دی اور وہ بھاری دل سے مان گئی تھی۔

حمین سکندر ساڑھے دس سال کی عمر میں پہلی بار MIT کی دنیا کھوجنے گیا تھا... ایک عجیب تجسس اور جوش و خروش کے ساتھ۔ MIT سے زیادہ اُسے اس بات پر ایکسائٹمنٹ ہو رہی تھی کہ وہ کہیں اکیلا جا رہا تھا... کسی بڑے کی طرح۔

اُسے گھر سے بھیجتے ہوئے اُن سب کا خیال تھا، وہ وہاں چند دن سے زیادہ نہیں رہ پائے گا... ایڈجسٹ نہیں ہو گا Home sick... ہو جائے گا... اور واپس آنے کی ضد کرے گا... اُن کی توقعات بالکل غلط ثابت ہوئی تھیں ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ حمین سکندر وقتی طور پر ہی سہی لیکن وہاں جا کر وہ سب کچھ بھول گیا تھا... وہ ”دُنیا“ تھی اور ”دُنیا“ نے اس ساڑھے دس سال کے بچے کو بری طرح fascinate کیا تھا... اُس دنیا میں ذہانت و احد شناختی علامت تھی اور وہ بے حد ذہین تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے وہ اپنے ماں باپ کے لئے یہ خوش خبری بھی لایا تھا کہ SPLASH میں آنے والا دنیا کا ذہین ترین دماغ قرار دیا گیا تھا... 150 کی ذہانت رکھنے والے صرف چند بچوں میں سے ایک... جنہوں نے اس پروگرام کو اس شناخت کے ساتھ اٹینڈ کیا تھا... اور اپنی صلاحیتوں کے حساب سے اُن بچوں میں سرفہرست... حمین سکندر کونہ صرف اُس کی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے سنگل آؤٹ کیا گیا تھا بلکہ MIT نے اُسے ان

بچوں میں بھی سرفہرست رکھا تھا جن کی پرورش MIT مستقبل کے ذہین ترین دماغوں کی کھوج کے پروگرام کے تحت کرنا چاہتی تھی... اور حمین بے حد خوش تھا اس سب کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود وہ صرف اسی بات پر خوش تھا کہ اُسے اب بار بار MIT میں جانے کے مواقع ملنے والے تھے کیوں کہ اُس ادارے نے کچھ منتخب بچوں کے لئے ہر سال MIT کے کچھ پروگرامز میں شرکت اوپن کر دی تھی یہ اُن بچوں کی ذہانت کو ایک tribute یا previlage تھی۔

”مجھے ہر سال وہاں جانا ہے۔“ اس نے گھر آتے ہی کھانے پر ماں باپ کو اطلاع دی تھی جنہوں نے اُس کی بات کو زیادہ توجہ سے نہیں سنا تھا اگر کسی چیز پر سالار سکندر نے غور کیا تھا تو وہ یہ تھی کہ وہ اتنے دن اُن سے الگ رہنے کے باوجود بے حد خوش اور مطمئن تھا۔

”نہیں میں نے کسی کو miss نہیں کیا... میں نے وہاں بہت انجوائے کیا۔“ اُس نے اپنی ازلی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امامہ کی ایک بات کے جواب میں اعلان کیا تھا اور وہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئے

تھے۔ وہ بڑا ہوتا اور ایسی بات کرتا تو وہ زیادہ غور نہ کرتے لیکن وہ ایک بچہ تھا اور اگر کسی جگہ کے ماحول میں اس قدر مگن ہو گیا تھا کہ اسے اپنی فیملی بھی بھول گئی تھی اور وہ اپنے گھر اور گھر والوں سے strong bonding ہونے کے باوجود انہیں بھول گیا تھا تو یہ کوئی بڑی حوصلہ افزا بات نہیں تھی ان دونوں کے لئے۔

”آپ کو پتہ ہے بابا مجھے اگلے سال ڈھیر ساری previlages ملیں گی جب میں وہاں جاؤں گا پھر اُس سے اگلے سال اُس سے بھی زیادہ... پھر اُس سے اگلے سال اُس سے بھی زیادہ۔“ وہ بے حد ایکساٹمنٹ سے ان دونوں کو بتا رہا تھا جیسے وہ یہ پلان خود ہی کر کے آیا تھا کہ اُسے اب وہاں ہر سال جانا تھا۔

”آپ کو پتہ ہے میں MIT کے کسی بھی Summer program کے لئے اپلائی کروں تو مجھے enrol کر لیں گے وہ، اور مجھ سے کوئی فیس نہیں لیں گے بلکہ مجھے وہاں سب کچھ فری ملے گا۔“ اُس کا خیال تھا اُس کے ماں باپ اس خبر پر اُس کی طرح ایکساٹنڈ ہو جائیں گے... وہ ایکساٹنڈ نہیں ہوئے تھے، وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔

”تو بابا آپ مجھے ہر سال وہاں بھیجا کریں گے نا؟“ اس نے بالآخر سالار سے کہا۔ وہ جیسے آتے ہی جانے کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

”اگلا سال بہت دور ہے حمین... جب اگلا سال آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“ سالار نے

گول مول انداز میں اُس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہمیں پلاننگ تو ابھی سے کرنی چاہیے نا۔“ وہ حمین کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ پہلی بار

کام کو پلان کرنے کی بات کر رہا تھا یہ اُس ننھے ذہن پر MIT کا پہلا اثر تھا۔

”میں نے سوچا ہے میں MIT سے ہی پڑھوں گا۔“ اُس نے جیسے باپ کو بتایا

تھا۔ ”بہت زیادہ“ وہ دونوں اُس کی بات سے محفوظ ہوئے وہاں جانے سے پہلے تک وہ

تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے کا اعلان کرتا رہتا تھا اور اُس کو یقین تھا دنیا کا بڑا انسان وہ ہوتا

ہے جو صرف ہائی سکول تک پڑھے اور بس... اور وہ چوں کہ خود بھی ایک بڑا انسان بننا

چاہتا تھا تو وہ بھی صرف ہائی سکول تک ہی پڑھنا چاہتا تھا۔

”اور اُس کے بعد؟“ سالار نے اُس سے پوچھا۔ ”اُس کے بعد میں نوبل جیتوں گا۔“

اُس نے بے حد اطمینان سے کہا تھا یوں جیسے وہ spelling bee کی بات کر رہا

ہو۔ وہ دونوں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے۔

**

آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں پاپا؟” سالار نے بے حد نرمی سے سکندر عثمان سے پوچھا تھا وہ دو گھنٹے سے اُن کے پاس بیٹھا باتیں کرنے سے زیادہ اُن کی باتیں سن رہا تھا ان کی گفتگو میں اب الزائمر جھلکنے لگا تھا... وہ جملوں کے درمیان رک کر کسی لفظ کو یاد نہ آنے پر گڑبڑاتے اُلجھتے... جھلاتے... اور بھول جاتے... اور پھر وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر جاتے ہوئے چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے تھے یوں جیسے انہیں کسی چیز کی تلاش تھی۔ سالار نے انہیں بالآخر ٹوک کر پوچھ ہی لیا تھا۔

”یہی رکھا تھا۔“ انہوں نے سالار کے جواب میں کہا، وہ اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کے پاس کھڑے تھے۔ سالار بہت دور صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا؟“ سالار نے گریدا۔ ”ایک سگار باکس کا مران نے بھیجا تھا وہی دکھانا چاہتا تھا تمہیں۔“ انہوں نے بے حد ایکساٹڈ انداز میں کہا اور ایک بار پھر تلاش شروع کر دی۔ سگار باکس چھوٹی چیز نہیں تھا وہ اس کے باوجود اُسے تکیے اٹھا اٹھا کر ڈھونڈ رہے تھے۔ پتہ نہیں اُس وقت ان کے ذہن میں ڈھونڈنے والی چیز کی کوئی شکل بھی تھی یا نہیں۔ وہ الزائمر کے اُس مریض کو پہلی بار اس حالت میں مرض کے اثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا... جو اُس کا باپ تھا۔

”شاید ملازم نے کہیں رکھا ہے... میں اُسے بلاتا ہوں۔“ انہوں نے بالآخر تھک کے کہا تھا۔ وہ اب واپس سالار کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے اُسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ سالار نے اُنہیں ٹوکا۔

”پاپا انٹرکام ہے اس کے ذریعہ بلائیں۔“ سالار نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا انٹرکام کارڈ سیور اٹھاتے ہوئے باپ سے کہا۔

”اس سے وہ نہیں آتا۔“ انہوں نے جواباً کہا اور دوبارہ اُسے آوازیں لگانے لگے وہ ایک ہی سانس میں جسے آوازیں دے رہے تھے اُن کے گھر اس وقت وہ ملازم موجود نہیں تھا، وہ چھٹی پر تھا اور سالار یہ جانتا تھا۔ وہ اُن کا پرانا ملازم تھا، اُسے لگا اُسے باپ کی مدد کرنی چاہیے۔ ملازم کو خود بلانا چاہیے۔

”نمبر بتادیں میں بلاتا ہوں اُسے۔“ سالار نے سکندر عثمان کو ایک بار پھر ٹوکا تھا۔ ”نمبر نہیں پتہ، ٹھہرو میں فون سے دیتا ہوں تمہیں۔“ انہوں نے اُس کی بات کے جواب میں کہا تھا اور پھر ر کے بغیر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے... سالار عجیب کیفیت میں انٹرکام کا رسیور ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا... وہ سیل فون جسے اُس کا باپ تلاش کر رہا تھا وہ سامنے میز پر پڑا تھا... وہ اُس سے انٹرکام کے نمبر کو، اپنے سیل فون کی یادداشت میں ڈھونڈنا چاہتا

تھا... اور وہ انٹرکام پراس ملازم کا ایک حرفی نمبر یاد نہیں رکھ پاتا تھا... وہ الزائمر کے جن کے ہاتھوں اپنے باپ کو زیر ہوتے دیکھ رہا تھا، تکلیف بڑا چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لئے جو اُس نے محسوس کی تھی۔ وہ بہت عرصے کے بعد امامہ اور بچوں کے ساتھ دو ہفتے کے لئے پاکستان آیا تھا۔ طیبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور سالار اور اُس کی ملاقات کئی مہینوں سے نہیں ہوئی تھی اور اب وہ طیبہ کے ہی بے حد اصرار پر بالآخر پاکستان آیا تھا اپنی فیملی کے ساتھ تو اپنے والدین کی حالت کو دیکھ کر بہت اب سیٹ ہوا تھا۔ خاص طور پر سکندر عثمان کو دیکھ کر۔

اُس نے انہیں ہمیشہ بے حد صحت مند اور چاق و چوبند دیکھا تھا۔ وہ ایک مشین کی طرح کام کرتے رہے تھے ساری زندگی... اور کام اُن کی زندگی کی سب سے پسندیدہ تفریح تھی اور اب وہ بڑی حد تک گھر تک محدود ہو گئے تھے۔ گھر میں سکندر عثمان اور نوکروں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

اسلام آباد میں ہی مقیم سالار کا بڑا بھائی اپنی فیملی کے ساتھ اپنے گھر میں رہتا تھا۔ وہ سکندر عثمان اور طیبہ کو اپنے ساتھ تو رکھنے پر تیار تھا لیکن وہ اُس کے بیوی بچے سکندر عثمان کے اُس پرانے گھر میں شفٹ ہونے پر تیار نہیں تھے اور طیبہ اور سکندر عثمان اپنا

گھر چھوڑ کر بیٹے کے گھر نہیں جانا چاہتے تھے۔ سالار سمیت سکندر کے تینوں بیٹے بیرون ملک تھے بیٹی کراچی... وہ گھر جو کسی زمانے میں افراد خانہ کی چہل پہل سے گونجتا تھا اب خالی ہو چکا تھا۔ سالار پہلی بار سکندر عثمان کی بیماری کے انکشاف پر بھی بے حد اپ سیٹ ہوا تھا۔ وہ انکشاف اُس پر اُس کی سرجری کے کئی مہینوں بعد ہوا تھا اور وہ بھی بے حد اتفاقی انداز میں جب سکندر عثمان اپنے ایک طبی معائنے کے لئے امریکہ گئے تھے اور سالار کو اُن کی بیماری کی تفصیلات کا پتہ چلا تھا۔

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ اُس نے سکندر عثمان سے شکایت کی تھی انہوں نے جواباً لاکر وانداز میں ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”کیا بتانا یا... مجھے اپنی بیماری سے زیادہ تمہاری بیماری کا دکھ ہے... میں 70 کا ہو چکا ہوں... کوئی بیماری ہونہ ہو کتنا جیوں گا میں؟ اور اس عمر میں الزائمر کے بغیر بھی کچھ یاد نہیں رہتا انسان کو۔“ وہ اپنی بیماری کو معمول بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے جیسے یہ کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

اور اب وہی بیماری اُس کے سامنے اُس کے باپ کی یادداشت کو گھن کی طرح کھانے لگی تھی۔

زندگی عجیب شے ہے، انسان اُس کے طویل ہونے کی دعا بھی کرتا ہے اور اس کی طوالت کے اثرات سے ڈرتا بھی ہے۔

سکندر عثمان ابھی تک سیل فون ڈھونڈتے جا رہے تھے... سالار نے فون اٹھا کر اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔

”اوہ... اچھا... ہاں... یہ رہا...“ انہوں نے فون ہاتھ میں لیا پھر سوچنے لگے تھے کس لیے لیا تھا۔

”یہ فون کس لیے دیا ہے تم نے...؟ میں نے مانگا تھا کیا؟“ وہ اب اُس سے پوچھ رہے تھے، کوئی چیز سالار کے حلق میں گولہ بن کر پھنسی۔

”نہیں... بس میں دینا چاہ رہا تھا آپ کو۔“ وہ کہتے ہوئے یک دم اٹھ گیا۔ وہ باپ کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔

”تم اتنی جلدی جا رہے ہو... کیا اور نہیں بیٹھو گے؟“ وہ جیسے مایوس ہوئے تھے۔ ”بیٹھوں گا... تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔“ وہ اُن سے نظریں چراتا بھرائی آواز میں کہتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔

اپنے بیڈروم سے متصل باتھ روم میں باتھ ٹب کے کنارے بیٹھا وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ سکندر عثمان کے بے حد قریب تھا اور یہ قربت آج عجیب طرح سے اذیت دے رہی تھی اُسے۔ وہ اپنی زندگی کے ہنگاموں میں اتنا مصروف رہا تھا کہ اُس نے سکندر عثمان کی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا... نوٹس تو تب کرتا جب وہ اُن سے باقاعدگی سے مل پاتا۔ SIF اُسے گرداب کی طرح الجھائے ہوئے تھا اُس کے پروجیکٹس نے اب اس کے پیروں کو پروں میں تبدیل کر دیا تھا... وہ سفر میں رہتا تھا... چار پانچ سال میں SIF دنیا کی بڑی فنانشل مارکیٹس میں ایک شناخت بنا رہا تھا... بے حد منفرد انداز میں تیز رفتار ترقی کے ساتھ... کام کی اس رفتار نے اُسے بہت سی چیزوں سے بے خبر بھی کیا تھا... وہاں بیٹھے ہوئے اُس نے اعتراف کیا تھا اور اب وہ حل ڈھونڈ رہا تھا اور حل ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔ وہ دونوں اُن کے ساتھ مستقل امریکہ شفٹ ہونے پر کبھی تیار نہیں ہوتے، سالار کو اس کا اندازہ تھا اور امریکہ چھوڑ کر اُن کے پاس مستقل آجانا سالار کے لئے ممکن نہیں تھا... اس کے باوجود حل سامنے تھا... بے حد مشکل تھا لیکن موجود تھا

”امامہ تم بچوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو جاؤ۔“ اُس رات اُس نے بالآخر انتظار کیے

بغیر وہ حل امامہ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ امامہ کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ ”میں چاہتا ہوں تم حمین، عنایہ اور رنیسہ کے ساتھ پاکستان آ جاؤ... میرے پیرنٹس کو میری ضرورت ہے میں ان کے پاس نہیں ٹھہر سکتا لیکن میں انہیں اس حالت میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا... تم نے دیکھا ہے پاپا کو...“ وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

”ہم انہیں اپنے پاس رکھ سکتے ہیں وہاں امریکہ میں...“ امامہ نے جیسے ایک تجویز پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

”وہ یہ گھر نہیں چھوڑیں گے اور میں اس عمر میں انہیں اور اپ سیٹ کرنا نہیں چاہتا۔ تم لوگ یہاں شفٹ ہو جاؤ... میں آتا جاتا ہوں گا... جبریل ویسے بھی یونیورسٹی میں ہے، اُسے گھر کی ضرورت نہیں ہے اور میں تو امریکہ میں بھی سفر ہی کرتا رہتا ہوں زیادہ... مجھے وہاں فیملی کے ہونے نہ ہونے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔“ وہ اُس سے نظریں ملانے بغیر کہہ رہا تھا۔ امامہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہی وہ سب کچھ اس طرح آسان بنا کر پیش کر رہا تھا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا... دو منٹوں کا کام تھا جو کیا جاسکتا تھا۔

”تمہارے اپنے پیرنٹس بھی ہیں یہاں... وہ بھی بہت بوڑھے ہیں... تم یہاں رہو گی تو ان سب کی دیکھ بھال کر سکو گی...“ وہ اُس سے کہہ رہا تھا۔ امامہ نے کچھ خفگی سے اُس سے کہا۔

”تم یہ سب میرے پیرنٹس کے لئے نہیں کر رہے سالار... اس لئے ان کا حوالہ نہ دو۔“

”تم ان کے بارے میں فکر مند نہیں ہوتی کیا؟ انہیں اس عمر میں دیکھ بھال کی ضرورت ہو گی... کوئی 24 گھنٹے ساتھ نہ رہے چند گھنٹے ہی رہے لیکن حال چال پوچھنے والا ہو۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ اپنے پیرنٹس کی بات کرنے سے زیادہ اُس کے پیرنٹس کی بات کر رہا تھا۔ امامہ کو بُرا لگا... اُسے اس جذباتی بلیک میلنگ کی ضرورت نہیں تھی۔

”سالار اتنے سالوں میں کبھی پہلے تم نے میرے پیرنٹس کی دیکھ بھال کو ایشو بنا کر مجھے پاکستان میں رکھنے کی بات نہیں کی... آج بھی اُن کو ایشو نہ بناؤ۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”ہاں نہیں کی تھی کیوں کہ آج سے پہلے میں نے کبھی اپنے پیرنٹس کا یہ حال بھی نہیں دیکھا تھا۔“ اُس نے جواباً کہا وہ قائل نہیں ہوئی۔

”مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

”تم ان کے پاس رہنا نہیں چاہتی؟ یہاں میرے گھر پر؟“ سالار نے دو ٹوک انداز میں اُس سے پوچھا۔ ”میں تمہارے ساتھ بھی رہنا چاہتی ہوں۔“ اُس نے جواباً کہا۔ سالار نے اُس سے نظریں چُرائیں۔ ”اُن سب کو تمہاری ضرورت ہے امامہ۔“ ”اور تم؟“ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے؟“ امامہ نے گلہ کیا تھا ”ان سب کے پاس زندگی کے زیادہ سال نہیں ہیں... میں یہ بوجھ اپنے ضمیر پر نہیں لینا چاہتا کہ میں نے زندگی کے آخری سالوں میں اپنے ماں باپ کی پروا نہیں کی۔“ وہ کہہ رہا تھا وہ اُس سے کہہ نہیں سکی وہ اُس کے ساتھ بھی تو اسی لئے چپکی رہنا چاہتی تھی اُسے بھی تو اُس کی زندگی کا پتہ نہیں تھا... ڈاکٹر نے کہا تھا 5-7 سال... زیادہ سے زیادہ دس سال... اور وہ اُسے اُس سے بھی پہلے اپنے سے الگ کر رہا تھا۔ وہ یہ ساری باتیں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ زندگی کے کسی بھی ناک خواب کے بارے میں... مستقبل کے بُرے دنوں کے بارے میں... وہ فی الحال صرف حال کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی... جو سامنے تھا... جو آج تھا... وہ اُسی میں جینا چاہتی تھی۔ ”تمہیں میری ضرورت ہے سالار... اکیلے تم کیسے رہو گے؟“ وہ

اُس سے کہہ رہی تھی۔ ”میں رہ لوں گا امامہ... تم جانتی ہو میں کام میں مصروف رہتا ہوں تو مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔“ یہ سچ تھا لیکن اُس کو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ امامہ ہرٹ ہوئی تھی وہ کچھ بول نہیں سکی اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے پل میں بھر گئی تھیں۔ سالار اُس کے برابر صوفہ پر بیٹھا تھا اُس نے امامہ سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی نہیں چرا سکا۔

”زندگی میں انسان صرف اپنی ضرورتوں کے بارے میں سوچتا ہے تو خود غرض ہو جاتا ہے۔“ اُس نے امامہ کو جیسے وضاحت ایک فلاسفی میں لپٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔

”مجھے پتہ ہے تمہیں ضرورت نہیں ہے... نہ میری نہ بچوں کی... تمہارے لئے کام کافی ہے... کام تمہاری فیملی ہے، تمہاری تفریح بھی... لیکن میری زندگی میں تمہارے اور بچوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے... میرا کام اور تفریح صرف تم لوگ ہو۔“ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں گلہ بھی کیا، اُس کی بے حسی بھی بتائی، اپنی مجبوری بھی سنائی۔

”تم یہ نہیں سوچتے کہ تم ابھی انڈر ٹریٹمنٹ ہو تمہیں بھی کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت ہے۔“ وہ جیسے اُسے یاد دلار ہی تھی بیماری کا نام لئے بغیر کہ اُسے بھی تیماردار

کی ضرورت تھی۔

”پرانی بات ہو گئی امامہ... میں ٹھیک ہوں پانچ سال سے اس بیماری کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں... کچھ نہیں ہوتا مجھے۔“ اس نے جیسے امامہ کے خدشات دیوار پر پڑھ کر بھی پھونک سے انہیں اڑایا تھا۔

”میں پاپا کو اس حال میں یہاں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا نوکروں کے سر پر... میں حمین کو ان کے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں حمین کو اکیلا یہاں نہیں رکھ سکتا اس لئے تمہاری ضرورت ہے اس گھر کو... تم اسے request سمجھو... خود غرضی یا پھر اصرار... لیکن میں چاہتا ہوں تم پاکستان آ جاؤ... یہاں اس گھر میں۔“ اس نے سالار کی آواز اور آنکھوں میں رنجیدگی دیکھی تھی۔

”میرے لئے تمہارے بغیر رہنا بے حد مشکل ہے... میں عادی ہو گیا ہوں تمہارا بچوں کا... گھر کے آرام کا... لیکن میرے ماں باپ کے بے حد احسانات ہیں ہم پر... صرف مجھ پر ہی نہیں ہم دونوں پر... میں اپنی comfort کو ان کی comfort کے لئے چھوڑنے کا حوصلہ رکھتا ہوں... یہ فرض ہے مجھ پر۔“ وہ جو کچھ اُس سے کہہ رہا تھا وہ مشورہ اور رائے نہیں تھی نہ ہی درخواست... وہ فیصلہ تھا جو وہ کر چکا تھا اور اب صرف

اُسے سنارہا تھا۔

وہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن غلط وقت پر کہہ رہا تھا، وہ اُس سے قربانی مانگ رہا تھا لیکن بہت بڑی مانگ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر اُس کے پاس سے اُٹھ گئی تھی۔ وہ saint نہیں تھی لیکن یہ بات سالار کو سمجھ نہیں آتی تھی۔

دو ہفتوں کے بعد امریکہ واپس جاتے ہوئے سالار نے سکندر عثمان کو اپنے فیصلے کے

بارے میں بتایا تھا وہ خوش نہیں ہوئے تھے۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”نہیں بے وقوفی کی بات ہے یہ... امامہ اور بچوں کو یہاں شفٹ کرنا...“ انہوں نے

فوری طور پر کہا تھا۔ ”ان کی سٹڈیز کا ہرج ہوگا اور یہاں کیوں لا رہے ہو انہیں تک کیا

بنتی ہے؟“ سالار نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اُن کے لئے کر رہا تھا یہ سب۔

”بس پاپا... وہاں مشکل ہو رہا ہے سب کچھ manage کرنا... مالی طور پر۔“ اُس

نے باپ سے جھوٹ بولا وہ انہیں زیر احسان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”بہت زیادہ ہوتے جا رہے ہیں وہاں اخراجات saving... بالکل نہیں ہو رہی...“

یہاں کچھ عرصہ رہیں گے تو تھوڑا بہت save کر لیں گے ہم۔ ”اُس نے بے حد روانی سے سکندر عثمان سے کہا۔

”لیکن تم تو کہہ رہے تھے SIF بہت کامیاب ہے... تمہارا بیسکٹ بہت اچھا ہے۔“ وہ کچھ متوحش ہوئے۔

”ہاں وہ تو بہت اچھا جا رہا ہے اُس کے حوالے سے مسائل نہیں ہیں مجھے... لیکن بس savings نہیں ہو پار ہی پھر بچیاں بڑی ہو رہی ہیں میں چاہ رہا ہوں کچھ سال پاکستان میں رہیں اپنی ویلیوز کا پتہ ہو پھر لے جاؤں انہیں۔“ اُس نے اپنے بہانے کو کچھ اضافی سہارے دیے۔ سکندر عثمان ابھی بھی پوری طرح قائل نہیں ہوئے تھے۔

”تم اکیلے کیسے رہو گے سالار... تمہارا ابھی علاج ہو رہا ہے... بیوی بچوں کے بغیر وہاں کون خیال رکھے گا تمہارا؟“ وہ اپنی تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔

”میں سوچ رہا ہوں میرے پاس جو اکاؤنٹ میں کچھ رقم ہے وہ تمہیں دے دوں تاکہ تمہیں اگر کوئی فنانشل مسئلہ ہے تو...“ سالار نے اُن کی بات کاٹ دی۔

”بس پاپا... اب نہیں...“ اُس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ”اب اور کچھ نہیں... کتنا

کریں گے آپ میرے لئے؟ مجھے بھی کچھ کرنے دیں... احسان نہیں کر سکتا تو حق ہی ادا کرنے دیں مجھے۔ ”اس نے عجیب بے بسی سے باپ سے کہا۔

”مجھے تمہاری فکر رہے گی۔“ سالار نے ایک بار پھر اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”مجھے بھی آپ کی فکر رہتی ہے پاپا“...

”اس لئے رکھنا چاہتے ہو ان سب کو یہاں؟“ سکندر عثمان جیسے بوجھ گئے تھے۔ ”آپ جو چاہے سمجھ لیں۔“ ”میں اور طیّبہ بالکل ٹھیک ہیں پر انے ملازم ہیں ہمارے پاس وفادار... سب ٹھیک ہے تم میری وجہ سے یہ مت کرو۔“ وہ اب بھی تیار نہیں تھے، اولاد پر انہوں نے ہمیشہ احسان کیا تھا احسان لینے کی عادت ہی نہیں تھی انہیں اور وہ بھی عمر کے اس حصہ میں... بے حد خواہش ہونے کے باوجود... مجبور ہونے کے باوجود... سکندر عثمان اولاد کو اپنی وجہ سے تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ ”میں ویسے بھی سوچتا ہوں فیکٹری جایا کروں کبھی کبھار... کام مکمل طور پر چھوڑ دیا ہے اس لئے... زیادہ بھولنے لگا ہوں میں“ وہ اپنے الزائمر کی شکل بدل رہے تھے۔

”تمہارے بیوی اور بچوں کو تمہارے پاس رہنا چاہیے سالار... تم زبردستی انہیں یہاں مت رکھو... میرے اور طیّبہ کے لئے بس۔“ انہوں نے جیسے سالار کو سمجھانے کی

کوشش کی۔

”زبردستی نہیں رکھ رہا پاپا... اُن کی مرضی سے ہی رکھ رہا ہوں... وہ یہاں آکر ہمیشہ خوش ہوتے رہیں ہیں اب بھی خوش ہوں گے“ ...

اُس نے باپ کو تسلی دی تھی اُسے اندازہ بھی نہیں تھا باپ کا تجربہ کتنا درست ہونے والا تھا۔

”میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔“ پاکستان شفٹ ہونے کی سب سے زیادہ مخالفت حمین سکندر کی طرف سے آئی تھی اور یہ مخالفت صرف سالار کے لئے ہی نہیں امامہ کے لئے بھی خلاف توقع تھی۔ وہ ہمیشہ پاکستان جانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا... دادا کے ساتھ اُس کی بنتی بھی بہت تھی اور وہ دادی کا لاڈلا بھی تھا... پاکستان میں اُسے بڑی attractions دھتی تھیں اور اب یک بیک مستقل طور پر پاکستان جا کر رہنے پر سب سے زیادہ اعتراضات اُس نے کیے تھے۔

”بیٹا دادا اور دادی بوڑھے ہو گئے ہیں تم نے دیکھا وہ بیمار بھی تھے... انہیں care کی

ضرورت ہے۔ ”امامہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”اُن کے پاس servants ہیں وہ اُن کا اچھی طرح خیال رکھ سکتے ہیں۔“ وہ بالکل قائل ہوئے بغیر بولا۔

Servants ”اُن کی اچھی کیئر نہیں کر سکتے۔“ امامہ نے جواباً کہا ”آپ انہیں اولڈ ہوم بھیج دیں۔“ وہ اُس معاشرے کا بچہ تھا اُسی معاشرے کا بے رحم لیکن عملی حل بتا رہا تھا۔

”کل کو ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو تم ہمیں بھی اولڈ ہوم میں بھیج دو گے۔“ امامہ نے کچھ ناخوش ہوتے ہوئے اُس سے کہا۔

”آپ انہیں یہاں لے آئیں۔“ حمین نے ماں کی خفگی کو محسوس کیا۔

”وہ یہاں نہیں آنا چاہتا وہ اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہتے۔“ امامہ نے اُس سے کہا۔

”پھر ہم بھی اپنا گھر کیوں چھوڑیں؟ میں اپنا سکول کیوں چھوڑوں؟“ وہ دنیا کے دس

ذہن ترین دماغوں میں سے ایک تھا... غلط بات نہیں کہہ رہا تھا Rationally ...

بات کر رہا تھا... دماغ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ وہ عقل سے سوچتا ہے دل سے

نہیں۔

”یہ ہمارا گھر نہیں ہے حمین... کرائے کا ہے، ہم صرف یہاں رہ رہے ہیں اور جب ہم سب پاکستان چلے جائیں گے تو بابا اور جبریل اس گھر کو چھوڑ دیں گے کیوں کہ انہیں اتنے بڑے گھر کی ضرورت نہیں ہوگی... جبریل ویسے بھی یونیورسٹی میں ہے... تمہارے بابا نیویارک شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔“ امامہ اُسے کہتی چلی گئی تھی۔

”جبریل پاکستان نہیں جائے گا؟“ حمین نے پوچھا۔

”نہیں تمہارے بابا اُسے اس لئے پاکستان بھیجنا نہیں چاہتے کیوں کہ وہ یونیورسٹی میں ہے اُس کی سٹڈیز متاثر ہوں گی۔“ امامہ نے اُسے سمجھایا۔

”میری بھی تو ہوں گی، مجھے بھی ہر سال MIT جانا ہے، میں کیسے جاؤں گا۔“ وہ خفا ہوا تھا اور بے چین بھی اُسے اپنا سمر پروگرام خطرے میں پڑتا دکھاتا تھا۔

”تم ابھی سکول میں ہو... جبریل یونیورسٹی میں ہے... اور پاکستان میں بہت اچھے سکولز ہیں تم cover کر لو گے سب کچھ... جبریل نہیں کر سکے گا اُسے آگے میڈیسن پڑھنی ہے...“ امامہ اُسے logic دینے کی کوشش کر رہی تھی جو حمین کے دماغ میں نہیں

بیٹھ رہی تھی۔

”That’s not fair Mummy“ حمین نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”اگر جبریل پاکستان نہیں جائے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گا... مجھے MIT جانا ہے۔“ وہ واضح طور پر بغاوت کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے تم مت جاؤ... میں عنایہ اور رنیسہ چلے جاتے ہیں تم یہاں رہنا اپنے بابا کے پاس...“ امامہ نے یک دم اس سے بحث کرنا بند کر دیا تھا۔

”یہ تمہارے بابا کا حکم ہے اور ہم سب اس کو مانیں گے... تم disobey کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی میں مجبور نہیں کروں گی۔“

امامہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ دُنیا کے وہ دو بہترین دماغ ایک دوسرے کے بالمقابل آگئے تھے۔

”تم پاکستان نہیں جانا چاہتے حمین؟“ اُس رات سالار نے حمین کو بٹھا کر پوچھا تھا۔ امامہ نے اُسے ڈنر سے کچھ دیر پہلے اس کے انکار کے بارے میں بتایا تھا۔

”نہیں۔“ حمین نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”اور

کوئی بھی جانا نہیں چاہتا۔ ”اُس نے مزید تبصرہ کیا۔ ”میں کسی اور کی نہیں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔ ”سالار نے اُسے ٹوک دیا، حمین سر جھکائے چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اُس نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”وجہ؟“ سالار نے اُسی انداز میں کہا۔

”بہت ساری ہیں۔“ اُس نے بے حد مستحکم انداز میں باپ کو جواب دیا۔

”کسی بھی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی صرف ایک وجہ ہوتی ہے، باقی سب بہانے ہوتے ہیں اس لئے تم صرف وجہ بتاؤ بہانے نہیں۔“ سالار نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کے ذخیرہ الفاظ کی ہوانکا لتے ہوئے کہا۔ حمین اس میٹنگ کے لئے پہلے سے تیار تھا اور وجوہات کو جمع کرنے پر بھی اچھا خاصا وقت صرف کر چکا تھا۔ باپ نے جیسے انگلی سے پکڑ کر دوبارہ زیر و پر کھڑا کر دیا تھا۔

”میں پاکستان میں adjust نہیں ہو سکتا۔“ حمین نے بالآخر وہ ایک وجہ تلاش کر

کے پیش کی۔ ”اگر تم کانگو میں adjust ہو سکتے ہو تو پاکستان میں بھی ہو جاؤ

گے... افریقہ سے زیادہ برا نہیں“ سالار نے اُسی انداز میں کہا ”تب میں چھوٹا تھا“ حمین

نے مدافعا نہ انداز میں کہا۔

”تم اب بھی چھوٹے ہی ہو۔“ سالار نے بات کاٹی۔ ”لیکن میں بڑا ہو رہا ہوں۔“ حمین نے جیسے اعتراض کیا ”اُس میں کافی time لگے گا... تمہارے لئے کم از کم پچیس سال۔“ سالار نے بے حد سنجیدگی سے اُسے tease کیا وہ باپ کو دیکھ کر رہ گیا۔

”I am serious Baba“ اُس نے سالار کی بات سے محفوظ ہوئے بغیر

کہا ”میں پاکستان نہیں جانا چاہتا۔ It’s not a good idea for Mummy either“ وہ کسی بڑے کی طرح باپ کے فیصلے پر تبصرہ کر رہا تھا۔

سالار خاموشی سے اُس کی بات سُن رہا تھا۔

”مجھے یہاں تعلیم حاصل کرنی ہے۔۔ میں وہاں holidays پر جا سکتا ہوں ہمیشہ کے لئے نہیں۔“ وہ بالکل امریکی انداز میں بے حد صاف گوئی سے باپ کو بتا رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتا تھا اور کیا نہیں۔

”چند سالوں کی بات ہے حمین اُس کے بعد تم بھی اس قابل ہو جاؤ گے کہ امریکہ میں واپس آ کر کہیں بھی پڑھ سکو۔“ سالار نے اُس کی بات کے جواب میں کہا، وہ گیارہ سال کا بچہ باپ کو بے حد مدلل دلائل دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”چند سال سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک سال سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔“ اُس نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔

”تو تم یہ قربانی نہیں دو گے؟“ سالار نے اس بار بات بدلی۔ ”جبریل بھی تو دے سکتا ہے قربانی... آپ بھی تو دے سکتے ہیں... میں ہی کیوں؟“ اُس نے جواباً اسی انداز میں کہا۔

دنیا کے بڑے بڑے اداروں کے برابر ہو کے ان کے سامنے بیٹھ کر اُن سے financial deals کرنا اور بات تھی... اُن کے سوالات اور اعتراضات کے انبار کو سمیٹنا آسان کام تھا... اپنے گیارہ سال کے بیٹے کو اس بات پر قائل کرنا زیادہ مشکل تھا کہ وہ وہ قربانی کیوں دے جو اُس کا بھائی نہیں دے رہا تھا... اُس کا باپ بھی نہیں دے رہا تھا... پھر وہ کیوں؟

اور اس کیوں کا جواب فارمولوں اور equations میں نہیں ملتا تھا، صرف اُن اخلاقی اقدار میں ملتا تھا جن سے اُس نے اپنی اولاد کی تربیت کی تھی لیکن اس کے باوجود اُس کی اولاد اُس سے یہ سوال کر رہی تھی۔

”تم جانتے ہو تمہارے دادا کو الزائمر ہے، وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور انہیں

ضرورت ہے کہ کوئی ان کے پاس ہو... تم سے انہیں زیادہ محبت ہے اس لئے میں چاہتا تھا تم ان کے پاس رہو۔ ”سالار نے جیسے وہ جواب ڈھونڈنا شروع کیے جن سے وہ اسے سمجھا پاتا۔

”ویسے بھی جب تمہاری ممی، عنایہ اور رنیسہ کے ساتھ یہاں سے چلی جائیں گی تو تم یہاں کس کے پاس رہو گے؟ گھر میں تمہاری دیکھ بھال کے لئے کوئی نہیں ہوگا۔ ”سالار نے کہنا شروع کیا۔

”I can take care of myself“، حمین نے باپ کی بات ختم ہونے پر کہا تھا۔ ”میں اتنا چھوٹا نہیں ہوں بابا... میں اکیلا رہ سکتا ہوں۔ آپ مجھے بورڈنگ میں بھی رکھ سکتے ہیں یا پھر میں کسی relative کے پاس بھی رہ سکتا ہوں۔ ”اُس نے سالار کے سامنے ایک کے بعد ایک solutions رکھنا شروع کیا۔

”اُن میں سے ایک بھی option میرے لئے قابل قبول نہیں ہے، تمہیں سب کے ساتھ پاکستان جانا ہے۔ ”سالار نے دو ٹوک انداز میں اُس سے کہا۔

”آپ مجھ میں اور جبریل میں فرق کیوں کرتے ہیں بابا؟ ”اُس کے اگلے جملے نے سالار کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کا چہرہ دیکھا جس نے زندگی میں

پہلی بار اُس سے ایسا سوال یا ایسی شکایت کی تھی۔ ”فرق...؟ تم اس فرق کو define کر سکتے ہو؟“ سالار پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا اُسے پانچ منٹ لگنے والے تھے زیادہ سے زیادہ اُسے سمجھانے میں اور اب جیسے یہ ایک پینڈورہ باکس ہی کھلنے لگا تھا۔

”آپ جبریل کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔“ اگلا تبصرہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ دیکھتے رہے پھر کچھ دیر بعد سالار نے اُس سے کہا۔

”اور میں اُسے کیوں بہتر سمجھتا ہوں؟“ وہ جیسے اُس کے اس الزام کی بھی وضاحت چاہتا تھا۔

”کیوں کہ وہ حافظِ قرآن ہے... میں نہیں ہوں۔“ بے حد روانی سے کہے گئے اس جملے نے سالار کو فریز کیا تھا... وہ واقعی پینڈورہ باکس ہی کھول بیٹھا تھا لیکن بہت غلط حوالے سے۔

وہ باغی نہیں تھا... نہ ہی بد تمیز نہ ہی بد لحاظ، لیکن وہ جو سوچتا اور محسوس کرتا تھا وہ کہہ دیتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سالار کو لگا وہ سکندر عثمان تھا اور اپنے سامنے آن بیٹھا تھا...

لاجواب... بے بس... تاریخ یقیناً اپنے آپ کو دہراتی تھی لیکن اپنی مرضی کے وقت پر۔

”تمہیں جبریل برا لگتا ہے؟“ سالار نے بے حد مدہم آواز میں اُس سے پوچھا۔ He

is my only brother... مجھے وہ کیسے بُرا لگ سکتا ہے، لیکن مجھے آپ

لوگوں کا یہ attitude اچھا نہیں لگتا... ”حمین کو یہ شکایت کب سے ہونی شروع

ہوئی تھی اُس کا اندازہ سالار کو نہیں ہوا۔ لیکن وہ اس وقت وہاں عجیب سی کیفیت میں

بیٹھا ہوا تھا۔

”ایسا نہیں ہے حمین۔“ اُس نے بالآخر حمین سے کہا وہ اپنے سلیپنگ سوٹ کے

پاجامے کو گٹھنے سے رگڑ رہا تھا جیسے اُس میں سوراخ ہی کر دینا چاہتا ہو۔

”بابا... میں آجاؤں؟“ وہ جبریل تھا جو دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا...

گفتگو کے عجیب مرحلے پر وہ اندر آیا تھا۔ سالار اور حمین دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر کچھ

جزبہ ہوئے تھے۔

”ہاں آجاؤ۔“ سالار نے اُس سے کہا، وہ اندر آ کر حمین کے برابر میں صوفہ پر بیٹھ گیا پھر

اُس نے ایک نظر حمین کو دیکھا جو اُس سے نظریں نہیں مل رہا تھا پھر اُس نے باپ سے

کہا۔

”دادا کے پاس میں پاکستان چلا جاتا ہوں... میں زیادہ اچھے طریقے سے اُن کی دیکھ بھال کر سکوں گا“ کمرے میں عجیب خاموشی چھائی تھی نہ سالار کچھ کہہ سکا، نہ حمین کچھ بول سکا تھا۔ اُن دونوں کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن جبریل پھر بھی یقیناً یہ گفتگو سُن کر ہی آیا تھا۔

”مُمی اور حمین یہیں رہیں آپ کے پاس... میں اکیلے بھی اُن کو سنبھال سکتا ہوں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح مدہم مستحکم آواز میں کہہ رہا تھا۔

”پاکستان میں ویسے بھی میڈیسن کی تعلیم کے لئے کم وقت لگتا ہے۔ یونیورسٹی کا سال ضائع ہونے سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ اتنے آرام سے کہہ رہا تھا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا... جبریل ایسا ہی تھا، کسی panic کے بغیر مسئلے کا حل نکالنے والا۔

”میں تم سے بعد میں بات کروں گا جبریل۔“ سالار نے اُسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”میں گھر میں سب سے بڑا ہوں بابا... میری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے... حمین کو آپ یہیں رہنے دیں اور مجھے جانے دیں... اور میں یہ سب بہت خوشی سے کہہ رہا ہوں، مجھے کوئی خفگی نہیں ہے۔“ جبریل نے سالار کے ٹوکنے کے باوجود اُس سے کہا اور اُٹھ

کھڑا ہوا۔

اُس کے کمرے سے جانے کے بعد بھی سالار اور حمین خاموش ہی بیٹھے رہے تھے وہ بے حد awkward صورت حال تھی جس کا سامنا ان دونوں نے چند لمحے پہلے کیا تھا۔

”میرے اور امامہ کے لئے تم میں اور جبریل میں کوئی فرق نہیں... اُسے قرآن پاک حفظ کرنے کے لئے عزت دیتے ہیں لیکن تم تینوں پر اُسے برتری نہیں دیتے اس لئے یہ کبھی مت سمجھنا کہ ہم دونوں تم چاروں میں کوئی تفریق کریں گے۔“ سالار نے بہت لمبی خاموشی کے بعد اُس سے کہنا شروع کیا تھا۔

”تمہارے دادا میری ذمہ داری ہیں اور میرا خیال تھا میں اپنی ذمہ داری تمہارے اور جبریل کے ساتھ بانٹ سکتا تھا... اس لئے یہ کوشش کی... لیکن تم پر زبردستی نہیں کروں گا میں... تم نہیں جانا چاہتے، مت جاؤ۔“ سالار اُس سے کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا ، حمین وہیں بیٹھا رہا... سر جھکائے... خاموش... سوچتے ہوئے۔

جب اُس نے کمرے کا دروازہ کھلتے اور حمین کو اندر آتے دیکھا۔ دونوں کے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا پھر جبریل دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حمین

بستر پر جا کر لیٹا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بالآخر اُسے مخاطب کیا تھا۔

”Upset؟“ جبریل نے پلٹ کر اُسے کچھ حیرانی سے دیکھا تھا ”کیوں؟“ حمین اُٹھ

کر بیٹھ گیا بڑے محتاط انداز میں اُس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”تم نے ہماری باتیں سنی تھیں؟“ وہ کچھ بھی کہنے سے پہلے جیسے تصدیق چاہتا تھا۔ ایک

لمحہ کے لیے جبریل اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”ہاں“ حمین کے

تاثرات بدلے۔ ہلکی شرمندگی نے اُسے جیسے کچھ اور defensive کیا تھا۔

”اسی لئے پوچھ رہا تھا تم مجھ سے خفا تو نہیں ہونا؟“ حمین نے اب اپنے جملے کو ذرا سا

بدلا۔ ”نہیں“ جبریل نے اُسی انداز میں کہا۔ حمین اپنے بستر سے اُٹھ کر اُس کے قریب

آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن مجھے مایوسی ضرور ہوئی۔“ جبریل نے اُس کے قریب آنے پر

جیسے اپنے جملے کو مکمل کیا۔ حمین اب سٹڈی ٹیبل سے پشت ٹکائے کھڑا تھا۔

”I didn't mean that...“ تم میرے بھائی ہو اور میں تم سے بہت پیار کرتا

ہوں... Trust me I have nothing against you...“ حمین

نے جیسے اُسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”I know it....“ جبریل نے نرمی سے اُسے ٹوکا اور اُس کا بازو ہلکے سے تھپتھپایا

”لیکن تمہیں بابا سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی He must have...“

been shocked... جبریل اب اُسے سمجھا رہا تھا۔ ”تم واقعی سمجھتے ہو کہ وہ مجھے

تم سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں... فرق کرتے ہیں؟“ وہ اُس سے کہہ رہا تھا ”جبکہ مجھے لگتا

تھا وہ تمہیں زیادہ importance دیتے ہیں۔“ جبریل نے جواباً سے کہا

تھا... ”کافی سال ایسے ہی لگتا رہا...“ جبریل نے جیسے بات ادھوری چھوڑی، حمین نے

کچھ تجسس سے کریدا ”پھر؟“ ”پھر میں بڑا ہو گیا۔“ وہ مسکرایا تھا And I...“

realized..“ کہ ایسا نہیں ہے۔ ”وہ کہہ رہا تھا“ کچھ qualities کو وہ مجھ

میں زیادہ پسند کرتے ہیں کچھ تم میں، لیکن انہوں نے ہم دونوں میں کبھی فرق نہیں

کیا، اگر کیا بھی ہو گا تو اُس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ”وہ اُس کا بڑا بھائی تھا اور بڑے بھائی ہی کی

طرح اُسے سمجھا رہا تھا۔ حمین خاموشی سے بات سُن رہا تھا۔ جب اُس نے بات ختم کی تو

حمین نے اُس سے کہا۔

”میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنی یونیورسٹی چھوڑ کر پاکستان جاؤ... میں اتنا selfish

نہیں ہوں...“ ”وہ جیسے اُسے صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا ”I just want

”to stay here“ اُس نے جبریل سے کہا تھا۔

”تمہیں کوئی selfish سمجھ بھی نہیں رہا حمین... تمہاری چوائس کی بات ہے اور بابا اس لئے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ تم چھوٹے ہو اور یہاں تم اکیلے نہیں رہ سکتے... بابا بہت بڑی ہیں، کئی بار کئی کئی دن گھر نہیں آپاتے... تم اکیلے کیسے رہو گے اُن کے ساتھ... صرف اس لئے تمہیں پاکستان بھیجنا چاہتے تھے وہ...“ اُس نے جبریل کی بات کاٹ دی اور بے حد ہلکی لیکن مستحکم آواز میں اُس سے کہا۔ I

”don't want you to go to Pakistan...“ تمہاری سٹڈیز متاثر ہوں گی... میں چلا جاؤں گا... حالانکہ میں خوش نہیں ہوں لیکن مجھے لگتا ہے میں سب کو ناراض کر کے یہاں stay نہیں کر سکتا۔ ”وہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف چلا گیا۔ جبریل کو لگا وہ کچھ الجھا ہوا تھا... جبریل اُسے لیٹتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اُس نے حمین سے کہا۔

”چند سالوں کی بات ہے حمین... پھر بابا تمہیں بھی واپس امریکہ بلا لیں گے... You can pursue your dreams...“ جبریل نے جیسے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”I don't dream much...“ اُس نے جو اباً چادر اپنے اوپر کھینچتے ہوئے کہا

تھا... جبریل اُسے دیکھ کر رہ گیا... حمین کے دماغ میں کیا تھا اُسے بو جھنا بڑا مشکل تھا،
صرف دوسروں کے لئے ہی نہیں، شاید اُس کے اپنے لئے بھی۔

جبریل ایک بار پھر اپنی سٹڈی ٹیبل پر پڑھنے بیٹھ گیا تھا وہ اُس ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا
اب اُسے کل پھر واپس جانا تھا، اُس کا اگلا سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔

”Who will stay with Baba?“ کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے اُس کا ہاتھ

رُک گیا... جبریل نے پلٹ کر ایک بار پھر بستر پر لیٹتے ہوئے حمین کو دیکھا، اُس نے
تقریباً دس منٹ بعد اُسے مخاطب کیا تھا جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ سوچکا تھا۔ اور اُس
کے سوال نے کسی کرنٹ کی طرح اُسے جیسے حمین کی سوچ تک رسائی دی تھی۔ وہ
واقعی بے حد گہرا تھا... یہ MIT نہیں تھی... امریکہ نہیں تھا... جو حمین کو واپس جانے
سے کھینچ رہا تھا... یہ سالار سکندر کی بیماری تھی جس نے حمین کو اُسے اکیلا چھوڑ دینے پر
متوحش کیا تھا۔

وہ وہاں باپ کے پاس رُکنا چاہتا تھا... بغیر اُسے یہ بتائے کہ وہ اُس کی وجہ سے وہاں رہنا
چاہتا تھا... کیوں کہ وہ اُس کے بارے میں فکر مند تھا... بالکل اُسی طرح جیسے سالار

سکندر اپنے باپ کے بارے میں فکر مند تھا، لیکن اُسے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا...

”تم بابا کی وجہ سے رُکنا چاہتے ہو؟“ جبریل نے جیسے اُس کاراز افشا کر دیا تھا۔ حمین کے چادر سے ڈھکے وجود میں حرکت ہوئی... شاید اپنے دل کا بھیدیوں فاش ہو جانے کی توقع نہیں تھی اُسے... لیکن اُس نے جواب نہیں تھا... اُس نے چادر بھی اپنے چہرے سے نہیں ہٹائی... جبریل پھر بھی اُسے دیکھتا رہا۔

حمین سکندر ایک خرگوش کی طرح سُرنگیں بنانے کا ماہر تھا... پلک جھپکنے میں کیا کیا کھود کر کہاں سے کہاں پہنچنے کا شوقین... وہ پلک جھپکتے میں دل سے نکلتا تھا وہ لمحہ بھر میں دل میں واپس آنکلتا تھا۔

جبریل سکندر اپنے اُس چھوٹے بھائی کو دیکھتا رہا جس کی اُسے اکثر سمجھ نہیں آتی تھی اور جب آتی تھی تو اُسے اپنی سمجھ بوجھ پر شک ہونے لگتا تھا۔

”تم سب لوگ جا رہے ہو؟“ بار بار پوچھنے اور اس کا جواب عنایہ سے ہاں میں ملنے کے باوجود ایرک کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ممکن تھا اور کبھی ہو سکتا تھا۔

”لیکن کیوں؟“ اگلا سوال کرنے کا خیال اُسے بڑی دیر بعد آیا تھا حالانکہ عنایہ اُس سوال سے پہلے اس کا بھی جواب دے چکی تھی۔

”بابا چاہتے ہیں ہم کچھ سال داد ادا دی کے پاس رہیں... وہ اکیلے ہیں پاکستان میں۔“
عنایہ سے ہمیشہ کی طرح بڑے تحمل سے اس کے اس سوال کا جواب ایک بار پھر دہرایا۔

”چند سال؟ کتنے سال؟“ ایرک بے حد ڈسٹر بڈ تھا۔ ”پتہ نہیں...“ عنایہ نے جواب دیا اور اُسے واقعی اس سوال کا جواب نہیں پتہ تھا۔
”لیکن یہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہو تم لوگ؟ تمہارے فادر اور جبرل تو نہیں جارہے؟“
ایرک نے اُسی انداز میں کہا تھا۔

”بابا نیویارک شفٹ ہو رہے ہیں جبریل ویسے ہی یونیورسٹی میں ہے... اتنا بڑا گھر ہماری ضرورت نہیں رہا اب۔“ عنایہ نے دہرایا۔ لیکن تم پریشان مت ہو... ہم لوگ امریکہ تو آتے جاتے رہیں گے... اور تم پاکستان آ سکتے ہو... جب بھی تمہارا دل چاہے۔“ عنایہ کو اندازہ تھا اُس کی اپنی فیملی کے ساتھ جذباتی وابستگی کا... وہ اُن کے بغیر اکیلا رہ جانے والا تھا۔

وہ دونوں اس وقت سکول کے گراؤنڈ کے ایک بیچ پر بریک کے دوران بیٹھے ہوئے تھے... ایرک نے اُس کی باتوں کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا تھا، وہ بس خاموش بیٹھا رہا تھا یوں جیسے اُس shock کو digest کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو عنایہ کے انکشاف نے اُسے دیا تھا۔

”کیا میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتا؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد ایرک نے بالآخر اُس سے کہا۔ سوال نے عنایہ کو مشکل میں ڈال دیا۔ جواب وہ جانتی تھی لیکن دے نہیں سکتی تھی۔

”تمہاری مُمی اور فیملی کو تمہاری ضرورت ہے، تم انہیں چھوڑ کر ہمارے ساتھ کیسے جاسکتے ہو؟“ عنایہ نے اپنے انکار کو بے حد مناسب الفاظ میں اُس تک پہنچایا تھا۔

”مُمی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا... میں اُن سے اجازت لے سکتا ہوں... کیا تم لوگ مجھے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو؟“ ایک اور سوال آیا... عنایہ ایک بار پھر وہیں کھڑی ہو گئی۔

”ایرک میں نہیں جانتی... میں مُمی اور بابا سے پوچھ سکتی ہوں لیکن اپنی فیملی کو اس طرح چھوڑ کر ایک دوسری فیملی کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔“ عنایہ نے کہا تھا۔ وہ 13 سال کی تھی اُسے بڑوں کی طرح نہیں سمجھا سکتی تھی پھر بھی اُس نے کوشش کی تھی۔

ایرک اُس کی بات پر خاموش رہا پھر اُس نے کہا

”چند سالوں تک میں ویسے ہی یونیورسٹی چلا جاؤں گا.. گھر سے تو ویسے بھی جانا ہی ہوگا مجھے۔“ اُس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”پھر تو اور بھی ضروری ہے کہ یہ وقت تم اپنی فیملی کے ساتھ گزارو۔“ عنایہ نے اُسی نرم لہجے میں کہا۔

”میں اپنے آپ کو تمہاری فیملی کا حصہ سمجھتا ہوں، کیا تم لوگ ایسا نہیں سمجھتے؟“

ایرک نے جواباً اُس سے کہا اور جیسے پھر سے اُسے مشکل میں ڈالا۔

”میں مُمّی سے بات کروں گی ایرک۔“ عنایہ نے اس argument سے نکلنے کے لئے جیسے ایک حل تلاش کیا۔

”اگر تم لوگ چلے گئے تو میرا گھر ایک بار پھر سے ٹوٹ جائے گا۔“ ایرک نے اُس سے

کہا ”میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں رہے گی جہاں میں جاسکوں۔“ اُس نے جیسے منت

والے انداز میں کہا تھا یوں جیسے یہ سب عنایہ کے ہاتھ میں تھا، وہ چاہتی تو سب کچھ رک

جاتا۔

عناویہ کا دل بُری طرح پسپا تھا۔

”ایسے مت کہو ایرک... دور جانے سے یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ ہمارا تعلق بھی ختم ہو جائے گا، ہم لوگ ملتے رہیں گے... بات بھی کریں گے Emails بھی...“

چھٹیوں میں تم ہمارے پاس پاکستان آسکتے ہو... اور ہم یہاں امریکہ... کچھ بھی ختم ہونے نہیں جا رہا۔ ”عناویہ نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایرک ٹھیک کہہ رہا تھا... فاصلہ دیا ہوتا ہے، سارے تعلق کھا جاتا ہے... پیار کا، دل کا، دوستی کا، رشتوں کا۔“

”اگر وہ سب نہیں رک سکتے تو تم رُک جاؤ۔“ ایرک نے یک دم اُس سے کہا، وہ بُری طرح گڑ بڑائی۔

”میں کیسے رُک سکتی ہوں... پہلے ہی حمین ضد کر رہا ہے... اور اُس کی بات کوئی نہیں مان رہا اور مجھے تو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے... میں مُمی کی help کرنا چاہتی ہوں دادا دادی کا خیال رکھنے میں۔“ اُس نے ایرک سے کہا تھا، وہ بے اختیار اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رُک گیا۔ اتنے سال عناویہ کے ساتھ پڑھنے اُس کے ساتھ دوستی اور تقریباً ہر روز اُس کے گھر جانے کے باوجود اُن کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اُسے

کچھ بھی کہہ دیتا یا کہہ سکتا۔ عنایہ سکندر کا وہ رکھ رکھاؤ ماں باپ کی طرف سے
 genes میں آیا تھا یا خاندانی تربیت تھی، لیکن یہ جس بھی وجہ سے تھا اس نے عنایہ
 سکندر کو ہمیشہ اپنی کلاس کے لڑکوں کے لئے enigmatic رکھا تھا اور ایرک
 کے لئے... fantasy وہ جس معاشرے میں پل بڑھ رہے تھے وہاں "I
 love you" ہیلو ہائے جیسی چیز بن کر رہ گئی تھی... کوئی بھی کسی سے بھی کبھی بھی
 کہہ سکتا تھا اور سننے کے لئے تیار رہتا تھا۔ نہ یہ بُری چیز سمجھی جاتی تھی نہ بُرا بنادینے والی
 چیز... اس کے باوجود ایرک کو جھجک تھی اُسے لگتا تھا وہ اگر کبھی عنایہ سے اپنی محبت کا
 اظہار اس طرح کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گی اور پھر شاید اس گھر میں اُس کا داخلہ
 ہی بند ہو جائے گا۔ اور پھر اس نے امامہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسی کوئی بات عنایہ سے
 نہیں کہے گا جب تک وہ بڑا نہیں ہو جاتا، زندگی میں کچھ بن نہیں جاتا... اور ایرک اب
 اچانک اپنے آپ کو ایک منحصرے میں پارہا تھا... وہ اب جا رہی تھی... شاید ہمیشہ کے لئے...
 اور پتہ نہیں وہ لوگ دوبارہ کبھی مل بھی پاتے تھے یا نہیں تو کیا اُسے اُس سے کہنا چاہیے
 تھا وہ سب جو وہ عنایہ کے لئے دل میں محسوس کرتا تھا... یا ایسے ہی خاموش رہنا چاہیے
 تھا۔

اُس دن پہلی بار عنایہ کے حوالے سے ایرک بُری طرح پریشان ہوا تھا... اُسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جارہی تھی، اُسے لگ رہا تھا وہ اُسے کھونے والا تھا... اور اُس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل فوری طور پر سمجھ نہیں آ رہا تھا اور جو حل وہاں بیٹھے بیٹھے ایرک کا بالآخر سمجھ آیا تھا... وہ کس قدر بے وقوفانہ تھا اس کا اُسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

”I want to marry your daughter“ یہ اُس دو صفحات پر مشتمل

خط کی ہیڈ لائن تھی جو سالار کو ایرک کی طرف سے ملا تھا اور سالار نے بے حد خاموشی کے عالم میں اُس خط کو پڑھا تھا۔ وہ شاکڈ ہوا تھا اس لئے نہیں کہ وہ ایرک کی طرف سے ایسے کسی خط کی توقع نہیں کر رہا تھا بلکہ اس لئے کیوں کہ اُس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ عنایہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ کوئی اُس کے حوالے سے اُس سے ایسی بات بھی کر سکتا تھا... وہ اس معاملے میں روایتی ہی تھا جسے ابھی بھی اپنی بیٹی بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔

امامہ اُسے چائے دینے بیڈروم میں آئی تھی جب اُس نے ڈاک چیک کرتے سالار کو ایک کاغذ ہاتھ میں لئے سوچوں میں گم دیکھا۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر جانے لگی تھی جب سالار نے اُسے روک لیا اور وہ خط اُسے تھما دیا۔ امامہ نے کچھ اُلجھے انداز میں اُس خط

کو پکڑا تھا لیکن پہلی ہیڈنگ پر نظر ڈالتے ہی اُس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا...

دوسری لائن پر نظر ڈالے بغیر بھی وہ جانتی تھی وہ کون ہو سکتا تھا، عرصے کی ایک لہر اُس کے اندر اتر آئی تھی اور سُرخ چہرے کے ساتھ اُس نے سالار سے کہا ”ایرک؟“

سالار نے سر ہلاتے ہوئے چائے کاسپ لیا اور اُسے کہا ”سار الیٹر پڑھو۔“ امامہ نے لیٹر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا ”اسے پڑھے بغیر بھی میں جانتی ہوں اُس نے کیا لکھا ہوگا۔“ وہ پھر بھی خط پڑھ رہی تھی۔ سالار چونکا تھا ”تم سے بات کی ہے اُس نے پہلے؟“ ”نہیں میں پھر بھی جانتی ہوں“ امامہ نے بالآخر خط ختم کرتے ہوئے اُسے تہہ کر کے سالار کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت خفا لگ رہی تھی۔

خط میں ایرک نے حتی المقدور بے حد مناسب انداز میں سالار سکندر سے عنایہ کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا... وہ اُس سے کس قدر محبت کرتا تھا اور کیوں اُس کے لئے عنایہ کا ساتھ ضروری تھا... پھر اُس نے سالار کو بتایا تھا کہ وہ اُس کے لئے کیا کیا کر سکتا تھا اور عنایہ کو وہ کتنا خوش رکھے گا۔

وہ خط اُس کی اپنی بیٹی کے حوالے سے نہ لکھا گیا ہوتا تو سالار اُس خط کو پڑھ کر محظوظ ہوتا، ہنستا اور شاید ایرک سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا لیکن وہ اُس کی اپنی بیٹی کے حوالے سے تھا...

بچگانہ ہوتے ہوئے بھی issue بچگانہ نہیں رہا تھا۔ عنایہ پسند کرتی ہے ایرک کو؟”

جو پہلا خیال سالار کے ذہن میں آیا تھا وہ اب یہ آیا تھا۔

”تم کیسی باتیں کرتے ہو سالار... عنایہ بے چاری کو پتہ تک نہیں ہو گا کہ یہ کیا خیالی پلاؤ

پکاتا رہتا ہے... اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے کہتی... ایرک ایک فیملی فرینڈ ہے،

بوائے فرینڈ نہیں ہے۔” امامہ نے بے حد ناگواری سے اُس کے سوال کو بالکل رد

کرتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ ضروری نہیں ہے امامہ کہ ہمیں اپنی اولاد کے دل کی ہر بات پتہ ہو۔” امامہ نے

اُس کی بات کاٹ دی اور کہا ”مجھے ہے ”وہ ہنس پڑا“ میں دن رات اُن کے ساتھ رہتی

ہوں سالار... تم نہیں رہتے... تم باپ ہو اولاد کو اور طرح جانتے ہو، میں ماں ہوں اُن کو

اور طرح دیکھتی ہوں۔” اُس نے سالار کے ہنسنے پر جیسے وضاحت کی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو اس کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ 24 گھنٹے بھی اگر اولاد کو

نظروں کے سامنے رکھا جائے تو اُن کے دلوں کو بھی دیکھا جاسکے۔ میں خوش فہمیاں

اور غلط فہمیاں دونوں ہی نہیں پالتا امامہ... باپ ہوں اس لئے rational ہو کر

سوچ رہا ہوں... ماں کی طرح جذباتی ہو کر نہیں۔” امامہ چند لمحوں کے لئے خاموش

ہو گئی، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ دونوں کئی سالوں سے اکٹھے تھے اُسے یہ خوش گمانی نہیں ہونی چاہیے تھی کہ عنایہ کو ایرک کی پسندیدگی کے بارے میں بالکل ہی اندازہ نہیں ہو گا۔ اُس کا دل چاہتا تھا نہ ہو... لیکن سالار دماغ کی بات کہہ رہا تھا۔

”میں عنایہ سے پوچھ لوں گی۔“ اُس نے یک دم کہا ”کیا؟“ سالار چائے پیتے پیتے رکا ”ایرک کے حوالے سے... اس خط کے حوالے سے... لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیسے اُس سے...“ وہ عجیب طرح سے اُلجھ کر رکی ”She is just a kid سالار اُس کی بات پر ہنستا“ ہاں یہ خط پڑھتے ہوئے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی میری بیٹی کے بارے میں اس طرح سوچ بھی کیسے سکتا ہے... She is just... a kid... لیکن یہ زندگی ہے اور ہم امریکہ میں رہ رہے ہیں جہاں آٹھ نو سال کے بچے بچیاں بھی بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز کے concept سے واقف ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی کچھ زیادہ realistic ہو کر اس صورت حال کو دیکھنا پڑے گا... تم ابھی عنایہ سے بات مت کرو... مجھے ایرک سے بات کرنے دو۔“ سالار نے جیسے اُس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک حل نکالا۔

”اور اُس سے مل کر تم کیا کرو گے؟“ امامہ کو جیسے یہ حل پسند نہیں آیا تھا ”اسی حوالے

سے گفتگو کروں گا... اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سب کتنا بچکانہ ہے اور کیوں ممکن نہیں ہے۔ ”سالار نے جواباً کہا۔

”دو تین سال پہلے بھی ایرک نے ایسی ہی بات کی تھی عنایہ کے بارے میں... تب بھی میں نے اُسے سمجھایا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، وہ مسلمان نہیں ہے اور بے حد چھوٹا ہے لیکن میں کچھ سختی سے منع اس لئے نہیں کر سکی تھی اُسے کیوں کہ اُس وقت وہ اپنے باپ کی موت کی وجہ سے بہت اپ سیٹ تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی وہ اور اپ سیٹ ہو۔“ امامہ نے سالار کو پہلی بار ایرک کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو دہرائی تھی۔

سالار اُس کی بات پر جیسے حیران ہوا ”تم نے کیا کہا تھا تب اُسے؟“ میں نے اُس سے کہا کہ وہ ابھی صرف اپنی تعلیم پر توجہ دے اور مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ عنایہ سے اس بارے میں بات نہیں کرے گا جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا۔“ امامہ نے اُسے بتایا۔

”And he agreed?“ سالار نے جواباً اُس سے پوچھا۔ امامہ نے سر ہلا دیا ”اُس نے عنایہ سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتی۔“ امامہ نے کہا۔

”اسی لئے اس نے خط میں ریفرنس دیا ہوا تھا کہ وعدے کے مطابق میں عنایہ کے بجائے آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہا ہوں... اور میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ وہ کس وعدے کا ریفرنس دے رہا ہے۔“ سالار پہلی بار amused نظر آیا تھا۔ امامہ کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی تھی۔

”میرا خیال ہے اب مجھے اس سے ضرور ملنا چاہیے، یہ ساری صورت حال بے حد دل چسپ ہے۔“ سالار نے کہا اور امامہ نے بُرا منایا۔

”کیا دلچسپی ہے اس صورت حال میں؟ تمہیں زندگی میں ہمیشہ weird لوگ اور weird situations ہی اچھی لگی ہیں۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم... تم سے میری شادی اس کا ثبوت ہے... اور دیکھو یہ کتنی اچھی رہی ہے ہم دونوں کے لئے“ وہ اُسے tease کر رہا تھا... اپنی اُس wit لئے جو اُس کا خاصہ تھی۔

زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے باوجود وہ آج بھی اُسے لاجواب کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور وقتاً فوقتاً اُس کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔

”تم ایرک سے مل کر کیا کرنا چاہتے ہو؟“ امامہ نے اُس کے تبصرے کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”بات چیت کرنا چاہتا ہوں، اُس کی sincerity دیکھنا چاہتا ہوں اُس پر پوزل کے حوالے سے۔“

وہ ہول کر رہ گئی تھی ”کیا مطلب ہے تمہارا سالار؟ تم ایک تیرہ سال کے بچے کے پر پوزل کی بات کر رہے ہو... ایک غیر مسلم کی... اور تم اپنی بیٹی کے لئے اسے consider کرنے کی بات کر رہے ہو؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے نا؟ یہ مذاق نہیں ہے...“ امامہ نے بے حد خفا ہو کر اُس سے کہا تھا۔

”ہاں میں جانتا ہوں یہ مذاق نہیں ہے۔ وہ تیرہ سال کا بچہ ہے، یہ میں بھی جانتا ہوں... غیر مسلم ہے، یہ بھی میں جانتا ہوں... لیکن وہ تیرہ سال کا بچہ اگر دس گیارہ سال کی عمر میں بھی پر پوزل دیتا ہے اور اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا ہے تو پھر میں اُسے غیر سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔“ سالار اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ امامہ بے یقینی سے اُس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم عنایہ کے لئے اُسے consider نہیں کر سکتے Don't tell me... کہ

تم ایسا کر رہے ہو؟”

”میں صرف اُس ایک option کو دیکھ رہا ہوں جو زندگی میں پہلی بار میری بیٹی کے حوالے سے آیا ہے۔“ سالار نے جواباً کہا تھا۔

”سالار میں کسی غیر مسلم کا option اپنی بیٹی کے لئے consider نہیں کروں گی۔“ امامہ نے دو ٹوک انداز میں اُس سے کہا ”مذاق میں بھی نہیں۔“ سالار نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”کسی غیر مسلم کا option میں بھی consider نہیں کروں گا لیکن کسی ایسے غیر مسلم کا ایسا ضرور کروں گا جو مسلمان ہونے کی خواہش اور ارادہ رکھتا ہو۔“ اُس نے بھی اُسی انداز میں کہا۔

”میں اُس option کو بھی consider نہیں کروں گی... میں نہ idealistic ہوں نہ ہی fantasies پر یقین رکھتی ہوں، میں اپنی بیٹی کو کسی مشکل صورت حال میں نہیں ڈالوں گی، ایسے کسی ممکنہ رشتے کے ذریعہ۔“ امامہ نے اُس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ہم رسک دوسروں کے لئے لے سکتے ہیں، دوسروں کی نصیحتیں بھی کر سکتے ہیں اور دوسروں کو ایسے بڑے کاموں پر اکسا بھی سکتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ سب چیزیں اپنے بچوں کے لئے ہم نہیں چاہ سکتے۔“ وہ کہتی گئی تھی۔

”میں نے تم سے شادی کر کے ایک رسک لیا تھا امامہ... مجھے بھی بہت روکا گیا تھا... بہت سارے وہم میرے دل میں بھی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی... دُنیا میں لوگ ایسے رسک لیتے ہیں، لینے پڑتے ہیں...“ سالار نے جو اب اُس سے جو کہا تھا اُس نے امامہ کی زبان سے سارے لفظ چھین کر اُسے جیسے گونگا کر دیا تھا... وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اُسے ایرک کے ساتھ اپنا موازنہ اور اس انداز میں اچھا نہیں لگا تھا۔ ”ایرک اور مجھ میں بہت فرق ہے... مذہب میں فرق ہوگا، لیکن کلچر میں نہیں... ہم ہمسائے تھے ایک جیسے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے... بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔“ وہ اپنے دفاع میں پر جوش دلائل دیتے دیتے یک دم اپنا جوش کھوتی چلی گئی، اُسے یک دم اندازہ ہوا تھا کہ اپنے دماغ میں دیا جانے والا اُس کا ہر argument اُس کے اور ایرک کے درمیان موجود مماثلت کو مزید ثابت کر رہا تھا۔

”میں ایرک کے option پر غور نہیں کر رہا... عبداللہ کے option پر کر رہا

ہوں... 13 سال کی عمر میں میں اپنی بیٹی کی کسی سے شادی نہیں کروں گا لیکن اگر 13 سال کی عمر میں بھی میری بیٹی کی وجہ سے کوئی میرے دین کی طرف راغب ہو رہا ہے تو میں صرف اس لئے اسے shut up call نہیں دوں گا کہ یہ میری غیرت اور معاشرتی روایات پر ضرب کے برابر ہے... مجھے معاشرے کو نہیں، اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ ”سالار نے جیسے ختم کرنے والے انداز میں بات کی تھی۔ امامہ قائل ہوئی یا نہیں، لیکن خاموش ہو گئی تھی، اُس کی بات غلط نہیں تھی لیکن سالار کی بھی درست تھی، وہ دونوں اپنے perspective سے سوچ رہے تھے اور دوسرے کے perspective کو بھی سمجھ رہے تھے۔ وہ پہلا موقع تھا جب امامہ نے شکر ادا کیا تھا کہ وہ پاکستان جا رہے تھے اور عنایہ اور ایرک ایک دوسرے سے دور ہو جاتے تو اس کے خیال میں ایرک کے سر سے عنایہ کا بھوت بھی اتر جاتا۔ سالار کے برعکس وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ ایرک کی اسلام اور عنایہ میں دلچسپی lasting ہو سکتی تھی۔ اُسے یقین تھا 13 سال کو وہ بچہ 24-25 سال کا ہوتے ہوئے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز سے گزرتا اور زندگی کی رنگینیوں سے بھی متعارف ہوتا پھر سالار سکندر کا خاندان اور اُس خاندان کی ایک لڑکی عنایہ سکندر ایرک عبد اللہ کو کہاں یاد رہتی اور اتنی یاد کہ وہ اُس کے لئے اپنا مذہب چھوڑ کر اُس کے پیچھے آتا... امامہ اس

بات پر بھی اللہ تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ وہ سب کچھ one sided تھا اگر عنایہ اس کا حصہ ہوتی تو اُس کی پریشانی اس سے سوا ہوتی۔

”ممی ایرک ہمارے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہے۔“ کچن میں کام کرتی امامہ ٹھٹھک گئی۔ عنایہ اُس کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا رہی تھی جب اُس کے ساتھ کام کرتے کرتے اُس نے اچانک امامہ سے کہا تھا۔ امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ عنایہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھی، وہ ڈش واش میں برتن رکھ رہی تھی۔

”تمہیں پتہ ہے ایرک نے تمہارے پاپا کو خط لکھا ہے۔“ امامہ نے گریڈنے والے انداز میں یک دم عنایہ سے کہا۔ وہ کچھ گلاس رکھتے ہوئے چونکی اور ماں کو دیکھنے لگی، پھر اُس نے کہا۔

”اُس نے پاپا سے بھی یہی بات کی ہوگی... وہ بہت اپ سیٹ ہے چند دنوں سے... ہر روز مجھے request کر رہا ہے کہ یا تو اُس کو بھی ساتھ لے جاؤں یا پھر خود بھی یہی رہ جاؤں۔“ اُس کی بیٹی نے بے حد سادگی سے اُس سے کہا تھا۔ وہ اب دوبارہ برتن رکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

امامہ اپنے جس خدشے کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی، اُس کی تصدیق نہ ہونے پر اُس نے جیسے شکر کیا تھا... وہ خط کے مندرجات سے واقف نہیں تھی۔

”مجھے ایرک پر ترس آتا ہے۔“ عنایہ نے ڈش واشر بند کرتے ہوئے ماں سے کہا۔ امامہ نے کچن کیبنٹ بند کرتے ہوئے ایک بار پھر اُسے دیکھا، عنایہ کے چہرے پر ہمدردی تھی اور ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تاثر نہیں تھا اور اس وقت امامہ کو اُس ہمدردی سے بھی ڈر لگا تھا۔

”کیوں ترس آتا ہے؟“ امامہ نے کہا ”کیوں کہ وہ بہت اکیلا ہے۔“ عنایہ نے جواباً کہا ”خیر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اُس کی فیملی ہے... مئی بہن بھائی دوست... پھر اکیلا کہاں سے۔“ ”لیکن مئی وہ اُن سب سے اُس طرح close تو نہیں ہے جس طرح ہم سے ہے۔“ عنایہ نے اُسے defend کیا ”تو یہ اُس کا قصور ہے، وہ گھر میں سب سے بڑا ہے، اُسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خود خیال رکھنا چاہیے۔“ امامہ نے جیسے ایرک کو قصور وار ٹھہرانے کی کوشش کی۔

”اگر جبریل اپنی فیملی کے بجائے کسی دوسرے کی فیملی کے ساتھ اس طرح attach ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ اکیلا ہے تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ امامہ نے

جیسے اُسے ایک بے حد مشکل equation حل کرنے کے لئے دے دی تھی۔
 عنایہ کچھ دیر کے لئے واقعی ہی بول نہیں پائی پھر اُس نے بے حد مدہم آواز میں کہا۔
 ”مئی ہر ایک جبریل کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتا۔“ امامہ کو اُس کا جملہ عجیب طرح
 سے چبھا، اُس کی بیٹی نے شاید زندگی میں پہلی بار کسی دوسرے شخص کے بارے میں
 اپنی ماں کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جیسے اُسے defend کرنے کی کوشش
 کی تھی اور اس کوشش نے امامہ کو پریشان کیا تھا۔

”ایرک چھوٹا بچہ نہیں ہے عنایہ!“ امامہ نے کچھ تیز آواز میں اُس سے کہا۔
 ”وہ 13 سال کا ہے...“ اُس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ عنایہ نے حیران
 ہو کر ماں کا چہرہ دیکھا نہ اُسے اور نہ ہی خود امامہ کو سمجھ آئی تھی کہ اس جملے کا مطلب کیا
 تھا۔ واحد چیز جو عنایہ اخذ کر پائی تھی وہ یہ تھی کہ اُس کی ماں کو اس وقت ایرک کا تذکرہ
 اور اُس کی زبان سے تذکرہ اچھا نہیں لگا تھا لیکن یہ بھی حیران کن بات تھی کیوں کہ
 ایرک کا ذکر اُن کے گھر میں اکثر ہوتا تھا۔

”مئی کیا میں ایرک کا خط پڑھ سکتی ہوں؟“ غیر متوقع طور پر عنایہ نے فرمائش کی تھی،
 جبکہ امامہ سمجھ رہی تھی وہ اب گفتگو کا موضوع بدل دے گی۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ امامہ نے حتمی انداز میں کہا، وہ اب اس موضوع کو شروع کر دینے پر پچھتا رہی تھی۔

”حمین نے پڑھا ہو گا وہ خط۔ ایرک اُسے ایک خط پڑھا رہا تھا... میرا خیال ہے یہ وہی خط ہو گا۔“

عناہ نے کچن سے نکلتے ہوئے اُس کے اوپر جیسے بجلی گرائی تھی ”حمین نے؟“ امامہ کو یقین نہیں آیا۔

”ہاں... میں نے ایرک اور اُسے بیٹھے کوئی کاغذ پڑھتے دیکھا تھا... میرا خیال ہے یہ خط ہی ہو گا کیوں کہ ایرک ہر کام اُس سے پوچھ کر کر رہا ہے آج کل ... But I am not sure“

عناہ نے اپنے ہی اندازے کے بارے میں خود ہی بے یقینی کا اظہار کیا۔

”ہر شیطانی کام کے پیچھے حمین ہی کیوں نکلتا ہے آخر؟“ امامہ نے دانت پیستے ہوئے سوچا تھا، وہ اس وقت یہ بھی بھول گئی تھی کہ اُسے کچن میں کیا کام کرنا تھا... اُسے اب یقین تھا کہ ایرک کو اس خط کا مشورہ دینے والا حمین ہی ہو سکتا تھا۔

اور امامہ کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ خط ایرک نے لکھا تھا اور حمین نے اُسے ایڈٹ کیا تھا۔ اُس نے اُس خط کے ڈرافٹ میں کچھ جذباتی جملوں کا اضافہ کیا تھا اور کچھ حد سے زیادہ جذباتی جملوں کو حذف کیا تھا۔

ایرک اُس کے پاس ایک خط کا ڈرافٹ لایا تھا... یہ بتائے بغیر کہ وہ خط وہ سالار سکندر کے نام لکھنا چاہتا تھا، اُس نے حمین سے مدد کی درخواست کی تھی کہ وہ ایک مسلم گرل فرینڈ کو پریوز کرنا چاہتا تھا اور اُس کے باپ کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ حمین نے جواباً سے مبارک باد دی تھی۔ ایرک نے اُس سے کہا تھا کہ کیوں کہ وہ مسلم کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اس لئے اُسے اُس کی مدد درکار تھی، اور حمین نے وہ مدد فراہم کی تھی۔

محمد حمین سکندر نے Muslim sensitivites کو مد نظر رکھتے ہوئے اُس کے لیٹر کو redraft کیا تھا اور ایرک نے نہ صرف اُس کا شکریہ ادا کیا تھا بلکہ جب سالار سکندر نے اُسے ملاقات کی دعوت دی تو اُس نے حمین کو اس بارے میں بھی مطلع کیا تھا۔ حمین کی excitement کی کوئی حد نہیں تھی... اُس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ ایرک کا یہ راز سب سے کہہ دے، لیکن اُس نے ایرک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس

راز کو کسی سے نہیں کہے گا۔ عنایہ نے ایک آدھ دن اُس گٹھ جوڑ کے بارے میں اُسے کریدنے کی کوشش کی تو بھی اُس نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ ایک ضروری لیٹر لکھنے میں ایرک کی مدد کر رہا تھا، لیکن خط کس کے نام تھا اور اُس میں کیا لکھا جا رہا تھا عنایہ کے کریدنے پر بھی حمین نے یہ راز نہیں اگلا تھا۔

”مجھے پتہ ہے ایرک نے وہ خط کس کے لئے لکھوایا تھا۔“ عنایہ امامہ کے پاس سے ہو کر سیدھا حمین کے پاس پہنچی تھی۔ وہ اُس وقت اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھا اور عنایہ کے اس تبصرے پر اُس نے بے اختیار دانت پیستے ہوئے کہا ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا وہ کوئی راز نہیں رکھ سکتا۔ مجھے کہہ رہا تھا کسی کو نہ بتاؤں خاص طور پر تمہیں... اور اب خود تمہیں بتا دیا اُس نے۔“ حمین خفا تھا، اُس کا اندازہ یہی تھا کہ یہ راز ایرک نے خود ہی فاش کیا ہوگا۔

”ایرک نے مجھے نہیں بتایا... مجھے تو مئی نے بتایا ہے۔“ اس بار حمین گیم کھیلنا بھول گیا تھا، اُس کے ہیر و نے اُس کے سامنے اونچی چٹان سے چھلانگ لگائی اور وہ اُسے سمندر میں گرنے سے نہیں بچا پایا... کچھ ویسا ہی حال اُس نے اپنا بھی اس وقت محسوس کیا تھا... ایک دن پہلے ہی اس کے اور مئی کے تعلقات میں پاکستان جانے کے فیصلے نے پھر سے

گرم جوشی پیدا کی تھی اور اب یہ انکشاف۔

”مٹی نے کیا بتایا ہے؟“ حمین کے منہ سے ایسے آواز نکلی جیسے اُس نے کوئی بھوت دیکھا تھا۔

”مٹی نے بتایا کہ ایرک نے پاپا کو کوئی خط لکھا ہے اور مجھے فوراً خیال آیا کہ جو خط تم پڑھ رہے تھے، وہ وہی ہو سکتا ہے۔“ عنایہ روانی میں بتا رہی تھی اور حمین کے دماغ میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے... کاٹو تو بدن میں لہونہ ہونا اس وقت اُس پر مصداق ثابت ہوتا۔ ایسی کون سی مسلم گرل فرینڈ بن گئی تھی یک دم ایرک کی جس کے باپ کو خط لکھوانے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی جبکہ 24 گھنٹے وہ اگر کسی کے گھر بھی آتا تھا تو وہ خود ان ہی کا گھر تھا پھر اُس کی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی یا وہ

excitement میں اتنا ہی اندھا ہو گیا تھا کہ اُس نے یہ سوچ لیا کہ ایرک کبھی عنایہ کے حوالے سے ایسا کچھ نہیں سوچ سکتا... حمین اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا... اور ملامت بڑا چھوٹا لفظ تھا اُن الفاظ کے لئے جو وہ اُس وقت اپنے اور ایرک کے لئے استعمال کر رہا تھا۔

”تم بول کیوں نہیں رہے؟“ عنایہ کو اُس کی خاموشی کھٹکی تھی۔ ”میں نے سوچا ہے

میں اب کم بولوں اور زیادہ سوچوں۔ ”حمین نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اُس تک وہ
خبر پہنچائی جس پر اُسے یقین نہیں آیا۔

”Keep dreaming“ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو tease کرنے والے
انداز میں کہا۔

”مُمی نے تمہیں بتایا اُس خط میں کیا ہے؟“ حمین اس وقت گلے گلے اس دلدل میں
پھنسا ہوا تھا۔

”نہیں لیکن میں نے انہیں بتایا کہ یہ خط حمین کی مدد سے لکھا گیا ہوگا، میں اُس سے
پوچھ لوں گی... اُس خط میں کیا لکھا تھا ایرک نے پاپا کو؟“ عنایہ اب اُس سے پوچھ رہی
تھی۔ حمین بے اختیار کراہا تھا... وہ مصیبت کو دعوت نہیں دیتا تھا... مصیبت خود آکر اُس
کے گلے کاہار بن جاتی تھی۔

ایرک کو سالار نے خود دروازے پر ریسیدو کیا تھا وہ ویک اینڈ تھا اور اس وقت اُن کے
بچے سائیکلنگ کے لئے نکلے ہوئے تھے... گھر پر صرف امامہ اور سالار تھے۔

”یہ آپ کے لئے!“ ایرک نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے چند پھول جو گلدستے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اُس کی طرف بڑھا دیے۔ سالار نے ایک نظر اُن پھولوں پر ڈالی، اُسے یقین تھا اُس میں سے کچھ خود اُس ہی کے لان سے لئے گئے تھے لیکن اُس نے اسے نظر انداز کیا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں تھی۔“ اُس نے اُسے اندر لاتے ہوئے شکر یہ کے بعد کہا۔ ایرک فارمل میٹنگ کے لئے آیا تھا اور آج پہلی بار سالار نے اُسے فارمل گیٹ اپ میں دیکھا تھا۔

”بیٹھو“ سالار نے اُسے وہیں لاؤنج میں ہی بیٹھنے کے لئے کہا۔ ایرک بیٹھ گیا۔ سالار اُس کے بالمقابل بیٹھا اور اُس کے بعد اُس نے ٹیبل پر پڑا ایک لفافہ کھولا۔ ایرک نے پہلی بار غور کیا، وہ اُسی کا خط تھا اور سالار اب اُس خط کو دوبارہ کھولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایرک بے اختیار نروس ہوا تھا۔ خط لکھ بھیجنا اور بات تھی اور اب اُسی خط کو اپنے اپنے اُس بندے کے ہاتھ میں دیکھنا جس کے نام وہ لکھا گیا تھا، دوسری۔

سالار نے ایک ڈیڑھ منٹ لیا پھر اُس خط کو ختم کرتے ہوئے ایرک کو دیکھا۔ ایرک نے نظریں ہٹالیں۔

”کیا عنایہ کو پتہ ہے تمہاری اس خواہش کے بارے میں؟“ سالار نے بے حد ڈائریکٹ سوال کیا تھا۔

”میں نے مسز سالار سے وعدہ کیا تھا کہ میں عنایہ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کروں گا اس لئے میں نے آپ کو خط لکھا“ ایرک نے جواباً کہا، سالار نے سر ہلایا اور پھر کہا۔

”اور یہ واحد وجہ ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں یہاں بلا یا ہے، تمہارا خط پھاڑ کر نہیں پھینکا... تم وعدہ کر کے نبھاسکتے ہو، یہ بہت اچھی کوالٹی ہے۔“

سالار سنجیدہ تھا اور اُس نے بے حد بے دھڑک انداز میں کہا تھا۔ ایرک کی تعریف کی تھی، لیکن اُس کے لہجے اور چہرے کی سنجیدگی نے ایرک کو خائف کیا تھا۔

”تو تم عنایہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ سالار نے اُس خط کو اب واپس میز پر رکھ دیا تھا اور اُس کی نظریں ایرک پر جمی ہوئی تھیں۔ ایرک نے سر ہلایا۔ ”پہلی بات یہ ایرک کہ صرف شادی کی نیت کر کے مذہب بدل لینا بہت چھوٹی بات ہے... ہمارا دین اس کی اجازت دیتا ہے، اسے بہت پسند نہیں کرتا۔“ سالار نے کہا۔

”تمہارے پاس مسلمان ہونے کے لئے میری بیٹی سے شادی کے علاوہ کوئی اور وجہ

ہے؟ ”سالار نے اسی انداز میں اُس سے اگلا سوال کیا تھا۔ ایرک خاموش بیٹھا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”مذہب کی تبدیلی ایک بہت بڑا فیصلہ ہے اور یہ نفس کی کسی خواہش کی وجہ سے نہیں ہونا چاہیے، عقل کا فیصلہ ہونا چاہیے... کیا تمہاری عقل تمہیں یہ کہتی ہے کہ تمہیں مسلمان بن کر اپنی زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزارنی چاہیے؟ ”اُس نے ایرک سے پوچھا، وہ گڑ بڑایا۔

”میں نے اس پر سوچا نہیں“ ”میرا بھی یہی اندازہ ہے کہ تم نے اس پر سوچا نہیں... اس لئے بہتر ہے پہلے تم اس پر اچھی طرح سوچو۔“ سالار نے جواباً اُس سے کہا۔

”میں کل پھر آؤں؟“ ایرک نے اُس سے کہا ”نہیں تم ابھی کچھ سال اس پر سوچو... کہ تمہیں مسلمان کیوں بننا ہے، اور اُس کی وجہ عنایہ نہیں ہونی چاہیے۔“ سالار نے اُس سے کہا۔

”میں ویسے بھی عنایہ کی شادی“ ”صرف مسلمان“ سے نہیں کروں گا، مسلمان ہونے کے ساتھ اُسے ایک اچھا انسان بھی ہونا چاہیے۔“ اُس نے کہا۔

ایرک کے چہرے پر یک دم مایوسی اُبھری۔

”یعنی آپ میرا پروپوزل قبول نہیں کر رہے؟“ اُس نے سالار سے کہا۔

”فوری طور پر نہیں، لیکن تقریباً دس سال بعد جب مجھے عنایہ کی شادی کے حوالے سے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا تو میں تمہیں ضرور consider کروں گا... لیکن اس کے لئے ضروری ہے ان دس سالوں میں تم ایک اچھے مسلمان کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بن کر بھی رہو۔“ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”Can you guide me to this?“ ایرک نے یک دم کہا۔ سالار چند لمحے خاموش رہا، وہ اُسی ایک چیز سے بچنا چاہتا تھا، اسی ایک چیز کو avoid کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب ایرک نے اُس سے بالکل direct مدد مانگ لی تھی۔

”ہاں ہم سب تمہاری مدد کر سکتے ہیں، لیکن اُس کے لئے رشتہ جوڑنا ضروری نہیں ہے ایرک! ہم انسانیت کے رشتے کی بنیاد پر بھی تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔“ سالار نے بالآخر جواباً کہا۔

”13 سال کی عمر میں سکول میں پڑھتے ہوئے تم شادی کرنا چاہتے ہو اور تمہیں یہ

اندازہ نہیں ہے کہ شادی ذمہ داریوں کا دوسرا نام ہے۔ تم اپنی فیملی کی ذمہ داریوں سے بھاگتے ہوئے ایک اور فیملی بنانے کی کوشش کر رہے ہو... تم اس فیملی کی ذمہ داری کیسے اٹھاؤ گے؟ مذہب بدل کر ایک دوسرے مذہب میں داخل ہونا اُس سے بھی بڑا کام ہے، کیا تمہارے پاس اتنا وقت اور passion ہے کہ تم اپنے اس نئے مذہب کو سمجھو، پڑھو اور اُس پر عمل کرو؟... کیا تم اُن پابندیوں سے واقف ہو جو یہ نیا مذہب تم پر لگائے گا...؟ ”سالار اب اُس پر جرح کر رہا تھا۔

”میں قرآن پاک کو ترجمے سے پڑھ چکا ہوں، میں پہلے ہی سب چیزیں جانتا ہوں اور میں عمل کر سکتا ہوں۔“ ایرک بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر ایسا کرتے ہیں دس سال کا ایک معاہدہ کرتے ہیں... اگر 23 سال کی عمر میں تمہیں لگا کہ تمہیں عنایہ سے ہی شادی کرنی ہے تو پھر میں عنایہ سے تمہاری شادی کر دوں گا... شرط یہ ہے کہ ان دس سالوں میں تم کو ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان کے طور پر بھی نظر آنا چاہیے۔“ سالار نے ایک اور بالکل سادہ کاغذ اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بہت لمبی مدت ہے۔“ ایرک نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”ہاں لیکن یہ وہ مدت ہے جس میں مجھے تمہارے فیصلے تمہاری sincerity کو ظاہر کریں گے، تمہارے بچکانہ پن کو نہیں۔“ سالار نے جواباً اس سے کہا۔ وہ سالار کو دیکھتا رہا بے حد خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے... پھر اُس نے کہا۔

”مسٹر سالار سکندر آپ مجھ پر دراصل اعتبار نہیں کر رہے۔“ اس نے بے حد blunt ہو کر سالار سے کہا۔

”اگر کر رہے ہوتے تو مجھ سے دس سال کے انتظار کا نہ کہتے لیکن ٹھیک ہے، آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔“ اُس نے کہا، میز پر پڑا ایک قلم اٹھایا وہاں پڑے سادے کاغذ کے بالکل نیچے اپنا نام لکھا، اپنے دستخط کئے اور تاریخ ڈالی پھر قلم بند کر کے واپس میز پر اُس کاغذ کے اوپر رکھ دیا۔ ”میں عنایہ سے متاثر نہیں ہوا، میں آپ اور آپ کے گھر سے متاثر ہوا... آپ کی بیوی کی نرم مزاجی اور آپ کی اصول پسندی سے... اُن values سے جو آپ نے اپنے بچوں کو دی ہیں... اور اس ماحول سے جہاں میں ہمیشہ آکر اپنا آپ بھول جاتا تھا... وہ مذہب یقیناً اچھا مذہب ہے جس کے پیروکار آپ لوگوں جیسے ہوں... میں عنایہ کے ساتھ ایک ایسا ہی گھر بنانا چاہتا تھا کیوں کہ میں بھی اپنی اور اپنے بچوں کے لئے ایسی زندگی چاہتا ہوں... میں جانتا تھا آپ لوگوں کے خاندان کا حصہ بنانا اتنا آسان

نہیں ہوگا... لیکن میں کوشش کرتا رہوں گا... کیوں کہ کوشش تو آپ کا مذہب ہی کرنے کو کہتا ہے، جو اب میرا مذہب بھی ہوگا۔”

وہ کسی تیرہ سال کے بچے کے الفاظ نہیں تھے اور وہ اتنے جذباتیت سے بھرپور بھی نہیں تھے جیسا اُس کا خط تھا، لیکن اُس کے باوجود اُس کے اُن جملوں نے صرف سالار کو نہیں امامہ کو بھی بُری طرح متاثر کیا تھا... وہ چند لمحے پہلے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اُس نے صرف ایرک کے جملے سنے تھے... ایرک اب اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا... اُس نے امامہ کو بھی دیکھا اور اُسے ہمیشہ کی طرح سلام کیا، پھر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل گیا۔ لاؤنج میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیرونی دروازے کے بند ہونے کی آواز پر امامہ آگے بڑھ آئی تھی، اُس نے لاؤنج کی سینٹر ٹیبل پر پڑا وہ کاغذ اُٹھا کر دیکھا جس پر ایرک دستخط کر کے گیا تھا، اُس کاغذ پر صرف ایک نام تھا... عبداللہ... اور اُس کے نیچے دستخط اور تاریخ۔

امامہ نے سالار کو دیکھا، اُس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ امامہ کے ہاتھ سے لیا، اُسے فولڈ کر کے اُسی لفافے میں ڈالا جس میں ایرک کا خط تھا اور پھر اُسے امامہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ دوبارہ آئے گا اور اگر میں نہ بھی ہو اور یہ اپنے وعدے پر پورا اترتا تو تم بھی اُس
 وعدے پر پورا اترنا جو میں نے اُس سے کیا ہے۔ امامہ نے کپکپاتی انگلیوں سے کچھ بھی
 کہے بغیر وہ لفافہ پکڑا تھا۔

عائشہ عابدین کو زندگی میں پہلی بار اگر کسی لڑکے سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تھا، تو وہ
 جبریل سکندر تھا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اُس نے اپنی بڑی بہن نساء عابدین سے
 جبریل کے بارے میں اتنا کچھ سُن رکھا تھا کہ وہ ایک فہرست بنا سکتی تھی۔ نساء جبریل کی
 کلاس فیلو تھی اور اُس سے ”شدید“ متاثر اور مرعوب... اس کے باوجود کہ وہ خود ایک
 شاندار تعلیمی کیریئر رکھنے والی سٹوڈنٹ تھی

عائشہ فیس بک پر اپنی بہن کی وال پراکٹر جبریل کے comments پڑھتی تھی جو
 وہ اُس کی بہن کے status updates پر دیتا رہتا تھا... عائشہ بھی کئی بار ان
 updates پر تبصرہ کرنے والوں میں سے ہوتی تھی لیکن جبریل سکندر کی wit کا
 مقابلہ وہاں کوئی بھی نہیں کر پاتا تھا، اُس کے comments نساء عابدین کی وال
 پر بالکل الگ چمکتے نظر آتے تھے اور جب وہ کسی وجہ سے وہاں تبصرہ نہیں کر پاتا تو کئی بار

اُس کے کلاس فیلوز کے تبصروں کی لمبی قطار کے بیچ میں جبریل کی خاموشی اور غیر حاضری کو بُری طرح miss کیا جاتا اور ان miss کرنے والوں میں سرفہرست عائشہ عابدین تھی جسے خود بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جبریل کے comments پڑھتے پڑھتے بے حد addictive ہو گئی تھی۔

نساء کے ساتھ جبریل کی مختلف فنکشنز اور سرگرمیوں میں اکثر بہت ساری گروپ فوٹوز نظر آتی تھیں لیکن عائشہ کو ہمیشہ جبریل کی فیملی کے بارے میں curiosity تھی... وہ سالار سکندر سے واقف تھی کیوں کہ اُس کا تعارف نساء نے ہی کروایا تھا، لیکن اُس کی فیملی کے باقی افراد کو دیکھنے کا اُسے بے حد اشتیاق تھا اور یہی اشتیاق اُسے بار بار جبریل کی فرینڈز لسٹ میں نہ ہونے کے باوجود اُس کی تصویروں کو کھوجنے کے لئے مجبور کرتا تھا، جہاں اُسے رسائی حاصل تھی... کچھ تصویریں وہ دیکھ سکتی تھی... کچھ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی... لیکن ان تصویروں میں جن تک اُسے رسائی حاصل تھی اُن میں جبریل کی فیملی کی تصاویر نہیں تھیں۔

جبریل بھی غائبانہ طور پر عائشہ سے واقف تھا، اور اس تعارف کی وجہ فیس بک پر نساء کے status updates پر ہونے والے تبصروں میں اُن کا حصہ لینا تھا اور نساء

نے اپنی وال پر جبریل کو اپنی بہن سے متعارف کروایا تھا۔ وہ غائبانہ تعارف بس اتنا ہی رہا تھا کیوں کہ جبریل نے کبھی اُس کی ID کھوجنے کی کوشش نہیں کی اور عائشہ کی اپنی وال پر تصویریں بہت کم تھیں، اُس سے بھی زیادہ کم وہ لوگ تھے جنہیں اُس نے اپنی contact list میں add کیا ہوا تھا... نساء کے برعکس اُس کا حلقہ احباب بے حد محدود تھا، اور اُس کی کوشش بھی یہی رہتی تھی کہ وہ اُسے اتنا ہی محدود رکھے۔

عائشہ کو جبریل کے بارے میں ہمیشہ یہ غلط فہمی رہی کہ وہ نساء میں انٹر سٹڈ تھا اور اس تاثر کی بنیادی وجہ خود نساء تھی جو اس بات کو ایڈمٹ کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتی تھی کہ عمر میں اُس سے چھوٹا ہونے کے باوجود وہ جبریل کو پسند کرتی تھی... ایک دوست کے طور پر جبریل کی اُس سے بے تکلفی تھی، ویسی ہی بے تکلفی جیسی اُس کی اپنی دوسری کلاس فیلوز سے بھی تھی اور نساء نے کبھی اس بے تکلفی کو

misinterpret نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ جبریل لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی اور دوستی میں بھی بہت ساری حدود و قیود رکھتا تھا اور بے حد محتاط تھا۔ نساء عمر میں اُس سے چار سال بڑی تھی... وہ اپنے قد کاٹھ اور maturity دونوں سے پندرہ سولہ سال کا نہیں لگتا تھا اور نساء یہ بھی جانتی تھی۔ یونیورسٹی میں اتنا وقت گزار لینے کے باوجود

جبریل ابھی تک گرل فرینڈ نامی کسی بھی چیز کے بغیر تھا، تو ایسے حالات میں سالار سکندر کی اُس لائق اولاد پر قسمت آزمائی کرنے کے لئے کوئی بھی تیار ہو سکتا تھا...
صرف نساء ہی نہیں۔

عائشہ عابدین ان سب چیزوں سے واقف تھی... نساء کی جبریل میں دلچسپی اُن کے گھر میں ایک اوپن سیکرٹ تھا لیکن ان دونوں کے future کے حوالے سے نہ تو اُن کو کوئی assurance تھی نہ ہی کسی اور کو... نساء ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہونے والوں میں سے تھی اور جبریل سکندر وہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے اُسے متاثر کیا تھا، مگر فی الحال یہ جبریل ہی تھا جس کا ذکر وہ کرتی رہتی تھی۔

عائشہ عابدین ایک passive observer کی طرح یہ سب کچھ دیکھتی آرہی تھی اور جب تک وہ جبریل سے ملی، وہ اُس سے پہلے ہی بہت متاثر تھی۔

یونیورسٹی کے ایک فنکشن میں وہ پہلی بار جبریل سے بالآخر ملنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ نساء کو اندازہ نہیں تھا کہ عائشہ صرف جبریل سے ملنے کے لئے اُس کے ساتھ یونیورسٹی آنے پر تیار ہوئی ہے، ورنہ وہ جب بھی امریکہ آتی اُن سب کی کوششوں کے باوجود اپنی مرضی کی جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں جاتی تھی... یونیورسٹی میں ہونے والی

کوئی تقریب تو وہ شاید کوئی آخری چیز تھی جس کے لئے عائشہ یونیورسٹی آئی اور نساء نے یہ بات جبریل سے اُسے متعارف کرواتے ہوئے کہہ بھی دی تھی۔

جبریل سکندر وہ پہلا لڑکا تھا جسے دیکھنے کا عائشہ عابدین کو اشتیاق ہوا تھا اور جبریل سکندر ہی وہ پہلا لڑکا تھا جسے عائشہ عابدین اپنے ذہن سے نکالنے میں اگلے کئی سال تک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

تصویریں کبھی کبھار کسی شخص کی شخصیت اور وجاہت کو کیمو فلانج کر دیتی ہیں... اور بہت اچھا کرتی ہیں۔ محمد جبریل سکندر charismatic تھا... خطرناک حد تک متاثر اور مرعوب کرنے والی شخصیت رکھتا تھا... 16 سال کی عمر میں بھی وہ تقریباً چھ فٹ قد کے ساتھ سالار سکندر کی گہری سیاہ آنکھیں اور اپنی ماں کے تیکھے نین نقوش اور بے حد بھاری آواز کے ساتھ ایک عجیب ٹھہراؤ کا منبع دکھتا تھا... ایک بے حد

casual ڈارک بلو جینز اور دھاری دار بلیک اینڈ وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس جبریل سکندر مسکراتے ہوئے پہلی بار عائشہ عابدین سے مخاطب ہوا تھا اور وہ بُری طرح نروس ہوئی تھی... وہ نروس ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن جبریل سے وہاں کھڑے صرف مخاطب ہونا بھی اُسے اُس کے پیروں سے ہلانے کے لئے کافی تھا۔ وہ صرف نساء ہی نہیں کسی

بھی عمر کی کسی بھی لڑکی کو پاگل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عائشہ عابدین نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

”کیوں؟ آپ کو اچھا نہیں لگتا امریکہ آکر گھومنا پھرنا؟“ اُس نے نساء کے کسی تبصرے پر عائشہ سے پوچھا تھا۔

”نہیں مجھے اچھا لگتا ہے، لیکن بہت زیادہ نہیں۔“ وہ گڑ بڑائی۔ اُس نے خود کو سنبھالا، پھر جبریل کے سوال کا جواب دیا جس کی آنکھیں اُسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اب سینے پر بازو لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ اُس کے جواب پر مسکرایا تھا پھر اُس نے نساء کو فنکشن کے بعد عائشہ کے ساتھ کسی ریستورنٹ میں کافی کی دعوت دی تھی جو نساء نے قبول کر لی تھی،

وہ دونوں اپنے کچھ دوستوں کا انتظار کرتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے... عائشہ ایک بار پھر passive observer بن گئی تھی۔ نساء ایک بہت dominating لڑکی تھی اور گھر میں وہ ہر کام اپنی مرضی اور اپنے طریقے سے کروانے کی عادی تھی لیکن عائشہ نے نوٹس کیا تھا، نساء جبریل کے ساتھ اُس طرح نہیں کر رہی تھی۔ وہ اُس کی پوری بات سن کر کچھ کہتی اور اُس کی بہت سی باتوں سے اتفاق کر رہی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے عائشہ عابدین کو وہ بے حد اچھے

لگ رہے تھے... ایک پرفیکٹ کپل... جس پر اُسے رشک آ رہا تھا اور جبریل سے اس طرح متاثر ہونے کے باوجود وہ اُسے نساء کی زندگی کے ساتھی کے طور پر ہی دیکھ رہی تھی... نساء کا taste اور چوائس ہر چیز میں اچھی اور منفرد تھی اور جبریل اُس کا ایک اور ثبوت ہے۔

فنکشن کے بعد وہ نساء اور جبریل کے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک کیفے میں کافی پینے گئی تھی، یہ ایک اتفاق تھا یا خوش قسمتی کہ چھ لوگوں کے اُس گروپ میں جبریل اور عائشہ کی سیٹس ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ نساء جبریل کے بالمقابل میز کے دوسری جانب تھی اور عائشہ کے دوسری طرف نساء کی ایک اور دوست سوزین۔ عائشہ عابدین کی nervousness اب اپنی انتہا کو تھی۔ وہ اُس کے اتنے قریب تھی کہ اُس کے پرفیوم کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ ٹیبل پر دھرے اُس کے ہاتھ کی کلائی میں بندھی گھڑی سے ڈائل پر ٹک ٹک کرتی سوئی دیکھ سکتی تھی لیکن اگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی تو وہ گردن موڑ کر اُسے اتنے قریب سے دیکھنا تھا... وہ غلط جگہ بیٹھ گئی تھی عائشہ عابدین کو مینیو دیکھتے ہوئے احساس ہوا تھا۔

جبریل میز بان تھا اور وہ سب ہی سے پوچھ رہا تھا، اُس نے عائشہ سے بھی پوچھا تھا۔

عائشہ کو مینیو کارڈ پر اُس وقت کچھ بھی لکھا نہیں دکھ رہا تھا۔ جو دکھ بھی رہا تھا وہ اس احساس سے غائب ہو گیا تھا کہ وہ گردن موڑ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ ”جو سب لیں گے میں بھی لے لوں گی۔“ عائشہ نے جیسے سب سے محفوظ حل تلاش کیا تھا، جبریل مسکرایا اور اُس نے اپنا اور اُس کا آرڈر ایک ہی جیسانوٹ کروایا۔ وہ ایک ویجی ٹیبیل پیزا تھا جسے اُس نے ڈرنکس کے ساتھ آرڈر کیا تھا اور بعد میں کافی کے ساتھ چاکلیٹ موز... نساء اپنا آرڈر پہلے دے چکی تھی اور باقی سب لوگ بھی اپنے آرڈر نوٹ کروا رہے تھے... ہم برگر... ٹرمپس... stuffed turkey... یہ امریکن دوستوں کے آرڈرز تھے... نساء نے ایک Salmon Sandwich منگوا یا تھا۔

”میں اس سال میڈیکل میں چلی جاؤں گی، میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔“ روٹین کی گفتگو کے دوران جبریل کے سوال پر یک دم اُس نے بتایا۔

”Fantastic!“ اُس نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ خود بھی میڈیسن میں ہی جا رہا تھا۔

وہ سب لوگ گفتگو میں مصروف تھے اور اس گفتگو میں اُس کی خاموشی کو جبریل ہی وقتاً فوقتاً ایک سوال سے توڑتا... وہ جیسے اُسے بوریٹ سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر

engage کرنے کی... اور عائشہ نے یہ چیز محسوس کی تھی۔ وہ جن ٹین ایجرز کو جانتی تھی، وہ اور طرح کے تھے... یہ اور طرح کا تھا۔

کھانا آنے پر وہ اسی طرح گفتگو میں مصروف خود کھانے کے ساتھ ساتھ عائشہ کو بھی سرو کرتا رہا۔ یوں جیسے وہ روٹین میں یہ سب کرنے کا عادی رہا ہو۔

محمد جبریل سکندر سے ہونے والی وہ پہلی ملاقات اور اُس میں ہونے والی ایک ایک چیز عائشہ عابدین کے ذہن اور دل دونوں پر نقش ہو گئی تھیں۔

”جس بھی لڑکی کا یہ نصیب ہوگا، وہ بے حد خوش قسمت ہوگی۔“ اُس نے سوچا تھا ”کاش یہ نساء ہی کو مل جائے!“ اُس نے بے حد دل سے خواہش اور دعا کی تھی۔ اُس عمر میں بھی اُس نے اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ بھی سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ اگر کرتی تو جبریل وہ پہلا لڑکا ہوتا جس جیسے شخص کی خواہش وہ اپنے لئے بھی کرتی۔ جبریل نے اُس کے لاشعور کو اُس پہلی ملاقات میں اس طرح اثر انداز کیا تھا۔

”میں تمہارے لئے بہت دعا کر رہی ہوں نساء... کہ تمہاری شادی جبریل سے ہو جائے... جب بھی ہو... وہ بہت اچھا ہے۔“ اُس کیفے سے اُس شام گھر واپس آنے کے بعد عائشہ نے نساء سے کہا تھا۔ وہ جو اب ہنسی۔

”خیر ابھی شادی وغیرہ کا تو کوئی سین نہیں ہو سکتا ہم دونوں کے لئے... وہ بہت young ہے اور مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے، لیکن مجھے وہ بہت پسند ہے... اور اگر کبھی بھی اُس نے مجھ سے کچھ کہا تو میں انکار نہیں کروں گی... کون انکار کر سکتا ہے جبریل کو۔“ اپنے بیڈ روم میں کپڑے تبدیل کرنے کے لئے نکالتے ہوئے نساء نے اُس سے کہا۔

”اُس کے ماں باپ نے بہت اچھی تربیت کی ہے اُس کی... تم نے دیکھا وہ کس طرح تمہیں توجہ دے رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں میں کبھی اپنے ساتھ کوئی guest لے کر گئی ہوں اور جبریل نے اُسے اس طرح attention نہ دی ہو۔“ وہ کہتی چلی گئی۔ عائشہ کا دل عجیب انداز میں بُجھا... تو وہ توجہ سب ہی کے لئے ہوتی تھی اور عادت تھی، favor نہیں۔ اُس نے کچھ مایوسی سے سوچا ”Fair enough“

”تمہیں پتہ ہے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے وہ...؟“ نساء اُس سے کہہ رہی تھی ”وہ حافظِ قرآن ہے... بے حد practising ہے... کبھی تم اُس کی تلاوت سنو... لیکن اتنا مذہبی ہونے کے باوجود وہ بہت لبرل ہے... تنگ نظر نہیں ہے جیسے بہت سارے new born Muslims ہو جاتے ہیں... نہ ہی اس کو میں نے کبھی دوسروں

کے حوالے سے judgemental پایا ہے... مجھے نہیں یاد کبھی اُس نے میرے
یا کسی اور فی میل کلاس فیلو کے لباس کے حوالے سے کچھ کہا ہو... یا ویسے کسی کے
بارے میں comment کیا ہو ”Never...“

نساء کہتی جا رہی تھی وہ لباس کے معاملے میں خاصی ماڈرن تھی اور اُسے یہ قابل قبول
نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اُس پر اس حوالے سے کوئی قد غن لگاتا اور جبریل میں اُسے یہ
خوبی بھی نظر آگئی تھی۔

عائشہ بالکل کسی سحر زدہ معمول کی طرح یہ سب سُن رہی تھی۔ نساء کے انکشافات نے
جیسے عائشہ کے لئے اُس کی زندگی کے آئیڈیل لائف پارٹنر کی چیک لسٹ میں موجود
اینٹریز کی تعداد بڑھادی تھی۔

اُس رات عائشہ عابدین نے بڑی ہمت کر کے جبریل کو فرینڈ ریکویسٹ بھیجی تھی اور پھر
کئی گھنٹے وہ اس انتظار میں رہی کہ وہ کب اُسے add کرتا ہے۔

وہ فجر کے وقت نماز کے لئے اُٹھی تھی اور اُس وقت نماز پڑھنے کے بعد اُس نے ایک
بار پھر فیس بک چیک کیا تھا اور خوشی کی ایک عجیب لہر اُس کے اندر سے گزری تھی، وہ
add ہو چکی تھی... اور جو پہلی چیز عائشہ نے کی تھی، وہ اُس کی تصویروں میں اُس کی

فیمیلی کی تصویروں کی تلاش تھی اور اُسے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے اکاؤنٹ میں اس کی فیمیلی کی بہت ساری تصاویر تھیں... سالار سکندر کی... حجاب میں ملبوس امامہ کی... اُس کی ٹین ایجر بہن عنایہ کی... حمین کی... اور ریسہ کی... جبریل کے انکلز اور کزنز کی جو اُن کی فیمیلی کے برعکس بے حد ماڈرن نظر آ رہے تھے لیکن اُن سب میں عجیب ہم آہنگی نظر آ رہی تھی۔

وہ جبریل سکندر سے دوستی کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ہمت نہیں کر پائی تھی... لیکن وہ اور اُس کی فیمیلی ایک دم جیسے اُس کے لئے ایک آئیڈیل فیمیلی کی شکل اختیار کر گئے تھے... ایسی فیمیلی جس کا وہ حصہ بننا چاہتی تھی... وہ اُس فیمیلی کا حصہ نہیں بن سکی تھی لیکن عائشہ عابدین کو احسن سعد اور اُس کی فیمیلی سے پہلی بار متعارف ہو کر بھی ایسا ہی لگا تھا کہ وہ جبریل سکندر جیسا خاندان تھا... اور احسن سعد جبریل سکندر جیسا مرد... قابل، باعمل مسلمان، حافظِ قرآن...

عائشہ عابدین نے جبریل سکندر کے دھوکے میں احسن سعد کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کتاب کا پہلا باب اگلے نوابوں سے مختلف تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی بھی شخص یہ

فرق محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ پہلا باب اور اگلے نوابواب ایک شخص کے لکھے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ ایک شخص نے لکھے تھے بھی نہیں۔

وہ جانتی تھی وہ اُس کی زندگی کی پہلی بددیانتی تھی، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ وہی آخری بھی ہوگی۔ اس کتاب کا پہلا باب اس کے علاوہ اب اور کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اُس نے پہلا باب بدل دیا تھا۔

نم آنکھوں کے ساتھ اُس نے پرنٹ کمانڈ دی۔ پرنٹر برق رفتاری سے وہ پچاس صفحے نکالنے لگا جو اس کتاب کا ترمیم شدہ پہلا باب تھا۔

اُس نے ٹیبیل پر پڑی ڈسک اٹھائی اور بے حد تھکے ہوئے انداز میں اُس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اُس نے اسے دو ٹکڑوں میں توڑ ڈالا... پھر چند اور ٹکڑے... اپنی ہتھیلی پر پڑے ان ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اُس نے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ڈسک کا کور اٹھا کر اُس نے زیر لب اس پر لکھے چند لفظوں کو پڑھا، پھر چند لمحے پہلے لیپ ٹاپ سے نکالی ہوئی ڈسک اُس نے اس کور میں ڈال دی۔

پرنٹر تب تک اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اُس نے ٹرے میں سے ان صفحات کو نکال دیا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے انہیں ایک فائل کور میں رکھ کر انہیں دوسری فائل کورز کے ساتھ رکھ دیا جن میں اس کتاب کے باقی نوابواب تھے۔

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہو کر اس نے ایک آخری نظر اُس لیپ ٹاپ کی مدھم پڑتی سکرین پر ڈالی۔

سکرین تاریک ہونے سے پہلے اس پر ایک تحریر ابھری تھی "Will be waiting"

اُس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی یک دم چھلک پڑی تھی۔ وہ مسکرا دی سکرین اب تاریک ہونے لگی۔ اُس نے پلٹ کر ایک نظر کمرے کو دیکھا پھر بیڈ کی طرف چلی آئی۔ ایک عجیب سی تھکن اُس کے وجود پر چھانے لگی تھی۔ اس کے وجود پر یاہر چیز پر... بیڈ پر بیٹھ کر چند لمحے اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں پر نظر دوڑائی۔

وہ پتہ نہیں کب وہاں اپنی رسٹ وینچ چھوڑ گیا تھا.. شاید رات کو جب وہ وہاں تھا، وہ وضو کرنے گیا تھا۔ پھر شاید اُسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ رسٹ وینچ اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔ سیکنڈز کی سوئی کبھی نہیں رکتی، صرف منٹ اور گھنٹے ہیں جوڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سفر ختم ہوتا ہے... سفر شروع ہو جاتا ہے۔

بہت دیر تک اس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی وہ جیسے اس کے لمس کو کھوجتی رہی۔ وہ لمس وہاں نہیں تھا۔ وہ اس کے گھر کی واحد گھڑی تھی جس کا ٹائم بالکل ٹھیک ہوتا تھا۔ صرف منٹ نہیں... سیکنڈز تک... کالمیت اس گھڑی میں نہیں تھی، اس شخص کے وجود میں تھی جس کے ہاتھ پر وہ ہوتی تھی۔

اُس نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اس گھڑی کو دوبارہ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کبل اپنے اوپر کھینچتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اُس نے لائٹ بند نہیں کی تھی۔ اُس نے دروازہ بھی مقفل نہیں کیا تھا۔ وہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ بعض دفعہ انتظار بہت ”لمبا“ ہوتا ہے... بعض دفعہ انتظار بہت مختصر ہوتا ہے۔

اُس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ وہ اسے نیند سمجھ رہی تھی... ہمیشہ کی طرح آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اُسے چاروں طرف پھونک رہی تھی۔ جب اُسے وہ یاد آیا۔ وہ اس وقت وہاں ہوتا تو اُس سے آیت الکرسی اپنے اوپر پھونکنے کی فرمائش کرتا۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑے ایک فوٹو فریم کو اٹھا کر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اُس پر پھونک ماری۔ پھر فریم کے شیشے پر جیسے کسی نظر نہ آنے والی گرد کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا، چند لمحے تک وہ فریم میں اس ایک چہرے کو دیکھتی رہی پھر اُس نے اس کو

دوبارہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ سب کچھ جیسے ایک بار پھر سے یاد آنے لگا تھا۔ اُس کا وجود ایک بار پھر سے ریت بننے لگا تھا۔ آنکھوں میں ایک بار پھر سے نمی آنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج ”اُسے“ بہت دیر ہو گئی تھی۔ امامہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ سالار اُس کے برابر میں سو رہا تھا۔ اُس نے وال کلاک پر نظر ڈالی، رات کا آخری پہر تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی... عجیب خواب تھا... وہ کس کا انتظار کر رہی تھی اُسے خواب میں بھی سمجھ نہیں آیا تھا... کتاب کے وہ دس ابواب سالار کے تھے... وہ کتاب سالار ہی لکھ رہا تھا اور ابھی تک اُس کے نو ابواب لکھے جا چکے تھے... دسواں نہیں... وہ گھڑی بھی سالار کی تھی اور سالار نے حمین کی پچھلی برتھ ڈے پر اُس کی ضد اور اصرار پر اُسے دی تھی اور اب وہ گھڑی حمین باندھتا تھا... اور اُس نے خواب میں اپنے آپ کو بوڑھا دیکھا تھا... وہ اُس کا مستقبل تھا... وہ کسی کو یاد کر رہی تھی کسی کے لئے اداس تھی، مگر کس کے لئے... اور وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی اور کوئی نہیں آرہا تھا... مگر کون... اور پھر وہ تحریر... Will be waiting... وہ خواب کی ایک ایک detail کو دہرا رہی تھی... ایک ایک جزئیات کو دہرا سکتی تھی۔ وہ بستر سے اُٹھ گئی، بے حد بے چینی کے عالم میں... اُن کی پیکنگ مکمل ہو چکی تھی۔ وہ

اس گھر میں اُن کی آخری رات تھی اُس کے بعد وہ اُن سب کے ساتھ پاکستان جانے والی تھی اور سالار اور جبریل کو وہیں رہ جانا تھا۔

ایک بار پھر سے اُس کا گھر ختم ہو جانا تھا... یہ جیسے اُس کی زندگی کا ایک پیٹرن ہی بن گیا تھا... گھر بننا... گھر ختم ہونا... پھر بننا... پھر ختم ہونا... ایک عجیب ہجرت تھی جو ختم ہی نہیں ہوتی تھی اور اس ہجرت میں اپنے گھر کی وہ خواہش اور خواب پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا... وہ اُس رات اس طرح خواب سے جاگنے کے بعد بھی بہت اُداس تھی۔

پہلے وہ سالار کی بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے اُس کے بغیر اپنے آپ کو رہنے کی عادی کر پائی تھی اور اب پاکستان چلے جانے کے بعد اُسے جبریل کے بغیر بھی رہنا تھا۔

وہ چلتے ہوئے کمرے میں موجود صوفہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کے سر میں درد ہونے لگا تھا... اور صوفہ پر بیٹھتے ہوئے اُسے ایک بار پھر اُس خواب کا خیال آنے لگا تھا... اُس خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ بُری طرح ٹھٹھکی... کتاب کے دس ابواب... اُس کی اُداسی... اُس کا بڑھا پاپا... کسی کو یاد کرنا۔

اُسے یاد آیا تھا اُس کتاب کا ہر باب سالار کی زندگی کے پانچ سالوں پر مشتمل تھا... ڈاکٹرز نے سالار کو سات سے دس سال کی زندگی کی مہلت دی تھی اور کتاب کا دسواں باب

50 سال کے بعد ختم ہو رہا تھا۔

پریزیڈنٹ نے کافی کا خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ پچھلے پانچ گھنٹے میں یہ کافی کا آٹھواں کپ تھا جو اس نے پیا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی اتنی کافی نہیں پی تھی، مگر زندگی میں کبھی اُسے اس طرح کا فیصلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ آگے گڑھا اور پیچھے کھائی والی صورت حال سے دوچار تھا اور اپنے عہدِ صدارت کے ایک بہت غلط وقت پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔

کانگریس کے الیکشنز سر پر تھے اور یہ فیصلہ ان الیکشنز کے نتائج پر بری طرح اثر انداز ہوتا۔ بری طرح کا لفظ شاید ناکافی تھا، اس کی پارٹی دراصل الیکشن ہار جاتی لیکن اس فیصلہ کو نہ کرنے کے اثرات زیادہ مضر تھے۔ وہ اسے جتنا ٹال سکتا تھا، ٹال چکا تھا، جتنا کھینچ سکتا تھا، کھینچ چکا تھا۔ اب اُس کے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ کچھ

lobbies کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ کچھ power

players بے لفظوں میں اپنی ناراضگی اور شدید ردِ عمل سے اُسے خبردار کر رہے

تھے۔ فارن آفس اُسے مسلسل متعلقہ ممالک سے امریکی سفارت خانوں کی تقریباً

روزانہ کی بنیاد پر آنے والی queries اور concerns کے بارے میں آگاہ

کر رہا تھا اور خود وہ دو ہفتے کے دوران مستقل ہاٹ لائن پر رہا تھا۔

امریکہ کی بین الاقوامی پسپائی ایک الیکشن ہارنے سے زیادہ سنگین تھی مگر اس کے پاس

آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے، اپنی کیبنٹ کے چھ اہم ترین ممبرز کے ساتھ پانچ

گھنٹوں کی طویل گفت و شنید کے بعد وہ جیسے تھک کر پندرہ منٹ کی ایک بریک لینے پر

مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس وقت وہ اس بریک کے آخری چند کچھ منٹ گزار رہا تھا۔

ٹیبل سے کچھ پیپر اٹھا کر وہ دوبارہ دیکھنے لگا تھا، وہ کیبنٹ آفس میں ہونے والی پانچ گھنٹے

کی طویل میٹنگ کے اہم نکات تھے۔ اُس کی کیبنٹ کے وہ چھ ممبرز دو برابر گروپس

میں بٹے ہوئے دو مختلف لابیوں کے ساتھ تھے۔ وہ ٹائی اس کے کاسٹنگ ووٹ سے ٹوٹنے

والی تھی اور یہی چیز اسے اتنا بے بس کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی ذمہ داری ہر حال میں

اسی کے سر پر آرہی تھی۔ یہ اس کے عہدِ صدارت میں ہوتا اور اُس کے کاسٹنگ ووٹ

سے ہوتا۔ اگر ہوتا تو... اور اس ذمہ داری کو وہ لاکھ کوشش کے باوجود کہیں اور منتقل

نہیں کر پارہا تھا۔

اُس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کو ایک نظر پھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ بُلٹ پوائنٹس اس

وقت حقیقتاً سے بُلٹس کی طرح لگ رہے تھے۔

بریک کے آخری دو منٹ باقی تھے جب وہ ایک فیصلہ پر پہنچ گیا تھا۔ بعض دفعہ تاریخ بنانے والے کے ہاتھوں کو خود جکڑ کر خود کو بنواتی ہے۔ اور تاریخ 17 جنوری 2030 کو بھی یہی کر رہی تھی۔

ہشام نے پہلی بار اُس لڑکی کو سوڈان میں دیکھا تھا UNHCR... کے ایک کیمپ پر کسی پناہ گزین گونگی عورت کے ساتھ اشاروں میں بات کرتے اور اُسے کچھ سمجھاتے۔ وہ پاکستانی یا انڈین تھی... ہشام نے اُس کے نقوش اور رنگت سے اندازہ لگایا تھا، اور پھر اُس کے گلے میں لٹکے کارڈ پر اُس کا نام پڑھ کر اُسے اُس کا نام پتہ چل گیا تھا۔

بے حد معمولی شکل و صورت کی ایک بے حد دبلی پتلی گھنے بالوں والی ایک سانولی رنگت کی ایک دراز قامت لڑکی... اُس کا پانچ فٹ سات انچ قد اُس کی واحد خاصیت لگی تھی اُس پہلی ملاقات میں ہشام کو۔

وہ ایک عورت سے بات کرتے کرتے ہشام کی طرف متوجہ ہوئی، ایک-co worker کے طور پر اُسے مسکراہٹ دی اور ہاتھوں کے اشارے سے ہیلو اور حال

چال پوچھا، اُس لڑکی نے بھی ہاتھوں کے اشارے سے اُس کو جواب دیا۔ دونوں نے بیک وقت اپنے گلے میں لٹکے کارڈز پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے اور اُس پر انگلی پھیرتے ہوئے جیسے خود کو متعارف کیا۔ وہ CARE کی ورکر تھی، وہ ریڈ کر اس کا اور وہ دونوں USA سے آئے تھے۔ رسمی تعارف اور وہاں کے حالات کے بارے میں اشاروں میں ہی بات کرنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔

اُن کی دوسری ملاقات دوسرے دن ہوئی تھی۔ لکڑی کے عارضی ہاتھ رومز کی تنصیب و تعمیر والی جگہ پر... وہ آج بھی اُس سے پہلے وہاں موجود تھی اور کچھ تصویریں لے رہی تھی۔ وہ کچھ سامان لے کر وہاں آیا تھا ایک لوڈر گاڑی میں لٹکے... دونوں نے ایک بار پھر اشاروں کی زبان پر رسمی علیک سلیک کی۔

تیسری ملاقات لمبی تھی، وہ ایڈور کرز کے ایک ڈنر میں ملے تھے... ڈنر ہال کے باہر کوریڈور میں... دونوں دس منٹ اشاروں کی زبان میں بات کرتے رہے... وہ پاکستان سے تھی، وہ بحرین سے... وہ نیویارک یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا، وہ سٹی یونیورسٹی نیویارک میں... وہ فنانس کا سٹوڈنٹ تھا، وہ سوشل سائنسز کی... اور ان دونوں کے درمیان کامن چیز صرف ایک تھی... ریلیف ورک، جس میں وہ دونوں اپنی ٹین اتیج سے انوالوڈ

تھے... اُن دونوں کا Academic C.V اتنا لمبا نہیں تھا جتنا اُن کا-Extra
 Curricular... کوریڈور میں کھڑے اُن دس منٹوں میں اُن دونوں نے ایک
 دوسرے کے بارے میں ہی پوچھا اور جانا تھا... اشاروں کی زبان میں سوالات بہت
 تفصیلی ہو گئے تھے لیکن ہشام کا دل چاہا تھا وہ اُس سے اور بھی سوال کرتا... وہ قوت
 گویائی رکھتی تو وہ کر ہی لیتا... اُس کے ساتھ کھڑے اُس نے سوچا تھا... وہ اُسے اُس شام
 اتنی ہی دل چسپ لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ہمیشہ کی طرح مل کر آگے بڑھ
 جاتے... اُس کوریڈور سے بہت سارے گزرنے والے ایڈور کرز میں سے ایک جو اُن
 دونوں کو جانتا تھا اُس نے اُنہیں بلند آواز میں دور سے مخاطب کرتے ہوئے ہیلو کہا اور
 ساتھ حال احوال دریافت کیا۔ وہ دونوں بیک وقت اُس کی طرف مخاطب ہوئے
 انہوں نے بیک وقت اُس کی ہیلو کا جواب دیتے ہوئے جواباً اُس کی خیریت دریافت کی
 اور پھر دونوں نے بیک وقت کرنٹ کھا کر ایک دوسرے کو دیکھا stunned ...
 silence میں... اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے... اور رہنستے ہی گئے تھے...
 سُرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ... اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے اُن کے پاس
 اس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا اُس وقت...

اُن دونوں کا پہلا تعارف ”خاموشی“ نے کروایا تھا اور وہ خاموشی ہمیشہ اُن کے ہر جذبے کی آواز بنی رہی... وہ جیسے اُن کا سب سے دل چسپ کھیل تھا... جب ایک دوسرے سے کچھ بھی خاص کہنا ہوتا تو Sign Language میں بات کرنے لگتے... ہنستے کھلکھلاتے، بوجھتے، بھٹکتے، سنبھلتے، سمجھتے... کیا کھیل تھا!!!...

وہ اُس وقت یونیورسٹی میں ابھی گئے ہی تھے... ہشام کو حیرت تھی اُن کی ملاقات اس سے پہلے کیوں نہیں ہوئی۔ وہ دونوں ایک جیسی relief agencies کے ساتھ کام کر رہے تھے، لیکن اس سے پہلے وہ صرف امریکہ کے اندر ہی طوفانوں اور سیلابوں کے دوران ہونے والے ریلیف ورک سے منسلک رہے تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں امریکہ سے باہر ہونے والے کسی ریلیف کیمپ میں حصہ لینے کے لئے گئے تھے۔

نیویارک واپسی کے بعد بھی اُن دونوں کا رابطہ آپس میں ختم نہیں ہوا تھا... دو مختلف یونیورسٹیز میں ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے وقتاً فوقتاً مختلف سوشل ایونٹس میں ملتے رہتے تھے کیوں کہ دونوں مسلمان طلبہ کی تنظیم سے بھی وابستہ تھے... اور پھر یہ رابطہ وقتاً فوقتاً ان سوشل ایونٹس سے ہٹ کر بھی ہونے لگا... وہ دونوں ایک

دوسرے کی فیملی سے بھی مل چکے تھے اور اب بہت باقاعدگی سے ملنے لگے تھے۔
دونوں کے والد ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے...

ہشام امریکہ میں بحرین کے سفیر کا بیٹا تھا، اور بحرین کے سفارت خانے میں ہونے والی
اکثر گیدرنگز میں اُسے بھی انوائٹ کیا جاتا تھا۔ اُس کی ماں ایک فلسطینی نژاد ڈاکٹر تھی
اور اس کا باپ امریکہ کے علاوہ بہت سے یورپین ممالک میں بحرین کی نمائندگی کر چکا
تھا۔ دو بہن بھائیوں میں وہ بڑا تھا اور اُس کی بہن ابھی ہائی سکول میں تھی۔

ریلیف ورک میں دل چسپی ہشام کو اپنی ماں سے وراثت میں ملی تھی جو ہشام کے باپ
سے شادی سے پہلے ریڈ کر اس کے ساتھ منسلک تھی اور فلسطین میں ہونے والے
ریلیف کیمپس میں اکثر اُن امدادی ٹیموں کے ساتھ جاتی تھی جو امریکہ سے جاتی تھیں،
شادی کے بعد اُس کا وہ کام صرف فنڈز اکٹھے کرنے اور donations تک محدود
رہ گیا تھا۔ مگر ہشام نے اپنی ماں فاطمہ سے یہ شوق وراثت میں لیا تھا۔ اور وقت گزرنے
کے ساتھ ساتھ وہ شوق بڑھتا ہی گیا تھا۔

اُس لڑکی سے ملنے کے بعد اُسے اپنا شوق اور جنوں بہت کم اور کمتر لگا تھا۔ وہ اُس کم عمری
میں جن ریلیف پروجیکٹس کے ساتھ منسلک رہی تھی، بہت کم ایسا ہوا تھا کہ ریلیف

آپریشن کے بعد بہترین خدمات کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں میں اُس کا نام نہ ہوتا۔ اُس سے میل جول کے آغاز ہونے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ اُن کے درمیان انسانیت کی خدمت کا جذبہ ایک واحد کامن چیز نہیں تھی، اور بھی بہت سی دلچسپیاں مشترکہ تھیں اور صرف دلچسپیاں اور مشاغل ہی نہیں... خصوصیات بھی... دونوں کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے اور بہت زیادہ... دونوں کوتاہ مخ میں دل چسپی تھی... دونوں پھرنے پھرانے کے شوقین تھے اور دونوں بہت زیادہ باتونی نہیں تھے... سوچ سمجھ کر بات کرنے کے عادی تھے۔

ہشام کی پوری زندگی لڑکیوں کے ساتھ مخلوط تعلیمی ماحول اور معاشرے میں گزری تھی... نہ اُس کے لئے لڑکیاں نئی چیز تھیں، نہ اُن سے دوستی... لیکن زندگی میں پہلی بار وہ کسی لڑکی سے متاثر ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اُس کا کبھی کوئی آئیڈیل نہیں رہا تھا لیکن اُسے لڑکیوں میں جو چیزیں اٹریکٹ کرتی تھیں، اُن میں سے کوئی بھی چیز اُس لڑکی میں نہیں تھی... نہ وہ حسین تھی... نہ سٹائلش، نہ ایسی ذہین کہ اگلے کو چاروں شانے چت کر دے لیکن اس کے باوجود وہ اُسے کسی مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی... نظر کا ایک جدید انداز کا چشمہ لگائے وہ سادہ سی جینز اور کُرتیوں میں اکثر

flip flops میں بہت سی stilleto heels والی لڑکیوں کے سامنے ہشام

کو زیادہ پرکشش محسوس ہوتی تھی... خود میں مگن، دوسروں سے بے نیاز... کالرڈ

کرتیوں اور شرٹس میں سر کے بال جوڑے کی شکل میں باندھے اپنی لمبی نیلی گردن کو

کسی راج ہنس کی طرح لہراتی وہ ہمیشہ اُسے فون یا ٹیبلیٹ ہاتھ میں پکڑے اپنے حال میں

مگن ملتی تھی، اُن بہت سی دوسری لڑکیوں کے برعکس جو اُسے دیکھتے ہی بے حد

attentive ہو جاتی تھیں۔ ہشام عرب تھا، عورت کی اداؤں سے بخوبی واقف

ہونے کے باوجود اداؤں ہی سے گھائل ہونے والا، لیکن اُس لڑکی کے پاس کوئی ادا

سرے سے تھی ہی نہیں اس کے باوجود وہ گھائل ہو رہا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE.COM
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”میرے معاشرے میں اگر مرد کسی عورت کے ساتھ کہیں جائے تو کھانے کا بل وہ

دیتا ہے، عورت نہیں۔“ ہشام نے پہلی بار اُسے کہیں کھانے کی دعوت دی تھی اور بل

کی ادائیگی کے وقت اُسے پرس نکالتے دیکھ کر اُس نے بڑی سنجیدگی سے روکتے ہوئے

کہا تھا۔ وہ جو اب مسکراتے ہوئے پرس سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے اُس سے بولی ”اور

میرے باپ نے مجھے کہا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کے علاوہ کسی مرد کے ساتھ بھی کھانا

کھاتے ہوئے اپنا بل خود دینا، یہ تمہیں ہر خوش فہمی اور اُسے ہر غلط فہمی سے دور رکھے

گا... اس لئے یہ میرے حصہ کا بل... ”اُس نے نوٹ میز پر رکھتے ہوئے ہشام سے کہا تھا۔ مسکرائی وہ اب بھی تھی، ہشام چند لمحوں کے لئے لاجواب ہوا تھا... وہ بڑا مہنگا ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ اُسے لایا تھا اور وہ جب بھی کسی لڑکی کو وہاں لا کر بل خود ادا کیا کرتا تھا، اُسے اُس لڑکی کی طرف سے بے حد ناز بھرا اور مصنوعی حیرت اور اور گرم جوشی سے بھرپور شکریہ موصول ہوتا تھا۔ آج کچھ خلاف توقع چیز ہو گئی تھی۔

”ریسٹورنٹ مہنگا تھا میں اس لئے کہہ رہا تھا۔“ وہ جملہ اگلے کئی ہفتے ہشام کو اکیلے میں بھی دانت پینے پر مجبور کرتا رہا تھا... شرم ساری میں اُس نے زندگی بھر کبھی کسی عورت کو ایسی توجیہ نہیں دی تھی۔

”شکریہ لیکن میں بہت امیر ہوں۔“ اُس لڑکی نے جواباً مسکراتے ہوئے اُس سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے تم میرا بل بھی دے سکتی ہو۔“ وہ پتہ نہیں کیوں کہنے لگا تھا۔ ”بل نہیں دے سکتی لیکن بل دینے کے لئے اُدھار دے سکتی ہوں۔“ اُس نے جواباً اُس سے کہا۔

So very kind of you... ”پھر دے دو...“ ہشام نے اُسی روانی سے کہا۔

وہ پہلی بار اُلجھی، اُسے دیکھا پھر اُس نے اپنے پرس سے بل کی بقایا رقم نکال کر اُس کی

طرف بڑھائی، ہشام نے وہ رقم پکڑ کر بل پر رکھتے ہوئے فولڈر بند کرتے ہوئے ویٹر کی طرف بڑھا دیا۔

اُس لڑکی نے اتنی دیر میں اپنا بیگ کھول لیا۔ وہ اُس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی، چند لمحے گود میں رکھے بیگ میں ہاتھ مارتے رہنے کے بعد اُس نے بالآخر ایک چھوٹی ڈائری نکالی اور پھر اُس کے بعد پین... میز پر ڈائری رکھ کر اُس نے اُس ڈائری میں اُس رقم کا اندراج کیا جو اُس نے کچھ دیر پہلے ہشام کو اُدھار دی تھی۔ پھر اُس نے پین اور ڈائری دونوں ٹیبل کے اوپر سے ہشام کی طرف بڑھائے۔ اُس نے کچھ حیران ہو کر دونوں چیزیں پکڑیں اور پھر اُس سے کہا ”یہ کیا ہے؟“ لیکن سوال کے ساتھ ہی اُسے پہلی نظر ڈائری پر ڈالتے ہی جواب مل گیا تھا... وہ اُس کے signatures اُس رقم کے سامنے چاہتی تھی جہاں اُس نے اُدھار دی جانے والی رقم لکھی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے اُس کی شکل دیکھ کر رہ گیا، وہ اب اپنے گلاسز اتار کر انہیں صاف کرتے ہوئے دوبارہ لگا رہی تھی۔ معمول کی طرح خود میں محو اور اُسے نظر انداز کئے یوں جیسے یہ سب ایک روٹین کی بات تھی۔ ہشام نے پین سنبھال کر دستخط کرنے سے پہلے ڈائری کے صفحے پلٹ کر بڑے تجسس سے لیکن محظوظ ہونے والے انداز میں دیکھا... وہاں

چھوٹی بڑی رقموں کی ایک قطار تھی اور لینے والا صرف ایک ہی شخص تھا جس کا نام نہیں تھا صرف دستخط تھے، مختلف تاریخوں کے ساتھ لیکن کہیں بھی ادائیگی والے حصے میں کسی ایک رقم کی بھی ادائیگی نہیں کی گئی تھی۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا تم اتنی calculated ہو... ہر چیز کا حساب رکھتی ہو؟“
ڈائری پر دستخط کرتے ہوئے ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

”اگر میں لکھوں گی نہیں تو بھول جاؤں گی اور معاملات میں تو clarity ضروری ہوتی ہے۔“ اُس لڑکی نے جواباً طمینان کے ساتھ کہا، وہ اب اُس سے ڈائری اور پین لے کر واپس اپنے بیگ میں رکھ چکی تھی۔

”ڈائری سے تو لگتا ہے تم واقعی بہت امیر ہو... اتنی دریا دلی سے کس کو قرض دے رہی ہو؟“ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے ہشام نے اُس کو کُریدا، وہ بات گول کر گئی۔ اُن کے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اُسے زیادہ کُریدا مگر اُس ڈائری میں کتنے ہوئے اُس آدمی کے دستخط اُسے یاد رہ گئے تھے۔ وہ اُن دستخط سے اتنا تواندازہ لگا ہی چکا تھا کہ وہ کسی مرد کے دستخط تھے۔

ایک ہفتے بعد اُس نے اُس لڑکی کو وہ قرض واپس کرتے ہوئے اُس کی ڈائری میں ادائیگی

کے حصے میں اپنے دستخط paid کی تحریر کے ساتھ کرتے ہوئے ایک بار پھر سے ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی... وہ ڈائری اُس سال کی تھی، اور سال کے شروع سے اُس مہینے تک کسی صفحے پر کوئی ادائیگی نہیں تھی، لیکن اُدھار لینے کی رفتار میں تسلسل تھا... چھوٹی بڑی رقمیں، لیکن لاتعداد بار۔

”اس سال تمہیں کوئی اُدھار واپس کرنے والا میں پہلا شخص ہوں۔“ ہشام نے جیسے بڑے فخریہ انداز میں کہا، اُس نے مسکرا کر اُس سے ڈائری اور نوٹ دوبارہ واپس لئے، نوٹوں کو ہشام کے سامنے گنا، اپنے پرس سے چند چھوٹے نوٹ نکال کر ہشام کو واپس کیے کیوں کہ اُس نے راونڈ فلر میں رقم واپس کی تھی۔

”چھوڑو اسے رہنے دو۔“ ہشام نے نوٹ واپس دینے کی کوشش کی۔ ”اتنی بڑی رقم نہیں ہے یہ۔“ اُس نے جیسے لاپرواہی سے کہا ”کافی کا ایک کپ اور ایک ڈونٹ آسکتا ہے، ایک ویفل آئس کریم آسکتی ہے یا ایک برگر۔“ اُس نے بڑے اطمینان سے جواباً کہا تھا، وہ ہنسا ”تم واقعی ضرورت سے زیادہ حساب کتاب کرتی ہو“ ”میری ماں کہتی ہے روپیہ مشکل سے کمایا جاتا ہے اور اُس کی قدر کرتے ہوئے اُسے خرچ کرنا چاہیے“ اُس نے جیسے ایک بار پھر ہشام کو لاجواب کیا تھا، ذرا سی شرمندگی دکھائے بغیر۔

”اس طرح تو تم واقعی بہت امیر ہو جاؤ گی۔“ ہشام نے اُسے tease کیا ”انشا اللہ“

اُس نے جواباً تِنے اطمینان سے کہا کہ ہشام کو ہنسی آگئی تھی۔ ہنسنے کے بعد ہشام کو

احساس ہوا شاید یہ مناسب نہیں تھا کیوں کہ وہ اُسی طرح سنجیدہ تھی۔

”تمہیں بُرا تو نہیں لگا؟“ اُس نے کچھ سنبھلتے ہوئے اُس سے پوچھا ”کیا؟“ ”میرا

ہنسنا...“ ”نہیں... مجھے کیوں بُرا لگے گا... تم کیا مجھ پر ہنسنے تھے؟“ ہشام نے سر کھجایا،

لڑکی سیدھی تھی، سوال ٹیڑھا تھا۔

”یہ جس کو اتنے اُدھار دیتی رہی ہو، یہ کون ہے؟“ اُس نے بھی اُس سے ایک ٹیڑھا

سوال کیا تھا۔
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Inter

”ہے کوئی“ وہ ایک بار پھر نام گول کر گئی ”تم نام بتانا نہیں چاہتی؟“ وہ کہے بغیر نہیں

رہ سکا ”نہیں“ وہ چند لمحوں کے لئے چُپ رہا پھر اُس نے کہا ”بہت زیادہ قرضہ نہیں

ہو گیا اس کے سر؟“ اس کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی ”میں اُسے انکار نہیں

کر سکتی...“ ہشام عجیب طرح سے بے چین ہوا۔ ”پیسے کے معاملے میں کسی پر اعتبار

نہیں کرنا چاہیے۔“ شاید زندگی میں پہلی بار اُس نے کسی کو ایسا مشورہ دیا تھا۔ ”پیسے کے

بارے میں نہیں، میں ویسے ہی اعتبار کرتی ہوں اُس پر۔“ اُس نے بڑے آرام سے کہا

تھا۔ ہشام کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اُس سے کیا کہے؟ وہ اُن کی دوستی کا آغاز تھا اور وہ ایک دوسرے کی ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے، اُن کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔

اُس شخص کا تعارف بھی ہشام سے بہت جلد ہی ہو گیا تھا۔

تالیوں کی گونج نے جمین سکندر کی تقریر کے تسلسل کو ایک بار پھر توڑا تھا، روسٹرم کے پیچھے کھڑے چند لمحوں کے لئے رُک کر اُس نے تالیوں کے اس شور کے تھمنے کا انتظار کیا۔

وہ MIT کے graduating students کا اجتماع تھا، اور وہ وہاں commencement speaker کے طور پر بلایا گیا تھا۔ پچھلے سال وہ MIT کے graduating students میں شامل تھا۔ Saloon School Of Management سے ڈسٹنکشن کے ساتھ نکلنے والوں میں سے ایک اور اس سال وہ یہاں graduating students سے خطاب کر رہا تھا۔ MIT وہ واحد یونیورسٹی نہیں تھی جس نے اُسے اس سال اس اعزاز کے قابل

سمجھا تھا۔ Ivy League کی چند اور نامور یونیورسٹیز نے بھی اُسے مدعو کیا تھا۔

24 سال کی عمر میں حمین سکندر پچھلے تین سالوں کے دوران دُنیا کے بہترین entrepreneurs میں سے ایک مانا جا رہا تھا، اُس ایک آئیڈیا کی وجہ سے جو پچھلے کچھ سالوں میں ایک بیج سے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

Trade an Idea کے نام سے اُس کی ڈیجیٹل فنانس کمپنی نے پچھلے تین سالوں میں گلوبل مارکیٹس میں دھوم مچا رکھی تھی۔ دُنیا کے 125 بہترین مالیاتی اور کاروباری ادارے اُس کمپنی کے باقاعدہ کلائنٹس تھے اور ڈیڑھ ہزار چھوٹے ادارے بالواسطہ اُس کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

اور یہ سب تین سال کی مختصر مدت میں ہوا تھا، جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کمپنی کی بنیاد رکھنے میں بھی مصروف تھا۔

Trade an Idea کا concept بے حد دل چسپ اور منفرد تھا اور ایک

عام user کو وہ ابتدائی طور پر کسی digital game جیسا لگتا۔

اُس کی ابتداء بھی حمین سکندر نے بے حد چھوٹے پیمانے پر کی تھی۔ ایک ویب سائٹ پر

اُس نے دنیا کی سو بہترین یونیورسٹیز کے سٹوڈنٹس کو ایک آن لائن چیلنج دیا تھا... ایسا کوئی آئیڈیا trade کرنے کے لئے جس کے لئے انہیں یا تو فنانس چاہیے تھا یا کسی کمپنی کی سپورٹ اور یا پھر وہ اپنا idea کسی خاص قیمت پر trade کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن trading اور traders دونوں بے حد مختلف تھے۔

اُس ویب سائٹ پر تین کورسز تھے... اے کیٹگری، بی اور سی کیٹگری... ہر کورس میں بیس سوالات تھے اور ویب سائٹ پر رجسٹریشن کے لئے ایک پاس ورڈ ضروری تھا جو اس کورس میں کامیاب ہونے کے بعد بھیجا جاتا ہے اور وہی نمبر اُس trader کی ID تھی۔

کیٹگری A کا کورس مشکل ترین تھا اور ناک آؤٹ کے انداز میں timed تھا۔ کیٹگری B اور C اُس سے آسان تھے اور نہ timed تھے اور نہ ہی ان میں ناک آؤٹ ہوتا تھا۔ یہ ان تین کیٹگریز کی درجہ بندی تھی جو وہاں آنے والے traders کی پرفارمنس پر automatically انہیں مختلف کیٹگریز میں رکھتی تھی۔ جو A کیٹگری میں آگے نہ جا پاتا وہ B کے کورسز میں حصہ لیتا اور جو B میں بھی آگے نہ جا پاتا وہ C میں اور جو C میں بھی آگے نہ جا پاتا تو اُسے

Trade an Idea کی طرف سے kick out کر دیا جاتا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ ابھی اُسے اور سیکھنے کی ضرورت ہے... ٹریڈنگ اُس کا کام نہیں۔ اے کیٹگری کے کونز میں کامیاب ہو جانے والے غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے حامل افراد ایک پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے اور پھر اگلے مرحلے تک رسائی کرتے...

ایک ایسے ٹریڈ سینٹر میں جہاں بہترین یونیورسٹیز کے بہترین دماغ اپنے اپنے ideas کو رجسٹر کروانے کے بعد آن لائن موجود ٹریڈرز کے ساتھ اپنے ideas کے حوالے سے بات چیت کرتے... وہ گروپ ڈسکشن بھی ہو سکتی تھی اور وہ ٹریڈرز کی آپس میں گفت و شنید بھی... پہلے مرحلے پر حمین صرف پانچ بڑی کمپنیز کو اس بات پر آمادہ کر پایا تھا کہ وہ اس ٹریڈ روم میں idea لے کر آنے والوں کے

ideas سنیں اور اُس پر اُن سے بات چیت کریں، اگر انہیں کسی کا idea پسند آجائے تو... اس کے عوض انہیں TAI کو ایک مخصوص فیس ادا کرنی تھی، اگر وہاں کوئی idea انہیں پسند آجاتا اور وہ اُسے خریدنے، اُس میں invest کرنے یا اُس میں پارٹنرشپ کرنے پر تیار ہوتے تو۔

کیٹگری بی میں پیش ہونے والے آئیڈیاز کی trading بھی اسی فارمولا کے تحت

ہوتی تھی، لیکن وہاں ایک اضافی چیز یہ تھی کہ وہاں اپنے ideas کے ساتھ آنے والے مختلف نوجوان افراد interactions کے ذریعہ اپنی پسند کے کسی ایک جیسے idea پر collaboration کر سکتے تھے اور اگر ایسی کوئی Trade an collaboration کسی آئیڈیا کو عملی شکل تک ڈھال دیتا تو Idea اس collaboration کے لئے بھی انہیں ایک فیس چارج کرتا۔

کیٹگری C اس سے بھی آسان تھی، وہاں trade کے لئے آنے والے traders اپنے ideas کو barter بھی کر سکتے تھے یعنی کسی بھی trader کو اگر دوسرے کا idea پسند آتا اور وہ اُسے cash سے خریدنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، تو پھر وہ اُس idea کے بدلے کچھ اور idea, skill, service یا پروجیکٹ اُسے پیش کر سکتا تھا۔

وہ بہت basic سا فارمولا تھا جو حمین نے صرف ذہانت کو encash کرنے کی بنیاد پر نکالا تھا اور اپلائی کیا تھا۔

پہلی بار اُس کی کلائنٹ بننے والی پانچ میں سے تین کمپنیز کو وہاں پہلے مہینے میں تین ایسے آئیڈیاز پسند آگئے تھے جن کے traders کو انہوں نے hire کر لیا تھا۔

تین سال پہلے کلائنٹس اور ٹریڈرز کی ایک محدود تعداد سے شروع ہونے والی کمپنی اب ان basic tradings سے بہت آگے بڑھ چکی تھی، وہ اب خود Trade an Idea پر آنے والے ٹریڈرز سے ایسے ideas اور بزنس پروپوزلز لیتی جس میں انہیں potential نظر آتا اور وہ اپنے بڑے کلائنٹس کی ضروریات اور دل چسپی کے مطابق مختلف ideas اور پروجیکٹس انہیں شیئر کر دیتی۔

Trade an Idea نے پچھلے تین سال میں تین سو ایسی نئی کمپنیز کی بنیاد رکھی تھی جن کے ideas اُن کے پلیٹ فارم پر آنے کے بعد مختلف بین الاقوامی کمپنیز نے اُن ideas میں investment کی تھی۔ Trade an Idea سے ملنے والے ideas پر تکمیل پانے والے پروجیکٹس کی کامیابی کا 90% ratio تھا۔

دُنیا کے سو بہترین اداروں کے بہترین سٹوڈنٹس کو ایک پلیٹ فارم پر لانے والا یہ ادارہ اب دُنیا کی ہزاروں یونیورسٹیز کے لاکھوں سٹوڈنٹس کو اپنے ideas گھر بیٹھے آن لائن نامور اور کامیاب ترین کمپنیز کے نمائندوں کے سامنے پیش کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم ایک نئے entrepreneur کے لئے ایک ڈریم پلیٹ

فارم تھا۔ Trade an Idea اب ان ہی کیٹگریز کے ساتھ ایک اور ایسی کیٹگری کا اضافہ کر چکا تھا جہاں کوئی بھی شخص اپنی خسارے میں جانے والی کمپنی، بزنس، سیٹ اپ پروجیکٹ بیچ سکتا تھا اور آن لائن ہی اُس کی evaluation بھی کروا سکتا تھا۔

حمین سکندر کا نام دُنیا کی کسی بھی بڑی مالیاتی کمپنی کے لئے اب نیا نہیں تھا۔ اُس کی کمپنی trade کے نئے اصول لے آئی تھی اور اُن نئے اصولوں پر کام کر رہی تھی۔ ”اکثر لوگوں کا خیال ہے میں رول ماڈل ہوں... ہو سکتا ہے میں بہت ساروں کے لئے ہوں... لیکن خود مجھے رول ماڈل کی تلاش کبھی نہیں رہی...“ نٹالیوں کا شور تھم جانے کے بعد اُس نے دوبارہ کہنا شروع کیا تھا ”رول ماڈل اور آئیڈیلز کتابوں میں زیادہ ملتے ہیں اور میرے ماں باپ کو ہمیشہ مجھ سے یہ شکایت رہی کہ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔“ وہاں بیٹھے ہوئے سٹوڈنٹس میں کھلکھلاہٹیں اُبھری تھیں اور اگلی ایک نشست پر بیٹھی امامہ بھی ہنس پڑی تھی۔

”میں نے اپنی زندگی میں دل چسپی سے صرف ایک کتاب پڑھی تھی وروہ میرے باپ کی آٹو بائیو گرافی تھی... وہ بھی بارہ سال کی عمر میں اپنی ماں کے لیپ ٹاپ میں۔“

سامنے والی نشستوں پر بیٹھی امامہ کارنگ فق ہو گیا، وہ ہنسنا یک دم بھول گئی تھی۔
 ”اور وہ واحد کتاب ہے جس کو میں نے بار بار پڑھا... وہ وہ واحد کتاب ہے جو میرے
 لیپ ٹاپ میں بھی ہے... میرے باپ کی آٹو بائیو گرافی کی بہترین بات یہ ہے کہ اُس
 میں کوئی ہیرو، کوئی آئیڈیل، کوئی رول ماڈل نہیں ہے، اور اُسے پڑھتے ہوئے مجھے
 ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ میرا باپ کتنا lucky ہے کہ اُسے کسی سے inspire
 ہو کر اُس جیسا نہیں بننا پڑا، زندگی گزارنے کے اُن کے اپنے اصول اور فارمولاز اُن کے
 بچپن اور جوانی کو dictate کرتے رہے۔“

وہ کہتا جا رہا تھا اور وہاں بیٹھی امامہ عجیب سے شاک اور شرمندگی میں بیٹھی تھی، وہ
 کتاب جسے وہ آج بھی publish کروانا نہیں چاہتی تھی، صرف اس لئے کیوں کہ
 وہ اپنی اولاد کو اُن کے باپ کے حوالے سے کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی
 تھی... وہ کتاب اُس کی تیسری اولاد بارہ سال کی عمر میں صرف ایک بار نہیں، بار بار
 پڑھتا رہا تھا۔ اُس کی ایک کاپی اُس کے لیپ ٹاپ تک بھی چلی گئی تھی اور وہ بے خبر
 تھی۔

”میں نے اُس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ طے کیا تھا کہ مجھے inspire ہونے جیسا

آسان کام نہیں کرنا inspire ... کرنے جیسا مشکل کام کر کے دیکھنا ہے۔ ”وہ کہہ رہا تھا۔

”میرا تعارف کرواتے وقت وہ ساری چیزیں گنوائی گئیں جن سے آپ سب کے سانس رُک جائیں، آنکھیں جھپکنا بند ہو جائیں، منہ کھلے کے کھلے رہ جائیں... میں نے کس عمر میں کیا کر دیا، اور کس عمر میں کیا... اس سال میری کمپنی کا ٹرن اوور کیا تھا... دُنیا کے دس بہترین entrepreneur میں میں کس نمبر پر ہوں... دُنیا کی کون کون سی کمپنیاں میری کلائنٹ ہیں... آپ میں سے اگر کوئی مجھ سے اور میری کامیابی سے متاثر نہیں ہوا یہ سب سُن کر بھی تو مجھے حیرت ہوگی... ”وہ رُکا، جیسے مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔

”لیکن اس تعارف میں بہت سے ایسے facts شامل ہیں جن کو سُن کر آپ کو مجھ میں اپنا آپ یا اپنے آپ میں دیکھنے لگوں گا... جیسے اس تعارف میں یہ حقیقت شامل نہیں ہے کہ میں آج تک کوشش کے باوجود کبھی اپنی بہن سے لیا گیا قرض واپس نہیں کر سکا۔ ”مجمع میں ہلکی تالیوں کے ساتھ قہقہے گونجے۔

حمین بے حد سنجیدہ تھا۔

”لیکن میں ایک دن وہ ساری رقم واپس کروں گا یہ وہ وعدہ ہے جو میں اُس سے 8 سال کی عمر سے کر رہا ہوں جب میں نے اُس سے پہلی بار قرض لیا تھا، اور میں کبھی وعدہ پورا نہیں کر سکا۔“ وہ ہنستے ہوئے مجمع کے سامنے بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ میری بہن کے پاس ڈائریز کا ایک ڈھیر ہے جس میں اُس نے اُس سے اُدھار لیے جانے والے ایک ایک سینٹ کا بھی حساب رکھا ہوا ہے۔ ”تالیوں کے شور میں وہ رُکا“ اور ہر اچھے بزنس مین کی طرح میں بھی اتنی بڑی رقم فوری طور پر کسی کو نہیں دے سکتا چاہے وہ قرضہ کی واپسی ہی کیوں نہ ہو...“ وہ بول رہا تھا۔

”اور میں سُست ہوں، ضرورتاً جھوٹ بولتا ہوں، چیزیں اکثر بھول جاتا ہوں، دوستوں کو مایوس کرتا ہوں۔“ اُس کے ہر جملے پر وہ سٹوڈنٹس پر جوش انداز میں تالیاں بجا رہے تھے جیسے کسی rock star کو داد دے رہے ہوں۔

”اور ان تمام خامیوں کے ساتھ بھی مجھے اگر most inspirational person کی فہرست میں رکھا جاتا ہے تو یہ خوف ناک بات ہے... خوف ناک اس لئے کیوں کہ ہم ایک ایسے زمانے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں صرف کامیابی ہمیں قابلِ عزت اور قابلِ رشک بنا رہی ہے... ہماری انسانی خصوصیات اور خوبیاں نہیں۔“

تالیوں کے شور نے ایک بار پھر اُسے رُکنے پر مجبور کیا تھا۔ مجمع اب اُس کے سینس آف ہیومر کو نہیں، اُس کے اُن الفاظ کو سراہ رہا تھا۔

MIT کے ”graduating students کو یہ بات کہتے ہوئے میں stupid لگوں گا کہ اُن چیزوں کو redefine کریں جو ہمارے لئے inspirational ہونی چاہیے... میں دس سال کا تھا جب میرے باپ نے مجھے زبردستی پاکستان بھیج دیا... مجھے اور میری فیملی کو... کیوں کہ میرے دادا کو الزائمر تھا، اور میرے باپ کا خیال تھا انہیں ہماری ضرورت تھی... میں نے اگلے چھ سال اپنے دادا کے ساتھ گزارے تھے... دنیا کی کوئی یونیورسٹی مجھے وہ تربیت اور علم نہیں دے سکتی جو الزائمر کے ہاتھوں اپنی یادداشت کھوتے ہوئے اُس 75 سال کے بوڑھے نے اپنے دس سال کے پوتے کو دی MIT ... بھی نہیں... ”سناٹے کو تالیوں نے توڑا تھا پھر اُس کے لئے کھڑے ہو جانے والے ہجوم نے اگلے کئی منٹ اپنے ہاتھ نہیں روکے۔

”میں ہمیشہ سوچتا تھا اس سب کا فائدہ کیا تھا... مجھے امریکہ میں ہونا چاہیے تھا، دادا کے پاس نہیں... لیکن پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنا شروع ہو گیا... مجھے اُن کے ساتھ بیٹھنا، بات کرنا، سننا اور اُن کی مدد کرنا اچھا لگنے لگا... دس سال کا بچہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ

کوئی انسان سامنے پڑی ہوئی چیز کا نام کیسے بھول سکتا ہے... لیکن میں یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس سب نے مجھے ایک چیز سکھائی... There is no tomorrow... جو بھی ہے آج ہے... اور آج کا بہترین مصرف ہونا چاہیے... ”کل“ ”چانس ہے، ہو سکتا ہے آپ کو نہ ملے۔“

اُس نے تقریر ختم کر دی تھی، وہ پورا مجمع ایک بار پھر اُس کے لئے کھڑا ہو چکا تھا... تالیاں بجاتے ہوئے۔

امامہ بھی تالیاں بجا رہی تھی، ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھتے ہوئے... اُسے داد دیتے ہوئے... اُس کی اولاد نے اُسے ایسے بہت سے فخریہ لمحے دیے تھے... بہت سارے...

آہستہ آہستہ اُس گھر کے سارے پرندے اُڑ گئے تھے... جبریل، عنایہ، حمین ریسہ... مگر ہر ایک کی پرواز شاندار تھی، وہ جس آسمان پر بھی اُڑ رہے تھے... فاتحانہ انداز میں اُڑ رہے تھے۔

”تم سمجھدار ہو گئے ہو یا ایکٹنگ کر رہے تھے؟“ وہاں سے واپسی پر امامہ نے اُس سے گاڑی میں کہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہنس پڑا ”ایکٹنگ کر رہا تھا، یہ تو ظاہر ہے...“

غلط سوال کر لیا آپ نے مجھ سے۔ ”اُس نے ماں کی بات کے جواب میں کہا تھا۔
 ”تم بے حد خراب ہو حمین!“ ”امامہ کو یک دم جیسے یاد آیا“ میں بھی سوچ رہا تھا آپ بابا
 کی آٹو بائیو گرافی بھول کیسے گئیں؟“ ”حمین نے ماں کے اس جملے پر برق رفتاری سے
 کہا۔

تمہیں اُسے نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ ”امامہ اب بھی سنجیدہ تھی۔ ”آپ ہی کہتی ہیں
 کتابیں پڑھنا اچھی عادت ہے۔ ”اُس نے ماں سے کہا ”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ
 کتابیں چوری کر کے اور بغیر اجازت پڑھو۔ ”امامہ نے اُسی سنجیدگی سے اُسے ڈانٹا۔
 ”زندگی میں پہلی اور آخری بار کوئی کتاب چوری کر کے پڑھی ہے۔ آپ تسلی رکھیں
 میں اتنا passionate نہیں ہوں ریڈنگ کے بارے میں۔ ”اُس نے بڑے
 اطمینان سے کہا۔ امامہ اگر اُسے شرمندہ دیکھنا چاہتی تھی تو یہ اُس کی غلط فہمی تھی۔ اُس
 کے پاس ہر logic اور ہر بہانہ تھا۔ سالار کا بیٹا تھا تو ان چیزوں کی افراط تھی اُس کے
 پاس۔

”مئی آپ خوا مخواہ ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں، ہم بڑے ہو چکے ہیں، آپ ہر بات ہم
 سے راز نہیں رکھ سکتیں۔ ”اُس نے ماں کا کندھا تھکتے ہوئے جیسے اُسے یاد دلایا۔

”باقی تینوں ہو چکے ہیں... تم نہیں ہوئے۔“

امامہ نے اُس کی بات کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑاتے ہوئے کہا۔

That's not fair ”آپ نے میری speech نہیں سُنی کیا؟“ اُس نے

بے ساختہ اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ speech عنایہ نے لکھی ہوگی۔“ امامہ نے کہا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ لاجواب

ہوا اور ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بھی اُسے امامہ کی چبھتی نظروں کا احساس ہو رہا

تھا۔ NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”She just edited it“ ”اُس نے بالآخر اعتراف کیا... As“

”always امامہ نے جتانے والے انداز میں کہتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

You know it very well ... ”میں ساری عمر speeches لکھتا

رہا ہوں، کرتا رہا ہوں، یہ مشکل نہیں ہے میرے لئے، میں خود بھی کر سکتا ہوں۔“

کر سکتے ہو بالکل کر سکتے ہو، لیکن بس یہ نہ کہو کہ تمہاری speech سُن کر

تمہارے سمجھدار ہونے کا یقین کر لوں۔“

امامہ مزید کچھ کہنے کے بجائے خفگی کے عالم میں خاموش ہو گئی اور ونڈ سکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

”عصّے میں آپ بہت حسین لگتی ہیں۔“ اُس نے یک دم بڑی سنجیدگی سے ماں سے کہا، امامہ نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا ”یہ بھی میں نے بابا کی کتاب میں کہیں پڑھا تھا... چیپٹر نمبر فائیو میں...؟ نہیں شاید فور میں۔“ وہ اب اپنا بازو اُس کے کندھے کے گرد پھیلائے ماں کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”واقعی لکھا ہے تمہارے بابا نے؟“ امامہ نے جیسے بے یقینی سے اُسے پوچھا، اس کے باوجود کہ وہ یہ کتاب درجنوں بار پڑھ چکی تھی... ایڈٹ، ری ایڈٹ کر چکی تھی اُس کے باوجود ایک لمحہ کے لئے اُسے واقعی شائبہ ہوا۔

”لکھا تو نہیں لیکن اگر آپ کہیں تو میں edit کر کے شامل کر دیتا ہوں... آپ کو ویسے بھی پتہ ہے میں غلط باتوں کا چیمپئن ہوں۔“ اُس نے بے حد اطمینان سے ماں سے کہا۔ وہ ہنس پڑی، وہ واقعی یہ بھی کر سکتا تھا، اُس کے لئے اُسے شبہ نہیں تھا۔

”ہم کہیں مل سکتے ہیں؟“ سکرین چمکی۔

”کہاں؟“ تحریر ابھری۔

”جہاں بھی تمہیں آسانی ہو، میں آ جاؤں گا۔“ جواب آیا۔

”اچھا سوچتی ہوں۔“ لفظوں نے کہا۔

وہ خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا... اور وہ وہاں مقامِ ملتزم کے سامنے کھڑا تھا... کتنی بار وہ یہاں آیا تھا اور کتنی بار یہاں آ کر کھڑا ہوا تھا، اُسے اب گنتی بھی بھول چکی تھی، لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ وہاں اسی حالت میں کھڑا تھا... ہیبت کے عالم میں... عجز کی کیفیت میں... دنیا کی کوئی جگہ سالار سکندر کو مٹی نہیں کرتی تھی، صرف وہ جگہ تھی جو اُسے خاک بنا دیتی تھی اور وہ ”خاک“ بننے ہی وہاں آتا تھا... ہر بار اپنی اوقات جاننے اور اُس کی یاد دہانی کے لئے... ہر بار جب دُنیا اُسے کسی چوٹی پر بٹھاتی تھی تو وہ اپنے فخر اور تکبر کو دفنانے یہاں آتا تھا... آج بھی آیا تھا... بلکہ بلا یا گیا تھا۔

خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا جا رہا تھا... سیڑھی لگی ہوئی تھی... اور وہ دُنیا کے مختلف خطوں سے آئے اُن دس مسلمانوں میں شامل تھا جنہیں خانہ کعبہ کے اندر ہونے والی صفائی کی

سعادت کے لئے چنا گیا تھا۔ اور یہ اعزاز اُس کے حصے کس نیکی کے عوض آیا تھا، یہ اُسے ابھی تک سمجھ نہیں آرہا تھا... کرم تو وہ تھا ہی اور کرم تو اُس پر اللہ کا ہمیشہ ہی رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نامہ اعمال میں ایسی کوئی نیکی کھوج رہا تھا جو ایسے کرم کا باعث بنتی۔

وہ شاہی خاندان کا مہمان بن کر پچھلے سالوں میں کئی بار عمرے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔ امامہ کے ساتھ بھی، اُس کے بغیر بھی... مگر یہ دعوت نامہ جو وہاں سے اس بار آیا تھا، وہ سالار سکندر کو کسی اور ہی کیفیت میں لے گیا تھا... ایسا انعام اور اتنا انعام... ایسا کرم اور اتنا کرم... وہ خطا کار اور گناہ گار تھا... ایسا کیا کر بیٹھا تھا کہ اب یوں درگزر کر رہا تھا، یوں عطا کر رہا تھا، وہ بھی جو وہم و گمان میں بھی نہ آنے والی باتیں ہوں۔ وہ اُس دعوت نامے کو آنکھوں سے لگا کر روتا رہا تھا... کیا صاف کرنا تھا اُس نے وہاں جا کر... سب صفائی تو اُس کے اپنے اندر ہونے والی تھی اور ہوتی آرہی تھی۔

امامہ بھی وہاں تھی، ایک دوسری قطار میں اُن ہی افراد کی فیملیز کے ساتھ... وہ اُسے بھی ساتھ لایا تھا اور وہ اُسے رشک سے دیکھ رہی تھی، اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتی تھی... اُس کے گھر امریکہ سے آنے والا وہ ”مہمان“ اس بار اُس کے لئے ایسی سعادت

لانے والا تھا، اس کا اندازہ تو اُسے تھا ہی نہیں۔ وہ اُسے ہمیشہ سر پر اُتر کر تا تھا، بغیر بتائے آجاتا تھا جب بھی کبھی اُسے وقت ملتا تھا... دو دن کے لئے، تین دن کے لئے... اس بار بڑے عرصے کے بعد اُس نے امامہ کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے سے بتایا تھا۔

”تمہارے لئے ایک سر پر اُتر ہے۔“ اُس نے امامہ سے کہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح سر پر اُتر بوجھ گئی تھی، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اُس نے وہ پہیلیاں نہ بوجھی ”ہوں جو سالار اُس کے سامنے رکھتا تھا۔“

”تم مجھے عمرے پر لے کر جاؤ گے۔“ اُس نے کئی اندازے لگانے کے بعد اُس سے فون پر کہا اور اُس کے ہنسنے پر امامہ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

”مجھے پتہ تھا۔“

لیکن جس سعادت کے لئے اللہ نے اُسے اس بار بلا یا تھا اُسے اس کا اندازہ نہیں تھا، وہ اُسے نہیں بوجھ سکی تھی اور جب اُس صبح اُس نے بالآخر امامہ کو وہ دعوت نامہ دکھایا تھا تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر وہی ہوا تھا جو ہوتا آیا تھا، جو ہونا تھا... وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ ”تم اس لئے رو رہی ہو کہ یہ دعوت نامہ تمہارے لئے نہیں ہے؟“

سالار نے اُس کے بہتے آنسو روکنے کے لئے جیسے اُسے چھیڑا۔

”نہیں میں صرف اس لئے رورہی ہوں کہ...“ وہ آنسوؤں کے درمیان رُکی۔ ”اللہ تم سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔“ وہ پھر رونے لگی تھی۔ ”حسد نہیں ہے... رشک ہے... تمہارا اعزاز ہے لیکن مجھے لگ رہا ہے میرے سر پر تاج بن کر سجا ہے۔“ وہ آنسوؤں کے بیچ کہتی جا رہی تھی۔

”جو بھی اعزاز ہیں، تمہاری وجہ سے ہی آئے ہیں امامہ... پہلے بھی... اب بھی... کوئی اور زندگی کا سا تھی ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔“ اُس نے جو اب اُس سے کہا تھا۔

اور اب خانہ کعبہ کے کھلتے ہوئے دروازے سے وہ سالار سکندر کو سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر جانے والا آخری شخص تھا۔

معجزہ ہی تھا وہ زندہ تھا... صحت مند، تندرست، چاق و چوبند... اس عمر میں بھی 20-22 گھنٹے کام کرتے رہنے کی سکت کے ساتھ۔

ڈاکٹر کہتے تھے اُس کی زندگی معجزہ تھی اور اُس کی ایسی صحت مند زندگی معجزے سے آگے کی کوئی شے... 42 سال کی عمر میں اُسے ٹیومر ہوا تھا اور وہ اب 60 سال کا تھا... جو

ٹیومر اُسے ہوا تھا، وہ سات سے دس سال کے اندر انسان کو ختم کر دیتا تھا اور وہ 18 سال سے زندہ تھا... ہر چھ مہینے کے بعد اپنی رپورٹس کو دیکھتا تھا... اُس کے دماغ میں

موجودیو مر آج بھی تھا... اسی جگہ پر... اسی سائز میں... اور بس...

وہ رب جو سمندروں کو باندھ دیتا تھا، اور انہیں ان کی حدوں سے باہر نکلنے نہیں دیتا تھا... اُس کے سامنے وہ چند ملی میٹر کا ایک ناسور کیا شے تھا؟

موت اور اُس کے بیچ زندگی نہیں دعائیں آکر کھڑی ہوئی تھیں اور سالار سکندر کو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے بھی یہ یاد تھا کہ وہ کس کی دعاؤں کی وجہ سے وہاں آج بھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے علاوہ کسی اور کی دعائیں ہو ہی نہیں سکتی تھیں جو اُسے زندگی بن کر یوں لگی تھیں۔

”کتنے سال سے میں نے اپنے لئے کوئی دعا ہی نہیں کی... جو بھی دعا کی ہے، تمہارے اور

بچوں سے شروع ہو کر تم اور بچوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے جب تک مجھے اپنا آپ یاد آتا ہے... مجھے دعا ہی بھول جاتی ہے۔“ وہ اکثر اُس سے ہنستے ہوئے کہا کرتی تھی۔ یوں جیسے ایک ماں اور بیوی کی پوری کہانی لکھ دیتی تھی۔

”دیکھو اللہ تمہیں کہاں کہاں بلاتے ہیں، کہاں کہاں دعا کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔“ یہاں آتے ہوئے امامہ نے بڑی حسرت سے اُس سے کہا تھا اور اب خانہ کعبہ کے اندر کھڑے وہ اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اُسے جہاں بھی بلاتا تھا، وہ اُسے ہر اُس جگہ

پر امامہ کو بھی یاد رکھواتا تھا۔ جیسے اُسے جتنا اور بتاتا ہو کہ اُسے کیسی درجے والی عورت کا ساتھ عطا کیا گیا تھا۔

اُس گھر کے اندر کی دُنیا اور دُنیا تھی۔ اس کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے بھی وہاں کروڑوں نہیں آئے تھے، لاکھوں نہیں، ہزاروں نہیں... بس ہر صدی میں چند سو... اور ایک وہ صدی تھی جب وہاں پیغمبر ﷺ آئے تھے... وہاں کی ہر جگہ، ہر دیوار پر اُن کا لمس تھا اور پھر سینکڑوں سال بعد وہاں سالار سکندر بھی کھڑا تھا... ہیبت نہ آتی تو کیسے نہ آتی... صاف کرنا تھا تو کیا چیز صاف کرنی تھی... اپنے وجود کے علاوہ تو اُسے وہاں صاف کرنے والی کوئی شے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

”تم اندر جا کے کیا مانگو گے سالار؟“ اُس نے خانہ کعبہ آتے ہوئے اُس سے پوچھا تھا۔
 ”تم بتاؤ کیا مانگوں؟“ سالار نے جواباً اُس سے پوچھا۔

”پتہ نہیں کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا۔“ وہ رونے لگی... اور اُس دعوت نامہ کو دیکھنے کے بعد بار بار یہی ہو رہا تھا وہ بار بار بات کرتے ہوئے رونے لگتی تھی... جیسے دل بھر آتا ہو...
 جیسے خوشی کی حد ختم ہو جاتی ہو۔

”تم سارے ستونوں کو ہاتھ لگا کر آنا... ساری دیواروں کو... اُن کو نبی پاک ﷺ نے بھی

چھوا ہوگا، کسی نہ کسی کو... پھر تم باہر آؤ گے تو سب سے پہلے میں تمہارا ہاتھ چھوؤں گی۔ ”وہ بچوں جیسے انداز میں کہہ رہی تھی۔

اور خانہ کعبہ کے اندر اُس کی دیواروں، ستونوں کو آپ ز م ز م سے دھوتے، چھوتے سالار سکندر کو سمجھ آ گیا تھا امامہ ہاشم کیوں یاد آتی ہے ایسی ہر جگہ پر... کیوں دعا والی ہر جگہ پر سب سے پہلے اُس کے لئے دعا کرنا یاد آتا تھا... کیوں کہ وہ عشقِ رسول ﷺ تھا... خالص تھا... غرض کے بغیر تھا... قربانیوں سے گندھا تھا، یہ کیسے ممکن تھا وہاں سے جواب نہ ملتا... بھلا دیا جاتا۔

”تم نے اندر جا کر میرے لئے کیا مانگا؟“ اُس کے باہر آنے پر امامہ نے عجیب بے تابی سے اُس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی اُس کے پاس آیا ہی تھا، اُس کے دونوں ہاتھ پکڑے وہ اب اُس سے پوچھ رہی تھی۔

”مانگا ہے کچھ... بتا نہیں سکتا۔“ سالار نے جواباً عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”جب پوری ہو جائے گی دعا پھر بتاؤں گا۔“ اُس نے اُسے جیسے اگلا سوال کرنے سے روک دیا تھا۔

”میں جانتی ہوں کیا مانگا ہے... لیکن میں بھی بتاؤں گی نہیں، دیکھتی ہوں قبول ہوتی

ہے تمہاری دعا یا نہیں۔ ”امامہ نے جو اباً عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس سے کہا تھا۔

اسفند کی موت کی اطلاع عائشہ عابدین کو دینا جبریل سکندر کی ذمہ داری نہیں تھی، اس کے باوجود وہ اُس بچے کی ماں سے ملنے آیا تھا اور عائشہ عابدین کو دیکھتے ہی کچھ دیر کے لئے وہ گنگ ہو گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال عائشہ عابدین کا تھا، وہ دونوں کئی سالوں بعد ایک دوسرے سے ملے تھے اور ملتے ہی ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے، اور اب یہ شناخت جیسے اُن کے حلق کا کاٹنا بن گئی تھی۔

عائشہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ امریکہ کے بہترین ہاسپٹل میں بہترین ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی اُس کے بچے کی جان جاسکتی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی، اسفند کی چوٹ کی نوعیت اور سنگینی کو جانتی تھی لیکن وہ خود جس ہاسپٹل میں ریڈیٹنسی کر رہی تھی، وہاں اُس نے اس سے بھی زیادہ سنگین اور پیچیدہ نوعیت کے آپریشنز کے بعد بھی مریضوں کو صحت یاب ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اُس کا اپنا بیٹا اُن خوش قسمت لوگوں میں شامل کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ اس سوال کا جو جواب عائشہ عابدین نے ڈھونڈا تھا، وہ ایک لمبے عرصہ تک اُسے بھوت بن کر چمٹا رہا تھا۔

اُس نے غم کو پہلی بار مجسم حالت میں دیکھا تھا، اُس شخص کی شکل میں جو اُسے اُس کی متاعِ حیات چھن جانے کی خبر سنانے آیا تھا... اور وہ وہ شخص تھا جس کے سراب نے عائشہ عابدین کو اُس عذاب میں ڈالا تھا جس میں وہ تھی۔

ایک ڈاکٹر کی طرح جبریل اُسے بتانا گیا تھا کہ آپریشن کیوں ناکام ہوا، اسفند کی حالت کیوں بگڑی... کیوں نہیں سنبھل سکی... اور ان تمام تفصیلات کو دہراتے ہوئے جبریل سکندر کے لاشعور میں ڈاکٹر ویزل کے ہاتھ کی وہ حرکت بار بار آتی رہی، بار بار سر سے جھٹکنے کے باوجود... وہ ایک بت کی طرح گم صم اُس کی بات سنتی رہی یوں جیسے وہ اُس کے بیٹے کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

”آپ کے ساتھ کوئی اور ہے؟“ اپنی کسی بات کے جواب میں ایک مکمل خاموشی رکھنے کے باوجود جبریل اُس سے ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اُسے وہ اس وقت نارمل نہیں لگ رہی تھی اور اُسے احساس ہوا تھا کہ اُسے اُس کی فیملی میں کسی اور سے بات کرنی چاہیے تھی۔ یا اگر اب کر سکتا تھا تو اب کر لے۔ عائشہ عابدین نے اُس کی بات کے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا۔ جبریل اُس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آیا تھا وہ اُس سے اگلا سوال کیسے کرے... سوال ہونے کے باوجود... فیملی نہیں تھی تو

کہاں تھی... وہ کیا سنگل پیرنٹ کے طور پر اسفند کی پرورش کر رہی تھی...؟ شوہر اگر نہیں بھی تھا تو کوئی اور تو فیملی میں ہوتا... اُس کی ماں اور بہنیں... وہ مزید کچھ نہیں سوچ سکا... عائشہ نے یک دم اُس سے کہا تھا ”آپ جائیں... میں manage کر لوں گی سب کچھ۔“ اُس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی تھی... اُسے پتہ تھا وہ ”سب کچھ“ کیا تھا اور جبریل کو بھی اندازہ تھا وہ کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔

ایک روتی بلکتی ہوئی ماں کو تسلی دینا آسان کام تھا، لیکن بظاہر ہوش و حواس میں نظر آتی ایک خاموش گم صم ماں کو تسلی دینا اُس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف چند منٹوں کے لئے اُس بچے کی فیملی سے ملنے آیا تھا اور اب یہ ملاقات ختم کرنا اُس کے لئے پہاڑ بن گیا تھا۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار کسی مریض کو مرتے نہیں دیکھا تھا، لیکن کسی بچے کو پہلی بار مرتے دیکھا تھا... عائشہ عابدین سے مل کر اُس کا رنج کچھ اور بڑھا تھا... وہ اُس آپریشن کو lead نہیں کر رہا تھا نہ ہی وہ اسفند کی موت کا ذمہ دار تھا، اس کے باوجود یہ احساس اُس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا کہ اُس آپریشن میں ڈاکٹر ویزل سے کچھ غلطی ہوئی تھی، آپریشن کے فوراً بعد ڈاکٹر ویزل اور اُس کی بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ عجیب اضطراب اور پریشانی کے عالم میں وہاں سے گئے تھے۔ سب کا اندازہ تھا

وہ اس آخری آپریشن کی ناکامی سے اپ سیٹ ہوئے تھے، صرف جبریل تھا جس کا خیال تھا وہ خود بھی اپنی غلطی کا اندازہ لگا چکے تھے لیکن اب اس صورت حال کے درمیان وہ پھنسا کھڑا تھا... ضمیر کی چبھن اور انسانی ہمدردی... لیکن اُس سے بھی بڑھ کر شناسائی کا وہ پرانا تعلق جو اُس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان نکل آیا تھا۔

”کوئی دوست ہے یہاں آپ کا؟“ جبریل اب اُس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اُسے ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اُسے پہچانی ہے یا نہیں اور اُسے اس صورت حال میں اپنا تعارف کروانا چاہیے یا نہیں۔

”نہیں“ عائشہ نے سر جھکائے اُسے دیکھے بغیر کہا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے اُن پر نظریں جمائے سر جھکائے بیٹھی تھی... جبریل اُس کے برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے بے حد نرمی سے عائشہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ عائشہ نے عجیب و حشت بھری نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

”میرا خیال ہے، ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ اُس کا ہاتھ بڑی نرمی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے جبریل نے اُس سے کہا تھا۔ وہ اُسے رلانا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اُسے اندازہ ہوا تھا کہ اُسے اس وقت پھوٹ پھوٹ کر

رونے کی ضرورت تھی... سکتے کی وہ کیفیت غیر فطری تھی۔

میں جبریل سکندر ہوں... نسا کا کلاس فیلو اور دوست... اور مجھے بہت افسوس ہے کہ ہم اسفند کو نہیں بچا سکے۔ ”وہ مدہم آواز میں اُس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عائشہ نے گردن موڑ کر بھی اُس کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت کسی کو پہچاننا نہیں چاہتی تھی، خاص طور پر ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو۔

”مجھے بتائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“ جبریل نے اُس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کی تھی، یوں جیسے اُس نے برف کو ہاتھ میں لے لیا تھا، وہاں کا ٹمپریچر بھی عائشہ عابدین کے وجود کی ٹھنڈک کو غائب کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

”Please leave me alone...“ میری وجہ سے اپنا وقت ضائع نہ کریں...

آپ ڈاکٹر ہیں، کسی کو آپ کی ضرورت ہوگی۔ ”اُس نے جبریل کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے رُک رُک کر اُس سے کہا تھا۔ وہ اب اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے بیچ دبا کر بیٹھ گئی تھی... یوں جیسے یہ چاہتی نہ ہو کہ کوئی اُس کا ہاتھ پکڑے، اُسے تسلی دے۔ کرسی کی edge پر بیٹھی اپنے وجود کو جو توتوں کے پنچوں پر ٹکائے وہ آگے پیچھے جھول رہی تھی یوں جیسے کسی گہری سوچ میں کسی ذہنی انتشار میں ہچکولے کھا رہی ہو۔

وہ پہلی بار تھا کہ جبریل نے عائشہ عابدین کو غور سے دیکھا تھا... بے حد حیرانی کے عالم میں... سیاہ جینز اور سیاہ ہی جیکٹ میں ملبوس گردن کے گرد ایک گرے رنگ کا مفلر لپیٹے اُس کی ہم عمر وہ لڑکی اب اُس کی ہم عمر نہیں لگ رہی تھی... اُس کے کندھوں سے نیچے تک لہراتے سیاہ چمکدار بالوں میں جگہ جگہ سفید بال تھے... اُس کی رنگت زرد تھی اور آنکھیں سُرخ... یوں جیسے وہ عادی رونے والوں میں سے تھی یا پھر ساری ساری رات جاگنے والوں میں سے... اُس کے سر پر وہ حجاب بھی نہیں تھا جو سالوں پہلے اُس کی پہچان تھا... ڈاکٹر نورین الہی کے خاندان میں وہ حجاب لینے والی پہلی اور واحد لڑکی تھی اور بے حد اچھی خاندانی اقدار رکھنے کے باوجود جبریل جانتا تھا کہ نسا اور اُس کے خاندان کا رجحان مذہب کی طرف نہیں تھا۔ صرف عائشہ عابدین تھی جو مذہبی رجحان اور بے حد واضح طور پر ایسی ہی پہچان بھی رکھتی تھی اور اُس کی وجہ شاید اُس کا پاکستان میں قیام پذیر ہونا تھا، یہ جبریل کا اندازہ تھا۔ عائشہ سے اُس کی کبھی اتنی تفصیلی ملاقاتیں نہیں ہوئیں کہ اُسے اُس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہو پاتا... وہ جس عمر میں اُس سے ملا تھا، وہ ٹین ایج تھی اور اُس عمر میں اُسے بات بات پر مسکرا نے اور بلبش کرنے والی وہ لڑکی عنایہ اور رُئیسہ جیسی ہی لگی تھی... اُس نے اس سے زیادہ غور اس پر نہیں کیا تھا، اس کے باوجود کہ وہ اُس کے فیس بک پر موجود تھی اور کبھی کبھار اُس کی تصویروں کو لائیک

کرتی نظر آتی تھی، پھر وہ غائب ہو گئی تھی۔ اُسے نسا سے پتہ چلا تھا کہ میڈیسن کی تعلیم کے دوران ہی اُس کی شادی ہو گئی تھی اور اُس وقت جبریل نے مبارک باد کا میسج اُس کی وال پر لگانا چاہا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ اب اُس کے contacts میں نہیں تھی... عائشہ عابدین سے اُس کا وہ پہلا تعارف بس یہی تک ہی رہا تھا... نسا اور وہ بہت جلد دو مختلف سٹیٹس کے ہاسپٹلز میں چلے گئے تھے... اُن کے درمیان ایک دوست اور کلاس فیلو کے طور پر موجود رشتہ بھی کچھ کمزور پڑنے لگا تھا... نسا اب کہیں engaged تھی اور جبریل اپنے پروفیشن میں بے حد مصروف... اور اس تیز رفتار سے گزرنے والی زندگی میں عائشہ عابدین کسی سپیڈ بریکر کی طرح آئی تھی۔ جبریل نے اُس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر اُس میں سے نسا کا نمبر ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ چند لمحوں میں اُسے نمبر مل گیا تھا۔

”کیا میں نسا کو فون کر کے بلاؤں؟“ اُس نے عائشہ سے کہا ”نہیں“ جبریل اُس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ عجیب تھی یا ہو گئی تھی، جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا یا پھر یہ صدمہ تھا جس نے اُسے یوں بے حال کر دیا تھا۔

جبریل کو لوگوں پر ترس آتا تھا ہمیشہ ہی... ہمدردی اُس کی گھٹی میں تھی لیکن اس کے

باوجود وہ ایک معروف ڈاکٹر تھا، ایک ایک منٹ دیکھ کر چلنے والا... اُس نے وہاں بیٹھے بیٹھے سوچا تھا، وہ ہاسپٹل کے متعلقہ شعبے سے کسی کو یہاں بھیجتا ہے تاکہ وہ عائشہ عابدین کی مدد کرے اور اُس کی فیملی کے دوسرے افراد سے رابطہ کر سکے۔ وہ اُٹھنے لگا تھا جب اُس نے عائشہ عابدین کی آواز سنی تھی۔

”آپ کو پتہ ہے میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟“ وہ رُک کر اُسے دیکھنے لگا، وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھی، لیکن خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

”کیوں کہ میں اللہ کی نافرمان عورت ہوں، اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔ احسن سعد ٹھیک کہتا ہے۔“ جبریل اُسے دیکھتا رہا گیا تھا۔ عائشہ عابدین نے جیسے وہ بوجھ اتار کر اُس کے سامنے پھینکنے کی کوشش کی تھی جو اُس کے لئے آزار بن گیا تھا۔ احسن سعد کون تھا، جبریل نہیں جانتا تھا اور وہ اُس کے بارے میں جو کہتا تھا، جبریل اُس کی وجہ سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اُس کے وہ دو جملے اُس دن اُس کے پیروں کی زنجیر بن گئے تھے۔

گاڑی بالآخر پورچ میں آکر رُک کی اور اندر سے امامہ بڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ گاڑی تب تک رُک چکی تھی اور اُس کی اگلی سیٹ سے ایرک اتر رہا تھا۔ پہلی نظر میں

امامہ اُسے پہچان نہیں سکی۔ وہ واقعی بدل گیا تھا۔ لمبا تو وہ پہلے بھی تھا، لیکن اب وہ پہلے کی طرح بہت دبلا پتلا نہیں رہا تھا۔

اُس کے ہاتھوں میں دو گلاب کی کلیوں اور چند سبز شاخوں کا ایک چھوٹا سا بُکے تھا... ہمیشہ کی طرح... امامہ کو یاد تھا وہ بچپن میں بھی اکثر اُسے اسی طرح ایک پھول اور دو پتوں والی شاخیں اکثر دیتا تھا... جب بھی اُسے کسی خاص موقع پر ملنے آتا تو... اور بعض دفعہ وہ پورا ”گلدستہ“ اُس کے گھر کے لان سے ہی بنایا گیا ہوتا تھا۔

ایرک اُس سے سلام کے بعد گلے ملنے کے لئے بے اختیار آگے بڑھا پھر جھینپ کر خود ہی ٹھٹھکا، شاید اُسے کوئی خیال آگیا تھا... امامہ نے آگے بڑھ کر تھپکنے والے انداز میں اُس کے گرد بازو پھیلا یا تھا۔

”میں تمہیں پہچان ہی نہیں سکی، تم بڑے ہو گئے ہو... بہت بدل بھی گئے ہو۔“ اُس نے ایرک سے کہا، وہ مسکرایا۔

”لیکن آپ نہیں بدلیں... آپ ویسی ہی ہیں۔“ وہ ہنس پڑھی تھی ”سننے میں کتنا اچھا لگتا ہے کہ کچھ نہیں بدلا... حالانکہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں بھی بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”بڑھاپے کی definition اب شاید بدل گئی ہوگی۔“ ایرک نے برجستگی سے کہا، وہ پھر ہنس پڑی۔

”یہ آپ کے لئے۔“ ایرک نے اُسے وہ چھوٹا سا گلدستہ تھمایا تھا۔

”تمہاری عادتیں سنیں بدلیں... لیکن پھول بدل گیا ہے۔“ امامہ نے گلدستہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”کیونکہ ملک بدل گیا ہے۔“ اُس نے دو بدو کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہا تم نے... سامان کہاں ہے تمہارا؟“ امامہ کو یک دم خیال آیا وہ

گاڑی سے اس گلدستے اور ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ خالی ہاتھ اُترا تھا۔

”ہوٹل میں... میں وہیں رہوں گا، بس آپ سے ضروری ملاقات کرنی تھی، اس لئے آیا ہوں۔“ ایرک نے اُس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے کہا۔

”پہلے تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرتے تھے اور یہیں رہتے تھے، اس بار کسی اور کے پاس

آئے ہو کیا؟“ امامہ کو لگا تھا وہ شاید پاکستان اپنے کسی پروفیشنل کام سے آیا تھا۔ نہیں کسی

اور کے پاس تو نہیں آیا لیکن بس مجھے لگا اس بار کسی ہوٹل میں رُک کر بھی دیکھنا

چاہیے۔“ وہ بات گول کر گیا تھا۔

وہ لنچ کا وقت تھا اور اُس نے صبح جب فون پر اُس سے ملاقات کے لئے بات کی تھی تو امامہ نے لنچ کے کھانے پر خاص اہتمام کیا تھا۔ ایرک کو جو چیزیں پسند تھیں، اُس نے بنوائیں تھیں اور ایرک نے اُس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بڑے شوق سے کھانا کھایا تھا۔

لنچ کے دوران گپ شپ میں ایرک اور اُس کے درمیان ہر ایک کے بارے میں بات ہوئی تھی سوائے عنایہ کے... ایرک نے اُس کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور امامہ نے یہ بات نوٹس کی تھی... حوصلہ افزا تھی یہ بات لیکن پتہ نہیں کیوں اُسے غیر معمولی لگی تھی... اور اُس کی چھٹی حس نے اُسے جو سگنل دیا تھا، وہ ٹھیک تھا۔

لنچ کے بعد چائے کا آخری سپ لے کر کپ رکھتے ہوئے ایرک نے اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اُس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ امامہ ابھی چائے پی رہی تھی، وہ بُری طرح ٹھٹھکی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

”آپ دیکھ لیں۔“

اُس نے امامہ سے کہا، پلک جھپکتے اُس خوبصورت لفافے کو کھولنے سے بھی پہلے... اُس کے چہرے سے مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی تھی، وہ اس ایک لمحے کو avoid کرنا چاہ رہی تھی اور وہ پھر بھی سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ لفافے کے اندر ایک خوبصورت کاغذ پر بے حد خوبصورت طرزِ تحریر میں ایرک نے وہی لکھا ہوا تھا جس کا اُسے خدشہ تھا۔ وہ عنایہ کے لئے اس کی طرف سے ایک فارمل پروپوزل تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اُسے بہت خوش رکھے گا اور آفر کے ساتھ کہ وہ اس پروپوزل کے لئے اُن کی تمام شرائط قبول کرنے پر تیار ہے۔

امامہ کی نظریں کچھ دیر اُس کاغذ پر جمی رہیں اور ایرک کی اُس پر۔ پھر امامہ نے کاغذ کو اُس لفافے میں واپس ڈال کر اُسے میز پر رکھ دیا تھا۔ ایرک سے اب نظر ملانا اور سامنا کرنا ایک دم مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے بالآخر ایرک کو دیکھا، وہ سنجیدہ تھا اور گفتگو کا آغاز اُسی نے کر دیا تھا۔

”آپ نے کئی سال پہلے مجھ سے کہا تھا میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں پھر آپ سے اس بارے میں بات کروں اور تب تک میں عنایہ سے بھی اس موضوع پر کبھی بات نہ کروں۔ دیکھیں میں نے آپ کی دونوں شرائط پوری کی ہیں۔“ اُس نے کہا تھا اور اُس

کے دونوں جملوں نے امامہ کے لئے جواب کو اور بھی مشکل کر دیا تھا۔

”میں جانتا ہوں مسز سالار، آپ کے لئے میں ایک بہت مشکل انتخاب ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک بُرا انتخاب ثابت نہیں ہوں گا۔“ ایرک نے جیسے اُس کی مشکل بھانپتے ہوئے خود ہی اُسے یقین دہانی کروانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہی، وہ اچھا لڑکا تھا... بُرا ہوتا تو اُسے بُرا بھلا کہنا کتنا آسان ہوتا... امامہ نے دل میں سوچا تھا... وہ انکار کی ہر وجہ اپنی طرف سے ختم کر آیا تھا... مسلمان بھی ہو گیا تھا، ایک اچھے پروفیشن میں بھی تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ پھر بھی اُسے انکار کیا کہہ کے کرے... یہ کہہ کے کہ اُسے خوف اور خدشات تھے، اُس کے نو مسلم ہونے کے حوالے سے... یا یہ کہے کہ وہ صرف ایک پاکستانی سے عنایہ کی شادی کرنا چاہتی تھی جو اُس کے اپنے کلچر سے واقف ہو... اُس کے ذہن میں اس وقت جو بات جیسے بھاگ رہے تھے اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو تسلی بخش ہوتا لیکن اس کے باوجود اُسے ایک جواب تو ایرک کو دینا ہی تھا۔

”تم بہت اچھے ہو ایرک۔“ امامہ نے بالآخر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
 - ”عبداللہ!“ اُس نے امامہ کو بیچ میں ٹوک کر جیسے اُس کی تصحیح کی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے

خاموش ہوئی پھر اُس نے جیسے بڑی مشکل سے اُس سے کہا ”عبداللہ... تم بڑے اچھے لڑکے ہو اور میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن عنایہ کے حوالے سے ابھی کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے، میں نہیں جانتی عنایہ تمہارے پروپوزل کے حوالے سے کیا سوچتی ہے... اُس کی پسندنا پسند بے حد اہم ہے۔“ وہ جملہ ادا کرتے ہوئے بھی امامہ کو احساس ہو رہا تھا وہ ایک بے تکی بات کر رہی تھی... اگر بات عنایہ کی پسندنا پسند کی تھی، تو پھر رشتہ پکا تھا۔ ایرک کے لئے اُس کی پسندیدگی بہت واضح تھی۔

”میں نے عنایہ سے پہلے اس لئے بات نہیں کی کیوں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا، میں یہ بات جب بھی کروں گا، آپ سے ہی کروں گا۔“ اُس نے امامہ کی بات کاٹ کر جیسے اُسے یاد دہانی کروائی تھی۔

”میں سالار سے بات کروں گی، تم دو ہفتے پہلے آجاتے تو اُن سے تمہاری ملاقات ہو جاتی... وہ یہیں تھے کچھ دن۔“ امامہ نے جواباً کہا تھا، فوراً ہاں کہہ دینے سے یہ بہتر تھا۔

”وہ جہاں بھی ہوں گے، میں اُن سے ملنے جاسکتا ہوں، میں جانتا ہوں وہ بڑے مصروف ہیں لیکن پھر بھی۔“ ایرک نے اُس سے کہا ”آپ کو تو میرے پروپوزل پر

کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟ ”وہ یک دم خوش ہوا تھا اور اُس کے چہرے پر چھلکنے والی خوشی اور اطمینان نے جیسے امامہ کو احساسِ جرم دیا تھا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے عبد اللہ تم بہ بہت اچھے ہو، لیکن میری خواہش ہے کہ عنایہ کی شادی جس سے بھی ہو، وہ صرف نام کا مسلمان نہ ہو، نیک ہو، دین دار ہو، سمجھ بوجھ رکھنے کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیمات پر عمل بھی کرتا ہو۔“ امامہ نے بالآخر اُس سے کہنا شروع کیا، وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ اُس کی بات بے حد غور سے سُن رہا تھا۔

”مرد کو دین کا پتہ نہ ہو تو عورت کے لئے بہت مسئلہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک پوری نسل کی تربیت کی بات ہوتی ہے۔ ہم لوگ لبرل مسلمان ہیں لیکن بے دین اور بے عمل نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے ہونا چاہتے ہیں، نہ اپنی اگلی نسلوں کے لئے یہ چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ تم کتنے practicing ہو اور اسلام کے بارے میں تمہارے

concepts کتنے واضح ہیں لیکن عنایہ بہت مذہبی ہے... میں نہیں چاہتی اُس کی شادی کسی ایسی جگہ ہو جہاں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی وجہ مذہبی اعتقادات اور اُن پر عمل کا ہونا یا نہ ہونا ہو۔“ وہ کہتی جا رہی تھی۔

”تمہیں شاید پتہ نہ ہو لیکن میں بھی نو مسلم تھی۔ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام کی

صحیح تعلیمات اختیار کی تھیں میں نے... فیملی، گھر سب چھوڑا تھا... بڑے مسائل کا سامنا کیا تھا... یہ آسان نہیں تھا۔ ”اُس کی آواز بھرا گئی تھی، وہ رُ کی اپنی آنکھیں پونچھتے وہ ہنسی یوں جیسے اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہو۔

”یہ آسان کام نہیں تھا۔“ اُس نے دوبارہ کہنا شروع کیا ”لیکن سالار نے بہت آسان کر دیا میرے لئے... وہ practicing مسلمان ہے اور میں اپنی بیٹی کے لئے اُس کے باپ جیسا مسلمان ہی چاہتی ہوں، زندگی میں اتنی تکلیفیں برداشت کر کے اتنی لمبی جدوجہد کے بعد میں اپنی اگلی نسل کو پھر سے بے دین اور بے عمل دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم مسلمان تو ہو لیکن شاید اسلام کی تعلیمات میں اتنی دلچسپی نہ ہو کیوں کہ مسلمان ہونے کی تمہاری وجہ ایک لڑکی سے شادی ہے۔ شادی ہو جائے گی تمہاری دلچسپی دین میں ختم ہو جائے گی... کچھ عرصہ بعد شاید تمہیں یہ بھی پروا نہ رہے کہ تم مسلمان ہو۔ حرام اور حلال کے درمیان جو دیوار ہم اٹھا کر رکھتے ہیں، تمہارے لئے وہ اٹھانا ضروری نہ ہو... محبت بہت دیر پا چلنے والی شے نہیں ہے، اگر دو انسانوں کے بیچ عادات، اعتقادات اور خیالات کی خلیج ہو تو۔“ ایرک نے اُس کی گفتگو کے درمیان اُسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا، وہ صرف خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔

”تم کسی ویسٹرن لڑکی سے شادی کر لو تو تمہاری بہت اچھی نہجے گی...“ وہ اب اُسے جیسے مشورہ دیتے ہوئے راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

”کوئی اچھی مسلمان لڑکی جو وہیں سے ہو۔“ اس بار اُس نے اس لمبی گفتگو کے دوران پہلی بار امامہ کو ٹوکا۔

”وہ جو بھی ہوگی، آپ کی بیٹی تو نہیں ہوگی مسز سالار۔“ امامہ خاموش ہو گئی۔

”آپ نے اچھا کیا یہ سب کچھ کہا مجھ سے... جو بھی آپ کے خدشات ہیں، میں اب انہیں دیکھ سکتا ہوں، اور آپ کو وضاحت بھی دے سکتا ہوں۔ نو سال ہو گئے ہیں مجھے عبداللہ بنے... لیکن مجھے لگتا ہے مسلمان میں بہت پہلے سے تھا... تب سے جب آپ لوگوں کے خاندان سے ملنا شروع ہوا تھا...“ وہ بہت سوچ سوچ کے ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔

”میں بہت زیادہ باعمل اور باکردار مسلمان نہیں ہوں... آپ کے بیٹوں جیسا تو بالکل بھی نہیں ہوں... لیکن اپنے آس پاس نظر آنے والے بہت سے مسلمانوں سے بہتر ہوں۔ نو سال میں میں نے اپنے دین کے حوالے سے صرف حرام اور حلال ہی کو نہیں سمجھا اور بھی بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے پتہ ہے آپ کبھی قادیانی تھیں،

پھر آپ تائب ہو کر مسلمان ہوں... مجھ سے یہ مت پوچھیے گا کہ یہ مجھے کس نے بتایا لیکن میں یہ جانتا ہوں اور اس لئے آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ ہمدردی رکھیں گی۔ آپ کی طرح میں بھی اپنی اگلی نسل کو اچھا انسان اور مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں... صرف مسلمان نہیں... اس لئے آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں... ایک اچھی دین دار عورت ہی ایک اچھے گھرانے کی بنیاد رکھتی ہے... یہ بھی دین نے ہی بتایا ہے مجھے۔ ”امامہ اُس کی باتیں سُن رہی تھی، عبداللہ اُس کے انکار کو بہت مشکل کرتا جا رہا تھا۔ وہ جو بھی اُس سے کہہ رہا تھا، وہ clarity کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

”مجھے عنایہ بہت اچھی لگتی ہے، محبت کرتا ہوں اُس سے لیکن شادی کا فیصلہ صرف محبت کی وجہ سے نہیں کیا نہ ہی مذہب کی تبدیلی محبت کا نتیجہ ہے... میری زندگی میں آپ اور آپ کی فیملی کا ایک بہت پازٹیو رول رہا ہے... میں آپ لوگوں کے مذہب سے بعد میں متاثر ہوا تھا، آپ لوگوں کی انسانیت اور مہربانی سے پہلے متاثر ہوا تھا... اور میری زندگی کے ایک بہت مشکل phase میں مجھے آپ لوگوں کا حُسن سلوک یاد ہے... ایک ایک چیز... آپ کہیں تو میں دہرا سکتا ہوں... میں اُس مذہب کے awe میں آگیا تھا جو ایسے خوبصورت انسان بنانے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا تھا... میں اُس

وقت بہت چھوٹا تھا، آپ لوگوں کے لئے جو محسوس کرتا تھا، اُسے آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا تھا۔ اب اتنے سالوں بعد مجھے موقع ملا تو میں بتا رہا ہوں۔ ”وہ رُکا... سر جھکائے بہت دیر خاموش رہا۔

”آپ لوگ میری زندگی میں نہ آتے تو میں ایک بہت بُرا انسان بنتا... پاپا کی موت کے بعد میں ویسے ہی تھا جیسے سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی... ڈوب جاتی تو ڈوب جاتی... میں اُس وقت بہت دعا کیا کرتا تھا کہ مسٹر سکندر کو کچھ نہ ہو، اُن کا ٹریٹمنٹ صحیح ہو جائے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا آپ کے گھر میں وہ تکلیف آئے جس سے میں اور میری فیملی گزر رہی تھی... ”وہ چپ ہو گیا۔ اما نہ بھی بول نہیں سکی... پانی دونوں کی آنکھوں میں تھا اور درد بھی... اور دونوں دونوں چیزیں چھپانے کی کوشش میں تھے۔

”میں پاکستان صرف آپ سے بات کرنے اور یہ سب بتانے کے لئے آیا ہوں... آپ نے اپنی بیٹی کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ وہ بہت عزت اور حیا والی ہے اور میں نے اتنے سالوں میں اُس کے لئے محبت کا جذبہ رکھنے کے باوجود اُن حدود کا احترام کیا ہے جو آپ نے اُس کے لئے طے کی ہیں اور جسے اُس نے کبھی نہیں توڑا۔ میں آپ کی بیٹی کو اتنی ہی

عزت اور احترام کے ساتھ اپنی زندگی اور گھر کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔” عبداللہ نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اُس لفافے کے اوپر رکھ دی جو اُس نے میز پر رکھا تھا۔

اُس خوبصورت لفافے کے اوپر ایک خوبصورت سُرخ ڈبیا میں عنایہ سکندر کا نصیب تھا جو اتنا ہی خوبصورت تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ امامہ اُس ڈبیا سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اُس کی مرضی سے کبھی کچھ نہیں ہوتا تھا، لیکن جو بھی ہوتا تھا وہ بہترین ہوتا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE

Ring ”خوبصورت ہے پر نقلی ہے۔“ جمین نے ڈنر ٹیبل پر بیٹھے فٹس اور چپس

کھاتے ہوئے ڈبیا کو ریسہ کی طرف سرکایا، جو سلاد کا ایک پیالہ کھاتے ہوئے اس کی بات سُن رہی تھی۔

گھلی ہوئی ڈبیا کو بند کرتے ہوئے اُس نے اُسی ہاتھ سے اپنے گلاسز ٹھیک کیے اور بڑے تحمل سے کہا۔

”I know”

وہ فٹ اور چپس تقریباً نگل رہا تھا اور ساتھ TV لاؤنج میں سکریں رگی کا ایک میچ دیکھ رہا تھا۔

رئیسہ ویک اینڈ گزارنے وہاں آئی تھی، امریکہ واپس آنے کے بعد اور اگلے دن عنایہ بھی وہاں پہنچ رہی تھی اور اس وقت ایک فاسٹ فوڈ سے ہوم ڈیلیوری کروانے کے بعد وہ کھانا کھانے میں مصروف تھے جب رئیسہ نے وہ انگوٹھی اُسے دکھائی تھی۔

”تم نے کسی کو دینی ہے یا تمہیں کسی نے دی ہے؟“ حمین نے میچ دیکھتے دیکھتے چلی ساس کی بوتل تقریباً اپنی پلیٹ میں خالی کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”ہشام نے دی ہے۔“ رئیسہ نے کسی تمہید کے بغیر مدہم آواز میں بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اس بار حمین نے سکریں سے نظریں ہٹالی تھیں۔

”جب وہ واپس آئے گا تو میں اُسے واپس کر دوں گی۔“ اُس نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد اُسی سانس میں کہا۔

”مطلب؟“ حمین اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”اُس نے مجھے پروپوز کیا ہے لیکن میں نے اُس کا پروپوزل قبول نہیں کیا۔ میں چاہتی

ہوں پہلے دونوں فیملیز آپس میں بات کر لیں۔ ”رئیسہ نے اُسے مختصر بتایا۔“ لیکن ہشام تو ابھی اپنی فیملی کے ساتھ بحرین میں ہوگا۔ اُس کی فیملی کیا وہاں سے آکر بات کرے گی؟ ”حمین نے جواباً اُس سے پوچھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہشام اور اُس کی فیملی کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔

تین دن پہلے بحرین میں ہونے والے رائل فیملی کے اُس پلین کریش میں وہاں کے حکمران اور اُس کی فیملی کے چھ افراد کی ہلاکت ہوئی تھی۔ بحرین کا حکمران ہشام کاتایا تھا اور اُس حادثے کی اطلاع ملنے کے فوری بعد ہشام اپنی فیملی کے ساتھ بحرین چلا گیا تھا۔ رئیسہ بھی اُس کے ساتھ ہی امریکہ واپس آئی تھی۔

”ہشام تو آجائے گا گلے ہفتے لیکن اُس کی فیملی ابھی رہے گی وہاں۔“ رئیسہ نے اُس سے کہا۔

”تو پھر کیا ہوگا؟“ حمین نے دوبارہ چسپ کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔

”اسی لئے تو تم سے بات کر رہی ہوں، تم بتاؤ۔“ رئیسہ نے اُسے جواباً کہا۔

”مئی کریں گی صاف صاف دو ٹوک انکار۔“ چلی ساس میں مچھلی کا ٹکڑا ڈبوتے ہوئے

حمین نے جیسے مستقبل کا نقشہ دو جملوں میں اُس کے سامنے کھینچا۔

”ہاں مجھے پتہ ہے۔“ ریسہ نے گہرا سانس لیا ”تمہیں پسند تو نہیں ہے نا؟“ حمین نے

اُس سے اس طرح سرسری سے انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی عام سی بات تھی۔

”ہے“ اُس نے یک لفظی جواب دیا اور ایک پورا زیتون اٹھا کر نگلا۔

”Too bad“ حمین نے جیسے افسوس کرنے والے انداز میں کہا۔

”عنا یہ اور عبداللہ کا پتہ ہے تمہیں اس کے باوجود تم نے...“ ریسہ نے اُس کی بات

کاٹی ”ہشام پیدا نشی مسلمان ہے“ ”لیکن بحرینی ہے بلکہ عرب ہے۔“ حمین نے اُسے
 بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”ویسے تو وہ امریکی ہے۔“ ریسہ نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا ”امریکی تو مئی کو ویسے

ہی زہر لگتے ہیں۔“ حمین نے بے حد اطمینان سے تصویر کا ایک اور تارک پھلو اُسے

دکھایا۔

”اسی لئے تم سے بات کر رہی ہوں۔“ ریسہ نے سلاد کھانا بند کر دیا۔

”تم ایک بات بتاؤ، تمہیں صرف وہ پسند ہے یا محبت وغیرہ ہے؟“ ریسہ نے اُسے

جو اباً گھورا۔

”صرف جنرل نانج کے لئے پوچھ رہا ہوں۔“ حمین نے مدافعانہ انداز میں بے اختیار کہا۔

”یہ جنرل نانج کا سوال نہیں ہے۔“ زئیہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”کامن سینس کا ہو گا پھر... وہ تو میری ویسے ہی خراب ہے۔“ پلیٹ صاف کرتے ہوئے حمین نے بے حد اطمینان سے کہا۔

”تم کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟“ زئیہ نے اُس کو اگلا جملہ بولنے سے پہلے کہا۔

”میں صرف کوشش کر سکتا ہوں لیکن اس کا فائدہ نہیں... لیکن سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم میری ملاقات ہشام سے کراؤ... میں دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے حوالے سے وہ دراصل کتنا سیریس ہے۔“

”وہ میں کروادوں گی، وہ مسئلہ نہیں ہے۔“ زئیہ نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

”اور اگر مٹی یا بابا نہیں مانتے پھر...؟“ حمین نے یک دم اُس سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی، پھر اُس نے کہا۔

”مجھے وہ اچھا لگتا ہے لیکن ایسی جذباتی وابستگی نہیں ہے کہ میں اُسے چھوڑ نہ سکوں۔“

”اچھے کی امید رکھنی چاہیے لیکن بدترین کے لئے تیار رہنا چاہیے... بابا کو اعتراض نہیں ہوگا، لیکن مُمّی کا میں کہہ نہیں سکتا، کوشش کروں گا... لیکن ہشام نے اپنی فیملی سے بات کی ہے تمہیں پروپوز کرنے سے پہلے؟ کیوں کہ اگر اس کی فیملی کو کوئی اعتراض ہوا تو مُمّی بابا میں سے کوئی بھی اس پروپوز پر غور نہیں کرے گا۔“ حمین کو بات کرتے کرتے خیال آیا تھا۔ اپنی فیملی سے بات کر کے ہی اُس نے مجھ سے بات کی ہے، اُس کی فیملی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ”رئیسہ نے اُسے جیسے یقین دہانی کروائی تھی۔

حمین اُس کی بات سنتے ہوئے اپنے میز پر دھرے فون کی سکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنی انگلی سے سکرین کو سکروں کر رہا تھا، رئیسہ کو لگا اُس نے اُس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔

”تم میری بات سُن رہے ہو؟“ رئیسہ نے جیسے اُسے متوجہ کیا۔

”ہاں... میں ہشام کے بارے میں search کر رہا ہوں۔“ اُس نے جواباً کہا۔

”کیا؟“ رئیسہ چونکی۔

”ہشام کو اور اُس کی فیملی کو پتہ ہے کہ تم ایڈاپٹڈ ہو؟“ حمین اُسی طرح سکرین سکرو ل کر رہا تھا...

”ہشام کو پتہ ہے تو ظاہر ہے اُس کی فیملی کو بھی پتہ ہوگا۔“ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھکی اور پھر اُس نے کہا۔

”اوہ...“ حمین اپنے فون کی سکرین پر کچھ پڑھتے پڑھتے بے اختیار چونکا تھا۔
 ”کیا ہوا؟“ رنیسہ چونکی۔

”تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے اور شاید بُری بھی۔“ حمین نے ایک گہرا سانس لے کر سر اٹھایا اور اُسے دیکھا اور پھر اپنا فون اُس کے سامنے رکھ دیا۔

وہ شخص دیوار پر لگی رنیسہ کی تصویر کے سامنے اب پچھلے پندرہ منٹ سے کھڑا تھا۔
 پلکیں جھپکائے بغیر، ٹکٹکی لگائے اس لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہوئے... چہرے میں کوئی شباہت
 تلاش کرتے ہوئے... سالار سکندر کے شجرہ میں دے آتش فشاں کی شروعات
 ڈھونڈتے ہوئے... اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا تو اسی ایک جگہ سے بنا سکتا تھا۔ وہ

ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا... خود کلامی... ایک سکینڈل کا تانا بانا تیار کرنے کے لئے ایک کے بعد ایک مکر و فریب کا جال... وجوہات... حقائق کو مخفی کرنے... وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہدایات دینے کے لئے مڑا تھا۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز کے اس کمرے کی دیواروں پر لگے بورڈز چھوٹے بڑے نوٹس، چارٹس، فوٹو گرافس اور ایڈریسز کی چٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔

کمرے میں موجود چار آدمیوں میں سے تین اس وقت بھی کمپیوٹر پر مختلف ڈیٹا کھنگالنے میں مصروف تھے، یہ کام وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کر رہے تھے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ بڑے بڑے ڈبے پڑے تھے جو مختلف فائلز، ٹیپس، میگزینز اور نیوز پیپرز کے تراشوں اور دوسرے ریکارڈ سے بھرے ہوئے تھے، کمرے میں موجود ریکارڈ کیبنٹس پہلے ہی بھری ہوئی تھیں، کمرے میں موجود تمام ڈیٹا ان کمپیوٹرز کی ہارڈ ڈسکس میں بھی محفوظ تھا۔

کمرے میں موجود دو آدمی پہلے ڈیڑھ ماہ سے سالار سکندر کے بارے میں آن لائن آنے والا تمام ریکارڈ اور معلومات اکٹھی کرتے رہے تھے۔ کمرے میں موجود تیسرا شخص

سالار اور اس کی فیملی کے ہر فرد کے ای میلز کا ریکارڈ کھنگالتا رہا تھا۔ چوتھا شخص اس کی فیملی اور مالی معلومات کو چیک کرتا رہا تھا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ ان تصویروں اور شجرہ نسب کی صورت میں ان بورڈز پر موجود تھا۔ وہ چار لوگ دعویٰ کر سکتے تھے کہ سالار اور اس کی فیملی کی پوری زندگی کا ریکارڈ اگر خدا کے پاس موجود تھا تو اس کی ایک کاپی اس کمرے میں بھی تھی۔ سالار کی زندگی کے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے علم میں نہیں تھی یا جس کے بارے میں وہ ثبوت نہیں دے سکتے تھے۔

CIA کے Sting Operations سے لے کر اس کی ٹین ایج کی گرل فرینڈز تک اور اس کے مالی معاملات سے لے کر اس کی اولاد کی پرسنل اور پرائیویٹ لائف تک ان کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔

لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز نہیں نکال سکے تھے جس سے وہ اس کی کردار کشی کر سکتے۔ وہ ٹیم جو پندرہ سال سے اس طرح کے مقاصد پر کام کرتی رہی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سرتوڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے حوالے سے کسی قسم کا سکینڈل نکال نہیں پائی تھی۔ دو سو پوائنٹس کی جو چیک لسٹ انہیں دی

گئی تھی، وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ اُن کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔
انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔

کسی حد تک وہ سٹائش کے جذبات رکھنے کے باوجود ایک آخری کوشش کر رہے تھے...
ایک آخری کوشش... کمرے کے ایک بورڈ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے
بورڈ تک جاتے جاتے وہ آدمی سالار کے فیملی ٹری کی اس تصویر پر رُکا تھا۔ اس تصویر
کے آگے کچھ اور تصویریں تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلٹ پوائنٹس... ایک دم جیسے
اُسے بجلی کا جھٹکا لگا تھا۔ اُس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے اس کی تاریخ پیدائش دیکھی
پھر مڑ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو اس سال ان dates پر یہ کہاں تھا؟“

کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چند منٹوں کے بعد سکرین پر نمودار ہونے والی تحریر
پڑھتے ہوئے کہا۔

”پاکستان“

سوال کرنے والے آدمی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی۔

”کب سے کب تک؟“

اُس آدمی نے اگلا سوال کیا، کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے کی بورڈ پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے سکرین پر دیکھتے ہوئے اُسے تاریخیں بتائیں۔

”آخر کار ہمیں کچھ مل ہی گیا۔“ اُس آدمی نے بے اختیار ایک سیٹی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ اُنہیں جہاز ڈبونے کے لئے تاریخیں مل گیا تھا۔

یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اب جانتا تھا کہ اُسے اس آتش فشاں کا منہ کھولنے کے لئے کیا کرنا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مٹھیوں کی طرح بھینچ کر کھولا، ایک بار... دو بار... تین بار... پھر اپنی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے مسلا... کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، اپنی لمبی ٹانگوں کو سٹڈی ٹیبل کے نیچے رکھے foot holder پر سیدھا کرتے ہوئے وہ جیسے کام کرنے کے لئے ایک بار پھر تازہ دم ہو گیا تھا... پچھلے چار گھنٹے سے مسلسل اُس laptop پر کام کرتے رہنے کے باوجود جو اس وقت بھی اُس کے

سامنے کھلا ہوا تھا اور جس پر چمکتی گھڑی اس وقت سوئٹزر لینڈ میں رات کے 2:34 ہو جانے کا اعلان کر رہی تھی۔

وہ ڈیوس میں ورلڈ اکنامک فورم کا keynote سپیکر تھا جس کی تقریر کل دنیا کے ہر بڑے چینل اور اخبار کی ہیڈ لائنز بننے والی تھی 3:40 پر اُس نے بالآخر اپنا کام ختم کیا laptop کو بند کر کے وہ سٹیڈی ٹیبل سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ موسم سرما تھا اور ڈیوس میں سورج طلوع ہونے میں ابھی وقت تھا... اتنا وقت کہ وہ چند گھنٹے کے لئے سو جاتا... اور چند گھنٹوں کی نیند اُس کے لئے کافی تھی، نماز کے لئے دوبارہ جاگنے سے پہلے... وہ اُس کی زندگی کا معمول تھا اور اب اتنے سالوں سے تھا کہ اُسے معمول سے زیادہ عادت لگنے لگا تھا۔ صوفہ کے سامنے موجود سینٹر ٹیبل پر سوئٹزر لینڈ اور امریکہ کے کچھ بین الاقوامی جریدوں کی کاپیز پڑی تھیں اور اُن میں سے ایک کے سرورق پر حمین سکندر کی تصویر تھی۔ Young Global Leaders 500 کی فہرست میں پہلے نمبر پر براجمان، اپنی مخصوص شرارتی مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کیمرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے۔

ایک لمحہ کے لئے سالار کو یو نہی لگا تھا جیسے وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا

تھا... اُسی اعتماد، دلیری اور وقار کے ساتھ جو اس کا خاصہ تھا۔
 سالار سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی، اُس نے جھک کر وہ میگزین اٹھایا تھا... وہ
 ورلڈ اکنامک فورم میں پہلی بار آ رہا تھا... اور دنیا کے اس prestigious فورم کا
 جیسے نیا پوسٹر بوائے تھا۔ وہاں پڑا کوئی میگزین ایسا نہیں تھا جس میں اُس نے حمین سکندر
 یا اُس کی کمپنی کے حوالے سے کچھ نہ پڑھا ہو۔

”Devilishly Handsome, Dangerously
 Meticulous” سالار سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوئی... وہ ہیڈ لائن
 حمین سکندر کے بارے میں تھی جس سے اس کی ملاقات کل اُسی فورم میں ہونے والی
 تھی، جہاں اُس کا بیٹا بھی خطاب کرنے والا تھا۔ اُس نے اُس میگزین کو دوبارہ سینٹر ٹیبل
 پر رکھ دیا۔

اُس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا سیل فون کھٹکا، بستر پر بیٹھتے ہوئے سالار نے اُسے اٹھا کر
 دیکھا۔ وہ واقعی شیطان تھا، خیال آنے پر بھی سامنے آجاتا تھا...

”Awake?” وہ حمین سکندر کا ٹیکسٹ تھا، اُسے باپ کی روٹین کا پتہ تھا وہ خود

بھی insomniac تھا۔

”Yes” سالار نے جواباً ٹیکسٹ کیا ”بڑی اچھی فلم آرہی تھی، سوچا آپ کو بتادوں۔“ جواب آیا۔ سالار کو اُس سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی۔ دوسرا ٹیکسٹ آیا جس میں اُس چینل کا نمبر بھی تھا جس پر وہ مووی آرہی تھی، اُس کی کاسٹ کے ناموں کے ساتھ جس میں چارلیز تھیرن کا نام بلاک لیٹرز میں لکھا ہوا تھا۔ وہ باپ کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ سالار کو اندازہ ہو گیا تھا۔

”Thank you for the recommendation” سالار نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے ٹیکسٹ کا جواب دیا۔ اُس کی بات کا جواب نہ دینا اس سے زیادہ بہتر تھا۔

”I am seriously thinking of getting married ” اگلا جملہ بے سرو پیر کے تھا۔ سالار سکندر گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ورلڈ اکنامک فورم کا اینگسٹار سپیکر تھا جو اپنی تقریر سے ایک رات پہلے باپ سے رات کے اس وقت اس طرح کی بے تکی باتیں کر رہا تھا۔

”What an idea! Tread it on TAI” اُس نے اُسے جوابی ٹیکسٹ کیا اور پھر گڈنائٹ کا میسج... کھٹاک سے ایک smiley اُس کی سکرین پر

اُبھری تھی... دانت نکالتے ہوئے۔

”I am serious“ سالار فون رکھ دینا چاہتا تھا، لیکن پھر رُک گیا۔

Options“ چاہیے یا approval؟ ”اُس نے اس بار بے حد سنجیدگی سے

اُسے ٹیکسٹ کیا۔

”Suggestions“ جواب اُسی تیز رفتاری سے آیا۔

TV” بند کر کے سو جاؤ۔ ”اُس نے جواباً سے ٹیکسٹ کیا۔

”بابا میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ رئیسہ اور عنایہ کی شادی کئے بغیر میرا شادی کرنا مناسب نہیں خاص طور پر جب جبریل کی شادی کافی الحال کوئی امکان نہیں۔ ”وہ اُس

کے اس جملے پر اب بالآخر کھٹکا تھا... اُس کی باتیں اتنی بے سرو پا نہیں تھیں جتنا وہ اُنہیں

سمجھ رہا تھا۔ رات کے اس پہر وہ فلم سے اپنی شادی اور اپنی شادی سے عنایہ اور رئیسہ

کی شادی کا ذکر لے کر بیٹھا تھا تو کوئی مسئلہ تھا... اور مسئلہ کہاں تھا، یہ سالار کو ڈھونڈنا

تھا۔

”تو؟“ اُس نے اگلے ٹیکسٹ میں جیسے کچھ اور اُگلوانے کے لئے دانہ ڈالا، جواب خاصی

دیر بعد آیا... یعنی وہ اب سوچ سوچ کر ٹیکسٹ کر رہا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا جیسے شطرنج کی ایک بساط بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔

”تو بس پھر ہمیں عنایہ اور رنیسہ کے حوالے سے کچھ سوچنا چاہیے۔“ جواب سوچ سمجھ کر آیا تھا، لیکن مبہم تھا۔

”رنیسہ کے بارے میں یا عنایہ کے بارے میں؟“ سالار نے بڑے کھلے الفاظ میں اُس سے پوچھا۔ حمین کو شاید باپ کے اس بے دھڑک سوال کی توقع نہیں تھی، وہ امامہ نہیں تھی جس کو وہ گھما پھرا لیتا تھا، وہ سالار سکندر تھا جو اُسی کی طرح لمحوں میں بات کی جڑ تک پہنچ جاتا تھا۔

”رنیسہ کے بارے میں۔“ بالآخر اُسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہنا پڑا، سالار کے لئے جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن حیران وہ اُس کی ٹائمنگ پر ہوا تھا۔

”تم خود رنیسہ کے لئے بات کر رہے ہو یا رنیسہ نے تمہیں بات کرنے کے لئے کہا ہے؟“ سالار کا اگلا ٹیکسٹ پہلے سے بھی direct تھا۔ حمین کا جواب اور بھی دیر سے آیا ”میں خود کر رہا ہوں۔“ سالار کو اُس کے جواب پر یقین نہیں آیا۔

”رئیسہ کہیں انوالوڈ ہے؟“ اُس نے اگلا ٹیکسٹ کیا... جواب ایک بار پھر دیر سے آیا اور
 ایک دم سالار کو احساس ہوا کہ یہ ٹیکسٹنگ دو لوگوں کے درمیان نہیں ہو رہی
 تھی... تین لوگوں کے درمیان ہو رہی تھی... وہ... حمین اور رئیسہ...

وہ تاخیر جو حمین کی طرف سے جواب آنے پر ہو رہی تھی، وہ اس لئے ہو رہی تھی کیوں
 کہ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے سوال جواب رئیسہ کو بھی بھیج رہا تھا اور پھر اُس کی
 طرف سے آنے والے جوابات اُسے فارورڈ کر رہا تھا۔ وہ اُن دونوں کی بچپن کی عادت
 تھی، ایک دوسرے کے لئے spokesperson کا رول ادا کرنا... اور زیادہ تر یہ
 رول رئیسہ ہی اُس کے لئے کیا کرتی تھی۔

”کوئی اُسے پسند کرتا ہے۔“ جواب دیر سے آیا تھا لیکن اُس کے direct سوال کے
 بدلہ میں بے حد ڈپلومیٹک انداز میں دیا گیا تھا اور یہ حمین کا انداز نہیں تھا۔ یہ رئیسہ کا
 انداز تھا۔

”کون پسند کرتا ہے...؟ ہشام؟“ سالار نے جواباً بے حد اطمینان سے ٹیکسٹ کیا۔ اُسے
 یقین تھا اُس کے جوابیہ سوال نے دونوں بہن بھائی کے پیرتلے سے کچھ لمحوں کے لئے
 زمین نکالی ہوگی۔ اُن کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ سالار اتنا ”باخبر“ ہو سکتا تھا۔

حسبِ توقع ایک لمبے وقفے کے بعد ایک پورے منہ کھولے ہنستی ہوئی smiley آئی تھی۔

”Good Shot” یہ حمین کا جواب تھا۔

”رہنمہ سے کہو آرام سے سو جائے... ہشام کے بارے میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہوگی... میں اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں اور تم دونوں اب مجھے مزید کوئی ٹیکسٹ نہیں کرو گے۔” سالار نے ایک voice message حمین کو بھیجتے ہوئے فون رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا اس کے بعد وہ واقعی بھوتوں کی طرح غائب ہو جائیں گے... خاص طور پر رہنمہ۔

جبریل نیند میں فون کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اُسے پہلا خیال ہاسپٹل کا آیا تھا لیکن اُس کے پاس آنے والی وہ کال ہاسپٹل سے نہیں آئی تھی اُس پر نسا کا نام چمک رہا تھا۔ وہ غیر متوقع تھا۔ ایک ہفتے پہلے اسفند کی تدفین کے دوران اُس کی ملاقات نسا سے ایک لمبے عرصے کے بعد ہوئی تھی اور اُس کے بعد اس طرح رات کے اس وقت آنے والی کال...

کال ریسیو کرتے ہوئے دوسری طرف سے اُس نے جبریل سے معذرت کی تھی کہ وہ رات کے اس وقت اُسے ڈسٹرب کر رہی تھی اور پھر بے حد اضطراب کے عالم میں اُس نے جبریل سے کہا تھا۔

”تم عائشہ کے لئے کچھ کر سکتے ہو؟“ جبریل کچھ حیران ہوا ”عائشہ کے لئے کیا؟“

”وہ پولیس کسٹڈی میں ہے“

”What?“ وہ ہکا بکارہ گیا ”کیوں؟“

”قتل کے کیس میں“ وہ دوسری طرف سے کہہ رہی تھی۔ جبریل شاکڈ رہ گیا۔ ”کس کا قتل؟“ وہ اب رونے لگی تھی۔

”اسفند کا“ جبریل کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

وہ بیچنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے چمچے کے ساتھ اپنے باپ کو کھلا رہا تھا، اُس کا باپ لقمے کو چبانے اور نکلنے میں تقریباً دو منٹ لے رہا تھا۔ وہ ہر بار صرف اتنی ہی بیچنی پیالے میں ڈالتا جس میں ایک ٹکڑا ڈوب جاتا پھر چمچے سے اس ٹکڑے کو باپ کے منہ

میں ڈالنے کے بعد وہ بے حد تحمل سے پیالے میں نیا ٹکڑا ڈالتا جو گرم یخنی میں چھولنے لگتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں یخنی اس پیالے میں ڈالتا تو یخنی اب تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ یخنی کا ایک پیالہ پینے میں اس کا باپ تقریباً ایک گھنٹہ لگاتا تھا۔ ٹھنڈی یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے بھی وہ اسی رغبت سے کھاتا جیسے وہ ان گرم لقموں کو کھا رہا تھا۔ سکندر عثمان کے ذائقے کی حس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی، گرم اور ٹھنڈی خوراک میں تخصیص کرنا وہ کب کا چھوڑ چکے تھے۔ صرف اُن کی دیکھ بھال کرنے والے فیملی کے افراد تھے جو اس تخصیص کو اُن کے لئے اب بھی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اب بھی خوراک کو اُن کے لئے ممکنہ حد تک ذائقہ دار بنا کر دے رہے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتے تھے نہ اس ذائقے کو یاد رکھ سکتے تھے۔ باپ کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ سالار اور امامہ نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا، تینوں وقت کا کھانا باپ کے کمرے میں اُسے کھانا کھلاتے ہوئے یہی کھاتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہ کام امامہ اور بچے کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ڈرائنگ روم ایک عرصہ سے نہ ہونے کے برابر استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے ماں باپ کا بیڈ روم اس کی فیملی کے افراد کی بہت ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ اُس شخص کو تنہائی سے بچانے کی ایک کوشش تھی جو کئی

سالوں سے اس کمرے میں بستر تک محدود تھا اور الزائمر کی آخری سیٹج میں داخل ہو چکا تھا۔

ٹرالی میں پڑا نیپکن اٹھا کر اُس نے سکندر عثمان کے ہونٹوں کے کونے سے نکلنے والی بیجنی کے وہ قطرے صاف کیے جو چند لمحے پہلے نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے خالی آنکھوں سے اُسے دیکھا جن سے وہ اُسے ہمیشہ دیکھتے تھے۔ وہ انہیں کھانا کھلاتے ہوئے جواب کی توقع کے بغیر ان سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے باپ کی خاموشی کے وقفے اب گھنٹوں پر مشتمل ہونے لگے تھے۔ گھنٹوں کے بعد کوئی لفظ یا جملہ ان کے منہ سے نکلتا تھا جس کا تعلق ان کی زندگی کے کسی سال کی کسی یاد سے ہوتا تھا اور وہ سب اس جملے کو سال کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

سکندر عثمان کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ یک ٹک اُسے دیکھتے تھے۔ اب بھی دیکھ رہے تھے۔ سالار جانتا تھا اُس کا باپ جیسے ایک اجنبی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کو کھانا کھلانے کی کوئی احتیاط، کوئی محبت، کوئی لگن ان کی یادداشت پر کہیں محفوظ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے اور ان کے ختم ہوتے ہوئے دماغی خلیے اُس اجنبی کے چہرے کو کوئی نام دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

سالار جانتا تھا اس کے باپ کو اُس کے ہاتھ سے کھایا ہوا وہ دوپہر کا کھانا بھی یاد نہیں ہوگا۔ وہ جتنی بار اُس کے کمرے میں آتا ہوگا، وہ اپنے باپ کے لئے ایک نیا شخص، ایک نیا چہرہ ہوگا اور صرف وہی نہیں، اُس کی فیملی کے باقی سب افراد بھی۔ سکندر عثمان شاید حیران ہوتے ہوں گے کہ اُن کے کمرے میں بار بار نئے لوگ کیوں آتے تھے... وہ اپنے گھر میں ”اجنبیوں“ کے ساتھ رہ رہے تھے۔

اُس نے یخنی کا آخری چمچ اپنے باپ کے منہ میں ڈالا۔ پھر پیالہ ٹرالی میں رکھ دیا۔ اب وہ اپنے باپ کو چمچ کے ساتھ پانی پلا رہا تھا۔ اُس کا باپ لمبا گھونٹ نہیں لے سکتا تھا۔ امامہ کچھ دیر پہلے کمرے سے اُٹھ کر گئی تھی۔ اُس کا سامان پہلے ہی ایئر پورٹ جا چکا تھا۔ اب باہر ایک گاڑی اُس کے انتظار میں کھڑی تھی جو اسے تھوڑی دیر میں ایئر پورٹ لے جاتی۔ اس کا سٹاف بے صبری سے اس کمرے سے اُس کی برآمدگی کا منتظر تھا۔

سالار نے گلاس واپس رکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کی گردن کے گرد پھیلا ہوا نیپکن ہٹایا۔ پھر کچھ دیر تک سکندر عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے انہیں اپنی روانگی کا بتایا تھا اور اُس تشکر و احسان مندی کا بھی جو وہ اپنے باپ کے لئے ہمیشہ محسوس کرتا تھا خاص طور پر آج... سکندر عثمان خالی نظروں سے

اُسے دیکھ اور سُن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پارہے تھے۔ لیکن یہ ایک رسم تھی جو وہ ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ اُس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد باپ کے ہاتھ چومے پھر اُنہیں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا، اور کچھ دیر بے مقصد بیڈ کے پاس کھڑا اُنہیں دیکھتا رہا تھا۔ اُس کے بعد پتہ نہیں کب وہ اپنے باپ کے پاس آنے کے قابل ہوتا۔ سالار یہ نہیں جانتا تھا وہ آخری کھانا تھا جو اُس نے اپنے باپ کے ساتھ کھایا تھا۔

تاش کا ترپ کا پتہ پھینکا جانے والا تھا اور ”مہلت“ ختم ہونے والی تھی

لاک اپ میں بیٹھے اُس رات عائشہ عابدین نے اپنی زندگی کو recap کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اُس کی زندگی میں اتنا بہت کچھ ہو چکا تھا کہ وہ اس کوشش میں بھی ناکام ہو رہی تھی، یوں جیسے وہ 28 سال کی زندگی نہیں تھی آٹھ سو سال کی زندگی تھی... کوئی بھی واقعہ اُس ترتیب سے یاد نہیں آ رہا تھا جس ترتیب سے وہ اُس کی زندگی میں ہوا تھا اور وہ یاد کرنا چاہتی تھی۔

لاک اپ کے بستر پر چت لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اُس نے یہ سوچنے کی کوشش کی تھی کہ اُس کی زندگی کا سب سے بدترین واقعہ کیا تھا... سب سے تکلیف دہ تجربہ اور دور... باپ کے بغیر زندگی گزارنا؟

احسن سعد سے شادی؟

اُس کے ساتھ اُس کے گھر میں گزارا ہوا وقت؟

ایک معذور بیٹے کی پیدائش؟

احسن سعد سے طلاق؟

اسفند کی موت؟

یا پھر اپنے ہی بیٹے کے قتل کے الزام میں دن دھاڑے ہاسپٹل سے پولیس کے ہاتھوں
 گرفتار ہونا...؟

اور ان سارے واقعات کے بچوں بیچ کئی اور ایسے تکلیف دہ واقعات جو اُس کے ذہن کی
 دیوار پر اپنی جھلک دکھاتے ہوئے جیسے اُس فہرست میں شامل ہونے کے لئے بے قرار
 تھے...

وہ طے نہیں کر سکی... ہر تجربہ، ہر حادثہ، اپنی جگہ تکلیف دہ تھا... اپنی طرح سے
 ہولناک... وہ اُن کے بارے میں سوچتے ہوئے جیسے زندگی کے وہ دن جینے لگی تھی اور
 اگلے واقعہ کے بارے میں سوچنا شروع کرتے ہوئے اُسے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا

کہ پچھلا واقعہ زیادہ تکلیف دہ تھا یا پھر جو اُسے اب یاد آ رہا تھا۔

کبھی کبھار عائشہ عابدین کو لگتا تھا وہ ڈھیٹ تھی... تکلیف اور ذلت سہہ سہہ کر وہ اب شرمندہ ہونا اور درد سے متاثر ہونا چھوڑ چکی تھی... زندگی میں وہ اتنی ذلت اور تکلیف سہہ چکی تھی کہ شرم اور شرمندگی کے لفظ جیسے اُس کی زندگی سے خارج ہو گئے تھے... وہ اتنی ڈھیٹ ہو چکی تھی کہ مرنا بھی بھول گئی تھی... اُسے کسی تکلیف سے کچھ نہیں ہوتا تھا... دل تھا تو وہ اتنے ٹکڑے ہو چکا تھا کہ اب اور ٹوٹنا اُس کے بس میں نہیں رہا تھا۔

ذہن تھا تو اُس پر جالے ہی جالے تھے... عزتِ نفس، ذلت، عزت جیسے لفظوں کو چھپا دینے والے جالے... یہ سوچنا اُس نے کب کا چھوڑ دیا تھا کہ یہ سب اُس کے ساتھ ہی کیوں ہوتا تھا، اُس نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا... اس سوال کا جواب ویسے بھی اُسے احسن سعد نے رٹوا دیا تھا۔

”لکھو اس کاغذ پر کہ تم گناہ گار ہو... اللہ سے معافی مانگو... پھر مجھ سے معافی مانگو... پھر میرے گھر والوں سے معافی مانگو... بے حیا عورت...“ پتہ نہیں یہ آواز اُس کے کانوں میں گونجنے کیوں نہیں ہوتی تھی... دن میں... رات میں... سینکڑوں بار ان جملوں کی بازگشت اُسے اُس کے اس سوال کا جواب دیتی رہتی تھی کہ یہ سب اُس کے ساتھ ہی

کیوں ہوتا تھا۔

وہ ایک گناہ گار عورت تھی... یہ جملہ اُس نے اتنی بار اپنے ہاتھ سے کاغذ پر لکھ کر احسن سعد کو دیا تھا کہ اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جملہ حقیقت تھا... اُس کا گناہ کیا تھا، صرف یہ اُسے یاد نہیں آتا تھا... مگر اُسے پھر بھی یقین تھا کہ جو بھی گناہ اُس نے کبھی زندگی میں کیا ہو گا... بہت بڑا ہی کیا ہو گا... اتنا بڑا کہ اللہ تعالیٰ اُسے یوں بار بار ”سزا“ دے رہا تھا... سزا کا لفظ بھی اُس نے احسن سعد اور اُس کے گھر میں ہی سنا اور سیکھا تھا... جہاں گناہ اور سزا کے لفظ کسی ورد کی طرح دہرائے جاتے تھے... ورنہ عائشہ عابدین نے تو احسن سعد کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے اللہ کو خود پر صرف ”مہربان“ دیکھا تھا۔

”بے حیا عورت...“ وہ گالی اُس کے لئے تھی۔ عائشہ عابدین کو گالی سُن کر بھی یہ یقین نہیں آیا تھا... زندگی میں پہلی بار ایک گالی اپنے لئے سُن کر وہ گنگ رہ گئی تھی... کسی مجسمے کی طرح... کھڑی کی کھڑی... یوں جیسے اُس نے کوئی سانپ یا اژدہا دیکھ لیا تھا... وہ ناز و نعم میں پلی تھی... گالی تو ایک طرف، اُس نے کبھی اپنے نانا نانی یا ماں سے اپنے لئے کوئی سخت لفظ بھی نہیں سنا تھا... ایسا لفظ جس میں عائشہ کے لئے توہین یا تضحیک ہوتی اور اب اُس نے اپنے شوہر سے اپنے لئے جو لفظ سنا تھا اُس میں تو الزام اور تہمت تھی... وہ ”بے

حیا” تھی... عائشہ عابدین نے اپنے آپ کو بہلایا تھا، سوتا ویلیں دے کر کہ یہ گالی اُس کے لئے کیسے ہو سکتی تھی... یا شاید اُس نے غلط سُنا تھا... یا پھر اُن الفاظ کا مطلب وہ نہیں تھا جو وہ سمجھ رہی تھی... وہ اُس کیفیت پر ایک کتاب لکھ سکتی تھی۔ ان توجیہات، اُن وضاحتوں پر جو پہلے گالی سُننے کے بعد اگلے کئی دن عائشہ عابدین نے اپنے آپ کو دیں تھیں... اپنی عزتِ نفس کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے Antibiotics... کے ایک کورس کی طرح... لیکن یہ سب صرف پہلی گالی کی دفعہ ہوا تھا، پھر آہستہ آہستہ عائشہ عابدین نے ساری توجیہات اور وضاحتوں کو دفن کر دیا تھا... وہ اب گالیاں کھاتی تھی اور بے حد خاموشی سے کھاتی تھی، اور بہت بڑی بڑی... اور اُسے یقین تھا کہ وہ یہ گالیاں deserve کرتی تھی کیونکہ احسن سعد اُسے یہ کہتا تھا... پھر وہ مارا کھانا بھی اسی سہولت سے سیکھ گئی تھی... اپنی عزتِ نفس کو ایک اور سلپنگ ڈوز دیتے ہوئے... پانچ افراد کا وہ گھرانہ اُسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اُس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ اُسے deserve کر رہی تھی۔

وہ مومنین کے ایک ایسے گروہ میں پھنس گئی تھی جو زبان کے پتھروں سے اُسے بھی مومن بنانا چاہتے تھے کیونکہ وہ ”گناہ گار“ تھی۔

احسن سعد اُس کی زندگی میں کیسے آیا تھا اور کیوں آگیا تھا... ایک وقت تھا اُسے لگتا تھا وہ اُس کی خوش قسمتی بن کر اُس کی زندگی میں آیا تھا اور پھر ایک وہ وقت تھا جب اُسے وہ ایک ڈراؤنا خواب لگنے لگا تھا، جس کے ختم ہونے کا انتظار وہ شد و مد سے کرتی تھی... اور اب اسے لگتا تھا وہ وہ عذاب تھا جو اللہ تعالیٰ نے اُسے اُس کے کردہ، ناکردہ گناہوں پر اس دنیا میں ہی دے دیا تھا۔

وہ ہاؤس جا ب کر رہی تھی جب احسن سعد کا پروپوزل اُس کے لئے آیا تھا۔ عائشہ کے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اُس کے لئے درجنوں پروپوزلز پہلے بھی آچکے تھے اور اس کے نانا نانی کے ہاتھوں رد بھی ہو چکے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ پروپوزل بھی کسی غور کے بغیر رد کر دیا جائے گا کیونکہ اُس کے نانا نانی اُس کی تعلیم مکمل ہوئے بغیر اُسے کسی قسم کے رشتے میں باندھنے پر تیار نہیں تھے۔ مگر اس بار ایسا نہیں ہوا تھا... احسن سعد کے والدین کی میٹھی زبان عائشہ عابدین کی فیملی پر اثر کر گئی تھی، اور اس پر بھی۔

”ہمیں صرف ایک نیک اور اچھی بچی چاہیے اپنے بیٹے کے لئے... باقی سب کچھ ہے ہماری پاس، کسی چیز کی کمی نہیں ہے... اور آپ کی بیٹی کی اتنی تعریفیں سنی ہیں ہم

لوگوں نے کہ بس ہم آپ کے ہاں جھولی پھیلا کر آئے بغیر نہیں رہ سکے ”احسن کے باپ نے اُس کے نانا سے کہا تھا۔ عائشہ عابدین جو جب پتہ چلا تھا کہ اُس کی ایک نند اُس کے ساتھ میڈیکل کالج میں ہی پڑھتی تھی... اُن دونوں کا آپس میں بہت رسمی سا تعارف تھا... مگر اُسے حیرت ہوئی تھی کہ اُس رسمی تعارف پر بھی اُس کی اتنی تعریفیں وہ لڑکی اپنی فیملی میں کر سکتی تھی جو کالج میں بالکل خاموش اور لئے دیے رہتی تھی... عائشہ عابدین کے لئے کسی کی زبان سے اپنی تعریفیں سُننا کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی، وہ کالج کے سب سے نمایاں سٹوڈنٹس میں سے ایک تھی، اور وہ ہر طرح سے نمایاں تھی، academic قابلیت میں، نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اور پھر اپنی personality کی وجہ سے بھی... وہ اپنے batch کی نہ صرف حسین بلکہ بے حد سٹائلش لڑکیوں میں گردانی جاتی تھی... بے حد practicing مسلمان ہوتے ہوئے بھی اور مکمل طور پر حجاب اوڑھے ہوئے بھی... حجاب عائشہ عابدین پر سجتا تھا... یہ اُس کے charisma کو بڑھانے کی چیز تھی اور یہ رائے اُس کے بارے میں لڑکے اور لڑکیوں کی متفقہ رائے تھی... اور اب اُس لڑکی کے لئے احسن سعد کا پروپوزل آیا تھا، جس کی فیملی کو اُس کے نانانانی نے پہلی ملاقات میں ہی Ok کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کون ”سادہ“ تھا... اُس کے نانانانی جنہیں احسن کے ماں باپ بہت

شریف اور سادہ لگے تھے یا پھر وہ خود کہ انہوں نے اُس خاندان کے بارے میں لمبی چوڑی تحقیق صرف اس لئے نہیں کروائی کیونکہ انہوں نے احسن سعد کے ماں باپ کی دینداری کا پاس کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے شادی سے پہلے احسن سعد اور عائشہ کی ایک ملاقات کروانا ضروری سمجھا تھا... احسن سعد اُس وقت امریکہ میں ریڈیو نسی کر رہا تھا اور چھٹیوں میں پاکستان آیا ہوا تھا۔

احسن سعد سے پہلی ملاقات میں عائشہ کو ایک لمبے عرصہ کے بعد جبریل یاد آیا تھا... اُسے وہ جبریل کی طرح کیوں لگا تھا، عائشہ کو اس سوال کا جواب کبھی نہیں ملا۔ وہ شکل و صورت میں صرف مناسب تھا، تعلیمی قابلیت میں بے حد اچھا... اور بات چیت میں بے حد محتاط... اُس کا پسندیدہ موضوع صرف ایک تھا مذہب، جس پر وہ گھنٹوں بات کر سکتا تھا اور اُس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان connecting factor یہی تھا... پہلی ہی ملاقات میں وہ دونوں مذہب کی بات کرنے لگے تھے اور عائشہ عابدین اُس کے awe میں آئی تھی۔ وہ حافظِ قرآن تھا اور وہ اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کی زندگی میں کبھی کسی لڑکی کے ساتھ دوستی نہیں رہی، وہ عام لڑکوں کی طرح کسی اُلٹی سیدھی حرکتوں میں نہیں پڑا... وہ مذہب کے بارے میں جامع معلومات رکھتا تھا... اور

وہ معلومات عائشہ سے بے حد زیادہ تھیں لیکن وہ ایک سادہ زندگی گزارنا چاہتا تھا اور عائشہ بھی یہی چاہتی تھی... ایک عملی مسلمان گھرانے کے خواب دیکھتے ہوئے... وہ احسن سعد سے متاثر ہوئی تھی اور اُس کا خیال تھا وہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے بے حد mature اور مختلف تھا... وہ اگر کبھی شادی کرنے کا سوچتی تھی تو ایسے ہی آدمی سے شادی کرنے کا سوچتی تھی... احسن سعد پہلی ملاقات میں اُسے متاثر کرنے میں کامیاب رہا... اُس کی فیملی اُس کے گھر والوں سے پہلے ہی متاثر تھی... یہ صرف نورین الہیٰ تھی جس نے احسن کی فیملی پر کچھ اعتراضات کئے تھے۔ اُسے وہ بے حد ”کٹر“ لگے تھے اور اُس کی اس رائے کو اُس کے اپنے ماں باپ نے یہ کہتے ہوئے رد کر دیا تھا کہ وہ خود ضرورت سے زیادہ لبرل تھی اس لئے وہ انہیں اس نظر سے دیکھ رہی تھی۔ نورین شاید کچھ اور بحث و مباحثہ کرتی اگر اُسے یہ نہ محسوس ہو جاتا کہ عائشہ عابدین بھی وہی چاہتی تھی جو اُس کے ماں باپ چاہتے تھے۔ نورین الہیٰ نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے تمام خدشات کو یہ کہہ کر سُلا دیا تھا کہ عائشہ کو احسن کے والدین کے پاس نہیں رہنا تھا... امریکہ احسن کے ساتھ رہنا تھا اور امریکہ کا ماحول بڑے بڑوں کو moderate کر دیتا تھا۔

شادی بہت جلدی ہوئی تھی اور بے حد سادگی سے... یہ احسن سعد کے والدین کا مطالبہ تھا اور عائشہ اور اُس کے نانانانی اُس پر بے حد خوش تھے... عائشہ ایسی ہی شادی چاہتی تھی اور یہ اُسے اپنی خوش قسمتی لگی تھی کہ اُسے ایسی سوچ رکھنے والا سسرال مل گیا تھا۔ احسن سعد کی فیملی کی طرف سے جہیز کے حوالے سے کوئی مطالبہ نہیں آیا تھا بلکہ انہوں نے سختی سے عائشہ کے نانانانی کو اُن روایتی تکلفات سے منع کیا تھا۔ مگر یہ عائشہ کی فیملی کے لئے اس لئے ممکن نہیں تھا کیونکہ عائشہ کے لئے اُس کے نانانانی بہت کچھ خریدتے رہتے تھے اور جس کلاس سے وہ تعلق رکھتی تھی، وہاں جہیز سے زیادہ مالیت کے تحائف دلہن کے خاندان کی طرف سے موصول ہو جاتے تھے اور عائشہ کی شادی کی تقریب میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت سادگی سے کی جانے والی تقریب بھی شہر کے ایک بہترین ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی، احسن سعد اور اُس کے خاندان کو عائشہ اور اُس کی فیملی کی طرف سے دیے جانے والے تحائف کی مالیت بے شک لاکھوں میں تھی مگر اس کے برعکس شادی پر دیے جانے والے عائشہ کے ملبوسات اور زیورات احسن سعد کے خاندانی رکھ رکھاؤ اور مالی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے... وہ صرف مناسب تھے... عائشہ کی فیملی کا دل برا ہوا تھا لیکن عائشہ نے اُنہیں سمجھایا تھا اُس کا خیال تھا، وہ ”سادگی“ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور اگر انہوں نے زیورات اور شادی کے

ملبوسات پر بھی بہت زیادہ پیسہ خرچ نہیں کیا تو بھی یہ ناخوش ہونے والی بات نہیں تھی، کم از کم اُس کا دل صرف ان چھوٹی موٹی باتوں کی وجہ سے کھٹا نہیں ہوا تھا۔

اُس کا دل شادی کی رات اُس وقت بھی کھٹا نہیں ہوا تھا، جب کمرے میں آنے کے بعد اُس کے قریب بیٹھ کر پہلا جملہ احسن سعد نے اپنی نئی نویلی دلہن اور اُس کے حسن پر نہیں کہا تھا بلکہ اُس کی ماں کے حوالے سے کہا تھا۔

”تمہاری ماں کو شرم نہیں آتی... اس عمر میں فاحشاؤں کی طرح sleeveless لباس پہن کر مردوں کے ساتھ ٹھٹھے لگاتی پھر رہی ہے... اور اُسی طرح تمہاری بہنیں اور تمہارے خاندان کی ساری عورتیں پتہ نہیں آج کیا پہن کر شادی میں شرکت کرنے پہنچی ہوئی تھیں۔“ عائشہ کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا، جو اُس نے اپنے کانوں سے سنا تھا، اُسے اُس پر یقین نہیں آیا تھا، احسن کا یہ لب و لہجہ اتنا نیا اور اجنبی تھا کہ اُسے یقین آ بھی نہیں سکتا تھا، اُن کے درمیان نسبت طے ہونے کے بعد وقتاً فوقتاً بات چیت ہوتی رہی تھی اور وہ ہمیشہ بڑے خوشگوار انداز اور دھیمے لب و لہجے میں بڑی شائستگی اور تمیز کے ساتھ بات کرتا تھا، اتنا کھڑ لہجہ اُس نے پہلی بار سنا تھا اور جو لفظ وہ اُس کی ماں اور خاندان کی عورتوں کے لئے استعمال کر رہا تھا، وہ عائشہ عابدین کے لئے

نا قابل یقین تھے۔

”تمہاری ماں کو کیا آخرت کا خوف نہیں ہے؟ مسلمان گھرانے کی عورت ایسی ہوتی ہے...؟ اور پھر بیوہ ہے وہ۔“ عائشہ آنکھیں پھاڑے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، وہ اُسے یہ سب کیوں سنارہا تھا...؟ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک دن کی دلہن تھی اور یہ وہ لفظ نہیں تھے جو وہ سننے کے لئے اپنی زندگی کے ایک اہم دن کے انتظار میں تھی۔ وہ آدھا گھنٹہ ایسی عورتوں کے بارے میں لعنت ملامت کرتا رہا تھا اور اُسے یہ بھی بتاتا رہا تھا کہ اُس کی فیملی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُس کی ماں اور بہنیں اتنی آزاد خیال تھیں اور امریکہ میں اُن کا یہ لائف سٹائل تھا... انہوں نے تو اُس کے ناننانانی اور خود اُسے دیکھ کر یہ رشتہ طے کیا تھا۔ وہ احسن سعد سے یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکی کہ وہ اس رشتہ کے طے ہونے پہلے امریکہ میں دو تین بار اُس کی ماں اور بہنوں سے مل چکا تھا... اور نسبت طے ہوتے ہوئے بھی اُس کی فیملی اُس کی ماں اور بہنوں سے مل چکی تھی... وہ آزاد خیال تھے تو یہ اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا جس کا انکشاف اُس رات ہونے پر وہ یوں صدمہ زدہ ہو گئے تھے۔ احسن سعد کے پاس مذہب کی ایسی تلوار تھی جس کے سامنے عائشہ عابدین بولنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں یہ مان لیا تھا کہ غلطی

اُس کی ماں اور بہنوں ہی کی تھی... وہ اسلامی لحاظ سے مناسب لباس میں نہیں تھیں اور احسن اور اُس کی فیملی اگر خفا تھی تو شاید یہ جائز ہی تھا۔

اُس رات احسن سعد نے اس ابتدائی کے بعد ایک لمبی تقریر میں اُسے بیوی اور ایک عورت کی حیثیت سے اُس کا درجہ اور مقام سنا اور سمجھا دیا تھا... جو سیکنڈری تھا... وہ سر ہلاتی رہی تھی... وہ ساری آیات اور احادیث کے حوالے آج کی رات کے لئے ہی جیسے اکٹھا کرتا رہا تھا... وہ بے حد خاموشی سے سب کچھ سنتی گئی تھی... وہ وقتی غصہ نہیں تھا، وہ ادا تھا... وہ اُسے نفسیاتی طور پر ہلا دینا چاہتا تھا اور وہ اُس میں کامیاب رہا تھا۔ عائشہ جیسی پر اعتماد لڑکی کی شخصیت پر یہ پہلی ضرب تھی جو اُس نے لگائی تھی... اُس نے اُسے بتایا تھا کہ اُس گھر اور اُس کی زندگی میں وہ اُس کے ماں باپ اور بہنوں کے بعد آتی ہے... اور ہاں اس فہرست میں اُس نے اللہ کو بھی پہلے نمبر پر رکھا تھا... عائشہ عابدین کو اُس نے جیسے اُس دائرے سے باہر کھڑا کر دیا تھا جس کے اندر اُس کی اپنی زندگی گھومتی تھی۔

21 سال کی ایک نو عمر لڑکی جس طرح ہر اسماں ہو سکتی وہ ویسے ہی ہر اسماں اور حواس باختہ ہوئی تھی۔ احسن سعد نے اُس سے کہا تھا اُس کے اور عائشہ کے درمیان جو بات چیت ہوگی عائشہ اُسے کسی سے share نہیں کرے گا... عائشہ نے اُس کی بھی حامی

بھری تھی، اُس کا خیال تھا یہ ایک عام وعدہ تھا جو ہر مرد بیوی سے لیتا تھا... مگر وہ ایک عام وعدہ نہیں تھا، احسن سعد نے اُس کے بعد اُس سے قرآن پاک پر رازداری کا حلف لیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ وہ اُس کی بیوی تھی اور شوہر کے طور پر وہ یہ استحقاق رکھتا تھا کہ وہ اُسے جو کہے وہ اُس کی اطاعت کرے... 21 سال کی عمر تک وہ عائشہ عابدین کی زندگی کی سب سے بُری رات تھی لیکن اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کے بعد بُری راتوں کی گنتی بھی بھولنے والی تھی۔

اُس رات احسن سعد کا غصہ اور رویہ صرف اُس کا غصہ اور رویہ نہیں تھا۔ اگلی صبح عائشہ عابدین کو اُس کی فیملی بھی اسی انداز میں ملی تھی... بے حد سرد مہری، بے حد اکھڑا ہوا لہجہ... اُس کا احساسِ جرم اور بڑھاتا اور اُس نے دعا کی تھی کہ اُس رات ولیمہ کی تقریب میں اُس کی ماں اور بہنیں ایسے کوئی لباس نہ پہنیں جس پر اُسے ایک اور طوفان کا سامنا کرنا پڑے۔

لیکن شادی کے چند دنوں کے اندر اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس کی فیملی کی خفگی کی وجہ اُس کی اپنی فیملی کا آزاد خیال ہونا نہیں تھا... اُن کی خفگی کی وجہ اُن کی توقعات کا پورا نہ ہونا تھا جو وہ عائشہ کی فیملی سے لگائے بیٹھے تھے، شادی سادگی سے کرنے اور جہیز یا کچھ

بھی نہ لانے کا مطلب ”کچھ بھی“ نہ لانا نہیں تھا۔ اُن کو توقع تھی کہ اُن کے اکلوتے اور اتنے قابل بیٹے کو عائشہ کی فیملی کوئی بڑی گاڑی ضرور دیتی... عائشہ کے نام کوئی گھر، کوئی پلاٹ، کوئی بینک بیلنس ضرور کیا جاتا... جیسے اُن کے خاندان کی دوسری بہوؤں کے نام ہوتا تھا... شادی سادگی سے ہونے کا مطلب اُن کے نزدیک صرف شادی کی تقریبات کا سادہ ہونا تھا۔ شادی کے تیسرے دن یہ گلے شکوے عائشہ سے کر لیے گئے تھے اور اس کوشش کے ساتھ کہ وہ انہیں اپنی فیملی تک پہنچائے جو عائشہ نے پہنچا دیئے تھے اب شکاٹڈ ہونے کی باری اس کی فیملی کی تھی۔ شادی کے تین دن بعد پہلی بار نورین الہی نے اپنی بیٹی کو یہ آپشن دیا تھا کہ وہ ابھی اُس رشتہ کے بارے میں اچھی طرح سوچ لے... جو لوگ تیسرے دن ایسے مطالبے کر سکتے ہیں، وہ آگے چل کر اُسے اور بھی پریشان کر سکتے تھے، عائشہ ہمت نہیں کر سکی تھی... اپنی دوستوں اور کزنز کے ٹیکسٹ میسجز اور کالز اور چھیڑ چھاڑ کے دوران وہ یہ ہمت نہیں کر سکی تھی کہ وہ ماں سے کہہ دیتی کہ اُسے طلاق چاہیے تھے۔ اُس نے وہی راستہ چُننا تھا جو اس معاشرے میں سب چنتے تھے... سمجھوتے کا اور اچھے وقت کے انتظار کا... اُس کا خیال تھا یہ سب کچھ وقتی تھا... یہ چند مطالبے پورے ہونے کے بعد سب کچھ بدل جانے والا تھا اور پھر ایک بار وہ احسن کے ساتھ امریکہ چلی جاتی تو وہ اور احسن اور طریقے سے زندگی گزارتے۔

احسن کی فیملی کی ساری شکایات ختم کر دی گئی تھیں۔ اُسے شادی کے ایک ہفتہ کے بعد ایک بڑی گاڑی دی گئی تھی، عائشہ کے نام نورین نے اپنا ایک پلاٹ ٹرانسفر کر دیا تھا اور عائشہ کے نانا نے اُس کو کچھ رقم تحفے میں دی تھی جو اُس نے احسن کے مطالبے پر اُس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی تھی۔ وہ اُس کے بعد دو ہفتوں کے لئے ہنی مون منانے بیرون ملک چلے گئے تھے۔

احسن سعد نے پہلی بار اُس پر ہاتھ بھی ہنی مون کے دوران کسی بات پر برہم ہو کر اٹھایا تھا۔ اُس سے پہلے اُس نے اُسے گالیاں دی تھیں... عائشہ عابدی سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی اپنی زندگی کے بارے میں... عائشہ نے جان لیا تھا... اُس کا شوہر بہت اچھا مسلمان تھا لیکن اچھا انسان نہیں تھا اور عائشہ نے اُس کا انتخاب اُس کے اچھے مسلمان ہونے کی وجہ سے کیا تھا، اس دھوکے میں جس میں وہ اُن بہت سارے اچھے مسلمانوں اور انسانوں کی وجہ سے آئی تھی جو منافق اور دور کرنے نہیں تھے۔

وہ ایک مہینہ کے بعد واپس امریکہ چلا گیا تھا لیکن ایک مہینہ میں عائشہ بدل گئی تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب خاندان میں آگئی تھی۔ جو بظاہر تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھا لیکن اندر سے بے حد گھٹن زدہ تھا اور اس گھٹن اور منافقت کا منبع احسن سعد کا باپ تھا اس کا

اندازہ اُسے بہت جلد ہو گیا تھا... احسن صرف اپنے باپ کی copy بن گیا تھا اور اُسے اپنی ماں کی copy بنانا چاہتا تھا جسے وہ ایک آئیڈیل مسلمان عورت سمجھتا تھا... وہ اور اُس کی بہنیں... وہ عائشہ عابدین کو اُن کے جیسا بنانا چاہتا تھا... اور عائشہ عابدین کو بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا وہ ”آئیڈیل مسلم عورتیں“ ”نفسیاتی مسائل کا شکار تھیں، اُس گھر کے ماحول اور سعد کے رویے اور مزاج کی وجہ سے... اُس کی نندوں کے لئے رشتوں کی تلاش جاری تھی، لیکن عائشہ کو یقین تھا جو معیار احسن اور سعد اُن دونوں کے لئے لے کر بیٹھے تھے، ان کے لئے رشتوں کی تلاش اور بھی مشکل ہو جاتی تھی۔

عائشہ شادی کے دو مہینوں کے اندر اندر اُس ماحول سے وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ احسن سعد کا لیا ہوا حلف توڑ کر اپنے نانانانی سے سب کچھ share کرتی اور انہیں کہتی کہ وہ اُسے اس جہنم سے نکال لیں... اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ پریگنٹ تھی... وہ خبر جو اُس وقت اُسے خوش قسمتی لگتی، اُسے اپنی بد قسمتی لگی تھی۔ عائشہ عابدین ایک بار پھر سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو گئی، ایک بار پھر اس اُمید کے ساتھ کہ بچہ اس گھر میں اُس کے سٹیٹس کو بدل دینے والا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم اُس کے اور احسن سعد کے تعلق کو تو... یہ بھی اُس کی خوش فہمی تھی، وہ پریگنٹسی اُس کے لئے ایک اور

پھندہ ثابت ہوا تھا۔ احسن سعد اور اُس کی فیملی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش تک پاکستان میں ہی رہے گی۔ عائشہ نے نو مہینے جتنے صبر اور تحمل کے ساتھ گزارے تھے، صرف وہ ہی جانتی تھی۔ وہ ہاؤس جاب کے بعد جاب کرنا چاہتی تھی لیکن اُس کے سسرال والوں اور احسن کو یہ پسند نہیں تھا اس لئے عائشہ نے اُس پر اصرار نہیں کیا۔ اُس کے سسرال والوں کو عائشہ کا بار بار اپنے ناننانانی کے گھر جانا اور اُن کا اپنے گھر آنا بھی پسند نہیں تھا تو عائشہ نے یہ بات بھی بنا چوں چراں کے مان لی تھی۔ وہ اب کسی سوشل میڈیا فورم پر نہیں تھی کیوں کہ احسن کو خود ہر فورم پر ہونے کے باوجود یہ پسند نہیں تھا کہ وہ وہاں ہو اور اُس کے contacts میں کوئی مرد ہو، چاہے وہ اُس کا کوئی رشتہ دار یا کلاس فیلو ہی کیوں نہ ہو اور عائشہ نے اپنی بہنوں کے اعتراضات کے باوجود اپنی ID ختم کر دی تھی، اُس کے پاس ویسے بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کے اظہر کے لئے اُسے فیس بک کے کسی اکاؤنٹ کی ضرورت پڑتی۔

احسن سعد کی ماں کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے... صبح دیر تک سوتی رہے، عائشہ صبح سویرے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ہر حالت میں لاؤنج میں آجاتی تھی۔ گھر میں ملازم تھے لیکن ساس سسر کی خدمات اُس کی ذمہ داری تھی اور اُسے اس

پر بھی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ کھانا بنانے کی وہ ذمہ داری جو اس سے پہلے تین خواتین میں تقسیم تھی، اب عائشہ کی ذمہ داری تھی اور یہ بھی وہ چیز نہیں تھی جس سے اُسے تکلیف پہنچتی... وہ بہت تیز کام کرنے کی عادی تھی اور نانانانی کے گھر میں بھی وہ بڑے شوق سے اُن کے لئے کبھی کبھار کھانا بنایا کرتی تھی... وہ ذمہ داریوں سے نہیں گھبراتی تھی، تذلیل سے گھبراتی تھی۔ اُس گھر کے افراد ستائش اور حوصلہ افزائی جیسے لفظوں سے نا آشنا تھے... وہ تنقید کر سکتے تھے، تعریف نہیں... یہ صرف عائشہ نہیں تھی جس کی خدمت گزاری کو وہ سراہنے سے قاصر تھے، وہاں کوئی بھی کسی کو سراہتا نہیں تھا۔ وہ اس گھر میں یہ سوال کرتی تو اپنے آپ کو ہی احمق لگتی کہ اُس نے کھانا کیسا بنایا تھا... شروع شروع میں بڑے شوق سے کیے جانے والے ان سوالات کا جواب اُسے بے حد تضحیک آمیز جملوں اور تمسخر سے ملتا تھا، کبھی کبھار اُسے لگتا وہ بھی نفسیاتی ہونا شروع ہو گئی تھی۔

احسن سعد اُس کے لئے ایک ایسا ضابطہ طے کر گیا تھا، وہ غلطی کرے گی تو کاغذ پر لکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرے گی... اللہ سے حکم عدولی کی معافی مانگے گی، پھر اُس شخص سے جس کی اُس نے نافرمانی کی ہو۔

ایک ہفتے میں کم از کم ایک بار عائشہ ایسا ایک معافی نامہ گھر کے کسی نہ کسی فرد کے نام لکھ رہی ہوتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اُسے اندازہ ہوا، وہ معافی نامہ بھی سعد کی ایجاد تھی... احسن سعد اپنا سارا بچپن اپنی غلطیوں کے لئے اپنے باپ کو ایسے معافی نامے لک لکھ کر دیتا رہتا تھا اور اب اپنی بیوی کے گلے میں اُس نے وہی رسی ڈال دی تھی۔

عائشہ پہلے حجاب کرتی تھی، اب وہ نقاب اور دستاں پہننا بھی شروع ہو گئی تھی۔ اُس نے بال کٹوانا چھوڑ دیا تھا، بھنوؤں کی تراش خراش، چہرے کے بالوں کی صفائی، سب کچھ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُس گھر کی عورتیں ان میں سے کوئی کام نہیں کرتی تھیں... وہ آئیڈیل عورتیں تھیں اور عائشہ عابدین کو اپنے آپ کو اُن کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اپنے باہر کو دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالتے ڈھالتے عائشہ عابدین کے اندر کے سارے سانچے ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔

اُس کے نانا نانی اور فیملی کو یہ پتہ تھا کہ اُس کے سسرال والے اچھے لوگ نہیں تھے، لیکن عائشہ اُس گھر میں کیا برداشت کر رہی تھی، اُنہیں اس کا اندازہ نہیں تھا... وہ اُس حلف کو نبھار ہی تھی جو وہ شادی کی پہلی رات لے بیٹھی تھی، کوئی بھی اُس سے ملنے پر اُس سے فون پر بات کرنے پر اُسے کریدتا رہتا عائشہ کے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں ہوتا

تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی اور اُس کی ناخوشی دوسرے کی غلط فہمی تھی اور ان نو مہینوں کے دوران اُس کا اور احسن سعد کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا... وہ شادی پر واپس جانے کے بعد بچے کی پیدائش تک دوبارہ واپس نہیں آیا تھا، ان کے درمیان فون پر اور skype پر بات بھی بہت مختصر ہوتی اور اُس میں تب وقفہ پڑ جاتا جب احسن کے گھر میں کوئی اُس سے خفا ہوتا، وہ امریکہ میں ہونے کے باوجود گھر میں ہونے والے ہر معاملے سے آگاہ رکھا جا رہا تھا، خاص طور پر عائشہ کے حوالے سے۔

عائشہ کو کبھی کبھار لگتا تھا وہ شوہر اور بیوی کا رشتہ نہیں تھا، ایک بادشاہ اور کنیز کا رشتہ تھا۔ احسن سعد کو اُس میں ویسی ہی اطاعت چاہیے تھی اور وہ اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے وہ بیوی بننے کی کوشش کر رہی تھی جو بیوی احسن سعد کو چاہیے تھی۔ اسفند کی پیدائش تک کے عرصے میں عائشہ عابدین کچھ کی کچھ ہو چکی تھی۔ جس گھٹن میں وہ جی رہی تھی، اُس گھٹن نے اس کے بچے کو بھی متاثر کیا تھا... اُس کا بیٹا اسفند نارمل نہیں تھا۔ یہ عائشہ عابدین کا ایک اور بڑا گناہ تھا۔

اول آفس سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پروٹوکول آفیسر کی رہنمائی میں

داخل ہوتے ہوئے سالار سکندر کے انداز میں اُس جگہ سے واقفیت کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔ وہ بڑے مانوس انداز میں چلتے ہوئے وہاں آیا تھا اور اُس کے بعد ہونے والے تمام ”rituals“ سے بھی وہ واقف تھا۔ وہ یہاں کئی بار آچکا تھا... کئی وفود کا حصہ بن کر... لیکن یہ پہلا موقع تھا جب وہ وہاں تنہا بلا یا گیا تھا۔

اُسے بٹھانے کے بعد وہ آفیسر اندرونی دروازے سے غائب ہو گیا تھا... وہ پندرہ منٹ کی ایک ملاقات تھی جس کے بلٹ پوائنٹس وہ اس وقت ذہن میں دہرا رہا تھا، وہ امریکہ کے بہت سارے صدور سے مل چکا، لیکن جس صدر سے وہ اُس وقت ملنے آیا تھا... ”خاص“ تھا... کئی حوالوں سے۔

وال کلاک پر ابھی 9:55 ہوئے تھے... صدر کے اندر آنے میں پانچ منٹ باقی تھے... اُس سے پہلے 9:56 پر ایک ویٹر اُس کو پانی serve کر کے گیا تھا... اُس نے گلاس اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ 9:57 پر ایک اور اٹینڈنٹ اُسے کافی سرو کرنے آیا تھا۔ اُس نے منع کر دیا۔ 9:59 پر اول آفس کا دروازہ کھلا اور صدر کی آمد کا اعلان ہوا... سالار اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اول آفس کے دروازے سے اُس کمرے میں آنے والا صدر امریکہ کی تاریخ کا کمزور

ترین صدر تھا... وہ 2030 کا امریکہ تھا... بے شمار اندرونی اور بیرونی مسائل سے دوچار ایک کمزور ملک... جس کی کچھ ریاستوں میں اس وقت خانہ جنگی جاری تھی... کچھ دوسری میں نسلی فسادات... اور ان سب میں وہ امریکہ کا وہ پہلا صدر تھا جس کی کیبنٹ اور تھنک ٹینکس میں مسلمانوں اور یہودیوں کی تعداد اب برابر ہو چکی تھی، اُس کی policies کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ بھی اندرونی خلفشار کا شکار تھی... لیکن یہ وہ مسائل نہیں تھے جن کی وجہ سے امریکہ کا صدر اُس سے ملاقات کر رہا تھا۔

امریکہ اپنی تاریخ کے سب سے بڑے مالیاتی اور بینکنگ بحران کے دوران اپنی بین الاقوامی پوزیشن اور ساکھ کو بچانے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہا تھا اور SIF کے سربراہ سے وہ ملاقات اُن ہی کوششوں کا ایک حصہ تھی... اُن آئینی ترامیم کے بعد جو امریکہ کو اپنے ملک کی economy کو مکمل طور پر ڈوبنے سے بچانے کے لئے کرنی پڑی تھیں۔

اپنی تاریخ کے اس سب سے بڑے مالیاتی بحران میں جب امریکہ کی سٹاک ایکسچینج کریش کر گئی تھی... اُس کے بڑے مالیاتی ادارے دیوالیہ ہو رہے تھے... ڈالر کی مسلسل گرتی ہوئی ویلیو کو کسی ایک جگہ روکنا مشکل ہو گیا تھا اور امریکہ کو تین مہینے کے دوران

تین بار اپنی کرنسی کو استحکام دینے کے لئے اُس کی ویلیو خود کم کرنی پڑی تھی... صرف ایک ادارہ تھا جو اس مالیاتی بحران کو جھیل گیا تھا... لڑکھڑانے کے باوجود وہ امریکہ کے بڑے مالیاتی اداروں کی طرح زمین بوس نہیں ہوا تھا نہ ہی اس نے ڈاؤن سائزنگ کی تھی نہ بیل آؤٹ پیکیجز مانگے تھے... اور وہ SIF تھا... پندرہ سال میں وہ ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے طور پر اپنی شاندار ساکھ اور نام بنا چکا تھا اور امریکہ اور بہت سے دوسرے چھوٹے ملکوں میں وہ بہت سے چھوٹے بڑے اداروں کو mergers کے ذریعے اپنی چھتری تلے لا چکا تھا اور وہ چھتری مغربی مالیاتی اداروں کی شدید مخالفت اور مغربی حکومتوں کے سخت ترین امتیازی قوانین کے باوجود پھیلتی چلی گئی تھی... پندرہ سالوں میں SIF نے اپنی survival اور ترقی کے لئے بہت ساری جنگیں لڑی تھیں اور ان میں سے ہر جنگ چوکھی تھی لیکن SIF اور اُس سے منسلک افراد ڈٹے رہے تھے اور پندرہ سال کی اس مختصر مدت میں مالیاتی دنیا کا ایک بڑا مگر مچھاب SIF بھی تھا جو اپنے بقا کے لئے لڑی جانے والی ان تمام جنگوں کے بعد اب بے حد مضبوط ہو چکا تھا... امریکہ، یورپ اور ایشیا اُس کی بڑی مارکیٹس تھیں لیکن یہ افریقہ تھا جس پر SIF مکمل طور پر قابض تھا... وہ افریقہ جس میں کوئی گورا 2030 میں SIF کے بغیر کوئی مالیاتی ٹرانزیکشن کرنے کا تصور بھی نہیں

کر سکتا تھا... افریقہ SIF کے ہاتھ میں نہیں تھا، سالار سکندر کے ہاتھ میں تھا جسے افریقہ اور اُس کے leaders نام اور چہرے سے پہچانتے تھے... پچھلے پندرہ سالوں میں صرف سالار کا ادارہ وہ واحد ادارہ تھا جو افریقہ کے کئی ممالک میں بدترین خانہ جنگی کے دوران بھی کام کرتا رہا تھا اور اُس سے منسلک وہاں کام کرنے والے سب افریقی تھے اور SIF کے mission statement پر یقین رکھنے والے... جو یہ جانتے تھے جو کچھ SIF ان کے لئے کر رہا تھا، اور کر سکتا تھا وہاں دنیا کا کوئی اور مالیاتی ادارہ نہیں کر سکتا تھا۔ SIF افریقہ میں ابتدائی دور میں کئی بار نقصان اٹھانے کے باوجود وہاں سے نکلا نہیں تھا، وہ وہاں جما اور ڈٹا رہا تھا اور اُس کی وہاں بقا کی بنیاد ہی وجہ سود سے پاک وہ مالیاتی نظام تھا جو وہاں کی لوکل انڈسٹری اور انڈسٹریل سٹریسٹس کو نہ صرف سود سے پاک قرضے دے رہا تھا بلکہ انہیں اپنے وسائل سے اُس انڈسٹری کو کھڑا کرنے میں انسانی وسائل بھی فراہم کر رہا تھا۔

پچھلے پندرہ سالوں میں SIF کی افریقہ میں ترقی کی شرح ایک سٹیج پر اتنی بڑھ گئی تھی کہ بہت سے دوسرے مالیاتی اداروں کو افریقہ میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے SIF کا سہارا لینا پڑا تھا۔

سالار سکندر سیاہ فاموں کی دُنیا کا بے تاج بادشاہ تھا اور اُس کی یہ پہچان بین الاقوامی تھی افریقہ کے مالیاتی نظام کی کنجی SIF کے پاس تھی اور سالار سکندر کے اُس دن وائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ امریکہ ورلڈ بینک کو دیے جانے والے فنڈز میں اپنا حصہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور ورلڈ بینک کو فنڈز کی فراہمی میں ناکام رہنے کے بعد اُس سے سرکاری طور پر علیحدگی اختیار کر رہا تھا... ورلڈ بینک اُس سے پہلے ہی ایک مالیاتی ادارے کے طور پر بُری طرح لڑ کھڑا رہا تھا... یہ صرف امریکہ نہیں تھا جو مالیاتی بحران کا شکار تھا، دُنیا کے بہت سے دوسرے ممالک بھی اسی کساد بازاری کا شکار تھے اور اس افراتفری میں ہر ایک کو صرف اپنے ملک کی اکانومی کی پروا تھی، اقوام متحدہ سے منسلک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کی اقتصادیات پر قابض رہنا اب نہ صرف ناممکن ہو گیا تھا بلکہ دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آئے ہوئے مالیاتی بحران کے بعد اب یہ بے کار بھی ہو گیا تھا...

ورلڈ بینک اب وہ سفید ہاتھی تھا جس سے وہ ساری استعماری قوتیں جان چھڑانا چاہتی تھیں اور کئی جان چھڑا چکی تھیں۔ اقوام متحدہ کا وہ چارٹر جو اپنے ممبران کو ورلڈ بینک کے ادرے کو فنڈز فراہم کرنے کا پابند کرتا تھا، اب ممبران کے عدم تعاون اور عدم

دلچسپی کے باعث کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اقوام متحدہ اب وہ ادارہ نہیں رہا تھا جو بین الاقوامی برادری کو سینکڑوں سالوں سے چلنے والے ایک ہی مالیاتی نظام میں پروئے رہنے پر مجبور کر سکتا... دُنیا بدل چکی تھی اور گھڑی کی سوئیوں کی رفتار کے ساتھ مزید بدلتی جا رہی تھی اور اس رفتار کو روکنے کی ایک آخری کوشش کے لئے امریکہ کے صدر نے SIF کے سربراہ کو وہاں بلا یا تھا۔

ایوان ہائکنز نے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنے اپنے اُس پرانے حریف کو ایک خیر مقدمی مسکراہٹ دینے کی کوشش کی جو اُس کے استقبال کے لئے مودبانہ اور بے حد باوقار انداز میں کھڑا تھا... سیاست میں آنے سے پہلے ایوان ایک بڑے مالیاتی ادارے کا سربراہ رہ چکا تھا، سالار سکندر کے ساتھ اُس کی سالوں پرانی واقفیت بھی تھی اور رقابت بھی SIF... نے امریکہ میں اپنی تاریخ کا پہلا بڑا merger اُس کے ادارے کو کھا کر کیا تھا، اور اُس merger کے بعد ایوان کو اپنے عہدے سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ وہ آج امریکہ کا صدر تھا لیکن وہ ناکامی اور بدنامی آج بھی اُس کے portfolio میں ایک داغ کے طور پر موجود تھی۔ یہ ایوان کی بد قسمتی تھی کہ اتنے سالوں کے بعد وہ اُسی پرانے حریف کی مدد لینے پر ایک بار پھر مجبور ہوا تھا... وہ اُس

کے دورِ صدارت میں اُسے دھول چٹانے آن پہنچا تھا... یہ اُس کی کیفیات تھیں... سالار کی نہیں... وہ وہاں کسی اور ایجنڈے کے ساتھ آیا تھا... اُس کا ذہن کہیں اور پھنسا ہوا تھا۔

”سالار سکندر...“ چہرے پر ایک گرم جوش مسکراہٹ کا نقاب چڑھائے ایوان نے سالار کا استقبال تیز رفتاری سے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے یوں کیا تھا جیسے وہ حریف نہیں رہے تھے... بہترین دوست تھے جو وائٹ ہاؤس میں نہیں کسی گالف کورس پر مل رہے تھے۔ سالار نے اُس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کا جواب بھی اتنی ہی خوش دلی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے دیا تھا۔ دونوں کے درمیان رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا... موسم کے بارے میں ایک آدھ بات ہوئی، جو اچھا تھا اور اُس کے بعد دونوں اپنی اپنی نشست سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ one on one ملاقات تھی، کمرے کے دروازے

اب بند ہو چکے تھے اور وہاں اُن دونوں کا سٹاف نہیں تھا اور اس one on one ملاقات کے بعد اُن دونوں کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس تھی جس کے لئے اس کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک اور کمرے میں دنیا بھر کے صحافی بے تابی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ملاقات سے پہلے اُن دونوں کی ٹیم کے افراد کئی بار آپس میں مل چکے تھے، ایک فریم ورک وہ ڈسکس بھی کر چکے تھے اور تیار بھی... اب اس ملاقات کے بعد

باضابطہ طور پر وہ دونوں وہ اعلان کر رہے تھے جس کی بھنک میڈیا کو پہلے ہی مل چکی تھی۔

امریکہ اب ورلڈ بینک کے ذریعے نہیں SIF کے ذریعے دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں گھسنا چاہتا تھا، خاص طور پر افریقہ میں اور اس کے لئے وہ ورلڈ بینک سے باضابطہ علیحدگی اختیار کر رہا تھا... مگر اُس کے سامنے مسئلہ صرف ایک تھا، امریکہ کا ایجنڈا SIF کے ایجنڈے سے مختلف تھا اور اس ملاقات میں سالار سکندر کو ایک بے حد informal انداز میں ایک آخری بار ان امریکی مفادات کے تحفظ کی یاد دہانی کروانی تھی... امریکہ SIF کی ٹیم کے بہت سارے مطالبات مان کر اُس فریم ورک پر تیار ہوا تھا۔ یہ وہ امریکہ نہیں رہا تھا جو بندوق کی نوپر کسی سے بھی کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ یہ انتشار کا شکار ایک کھوکھلا ہوتا ہوا ملک تھا جو بات سُنتا تھا... مطالبات مانتا تھا اور اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹ جاتا تھا... یا پھر آخری حربے کے طور پر اپنے مفادات کی خاطر وہ کرتا تھا جو اس بار بھی اس میٹنگ کے اچھے یا بُرے نتیجے کے ساتھ پہلے سے مشروط تھا۔

میٹنگ کا نتیجہ ویسا ہی نکلا تھا جیسا ایوان کو توقع تھی۔ سالار سکندر کو SIF کے

ایجنڈے کے حوالے سے کوئی ابہام نہیں تھا، نہ ہی امریکی حکومت کے ایجنڈے کے حوالے سے... وہ امریکی حکومت کی مدد کرنے پر تیار تھا... اُس فریم ورک کے تحت جو اُس کی ٹیم نے تیار کیا تھا لیکن SIF کو امریکہ کا ترجمان بنانے پر تیار نہیں تھا۔ اُس نے ایوان کی تجویز کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا تھا... دو مگر مچھوں کے درمیان دشمنی ہو سکتی تھی، دوستی نہیں... مگر دشمنی کے ساتھ بھی وہ ایک ہی پانی میں رہ سکتے تھے بڑے محتاط اور پُر امن طریقے سے... اپنی اپنی حدود میں... اور اُس نے ایوان کو بھی یہی مشورہ دیا تھا جس سے ایوان نے اتفاق کیا تھا... سالار سکندر سے انہیں جیسے جواب کی توقع تھی، انہیں ویسا جواب ہی ملا تھا۔

SIF کو اب ایک نئے سربراہ کی ضرورت تھی، جو زیادہ ”flexible“ ہوتا... اور زیادہ سمجھدار بھی... سالار سکندر میں ان دونوں چیزوں کی اب کچھ کمی ہو گئی تھی... یہ ایوان کا اندازہ تھا۔

CIA کو SIF کے نئے سربراہ کے بارے میں تجاویز دینے سے پہلے SIF کے پرانے سربراہ کو ہٹانے کے لئے احکامات دے دیئے گئے تھے اور یہ اس میٹنگ کے بعد ہوا تھا۔

اُس سے پہلے ایوان نے سالار سکندر کے ساتھ اُس پریس کانفرنس میں شرکت کی تھی جس میں امریکہ نے باقاعدہ طور پر ملک میں ہونے والے مالیاتی کرائسٹس سے ہٹنے کے لئے نہ صرف SIF کی مدد لینے کا اعلان کیا تھا بلکہ SIF کے ساتھ طے پانے والے اس فریم ورک کا بھی اعلان کیا تھا جس کی منظوری صدر نے بے حد دباؤ کے باوجود دے دی تھی۔

ایوان ہائیکورٹ کو اس اعلان کے وقت ویسی ہی تضحیک محسوس ہو رہی تھی جیسی اُس نے اُس وقت محسوس کی تھی جب اُس کے مالیاتی ادارے کا merger ، SIF کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے بعد وہ اپنے عہدے سے فارغ ہو گیا تھا، اُسے یقین تھا تاریخ اس بار اپنے آپ کو کچھ مختلف طریقے سے دہرانے والی تھی... اس دفعہ سکرین سے غائب ہونے والا اُس کا پرانا حریف تھا، وہ نہیں۔

رئیسہ سالار کی زندگی پر اگر کوئی کتاب لکھنے بیٹھتا تو یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ خوش قسمت تھی، جس کی زندگی میں آتی تھی اُس کی زندگی بدلنا شروع کر دیتی تھی۔ وہ جیسے پارس پتھر جیسا وجود رکھتی تھی، جو اُس سے چھو جاتا، سونا بننے لگتا۔

سالار سکندر کے خاندان کا حصہ بننے پر بھی وہ اُن کی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں لے آئی تھی اور اب ہشام سے منسلک ہونے کے بعد اس کی زندگی کے اُس خوش قسمتی کے دائرے نے ہشام کو بھی اپنے گھیراؤ میں لینا شروع کر دیا تھا۔

بحرین میں ہونے والے اُس طیارے کے حادثے میں امیر سمیت شاہی خاندان کے کچھ افراد ہلاک نہیں ہوئے تھے، وہ دراصل بحرین کی بادشاہت کے حصہ داروں کی ہلاکت تھی۔ پیچھے رہ جانے والا ولی عہد بے حد نوجوان، نا تجربہ کار اور عوام سے بہت دور تھا اور اُس حلقے میں بے حد ناپسندیدہ تھا جو امیر کا حلقہ تھا۔

ہشام کے باپ صباح بن جراح کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ امیر اور شاہی خاندان کے افراد کی تدفین کی تقریبات میں شرکت کے لئے جب بحرین پہنچے گا تو بادشاہت کا ہمارا اُس کے سر پر آن بیٹھے گا۔ بحرین کی کونسل کے ایک ہنگامی اجلاس میں ولی عہد کو برطرف کرتے ہوئے بادشاہت کی فہرست میں بہت نیچے کے نمبر پر براجمان صباح کو اکثریتی تائید سے بحرین کا نیا امیر نامز کر دیا گیا تھا... اس عہدے پر اُسے وقتی طور پر فائز کیا گیا تھا، مگر اگلے چند ہفتوں میں کونسل نے اس حوالے سے حتمی فیصلہ بھی کر دیا تھا۔ ولی عہد کی نامزدگی کونسل کے اگلے اجلاس تک کے لئے ملتوی کر دی گئی

تھی۔

یہی وہ خبر تھی جو رینے کو حمین نے سنائی تھی۔ خبر اتنی غیر متوقع اور ناقابل یقین تھی کہ رینے کو بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن جب اُسے یقین آیا تو وہ ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔

”اور اب بُری خبر کیا ہے؟ وہ بھی سنا دو۔“ اُس نے حمین سے پوچھا۔ ہشام اور تمہاری شادی میں اب بہت ساری رکاوٹیں آئیں گی... صرف اُس کے خاندان کی طرف سے نہیں، پورے شاہی خاندان کی طرف سے۔“ حمین نے اُسے بنا کسی تمہید کے کہا۔ وہ فکر مند ہونے کے باوجود خاموش ہو گئی تھی۔

ہشام سے اُس کی ملاقات امریکہ واپسی کے دوسرے دن ہی ہو گئی تھی۔ وہ ویسا ہی تھا...

بے فکر!... لاپروا!... اپنے باپ کے بدلے جانے والے سٹیٹس کے بارے میں زیادہ دلچسپی نہ دکھاتا ہوا۔ اُس کا خیال تھا، اُس کے باپ کو ملنے والا وہ عہدہ وقتی تھا... چند ہفتوں کے بعد کو نسل اُس کے باپ کی جگہ شاہی خاندان کے اُن افراد میں سے کسی کو اس عہدے پر فائز کرے گی جو جانشینی کی دوڑ میں اُس کے باپ سے اوپر کے نمبر پر تھے۔

”تم نے اپنی فیملی سے بات کی؟“ اُس نے چھوٹے ہی رینے سے وہ سوال کیا تھا جس

کے حوالے سے وہ فکر مند تھی۔

”حمین سے بات ہوئی میری اور حمین نے بابا سے بھی بات کی ہے، لیکن بابا کو ہمارے حوالے سے پہلے ہی کچھ اندازہ تھا... انہوں نے کہا ہے وہ مجھ سے اس ایشوپر آمنے سامنے بات کریں گے... لیکن حمین تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ ریسہ نے اسے بریف کیا تھا۔

حمین ہشام سے چند بار سرسری انداز میں پہلے بھی مل چکا تھا، لیکن یہ پہلی بار تھا کہ حمین نے خاص طور پر اُس سے ملنے کی فرمائش کی تھی۔

”مل لیتا ہوں... میں تو اتنا مصروف نہیں رہتا... وہ رہتا ہے... تم اُس سے coordinate کر لو کہ کب ملنا چاہے گا؟“ ہشام نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اُس سے کہا تھا۔

”تمہاری فیملی کو میری adoption کا پتہ ہے؟“ اس بار ریسہ نے بالآخر اُس سے وہ سوال کیا تھا جو بار بار اُس کے ذہن میں آرہا تھا۔

”نہیں میری کبھی اُن سے اس حوالے سے بات نہیں ہوئی... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“ ہشام اُس کی بات پر چونکا تھا۔

”اُنہیں اعتراض تو نہیں ہوگا کہ میں adopted ہوں؟“

”کیوں اعتراض ہوگا...؟ میرا نہیں خیال کہ میرے پیرنٹس اتنے تنگ نظر ہیں کہ اس طرح کی باتوں پر اعتراض کریں گے۔“ ہشام نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔ ”میں اپنے والدین کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اُس نے ریسہ سے کہا تھا۔

حمین سے اُس کی ملاقات دو ہفتے بعد طے ہوئی تھی مگر اُس سے پہلے ہی ہشام کو ایک بار پھر ایمر جنسی میں بحرین بلا لیا گیا تھا۔ اُس کے باپ کی کونسل نے متفقہ فیصلے سے امیر کے طور پر توثیق کر دی تھی اور ہشام بن صباح کو بحرین کا نیا ولی عہد نامزد کر دیا گیا تھا۔ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ہشام کو بحرین بلا لیا گیا تھا اور وہاں پہنچنے پر یہ خبر ملنے پر اُس نے سب سے پہلے فون پر ریسہ کو یہ اطلاع دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ ریسہ چاہتے ہوئے بھی خوش نہیں ہو سکی... وہ ایک ”عام آدمی“ سے یک دم ایک ”خاص آدمی“ ہو گیا تھا... حمین کی باتیں اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ہشام بہت جلدی میں تھا، اُن دونوں کے درمیان صرف ایک آدھ منٹ کی گفتگو ہو سکی تھی۔ فون بند ہونے کے بعد ریسہ کے لئے سوچ کے بہت سارے درکھل گئے تھے، وہ fairy tales پر یقین نہیں کرتی تھی کیونکہ اُس نے جس فیملی میں پرورش پائی تھی وہاں

کوئی fairy tale نہیں تھی... وہاں اتفاقات اور انقلابات نہیں تھے... کیریز، زندگی، نام سب محنت سے بنائی جا رہی تھیں اور ریسہ سالار کو اپنے سامنے نظر آنے والی وہ fairy tale بھی ایک سراب لگ رہی تھی۔

وہ ایک عرب امریکن سے شادی کرنا چاہتی تھی، ایک عرب بادشاہ سے نہیں... اُسے luxuries کی خواہش نہیں تھی اور اُس کی زندگی کے مقاصد اور تھے... اور چند دن

پہلے تک اُس کے اور ہشام کی زندگی کے مقاصد ایک جیسے تھے... اب وہ لمحہ بھر میں ریل کی پٹری پر جانے والے دو ٹریک بنے ہوئے تھے... مخالف سمت میں جانے والے ایک دوسرے ٹریک ہو گئے تھے۔

وہ بہت غیر جذباتی ہو کر اب حمین کی اُس گفتگو کو یاد کر رہی تھی جو اُس نے ہشام کے حوالے سے کی تھی اور وہ تب کی تھی جب ہشام ولی عہد نہیں بنا تھا... اُسے اب جاننا تھا کہ حمین ہشام کے بارے میں اب کیا سوچتا تھا۔

ہشام کے حوالے سے یہ خبر بھی حمین نے ہی اُسے اُس رات دی تھی جب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ایک کانفرنس اٹینڈ کرنے کے لئے Montreal میں تھا۔

”میں جانتی ہوں۔“ اُس نے جو اب اسٹیکسٹ کیا ”مجھے مبارک باد دینی چاہیے یا افسوس

کرنا چاہیے؟ ”جوابا ٹیکسٹ آیا تھا۔ وہ اُس کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ مسکرا دی۔“

تمہاری رائے کیا ہے؟ ”اُس نے جواباً پوچھا

”افسوسناک خبر ہے“

”جانتی ہوں۔“ اُس نے حمین کے ٹیکسٹ پر اتفاق کیا۔

جوابا اُس کی کال آنے لگی تھی۔

”اتنا بھی اپ سیٹ ہونے والی بات نہیں ہے۔“ حمین نے ہیلو سنتے ہی بڑے خوشگوار

لہجہ میں اُس سے کہا تھا۔ وہ اُس کی آواز کا ہر انداز پہچانتا تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”میں اپ سیٹ تو نہیں ہوں... بس یہ سب غیر متوقع ہے اس لئے...“ ریسہ نے بات

ادھوری چھوڑ دی۔

”میرے لئے غیر متوقع نہیں ہے یہ، مجھے اندازہ تھا اس کا۔“ اُس نے جواباً کہا تھا۔

”تو پھر اب...؟“ ریسہ نے ایک بار پھر ادھورے جملے میں اُس سے مسئلے کا حل پوچھا۔

”تم نے کہا تھا تم اس پر پوزل کے حوالے سے بہت زیادہ جذباتی نہیں ہو۔“ حمین

نے اطمینان سے لمحہ بھر میں تصویر کا سیاہ ترین پہلو اُسے دکھایا یعنی ہشام کو بھول جانے

کا مشورہ دیا۔

”You really think so?“ ریسہ کو جیسے یقین نہیں آیا ”تمہیں لگتا ہے

میری اور اُس کی شادی نہیں ہو سکتی؟“

”ہو سکتی ہے لیکن اُس کی شادی صرف تمہارے ساتھ ہو اور تمہارے ساتھ ہی رہے،

یہ میرے لئے زیادہ بڑا مسئلہ ہے... عرب بادشاہ ”حرم“ رکھتے ہیں... ”حمین نے اُسے

جتایا تھا... تصویر کا ایک اور رُخ اُسے دکھایا جو اُس نے ابھی دیکھنا شروع بھی نہیں کیا

تھا۔

NEW ERA MAGAZINE

Novel | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

”میں جانتی ہوں۔“ اُس نے مدہم آواز میں کہا، پھر اگلے ہی جملے میں جیسے اُس کا دفاع

کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن ہشام کے باپ نے شاہی خاندان کا حصہ ہوتے ہوئے

بھی کبھی دوسری شادی نہیں کی۔“

”وہ امریکہ میں سفیر رہے... بادشاہ کبھی نہیں رہے۔“ حمین نے ترکی بہ ترکی کہا۔

دونوں کے درمیان اب خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آ گیا تھا۔

”So it’s all over?“

اُس نے بالآخر حمین سے پوچھا۔ حمین کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ پہلی محبت تھی جو اُس نے کبھی نہیں کی تھی، مگر اُس نے پہلی محبت کا انجام بہت بار دیکھا تھا لیکن اب رنیسہ کو اُس انجام سے دوچار ہوتے دیکھ کر اُسے دلی تکلیف ہوئی تھی۔

”تمہارا دل تو نہیں ٹوٹے گا؟“ وہ بے حد فکر مند انداز میں اُس سے پوچھ رہا تھا۔ رنیسہ کا دل بھر آیا۔

”ٹوٹے گا... لیکن میں برداشت کر لوں گی۔“ رنیسہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی آنکھوں میں آئی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔

حمین کا دل اور پگھلا ”ساری دُنیا میں تمہیں یہی ملا تھا...؟“ اُس نے دانت پیستے ہوئے رنیسہ سے کہا تھا۔

”مسئلہ شادی نہیں ہے رنیسہ، مسئلہ آئندہ کی زندگی ہے... کوئی گارنٹی نہیں ہے اس رشتے میں...“ حمین نے ایک بار پھر اُس کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود جیسے اُس کا دکھ کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی، کال ختم ہو گئی تھی۔ مگر ہشام نہ رنیسہ کے ذہن سے نکلا تھا نہ ہی حمین کے۔

اگلے دن کے اخبارات نہ صرف بحرین کے نئے امیر اور ولی عہد کے بارے میں
تصویروں اور خبروں سے بھرے ہوئے تھے بلکہ اُن خبروں میں ایک خبر نئے علی
عہد ہشام بن صباح کی منگنی کی بھی تھی، جو بحرین کے ہلاک ہونے والے امیر کی نواسی
سے طے پارہی تھی۔ وہ خبر حمین اور ریسہ دونوں نے پڑھی تھی اور دونوں نے ایک
دوسرے سے شیئر نہیں کی تھی۔

”کوئی تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ وہ اگلی صبح تھی... ساری رات لاک اپ میں جاگتے رہنے
کے بعد وہ ناشتہ کے بعد کافی کا ایک کپ ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی جب ایک آفیسر نے
لاک اپ کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک کارڈ اُس کے ہاتھ میں تھمایا اور کارڈ پر لکھا ہوا نام
دیکھ کر عائشہ عابدین کا دل چاہا تھا وہاں کوئی سوراخ ہوتا تو وہ اُس میں گھس کر چھپ
جاتی۔ پتہ نہیں اُس شخص کے سامنے اُسے اب اور کتنا ذلیل ہونا تھا... دُنیا سے غائب
ہو جانے کی خواہش اُس نے زندگی میں کتنی بار کی تھی، لیکن شرم کے مارے اُس نے
پہلی بار کی تھی۔

وہ پولیس آفیسر کے ساتھ وہاں آئی تھی جہاں وہ ایک اٹارنی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اُس

کی رہائی کے لئے کاغذات لئے جس پر اب صرف اُس کے signatures ہونے تھے۔

جبریل اور اُس کے درمیان رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا... ایک دوسرے سے نظریں ملائے بغیر... پھر اُس اٹارنی سے اُس کی بات چیت شروع ہوئی تھی... کاغذات... دستخط... اور پھر اسے رہائی کی نوید دے دی گئی تھی۔

بے حد خاموشی کے عالم میں وہ دونوں بارش کی ہلکی پھوار میں پولیس سٹیشن سے باہر پارکنگ میں گاڑی تک آئے تھے۔

”میں بہت معذرت خواہ ہوں... میری وجہ سے بار بار آپ کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، نساء کو آپ کو فون نہیں کرنا چاہیے تھا... میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتی... یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔“

گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر اُس کے برابر بیٹھی عائشہ نے پہلی بار اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بے حد شائستگی سے جبریل کی طرف دیکھے بغیر اُسے مخاطب کیا تھا۔

جبریل نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔ اُس کے جملے میں وہ آخری بات نہ ہوتی تو وہ نساء

کی اس بات کو کبھی یقین نہیں کرتا کہ وہ mentally upset تھی... وہ اپنے خلاف parental negligence کے تحت فائل ہونے والے قتل کے ایک الزام کو معمولی بات کہہ رہی تھی۔

”آپ نے کچھ کھایا ہے؟“ جبریل نے جو اب بڑی نرمی سے اُس سے پوچھا تھا۔ عائشہ نے سر ہلادیا۔ وہ اب اُسے بتانے لگی تھی کہ وہ کسی قریبی بس سٹاپ یا ٹرین سٹیشن پر اُسے ڈراپ کر دے تو وہ خود گھر پہنچ سکتی تھی۔ جبریل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اُس کی ہدایات سنیں اور ٹھیک ہے کہہ دیا... مگر وہ وہاں نہیں رُکا تھا جہاں وہ اُسے ڈراپ کرنے کے لئے کہہ رہی تھی، وہ سیدھا اُس کے گھر پہنچ گیا تھا... اُس بلڈنگ کے سامنے جہاں اس کا اپارٹمنٹ تھا، عائشہ نے اُس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اُسے اُس کے گھر کا ایڈریس کیسے پتہ تھا۔ وہ اُس کا شکر یہ ادا کر کے گاڑی سے اترنے لگی تو جبریل نے اُس سے کہا۔

”کافی کا ایک کپ مل سکتا ہے؟“ وہ ٹھٹھکی اور اُس نے پہلی بار جبریل کا چہرہ دیکھا۔

”گھر پر کافی ختم ہو چکی ہے، میں کچھ ہفتوں سے گروسری نہیں کر سکی۔“ اُس نے کہتے ہوئے دوبارہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

”میں چائے بھی پی لیتا ہوں۔“ جبریل نے اُسے پھر روکا۔

”میں چائے نہیں پیتی اس لئے لاتی بھی نہیں۔“ عائشہ نے اس بار اُسے دیکھے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

”پانی تو ہو گا آپ کے گھر؟“ جبریل اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور اُس نے گاڑی کی چھت کے اوپر سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس بار عائشہ اُسے صرف دیکھتی رہی تھی۔

اُس کا اپارٹمنٹ اس قدر صاف ستھر اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی جبریل چند لمحوں کے لئے ٹھٹھک گیا تھا، جن حالات کا وہ شکار تھی، وہ وہاں کسی اور طرح کا منظر دیکھنے کی توقع کر رہا تھا۔

”آپ کی aesthetics بہت اچھی ہے۔“ وہ عائشہ سے کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ عائشہ نے جو اباً کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اپنا لونگ کوٹ اُتارتے اور دروازے کے پیچھے لٹکاتے ہوئے وہ لاؤنج میں سیدھا پکن ایریا کی طرف گئی، کچھ بھی کہے بغیر اُس نے ایک کیبنٹ کھول کر کافی کا جار نکال لیا تھا اور پھر پانی گرم کرنے لگی تھی۔

جبریل لاؤنج میں کھڑا اُس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا، جہاں آنے والا کوئی شخص بھی یہ جان جاتا کہ اُس گھر میں ایک بچہ تھا جو اُس گھر میں رہنے والوں کی زندگی کا محور تھا۔

لاؤنج میں بنے play area میں اسفند کے کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ عائشہ اور اُس کی تصویریں... جبریل نے نظریں چرائی تھیں... پتہ نہیں اس guilt کو وہ کیا کہتا اور اس کا کیا کرتا جو بار بار عائشہ عابدین کے بچے کے حوالے سے اُسے ہوتا تھا۔ اُس نے مڑ کر عائشہ کو دیکھا تھا، وہ بے حد میکانکی انداز میں اُس کے لئے کافی کا ایک کپ تیار کر رہی تھی، یوں جیسے وہ کوئی waitress تھی... پورے انہماک سے ایک ایک چیز کو ٹرے میں سجاتے اور رکھتے ہوئے باقی ہر چیز سے بے خبر... اس چیز سے بھی کہ وہاں جبریل بھی تھا۔

وہ اب کافی کی ٹرے لے کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر کافی کے ایک کپ کی وہ ٹرے رکھتے ہوئے وہ کچھ کہے بغیر صوفہ پر بیٹھ کر اُس سے پوچھنے لگی ”Sugar?“

”مجھے کافی کڑوی نہیں لگتی۔“ جبریل اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”Milk? Cream?“ عائشہ نے شوگر پاٹ چھوڑتے ہوئے باقی دو چیزوں کے بارے میں پوچھا جو ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں۔

”یہ بھی نہیں... مجھے کچھ دیر میں ہاسپٹل کے لئے نکلنا ہے۔“ جبریل نے اب مزید کچھ کہے بغیر وہ کپ اٹھالیا تھا جو عائشہ نے میز پر اُس کی طرف بڑھایا تھا۔ اُس نے بڑی خاموشی کافی پی... کپ دوبارہ میز پر رکھا اور پھر اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے اُس سے کہا۔

”اسے آپ میرے جاننے کے بعد کھولیں... پھر اگر کوئی سوال ہو تو میرا نمبر یہ ہے۔“ اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میز پر اُسی لفافے کے پاس رکھ دیا۔

”حالانکہ میں جانتا ہوں آپ سوال نہیں کرتیں... مجھے فون بھی نہیں کریں گی... اس کے باوجود مجھے اسے پڑھنے کے بعد آپ کے کسی سوال کا انتظار رہے گا۔“ عائشہ نے خاموشی سے میز پر پڑے اُس لفافے اور کارڈ کو دیکھا پھر سر اٹھا کر کھڑے جبریل کو... دُنیا میں ایسی تمیز اور تہذیب والے مرد کہاں پائے جاتے ہیں... اُس نے سامنے کھڑے مرد کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور اگر پائے جاتے تھے تو اُن میں سے کوئی اُس کا نصیب کیوں نہیں بناتا تھا... وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

جبریل کو اپارٹمنٹ کے دروازے پر چھوڑ کر آنے کے بعد اُس نے اپنے اپارٹمنٹ کی

کھڑکی سے جھانک کر پارکنگ کو دیکھا جہاں وہ ابھی کچھ دیر میں نمودار ہوتا اور پھر وہ نمودار ہوا تھا اور وہ تب تک اُسے دیکھتی رہی جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا نہیں گیا۔

پھر وہ میز پر پڑے اُس لفافے کی طرف آئی تھی... اُس سفید لفافے کو اُس نے اٹھا کر دیکھا جس پر اُس کا نام جبریل کی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا۔

Ms Aisha Abedeen



کاغذ کی اس چٹ پر احسن سعد کا نام اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ریسپشن سے جبریل کو بتایا گیا تھا کہ وہ شخص کئی بار اُسے کال کر چکا تھا اور ایمر جنسی میں اُس سے بات کرنا یا ملنا چاہتا تھا۔ جبریل اُس وقت چھ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں گزارنے کے بعد تھکا ہوا گھر جانے کے لئے نکل رہا تھا جب یہ چٹ اُس کے حوالے کی گئی تھی، اُس چٹ پر اُس کے لئے ایک میسج بھی تھا۔

ٹیلی اسکوپ سے اس نے ایک بار پھر اس بینکونٹ ہال کی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی۔ ہال میں سیکورٹی کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر مستعد تھے۔ care taker staff بھی اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ اس بینکونٹ ہال کا داخلی دروازہ اس قد آدم کھڑکی کے بالکل سامنے تھا جس کھڑکی کے بالمقابل ساٹھ فٹ چوڑی، دو روہ مین روڈ کے پار ایک عمارت کی تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ موجود تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی رکھے وہ ایک جدید sniper رائفل کی ٹیلی اسکوپک سائٹ سے کھڑکی کے پردے میں موجود ایک چھوٹے سے سوراخ سے اس بینکونٹ ہال میں جھانک رہا تھا۔ بینکونٹ ہال کا داخلہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور کوریڈور میں استقبالیہ قطار اپنی پوزیشن لے چکی تھی۔ اس کی گھڑی پر 9:02 بجے تھے۔ مہمان نونج کرپندہ منٹ پر اس کوریڈور میں داخل ہونے والا تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ وہاں گزارنے کے بعد وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ مہمان کے اس ہوٹل میں پہنچنے سے اس کی روانگی کے بعد تک اس علاقے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے ہر طرح کا مواصلاتی رابطہ جام ہونے والا تھا۔ یہ سیکورٹی کے ہائی الرٹ کی وجہ سے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے

وہاں سیل فون اور متعلقہ کوئی ڈیوائسز کام نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک پروفیشنل ہٹ مین تھا۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کے ہائی الرٹس میں کامیابی سے کام کرتا رہا تھا۔ اس کو ہائر کرنے کی وجہ بھی اس کی کامیابی کا تناسب تھا جو تقریباً سو فی صد تھا۔ وہ صرف دو لوگوں کو مارنے میں ناکام رہا تھا اور اس کی وجہ اس کے نزدیک اس کی بری قسمت تھی۔ پہلی بار اس کی رائفل لاسٹ سیکنڈز میں اس اسٹینڈ سے ہل گئی تھی، جس پر وہ رکھی تھی اور دوسری بار... خیر دوسری بار کا قصہ طویل تھا۔

وہ پچھلے دو مہینے سے اس اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ اس دن سے تقریباً ایک مہینہ پہلے سے جب وہ یہ ہوٹل اس بینکویٹ کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اسے اس اہم کام پر مامور کیا تھا۔ اس تقریب کے لیے اس ہوٹل اور ہوٹل کے اس بینکویٹ ہال کا انتخاب کرنے والے بھی وہی تھے۔

اس مہمان کو ختم کرنے کا فیصلہ چار ماہ پہلے ہوا تھا۔ وقت، جگہ اور قاتل کا انتخاب بے حد ماہرانہ طریقے سے بڑے غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ اس مہمان کے سال کی مکمل مصروفیات کے شیڈول میں سے مقام، ملک اور ممکنہ قاتلوں کے نام شارٹ لسٹ کیے گئے تھے۔ پھر ہر جگہ اور تاریخ پر ہونے والے اس حادثے کے اثرات پر سیر

حاصل بحث کی گئی تھی۔ فوری اثرات اور اس سے نمٹنے کی حکمت عملی پر بات کی گئی تھی۔ ممکنہ ردِ عمل کے نقصانات سے بچنے کے لیے منصوبے تیار کیے گئے تھے۔ ایک قاتلانہ حملے کے ناکام ہو جانے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ ردِ عمل اور نقصانات پر غور کیا گیا تھا اور ہر میٹنگ کے بعد ”کام“ کی جگہیں اور تاریخیں بدلتی رہی تھیں، لیکن قاتل ایک ہی رہا تھا۔ کیوں کہ وہ موزوں ترین تھا۔ اس شہر میں اس تاریخ پر اس تقریب کے لیے سیکیورٹی کی وجوہات کے باعث تین مختلف ہوٹلز کا نام لسٹ میں رکھا گیا تھا، لیکن اسے ہائر کرنے والے جانتے تھے کہ تقریب کہاں ہوگی۔

اس سے دو ماہ پہلے ہی اسے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر سٹائنس سالہ لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لڑکی کے چار سالہ پرانے بوائے فرینڈ سے بیک اپ کے لیے ایک پرو فیشنل کال گرل کا استعمال کیا گیا تھا جو اس کے کارڈیلر بوائے فرینڈ سے ایک کار خریدنے کے بہانے ملی تھی اور اسے ایک ڈرنک کی آفر کر کے ایک موٹل لے گئی تھی۔

اس کال گرل کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی ریکارڈنگ دوسرے دن اس لڑکی کو میل میں موصول ہو گئی تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ نشے میں تھا اسے پھنسا یا گیا تھا اور یہ

سب ایک غلطی تھی، لیکن اس کے بوائے فرینڈ کی کوئی تاویل، اس کے غصے اور رنج کو کم نہیں کر سکی تھی... اس کی گرل فرینڈ کے لئے یہ بات اس لئے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ زیادہ ناقابل برداشت تھی، کیوں کہ وہ تین ہفتے بعد شادی کرنے والے تھے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا سامان گھر کے دروازے سے باہر نہیں پھینکا تھا۔ اسے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے باہر پھینکا تھا۔ سڑک پر بکھرے سامان کو اکٹھا کرتے ہوئے خود کو اور اس کال گرل کو کوستے ہوئے بھی اس کا بوائے فرینڈ یہ سوچ رہا تھا کہ چند ہفتوں میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ دونوں دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنہوں نے ان کا تعلق ختم کروایا تھا۔ انہیں اس بات کا اندیشہ بھی تھا۔ چنانچہ معاملات کو پوائنٹ آف نوریٹن تک پہنچانے کے لیے اس لڑکی کے کمپیوٹر کو ہیک کیا گیا تھا۔ اس کی اور اس کی گرل فرینڈ کی بے حد قابل اعتراض تصویروں کو اس کی ای میل آئی ڈی کے ساتھ بہت ساری ویب سائٹس پر آپ لوڈ کر دیا گیا تھا۔

یہ جیسے تابوت میں آخری کیل تھی۔ اس لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی ای میل آئی ڈی سے بھیجا ہوا پیغام پڑھا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس نے اپنے بریک آپ کے بعد اس کی ساری پکچرز کو قابل اعتراض ویب سائٹس سے آپ لوڈ کر دیا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ

نے پہلے وہ لنکس وزٹ کیے تھے۔ پھر اپنے بوائے فرینڈ کی اس کال گرل کے ساتھ ویڈیو کو آپ لوڈ کیا تھا اور اس کے بعد اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کو اس کے شوروم میں جا کر اس کے کسٹمرز کے سامنے اس وقت سامنے اس وقت پیٹا تھا، جب وہ انہیں ایک جدید ماڈل کی گاڑی تقریباً بیچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”Happy families drive this car“ اس نے تقریباً چھپن باریہ جملہ اس جوڑے کے سامنے دہرایا تھا جو ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے وہاں موجود تھے اور اس کے ساتھ اس نے ایک سو چھپن باریہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ کس طرح خود بھی اس کار کو ذاتی استعمال میں رکھنے کی وجہ سے اس کا اور اس کی گرل فرینڈ کار پیلیشن شپ مضبوط ہوا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کو مار کھانے پر اتنا شاک نہیں لگا تھا۔ چار سالہ کورٹ شپ میں وہ اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں اس شہر کی تقریباً ہر مشہور پبلک پلس پر پٹ چکا تھا اور یہ تو بہر حال اس کا اپنا شوروم تھا۔ جتنا اسے اپنی گرل فرینڈ کے الزام سن کر شاک لگا تھا۔

اس کے چیخنے چلانے اور صفائیاں دینے کے باوجود اس کی گرل فرینڈ کو یقین تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں یہ حرکت کی ہوگی۔ ورنہ اس کی ذاتی لیپ ٹاپ میں موجود

تصویریں اس کی ای میل ایڈریس کے ساتھ کون آپ لوٹ کر سکتا تھا۔

اس بربیک آپ کے ایک ہفتے کے بعد وہ نائٹ کل میں اسے سے ملا تھا۔ چند دن ان کی ملاقاتیں اسی بے مقصد انداز میں ہوتی رہیں تھیں۔ وہ میڈیک ٹیکنیشن تھی اور اس نے اپنا تعارف پیٹرن کے طور پر کروایا تھا۔ وہ ہر بار اس لڑکی کو ڈرنکس کی قیمت خود ادا کرتا تھا۔ چند دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے اسے گھر پہ مدعو کیا تھا اور اس کے بعد وہاں کا آنا جانا زیادہ ہونے لگا تھا۔ وہ اس بلڈنگ کے افراد کو ایک ریگولر وزیٹر کا تاثر دینا چاہتا تھا اور دو ماہ کے اس عرصے میں وہ اس اپارٹمنٹ کی دوسری چابی بنا چکا تھا اور ایک ہفتہ پہلے وہ اس لڑکی کی عدم موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ پر وہ اسنا پیرا نقل اور کچھ دوسری چیزیں بھی منتقل کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اس تقریب سے ایک ہفتہ پہلے اس علاقے کی تمام عمارتوں پر سیکورٹی چیک ہوگا۔ وہ تب ایسا کوئی بیگ اسکریننگ کے بغیر عمارت میں منتقل نہیں کر سکے گا اور اس وقت بھی اس علاقے کی تمام بلڈنگز بے حد ٹائٹ سیکورٹی میں تھیں۔ وہ ایک ریگولر وزیٹر نہ ہوتا تو اس وقت اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بلڈنگ سے پچاس میل دور اس کی گرل فرینڈ کو اسپتال میں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے روک لیا گیا تھا۔ ورنہ اس وقت وہ اپنے اپارٹمنٹ پر ہوتی۔

پارکنگ میں کھڑی اس کی کار کے چاروں ٹائر پنچر تھے اور اگر وہ ان دونوں چیزوں سے کسی نہ کسی طرح بچ کر بھی گھر روانہ ہو جاتی تو راستے میں اس کو چیک کرنے کے لیے کچھ اور بھی انتظامات کیے گئے تھے۔

نونج کر تیرہ منٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنی رائفل کے ساتھ مہمان کے استقبال کے لئے بالکل تیار تھا۔ جس کھڑکی کے سامنے وہ تھا، ہوٹل کے اس بینکوائٹ ہال کی وہ کھڑکی بلٹ پروف شیشے کی بنی تھی۔ ڈبل گلیز ڈبلٹ پروف شیشہ... یہی وجہ تھی کہ ان ونڈوز کے سامنے کوئی سیکورٹی اہلکار تعینات نہیں تھے۔ تعینات ہوتے تو اس نشانہ باندھنے میں یقیناً دقت ہوتی، لیکن اس وقت اسے پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے پہلے کسی کو مارنے جکے لئے اتنی جامع سہولیات نہیں ملی تھیں۔ مہمان کوریڈور میں چلتے ہوئے آنا تھا۔ ایلیوٹر سے نکل کر کوریڈور میں چلتے ہوئے بینکوائٹ ہال کے داخلی دروازے تک اس مہمان کو شوٹ کرنے کے لیے اس کے پاس پورے دو منٹ کا وقت تھا۔ ایک بار وہ بینکوائٹ ہال میں اپنی ٹیبل کی طرف چلا جاتا تو اس کی نظروں سے او جھل ہو جاتا، لیکن دو منٹ کا وقت اس جیسے پروفیشنل کے لیے دو گھنٹے کے برابر تھا۔ اس بینکوائٹ ہال کی تمام کھڑکیاں بلٹ پروف تھیں۔ صرف اس کھڑکی کے سوا جس

کے سامنے ہو تھا۔ تین ہفتے پہلے بظاہر ایک اتفاقی حادثے میں اس کھڑکی کا شیشہ توڑا گیا تھا۔ اسے تبدیل کروانے میں ایک ہفتہ لگا تھا اور تبدیل کیا جانے والا شیشہ ناقص تھا۔ یہ صرف وہ لوگ جانتے تھے جنہوں نے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ اسٹیج تیار تھا اور اس پر وہ فنکار آنے والا تھا جس کے لیے یہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔

جبریل نے ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کو بغور دیکھا تھا۔ وہ اُس سے چند سال بڑا لگتا تھا۔ ایک بے حد مناسب شکل و صورت کا بے حد سنجیدہ نظر آنے والا مرد جو کلین شیوڈ تھا حالانکہ جبریل کے ذہن میں اُس کا جو خاکہ تھا، وہ ایک داڑھی والے مرد کا تھا۔

ویٹران کے سامنے کافی رکھ کر چلا گیا تو احسن سعد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”میرے بارے میں آپ یقیناً بہت کچھ سُن چکے ہوں گے میری سابقہ بیوی سے۔“
اُس کے لہجے میں ایک عجیب سی تحقیر اور یقین تھا، اور ساتھ ہونٹوں پر اُبھر آنے والی ایک طنزیہ خم بھی۔ جبریل نے کچھ ایسا ہی جملہ اُس message میں پڑھا تھا جو احسن سعد نے فون کا لیز پر اُس سے رابطہ کرنے پر ناکامی پر اُس کے لئے چھوڑا تھا۔

”مجھے اپنی سابقہ بیوی کے باری میں تمہیں کچھ بتانا ہے۔“

چھ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں کھڑے رہنے کے بعد اس کاغذ پر لکھی وہ تحریر پڑھتے ہی جبریل کا دماغ پل جھپکتے میں گھوم کر رہ گیا تھا۔ جس receptionist نے ڈاکٹر احسن سعد کا وہ پیغام جبریل سکندر کے لئے نوٹ کیا تھا اُس نے وہ چٹ جبریل کو دیتے ہوئے بے حد عجیب نظروں سے اُسے دیکھا تھا، وہ ایک بے حد scandalous فقرہ تھا اور اُسے پڑھتے اور سنتے دیکھ کر کوئی بھی جبریل سکندر کے حوالے سے عجیب سے احساسات کا شکار ہوتا، اس کے باوجود کہ اُس ہاسپٹل میں جبریل بے حد ”clean record“ رکھنے والے چند نوجوان ڈاکٹرز میں سے ایک تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels / Articles / Poems / Short Stories / Interviews

“Are you sure this is for me?”

جبریل ایک پاکستانی نام دیکھنے کے باوجود اس پیغام کو پڑھ کر اُس receptionist سے ہو چھہ بغیر نہیں رہ سکا... نہ وہ احسن سعد کو جانتا تھا نہ کسی سابقہ بیوی کو... اور یہ شخص اس سے ایمر جنسی میں ملنا چاہتا تھا... اُسے لگا کوئی غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔

receptionist اُس “Ohhhh yeah! I am pretty sure”

نے جو ابا کہا۔ جبریل اُلجھے ذہن کے ساتھ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے گیا تھا اور

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اُس نے وہیں کھڑے کھڑے احسن سعد کے اُس نمبر پر کال کی جو اُس chit پر تھا۔ پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ یوں جیسے وہ اُسی کے انتظار میں تھا اور جبریل کے کچھ کہنے سے بھی پہلے اُس نے جبریل کا نام لیا۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد جبریل نے yes کیا۔

”مجھے آپ سے فوری طور پر ملنا ہے، میں کچھ دن کے لئے یہاں ہوں اور پھر چلا جاؤں گا۔“ احسن سعد نے فوری طور پر کہا ”مگر آپ مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتا۔ Chit“ کے اُس پیغام کے باوجود جبریل پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”میں عائشہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ احسن سعد کے جملے پر جبریل کا ذہن بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عائشہ کا شوہر اس سے رابطہ کرے گا... اُس نے احسن سعد کا نام نہ نساء سے سنا تھا نہ ہی عائشہ سے اور نہ ہی اسفند کے funeral میں کسی سے جہاں وہ دس پندرہ منٹ رُک کر نساء اور ڈاکٹر نورین سے ہی console کر کے آیا تھا۔ اگر احسن سعد وہاں کہاں تھا بھی تو اُن دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی، اور اب یک دم بیٹھے بٹھائے وہ سیدھا نہ صرف اُس کو کال بھی کر رہا تھا، بلکہ کال کر کے وہ بات بھی عائشہ ہی کے بارے میں کرنا چاہتا

تھا لیکن کیا بات...؟

”عائشہ عابدین؟“ جبریل نے بڑے محتاط لہجہ میں اُس سے پوچھا اس بار یہ یقین ہونے

کے باوجود کہ وہ عائشہ عابدین ہی کا شوہر ہو سکتا تھا، اُس کو فوری طور پر کوئی اور

”عائشہ“ یاد نہیں آئی تھی جس کا شوہر اُس سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا

اور رابطہ کرنے کی ضرورت تو یقیناً اسے عائشہ کے شوہر سے بھی متوقع نہیں تھی۔

”ہاں... ڈاکٹر عائشہ عابدین۔“ دوسری طرف سے احسن سعد نے بڑے چبھتے ہوئے

لہجہ میں کہا۔ ”میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ مجھ سے ملنا کیوں چاہ رہے ہیں؟“ جبریل

کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”میں آپ کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔“ ”آپ مجھے ٹھیک سے

نہیں جانتے لیکن میری سابقہ بیوی کو ضرورت سے زیادہ جانتے ہیں اسی لئے اُسے

وکیل فراہم کر رہے ہیں... اُس کی ضمانت کروا رہے ہیں۔“ جبریل خاموش رہا۔ احسن

سعد کے طنز میں صرف تحقیر نہیں تھی ”باخبری“ بھی تھی۔ وہ مکمل معلومات رکھنے

کے بعد ہی اُس سے رابطہ کر رہا تھا۔

”میں آپ کے ہاسپٹل سے زیادہ دور نہیں ہوں... اور میں زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا

آپ کا کیونکہ آپ بھی مصروف ہیں اور فالٹو وقت میرے پاس بھی نہیں ہے... لیکن

آپ سے ملنا اس لئے ضروری ہے کیونکہ ایک مسلمان کے طور پر میں آپ کو اُس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے اور چاہتا ہوں آپ وہ غلطی نہ کریں، جو میں نے کی ہے۔ ”احسن سعد بہت لمبی بات کرتا تھا، اُس کی بات سُننے ہوئے جبریل نے سوچا مگر وہ اُس کی بات سننے سے بھی پہلے اُس سے ملنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ احسن سعد سے مل کر اُسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ عائشہ کے خلاف وہ کیس واپس لے لے جو اُس نے فائل کیا تھا۔ اُس وقت احسن سعد کے ساتھ ملنے کی جگہ طے کرتے ہوئے اُسے یقین تھا وہ اُس شخص کو سمجھالے گا، اس کے باوجود کہ اُس نے نساء سے اُس کے بارے میں بے حد خوفناک باتیں سنی تھیں۔ اس کے باوجود کہ اُس نے عائشہ عابدین کی وہ حالت دیکھی تھی مگر کہیں نہ کہیں جبریل سکندر اُسے ایک خراب شادی اور خراب سے زیادہ mismatched شادی ہی سمجھتا رہا تھا جس میں ہونے والی غلطیاں یک طرفہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ایک مرد کے طور پر اُس کا یہ خیال تھا کہ ساری غلطیاں احسن سعد کی نہیں ہو سکتی تھیں، کچھ خامیاں عائشہ عابدین میں بھی ہوں گی... کہیں نہ کہیں جبریل سکندر یہ جاننے کے بعد کہ احسن سعد کی فیملی بے حد مذہبی تھی، اُن کے لئے biased تھا اُس کا خیال نہیں اُسے یقین تھا کہ وہ اتنے سخت نہیں ہو سکتے جتنا اُس نے اُن کے بارے میں سُنا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ

یہ bias اُس حافظِ قرآن کے لئے بھی رکھتا تھا جو اُس کی طرح قرآن جیسی متبرک شے کو اپنے سینے اور ذہن میں رکھتا تھا۔ وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ جس دل میں قرآن محفوظ کیا گیا تھا، وہ اتنا سخت اور بے رحم ہو سکتا تھا۔ اُسے یقین تھا جو بھی کچھ تھا اُس میں غلط فہمیوں کا زیادہ تصور ہو گا بُری نیت اور اعمال کی نسبت اور وہ اسی خیال کے ساتھ احسن سعد سے ملنے آیا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اُسے سمجھالے گا اور اس جھگڑے کو ختم کروادے گا اور احسن سعد سے مصافحہ کرنے، کافی پینے کے لئے اُس میز پر بیٹھنے تک اُس کا یہ یقین قائم رہا تھا، جو احسن سعد کی گفتگو کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

”عائشہ نے کبھی مجھ سے آپ کے حوالے سے بات نہیں کی۔“ جبریل نے اُس پر نظریں جمائے نرم لہجے میں کہا۔ احسن سعد قہقہہ مار کر ہنسا، جبریل اپنی بات مکمل نہیں کر سکا اُسے سمجھ نہیں آئی اُس کی گفتگو میں ہنسنے والی کیا بات تھی۔

”میں نہ تو بے وقوف ہوں، نہ ہی بچہ۔“ اُس نے اُس قہقہے کے اختتام پر جبریل سے کہا ”مجھے یقین ہے تم نہ بے وقوف ہو اور نہ ہی بچے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں۔“ جبریل نے جو ابابڑے محتاط انداز میں کہا ”Then stop treating me like

”One حسن سعد نے ایک بار پھر اُس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اُس کی آواز اب بلند تھی، ماتھے پر بل اور ہونٹ بھنچے ہوئے... اُس نے کافی کے اُس کپ کو ہاتھ سے دور دھکیل دیا تھا جس سے کچھ دیر پہلے اُس نے ایک سپ لیا تھا۔ کافی چھلک کر میز پر گری تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب مٹھیوں کی شکل میں بھنچے ہوئے میز پر تھے، سیکنڈز کے اندر حسن سعد نے کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا... وہ اب شدید غصہ میں نظر آ رہا تھا اور جبریل کو سمجھ نہیں آئی تھی کہ اُن چند جملوں میں جن کا تبادلہ اُن کے درمیان ہوا تھا، ایسا کیا تھا جو اُسے اس طرح غضب ناک کرتا۔ ”تم اُس عورت کے guaranter بنے ہوئے ہو اور تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ اُس نے تم سے میرے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔“ اُس کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوئی تھی، آس پاس کی ٹیبلز پر بیٹھے لوگوں نے گردنیں موڑ کر اُن کو دیکھا۔ جبریل نے ایک نظر اطراف میں مڑتی گردنوں کو دیکھا پھر بے حد سرد مہری سے اُس سے کہا۔

”اگر تم اس آواز اور انداز میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں یہاں ایک منٹ بھی مزید ضائع نہیں کرنا چاہوں گا...“ جبریل نے کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنا والٹ جیب سے نکالا اور دوسرے ہاتھ کو فضا میں ذرا سا بلند کر کے ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور

اُسے بل لانے کا اشارہ کیا۔ احسن سعد کو یک دم ہی احساس ہوا، وہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو غلط طریقے سے ہینڈل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں اپنے بیٹے کے قتل کی وجہ سے اس قدر فرسٹریٹڈ ہوں کہ I am ...

sorry۔ ”وہ اگلے ہی لمحے گرگٹ کی طرح ایک بار پھر رنگ بدل گیا تھا۔ اب اُس کی

آواز ہلکی تھی، بپنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور وہ ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا اور

کنپٹیاں رگڑ رہا تھا۔ جبریل نے اُس تبدیلی کو بھی اتنی ہی باریکی سے دیکھا تھا جتنی باریکی

سے اُس نے پہلی تبدیلی دیکھی تھی اور اُس نے احسن سعد کی معذرت کو قبول کیا تھا۔

”تم میرے مسلمان بھائی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس دھوکے سے بچالوں جو

میں نے کھایا۔ ”اُس کا اگلا جملہ جبریل کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ احسن سعد اب

بے حد نرم اور دھیمے انداز میں بات کر رہا تھا بے حد شائستگی کے ساتھ... جبریل نے

ٹوکے بغیر اُسے بات کرنے دی۔

”میری بیوی ایک characterless عورت ہے... جس طرح اُس نے تمہیں

الوینا یا ہے اپنی مظلومیت استعمال کر کے... اُسی طرح تم سے پہلے درجنوں کو بنا چکی ہے۔

وہ کسی بھی مرد کو منٹوں میں اپنی مٹھی میں کر کے انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ ”اُس کے

لہجے میں عائشہ کے لئے اتنا زہر موجود تھا کہ جبریل دم بخود رہ گیا تھا، وہ جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا وہاں طلاق بھی ہوتی تھی، بریک اپ بھی مگر کوئی اپنی بیوی کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں کرتا تھا جس طرح کی گفتگو احسن کر رہا تھا۔

”میرا عائشہ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا اور میں سمجھ نہیں پارہا کہ تمہاری باتوں کو الزامات سمجھوں یا غلط فہمی؟“ جبریل مداخلت کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”یہ حقائق ہیں“ احسن نے جواباً کہا۔

”جو بھی ہے، مجھے ان میں دلچسپی نہیں، عائشہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے اور میں نے صرف اس لئے اُس کی مدد کی کیونکہ اُس کی بہن میری کلاس فیلو تھی۔“ احسن نے اُس کی بات کاٹی ”تم اُس کی بہن کو جانتے ہو گے اس عورت کو نہیں... اس فاحشہ اور حرافہ کو نہیں...“

”Language please ...“ جبریل کا چہرہ اور کانوں کی لویں بیک وقت

سُرخ ہوئی تھیں، وہ احسن سعد سے اس طرح کے الفاظ کی توقع کر رہا تھا۔

”تم اگر اس عورت کو جانتے ہوتے تو تمہیں ان الفاظ پر کبھی اعتراض نہ ہوتا... یہ اس

سے زیادہ گندے الفاظ deserve کرتی ہے۔ ”احسن کی زبان ویسے ہی چلتی رہی تھی۔ ”وہ تمہاری بیوی رہ چکی ہے، تمہارے ایک بچے کی ماں ہے... کم از کم تم سے یہ الفاظ deserve نہیں کرتی... بیوی بُری ہو سکتی ہے، ماں بھی... مگر عورت کی عزت ہوتی ہے نا... اتنی respect تو دکھاؤ اُس کے لئے۔“ جبریل بے حد ٹھنڈے مزاج کا تھا، لیکن جو ”گفتگو“ وہ سُن رہا تھا وہ اُس جیسے ٹھنڈے مزاج کے شخص کو کھولا دینے کے لئے بھی کافی تھی۔

”جو عورت بیوی رہ چکی ہو، اُس کی کیا عزت!“ احسن سعد نے جواب نہیں دیا تھا، اپنی ذہنیت کو اُس کے سامنے ننگا کر کے رکھ دیا تھا۔

Then I pity on you... ”اور اُس عورت کو بھی جو تمہاری بیوی رہی۔“

جبریل نے بے حد سرد لہجے میں اُس سے کہا تھا، اُسے اندازہ ہو گیا تھا وہ غلط شخص کو سمجھانے بیٹھا تھا۔

”اُس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں پھر تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟“ احسن سعد نے جواباً سے ایک جھلسانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”تم اُسے جانتے ہی کتنا ہو کہ ایک شوہر کی رائے کو رد کر رہے ہو؟“

”میں اُسے سولہ سال کی عمر سے جانتا ہوں، اُسے بھی... اُس کی فیملی کو بھی... اور وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی اور ہے“ ...

احسن سعد کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزرا تھا۔

“So I was right, it was an old affair”

”Shut Up... You are sick“ جبریل کو اپنے سر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا وہ تھوڑی ہی دیر میں احسن سعد کے ساتھ اُسی کی طرح گالم گلوچ پر اتر آئے گا... وہ شخص کسی کو بھی infuriate کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا... وہ کسی کو بھی پاگل کر سکتا تھا۔

”تم مجھ سے کس لئے ملنے آئے ہو؟“ جبریل نے اُس بل جیکٹ کے اندر بل کی رقم رکھتے ہوئے بے حد بے زاری سے کہا جو ویٹر بہت پہلے رکھ کر گیا تھا، یہ جیسے احسن سعد کے لئے اشارہ تھا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ میں تمہیں صرف اس عورت کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ... ”جبریل نے بے حد درشتی سے اُس کی بات کاٹی“ اور میں انٹر سٹڈ نہیں ہوں اُس کے یا اُس کے کردار کے بارے میں کچھ بھی سُننے میں... I am just not interested... کیونکہ وہ کیا ہے، کیسی ہے یہ میرا مسئلہ نہیں

ہے ”Is that clear to you?..“

”پھر تم اُس عورت کو سپورٹ کرنا بند کرو...“ احسن سعد نے جواباً اُس سے کہا تھا ”میں اُسے اس لئے سپورٹ کر رہا ہوں کیونکہ کوئی ماں اپنی اولاد کو نہیں مار سکتی... وہ negligent ہو بھی تو بھی اس negligence کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اُس اولاد کو مارنا چاہتی تھی اور اُس کے خلاف قتل کا کیس کر دیا جائے۔“ جبریل اب بے حد blunt ہو رہا تھا۔ یہ شاید احسن کا رویہ تھا، جس نے اُس کا سارا لحاظ منٹوں میں غائب کر دیا تھا۔

”تم پہلے یہ طے کرو کہ تمہیں عائشہ سے نفرت ہے کیوں... اُس کے عورت ہونے کی وجہ سے؟ بیوی ہونے کی وجہ سے؟ Characterless ہونے کی وجہ سے یا اپنے بیٹے کو مارنے کے شبہ کی وجہ سے... تم بیٹھ کر یہ طے کرو کہ تمہاری اتنی گہری نفرت کی وجہ ہے کیا۔“ جبریل اُس سے کہتا گیا تھا۔

”That’s none of your business“ احسن سعد نے درشتی سے

کہا تھا ”میں تم سے psychiatry پڑھنے نہیں آیا۔“ جبریل نے سر ہلایا ”Exatctly...“ میں بھی تم سے morality پڑھنے نہیں آیا۔ تم مسلمان

ہو، بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ جس عورت کو طلاق دے دی گئی ہو، اُس کے حوالے سے کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں... اور اُس میں کم از کم یہ ذمہ داری شامل نہیں ہے کہ تم ہر مرد کے سامنے بیٹھ کر اس پر کیچڑ اچھا لو۔”

”تم مجھے میرا دین سکھانے کی کوشش مت کرو۔“ احسن سعد نے اُس کی بات کاٹ کر بے حد تنفر سے کہا تھا ”میں حافظِ قرآن ہوں، اور تبلیغ کرتا ہوں... درجنوں غیر مسلموں کو مسلمان کر چکا ہوں... تم مجھے یہ مت بتاؤ کہ میرا دین مجھ پر عورتوں کے حوالے سے کیا ذمہ داری عائد کرتا ہے اور کیا نہیں... تم اپنے دین کی فکر کرو کہ ایک نامحرم عورت کے ساتھ افسیر چلا رہے ہو اور مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں اپنی سابقہ آوارہ بیوی کی شان میں قصیدے پڑھوں“ وہ بات نہیں کر رہا تھا۔ زہر تھوک رہا تھا۔ وہ جبریل کی زندگی میں آنے والا پہلا تبلیغی تھا جس کی زبان میں جبریل نے مٹھاس کی جگہ کڑواہٹ دیکھی تھی۔

”تمہاری تصویریں میں نے شادی کے بعد بھی اُس کے لیپ ٹاپ میں دیکھی تھیں اور تب اُس نے کہا تھا تم اُس کی بہن کے دوست ہو، تمہارا اور اُس کا کوئی تعلق نہیں، لیکن میں غلط نہیں تھا، میرا شک ٹھیک تھا۔ کوئی لڑکی بہن کے بوائے فرینڈ کی تصویریں

اپنے laptop میں جمع کر کے نہیں رکھتی ہے... ”احسن سعد کہہ رہا تھا اور جبریل دم بخود تھا ”اور آج تم نے بالآخر بتا دیا کہ یہ affair کتنا پُرانا تھا... اسی لئے تو اُس عورت نے جان چھڑائی ہے میرے بیٹے کو مار کر۔ ”اُس کی ذہنی حالت اس وقت جبریل کو قابلِ رحم لگ رہی تھی۔ اتنی قابلِ رحم کہ وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”احسن اُس نے تمہارے بیٹے کو نہیں مارا... وہ سرجری میں ہونے والی ایک غلطی سے مارا گیا۔ ”اُس کی زبان سے وہ نکلا تھا جو شاید اُس کے لاشعور میں تھا اور جس سے وہ خود نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ احسن کو اس کا جملہ سُن کر کرنٹ لگا تھا اور جبریل پچھتا یا تھا... وہ ایک برادِن تھا اور اُس بُرے دن کا وہ بدترین وقت تھا۔

”تم کیسے جانتے ہو یہ؟ ”احسن نے سر سراتی ہوئی آواز میں اُس سے کہا تھا۔

”کیونکہ میں اُس آپریشن ٹیم کا حصّہ تھا... ”اس بار جبریل نے سوچ سمجھ کر کہا تھا... بدترین انکشاف وہ تھا جو ہو چکا تھا، اب اس کے بعد کی تفصیلات کا پتہ چل جانا یہ نہ چلنا بے معنی تھا۔ احسن دم سادھے اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا... ساکت، پلکیں جھپکائے بغیر اُس کے چہرے کا رنگ سانولا تھا یا سُرخ یا زرد... چند لمحوں کے لئے جیسے جبریل کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا ”وہ سرجری میں نے نہیں کی احسن... میں assist کر رہا

تھا ڈاکٹر ویزل کو... اور مجھے یا بھی یقین نہیں ہے کہ سر جری میں واقعی کوئی غلطی ہوئی تھی یا وہ میرا وہم تھا۔ ”جبریل نے اُس کے سامنے جیسے وضاحت دینے کی کوشش کی تھی... احسن سعد وہاں اُسے عائشہ عابدین سے بدگمان کرنے آیا تھا لیکن اُسے اندازہ نہیں تھا کہ اُسے جو اب جبریل سے کیا پتہ چلنے والا تھا۔

وہ یک دم اٹھا تھا اور پھر وہاں سے چلا گیا تھا۔ جبریل سکندر وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔

”Hello back in USA“ صبح سویرے اپنے فون کی سکریں پر اُبھرنے والی اس تحریر اور بھیجنے والے کے نام نے رَئیسہ کو چند لمحوں کے لئے ساکت کیا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ واپس آنے کے بعد اُس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ حالات جو بھی تھے، اُن دونوں کے درمیان بہر حال ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کہ اُن دونوں کو ایک دوسرے سے چھپنا پڑتا۔ ”Welcome Back“ کا ٹیکسٹ اُسے بھیجتے ہوئے رَئیسہ نے ایک بار پھر خود کو یاد دلایا تھا کہ زندگی میں ہونے والے اُس پہلے بریک اپ کو اُس نے دل پر نہیں لینا تھا... اور بار بار خود کو یہ یاد دہانی ضروری تھی... درد ختم نہیں ہو رہا تھا، لیکن کم ضرور ہوتا تھا... کچھ دیر کے لئے تھمتا ضرور تھا۔

”یونیورسٹی جا رہی ہو؟“ وہ نہا کر نکلی تو اُس نے فون پر ہشام کا اگلا ٹیکسٹ دیکھا۔ اُس نے ہاں کا جوابی ٹیکسٹ کرتے ہوئے اُسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

”میں؟“ اگلا ٹیکسٹ فوراً آیا تھا۔ وہ کارن فلیکس کھاتے ہوئے میز پر پڑے فون پر چمکتے اُس سوال کو دیکھتی رہی۔ کہنا چاہتی تھی... اب کیسے؟... مگر لکھا تھا... ”نہیں میں مصروف ہوں“... کارن فلیکس حلق میں اٹکنے لگے تھے، وہ اب اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دل سنبھالنے کی ساری کوششوں کے باوجود اُس کا سامنا مشکل ترین تھا۔ وہ روایتی لڑکی نہیں بننا چاہتی تھی۔ نہ گلے شکوے کرنا چاہتی تھی، نہ طنز... نہ جھگڑا... اور نہ ہی اُس کے سامنے روپڑنا چاہتی تھی... وہ بحرین بہر حال اس لئے نہیں گیا تھا کہ پچھڑ جاتا۔

فون کی سکریں پر جو اب ایک منہ چڑاتی smiley آئی تھی، یوں جیسے اُس کے بہانے کا مذاق اڑا رہی ہو۔ رنیسہ نے اُسے انکور کیا اور اُسے جو اب اچھ نہیں بھیجا۔

پندرہ منٹ بعد اُس نے اپنے اپارٹمنٹ کے باہر نکلنے پر گاڑی سمیت اُسے وہاں پایا تھا۔ وہ شاید وہیں بیٹھے ہوئے اُسے text بھیج رہا تھا، ورنہ اتنی جلد وہ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُسے سر پر اُتر دینا اچھا لگتا تھا اور رنیسہ کو یہ سر پر اُتر لینا... مگر یہ کچھ دن پہلے کی بات

تھی۔

وہ اُس کے بلائے بغیر اُس کی طرف آئی تھی، دونوں کے چہروں پر ایک دوسرے کو دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری، حال احوال کا پوچھا گیا، اُس کے بعد رنیسہ نے اُس سے کہا، ”مجھے آج یونیورسٹی ضرور پہنچنا ہے... کچھ کام ہے۔“ ہشام نے جواباً کہا، ”میں ڈراپ کر دیتا ہوں اور ساتھ کچھ گپ شپ بھی لگالیں گے... بڑے دن ہو گئے ہمیں ملے اور بات کیے۔“ رنیسہ نے اُس سے نظریں چڑالیں تھیں۔ مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی ہشام نے اُس کی طرف مڑتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا، ”کیا؟“ رنیسہ نے انجان بننے کی کوشش کی، یہ کہنا کہ میں ناخوش ہوں، دل شکستہ ہوں، کیونکہ تم مجھے اُمیدیں دلاتے دلاتے کسی اور لڑکی کو اپنی زندگی میں لے آئے ہو... یہ سب کم از کم رنیسہ کی زبان پر نہیں آسکتا تھا۔

”کیا؟“ اُس نے جواباً ہشام سے پوچھا تھا، ”تمہارا موڈ آف ہے؟“ وہ اب بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ ”نہیں... موڈ کیوں آف ہوگا؟“ رنیسہ نے جواباً اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ”پتہ نہیں یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔“ وہ الجھا ہوا تھا، ”تم کچھ

دنوں سے مکمل طور پر غائب ہو میری زندگی سے... بحرین سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن تم کال ریسیو نہیں کرتی، نہ ہی میسجز کا جواب دیتی ہو... ہوا کیا ہے؟”

”تمہیں کیا لگتا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے میرے اس رویے کی؟“ رنیسہ نے جواباً اُس سے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ...“ ہشام نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔

”میں اب یہ سب ختم کرنا چاہتی ہوں۔“ رنیسہ نے بالآخر اُس سے کہا۔ وہ چونکا نہیں، اُسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر بولا، ”یعنی میرا اندازہ ٹھیک ہے، تمہارا موڈ واقعی ہی آف ہے۔“ رنیسہ نے اُس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنے بیگ سے انگوٹھی کی وہ ڈبیاز نکالی اور گاڑی کے ڈیش بوڑپر رکھ دی، ہشام بول نہیں سکا۔ گاڑی میں خاموشی رہی، پھر ہشام نے کہا۔

”تم نے engagement کی خبر پڑھ لی ہے؟“

”اُس سے بھی پہلے مجھے یہی خدشہ تھا، اس لئے اُس خبر سے میں حیران نہیں ہوئی۔“

رنیسہ نے مدہم آواز میں اُس سے کہا، بڑے ٹھنڈے انداز میں جس کے لئے وہ ہمیشہ

پہچانی جاتی تھی۔ ”میں نے تم سے ایک commitment کی تھی ریسے، اور میں اپنا وعدہ نہیں توڑوں گا۔ نیوز پیپر میں آنے والی ایک خبر ہم دونوں کے درمیان دیوار نہیں بن سکتی، اتنا کچا رشتہ نہیں ہے یہ۔“ ہشام بڑی سنجیدگی سے کہتا گیا تھا۔

”نیوز پیپر کی خبر کی بات نہیں ہے ہشام، تمہاری فیملی کے فیصلے کی بات ہے... تم اب ولی عہد ہو... تمہاری ذمہ داریاں اور تم سے رکھی جانے والی توقعات اور ہیں...“ وہ اُس کی بات پر ہنسا تھا۔

”ولی عہد... میں ابھی تک نہ اپنے اس رول کو سمجھ پایا ہوں اور نہ ہی یہ اندازہ لگا پارہا ہوں کہ میں اس منصب کے لئے اہل ہوں بھی یا نہیں... یہ power politics ہے... آج جس جگہ پر ہم ہیں... کل ہوں گے بھی یا نہیں... کوئی certainty نہیں... اگر مجھے فیصلہ کرنا ہوتا تو میں کبھی یہ عہدہ نہ لیتا مگر یہ میرے باپ کی خواہش ہے۔“ وہ اب سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ریسے نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ”غلط خواہش نہیں ہے... کون ماں باپ نہیں چاہیں گے، اپنی اولاد کے لیے ایسا منصب... تم خوش قسمت ہو، تمہیں ایسا موقع ملا ہے۔“ وہ مدہم آواز میں کہتی گئی۔

”پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔“ ہشام نے جواباً کہا، ”لیکن اب ایسا نہیں ہے... ہر چیز کی

ایک قیمت ہوتی ہے... کوئی بھی چیز لاٹری میں نہیں ملتی... یہ ضروری ہے ولی عہد کے لئے کہ وہ ایک شادی شاہی خاندان میں کرے... وہ بھی پہلی... میری اور تمہاری شادی ہو چکی ہوتی تو اور بات تھی، لیکن اب نہیں ہو سکتا کہ میں شاہی خاندان میں شادی سے انکار کروں۔ جنہوں نے میرے باپ کی بادشاہت کا فیصلہ کیا ہے، انہوں نے ہی یہ فیصلہ بھی کیا ہے۔ مجھ سے اس بارے میں رائے نہیں لی گئی، بتایا گیا تھا۔ ”وہ خاموش ہوا۔

”میں اندازہ کر سکتی ہوں اور اسی لئے تم سے کوئی شکایت نہیں کر رہی... میرے اور تمہارے درمیان ویسے بھی اتنے عہد و پیمان تو ہوئے بھی نہیں تھے کہ میں تم کو کسی بات کے لئے الزام دیتی... اسی لئے ختم کرنا چاہتی ہوں خود یہ سب کچھ تاکہ تم اگر کوئی obligation محسوس کر رہے ہو تو نہ کرو... اور میں hurt نہیں ہوں۔“ اُس نے بات ختم کی، توقف کیا پھر آخری جملہ بولا۔

”تم ہوئی ہو... میں جانتا ہوں اور میں نادم بھی ہوں۔“ ہشام نے اُس کی بات کے اختتام پر کہا۔ ”اور میں یہ سب ختم نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی میں تم سے اس لئے ملنے آیا ہوں... ریسہ میں تم سے بھی شادی کروں گا اور یہ بات میں نے اپنی فیملی کو بتادی ہے اور

”اُنہیں اعتراض نہیں ہے۔“ وہ اُس کی بات پر بے اختیار ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی اتنا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”حمین بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ پتہ نہیں اُس کی زبان کالی ہے یا وہ ضرورت سے زیادہ عقلمند ہے۔“ وہ بالآخر اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔ ہشام پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

”وہ کیا کہتا ہے؟“

”یہی جو تم ابھی کہہ رہے ہو... دوسری شادی... وہ کہتا ہے... بادشاہ حرم رکھتے ہیں اور حرم کی ملکہ بھی کنیز ہی ہوتی ہے۔“

ہشام کچھ دیر کے لئے بول نہیں سکا، یوں جیسے لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اُس نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا ”عربوں میں ایسا نہیں ہوتا، اگر بادشاہ کی چار بیویاں بھی ہوں تو بھی...“ زینہ نے بڑی نرمی سے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے کسی بادشاہ سے شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی، میں ہشام سے شادی کرنا چاہتی تھی... تمہاری مجبوری ہو سکتی ہے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا... میری مجبوری نہیں ہے۔ میں محبت کرتی ہوں لیکن دل کے ہاتھوں اتنی مجبور نہیں ہوں کہ تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہ سکوں۔“ اُس کے لہجے میں وہی practicality تھی جس

کے لئے ہشام اُس کو پسند کرتا تھا... مگر آج پہلی بار وہ عقل، وہ سمجھ بوجھ اُسے بُری لگی تھی۔

”اتنا کمزور رشتہ تو نہیں ہے ہمارا ریسہ۔“ اُس نے ریسہ کی بات کے جواب میں کہا۔

”میرا بھی یہی خیال تھا کہ بہت مضبوط تھا، لیکن میرا خیال غلط تھا۔ میری مُمی کبھی بھی

interracial اور intercultural شادیوں کے حق میں نہیں، اور میں

سمجھتی تھی یہ bias ہے... لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ ٹھیک کہتی ہیں...

تہذیب کا فرق بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔“ ریسہ کہہ رہی تھی ”کبھی بھی بہت بڑا مسئلہ

بن سکتا ہے جیسے ابھی ہوا... لیکن مجھے خوشی ہے کہ یہ سب اب ہوا ہے... بعد میں ہوتا

تو...“ وہ رُکی، ہشام نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

”میں تمہاری مُمی سے متفق نہیں ہوں... محبت کا رشتہ ہر فرق سے بڑا اور طاقت ور ہوتا

ہے۔“ ریسہ نے کہا ”مانتی ہوں لیکن وہ تب ہوتا ہے جب مرد کی محبت میرے بابا

جیسی pure ہو اور وہ میرے بابا کی طرح اپنے فیصلے پر قائم رہ سکے۔“ اُس نے سالار

سکندر کا حوالہ دیا تھا، اگر محبت کے بارے میں اُسے کوئی ریفرنس یاد تھا تو وہ اپنے ماں

باپ کی آپس میں محبت ہی کا تھا۔ اور وہ حوالہ ہشام نے بہت بار سنا تھا، لیکن آج پہلی بار

اُس نے ہشام کا موازنہ سالار سکندر سے کیا تھا، اور علی الاعلان کیا تھا۔ ”میں بھی اپنی محبت میں بہت کھرا ہوں اور تمہارے لئے لڑ سکتا ہوں۔“ اُس نے ریسہ سے کہا تھا۔ اُس کا وہ حوالہ اور موازنہ اُسے پہلی بار شدید بُرا لگا تھا۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے بحرین میں سر اور پلکوں پر بٹھایا جا رہا تھا اور یہاں وہ اُسے ایک ”عام آدمی“ کے سامنے چھوٹا گردان رہی تھی۔

”ہاں تم ہو محبت میں کھرے، لیکن تم لڑ نہیں سکتے ہشام، نہ مجھے زندگی میں شامل کرنے کے لئے، نہ ہی مجھے اپنی زندگی میں رکھنے کے لئے۔“ ریسہ نے اب گاڑی کا دروازہ کھول لیا تھا۔

”میں پھر بھی اپنے ماں باپ کو تمہارے ماں باپ کے پاس رشتے لے لئے بھیجوں گا اور یہ وقت بتائے گا کہ میں تمہارے لئے لڑ سکتا ہوں یا نہیں۔“ گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے ریسہ نے اُسے کہتے سنا تھا۔ اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس نے ہشام کے جملے کو سنتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ ایک ہفتہ جبریل سکندر کے لئے عجیب ذہنی انتشار لایا تھا۔ احسن سعد ایک بے حد

ڈسٹرب کر دینے والی شخصیت رکھتا تھا اور وہ اُسے بھی ڈسٹرب ہی کر کے گیا تھا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے اسفند کی سرجری سے متعلقہ انکشاف پر اب وہ کیسے react کرے گا۔ جس بات کا اُسے خدشہ تھا، وہ اُس کیس میں کسی بھی حوالے سے اپنی نامزدگی تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا... ایک ڈاکٹر کے طور پر اپنے کیریئر کے اس سٹیج میں اپنے پروفیشن سے متعلقہ کسی سکینڈل یا کیس کا حصہ بننا اپنے کیریئر کی تباہی کے مترادف تھا۔ لیکن اب اس پر پچھتانے کا فائدہ نہیں تھا، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا اور اسی ہفتے میں بے حد سوچ و بچار کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ عائشہ کو بھی اس سرجری کے حوالے سے وہ سب کچھ بتا دے گا، جو وہ احسن سعد کو بتا چکا تھا۔ ان حالات میں ایسا کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

اُس نے ہفتے کی رات کو اُسے فون کیا تھا، فون بند تھا... جبریل نے اُس کے لئے پیغام چھوڑا تھا کہ وہ اُسے کال بیک کرے، آدھ گھنٹہ کے بعد اُس نے عائشہ کا نام اپنی سکرین پر چمکتا دیکھا۔

کال ریسیو کرنے کے بعد اُن کے درمیان حال احوال کے حوالے سے چند سیکنڈز کی گفتگو ہوئی، پھر جبریل نے اُس سے اگلے دن ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

”کس لئے ملنا چاہتے ہیں آپ؟“ عائشہ نے بے تاثر انداز میں اُس سے پوچھا تھا۔

”یہ بات میں آپ کو سامنے بیٹھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔“ اُس نے جواباً کہا تھا، وہ چند لمحے

خاموش رہی پھر اُس نے پوچھا تھا کہ وہ کس وقت اُس سے ملنا چاہتا تھا۔

”کسی بھی وقت جب آپ کے پاس وقت ہو۔“ اُس نے جواباً کہا تھا۔

”گیارہ، بارہ بجے؟“ عائشہ نے چند لمحے سوچ کر اُس سے کہا۔

”Done“ اُس نے جواباً کہا اور عائشہ عابدین نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

جبریل فون ہاتھ میں لئے اگلا جملہ سوچتا ہی رہ گیا۔ احسن سعد نے اُس سے کہا تھا اُس نے

عائشہ عابدین کے لیپ ٹاپ میں اُس کی تصویریں دیکھی تھیں، جبریل کو یاد نہیں پڑتا تھا

اُس کے اور عائشہ کے درمیان کبھی تصویروں کا تبادلہ ہوا ہو اور تصویروں کا کوئی تبادلہ

تو اُس کے اور نساء کے درمیان بھی نہیں ہوا تھا لیکن نساء کے پاس اُس کی گروپ فوٹوز

ضرور تھیں... مگر عائشہ اُن تصویروں کو اپنے پاس اس طرح الگ کیوں رکھے ہوئے

تھی... وہ گروپ فوٹوز ہوتیں تو احسن سعد اُس میں سے صرف جبریل کو پہچان کر اُس پر

اعتراض نہ کرتا، یقیناً عائشہ کے پاس اُس کی کچھ الگ تصویریں بھی تھیں، اور وہ

تصویریں وہ کہاں سے لے سکتی تھی...؟ یقیناً فیس بک سے جہاں وہ اُس زمانے میں اپنی

تصویریں باقاعدگی سے upload کیا کرتا تھا اور اُس سے بھی بڑھ کر حمین... وہ اُس کے بارے میں بہت سوچنا نہیں چاہتا تھا، لیکن سوچتا چلا گیا تھا۔ احسن سعد سے ملاقات کے بعد عائشہ عابدین کے لئے اُس کی ہمدردی میں دس گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ اگلے دن ٹھیک وقت پر اُس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑا تھا اور پہلی بیل پر ہی عائشہ عابدین نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ شاید پہلے ہی اُس کی منتظر تھی۔ سیاہ ڈھیلے پاجامے اور ایک بلوٹی شرٹ کے ساتھ flip flops پہنے، اپنے بالوں کو ایک ڈھیلے جوڑے کی شکل میں سمیٹے وہ جبریل کو پہلے سے بہتر لگی تھی، اُس کی آنکھوں کے حلقے بھی کم تھے۔ وہ بے حد خوبصورت تھی اور سولہ سال کی عمر میں بھی اُس سے نظریں ہٹانا مشکل ہوتا تھا۔ اُس کا چہرہ اب بھی کسی کی نظروں کو روک سکتا تھا۔ جبریل کو احساس ہوا۔

”وعلیکم اسلام۔“ وہ اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اُس نے جبریل کے ہاتھوں میں اُس چھوٹے سے گلدستے کو دیکھا جس میں چند سفید اور گلابی پھول تھے اور اُس کی ساتھ ایک کوکیز کاپیک... اُس کا خیال تھا وہ دونوں چیزیں اُسے تھمائے گا۔ لیکن وہ دونوں چیزیں اٹھائے اندر چلا گیا تھا۔

کچن کاؤنٹر پر اُس نے پہلے پھول رکھے، پھر کوکیز کا وہ پیک اور پھر وہاں پڑے کافی کے اُس مگ کو دیکھا جس میں سے بھاپ اُڑ رہی تھی۔ وہ یقیناً اُس کے آنے سے پہلے وہ پی رہی تھی۔ ایک پلیٹ میں آدھا آملیٹ تھا اور چند چکن سائیسجز... وہ ناشتہ کرتے کرتے اُٹھ کر گئی تھی۔

”میں بہت جلدی آگیا ہوں شاید؟“ جبریل نے پلٹ کر عائشہ کو دیکھا جو اب اندر آگئی تھی۔

”نہیں میں دیر سے جاتی ہوں... آج سنڈے تھا، اور رات کو ہاسپٹل میں ڈیوٹی تھی۔“ اُس نے جواباً جبریل سے کہا۔

”آپ کا سنڈے خراب کر دیا میں نے۔“ جبریل نے مسکراتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ وہ اب لاؤنج میں پڑے صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ عائشہ کا دل چاہا اُس سے کہے... اُس کی زندگی میں ہر دن پہلے ہی بہت خراب تھا، وہ کچھ نہیں بولی تھی اور کچن کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

”یہ آپ میرے لئے لائے ہیں؟“ جبریل نے اُسے پھول اُٹھاتے ہوئے دیکھا۔

”جی ”اُس نے جواباً کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ”اُس نے جبریل کو دیکھا، پھر انہیں ایک vase میں ڈالنے لگی۔

”یہ بھی جانتا ہوں۔ ”جبریل نے کہا۔ اُن پھولوں کو اُس vase میں ڈالتے ہوئے عائشہ کو خیال آیا کہ وہ شاید دو، ڈھائی سال کے بعد اپنے لئے کسی کے لئے ہوئے پھولوں کو چھو رہی تھی۔ آخری بار اُس کے گھر آنے والے پھول اسفند کے لئے اُس کے کچھ عزیز واقارب کے لئے ہوئے پھول تھے۔ اُس نے ان تکلیف دہ یادوں کو جیسے سر سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

”آپ بریک فاسٹ کر لیں، ہم پھر بات کرتے ہیں۔ ”جبریل کی آواز نے اُسے چونکا یا۔ وہ سینٹر ٹیبل پر پڑی اون سلاٹیاں اٹھا کر دیکھ رہا تھا... بے حد amused انداز میں...

”یہ آپ کا شوق ہے؟ ”اُس نے سکارف کے اُس حصے کو چھوتے ہوئے کہا، جو ادھ بُنا تھا۔

”وقت گزارنے کی ایک کوشش ہے۔“ آملیٹ کی پلیٹ سے آملیٹ کا ایک ٹکڑا کانٹے کی مدد سے اٹھاتے ہوئے عائشہ نے جواب دیا۔

”اچھی کوشش ہے۔“ جبریل نے مسکراتے ہوئے اون سلائیوں کو دوبارہ اُس باکس میں رکھا جس میں وہ پڑے تھے۔

”آپ یہ کافی لے سکتے ہیں... میں نے ابھی بنائی تھی... پی نہیں... میں اپنے لئے اور بنا لیتی ہوں۔“ اُس نے کافی کا مگ لا کر اُس کے سامنے ٹیبل پر پڑے ایک mat

پر رکھ دیا تھا، وہ خود دوبارہ ناشتہ کرنے کچن کاؤنٹر کے پاس پڑے سٹول پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

”میرا خیال تھا آپ مجھے ناشتہ کی بھی آفر کریں گی۔“ جبریل نے مسکراتے ہوئے اُس سے کہا۔

”میں نے اس لئے آفر نہیں کی کیونکہ آپ قبول نہیں کرتے۔“ اُس نے سا سبجز کے ٹکڑے کرتے ہوئے جواباً کہا۔

”ضروری نہیں“ جبریل نے اصرار کیا۔

”آپ ناشتہ کریں گے؟“ ٹھک سے اُس سے پوچھا گیا۔

”نہیں...“ جبریل نے کہا اور پھر بے ساختہ ہنسا ”میں ناشتہ کر کے آیا ہوں، اگر پتہ ہوتا کہ آپ کروا سکتی ہیں تو نہ کر کے آتا۔ Assumptions بڑی نقصان دہ ہوتی ہیں۔“ اُس نے کہا، عائشہ خاموشی سے اُس کی بات سنتے ہوئے ناشتہ کرتی رہی۔

”میں آپ کی کال کا انتظار کرتا رہا تھا... اس توقع کے باوجود کہ آپ کال نہیں کریں گی۔“ جبریل نے اُس سے کہا۔ وہ کافی کے سپ لے رہا تھا۔ عائشہ نے چکن سا سبزی کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے اُسے دیکھا۔ اُسے ایک کاغذ پر لکھا ہوا Sorry کا وہ لفظ یاد آ گیا تھا جو وہ اُسے ایک لفافے میں دے کر گیا تھا اور جسے دیکھ کر وہ بے حد الجھی تھی۔ وہ اُس سے کس بات کے لئے معذرت خواہ تھی، کس چیز کے لئے شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ کوئی وضاحت، کوئی توجیہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اتنا الجھنے کے باوجود اُس نے جبریل کو فون کر کے اُس ایک لفظ کی وضاحت نہیں مانگی تھی۔ وہ اُس شخص سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی تھی، بار بار اُس سے بات کرنا، اُس سے ملنا نہیں چاہتی تھی... ہر بار اُس کی آواز، اُس سے ملاقات عائشہ عابدین کو پتہ نہیں کیا کیا یاد دلانے لگتا تھا... کیا کیا پچھتاوا اور احساسِ زیاں تھا جو

اُسے ہونے لگتا تھا اور عائشہ اپنے ماضی کے اُس حصے میں نہیں جانا چاہتی تھی جہاں جبریل سکندر کھڑا تھا... وہ closure کر چکی تھی۔

جبریل نے اُسے کچن کاؤنٹر کے پار سٹول پر بیٹھے اپنی خالی پلیٹ پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں دیکھا، اُس نے جبریل کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ یوں جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جبریل کو سمجھ نہیں آیا وہ اُس سے جو کہنے آیا تھا، وہ کیسے کہے گا۔ اُس وقت اُس نے بے اختیار یہ خواہش کی تھی کہ کاش اُس نے اُس سر جری کے دوران ڈاکٹر ویزل کی وہ غلطی دیکھی ہی نہ ہوتی۔

”آپ کا وزٹنگ کارڈ مجھ سے کھو گیا تھا... مجھے یاد نہیں وہ میں نے کہاں رکھ دیا تھا۔“ وہ بالآخر بولی تھی اور اُس نے بے حد عجیب ایکسکیوز دی تھی اُسے... یعنی وہ اُسے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اُس نے جبریل کا نمبر save نہیں کیا ہوا تھا۔

کچھ کہنے کے بجائے جبریل نے اپنی جیب سے والٹ نکال کر ایک اور وزٹنگ کارڈ نکالا اور اُسے اون سلائیوں کے اُس ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا، ”یہاں سے گم نہ ہو شاید۔“ عائشہ نے نظریں چرائی تھیں۔ وہ پلیٹیں اٹھاتے ہوئے انہیں سنک میں رکھ آئی۔

”آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔“ اپنے لئے کافی بناتے ہوئے اُس نے بالآخر

جبریل کو وہ ایشویا دد لایا جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔

”احسن سعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جبریل نے اُس سے کہا۔ اُس کا خیال تھا وہ بری طرح چونکے گی۔

”میں جانتی ہوں۔“ وہ انتہائی غیر متوقع جواب تھا۔ جبریل چند لمحے بول نہیں سکا۔ وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کافی کو اس انہماک سے بنا رہی تھی جیسے اُس کی زندگی کا مقصد کافی کا وہ کپ بنانا ہی تھا۔

”اُس نے مجھے کال کی تھی۔“ جبریل کی خاموشی کو جیسے اُس نے decode کرتے ہوئے مزید کہا۔ جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اب کیا کہے... اگر احسن سعد نے اُسے کال کی تھی جبریل سے ملاقات کے بعد تو یہ ممکن نہیں تھا کہ اُس نے عائشہ کو اسفند کی سر جری کے حوالے سے اُس کے اعتراف کے حوالے سے کچھ نہ کہا ہو... اور اگر اُس نے عائشہ سے ذکر کیا تھا تو عائشہ اس وقت اتنے پرسکون انداز میں اُس کے سامنے کیسے بیٹھی رہ سکتی تھی۔ احسن سعد نے جبریل کے کام کو مشکل سے آسان کر دیا تھا، مگر اب اس کے بعد اگلا سوال جبریل کو سوجھ نہیں رہا تھا۔

وہ اب اپنا کافی کا مگ لئے اُس کے سامنے صوفہ پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

”اب آپ کو یہ تو پتہ چل گیا ہو گا کہ میں کتنی گناہ گار اور قابل نفرت ہوں۔“ عائشہ عابدین کے لہجے میں عجیب اطمینان تھا یوں جیسے وہ خود پر ملامت نہیں، اپنی تعریف کر رہی ہو۔ جبریل اُسے دیکھتا رہا۔ عائشہ عابدین کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا... وہ تکلیف اور درد بھی نہیں جو جبریل نے ہر بار اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا... وہ شرمندگی اور ندامت بھی نہیں جو ہر بار اُس کی آنکھوں میں جھلکتی تھی... اُس کی آنکھوں میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اُس کے جملے نے جبریل کے سارے لفظوں کو گونگا کر دیا تھا۔

احسن نے آپ کو یہ بتایا کہ سر جری میں... ”جبریل کو پتہ نہیں کیوں شبہ ہوا کہ شاید احسن نے اُسے کچھ نہیں بتایا اور نہ عائشہ عابدین کی زبان پر کچھ اور سوال ہونا چاہیے تھا۔

”ہاں“ اُس یک لفظی جواب نے جبریل کو ایک بار پھر کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، وہ اب اُسے نہیں دیکھ رہی تھی اُس کافی کے مگ سے اُٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی جو اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ یوں جیسے وہ ہاتھوں میں کوئی کر سٹل بال لئے بیٹھی ہو، جس میں اپنا مستقبل دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ماضی وہ تھا جسے وہ بھولنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی اور حال میں اُسے دلچسپی نہیں تھی... وہ زندگی کے اُس حصے سے بس آنکھیں بند کر کے گزرنا چاہتی تھی، احسن سعد کی چلائی ہوئی آواز اُس کے

کانوں میں گونج رہی تھی...

”گالی... گالی... گالی... اور گالیاں...“ وہ فون کان سے لگائے کسی میکاکی انداز میں وہ گالیاں سُن رہی تھی جو کئی سال اُس کی زندگی کے شب و روز کا حصہ رہی تھیں... اور وہ اُنہیں سنتے ہوئے اب immune ہو چکی تھی، اُن برے لفظوں کا زہر اب اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑتا تھا، نہ اُسے شرم محسوس ہوتی تھی، نہ تذلیل، نہ ہتک، نہ غصہ، نہ پریشانی... طلاق کا کیس چلنے کے دوران، طلاق ہونے کے بعد اور اسفند کی کسٹڈی کے کیس کے دوران بھی احسن کا جب دل چاہتا تھا، وہ اُسے اسی طرح فون کرتا تھا اور یہی سارے لفظ دہراتا تھا، جو اُس نے اب بھی دہرائے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اُس کی کال نہ لینے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی... نفسیاتی طرف پر وہ اس قدر خائف تھی کہ اُسے یوں لگتا تھا وہ اُس کی کال نہیں سُنے گی تو وہ اُس کے گھر آجائے گا... وہ اُسے یہی کہتا تھا اور وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ امریکہ میں تھی... اُس کی ایک کال پر پولیس احسن سعد کو کبھی اُس کے گھر کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیتی... لیکن عائشہ اتنی بہادر ہوتی تو اُس کی زندگی ایسی نہ ہوتی۔ Abuse کی ایک قسم وہ تھی جو اُس نے اپنی شادی قائم رکھنے کے لئے، ایک اچھی بیوی اور اچھی مسلمان عورت بننے کی جدوجہد کرتے ہوئے سہی

تھی۔ Abuse کی دوسری قسم وہ تھی جو اُس نے اسفند کی زندگی میں باپ نام کی اُس محرومی کو نہ آنے کے لئے سہی تھی، جو خود اُس کی زندگی میں تھی۔

اسفند کے ایک کندھے میں پیدائشی نقص تھا، وہ اپنا بازو ٹھیک سے اٹھا نہیں پاتا تھا اور وہ slow learner تھا... اور اُس کے یہ دونوں ”نقائص“ احسن سعد اور اُس کی فیملی کے لئے ناقابل یقین اور ناقابل معافی تھی۔ اُن کی سات نسلوں میں کبھی کوئی بچہ کسی ذہنی یا جسمانی نقص کا شکار کبھی نہیں ہوا تھا... تو اُن کے گھر میں اسفند کی پیدائش کیسے ہو گئی تھی... یہ بھی عائشہ کا قصور تھا... اُس کے جینز کا... اُس کے اعمال کا... وہ اُس کا عذاب اور سزا تھی... احسن سعد اور اُس کی فیملی کے لئے آزمائش کیوں بنا تھا۔ اور عائشہ کے کھوکھلے لفظ اب بالکل گونگے ہو گئے تھے۔ اُسے بھی یقین تھا اُس کی اولاد کی یہ تکلیف اُس کے کسی گناہ کا نتیجہ تھی پر کیا گناہ... یہ سوال وہ تھا جس کا جواب اُسے نہیں ملتا تھا، اور اُس معذور اولاد کے ساتھ اُس نے احسن سعد کی اطاعت کی ہر حد پار کر لی تھی، صرف اس لئے کیونکہ اُسے لگتا تھا اُس کے بیٹے کو باپ کی ضرورت تھی۔ وہ اکیلی اُسے کیسے پالتی... وہ اسفند کی پیدائش کے بعد امریکہ آگئی تھی... اور یہاں احسن نے اُسے ریڈیٹنسی کرنے کے لئے کہا تھا کیونکہ وہ financially اتنی ذمہ داریاں پوری

نہیں کر سکتا تھا۔ عائشہ نے سوچے سمجھے بغیر اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ احسن کو یک دم ایسے کون سے finances نظر آنے لگے تھے جس کے لئے اس کا کام کرنا بھی ضروری تھا۔ اور وہاں آنے کے ایک سال بعد اُسے پتہ چلا تھا کہ اُس کے امریکہ آنے کے چند مہینے بعد ہی احسن نے پاکستان میں دوسری شادی کر لی تھی، وہ اب بہت frequently پاکستان آ جا رہا تھا اور عائشہ کو کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ اُس کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آچکی تھی۔ وہ انکشاف کسی نے اُس کی فیملی کے سامنے کیا تھا جو احسن سعد کی دوسری بیوی اور اُس کے خاندان کو جانتا تھا۔ عائشہ عابدین کو سمجھ ہی نہیں آئی تھی کہ وہ اس خبر پر کس ردِ عمل کا اظہار کرتی، یہ سب فلموں اور ڈراموں میں ہوتا تھا مگر اُس کے ساتھ ہوا تھا تو اُسے فلمیں اور ڈرامے بھی ہیچ لگنے لگے تھے۔

احسن سعد نے بے حد ڈھٹائی سے دوسری شادی کا اعتراف کیا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور چار شادیاں بھی کر سکتا تھا اور یہاں تو اُس کے پاس ایک بے حد مضبوط وجہ تھی، کہ اُس کی بیوی اُسے صحت مند اولاد نہیں دے سکتی تھی جو اُس کی دوسری بیوی اُسے دے گی۔ زندگی میں وہ پہلا لمحہ تھا جب عائشہ عابدین تھک گئی تھی اور اُس

نے احسن سعد اور اُس کی فیملی کے بجائے اپنی فیملی کی بات مانتے ہوئے اُس سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا، اور اُس فیصلے نے احسن سعد کے ہوش اُڑا دیے تھے۔ اُسے عائشہ عابدین سے ایسے ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ اسفند کے نام کچھ جائیداد تھی جو عائشہ کے نانانے عائشہ کے نام کرنے کے بجائے جائیداد کی تقسیم کے دوران اُس کے بیٹے کے نام gift کی تھی اور عائشہ کے احسن سعد کے لئے valuable ہونے کی یہ بڑی وجہ تھی۔ اُسے عائشہ کے کردار پر شک تھا اُس کی بے عمل اور بے ہدایتی پر شکایت تھی، لیکن اس سب کے باوجود وہ عائشہ کو آزاد کرنے تیار نہیں تھا۔ مگر اُس کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوا تھا... عائشہ کی طلاق کی proceedings کے دوران پاکستان میں احسن سعد کی دوسری بیوی نے بھی شادی کے آٹھ ماہ بعد خلع کا کیس فائل کر دیا تھا۔ احسن سعد اور اس کی فیملی نے اس کے بعد کچھ مشترکہ فیملی فرینڈز کے ذریعے مصالحت کی بے انتہا کوشش کی تھیں مگر... عائشہ کی فیملی نے ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا، اور عائشہ اس سارے عرصہ میں ایک کپچوے کی مانند رہی تھی، جو ہو رہا تھا وہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر جو بھی ہو رہا تھا، وہ خود نہیں کرنا چاہتی تھی... وہ تب بھی یہ فیصلہ نہیں کر پارہی تھی کہ وہ صحیح کر رہی تھی یا غلط... اللہ کے نزدیک اُس کا یہ عمل گناہ تھا یا نہیں... اور اگر وہ گناہ تھا تو وہ چاہتی تھی یہ گناہ کوئی اور اپنے سر لے لے

لیکن اُسے احسن سعد سے نجات دلادے۔

جس دن اُس کی طلاق فائنل ہوئی تھی، اُس دن اُس نے حجاب اُتار دیا تھا کیونکہ اُسے یقین تھا اب وہ کتنی بھی نیکیاں کر لے، وہ اللہ کی نظروں میں گناہ گار ہی تھی... احسن سعد نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ نہیں کی تھی، اُس نے اُسے اُس دین سے بھی برگشتہ کر دیا تھا جس کی پیروکار ہونے پر عائشہ عابدین کو فخر تھا۔

”تمہارے یار کو بتا آیا ہوں تمہارے سارے کرتوت۔“ احسن سعد نے فون پر دھاڑتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ ”تم کیا پلان کر رہی ہو کہ میرے بیٹے کو مار کر تم اپنا گھر بساؤ گی، رنگ رلیاں مناؤ گی... میں تو صرف تمہیں جیل نہیں بھیجوں گا، تمہارے اس یار کو بھی بھیجوں گا جس نے میرے بیٹے کا آپریشن کر کے جان بوجھ کر اُسے مارا اور اُس نے اپنی زبان سے مجھے بتایا ہے۔“ وہ بکتا، جھکتا بولتا ہی چلا گیا اور وہ سنتی رہی تھی۔

”عائشہ...“ جبریل کی آواز نے ایک بار پھر اُسے چونکایا۔ اُس کے ہاتھوں میں موجود کافی کے مگ سے اب بھاپ اُٹھنا بند ہو چکی تھی۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ عائشہ نے سر اٹھا کر جبریل کو دیکھا۔ وہ اب اُسے بتا رہا تھا کہ اس آپریشن کے دوران کیا ہوا تھا... اور اُسے یقین نہیں تھا، صرف اس کا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر ویزل سے اُس آپریشن میں کچھ

غلطیاں ہوئی تھیں... اور قصور وار نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ یہ اُس کی بے وقوفی ہی تھی کہ وہ یہ انکشاف احسن سعد کے سامنے کر بیٹھا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں... آپ کو کچھ نہیں ہوگا... احسن سعد آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“ اُس کی بات کے اختتام پر عائشہ کی زبان سے نکلنے والے جملے نے جبریل کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اُسی طرح پر سکون تھی، وہ اگر ایک شدید جذباتی ردِ عمل کی توقع کر رہا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ کسی عرصے کا اظہار، کوئی ملامتی لفظ... کچھ بھی نہیں... وہ جواباً اُسے تسلی دے رہی تھی کہ اُسے کچھ نہیں ہوگا۔

”میں نے احسن کو بتا دیا ہے کہ میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو مانتے ہوئے کورٹ میں اسفند کے قتل کا اعتراف کر لوں گی۔“ اُس کے اگلے جملے نے جبریل کا دماغ جیسے بھک سے اڑا دیا تھا۔

”تم سے کوئی ملنے آیا ہے!“ جیل کے ایک سنتری نے ایک راہداری جتنی لمبی بیرک کی ایک دیوار کے ساتھ چادر زمین پر ڈال کر سوئے اُس بوڑھے آدمی کو بڑی رعونت کے عالم میں اپنے جوتے کی ٹھوک سے جگایا تھا۔ وہ ہڑ بڑایا نہیں، ویسے ہی پڑا رہا اور لیٹے

لیٹے اُس نے آنکھیں کھول کر سر پر کھڑے اُس سنتری کو دیکھا۔ اُسے یقین تھا اُسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اُس سے ملنے کون آسکتا تھا۔ پچھلے بارہ سالوں سے تو کوئی نہیں آیا تھا، پھر اب کون آئے گا۔

”ارے اُٹھ... مرا پڑا ہے... سنا نہیں ایک بار کہ کوئی ملنے آیا ہے۔“ سنتری نے اس بار کچھ زیادہ طاقت سے اُسے ٹھوکر ماری تھی، وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا، ”کون آیا ہے؟“ اُس نے سنتری سے پوچھا۔ ”وہی میڈیا والے کتے۔“ سنتری نے گالی دی، ”سزائے موت کے قیدیوں سے انٹرویو کرنا ہے اُنہیں۔“ اُس نے ایک بار پھر لیٹنے کی کوشش کی لیکن سنتری کے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کی حرکت نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اُس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ ان میڈیا والوں سے بے زار تھا اور NGO والوں سے بھی جو وقتاً فوقتاً وہاں سروے کرنے آتے تھے... اُن کے حالاتِ زندگی جاننے، اُن کے جرم کی وجوہات کریدنے، جیل کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے... وہ جیسے سرکس کے جانور تھے جنہیں اُن کے سامنے پیش ہو کر بتانا پڑتا کہ انہوں نے جو کیا، کیوں کیا کیا اب اُنہیں پچھتاوا تھا اور کیا اُنہیں اپنے گھر والے یاد آتے تھے...

بے زاری کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اُس سنتری کے پیچھے چلتا گیا جو اُس سے

بیرک سے نکال کر ملاقاتیوں والی جگہ کے بجائے جیلر کے کمرے میں لے آیا تھا۔ اور وہاں غلام فرید نے پہلی بار اُن چار افراد کو دیکھا جن میں سے دو گورے تھے اور دو مقامی خواتین... وہ چاروں انگلش میں بات کر رہے تھے اور غلام فرید کے اندر داخل ہوتے ہی اُن کے اور جیلر کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی اور پھر جیلر اُس سنتری کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا۔

”غلام فرید؟“ ایک عورت نے جیسے تصدیقی انداز میں اُس سے پوچھا تھا۔ غلام فرید نے سر ہلایا۔ ”بیٹھو“ اُسی عورت نے اشارے سے سامنے پڑی ایک کرسی پر اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ غلام فرید کچھ زورس ہوا تھا، لیکن پھر وہ جھجھکتا سکڑتا سمٹا اُن کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک گورے نے اُس کے بیٹھتے ہی ہاتھ میں پکڑے ایک فون سے اُس کی کچھ تصویریں لی تھیں... جس عورت نے اُس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا وہ اب پنجابی میں اُس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کس جرم میں کب وہاں آیا تھا۔ غلام فرید نے رٹے رٹائے طوطے کی طرح اُس کے ان دس بارہ سوالات کا جواب دیا تھا، اور پھر انتظار میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ اب ان بنیادی سوالات کے بعد ایک بار پھر سے اُس کے مجرم کو کُریڈنا شروع کریں گے پھر جیل میں اُس کی زندگی کے بارے میں پوچھیں گے اور

پھر...

مگر اُس کی توقع غلط ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے اُس کی زبانی اُس کا نام، ولدیت، رہائش، جرم کی نوعیت اور جیل میں آنے کے سال کے بعد اُس سے پوچھا تھا۔

”جیل سے باہر آنا چاہتے ہو غلام فرید؟“ وہ گورا تھا مگر اُس سے شستہ اُردو میں بات

کر رہا تھا غلام فرید کو لگا اُسے سننے میں کچھ دھوکہ ہوا تھا۔

”جیل سے باہر آنا چاہتے ہو؟“ اُس آدمی نے جیسے اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھ

لئے تھے۔ جیل سے باہر...؟ غلام فرید نے سوچا... ایک لمحہ کے لئے... کیا وہ جیل سے

باہر آنا چاہتا تھا... پھر اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ جو اُس آدمی کے لئے جیسے غیر متوقع تھا۔

”کیوں؟“ اُس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

”باہر آ کر کیا کروں گا؟“ غلام فرید نے جواباً کہا تھا۔ ”نہ کوئی گھر ہے نہ خاندان اور اس

عمر میں محنت مزدوری نہیں ہوتی... جیل ٹھیک ہے... یہاں سب ملتا ہے۔“ غلام فرید

نے کہا تھا، اُس نے سوچا تھا اب سروے کے سوال بدل گئے تھے۔

”اگر تمہیں ڈھیر سا پیسہ، ایک شاندار سا گھر اور ایک بیوی بھی مل جائے تو بھی باہر آنا

نہیں چاہتے؟ زندگی نئے سرے سے شروع کرنا نہیں چاہتے؟ ”اس بار دوسری عورت نے اُس سے کہا تھا۔

بہت سارا پیسہ...؟ غلام فرید نے سوچا... بہت سارے پیسے کی خواہش نے ہی تو مسئلہ پیدا کیا تھا اُس کے لئے... اُسے پتہ نہیں کیا کیا یاد آیا تھا... اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی جب وہ سوچتا تھا تو اُسے سب یاد آ جاتا تھا... اپنی کڑوی زبان والی بیوی جس کے وہ عشق میں گرفتار تھا اور جو کبھی شہد جیسی میٹھی تھی... اور وہ بچے... ایک دو سال کے وقفے سے باری باری پیدا ہونے والے نو بچے جن میں سے چند بڑوں کے علاوہ اُسے اب کسی کا نام اور شکل یاد نہیں تھی... وہ مولوی جو اُس کا دشمن تھا... اور وہ سود جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا، اُسے آج بھی وہ رقم یاد تھی جو اُس نے سود پر لی تھی اور وہ رقم بھی جو بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک دن وہ اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔

”سالار سکندر یاد ہے تمہیں؟“ اُس کو خاموش دیکھ کر اُس گورے نے غلام فرید سے پوچھا تھا۔ غلام فرید کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت آئی تھی۔ جھریوں سے بھرے چہرے، بڑھے بالوں اور بے ترتیب داڑھی کے ساتھ پھٹے پرانے ملگجے کپڑوں میں وہاں ننگے پاؤں بیٹھے بھی اُسے سالار سکندر یاد تھا... اور اُس کا باپ... اور وہ نفرت

بھی جو اُس کے دل میں اُن کے لئے تھی اور بہت سے اُن دوسرے لوگوں کے لئے بھی جنہوں نے اُس کا استعمال کیا تھا۔

غلام فرید نے زمین پر تھوکا تھا۔ کمرے میں بیٹھے چاروں افراد کے چہروں پر مسکراہٹ اُبھری۔

”میرے بچپن میں میری زندگی میں جتنا بڑا رول آپ لوگوں کی فیملی کا تھا، پچھلے پانچ سالوں میں اتنا ہی بڑا رول اس شخص کا ہے۔“ عبداللہ نے عنایہ کو بتایا تھا۔ چند ہفتوں بعد ہونے والی اپنی منگنی سے پہلے یہ اُن کی دوسری ملاقات تھی۔ عنایہ ایک سیمینار میں شرکت کے لئے کیلی فورنیا آئی تھی اور عبداللہ نے اُسے ڈنر پر بلایا تھا، وہ اُسے ڈاکٹر احسن سعد سے ملوانا چاہتا تھا جو اُسی کے ہاسپٹل میں کام کرتے تھے اور وہ ہمیشہ سے اُن سے بہت متاثر تھا۔ عنایہ نے کئی بار اُس سے پچھلے سالوں میں اس شخص کے حوالے سے سُننا تھا جس سے وہ اب تھوڑی دیر میں ملنے والی تھی۔

”مسلمان ہونا آسان تھا میرے لئے... لیکن مسلمان رہنا اور بننا بڑا مشکل تھا... ڈاکٹر احسن نے یہ کام بڑا آسان کر دیا میرے لئے۔ جبریل کے بعد یہ دوسرا شخص ہے جسے

میں رول ماڈل سمجھتا ہوں کہ وہ دین اور دُنیا دونوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ ”
 عبد اللہ بڑے پر جوش انداز میں عنایہ کو بتا رہا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے سُن رہی تھی۔
 عبد اللہ جذباتی نہیں تھا بے حد سوچ سمجھ کر بولنے والوں میں سے تھا اور کسی کی بے جا
 تعریف کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

”کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہو تم اُن سے۔“ عنایہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ ہنس
 پڑا، ”تم jealous تو نہیں ہو رہی؟“ اُس نے عنایہ کو tease کیا، ”ہوئی تو
 نہیں لیکن ہو جاؤں گی۔“ اُس نے جو اب مسکراتے ہوئے کہا ”مجھے یقین ہے تم اُن سے
 ملو گی تو تم بھی میری ہی طرح متاثر ہو جاؤ گی اُن سے۔“ عبد اللہ نے کہا ”میں اپنے نکاح
 میں ایک گواہ اُنہیں بناؤں گا“ عنایہ اس بار قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔ ”عبد اللہ تم اس قدر
 inspired ہو اُن سے؟ مجھے تھوڑا بہت تو اندازہ تھا لیکن اس حد تک نہیں... مجھے
 اب اور اشتیاق ہو رہا ہے اُن سے ملنے کا۔“ عنایہ نے اُس سے کہا، ”وہ یقیناً بڑے اچھے
 شوہر بھی ہوں گے اگر تم نکاح میں بھی اُنہیں گواہ بنانا چاہتے ہو تو۔“ عنایہ کو مزید
 تجسس ہوا تھا۔

”بس اس ایک معاملے میں خوش قسمت نہیں رہے وہ۔“ عبد اللہ یک دم سنجیدہ ہو گیا

”اچھی بیوی ایک نعمت ہوتی ہے اور بُری ایک آزمائش... اور اُنہیں دوبار اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اُن کی نرمی اور اچھائی کا ناجائز فائدہ اٹھایا اُن کی بیویوں نے۔“ عبداللہ کہہ رہا تھا ”Ohhh that’s sad“ عنایہ نے کریدے بغیر افسوس کا اظہار کیا۔

”تمہیں پتہ ہے تم سے شادی کے لئے بھی میں نے اُن سے بہت دُعا کروائی تھی اور دیکھ لو اُن کی دعا میں کتنا اثر ہے ورنہ تمہارے پیرنٹس آسانے سے ماننے والے تو نہیں تھے۔“ عبداللہ اب بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا ”میرے پیرنٹس کسی کی دعاؤں کے بجائے تمہارے کردار اور اخلاص سے متاثر ہوئے ہیں عبداللہ۔“ عنایہ نے اُسے بتایا۔

اسے اپنی بے یقینی کا وہ عالم ابھی بھی یاد تھا جب چند مہینے پہلے عبداللہ سے پاکستان میں ملنے کے بعد امامہ نے اُسے فون کیا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ انہوں نے اُس کا رشتہ امریکہ میں مقیم ایک ہارٹ سرجن کے ساتھ طے کر دیا تھا، وہ کچھ دیر کے لئے بھونچکا رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے جو بھی پروپوز لزا اُس کے لئے زیرِ غور آتے تھے، عنایہ سے مشورہ کیا جاتا تھا اور پھر اُسے ملوایا جاتا تھا۔ یہ پہلا پروپوزل تھا جس کے بارے میں اُسے اُس وقت اطلاع دی جا رہی تھی جب رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ عجیب صدمے کی حالت میں

اُس نے امامہ سے کہا تھا ”مگر مئی آپ کو مجھے پہلے ملوانا چاہیے تھا اُس سے... اُس کے بارے میں تو مجھ سے کچھ پوچھنا تک نہیں آپ نے۔“

”تمہارے بابا نے بات طے کی ہے۔“ امامہ نے جواباً کہا۔ عنایہ خاموش ہو گئی۔ عجیب دھچکا لگا تھا اُسے ”تم نہیں کرنا چاہتی؟“ امامہ نے اُس سے پوچھا تھا۔ ”نہیں میں نے ایسا نہیں کہا، پہلے بھی آپ لوگ ہی کو کرنا تھا تو ٹھیک ہے۔“ عنایہ نے کچھ بجھے دل کے ساتھ کہا تھا۔ اُسے عبد اللہ یاد آیا تھا اور بالکل اُسی لمحے امامہ نے اُس سے کہا ”عبد اللہ نام ہے اُس کا۔“ نام سُن کر بھی لحظہ بھر کے لئے بھی اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایرک عبد اللہ کی بات کر رہی تھیں۔ امامہ اس قدر کٹر مخالف تھیں ایرک عبد اللہ سے شادی کی کہ عنایہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ جس عبد اللہ کا اتنے دوستانہ انداز میں ذکر کر رہی تھیں، وہ وہی تھا۔

”Ok“ عنایہ نے بمشکل کہا ”تم سے ملنا بھی چاہتا ہے وہ... نیویارک آیا ہوا ہے، میں نے اُسے تمہارا ایڈریس دیا تھا۔“ امامہ کہہ رہی تھی، عنایہ نے بے ساختہ کہا ”مئی پلیز اب اس طرح میرے سر پر مت تھوپیں اُسے کہ آج مجھے رشتہ طے ہونے کی خبر دے رہی ہیں اور آج ہی مجھے اُس سے ملنے کا بھی کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی اب رشتہ طے ہو گیا

ہے، ملنے نہ ملنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ”اُس نے جیسے اپنے اندر کا غصہ نکالا تھا۔ ”اُس کی فیملی بھی شاید ساتھ ہو... اُس کی مُمی سے بات ہوئی ہے میری... اگلے ٹرپ پر میں بھی ملوں گی اُس کی فیملی سے... منگنی کا فارمل فنکشن تو چند مہینوں بعد ہوگا۔ ”امامہ نے اس طرح بات جاری رکھی تھی جیسے اُس نے عنایہ کی خفگی کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔

عنایہ صدمہ کی حالت میں اگلے ایک گھنٹے تک وہیں بیٹھی رہی تھی اور ایک گھنٹے کے بعد اُس کے دروازے پر بیل بجنے پر اُس نے جس شخص کو دیکھا تھا، اُسے لگا تھا سردیوں کے موسم میں ہر طرف بہار آگئی تھی۔ گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول ٹہنی سمیت اُسے پکڑتے ہوئے دروازے پر ہی اُس نے عنایہ سے پھاوڑا مانگا تھا تاکہ اُس کے دروازے کے باہر پڑی برف ہٹا سکے۔ وہ کئی سالوں بعد مل رہے تھے اور عنایہ کو وہی ایرک یاد آیا تھا جو اکثر اُن کے گھر میں لگے پھول ہی توڑ توڑ کر اُس کو اور امامہ کو لاکر دیا کرتا تھا اور جس کی favorite hobby سردیوں میں اپنے اور اُن کے گھر کے باہر سے برف ہٹانا تھی۔ ”He is here” عبداللہ کی آواز اُسے خیالوں سے باہر لے آئی تھی۔ وہ ریستورنٹ کے دروازے پر نمودار ہونے والے کسی شخص کو دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ عنایہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ احسن سعد سے اُس کی پہلی ملاقات تھی۔

اُسے اندازہ نہیں تھا اُس سے ہونے والا اگلا سا مناس کی زندگی میں کتنا بڑا بھونچال لانے والا تھا۔

”تمہارے لئے کوئی لڑکی دیکھیں؟“ امامہ نے حمین سے اُس صبح ناشتے کی ٹیبل پر کہا تھا۔ وہ اُن کے پاس چند دنوں کے لئے پاکستان آیا ہوا تھا۔ یہ اُس کی روٹین میں شامل تھا بناتائے کچھ دنوں کے لئے امامہ اور سکندر عثمان سے ملنے آجانا۔ اپنی زندگی اور بزنس کی بے پناہ مصروفیات میں بھی وہ کبھی یہ نہیں بھولتا تھا۔

”صرف ایک لڑکی؟“ حمین نے بڑی سنجیدگی سے امامہ سے کہا جو اُس کی پلیٹ میں کچھ اور آملیٹ ڈال رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ عرصہ سے ہر بار اُس کے پاکستان آنے پر اسے شادی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھی، وہ ہنس کر ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔

”میں سیریس ہوں... مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ امامہ نے اُسے گھورا تھا۔

”باقی تینوں میں سے ہر ایک آزاد پھر رہا ہے تو میں نے کیا گناہ کیا ہے۔“ حمین نے اُس سے کہا تھا۔

”جبریل کے پاس ابھی شادی کے لئے وقت نہیں... عنایہ کی تو ریڈیو نسی مکمل ہوتے ہی کر دوں گی... ریسیہ اور تمہارے لئے اب تلاش شروع کرتی ہوں۔“ امامہ نے اپنے لئے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

”You should do something more productive“

حمین نے اُسے چھیڑا ”مثلاً؟“ اُس نے جواباً بڑی سنجیدگی سے اُس سے پوچھا۔ ”ڈھونڈتا ہوں آپ کے لئے کوئی productive کام۔“ حمین نے آملیٹ کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہاں کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے... اور اس عمر میں نئے سرے سے کوئی activity ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے، اتنے سالوں سے ایک routine کی عادی ہوں اور پاپا کو اس طرح گھر چھوڑ کر میں کوئی activity ڈھونڈنا بھی نہیں چاہتی۔“ امامہ نے اُس سے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا، یوں جیسے اُسے خدشہ ہو وہ واقعی اُس کے لئے کوئی activity ڈھونڈنے نہ چل پڑے، وہ تھا بھی تو ایسا ہی۔

حمین نے امامہ کو بڑے پیار سے دیکھا۔ وہاں اسلام آباد کے ایک گھر میں اپنی منتخب کردہ گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہوئے بھی وہ اُن سب کی زندگی کا محور تھیں۔ حمین نے

جو سال بچپن میں یہاں سالار اور جبریل کی عدم موجودگی میں امامہ کے ساتھ گزارے تھے، وہ اُن دونوں کو بہت قریب لے آئے تھے۔ وہ اس سے پہلے اپنے ہر دکھ سکھ کی بات جبریل سے کرنے کی عادی تھی، اب حمین سے کرنے لگی تھی۔ اُس نے امامہ کی بات سننے اور ماننے کی عادت اُن ہی سالوں میں سیکھی تھی۔

”مُمی آپ نے فیملی کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔“ حمین نے یک دم پتہ نہیں کس ذہنی رو میں اُس سے کہا تھا۔ وہ اُس کی بات پر چائے کا سپ لیتے لیتے مسکرا دی تھی۔ ”ہمیشہ عورت ہی دیتی ہے حمین... میں نے کوئی الگ کام نہیں کیا۔“ اُس نے بڑی لاپرواہی سے حمین سے کہا تھا۔

”اگر آپ کو کبھی اپنے جیسی کوئی عورت ملے تو مجھے اُس سے ضرور ملوائیں ہو سکتا ہے میں شادی کر لوں اُس سے بلکہ فوراً کر لوں گا۔“ اُس نے کہا۔ امامہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرائی ”یہ تو کام بڑا آسان کر دیا ہے تم نے میرے لئے۔“ وہ بھی مسکرایا۔

”تمہارے ساتھ چلنا اور زندگی گزارنی بھی بہت مشکل ہو گا حمین... تم بھی کام کے معاملے میں اپنے بابا جیسے ہو... workaholic... جو کام سامنے پر سب کچھ بھول بیٹھے۔“ امامہ نے اُس سے کہا تھا۔ ”بابا سے موازنہ نہ کریں میرا... اُن کی اور میری سپیڈ

میں بہت فرق ہے۔ ”وہ خوش دلی سے ہنساتھا۔

”رئیسہ اچھی لڑکی ہے۔“ امامہ نے یک دم کہا تھا۔ حمین کو سمجھ نہیں آئی انہیں بیٹھے

بٹھائے رئیسہ کیوں یاد آگئی تھی۔ امامہ نے بھی اُس سے آگے کچھ نہیں کہا تھا۔

”ہاں رئیسہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“ اُس نے بھی سوچے سمجھے بغیر ماں کی بات کی تائید

کی تھی اور اُسے ہشام اور رئیسہ کا مسئلہ یاد آ گیا تھا جسے ڈسکس کرنے کے لئے وہ امامہ

کے پاس آیا تھا۔ مگر اگلے دن سکندر عثمان کی اچانک موت نے اُسے یہ کرنے نہیں دی

اُس بینکونیٹ ہال کے اوپر والے فلور کے ایک کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشوں سے

ایک اور ٹیلی سکوپک رائفل بالکل اُسی طرح اُس ٹارگٹ کلر کو نشانہ بنائے اُلٹی گنتی گننے

میں مصروف تھی۔ وہ چوتھا فلور تھا اور وہ کمرہ اس فلور کے سٹور رومز میں سے ایک تھا

جہاں پر صفائی ستھرائی اور اسی طرح کا سامان trollies میں بھرا پڑا تھا۔ جن

لوگوں نے اُس بینکونیٹ ہال میں اُس مہمان کے لئے اُس پیشہ ورانہ قاتل کا انتخاب کیا

تھا ان ہی لوگوں نے اُس قاتل کے لئے اس شخص کا انتخاب کیا تھا اور اُس جگہ کا بھی

جہاں وہ 40 سالہ شخص رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھے آنکھیں اُس ٹارگٹ کلر پر لگائے

بیٹھا تھا۔ اُس نے اس کمرے کو اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ وہ ایک ڈالی دھکیلتا ہوا اُس

کمرے میں صبح کے وقت آیا تھا جب اُس floor کے کمروں کی house
keeping ہو رہی تھی اور پھر وہ اپنی ٹرائی کو اندر رکھ کر باہر جانے کے بجائے خود
بھی اندر ہی رہ گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً کچھ اور بھی ٹرائیاں لانے والے اندر آتے اور جاتے
رہے تھے اور اُس کے ساتھ ہیلو ہائے کا تبادلہ بھی کرتے رہے تھے، مگر کسی کو اُس پر شبہ
نہیں ہوا تھا۔ ایک مقررہ وقت پر اُس نے سٹور روم کو اندر سے لاک کر لیا تھا کیونکہ
اُسے پتہ تھا اب اُس فلور کو بھی وقتی طور پر سیل کیا جانا تھا جب تک وہ کانفرنس وہاں
جاری تھی۔

سٹور روم کی کھڑکی کے شیشے میں اُس کی ٹیلی سکوپک رائفل کے لئے سوراخ پہلے سے
موجود تھا جسے tape لگا کر وقتی طور پر بند کیا گیا تھا۔ اُس نے tape ہٹانے سے
پہلے ایک دوسری ٹیلی سکوپ سے سڑک کے پاس اُس عمارت کے اُس فلیٹ کی اُس
کھڑکی کو دیکھا اور پھر اُس پیشہ ور قاتل کو جو گھات لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پھر اُس
نے اپنی کھڑکی کو دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا۔ ابھی بہت وقت تھا... اور اُس کی کھڑکی سے
اُس پیشہ ور قاتل کی کھڑکی کا view بے حد زبردست تھا۔ وہ پہلا فائر مس بھی
کر جاتا تو بھی وہ قاتل اُس کی ریج میں رہتا... بھاگتے ہوئے بھی... کھڑکی سے ہٹنے کی

کوشش کے دوران بھی... انہوں نے جیسے اُس کے لئے حلوہ بنا دیا تھا۔

اُسے یقین تھا اُس کھڑکی میں گھات لگانے کے بعد اُس پیشہ ور قاتل نے اُس ہوٹل کے اوپر نیچے کے ہر فلور کی کھڑکیوں کو اپنی ٹیلی سکوپک رائفل سے ایک بار جیسے کھوجا ہوگا... کہیں کوئی غیر معمولی حرکت یا شخص کو trace کرنے کی کوشش کی ہوگی، وہ ٹیلی سکوپک رائفل کھڑکی کے شیشے سے لگا کر بیٹھتا خود اُس کی نظر میں نہ آتا تب بھی اُس کی رائفل کی نال اُس کی نظر میں آجاتی۔ اس لئے آخری منٹوں تک وہ کھڑکی کے پاس نہیں گیا تھا۔ اُسے اُس پیشہ ور قاتل پر ایک پہلا اور آخری کارگر shot فائر کرنے کے لئے گھنٹوں چاہیے بھی نہیں تھے۔ وہ بے حد close range میں تھا۔

اور اب بالکل آخری منٹوں میں اُس نے بالآخر رائفل کو اُس سوراخ میں ٹکایا تھا۔

اُسے اُس پیشہ ور قاتل کو اُس وقت مارنا تھا جب وہ فائر کر چکا ہوتا... اُس مہمان کو صرف مارنا ضروری نہیں تھا بلکہ اُس سازش کے سارے ثبوت مٹائے جانے بھی ضروری تھے۔

گھڑی کی سوئیاں جیسے بھاگتی جا رہی تھیں... ٹک..... ٹک..... ٹک کرتے... دو انگلیاں دو

ٹریگر پر اپنا دباؤ بڑھا رہی تھیں

☆☆☆

حمین سکندر سے ہشام متاثر زیادہ تھا یا مرعوب... اُسے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا... مگر وہ اُس سے jealous تھا، اس کے بارے میں اُسے شبہ نہیں تھا۔

رئیسہ سے ملنے اور اُس کی فیملی کے بارے میں جاننے سے بھی پہلے وہ حمین سکندر کے بارے میں جانتا تھا... اپنے تقریباً ہم عمر اُس نوجوان کے بارے میں وہ اتنا ہی تجسس رکھتا تھا جتنا بزنس اور فائننس کی دُنیا میں دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص۔

ہشام کا باپ امریکہ میں سفارت کاری کے دوران بھی بہت ساری کمپنیز چلا رہا تھا اور اُن کمپنیز میں سے کچھ کا واسطہ حمین سکندر کی کمپنیز سے بھی پڑتا تھا۔ وہ خود حمین سے رئیسہ سے متعارف ہونے سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اُس کا باپ مل چکا تھا اور اُس کا مداح تھا۔ اپنی زندگی کی دوسری دہائی کے اوائل میں وہ جن بزنس ٹائیکونز سے ڈیل کر رہا تھا، وہ عمر میں اس سے دو گنا نہیں چار گنا بڑے تھے اس کے باوجود حمین سکندر کی بزنس اور فائننس کی سمجھ بوجھ کو کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ وہ بولتا تھا تو لوگ سنتے تھے۔ بیان

جاری کرتا تھا تو اُس پر تبصرے آتے تھے۔ پراڈکٹ پلان دیتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ

مارکیٹ میں نوٹس نہ ہو... اور business ventures کرتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ ناکامی سے دوچار ہو... اور اس حمین سکندر سے متاثر ہونے والوں میں ایک ہشام بھی تھا... متاثر بھی، مرعوب بھی لیکن اُس سے رقابت کا جذبہ اُس نے ریسہ کی وجہ سے رکھنا شروع کیا۔ وہ لڑکی جس پر ہشام جان چھڑکتا تھا۔ وہ صرف ایک شخص پر اندھا اعتماد کرتی تھی صرف ایک شخص کا حوالہ بار بار دیتی تھی اور بد قسمتی سے وہ شخص وہ تھا جس سے ہشام پہلے ہی مرعوب تھا... پھر رقابت کے علاوہ کوئی اور جذبہ ہشام اپنے دل میں محسوس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ریسہ اُسے صرف ایک دوست اور بھائی سمجھتی تھی اور یہ جاننے کے باوجود کہ حمین کے بھی ریسہ کے لئے احساسات ایسے ہی تھے۔

وہ ریسہ سے متعارف ہونے کے بعد حمین سے چند بار سرسری طور پر مل چکا تھا۔ مگر یہ پہلا موقع تھا جب وہ اُس سے تنہا ملنے جا رہا تھا اور وہ بھی اُس کے گھر پر... وہ اب بحرین کا ولی عہد نہ ہوتا تو اُس شخص سے ملنے کے لئے جاتے ہوئے بے حد احساس کمتری کا شکار ہو رہا ہوتا۔ حمین سکندر کی کامیابی اور ذہانت کسی کو بھی اس احساس سے دوچار کر سکتی تھی۔

نیویارک کے ایک مہنگے ترین علاقے میں ایک 57 منزلہ عمارت کی چھت پر بنے اُس pent house میں حمین سکندر نے بے حد گرم جوشی سے اُس کا استقبال کیا تھا۔ اُس کے ساتھ اب سائے کی طرح رہنے والے باڈی گارڈز اُس عمارت کے اندر نہیں آسکتے تھے کیونکہ entrance پر visitors میں صرف ہشام کا نام تھا... ولی عہد یا شاہی خاندان کے القابات کے بغیر۔

ان چند مہینوں میں پہلی بار His Royal Highness صرف ہشام بن صباح کے طور پر پکارے گئے تھے... اُسے بُرا نہیں لگا، صرف عجیب لگا۔ وہ نام اُس کے پینٹ ہاؤس کے دروازے پر اندر داخلے کے وقت حمین نے اور بھی چھوٹا کر دیا تھا ”مجھے خوشی ہے کہ تم بالکل وقت پر آئے ہو ہشام۔“ اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے ایک سیاہ ٹراؤزر اور سفید ٹی شرٹ میں ملبوس حمین سکندر نے کہا تھا۔

وہ اتوار کا ایک دن تھا اور وہ لنچ کے بعد مل رہے تھے۔ وہ دُنیا کے امیر ترین نوجوانوں میں سے ایک کے گھر پر تھا اور ہشام کا خیال تھا اُس pent house میں بھی وہی سب لوازمات ہوں گے جو وہ اپنے خاندانی محلات اور اپنے سوشل سرکل میں دیکھتا آیا تھا... پر تعیش رہائش گاہ جہاں پر دُنیا کی ہر آسائش ہوگی، ہر طرح کے لوازمات کے

ساتھ۔ بہترین interior، فرنیچر، شو پیسز، bars اور دنیا کی بہترین سے بہترین شراب... اُس کا خیال تھا نیویارک کے اُس مہنگے ترین علاقے میں اُس pent house میں حمین سکندر نے ایک دنیاوی جنت بسا رکھی ہوگی کیونکہ ہشام ایسی جنتیں دیکھتا آیا تھا۔

حمین سکندر کے اُس pent house میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بہت مختصر تقریباً ہونے کے برابر فرنیچر... دیواروں پر چند کیلی گرائی کے شاہکار... اور کچن کا وٹزر پر ایک رحل میں کھلا قرآن پاک جس کے قریب پانی کا ایک گلاس اور کافی کا ایک مگ تھا۔ ہشام بن صباح عجیب ہیبت میں آیا تھا، اُس شخص کی جس سے وہ ”مل“ رہا تھا، جسے بزنس اور فائننس کی دنیا کا guru نہیں جن مانا جاتا تھا اور جس کے کروڑوں روپے کے اُس pent house میں دکھاوے کے لئے بھی رکھی جانے والی چیز قرآن پاک تھا... وہ سالار سکندر کا خانوادہ تھا۔

”یہ میرے دادا کا دیا ہوا قرآن پاک ہے، اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں میں... گھر پر تھا، فرصت بھی تو تمہارے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔“ حمین نے رحل پر رکھے قرآن پاک کو بند کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹھو“ وہ اب ہشام سے کہہ رہا تھا اُس کو اُس کاؤنٹر کے قریب پڑے کچن سٹولز کے بجائے لاؤنج میں پڑے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے...

وہ پورا pent house اُس وقت دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سفید انٹیریر میں گلاس سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی کی کرنیں اُن صوفوں تک بھی آرہی تھیں جن پر اب وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہشام بن صباح شاہی محل کے تخت پر بیٹھ کر آیا تھا۔ مگر اُس کے سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ہوئے شخص کے جیسا طمطراق اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بات کا آغاز مشکل ترین تھا اور بات کا آغاز حمین نے کیا تھا، اُسے چائے کافی کی آفر کے ساتھ۔

”کافی“ اُس نے جو با آفر قبول کرتے ہوئے کہا۔ حمین اُٹھ کر اب سامنے کچن ایرا میں کافی میکر سے کافی بنانے لگا۔

”رئیسہ سے تمہارا بہت ذکر سنا ہے میں نے اور ہمیشہ اچھا۔“ وہ کافی بناتے ہوئے اُس سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے بھی۔“ ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ حمین کافی انڈیلتے ہوئے مسکرایا اور اُس

نے کہا ”I am not surprised“

وہ اب کافی کے دوگ اور کوکیز کی ایک پلیٹ ایک ٹرے میں رکھے واپس آ کر بیٹھ گیا

تھا۔

ہشام نے کچھ کہے بغیر کافی کا اپنا گ اٹھایا، حمین نے ایک کوکی...

”تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے...“ کوکی کو کھانا شروع کرنے سے پہلے اُس نے جیسے ہشام کو

ایک reminder دیا...

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”ہاں...“ ہشام کو یک دم کافی پینا مشکل لگنے لگا تھا جس مسئلے کے لئے وہ وہاں آیا تھا، وہ

مسئلہ پھر گلے کے پھندے کی طرح یاد آیا تھا۔

”میں ریسہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ اُس نے بالآخر اُس جملے سے آغاز کیا جس

جملے سے وہ آغاز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ”Good“ حمین نے بے حد اطمینان سے جیسے

کوکی کو نگلنے سے پہلے یوں کہا جیسے وہ اُس کا چیس کا سکور تھا۔

”میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ہشام نے اگلا جملہ ادا کیا۔ اُسے اپنا آپ عجیب

چغد محسوس ہو رہا تھا اُس وقت۔

”میں جانتا ہوں۔“ حمین نے کافی کا پہلا سپ لیتے ہوئے کہا ”مگر سوال یہ ہے کہ یہ کروگے کیسے؟“ اُس نے جیسے ہشام کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے سیدھا اُس موضوع پر بات کرنے کے لئے لے آیا تھا جس پر بات کرنے کے لئے وہ آیا تھا۔ ہشام اگلے کئی لمحے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا یہاں تک کہ حمین کو اُس پر ترس آنے لگا تھا۔

”اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“ ہشام نے یک دم اُس سے پوچھا۔ حمین کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

”جو میں کرتا، وہ تم کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتے۔“ حمین نے جواباً کہا۔ ہشام کو عجیب سی ہتک محسوس ہوئی... وہ اُسے چیلنج کر رہا تھا۔

”تم بتائے بغیر مجھے judge نہیں کر سکتے۔“ اُس نے حمین سے کہا۔ ”ٹھیک ہے بتادیتا ہوں۔“ حمین نے کافی کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

”رئیسہ کو چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی بھی حل بتادو مجھے میرے مسئلے کا۔“ پتہ نہیں

اُسے کیا وہم ہوا تھا کہ حمین کے بولنے سے پہلے وہ ایک بار پھر بول اُٹھا تھا۔ حمین اس بار مسکرایا نہیں، صرف اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

”میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو“.....



امامہ جبریل کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اُسے کچھ دیر کے لئے جیسے اُس کی باتیں سمجھنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے جو عنایہ اور عبداللہ کے حوالے سے کہا، جو احسن اور عبداللہ کے حوالے سے اور جو اپنے اور عائشہ کے حوالے سے، وہ سب کچھ عجیب انداز میں اُس کے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا تھا۔

”مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا جبریل۔“ وہ بالآخر اُس سے کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ ”مُمی“ I am sorry..... جبریل کو بے اختیار اس کے چہرے ک تاثرات سے اندازہ ہوا کہ اُس نے ماں کو پریشان اور حواس باختہ کر دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ماں کو کسی لڑکی کے حوالے سے اپنے کسی ”افیئر“ کی بات کر رہا تھا وہ بھی ایک ایسا معاملہ جس میں اُس پر الزامات لگائے جا رہے تھے... عائشہ عابدین کون تھی، امامہ نے زندگی میں کبھی اُس کا نام نہیں سنا تھا اور جبریل پر کیوں اُس کے ساتھ انوالوڈ ہونے کا

الزام ایک ایسا شخص لگا رہا تھا جو اُس کے ہونے والے داماد کے لئے ایک inspiration کی حیثیت رکھتا تھا... اور جبریل کیوں رعنایہ کی شادی عبد اللہ کے ساتھ کرنے کے اچانک خلاف ہو گیا تھا جبکہ ماضی میں ہمیشہ وہی تھا جو امامہ کو عبد اللہ کے حق میں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

”میں یہ سب آپ سے شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن اب اس کے علاوہ اور کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے۔“ وہ شرمندہ زیادہ تھا یا پریشان، اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ”لیکن اس سب میں رعنایہ اور عبد اللہ کا کیا قصور ہے؟“

”مُمی اگر وہ اُس شخص کے زیر اثر ہے تو وہ بیوی کے ساتھ رویے کے لحاظ سے بھی ہو گا... جو کچھ میں نے احسن سعد کو عائشہ کے ساتھ کرتے دیکھا ہے، وہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ جبریل نے غیر مبہم لہجے میں کہا۔

”تم نے رعنایہ سے بات کی ہے؟“ امامہ نے بے حد تشویش سے اُس سے پوچھا۔ ”ہاں میں نے کی ہے اور وہ بہت اپ سیٹ ہوئی ہے، لیکن اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نہیں جانتا وہ کیا سوچ رہی ہے۔“ جبریل کہہ رہا تھا، امامہ اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، اُس نے جبریل کو کبھی اس طرح پریشان اور اس طرح کسی معاملے پر سٹینڈ لیتے نہیں دیکھا

تھا۔

”اتنے مہینے سے عائشہ عابدین کا مسئلہ چل رہا ہے، تم نے پہلے کبھی مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ بے حد سنگین الزامات تھے جو جبریل پر کسی نے لگائے تھے اور اپنی اولاد پر اندھا اعتماد ہونے کے باوجود امامہ بل کر رہ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اپنی اولاد کے حوالے سے ایسی کسی بات کو سُننا پڑ رہا تھا، وہ بھی جبریل کے بارے میں... حمین کے حوالے سے کوئی بات وہ سُنتی تو شاید پھر بھی اُس کے لئے غیر متوقع نہ ہوتی، وہ حمین سے کچھ بھی توقع کر سکتی تھی، لیکن جبریل... ”بتانے کے لئے کوئی بات تھی ہی نہیں مُمی...“ جبریل نے جیسے صفائی دینے کی کوشش کی۔ ایک دوست کی بہن ہے وہ... دوست نے اُس کی مدد کرنے کے لئے کہا اور میں اس لئے considerate تھا کیونکہ مجھے لگا آپریشن میں کچھ غلطی ہوئی ڈاکٹر ویزل سے... اگرچہ اُس میں میرا تصور نہیں تھا پھر بھی میں اُس سے ہمدردی رکھ رہا تھا... مجھے یہ تھوڑی پتہ تھا کہ ایک psycho آکر خواہ مخواہ میں مجھے اپنی-ex wife کے ساتھ انوالو کرنے کی کوشش کرے گا۔“ وہ کہتا جا رہا تھا۔

”That man is.....“ جبریل کہتے کہتے رُک گیا، یوں جیسے اُس کے پاس احسن

سعد کو بیان کرنے کے لئے لفظ ہی نہ رہے ہوں۔

”تمہارے پاپا سے بات کرنی ہوگی ہمیں... اتنا بڑا فیصلہ ہم خود نہیں کر سکتے۔“ امامہ نے اُس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔

”فیصلہ بڑا ہوا یا چھوٹا، مُمی میں عنایہ کی عبداللہ سے شادی نہیں ہونے دوں گا۔“ جبریل نے شاید زندگی میں پہلی بار امامہ سے کسی بات پر ضد کی تھی۔

”کسی دوسرے کے جرم کی سزا ہم عبداللہ کو تو نہیں دے سکتے جبریل...“ امامہ نے مدہم آواز میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی ”عبداللہ میری ذمہ داری نہیں ہے، عنایہ ہے... میں رسک نہیں لے سکتا اور نہ ہی آپ کو لینا چاہیے۔“ وہ ماں کو جیسے خبردار کر رہا تھا اور امامہ اب واقعی پریشان ہونے لگی تھی۔

”تمہارے بابا جو بھی فیصلہ کریں گے، وہ بہتر فیصلہ ہوگا... اور تم ٹھیک کہتے ہو ہم عنایہ کے لئے کوئی رسک نہیں لے سکتے، لیکن ہم عبداللہ کی بات سُننے بغیر اس طرح اُس سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتے۔“ امامہ نے کہا ”عبداللہ سے ایک بار بات کرنی چاہیے۔“

جبریل کچھ ناخوش ہو کر اٹھ کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا جب امامہ نے اُسے پکارا، وہ پلٹا۔

”ایک بات پوری ایمانداری سے بتانا مجھے۔“ وہ ماں کے سوال اور انداز دونوں پر حیران ہوا۔

”جی؟“

”تم عائشہ عابدین کو پسند کرتے ہو؟“ جبریل ہل نہیں سکا۔

NEW ERA MAGAZINE
☆☆☆☆
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ عنایہ کے کہنے پر عائشہ عابدین سے ملنا آیا تھا، یقین اور بے یقینی کی ایک عجیب کیفیت میں جھولتے ہوئے... وہ اسلام سے ایک بچے کے طور پر متعارف ہوا تھا، ایک بچے کے طور پر متاثر... وہ ایک ایسے خاندان کے ذریعہ اُس مذہب کے سحر میں آیا تھا جیسے لوگ اُس نے دیکھے ہی نہیں تھے... اُن کی نرمی، فیاضی اور ہمدردی نے ایرک کا وجود نہیں دل اپنی مٹھی میں کیا تھا اور اتنے سالوں میں وہ اسلام کی اسی روشن خیالی، اسی فیاضی اور نرمی کو ہی idealize کرتا رہا تھا۔ اور اب وہ اپنے mentor کے بارے میں

ایسی باتیں سن رہا تھا جو اُس کے لئے ناقابل یقین تھیں، وہ اُس نے عنایہ کی زبان سے نہ سنی ہو تیں تو وہ انہیں جھوٹ کے پلندے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ سمجھتا... ڈاکٹر احسن سعد وہ نہیں ہو سکتے تھے اور وہ نہیں کر سکتے تھے، جس کا الزام عنایہ اُن پر لگا رہی تھی۔

عنایہ نے امریکہ پہنچنے کے فوراً بعد اُسے کال کر کے بلوایا تھا، اور پھر احسن سعد کے معاملے کو اُس سے ڈسکس کیا تھا، جبریل پر ڈاکٹر احسن کے الزامات کو بھی اور عائشہ عابدین کے ساتھ ہونے والے معاملات کو بھی... وہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھا کہ احسن سعد، اتنا بے حس اور جھوٹا ہو سکتا تھا مگر جس پر وہ الزامات لگ رہے تھے اُس کے بارے میں بھی عبداللہ قسم کھا سکتا تھا کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔

دونوں کے درمیان بحث ہوئی پھر تکرار اور پھر اُن کی زندگی کا پہلا جھگڑا... دو بے حد ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے لوگوں میں۔

”میں یقین نہیں کر سکتا... میں یقین نہیں کر سکتا... ڈاکٹر احسن سعد عملی مسلمان ہیں... نماز کی امامت کرواتے ہیں، وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کریں گے... یہ سب...؟؟ اور بغیر وجہ کے... میں مان ہی نہیں سکتا... میں مان ہی نہیں سکتا۔“ وہ اس کے علاوہ کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا۔

”تو جاؤ، تم پھر عائشہ سے مل لو اور خود پوچھ لو کہ کیا ہوا تھا اُس کے ساتھ لیکن میرا بھائی جھوٹ نہیں بول سکتا...“ عنایہ نے بھی جواباً بے حد خفگی سے کہا تھا۔

ملاقات کا اختتام بے حد تلخ نوٹ پر ہوا تھا، اور اُس وقت پہلی بار عنایہ کو احساس ہوا کہ جبریل کے خدشات بے جا نہیں تھے۔ عبد اللہ اگر اس حد تک احسن سعد سے متاثر تھا تو اُن دونوں کے تعلق میں یہ اثر بہت جلد رنگ دکھانے لگتا۔ وہ عبد اللہ سے مل کر بہت ڈسٹر بڈ ہو کر آئی تھی۔ وہ مصیبت جو کسی اور کے گھر میں تھی اُن کی زندگی میں ایسے آئی تھی کہ اُنہیں اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔

عبد اللہ نے اُس سے ملنے کے بعد اُسے کال نہیں کی تھی، اُس نے جبریل کو کال کی تھی... ایک بے حد شکایتی کال... یہ پوچھنے کے لئے کہ وہ احسن سعد کے حوالے سے یہ سب کیوں کہہ رہا تھا، کیا وہ نہیں جانتا تھا احسن کتنا اچھا انسان اور مسلمان تھا۔ وہ بہت دیر جبریل کی بات سُنے بغیر بے حد جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا تھا۔ جبریل سُنتا رہا تھا۔ وہ اُس کی زندگی کے مشکل ترین لمحات میں سے ایک تھا۔ ایک نو مسلم کو یہ بتانا کہ اُس کے سامنے جو سب سے زیادہ عملی مسلمان تھا، وہ اچھا انسان ثابت نہیں ہوا تھا... وہ عبد اللہ کا دل مسلمانوں سے نہیں اٹھانا چاہتا تھا، خاص طور پر اُن مسلمانوں سے جو تبلیغ

کا کام کر رہے تھے... وہ ایک حافظِ قرآن ہو کر ایک دوسرے حافظِ قرآن کے بارے میں ایک نو مسلم کو یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹا تھا، ظالم تھا، بہتان لگانے والا ایک لالچی انسان تھا اس کے باوجود کہ وہ صوم و صلوة کا پابند ایک مسلمان تھا... جبریل سکندر کا مخلصہ ایک بڑا مخلصہ تھا مگر اُس کی خاموشی اُس سے زیادہ خرابی کا باعث بنتی تو وہ خاموش نہیں رہ پایا تھا۔

”احسن سعد کے بارے میں جو میں جانتا ہوں اور جو میں کہوں گا، تم پھر اُس سے hurt ہو گے اس لئے سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تم اُس عورت سے جا کر ملو اور وہ سارے documents دیکھو جو اُس کے پاس ہیں۔“ اُس نے عبد اللہ کی باتوں کے جواب میں اُسے کہا تھا۔

اور اب عبد اللہ یہاں تھا عائشہ عابدین کے سامنے اُس کے گھر پر... وہ جبریل کے ریفرنس سے آیا تھا۔ عائشہ عابدین اُس سے ملنے سے انکار نہیں کر سکی۔ وہ اُس رات آن کال تھی اور اب گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی جب عبد اللہ وہاں پہنچا تھا اور وہ وہاں اب اُس کے سامنے بیٹھا اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کی منگیت نے احسن سعد کے حوالے سے کچھ شبہات کا اظہار کیا تھا خاص طور پر عائشہ عابدین کے حوالے سے اور وہ اُن الزامات

کی تصدیق یا تردید کے لئے وہاں آیا تھا... لیکن یہ کہنے سے پہلے اُس نے عائشہ کو بتایا تھا کہ وہ احسن سعد کو کیا درجہ دیتا تھا اور اُس کی زندگی کے پچھلے کچھ سالوں میں وہ اُس کے لئے ایک رول ماڈل رہے تھے، وہ جیسے ایک ”بُت“ لے کر عائشہ عابدین کے پاس آیا تھا جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے وہ کسی بھی حد تک جاسکتا تھا اور گفتگو کے شروع میں ہی اتنی لمبی تمہید جیسے ایک حفاظتی دیوار تھی جو اُس نے صرف اپنے سامنے ہی نہیں، عائشہ عابدین کے سامنے بھی کھڑی کر دی تھی۔ اُس نے بھی جبریل جیسی ہی خاموشی کے ساتھ اُس کی باتیں سنی تھیں... بے حد تحمل اور سکون کے ساتھ... کسی مداخلت یا اعتراض کے بغیر... عبداللہ کو کم از کم اُس سے یہ توقع نہیں تھی... وہ یہاں آنے سے پہلے عائشہ عابدین کا ایک image ذہن میں رکھ کر آیا تھا۔ وہ پہلی نظر میں بھی اُس image پر پوری نہیں اُتری تھی۔ بے حجاب ہونے کے باوجود اُس میں عبداللہ کو بے حیائی نہیں دکھی تھی۔ بے حد سادہ لباس میں میک اپ سے بے نیاز چہرے والی ایک بے حد حسین لڑکی جس کی آنکھیں اُداس تھیں اور جس کی آواز بے حد دھیمی... عبداللہ وہاں ایک تیز طرار، بے حد فیشن ایبل الٹرا ماڈرن عورت سے ملنے کی توقع لے کر آیا تھا جسے اُس کے اپنے خیال اور ڈاکٹر احسن سعد کے بتائے ہوئے کردار کے مطابق بے حد قابل اعتراض حلیے میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر عبداللہ کی قسمت میں شاید اور

حیران ہونا باقی تھا۔

عناویہ اور جبریل دونوں نے اُسے کہا تھا کہ وہ اُسے documents دکھائے گی، احسن سعد سے طلاق کے کاغذات، قانونی کارروائی کے کاغذات، کورٹ کی judgement، کسٹڈی کی تفصیلات اور وہ حقائق جو صرف وہی بتا سکتی تھی، عائشہ عابدین نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

”احسن سعد بُرا شخص نہیں ہے، صرف میں اور وہ compatible نہیں تھے اس لئے شادی نہیں چلی۔“ تقریباً دس منٹ تک اُس کی بات سننے کے بعد عائشہ نے بے حد مدہم آواز میں اُسے کہا تھا۔

”وہ یقیناً اتنے ہی اچھے مسلمان ہیں، جتنا آپ اُسے سمجھتے ہیں اور اُس میں بہت ساری خوبیاں ہیں... آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کا واسطہ اُن کی خوبیوں سے پڑا... میں شاید اتنی خوش قسمت نہیں تھی یا پھر مجھ سے کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔“ وہ کہہ رہی تھی اور عبداللہ کے دل کو جیسے تسلی نہیں ہو رہی تھی، یہ وہ کچھ نہیں تھا جو وہ سُننا چاہتا تھا لیکن وہ بھی نہیں تھا جس کی اُسے توقع تھی۔

”وہ آپ کے لئے ایک inspiration اور رول ماڈل ہیں... یقیناً ہوں گے...“ وہ

کہہ رہی تھی ”کوئی انسان perfect نہیں ہوتا... مگر چند غلطیاں کرنے پر ہم کسی کو نظروں سے نہیں گرا سکتے... میرے اور احسن سعد کے درمیان جو بھی ہوا، اُس میں اُن سے زیادہ میری غلطی ہے... اور آپ کے سامنے میں اُن کے بارے میں کچھ بھی کہہ کر وہ غلطی پھر سے دہرانا نہیں چاہتی۔“ عائشہ نے بات ختم کر دی تھی۔ عبداللہ اُس کی شکل دیکھتا رہا گیا تھا۔ اُسے تسلی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہوئی... وہ وہاں احسن سعد کے بارے میں کچھ جاننے اور کھوجنے نہیں آیا تھا اُس کو defend کرنے آیا تھا، اُس عورت کے سامنے جو اُس کی تذلیل اور تضحیک اور دل شکنی کا باعث بنی تھی لیکن اُس عورت نے جیسے اُس کے سامنے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی کسی صفائی، کسی وضاحت کی۔ اُس نے ہر غلطی، ہر گناہ خاموشی سے اپنے کھاتے میں ڈال لیا تھا۔ اُس کے لاؤنج میں بیٹھے عبداللہ نے دیواروں پر لگی اُس کے بیٹے کی تصویریں دیکھی تھیں... اُس کے کھلونوں کی... ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر... ویسی جگہ نہیں جیسا وہ اُسے تصور کر کے آیا تھا، کیوں کہ احسن سعد نے اُسے اس عورت کے ”پھوہڑ پن“ کے بھی بہت قصے سن رکھے تھے جو احسن سعد کے گھر کو چلانے میں ناکام تھی، جس کا واحد کام اور مصروفیت TV دیکھتے رہنا یا آوارہ پھرنا تھا اور جو گھر کا کوئی کام کرنے کے لئے کہنے پر بھی برہم ہو جاتی تھی۔ عبداللہ کے دماغ میں گرہیں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ وہ اُس

لڑکی سے نفرت نہیں کر سکا... اُسے ناپسند نہیں کر سکا۔

”جبریل سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“ وہ بالآخر ایک آخری سوال پر آگیا تھا جہاں سے یہ سارا مسئلہ شروع ہوا تھا۔

”میں اُس سے پیار کرتی ہوں۔“ وہ اُس کے سوال پر بہت دیر خاموش رہی پھر اُس نے عبداللہ سے کہا... سر اٹھا کر نظریں چرائے بغیر...

☆☆☆☆

”I met your ex-wife“ وہ جملہ نہیں تھا جیسے ایک بم تھا جو اُس نے احسن کے سر پر پھوڑا تھا۔

عبداللہ کچھلی رات واپس پہنچا تھا اور اگلے دن ہاسپٹل میں اُس کی ملاقات احسن سے ہوئی تھی... اُسی طرح ہمشاش بشاش، باخلاق، پر جوش... عبداللہ کے کانوں میں عنایہ اور جبریل کی آوازیں اور انکشافات گونجنے لگے تھے۔ اُس نے احسن سے ملاقات کا وقت مانگا تھا جو بڑی خوش دلی سے دیا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی اپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ احسن کے والدین اُس کے ساتھ رہتے تھے، اس لئے وہ ملاقات اپنے گھر پر

کرنا چاہتا تھا مگر اُس شام کچھ مصروف تھا تو عبد اللہ کو اُس ہی کے اپارٹمنٹ پر جانا پڑا، وہاں اُس کی ملاقات احسن کے والدین سے ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح ایک رسمی ہیلو ہائے... احسن لاؤنج میں بیٹھے بٹھائے اُس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر عبد اللہ نے اُس سے علیحدگی میں ملنا چاہتا اور تب وہ اُسے اپنے بیڈ روم میں لے آیا تھا مگر وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ عبد اللہ کا رویہ کچھ عجیب تھا مگر احسن سعد کی چھٹی حس اُسے اُس سے بھی بُرے سنگلز دے رہے تھے اور وہ بالکل ٹھیک تھے۔ عبد اللہ نے کمرے کے اندر آتے ہی گفتگو کا آغاز اسی جملے سے کیا تھا اور احسن سعد کا لہجہ، انداز اور تاثرات پلک جھپکتے میں بدلے تھے۔ عبد اللہ نے زندگی میں پہلی بار اُس کی یہ آواز سنی تھی۔ وہ لہجہ بے حد خشک اور سرد تھا Rude... بہتر لفظ تھا اُسے بیان کرنے کے لئے... اور اُس کے ماتھے پر بل آئے تھے... آنکھوں میں کھا جانے والی نفرت... بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اُس نے عبد اللہ سے کہا۔

”کیوں؟“ عبد اللہ نے بے حد مختصر الفاظ میں اُسے بتایا کہ عنایہ نے اُس سے کہا تھا کہ جبریل اُس کی شادی عبد اللہ سے نہیں کرنا چاہتا اور اُس کے انکار کی وجہ احسن سعد سے اُس کا قریبی تعلق تھا۔ اُس نے احسن سعد کو بتایا کہ عنایہ اور جبریل دونوں نے اُس پر

سنگین الزامات لگائے تھے اور اُسے عائشہ عابدین سے ملنے کے لئے کہا جو اُس کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔

”تو تم نے اُن پر اعتبار کیا... اپنے اُستاد پر نہیں... اور تم مجھ سے بات یا مشورہ کئے بغیر اُس کتیلے سے ملنے چلے گئے... اور تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے سب کچھ سیکھ لیا۔“ احسن نے اُس کی گفتگو کے درمیان ہی اُس کی بات بے حد خشمگیں لہجے میں کاٹی تھی، عبد اللہ بات ویسے بھی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اُس نے احسن سعد کی زبان سے ابھی ابھی ایک گالی سنی تھی عائشہ عابدین کے لئے... وہ گالی اُس کے لئے شاکنگ نہیں تھی، احسن سعد کی زبان سے اُس کا نکلنا شاکنگ تھا۔ مگر وہ شام عبد اللہ کے لئے وہ آخری شاک لانے والی نہیں تھی... وہ جس بُت کی پوجا کر رہا تھا، وہ وہاں اُس بُت کو کو اوندھے منہ گرتے دیکھنے آیا تھا۔

”تمہیں کوئی حق نہیں تھا کہ تم میری سابقہ بیوی سے ملتے... میرے بارے میں اس طرح investigation کرتے، تم اُس ”.....“ ”؟“ ”؟“ ”؟“ ”؟“ کے پاس پہنچے جس نے تمہیں میرے بارے میں جھوٹ پہ جھوٹ بولا ہوگا۔“ احسن سعد کے جملوں میں اب عائشہ کے لئے گالیاں اس طرح آرہی تھیں جیسے وہ اُسے مخاطب کرنے کے

لئے روزمرہ کے القابات تھے... وہ عرصے کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا، عائشہ کی نفرت اُس کے لئے سنبھالنا مشکل ہو رہی تھی یا اپنا سالوں کا بنایا ہوا image مسخ ہونے کی تکلیف نے اُسے اس طرح بلبلائے پر مجبور کر دیا تھا، عبداللہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”وہ دکھانے بیٹھ گئی ہوگی تمہیں کورٹ کے کاغذات کو، یہ دیکھو کورٹ میرے شوہر کو جھوٹا کہہ رہی ہے... کورٹ نے مجھ پر مار پیٹ کے الزامات کو مانا ہے، کورٹ نے احسن سعد کو دوسری شادی کرنے کے لئے اُسے دھوکہ باز کہا ہے اور اس لئے اُس..... عورت کے طلاق کے مطالبے کو جائز قرار دیتے ہوئے اُسے طلاق دلوادی اور بچے کی کسٹڈی بھی...“ وہ بولتا ہی جا رہا تھا اور عبداللہ ساکت صرف اُسے سن رہا تھا۔ وہ سارے انکشافات جن کو سُننے کے لئے جبریل نے اُسے عائشہ کے پاس بھیجا تھا، وہ الزامات وہ خود احسن سعد سے سُن رہا تھا۔

”میں اس ملک کے courts کو دو ٹوکے کا نہیں سمجھتا... یہ کافروں کی عدالتیں ہیں، اسلام کو کیا سمجھتی ہوں گی، وہ فیصلے دیتی ہیں جو شریعہ کے خلاف ہیں... میرا مذہب حق دیتا ہے مجھے دوسری شادی کا... کسی بھی وجہ کے بغیر تو کورٹ کون ہوتی ہے مجھے اس

عمل پر دھوکہ باز کہنے والی... مجھے حق ہے کہ میں ایک نافرمان بیوی کو مار پیٹ سے راہِ راست پر لاؤں... کورٹ کس حق کے تحت مجھے اس سے روک سکتا ہے... میں مرد ہوں، مجھے میرے دین نے عورت پر برتری دی ہے... کورٹ کیسے مجھے مجبور کر سکتی ہے کہ میں اپنی بیوی کو برابری دوں... ان ہی چیزوں کی وجہ سے تو تمہارا معاشرہ تباہ ہوگا... بے حیائی، عُریانی، منہ زوری، مرد کی نافرمانی... یہی چیزیں تو لے ڈوبی ہیں تمہاری عورتوں کو... اور تمہارے کورٹس کہتے ہیں ہم بھی بے غیرت ہو جائیں اور ان عورتوں کو بسائیں اور اُن کے پیچھے کتے کی طرح دُم ہلاتے پھریں۔”

وہ شخص کون تھا، عبداللہ پہچان ہی ان نہیں پارہا تھا... اتنا زہر، ایسا تعصب، ایسے الفاظ اور یہ سوچ... اُس نے ڈاکٹر احسن سعد کے اندر یہ چھپا انسان تو کبھی نہیں دیکھا تھا جو امریکہ کو ہمیشہ اپنا ملک قرار دیتے ہوئے اپنے آپ کو ایک proud American کہتا تھا اور آج وہ اُسے تمہارا ملک، تمہارا معاشرہ، تمہارے کورٹس کہہ کہہ کر بات کر رہا تھا... اُمّت اور اخوت کے جو دو لفظ اُس کا کلمہ تھے وہ دونوں یک دم کہیں غائب ہو گئے تھے۔

”اب طلاق منہ پر مار کر میں نے اُس حرافہ کو چھوڑا ہوا ہے تو خوار ہوتی پھر رہی ہے...“

کسی کی keep اور گرل فرینڈ ہی رہے گی وہ ساری عمر، کبھی بیوی نہیں بنے گی... اُسے یہی آزادی چاہیے، تمہاری سب عورتوں کو یہی سب چاہیے... گھر، خاندان، چار دیواری کس چڑیا کے نام ہیں اُنہیں کیا پتہ... عصمت جیسا لفظ اُن کی ڈکشنری میں ہی نہیں... اور پھر الزام لگاتی ہیں شوہروں پر... تشدد کے... گھٹیا عورتیں... ”اُس کے جملوں میں اب بے ربطگی تھی... یوں جیسے وہ خود بھی اپنی باتیں جوڑ نہ پارہا ہو، مگر وہ خاموش ہونے پر تیار نہیں تھا... اُس کا علم بول رہا ہوتا تو اگلے کئی گھنٹے بھی عبد اللہ اسی طرح اُسے سُن سکتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سحر زدہ معمول کی طرح سُنتا رہتا تھا مگر یہ اُس کی جہالت تھی جو گفتگو کر رہی تھی اور کرتے ہی رہنا چاہتی تھی۔

عبد اللہ اُس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس سے پہلے احسن سعد کے دونوں ماں باپ اندر آ گئے تھے وہ یقیناً احسن کے اس طرح بلند آواز میں باتیں سُن کر اندر آئے تھے۔

”ابو میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کے دوست کا بیٹا میرا دشمن ہے، مجھے نقصان پہنچائے گا... اب دیکھ لیں وہی ہو رہا ہے، وہ مجھے جگہ جگہ بدنام کرتا پھر رہا ہے۔“ احسن نے اپنے باپ کو دیکھتے ہی کہا تھا۔

”کون؟“ سعد نے کچھ ہکا بکا انداز میں کہا۔

”جبریل“ احسن نے جواباً کہا اور عبد اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اسے عائشہ سے ملوایا ہے اُس نے... اور اُس عورت نے اسے میرے بارے میں جھوٹی سچی باتیں کہی ہیں، زہرا گلا ہے میرے بارے میں۔“ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح باپ سے شکایت کر رہا تھا۔

”عائشہ نے مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا... جو بھی بتایا ہے آپ نے خود بتایا ہے۔“ عبد اللہ نے سعد کے کچھ کہنے سے پہلے کہا تھا۔ ”انہوں نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ آپ کے اور اُن کے درمیان compatibility نہیں تھی، مگر کوئی کورٹ پیپر ز اور کورٹ میں آپ پر ثابت ہونے والے کسی الزام کی انہوں نے بات کی نہ ہی مجھے کوئی پیپر دکھایا... جو بھی سُن رہا ہوں، وہ میں آپ سے ہی سُن رہا ہوں۔“ عبد اللہ کا خیال تھا احسن سعد حیران رہ جائے گا اور پھر شرمندہ ہوگا... ایسا نہیں ہوا تھا۔

”تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔“ احسن سعد نے اُسے درمیان میں ہی ٹوک دیا تھا۔ عبد اللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس گھر میں یک دم ہی اُس کا دم گٹھنے لگا تھا۔

اب صرف احسن سعد نہیں بول رہا تھا، اُس کا باپ اور ماں بھی بولنے لگ گئے تھے۔ وہ تینوں بیک وقت بول رہے تھے اور عائشہ عابدین کو لعنت ملامت کر رہے تھے اور جبریل کو اور سالار سکندر کو جس کے ماضی کے حوالے سے سعد کو یک دم بہت ساری باتیں یاد آنے لگی تھیں اور امامہ کے بارے میں... جس کا پہلا مذہب قادیانیت تھا... عبداللہ کو یک دم کھڑے کھڑے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ایک mental asylum میں کھڑا تھا... وہ اُس کے کھڑے ہونے پر بھی اُسے جانے نہیں دے رہے تھے بلکہ چاہتے تھے وہ اُس کی ہر بات سُن کر جائے... ایک ایک بہتان، ایک ایک راز جو صرف اُن کے سینوں میں دبا ہوا تھا اور جسے وہ آج آشکار کر دینا چاہتے تھے... اسلام کا وہ چہرہ عبداللہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مذہب اُس کے لئے ہمیشہ ہدایت اور مرہم تھا، بے ہدایتی اور زخم کبھی نہیں بناتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا... کانوں میں پڑنے والی آوازوں کو روک دینا چاہتا تھا... احسن سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اُس کے قرآن کا اُستاد رہا تھا... وہ بس وہی سب بتائے اُسے... یہ سب نہ سُنائے۔ برادر احسن ”You disappointed me... عبداللہ نے بالآخر بہت دیر بعد آوازوں کے اُس طوفان میں اپنا پہلا جملہ کہا۔ طوفان جیسے چند لمحوں کے لئے رُکا۔

”آپ کے پاس بہت علم ہے... قرآن پاک کا بہت زیادہ علم ہے... لیکن ناقص... آپ قرآن پاک کو حفظ تو کئے ہوئے ہیں، مگر نہ اس کا مفہوم سمجھ پائے ہیں نہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات... کیونکہ آپ سمجھنا نہیں چاہتے اُس کتاب کو جو اپنے آپ کو سمجھنے اور سوچنے کے لئے بلاتی ہے... آپ سے ایک بار میں نے ایک آیت کا مطلب پوچھا تھا کہ قرآن دلوں پر مہر لگا دینے کی بات کرتا ہے تو اُس کا کیا مفہوم ہے... مجھے اُس کا مفہوم اُس وقت سمجھ نہیں آیا تھا... آج آگیا... آپ میرے اُستاد رہے ہیں مگر میں دعا کرتا ہوں اللہ آپ کے دل کی مہر توڑ دے اور آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔“ وہ احسن سعد کو بیچ بازار میں جیسے ننگا کر کے چلا گیا تھا... وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔

☆☆☆☆

وہ پھر وہیں کھڑا تھا جہاں عائشہ کو توقع تھی... اُس کے اپارٹمنٹ کے باہر کمپاؤنڈ میں... ادھر سے ادھر ٹہلتے... گہری سوچ میں... زمین پر اپنے قدموں سے فاصلہ ماپتے ہوئے... برف باری کچھ دیر پہلے ہو کر ہٹی تھی اور جو برف گری تھی... وہ بہت ہلکی سی چادر کی طرح تھی... جو دھوپ نکلنے پر پگھل جاتی، مگر آج دھوپ نہیں نکلی تھی اور اُس برف پر جبریل کے قدموں کے نشان تھے... بے حد ہموار... اور متوازن جیسے بہت سوچ سمجھ

کر رکھے جا رہے ہوں۔ اُس نے عائشہ کو باہر آتے نہیں دیکھا تھا مگر عائشہ نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ لانگ کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اُس کی طرف بڑھنے لگی۔

جبریل نے اُسے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا... ملنا چاہتا تھا ”میں گروسری کے لئے جا رہی ہوں اور پھر ہاسپٹل چلی جاؤں گی...“ اُس نے جیسے بلا واسطہ انکار کیا تھا... وہ اب اُس کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی... اُس کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتی تھی اُس ایک گفتگو کے بعد۔

”تو تم کورٹ میں یہ اعتراف کرنا چاہتی ہو کہ احسن سعد ٹھیک ہے اور تم نے اپنے بیٹے کی دیکھ بھال میں لاپرواہی کا مظاہرہ کیا... تم اپنی زندگی تباہ کرنا چاہتی ہو۔“ جبریل نے بے حد خفگی سے اُسے تب کہا تھا ”مجھے اپنی زندگی میں اب دلچسپی نہیں رہی اور اگر اسے قربان کرنے سے ایک زیادہ بہترین زندگی بچ سکتی ہے تو کیوں نہیں۔“ اُس نے جواباً ان سب ملاقاتوں میں پہلی بار اُس سے اس طرح بات کی تھی۔

”تم مجھے بچانا چاہتی ہو؟“ جبریل نے سیدھا اُس سے پوچھا۔ اُسے اتنے direct سوال کی توقع نہیں تھی اُس سے... اور ایک ایسے سوال کی جس کا جواب وہ اُسے دینے کی جرأت ہی نہیں کر سکتی تھی... وہ اُسے یہ کیسے بتا سکتی کہ وہ احسن سعد سے اُس شخص کو

بچانا چاہتی تھی جو اُسے اسفند کے بعد اب سب سے عزیز تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ احسن سعد نے اُسے جبریل کے آپریشن میں ڈاکٹر ویزل سے ہونے والی کوتاہی کے بارے میں بتایا تھا... اُسے جبریل کے اُس معذرت والے کارڈ کی سمجھ بھی تب ہی آئی تھی... لیکن وہ پھر بھی جبریل کو معاف کرنے پر تیار تھی، یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ اُس کے بیٹے کی جان لینے میں اُس شخص سے ہونے والی کسی دانستہ غلطی کا ہاتھ تھا۔ وہ اُسے اتنی توجہ کیوں دیتا تھا... اُس کے لئے کیوں بھاگتا پھرتا تھا... عائشہ عابدین جیسے اب ڈی کوڈ کر پائی تھی اور وہ اُسے اُس احساسِ جرم سے آزاد کر دینا چاہتی تھی، یہ بتا کر کہ اُس نے جبریل کو معاف کر دیا تھا اور وہ جبریل کو بچانے کے لئے احسن سعد کے آگے دیوار کی طرح کھڑی ہو سکتی تھی... وہ ایک کام بھی جو وہ زندگی میں اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لئے بھی نہیں کر سکی تھی۔ میں تمہیں صرف احساسِ جرم سے آزاد کر دینا چاہتی ہوں جو تم اسفند کی وجہ سے رکھتے ہو۔ ”اُس نے اُس کے سوال کا جواب دیا تھا۔ جبریل بول نہیں سکا تھا ”میں اس کے لئے تمہارا شکر یہ ادا کر سکتا ہوں، مگر تمہیں اپنی زندگی تباہ کرنے نہیں دے سکتا... ”بڑی لمبی خاموشی کے بعد جبریل نے کہا تھا۔

”تم اگر احسن کے اس الزام پر کورٹ میں یہ کہو گی تو میں اپنی غلطی کورٹ میں جا کر

بتاؤں گا۔ ”اُس نے عائشہ سے کہا۔ ”تمہیں کوئی سمجھانے والا نہیں ہے، ہوتا تو تمہیں یہ نہ کرنے دیتا..... اور نہیں... تمہارے پاس آنے کی واحد وجہ میرا احساسِ جرم نہیں ہے... زندگی میں احساسِ جرم ہمدردی تو کروا سکتا ہے محبت نہیں۔ ”جبریل اُسے اُس دن جانے سے پہلے کہہ کر گیا تھا... ایسے ہی معمول کے انداز میں... یوں جیسے سردرد میں

ڈسپرین recommend کر رہا ہو... یا نزلہ ہو جانے پر فلو diagnose

کر رہا ہو... اُس کے جانے کے بعد بھی عائشہ کو لگا تھا اُس نے جبریل سکندر کی بات سُننے میں غلطی کی تھی اور اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس بات کو دوبارہ سُننے کا اصرار کرتی تاکہ اپنی تصحیح کر سکے... بعض وہم جی اُٹھنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں، بعض شاہے متاعِ حیات ہوتے ہیں، یقین میں نہ بھی بدلیں تو بھی۔

اور اب وہ ایک بار پھر سامنے کھڑا تھا... نہیں کھڑا نہیں تھا... برف پر اپنے نشان بنانے میں مصروف تھا یوں جیسے اُس کے پاس دنیا بھر کی فرصت تھی۔

اُس کی چاپ پر جبریل نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ لانگ کوٹ کے اندر اپنی گردن کے مفلر کو بالکل ٹھیک ہونے کے باوجود ایک بار پھر ٹھیک کرتی اُس کی طرف آرہی تھی، اُس کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود۔

”گروسری میں بہت وقت لگے گا میرا“ اُس کے قریب آتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اُسے جتاتے ہوئے اُس نے جبریل سے کہا تھا ”ہم پھر کسی دن فرصت میں مل سکتے تھے۔“ جبریل کے جواب کو انتظار کئے بغیر اُس نے ایک بار پھر جبریل کو جیسے اپنے ساتھ جانے سے روکنے کے لئے کہا۔ اس کے باوجود کہ جبریل نے اُسے انتظار کرنے کا نہیں کہا تھا، وہ اُس کے ساتھ گروسری کرنے کے لئے تیار تھا۔ اُسے صرف اتنا وقت ہی چاہیے تھا جتنا وقت وہ گروسری کرتی... ساتھ چلتے پھرتے وہ بات کر سکتا تھا۔

”میں جانتا ہوں... مگر فرصت میرے پاس تو بہت ہے، تمہارے پاس بالکل نہیں۔“ اُس نے جواباً اُس سے کہا ”گاڑی میں چلیں؟“ جبریل نے بھی اپنے جواب پر اُس کے تبصرے کا انتظار نہیں کیا تھا ”نہیں یہاں قریب ہی ہے سٹور walking ... distance پر... گاڑی کی ضرورت نہیں ہے... مجھے بہت زیادہ چیزیں نہیں چاہیے۔“ عائشہ نے قدم رو کے بغیر بیرونی سڑک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”تم نے عبداللہ سے جھوٹ کیوں بولا؟“ وہ چند قدم خاموشی سے چلتے رہے تھے پھر جبریل نے اُس سے پوچھنے میں دیر نہیں کی تھی۔ عائشہ نے گہرا سانس لیا۔ اُسے اس سوال کی توقع تھی لیکن اتنی جلدی نہیں۔

”بزدلی اچھی چیز نہیں عائشہ...“ اُس نے چند لمحے اُس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا تھا۔ وہ طنز نہیں تھا مگر اس وقت عائشہ کو طنز ہی لگا تھا۔ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر آگئے تھے۔ برف کی چادر پر وہ نشان جو کچھ دیر پہلے جبریل اکیلا بنا رہا تھا اب وہ دونوں ساتھ ساتھ بنا رہے تھے۔

”تمہیں لگتا ہے میں بزدل ہوں اس لئے میں نے احسن سعد کے بارے میں عبد اللہ کو سچ نہیں بتایا؟“ اُس نے اس ملاقات کے دورانہ میں ساتھ چلتے ہوئے پہلی بار گردن موڑ کر جبریل کو دیکھا تھا۔ ”بزدلی یا خوف... اس کے علاوہ تیسری وجہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ جبریل نے جیسے اپنی بات کی تصدیق کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا ”تمہیں ڈر تھا کہ احسن سعد تمہیں پریشان کرے گا... تمہیں فون کرے گا اور تنگ کرے گا۔“ جبریل نے کہا تھا ”مگر تم نے عبد اللہ سے جھوٹ بول کر احسن سعد کو بچا کر بہت زیادتی کی... تم نے مجھے اور عنایہ کو جھوٹا بنا دیا۔“ اُس کا لہجہ اب شکایتی تھا۔

”آپ لوگوں کے جھوٹا ہونے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا احسن سعد کے جھوٹا ہونے سے عبد اللہ کو ہوتا۔“ عائشہ نے جواباً کہا۔

”وہ حافظِ قرآن ہے تو میں بھی ہوں۔“ جبریل نے کہا ”آپ کو وہ اُس مقام پر بٹھا کر

نہیں دیکھتا جس پر احسن کو دیکھتا ہے۔ ”عائشہ نے جواباً کہا ”وہ نو مسلم نہ ہوتا تو میں احسن کے بارے میں اب سب کچھ بتا دیتی اُسے... وہ مجھ سے ملنے کے بعد دوبارہ احسن کی شکل بھی نہ دیکھتا شاید... مگر وہ نو مسلم ہے... میں اُسے کس منہ سے یہ کہتی کہ اتنے سالوں سے وہ جس شخص کو بہترین مسلمان اور انسان سمجھ رہا ہے، وہ ایسا نہیں ہے۔ عبد اللہ نے صرف احسن کو جھوٹا نہیں ماننا تھا میرے دین سے اُس کا دل اُچاٹ ہونا تھا۔ ”وہ کہہ رہی تھی اُسی مدہم آواز میں جو اُس کا خاصہ تھی۔

”میرے ساتھ ہوا تھا ایک بار ایسے... میں احسن سعد سے ملنے سے پہلے بہت اچھی مسلمان تھی، آنکھیں بند کر کے اسلام کی پیروی کرنے والی... جنون اور پاگل پن کی حد تک دین کے راستے پر چلنے والی اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے اندھی محبت اور عقیدت رکھنے والی... لیکن پھر میری شادی احسن سعد سے ہو گئی اور میں نے اُس کا اصل چہرہ دیکھ لیا... اور میرا سب سے بڑا نقصان ایک خراب ازدواجی زندگی، طلاق یا اسفند کی موت نہیں ہے... میرا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اُس نے مجھے دین سے بیزار کر دیا... مجھے اب دین کی بات کرنے والا ہر شخص جھوٹا اور منافق لگتا ہے... داڑھی اور حجاب سے مجھے خوف آتا ہے، میرا دل جیسے عبادت کے لئے بند ہو گیا ہے... اتنے

سال میں دن رات اتنی عبادتیں اور وظیفے کرتی رہی اپنی زندگی میں بہتری کے لئے کہ اب مجھے لگتا ہے مجھے اللہ سے کچھ مانگنا ہی نہیں چاہیے... میں مسلمان ہوں لیکن میرا دل آہستہ آہستہ کافر ہوتا جا رہا ہے اور مجھے اس احساس سے خوف آتا ہے لیکن میں کچھ کر نہیں پار ہی... اور یہ سب اس لئے ہوا کیوں کہ مجھے ایک اچھے عملی مسلمان سے بہت ساری توقعات اور اُمیدیں تھیں اور میں نے انہیں چکنا چور ہوتے دیکھا... اور میں عبد اللہ کو اس تکلیف سے گزارنا نہیں چاہتی... اگر وہ احسن سعد کو اچھا انسان سمجھتے ہوئے ایک اچھا انسان بن سکتا ہے تو اُسے بننے دیں۔ ”وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں اور گالوں کو رگڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں کافر ہوں لیکن میں کسی کو کافر نہیں کر سکتی، بس مجھ میں اگر ایمان ہے تو صرف اتنا ”وہ اب ٹشو اپنی جیب سے نکال کر آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

”پسند...؟؟؟ مجھے پسند کا نہیں پتہ مُمی... مگر عائشہ عابدین میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے... میں اُس سے شدید ہمدردی رکھتا تھا... مگر اب ہمدردی تو بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

میں اُسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پاتا... بار بار اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کا اور میرا کوئی future نہیں ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ لائف

پارٹنر کے طور پر مجھے جیسی لڑکی کی خواہش ہے، عائشہ اُن کی متضاد ہے... مجھے بے حد مضبوط، پر اعتماد، زندگی سے بھرپور، career oriented، ہر وقت ہنستی رہنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو بہت اچھی values بھی رکھتی ہوں اور عائشہ میں ان سب چیزوں میں سے صرف دو ہوں گی... یا تین... لیکن اس کے باوجود میں عائشہ سے disconnect نہیں رہ سکتا۔”

کافی پیوگی یا اب بھی گروسری کروگی؟ ”وہ اُسے اب چھیڑ رہا تھا ”گروسری زیادہ ضروری ہے۔“ اُس نے اپنی ندامت چھپاتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا ”اگر اتنی ضروری ہوتی تو تم گروسری سٹور کو پیچھے نہ چھوڑ آتی۔“ عائشہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ وہ واقعی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہت ساری دوسری چیزوں کی طرح... آگے بہت کچھ تھا... اُس نے جبریل کا نم چہرہ دیکھا، پھر نم آنکھوں سے مسکرائی۔

”کافی پی لیتے ہیں پھر۔“



امامہ نے اُس سکریپ بک کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اُس ہی کی سکریپ بک

تھی وہ سکریپ بک جس میں اُس نے کبھی اپنے ممکنہ گھر کے لئے ڈیزائننگ کی تھی۔
 مختلف گھروں کی مختلف چیزوں کی تصویریں کھینچ کھینچ کر ایک collection بنائی
 تھی کہ جب وہ اپنا گھر بنائے گی تو اُس کا فلور اس گھر جیسا ہوگا، windows اس گھر
 جیسی، دروازے اس گھر جیسے... ہاتھ سے بنائے سکیچز کے ساتھ... اور اُس میں اُن بہت
 سے خوبصورت گھروں کی میگزینز سے کاٹی گئی تصویریں بھی چسپاں تھیں۔

وہ سکریپ بک چند سال پہلے اُس نے پھینک دینے کے لئے بہت ساری ردی کے ساتھ
 نکالی تھی، اور حمین نے اُسے پھینکنے نہیں دی تھی۔ اُس سے وہ سکریپ بک لے لی
 تھی۔ اور اب امامہ نے اُس سکریپ بک کو یہاں دیکھا تھا۔ حمین سکندر کے اُس
 pent house کی ایک دراز میں... اُس کی مرمت کی جا چکی تھی اور وہ بہت صاف
 ستھری اور اُس سے بہتر حالت میں نظر آرہی تھی جس میں امامہ نے اُسے آخری بار
 حمین کو دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم کیا کرو گے اس کا؟ ”اُس نے حمین سے پوچھا
 تھا۔ ”آپ کو ایسا ایک گھر بنا کر دوں گا۔“ اُسے وہی جواب ملا تھا جس کا اُسے پہلے ہی
 اندازہ تھا وہ حمین سکندر کے سرپرائز کو بوجھنے میں ماہر تھی۔ ”مجھے اب ایسے کسی گھر کی
 تمنا نہیں ہے۔“ امامہ نے اُسے کہا تھا، ”ایک وقت تھی پر اب نہیں، اب مجھے بس ایک

چھوٹا سا ایسا گھر چاہیے جہاں پر میں تمہارے بابا کے ساتھ رہوں اور تمہارے بابا کے پاس وہ ہے۔ اس لئے تم اس گھر کو بنانے میں اپنی energy اور وقت ضائع مت کرنا۔ ”اُس نے حمین کو نصیحت کی۔ ”میری خواہش ہے یہ مُمی ”حمین نے اُسے کہا تھا، ”یہ گھر میں نے تمہارے بابا سے مانگا تھا، وہ نہیں دے سکے... اور تم سے میں لوں گی نہیں... میں کبھی سالار کو یہ احساس نہیں ہونے دوں گی کہ تم نے مجھے وہ دے دیا ہے جو وہ نہیں دے سکا۔ ”حمین کو اُس کی بات کی سمجھ آگئی تھی۔ ”سوچ لیں ”اُس نے جیسے امامہ کو چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ ”سوچ لیا۔ ”وہ چیلنج قبول کرتے ہوئے ہنس پڑی

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”آپ کو دُنیا میں بابا کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ ”حمین نے شکایتاً اُس سے کہا۔

”ہاں نہیں آتا ”وہ ہنسی۔

”زیادتی ہے یہ ”اُس نے بتایا۔

”اتنا تو کر سکتی ہوں۔ ”اُس نے جو ابا چھیڑا۔

”دادا کہتے تھے آپ دونوں پتھر کے زمانے میں بھی ہوتے تو مل جاتے۔ ”وہ اب اُسے

چھیڑ رہا تھا، وہ بے اختیار ہنسی تھی اور ہنستی چلی گئی تھی۔

اور اب وہ اُس سکریپ بک کو کھولتے ہوئے اُسے ورق بہ ورق دیکھ رہی تھی... جیسے اپنی زندگی کی ورق گردانی کرتے ہوئے... اُس کے پاس وہ سکریپ بک آدھی خالی تھی، اور اب وہ ساری بھر چکی تھی۔ اُس نے کچھ تجسس کے عالم میں اُن صفحاتوں سے آگے دیکھنا شروع کیا جو اُس نے بھرے تھے۔ وہاں بھی تصویریں تھیں... خوبصورت گھروں کی... وہ حمین سکندر کی collection تھی... اُس ہی کی طرح کاٹ کاٹ کر لگائی ہوئی تصویریں، مگر فرق صرف یہ تھا کہ وہ میگزینز سے کاٹی ہوئی تصویریں نہیں تھیں، وہ کھینچی ہوئی تصویریں تھیں حمین سکندر کے اپنے گھروں کی... وہ چہرے پر مسکراہٹ لئے بڑے اشتیاق سے اُن گھروں کی تصویروں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ یقیناً خوش نصیب تھا، تیس سال کی عمر تک پہنچے بغیر درجنوں گھروں کا مالک تھا۔ اُس کی ساری اولادوں میں دولت کے معاملے میں سب سے زیادہ امیر اور خرچ کرنے میں سب سے زیادہ فیاض... اُس نے اپنی زندگی کی سب سے پہلی کمپنی امامہ سے قرض لے کر شروع کی تھی۔

”صرف اس لئے لے رہا ہوں آپ سے کہ بابا نے بھی SIF آپ کے قرض سے

شروع کیا تھا۔ ”اُس نے امامہ کو ”logic“ بتائی تھی۔ اور اُس وقت پہلی بار امامہ نے سالار سے SIF میں دی جانے والی اپنی اصل رقم واپس مانگی تھی۔

”وہ ڈبودے گا... مجھے یقین ہے۔“ سالار نے اُسے خبردار کیا تھا... وہ اُس وقت سولہ

سال کا بھی نہیں تھا اور اگر سالار یہ تبصرہ کر رہا تھا تو غلط نہیں تھا۔

”جب تمہیں SIF کے لئے یہ رقم دی تھی تو پاپانے بھی یہی کہا تھا... تم نے ڈبودی

کیا؟“ اُس نے سالار کو جتایا تھا۔ ”تم مجھے حمین سے compare کر رہی ہو۔“

سالار ناخوش ہوا تھا ”پہلی بار نہیں کر رہی“ اُس نے جواباً کہا تھا۔

کتنا وقت گزر گیا تھا... گزر گیا تھا یا شاید بہہ گیا تھا... زندگی بہت آگے چلی گئی تھی...

خواہشاتِ نفس بہت پیچھے چلی گئی تھیں۔

امامہ نے ہاتھ میں پکڑی سکریپ بک اپنے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہاں پڑا

چائے کا مگ اٹھالیا۔ وہ اب سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ چند دن پہلے پاکستان

سے مستقل طور پر امریکہ شفٹ ہوئی تھی اور حمین کا گھر اُس کا پہلا پڑاؤ تھا۔ سالار بھی

چند دن کے لئے وہیں تھا اور اس وقت صبح سویرے وہ اپنے لئے چائے بنا کر pent

house کے اُس حصے میں آکر بیٹھی تھی جس کی چھت بھی شیشے کی تھی، نیلے آسمان

پر تیرتے ہلکے بادلوں اور اڑتے پرندوں کو وہ اس پر سکون خاموشی میں بچوں کے سے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اُس نے اپنے عقب میں آہٹ سُنی، وہ سالار تھا۔ چائے کے اپنے مگ کے ساتھ۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے۔ ایک طویل مدت کے بعد وہ یوں امریکہ میں اس طرح فرصت سے مل رہے تھے... سالار کی زندگی کی بھاگ دوڑ کے بغیر۔

وہ بھی اُس کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا، کاؤچ پر اُس کے برابر بیٹھے چائے کے دو مگز ہاتھ میں لئے وہ دونوں آج بھی ویسے ہی تھے... سالار کم گو، وہ سب کچھ کہہ دینے والی... سالار سُنتے رہنے والا وہ دنیا جہاں کی باتیں دُہرا دینے والی... مگر اُن کے پاس فرصت صرف چائے کے مگ جتنی ہوتی تھی۔ چائے کا مگ بھرا ہوتا تو اُن کی باتیں شروع ہوتیں اور اُس کے ختم ہونے تک باتیں اور فرصت دونوں ختم ہو جاتے... چائے کا وہ مگ جیسے اُن کی قربت میں گزارا ہوئی زندگی تھی... نرم گرم، رُک رُک، ٹھہر ٹھہر کر گزرتی ہوئی... لیکن جتنی بھی تھی، تسکین بھری... سالار نے سامنے پڑی سکریپ بک کو سرسری نظر سے دیکھا، چند لمحوں کے لئے اُٹھا کر اُلٹا پلٹا پھر واپس رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے جیسے شوق ہیں تمہارے بیٹے کے۔“ وہ مسکرا دی۔ وہ دونوں اُس کے اس pent house میں پہلی بار آئے تھے۔

”اس سال ریٹائر ہونے کا سوچ رہا ہوں۔“ چائے کا ایک سپ لیتے ہوئے سالار نے امامہ سے کہا، ”کئی سالوں سے سُن رہی ہوں۔“ اُس نے جواباً کہا۔ وہ دھیرے سے ہنسا ”نہیں اب تم آگئی ہو امریکہ تو اب ریٹائر ہو سکتا ہوں... پہلے تو تنہائی کی وجہ سے کام کرنا میری مجبوری تھی۔“ وہ اُسے tease کر رہا تھا ”بیس سال کی ہوتی تو تمہاری اس بات پر خوش ہوتی۔“ امامہ نے بے ساختہ کہا ”خیر بیس سال کی عمر میں میرے اس جملے پر تو تم کبھی خوش نہیں ہوتی۔“ اُس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ دونوں بیک وقت ہنسے۔

”یہ ویسا گھر ہے جیسا ایک بار ہم نے خواب میں دیکھا تھا، اُس جھیل کے کنارے؟“

سالار نے یک دم آسمان کو دیکھتے ہوئے، اُس سے پوچھا۔ وہ بھی سر اٹھا کر شیشے سے نظر آتے آسمان کو دیکھنے لگی۔

”نہیں ویسا گھر نہیں ہے۔“ امامہ نے ایک لمحے کے بعد کہا۔ سکندر عثمان کی موت کے بعد امامہ نے ایک بار پھر وہی جھیل کنارے ایک گھر دیکھا تھا۔ جو وہ اپنی زندگی کے کئی سالوں میں بار بار دیکھتی رہی تھی۔ مگر اس بار وہ خواب اُس نے بہت عرصے کے بعد

دیکھا تھا۔

”وہ گھر ایسا نہیں تھا۔“ وہ اُس pent house کو گردن گھما کر دیکھتے ہوئے بڑ بڑا رہی تھی، ”وہ آسمان ایسا نہیں تھا... نہ وہ پرندے ایسے تھے... نہ وہ شیشہ ایسا۔ وہ گھر دُنیا میں کبھی کہیں نہیں دیکھا میں نے۔“ وہ کہہ رہی تھی ”اُس گھر کی کوئی چیز دُنیا بھر میں پھرنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آئی مجھے... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے وہ گھر جنت میں ملے گا ہمیں۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ بھی چونکے بغیر خاموش ہی رہا تھا..

”تم نے کچھ نہیں کہا“ امامہ نے اُس کی خاموشی کو کُریدا۔ اُس نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے امامہ کو دیکھا اور بڑ بڑایا۔

”آمین“ وہ چپ رہی، پھر ہنس پڑی وہ آج بھی ویسا ہی تھا... مختصر مگر اگلے کو لا جواب کر دینے والی باتیں کہہ دینے والا۔

”اگر وہ جنت ہے تو پھر میں تم سے پہلے وہاں جاؤں گا۔“ وہ امامہ سے کہہ رہا تھا ”تمہیں یاد ہے نا میں وہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

”ضروری نہیں“ لمحہ بھر کے لئے وہ چائے پینا بھولی ”خوابوں میں سب کچھ سچ نہیں

ہوتا ”اُس نے بے اختیار کہا تھا۔ آج بھی مجھڑ جانے کا خیال اُسے بے کل کر گیا تھا۔
 ”اگر وہ واقعی جنت ہے تو کیا تم چاہتی ہو وہ خواب جھوٹا ہو؟“ وہ عجیب انداز میں مسکرایا
 تھا... اک بار پھر لا جواب کر دینے والے جملے کے ساتھ ”بس اتنا کہ تم وہاں پہلے انتظار
 میں مت کھڑے ہو... دونوں اکٹھے بھی تو جا سکتے ہیں۔“ امامہ نے چائے کا گگ خالی کر
 کے سامنے پڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اُس نے اب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ
 مسکرا دیا۔

”اب بھی کہونا؟“ وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ ”کیا؟“ اُس نے پوچھا۔ آمین ”وہ ہنس پڑا
 ”آمین۔“

☆☆☆☆

ٹھیک 9:15 پر لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور دو سیکورٹی گارڈز تیز رفتار قدموں سے باہر
 نکلے تھے اور اُن دونوں کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر وہ نکلا تھا۔ اُس پورے
 کوریڈور میں یک دم ہلچل مچ گئی تھی۔ وہاں پہلے سے کھڑے security
 officials اور پروٹوکول کے اہلکار یک دم الرٹ ہو گئے تھے۔ ”وہ“ بے حد تیز

قدموں سے اُن دو سیکورٹی گارڈز کے عقب میں چل رہا تھا اور اُس کے بالکل پیچھے اُس کے اپنے عملے کے چند افراد بے حد تیز قدموں سے اُس سے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔

1...2...3...4...5 زیر لب گنتی کرتے ہوئے اُس ٹارگٹ کلر نے 1 کا لفظ زبان سے ادا کرتے ہی اپنی ریخ میں آنے والے اپنے ٹارگٹ پرفائر کر دیا تھا... اُس نے بینکونیٹ ہال کے شیشے کے پرچے اڑتے دیکھے۔

☆☆☆☆
NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsona | Articles | Books | Poetry | Interviews

”تم نے اُس سے کیا کہا ہے کہ اُس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی؟“ ہشام سے ملاقات کے کئی دن بعد تک بھی اس ملاقات کے حوالے سے کوئی اپ ڈیٹ نہ ملنے اور ہشام کی طرف سے ہو جانے والی پراسرار خاموشی نے ریسے کو فکر مند کیا اور وہ حمین سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”اُس نے تمہارا پیچھا چھوڑ دیا... یہ تو اچھا ہے، تم یہی تو چاہتی تھی نا۔“ اُس نے ریسے کو بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ ریسے کو جواب نہیں سوچا۔ وہ اُس کی یونیورسٹی آیا ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہے مگر تم نے اُس سے کیا کہا؟“ ریسے نے کچھ بُجھے ہوئے انداز میں حمین

سے کہا تھا۔ وہ اُس کے لئے برگر لایا تھا اور اپنا راستے میں ہی کھاتا آیا تھا۔ اب اُس کے پاس صرف ایک ٹکڑا رہ گیا تھا جسے وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے نگل رہا تھا۔ ریسہ نے اپنا برگر نکال کر کھانا شروع کر دیا، اُسے پتہ تھا وہ اپنا ختم کرنے کے بعد اُس کا برگر بھی کھانا شروع کر دیتا۔

”میں نے اُس سے کہا اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بادشاہت چھوڑ دیتا۔“ اُس نے آخری ٹکڑا نکلتے ہوئے کہا اور ریسہ کی بھوک مر گئی تھی۔ کیا الٹا مشورہ تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

”لیکن میں نے اُس سے صرف یہ نہیں کہا تھا۔“ حمین اب اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ پھر اُس نے ریسہ سے بڑے اطمینان سے کہا... ”تمہاری بھوک تو مر گئی ہوگی، میری ابھی ہے... تم نے نہیں کھانا تو میں یہ باقی کھا لوں۔“ ریسہ نے خاموشی سے اُسے برگر تھما دیا۔ اُس کی بھوک واقعی مر گئی تھی۔

”میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ ولی عہد کے لئے مناسب امیدوار ہے ہی نہیں... نہ اہلیت رکھتا ہے نہ صلاحیت... اور یہ شادی ہونہ ہو... جلد یا بدیر وہ ویسے بھی ولی عہد کے عہدے سے معزول کر دیا جائے گا۔“ So he has two options... یا تو اپنی

پسند کی لڑکی سے شادی کرے اور ولی عہد کا عہدہ ابھی چھوڑ دے یا پھر بادشاہت کے خواب دیکھتے رہنے میں محبت بھی گنوائے اور تخت بھی۔ ”حمین نے بڑے اطمینان سے اُسے گفتگو کا باقی حصہ سنا یا تھا۔

”تم نے یہ سب کہا اُس سے، اس طرح۔“ رنیسہ کو شدید صدمہ ہوا۔

”نہیں ایسے نہیں کہا تمہیں تو میں مہذب انداز سے بتا رہا ہوں اُسے تو میں نے صاف

صاف کہا کہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے ہیں اور اس کے پاس... اگر تین مہینے میں وہ

معزول نہ ہو تو پھر رنیسہ سے دوسری شادی کر لینا۔“ وہ دانت پر دانت رکھے حمین

سکندر کو صرف دیکھ کر ہی رہ گئی۔ اس ”گفتگو“ کے بعد اگر ہشام بن صباح نے اُسے

اپنی زندگی سے نکال دیا تھا تو کوئی بھی خود دار شخص یہی کرتا۔ صباح بن جرّاح کے

خلاف شاہی خاندان کے اندر شدید lobbying ہو رہی ہے... اور صباح بن جرّاح

اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے پرانے امیر کی فیملی میں شادی کروانا چاہتا ہے ہشام

کی... اور یہ ہو بھی گئی تب بھی وہ بہت دیر تخت پر نہیں رہ سکتا، اس کے حریف بہت

طاقت ور لوگ ہیں اور صباح سے زیادہ بہتر حکمران ہو سکتے ہیں... اگر صباح ہٹ جاتا

ہے تو پھر ہشام کو کون رہنے دے گا وہاں... میں نے ہشام کو یہ سب نہیں بتایا، تمہیں

بتا رہا ہوں۔ ”اُس نے برگر ختم کرتے ہوئے ہاتھ جھاڑے اور رئیسہ سے کہا۔

”تم finance کر رہے ہو اُس کے حریفوں کو؟“ اُسے رئیسہ سے جس آخری

سوال کی توقع تھی، وہ یہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

دیکھتے رہے پھر حمین نے کہا ”میں صرف ”بزنس“ کر رہا ہوں... امریکہ میں صبح کے

ساتھ... بحرین میں اُس کے مخالفین کے ساتھ۔“ اُس نے بالآخر کہا۔ وہ گول مول

اعتراف تھا ”کیوں کر رہے ہو؟“ رئیسہ نے جواباً اُس سے زیادہ تنکھے انداز میں اُس سے

کہا۔ وہ اُس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

”For Family.....Anything for Family“ ”رئیسہ کی آنکھیں

آنسوؤں سے بھر گئی تھیں،

”مجھے خیرات میں ملی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔“ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ تمہارے لئے میرے اندازے سے زیادہ مخلص ہے... نہ ہوتا تو میں تمہیں بتا دیا...“

وہ تمہارے لئے بادشاہت چھوڑ دے گا۔“ حمین نے دو ٹوک انداز میں اُس سے کہا۔ وہ

اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔



اُس نے اپنی ٹیلی سکوپک رائفل سے اُس ٹارگٹ کلر کو ٹریگر دباتے دیکھا۔ بے حد سکون اور اطمینان کے عالم میں... اُس نے اُس کی ہلکی سی مسکراہٹ بھی دیکھی تھی۔ پھر اُس نے اُس ٹارگٹ کلر کو بے حد مطمئن انداز میں سر اٹھاتے اور ٹیلی سکوپک رائفل سے آنکھ ہٹاتے دیکھا اور اس وقت اُس نے اُسے شوٹ کیا۔ ایک مدہم ٹک کی آواز کے ساتھ اُس نے کھڑکی سے اُس کے بھیجے کو اڑتے دیکھا اور اپنے کمرے کے باہر بھاگتے قدموں کا شور... اُس کا مشن پورا ہو چکا تھا، اب اُس کے لئے exit تیار کرنے والے اُس کے منتظر تھے۔



عناہ نے اپنے ہاسپٹل کی پارکنگ میں داخل ہوتے ہوئے عبداللہ کی کال اپنے فون پر دیکھی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ الجھی پھر اُس نے اُس کی کال ریسیو کی۔

”مل سکتے ہیں؟“ اُس نے سلام دعا کے بعد پہلا جملہ کہا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہی۔

”تم یہاں ہو؟“ اُس نے پوچھا۔

”تمہاری گاڑی کے پیچھے ہی ہے میری گاڑی۔“ عنایہ نے بے اختیار بیک ویو مرر سے عقب میں عبداللہ کی گاڑی کو دیکھا جو اُسے dipper سے اشارہ کر رہا تھا۔

دس منٹ بعد پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے وہ اُس کی گاڑی میں آگیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پھول کے ساتھ دو شاخیں تھیں۔ عنایہ نے کچھ کہے بغیر اُسے دیکھا، پھر وہ تھام لیں۔

وہ فون پر پہلے ہی احسن اور عائشہ کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کے بارے میں اُسے بتا چکا تھا۔ ”اُس نے کہا تھا۔“

”اُس کی ضرورت نہیں۔“ عنایہ نے جواباً کہا۔

”میں نے ہاسپٹل میں ڈاکٹر احسن کی امامت میں نماز پڑھنا چھوڑ دی۔“ عنایہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ”میں نے اُسے بتا دیا کہ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والا شخص امامت کا اہل نہیں، اُسے عائشہ کے خلاف سارے الزامات واپس لینے ہوں گے، اگر وہ دوبارہ امامت کروانا چاہتا ہے تو۔“ عبداللہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

اوہ تو اس لئے اُس نے کیس واپس لیا ہے۔ ”عنایہ نے بے اختیار کہا۔ عبداللہ چونکا۔“

اُس نے کیس واپس لے لیا؟“

”ہاں جبریل نے بتایا مجھے... اُس نے ایک معذرت کا خط بھی لکھا ہے عائشہ کے نام“

عنایہ نے مزید بتایا۔ ”یہ سب بے کار ہے اب... وہ بہت زیادہ نقصان کر چکا ہے۔“

”عائشہ کا؟“

”نہیں اپنا۔“ عبد اللہ کے لہجے میں افسردگی تھی۔

”اچھے انسان recover کر جاتے ہیں ہر نقصان سے کیوں کہ اللہ اُن کے ساتھ

ہوتا ہے، بُرے نہیں کر سکتے۔“ عبد اللہ کہہ رہا تھا۔

”He himself is the greatest liar“

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”وہ اپنے parents کے ساتھ بابا سے ملنے بھی آئے تھے، جبریل کی شکایت

کرنے۔“ عنایہ کہہ رہی تھی ”بابا نے اُس کے باپ سے کہا کہ وہ دیکھے اُس کی منافقت

اور تنگ نظری نے اُس کے اکلوتے بیٹے کو کیا بنا دیا ہے۔“

”شر مندہ ہوئے؟“ عبد اللہ نے پوچھا۔ ”پتہ نہیں خاموش ہو گئے تھے... احسن سعد

کی ماں رونے لگی تھی پتہ نہیں کیوں، پھر وہ چلے گئے۔“ عنایہ نے کہا۔

”تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ عبد اللہ نے یک دم پوچھا۔ وہ مسکرا دی ”ہاں... ایسی کوئی

بڑی غلطی تو نہیں تھی تمہاری کہ معاف ہی نہ کرتی۔ ”عبداللہ نے ایک کارڈ اُس کی طرف بڑھایا۔ وہ بے اختیار ہنسی ”اب سب کچھ زبان سے کہنا سیکھو... سب کچھ لکھ لکھ کے کیوں بتاتے ہو۔“ وہ کارڈ کھولتے ہوئے اُس سے کہہ رہی تھی، پھر وہ بات کرتے کرتے ٹھٹھک گئی۔ ایک ہاتھ سے بنے ہوئے کارڈ پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

”تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ عنایہ نے اپنی شرٹ کی جیب میں اٹکے بال پوائنٹ کو نکال کر اُس تحریر کے نیچے لکھا۔

”ہاں“ عبداللہ مسکرایا اور اُس نے اُس کا بال پوائنٹ لیتے ہوئے لکھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

”کب؟“

عنایہ نے لکھا

”پھولوں کے موسم میں۔“

عبداللہ نے لکھا۔

”بہار؟“

عنایہ نے لکھا۔

”ہاں“ عبداللہ نے کارڈ پر ایک دل بنایا، عنایہ نے ایک اور... عبداللہ نے ایک smiley بنایا... عنایہ نے ایک اور...

کارڈ لکیروں، حرفوں، ہندسوں، جذبوں سے بھرتا جا رہا تھا اور ہر شے صرف محبت کی ترجمان تھی جو اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک ہے اور جسے پانے والے خوش نصیب... وہ دونوں دو خوش نصیب تھے جو اُس کارڈ کو عہد اور تجدید عہد سے بھر رہے تھے۔



☆☆☆☆☆
NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

لفٹ کا دروازہ کھلا۔ سالار نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اُس کے دو سیکورٹی گارڈز اُس سے پہلے لفٹ سے نکل گئے تھے۔ اُس کا باقی کا عملہ اُس کے لفٹ سے نکلنے کے بعد پیچھے لپکا تھا۔ کوریڈور میں تیز قدموں سے چلتے وہ استقبال کرنے والے officials سے ملا تھا۔ اُس نے گھڑی ایک بار پھر دیکھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ وقت پر تھا... چند سیکنڈز کے بعد وہ بینکویٹ ہال میں داخل ہو جاتا... وہاں جو ہونے والا تھا، وہ اُس سے بے خبر تھا۔ بے خبری زندگی میں ہر بار نعمت نہیں ہوتی۔ TV پر چلتی اُس خبر کو دیکھتے ہوئے سالار گنگ تھا۔ آخری چیز جو وہ اپنی زندگی اور کیریئر کے اس سٹیج پر ہوتا تو

کر سکتا تھا، وہ یہ تھی۔ رحم کھا کر گود لی گئی بچی کو اُس کے گناہ کے طور پر پوری دُنیا میں دکھایا جا رہا تھا اور یہ سب کہنے والا اُس بچی کا اپنا باپ تھا۔ جس کی بیوی کی سالار نے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی... ایئر اور نا جائز اولاد تو دور کی بات تھی۔ وہ طاقت کا کھیل تھا... جنگ تھی... اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ سازش کی جا رہی تھی... نیروبی میں ہونے والے TAI اور SIF کے اُس اشتراک کو ہونے سے پہلے توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی، بے کار تھا۔

وہ اُس وقت نیویارک ایئر پورٹ پر ایک فلائٹ لینے کے لئے موجود تھا جب پہلی بار وہ خبر بریک ہوئی تھی اور اُس نے بزنس کلاس کے departure lounge میں دیکھی تھی۔ اُس کے ساتھ موجود اُس کے سٹاف نے ایک کے بعد ایک نیوز چینلز کی update کو اُس کے ساتھ شیئر کرنا شروع کر دیا تھا... سالار سکندر نے وہاں بیٹھے سب سے پہلی کال امامہ کو کی تھی۔ اور اُس نے اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس سے کہا تھا۔

”مجھے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں، نہ مجھے نہ تمہارے بچوں کو“...

”رئیہ سے بات کرو۔“ سالار نے جواباً اُس سے کہا تھا ”مجھے اپنے سے زیادہ تکلیف

اس بات کی ہے کہ وہ اُس کی تصویریں چلا رہے ہیں۔ ”اُس نے امامہ سے کہا تھا۔ وہ اپ سیٹ تھا اس کا اندازہ امامہ کو اُس کی آواز سے بھی ہو رہا تھا۔

”یہ وقت بھی گزر جائے گا سالار۔“ امامہ نے اُس سے کہا تھا، تسلی دینے والے انداز میں۔

”ہم نے اس سے زیادہ برا وقت دیکھا ہے۔“ سالار نے سر ہلایا تھا، ممنونیت کے عجیب سے احساس کے ساتھ۔ گھر میں بیٹھی وہ عورت اُن سب کے لئے عجیب طاقت تھی... عجیب طرح سے حوصلہ دے رکھتی تھی اُن کو... عجیب طریقے سے ٹوٹنے سے بچاتی تھی۔

☆☆☆☆

وہ یہاں کسی جذباتی ملاقات کے لئے نہیں آتی تھی... سوال و جواب کے کسی لمبے چوڑے سیشن کے لئے بھی نہیں... لعنت و ملامت کے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بھی نہیں... وہ یہاں کسی کا ضمیر جھنجھوڑنے آئی تھی، نہ ہی کسی سے نفرت کا اظہار کرنے کے لئے... نہ ہی وہ کسی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ اذیت کے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی ہے۔ نہ ہی وہ اپنے باپ کو گریبان سے پکڑنا چاہتی تھی... نہ اسے یہ

بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی... اس کے صحت مند ذہن اور جسم کو ہمیشہ کے لئے مفلوج کر دیا تھا۔

وہ یہ سب کچھ کہتی... یہ سب کچھ کرتی، اگر اسے یقین ہوتا کہ یہ سب کرنے کے بعد اسے سکون مل جائے گا۔ اس کا باپ احساس جرم یا پچھتاوے جیسی کوئی چیز پالنے لگے گا۔

پچھلے کئی ہفتے سے وہ آبلہ پا تھی۔ وہ راتوں کو سکون آور گولیاں لیے بغیر سو نہیں پارہی تھی اور اس سے بڑھ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ وہ سکون آور ادویات لینا نہیں چاہتی تھی... وہ سونا نہیں چاہتی تھی... وہ سوچنا چاہتی تھی اس بھیانک خواب کے بارے میں، جس میں وہ چند ہفتے پہلے داخل ہوئی تھی اور جس سے اب وہ ساری زندگی نہیں نکل سکتی تھی۔

وہ یہاں آنے سے پہلے پچھلی پوری رات روتی رہی تھی۔ یہ بے بسی کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ اذیت کی وجہ سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس غصے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ کے لئے اپنے دل میں اتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک آتش فشاں تھا یا جیسے کوئی الائو، جو اس کو اندر سے سلگا رہا تھا، اندر سے جلا رہا تھا۔

کسی سے پوچھے، کسی کو بتائے بغیر یوں اٹھ کر وہاں آجانے کا فیصلہ جذباتی تھا، احمقانہ تھا اور غلط تھا... اس نے زندگی میں پہلی بار ایک جذباتی، احمقانہ اور غلط فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ایک اختتام چاہتی تھی وہ اپنی زندگی کے اس باب کے لئے، جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس کی موجودگی کا انکشاف اس کے لئے دل دہلا دینے والا تھا۔

اس کا ایک ماضی تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اسے کبھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا ”ماضی“ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر تھا جب وہ ”خوش“ تھی اپنی زندگی میں... جب وہ خود کو باسعادت سمجھتی تھی... اور ”مقرب“ سے ”ملعون“ ہونے کا فاصلہ اس نے چند سیکنڈز میں طے کیا تھا۔ چند سیکنڈز شاید زیادہ وقت تھا... شاید اس سے بھی بہت کم وقت تھا جس میں وہ احساس کمتری، احساس محرومی، احساس ندامت اور ذلت و بدنامی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوئی تھی۔

اور یہاں وہ اس ڈھیر کو دوبارہ وہی شکل دینے آئی تھی... اس بوجھ کو اس شخص کے سامنے اتار پھینکنے آئی تھی، جس نے وہ بوجھ اس پر لادا تھا... زندگی۔

کسی کو اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں تھی... کسی کو پتا ہوتا تو وہاں آہی نہیں سکتی

تھی... اس کا سیل فون پچھلے کئی گھنٹوں سے آف تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لئے خود کو اس دنیا سے دور لے آئی تھی، جس کا وہ حصہ تھی۔ اس دنیا کا حصہ، یا پھر اس دنیا کا حصہ جس میں وہ اس وقت موجود تھی...؟ یا پھر اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی...؟ وہ کہیں کی نہیں تھی... اور جہاں کی تھ جس سے تعلق رکھتی تھی، اس کو اپنا نہیں سکتی تھی۔

انتظار لمبا ہو گیا تھا... انتظامیہ ہمیشہ لمبا ہوتا ہے... کسی بھی چیز کا انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا ہے... چاہے آنے والی شے پائوں کی زنجیر بننے والی ہو یا گلے کا ہار... سر کاتاج بن کر سجنا ہو اس نے یا پائوں کی جوتی... انتظار ہمیشہ لمبا ہی لگتا ہے۔

رئیسہ سالار صرف ایک سوال کا جواب چاہتی تھی اپنے باپ سے... صرف ایک چھوٹے سے سوال کا... اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا تھا؟ اور اگر انہیں مار ڈالا تھا اور اُسے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ یا اُس کی زندگی اُس کے باپ کی چوک کا نتیجہ تھی... سوالات کا ایک انبار تھا جو وہ اُس سے کرنا چاہتی تھی۔

اُس نے ویٹنگ ایریا میں بیٹھے اپنی سلگتی آنکھوں کو ایک بار پھر مسلا... وہ پتہ نہیں کتنی راتوں سے سو نہیں پائی تھی... ایک بھیانک خواب تھا پچھلے دو ہفتے، جس میں اُسے پہلی بار میڈیا سے پتہ چلا تھا کہ اُس کا باپ کون تھا... وہ کون تھی... کہاں سے تھی... وہ سالار

سکندر اور امامہ ہاشم کی بیٹی نہیں تھی، وہ یہ جانتی تھی لیکن اُسے ہمیشہ یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سالار کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو ایک حادثے میں اپنی بیوی سمیت مارا گیا تھا اور پھر سالار نے اُسے adopt کر لیا۔ مگر اب اُس کی زندگی میں اچانک غلام فرید آ گیا تھا جسے TV پر دیکھتے ہوئے بھی اُس کا ذہن اُس سے کسی بھی رشتہ سے انکاری تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

وہ سب اُس turmoil میں اُس کے پاس آ گئے تھے... حمین، جبریل، عنایہ، امامہ، سالار اور ہشام بھی... اُسے یہ بتانے کہ اُنہیں فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھی، کیا تھی... وہ اُن کے لئے رئیسہ تھی... وہی پہلے والی رئیسہ... وہ اُن سب کی شکر گزار تھی، ممنون تھی، احسان مند بھی... اور اُس نے اُن سب کو یہ احساس دلایا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک تھی، مگر وہ ٹھیک نہیں تھی... اندر ہونے والی توڑ پھوڑ بے حد شدید تھی۔ اس لئے بھی کہ وہ اُس خاندان کے ذلت اور رسوائی کا سبب بن رہی تھی جنہوں نے اُس پر رحم کھاتے ہوئے اُس کو پالا تھا۔ اُسے ایک لمحہ بھر کے لئے بھی سالار سکندر پر اپنے باپ کے لگائے ہوئے الزامات کے جھوٹا ہونے میں کوئی شک نہیں ہوا تھا اور اُس کے یہاں آنے کی وجہ بھی وہی الزامات بنے تھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر صرف اپنے تعلقات کو

استعمال کرتے ہوئے یہاں تک آنے میں کامیاب ہوئی تھی... اپنے خاندان کو بے خبر رکھتے ہوئے۔

غلام فرید جیل کے ایک اہلکار کے ساتھ بالآخر اُس کمرے میں داخل ہوا تھا، جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں اب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ جیل اہلکار وہاں سے چلا گیا۔ غلام فرید کچھ نروس انداز میں اُسے دیکھ رہا تھا، وہ کئی لمحے اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے مدہم آواز میں کہا۔

”آپ نے مجھے پہچانا؟“
 ”نہیں“ ایک لمحہ کی تاخیر کے بعد غلام فرید نے کہا۔

”میں آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں... جسے مارنا بھول گئے تھے آپ۔“ وہ طنز نہیں تعارف تھا اور اُس کے علاوہ اپنا تعارف کسی اور طرح سے نہیں کروا سکتی تھی وہ۔

”چُننی“ بہت دیر غلام فرید اُس کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد بے ساختہ بڑبڑایا تھا۔
 رئیسہ نے ہونٹ بھیج لئے، اُس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ اُس کے باپ نے بالآخر اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ اب اُس کا وہ نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اُس نے

لکھوایا تھا پر یاد نہیں کر سکا۔ اُس نے چُننی کو ایک بار پھر دیکھا... بغور دیکھا... وہ میم صاحب لگ رہی تھی، اپنی سانولی رنگت کے باوجود... اُس کی بیٹی تو نہیں لگ رہی تھی، وہ جانتا تھا اُس کی آخری اولاد کی پرورش سالار سکندر نے کی تھی... یہ اُسے اُن لوگوں نے بتایا تھا جو بار بار اُسے بہت کچھ یاد کروانے اور پھر دہرانے کے لئے آتے تھے۔

اُسے چُننی کو دیکھ کر اپنی بیوی یاد آئی تھی... ایک نیلی جینز اور سفید شرٹ میں بال ایک جوڑے کی شکل میں لپیٹے گلاسز آنکھوں پر لگائے، گلے میں ایک باریک چین میں لٹکتا اللہ کے نام کا لاکٹ پہنے، کلائی میں ایک قیمتی گھڑی پہنے اُس کے سامنے ایک کُرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چُننی نے اُسے اپنی ماں کی یاد دلائی تھی... اُس کے نین نقش ویسے تھے... سارے حلیے میں صرف نین نقش ہی تھے جو وہ پہچان پایا تھا... ورنہ وہ بیمار رہنے

والی لاغر، کمزور اور ہر وقت روتی ہوئی چُننی ایسے کیسے بن گئی تھی کہ اُس کے سامنے بیٹھے غلام فرید کو اُس کے سامنے اپنا وجود کمتر لگنے لگا تھا... پر پتہ نہیں اپنی ایک بچ جانے والی اولاد کو ایسے اچھے حلیے میں دیکھتے ہوئے غلام فرید کو ایک عجیب سی خوشی بھی ہوئی تھی، وہ اُس لمحے بھول گیا تھا کہ وہ اپنی اس اولاد پر ناجائز اولاد کا لیبل لگا رہا تھا... برسوں بعد اُس نے کوئی ”اپنا“ دیکھا تھا اور اپنا دیکھ کر وہ پھر بھول گیا تھا۔

ایک لفافے میں موجود کچھ کھانے پینے کی چیزیں اُس نے باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ میں آپ کے لئے لائی تھی“ غلام فرید نے عجیب حیرت سے اُس لفافے کو دیکھا اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اُسے تھام لیا، وہ سارے سوالات جو وہ غلام فرید سے کرنا چاہتی تھی یک دم دم توڑتے چلے گئے تھے... وہ نحیف و نزار شخص جو اُس کے سامنے اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پر کھڑا تھا، اُس سے وہ سوال اب کرنا بے کار تھا۔ اُسے اُس پر ترس آ گیا تھا، وہ اُسے اب کسی کٹہرے میں کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

غلام فرید نے گلاسز اتار کر اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی اُس لڑکی کو دیکھا جس نے کچھ دیر پہلے اُس سے اپنا تعارف کروایا تھا۔

”تم پڑھتی ہو؟“ اُس نے بالآخر پوچھا، عجیب سے انداز میں... ریسہ نے سر اٹھا کر غلام فرید کا چہرہ دیکھا، پھر سر ہلایا۔ غلام فرید کا چہرہ چمکا۔

”زیادہ پڑھنا۔“

ریسہ کی آنکھوں میں نمی پھرا تری۔

”میں اور تمہاری ماں سوچتے تھے کبھی پڑھائیں گے بچوں کو زیادہ... اور...“ غلام فرید

نے یادوں کے کسی دُھند لکے کو لفظوں میں بدلا پھر چُپ ہو گیا۔

”صاحب کو میرا شکریہ کہنا... اور دوبارہ جیل مت آنا۔“ غلام فرید نے چند لمحے بعد کہا اور ریسہ کی آنکھوں کی نمی اب اُس کے گالوں پر پھیلنے لگی تھی۔ غلام فرید کے لئے سالار سکندر ایک بار پھر ”صاحب“ ہو گیا تھا۔ اپنی اولاد کو ایسی اچھی حالت میں دیکھ کر ریسہ کو لگا تھا اُس کا باپ شرمندہ بھی تھا۔

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اُس نے ریسہ کے سر پر ہاتھ پھیرا، وہ اُسے گلے لگاتے ہوئے جھجکا تھا... شاید لگانا چاہتا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر خود غلام فرید کو گلے لگایا تھا پھر وہ اُس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا... اپنے باقی بچوں اور بیوی کے ناموں کو پکارتے ہوئے۔

☆☆☆☆

وہ بڑا ہلکا وجود لئے امریکہ واپس آئی تھی اور امریکہ پہنچ کر بالآخر اُس نے اپنا نمبر آن کیا تھا... اور اُس کا فون یک دم سارے رشتوں سے جاگنے لگا تھا... پیغامات کا انبار تھا اُس کی فیملی کی طرف سے... ایئر پورٹ سے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ اُن سب پیغامات کو پڑھتی گئی تھی۔ نم آنکھوں کے ساتھ... ایک کے بعد ایک پیغامات کا... thread اور پھر ایک

آخری پیغام ہشام کی طرف سے... بادشاہ نے تخت چھوڑ دیا تھا... کیوں؟... اُس نے یہ نہیں لکھا تھا۔ اُسے حمین یاد آیا تھا، اُس کے لفظ۔

گھر کے باہر سالار کے ساتھ ساتھ حمین کی بھی گاڑی تھی۔ رئیسہ نے بیل بجائی... کچھ دیر بعد یہ سالار سکندر تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر سالار سے لپٹ گئی تھی... بالکل اُس ہی طرح جب وہ ڈیڑھ سال کی عمر میں اُس سے لپٹی تھی اور پھر الگ نہیں ہوئی تھی۔ سالار اُسے بچوں کی طرح تھپکتا رہا... وہ امریکہ واپس آنے سے پہلے پاکستان میں ایک پریس کانفرنس میں اپنا Paternity Test اور غلام فرید کا بیان میڈیا کے ساتھ شیئر کر کے آئی تھی اور ایک وکیل کے ذریعے اپنے خاندان کی واحد وارث ہونے کے طور پر اپنے باپ کو معاف کرنے کا حلف نامہ بھی... وہ طوفان جو سالار سکندر اور اُس کے خاندان کو ڈبونے کے لئے آیا تھا، وہ اس بار رئیسہ نے روکا تھا۔ اور وہاں اب سالار سکندر کے سینے سے لگی بچوں کی طرح روتی رئیسہ کو دیکھتے ہوئے اُسے کوئی دلیر نہیں کہہ سکتا تھا... وہ بھی سالار سکندر کا ہی خاندانہ تھی۔ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود، رحم اور مہربانی کے مضبوط ترین رشتوں سے اُن کے ساتھ جوڑی

گئی۔

اپنے نام کے ساتھ سالار کا نام استعمال کرتے ہوئے بھی وہ اپنے باپ کے نام سے واقف تھی مگر وہ باپ جیل میں سزائے موت کا ایک قیدی تھا، سالار کا دوست نہیں، وہ اس سے واقف نہیں تھی۔ اور اس ”واقفیت“ کے بعد اُسے اُس خاندان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا جو اُس کا تعارف تھا۔

”میں نے تمہیں رونا تو کبھی نہیں سکھایا بیسہ... نہ ہی رونے کے لئے تمہاری پرورش کی ہے۔“ سالار نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنے آنسوؤں پر قابو پار ہی تھی۔ اور اُس نے سالار کے عقب میں کھلے دروازے سے حمین اور امامہ دونوں کو دیکھا تھا۔ ”آخری بار روئی ہوں بابا۔“ اُس نے گیلی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہنے کی کوشش کی اور اُس کی آواز پھر بھرا گئی۔

”You belong to us“ سالار نے اُسے جتانے والے انداز میں کہا۔ ”اور

تم سمجھدار اور بہت بہادر ہو... ہم نے یہی سکھایا ہے تمہیں۔“ وہ جیسے اُسے یاد دہانی کروا رہا تھا۔ وہ سر ہلانے لگی تھی۔ زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع آتا جب وہ اُنہیں اپنی احسان مندی دکھا سکتی تو اُنہیں بتاتی کہ اپنے حقیقی باپ سے ملنے کے بعد اُسے پہلی بار یہ

احساس ہوا تھا کہ وہ بے حد خوش قسمت تھی... واقعی خوش قسمت تھی کہ وہ سالار سکندر کے خاندان کا حصہ بنی تھی، اُسے وہ own کرتے تھے۔

☆☆☆☆

9:15 منٹ پر بالآخر لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور حمین سکندر اپنے دو ذاتی محافظوں کے پیچھے باہر نکلا تھا، اُس کے پیچھے اُس کے عملے کے باقی افراد باقی تھے۔ کوریڈور میں پریس فوٹو گرافرز اور چینلز کے افراد بھی تھے جو ہر آنے والی اہم شخصیت کی coverage کر رہے تھے، اُس سے پانچ منٹ پہلے وہاں سے سالار سکندر گزر کر گیا تھا اور اب وہ وہاں آیا تھا اُس تقریب کے دو اہم ترین لوگ...

بے حد تیز رفتاری سے قدم اٹھاتے حمین سکندر کوریڈور میں اُس کی آمد کی کوریج کرتے پریس فوٹو گرافرز پر نظر ڈالتے اپنا استقبال کرتے ہوئے officials کے ساتھ بڑی تیزی سے بینکویٹ ہال کے داخلی دروازے کی طرف جا رہا تھا، جب اُسے ایک دم اپنے عقب میں آتے اپنی ٹیم کے ایک ممبر سے کچھ پوچھنے کا خیال تھا... اپنے Chief Finance Strategist سے... وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا، پلٹا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا اُس نے اپنی گردن کی پشت میں کوئی سلاخ گھستی محسوس

ہوئی تھی... پھر شیشہ ٹوٹنے کی آوازیں اور پھر چیخوں کی اور پھر کوئی اُسے زمین پر گراتا ہو اُس پر لیٹا تھا... پھر کوئی چیخا تھا ”سامنے والی بلڈنگ سے گولی چلائی گئی ہے۔“ اور اُس وقت پہلی بار حمین کو احساس ہوا اُس کی گردن کی پشت پر کیا ہوا تھا... تکلیف شدید تھی، لیکن تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ وہ حواس میں تھا... سب کچھ سُن رہا تھا... اُسے اب زمین پہ ہی گھسیٹتے اُس کی سیکورٹی ٹیم وہاں سے لفٹ کی طرف لے جا رہی تھی اور اُس وقت حمین کو پہلی بار سالار سکندر کا خیال آیا تھا اور اُس کا دل اور دماغ بیک وقت ڈوبے تھے۔



سالار سکندر نے بینکونیٹ ہال میں سٹیج پر رکھی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے اپنی تقریر کے notes پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اُس بینکونیٹ ہال کی داخلی دروازے کے بالمقابل ایک کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنی تھی۔ اُس نے بے یقینی سے بہت دور اُس شیشے کی گرتی کرچیاں دیکھی تھیں... وہ ساؤنڈ پروف بلٹ پروف شیشے تھے... ٹوٹ کیسے رہے تھے...؟؟ ایک لمحہ کے لئے اُس نے سوچا تھا اور پھر اُس نے ہال کے عقبی حصے اور باہر کوریڈور میں شور سنا تھا اور اس سے پہلے وہ کچھ سمجھ سکتا، اُس سمیت سٹیج پر بیٹھے

ہوئے لوگوں کو سیکورٹی گارڈز نے کور کرتے ہوئے سیٹج کے عقب میں کھینچتے ہوئے فرش پر لیٹنے کا کہہ رہا تھا۔ ہال میں اب شور تھا۔ گارڈز چلا چلا کر orders دے رہے تھے اور جس جس اہم شخصیت کے ساتھ وہ سیکورٹی پر مامور تھے۔ وہ اُسے cover کرنے میں مصروف تھے۔ وہاں موجود ہر شخص خاص تھا... اہم... وہ دنیا کے بہترین اثاثوں کا مجمع تھا، جو اب زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور وہاں زمین پر اوندھے منہ لیٹے سالار کو حمین کا خیال آیا تھا اور اُس کا دل کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔ ہال میں اُس کے بعد حمین سکندر کو داخل ہونا تھا... اور وہ نہیں آیا تھا... تو کیا یہ حملہ اُس پر... وہ سوچ نہیں سکا، وہ زمین سے اٹھ گیا... گارڈز نے اُسے روکنے کی کوشش کی... اُس نے اُنہیں دھکا دیا اور چلایا ”Go away...” وہ اُس کے پیچھے لپکے تھے۔ وہ زمین پر لیٹے لوگوں کو پھلانگتا، کھڑے گارڈز سے ٹکراتا داخلی دروازے تک آ گیا تھا جو اس وقت سیکورٹی آفیشلز سے بھرا ہوا تھا... اور اس ہجوم میں بھی اُس نے ریسپشن رنر کے ساتھ سفید ماربل کے فرش پر خون کے دھبے دیکھے تھے جو پورے فرش پر لفٹ تک گئے تھے۔

”کس کو گولی لگی ہے؟“ اُس نے اپنے سر دھوتے وجود کے ساتھ وہاں ایک سیکورٹی

آفیشل کانڈھا پکڑ کر پوچھا۔

”حمین سکندر“ سالار کے پیروں سے جان نکل گئی تھی، وہ لڑکھڑایا تھا۔ اُن دونوں
سیکورٹی گارڈز نے اُسے سنبھالا۔

”Is he alive“؟ ”اُس نے اُس سیکورٹی اہلکار سے دوبارہ پوچھا۔ جواب نہیں

آیا۔

☆☆☆☆

امامہ اُس ہوٹل کے ساتویں فلور پر سالار سکندر کے کمرے میں تھے۔ وہ ایک
suite تھا اور اُن کے برابر کے کمرے میں حمین رہ رہا تھا۔ امریکہ شفٹ ہو جانے
کے بعد امامہ سالار کے ہر سفر میں اُس کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس سفر میں حمین بھی
اُن کے ساتھ تھا۔ وہ اُس ہی کے ذاتی طیارے پر آئے تھے... افریقہ وہ دو دہائیوں سے
بھی زیادہ عرصے کے بعد آئی تھی اور اس بار وہ Congo بھی جانا چاہتے تھے... اپنی
پرانی یادیں تازہ کرنے کے لئے... اُن تینوں نے کچھ دیر پہلے اکٹھے ہی کمرے میں ناشتہ
کیا تھا... اس کانفرنس کے بعد وہ سہ پہر کو کنشاسا جانے والے تھے اور امامہ اُس وقت
اپنی پیکنگ میں مصروف تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے اُس suite میں اپنے اور حمین کے

بیڈرومز کا درمیانی دروازہ کھول کر اُس کا سامان بھی پیک کر آئی تھی، اپنے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اُس نے اپنے کمرے کے دروازے پر زوردار دستک سُنی تھی۔ وہ بُری طرح ہڑبڑائی، پھر اُس نے جا کر دروازہ کھولا... پورا کوریڈور سیکورٹی آفیشلز سے بھرا ہوا تھا اور وہ تقریباً ہر کمرے کے دروازے پر تھے۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

”ہاں... کیوں؟“ اُس نے حیرانی سے کہا۔ وہ دونوں بڑی تہذیب سے اُسے ہٹاتے ہوئے اندر چلے آئے تھے اور اُنہوں نے اندر آتے ہی کھڑکی کے کھلے ہوئے بلا سنڈز بند کئے تھے۔ پھر اُن میں سے ایک حمین کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تھا اور کچھ دیر بعد لوٹا۔

”کیا بات ہے؟“ امامہ اب شدید تشویش کا شکار ہوئی تھی۔ ”ایک ایمر جنسی ہو گئی ہے... آپ کمرے سے باہر مت نکلیں... اگر کچھ مسئلہ ہو تو ہمیں بتادیں۔“ اُن میں سے ایک اُسے کہہ رہا تھا دوسرا اُس کا ہاتھ روم اور وارڈروب برق رفتاری سے چیک کر آیا تھا۔ وہ جس تیز رفتاری سے آئے تھے، اُس ہی تیز رفتاری سے باہر نکل گئے تھے... امامہ کو جیسے panic attack ہوا تھا۔ وہ سالار اور حمین کو اُس وقت فون

نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ فون سروس اُس وقت کام نہیں کر رہی تھی، مگر اُس نے TV آن کر لیا تھا، جہاں پر لوکل اور بین الاقوامی چینلز اس کانفرنس کی لائیو کوریج کرنے میں مصروف تھے۔ سکرین پر پہلی تصویر اُبھرتے ہی امامہ کھڑی نہیں رہ سکی، وہ صوفہ پر بیٹھ گئی TV... کی سکرین پر وہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی تھی... اور بینکونیٹ ہال کے باہر ہوا سے ڈرون کیمروں کے ذریعے فضائی مناظر دکھائے جا رہے تھے... سکرین پر caption بار بار نمودار ہو رہا تھا... جو اُس گلوبل کانفرنس پر ہونے والے حملے اور فائرنگ کی خبر بریکنگ نیوز کی طرح سے چلا رہے تھے... مگر یہ وہ caption نہیں تھا جس نے امامہ کو بدحواس کیا تھا... وہ دوسرا ticker تھا جو بار بار آرہا تھا۔

TAI کے سربراہ حمین سکندر اس حملے میں شدید زخمی۔ امامہ کو لگا اُسے سانس آنا بند ہو گیا تھا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی... وہ اُٹھ نہیں سکی... اُس نے چیخنے کی کوشش کی تھی، وہ وہ بھی نہیں کر سکی... افریقہ اُس کے لئے منحوس تھا۔ اُس نے سوچا تھا اور اپنے کمرے کے دروازے پر اُس نے دھڑ دھڑاہٹ سنی اور پھر اُس نے حمین سکندر کے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا۔

☆☆☆☆

سالار سکندر کو سیکورٹی آفیشلز روک نہیں پائے تھے... پکڑنے، سمجھانے، آگے جانے سے روکنے کی کوشش کے باوجود... وہ برق رفتاری سے اُن چار lifts میں سے اُس لفٹ کی طرف گیا تھا جس طرف خون کے وہ دھبے گئے تھے۔ سیکورٹی آفیشلز اب اُسے عقب سے کور کر رہے تھے۔ وہ اُسی کھڑکی کے سامنے خود کو ایک بار پھر expose کر رہا تھا جہاں اب شیشہ نہیں تھا اور اُس کے سامنے کی عمارت سے فائرنگ ہوئی تھی... سامنے والی عمارت کو اب گھیرے میں لیا جا رہا تھا اور جب تک وہاں security clearance نہیں ہو جاتی وہ ہال سے کسی کو ایک بار پھر اُن کھڑکیوں کے سامنے سے گزر کر lifts تک جانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے... مگر سالار سکندر کو وہ کوشش کے باوجود نہیں روک سکے تھے۔

لفٹ کا دروازہ اب کھل گیا تھا... اور اُس کا فرش بھی خون آلود تھا... بہت زیادہ نہیں لیکن فرش یہ بتا رہا تھا کہ وہ جو بھی تھا... شدید زخمی تھا۔ لفٹ کے اندر پہنچنے کے بعد سالار کو سمجھ نہیں آئی وہ اُس کے بعد آگے کیا کرے... وہ اپنے بیٹے کے خون پر بھی قدم رکھنے کی جرات نہیں کر پارہا تھا... اُس کے اندر داخل ہوتے ہی سیکورٹی آفیشلز اُس کے پیچھے اندر گھسے تھے اور اُنہوں نے دروازہ فوری طور پر بند کیا اور پھر جیسے سکون کا سانس

لیا۔

”اُسے کہاں لے کر گئے ہیں؟“ سالار نے کھوکھلی آواز کے ساتھ کہا تھا۔ ہمیں نہیں پتہ سر ”اُن میں سے ایک نے جواب دیتے ہوئے 7th Floor کا بٹن پریس کر دیا۔

”مجھے حمین کے پاس جانا ہے۔“ وہ چلایا تھا۔ وہ دونوں خاموش رہے۔ لفٹ برق رفتاری سے حرکت میں تھی۔

NEW ERA MAGAZINE ☆☆☆☆
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

حمین کے کمرے کے کھلے دروازے میں حمین کھڑا تھا۔ اُس کی سفید شرٹ خون آلود تھی اور وہ سیاہ کوٹ بھی اُس کے جسم پر نہیں تھا جو وہ پہن کر گیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی اُسے دیکھتی رہی۔ سکریں پرا بھی بھی اُس پر ہونے والے حملے کی تفصیلات چل رہی تھیں۔ اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ امامہ اُٹھی... دوبارہ بیٹھ گئی... اُس کی خون آلود شرٹ اُس کی جان نکال رہی تھی اور اُس کا اپنے پیروں پر کھڑا وجود اُسے زندگی بخش رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر اٹھی اور بھاگتے ہوئے اُس نے جا کر حمین کو اپنے ساتھ لپٹایا تھا۔ ”میں ٹھیک ہوں مُمی... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”بابا کہاں ہیں؟“ اُس نے امامہ سے اگلا سوال کیا تھا اور امامہ کو پہلی بار سالار کا خیال آیا۔ تب ہی دروازہ دوبارہ دھڑ دھڑایا گیا اور وہ اپنے قدموں پر چلتا دروازے تک گیا اور اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اُس کے بالکل سامنے سالار سکندر کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لئے باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھ کر فریض ہوئے تھے۔ پھر سالار آگے بڑھا اور شادی مرگ سی کیفیت میں اُس نے حمین کو لپٹایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار حمین سکندر نے سالار سکندر کی گرفت کو اتنا سخت پایا تھا کہ اُسے لگا اُس کا دم گھٹ جائے گا۔ اُسے اپنی گردن کی پشت سے بہتے خون کی اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اپنے گالوں کو نم کرتے سالار کے آنسوؤں سے...

سالار کے خاندان میں سے اُس کا جانشین کون ہو گا اُس کی پشت سے بہتا خون اُس کا اعلان کر رہا تھا۔

”بابا میں ٹھیک ہوں... آئیں دوبارہ چلتے ہیں کانفرنس ہال میں۔“ سالار نے اپنے کانوں میں مستحکم آواز میں کہی ہوئی ایک سرگوشی سنی تھی۔



وہ افریقہ کی تاریخ کا یادگار ترین دن تھا جب کئی سالوں بعد تاریخ ایک بار پھر دہرائی جا رہی تھی۔

بینکونیٹ ہال میں تمام delegates ایک بار پھر اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ خوف و ہراس کی ایک عجیب سی فضا میں بے حد ناخوش مگر کانفرنس جاری تھی... کینسل نہیں ہوئی تھی۔ اُس کھڑکی کا وہ شیشہ اُسی طرح ٹوٹا ہوا تھا مگر اب سامنے والی بلڈنگ سیکورٹی آفیشلز کے حصار میں تھی۔ کانفرنس ایک گھنٹہ کی تاخیر سے اب دوبارہ شروع ہونے جا رہی تھی۔

سالار سکندر اور حمین دونوں امامہ کے کمرے میں تھے۔ میڈیکل ٹیم حمین کو فرسٹ ایڈ دے چکے تھے، اور فرسٹ ایڈ دینے کے دوران انہیں پتہ چلا تھا کہ گولی اُس کی گردن میں نہیں گئی تھی۔ وہ اُس کی گردن کی پشت پر رگڑ کھاتی اور جلد اور کچھ گوشت اُڑاتے ہوئے گزر گئی تھی... اُس کی گردن پر تین انچ لمبا اور آدھ انچ گہرا ایک زخم بناتے ہوئے... میڈیکل ٹیم نے اُس کی بینڈیج کی تھی اور پین کلر لگا کر اُس کے اس زخم کو کچھ دیر کے لئے سُن کیا تھا تاکہ وہ کانفرنس اٹینڈ کر سکتا۔ اُسے blood لگنا تھا

لیکن وہ فوری طور پر اُس کے لئے تیار نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اُس کے لئے اہم ترین چیز اُس کا نفرنس ہال میں دوبارہ بیٹھنا تھا... اُن لوگوں کا دکھانا تھا کہ وہ اُنہیں گرا نہیں سکے... ڈرا بھی نہیں سکے۔

سالار سکندر اُس سے پہلے کمرے سے نکلا تھا اور اب کپڑے تبدیل کرنے کے بعد حمین سکندر امامہ سے گلے مل رہا تھا۔ امامہ نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی... وہ سالار سکندر کا بیٹا تھا، اُسے کون روک سکتا تھا... اُس نے صرف اُسے گلے لگایا تھا، ماتھا چوما تھا اور دروازے پر رخصت کر دیا تھا۔

اُس لفٹ کا دروازہ 10:40 پر ایک بار پھر کھلا تھا... اس بار حمین سکندر کے ساتھ سیکورٹی کا کوئی اہلکار نہیں تھا صرف اُس کے اپنے سٹاف کے لوگ تھے۔ اُس کے لفٹ سے کوریڈور میں قدم رکھتے ہی وہاں تالیوں کا شور گونجنا شروع ہوا تھا۔ وہ پریس فوٹو گرافرز اور اُس کوریڈور میں کھڑے سیکورٹی اہلکار تھے جو اُسے اُس دلیری کی داد دے رہے تھے جو وہ دکھا رہا تھا... لمبے ڈگ بھرتے اُس نے ٹوٹے شیشے والی اُس کھڑکی کو بھی دیکھا جو ہال کے داخلی دروازے کے بالکل سامنے ایک عجیب سا منظر پیش کر رہی تھی، اگرچہ اُس کے سامنے اب سیکورٹی اہلکاروں کی ایک قطار رہتی تھی۔ تیز

قدموں سے لمبے ڈگ بھرتا حمین سکندر جب ہال میں داخل ہوا تھا تو ہال میں تالیاں بجنی شروع ہوئی تھیں، پھر وہاں بیٹھے و فود اپنی اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ حمین سکندر مسکراتا، سر کے اشارے سے اُن تالیوں کا جواب دیتا سیٹج کی طرف بڑھ رہا تھا اور سیٹج پر بیٹھے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ کھڑا ہونے شروع ہوئے تھے اور پھر حمین نے سالار سکندر کو کھڑا ہوتے دیکھا تھا۔ حمین چلتے چلتے رُک گیا تھا... وہ اُس کے باپ کی طرف سے اُس کی تعظیم تھی جو اُسے پہلی بار دی گئی تھی۔ ایک لمحہ ٹھٹھکنے کے بعد حمین سکندر نے سیٹج کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیا تھا۔

دنیا بھر کے TV چینلز وہ مناظر live دکھا رہے تھے... دلیری کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو دنیا نے کئی سال پہلے اسی افریقہ میں سالار سکندر کے ہاتھوں دیکھا تھا، جرأت کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو آج اسی افریقہ میں وہ حمین سکندر کے ہاتھوں دیکھ رہے تھے۔

سیٹج پر اب TAI اور SIF کے دونوں سربراہان مل رہے تھے اور اُس memorandum پر دستخط کر رہے تھے جس کے لئے وہ وہاں آئے تھے اور پھر اُس کے بعد حمین سکندر نے تقریر کی تھی... اُس ہی آخری خطبے سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا جس کا حوالہ کئی سال پہلے اُس کے باپ نے افریقہ کے سیٹج پر دیا تھا۔

”بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ اُس نے سورۃ ملک کی آیات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

”وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ آزمائش کرے تمہارے کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں... اور وہ ہے زبردست، بے انتہا... معاف فرمانے والا۔“

اُس ہال میں سوئی گرنے جیسی خاموشی تھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کرنے پر قادر ہے جو کن کہتا ہے تو چیزیں ہو جاتی ہیں، جو دشمنوں کی چالیں اُن ہی پر اُلٹا دیتا ہے۔

”کئی سال پہلے SIF نے سود کے خلاف اپنی پہلی جدوجہد افریقہ سے شروع کی تھی، یہ وہ زمین تھی جس پر میرے باپ نے ایک سودی نظام کے آلہ کار کے طور پر کام کرتے ہوئے سود کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا... اُس سود کو جسے آخری خطبہ میں نبی آخر الزمان ﷺ نے حرام قرار دیا تھا اور اُس آخری خطبے میں یہ صرف سود نہیں تھا جس کے خاتمے کا فیصلہ کیا گیا تھا، یہ مساوات بھی تھی جس کا حکم دیا گیا تھا... انسانوں کو اُن کے رنگ، نسل، خاندانی نام و نسب کے بجائے صرف اُن کے تقویٰ اور پارسائی پر judge کرنے کا SIF... اور TAI آج اُس ہی مشن کو آگے بڑھانے کے لئے

دنیا کے سب سے بڑے گلوبل فنڈ کا قیام عمل میں لایا ہے... ”وہ بات کر رہا تھا اور پوری
 دُنیا سُن رہی تھی... وہ آخری نبی ﷺ کا حوالہ دیتا ہوا بات کر رہا تھا اور وہ پھر بھی سُننے پر
 مجبور تھے... کیونکہ وہ باعمل بہترین مسلمان تھے جن کے قول و فعل میں دُنیا کو تضاد
 نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو طاقت ور تھے تو دُنیا اُن کے مذہب کو بھی عزت دے رہی تھی اور
 اُس مذہب کے پیغام بر کو بھی...“

وہ ایک گولی جو دُنیا کی تاریخ بدلنے آئی تھی وہ کاتبِ تقدیر کے سامنے بے بس ہو گئی
 تھی... تاریخ ویسے ہی لکھی جا رہی تھی جیسے اللہ تعالیٰ چاہتا تھا اور وہ ہی لکھ رہے تھے،
 جن کو اللہ نے منتخب کیا تھا۔ بے شک طاقت کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے جس کی
 محبت وہ آپ حیات ہے جو زندگی کو دوام بخشتا ہے اس دُنیا سے اگلی دُنیا تک۔

☆☆☆☆

ترپ کا پتہ

مارچ 2040

امریکہ کے اُس اسپتال کے نیوروسرجری ڈپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس

شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے وہ آبادی کے اُس 2.5 فیصد حصہ سے تعلق رکھتا تھا جو I.Q Level 150 کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹہ سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا، یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر زکی اس ٹیم کو lead کرنے والا ڈاکٹر دُنیا کے قابل ترین سرجنز میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک گلاس روم میں سرجری ریڈیٹنٹس اس وقت جیسے سحر زدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی سکریں پر دیکھ رہے تھے جو اُس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کسی pianist کی انگلیاں ایک پیانو پر۔ وہ اپنی مہارت سے سب کو مسمرا کر ڈکٹے ہوئے تھا سوائے اس ایک شخص کے جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ آپریشن کے دوران وہ نیوروسرجن چند لمحوں کے لئے رُکا تھا۔ ایک نرس نے بنا کہے اُس کے ماتھے پر اُبھرنے والے قطروں کو ایک کپڑے سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر پڑے ہوئے اُس دماغ پر جھکا جو دُنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اُس کے سامنے آیا تھا۔ دُنیا کی اہم ترین پوزیشنز پر فائز رہنے والے اس شخص کے لئے اس ایمر جینسی میں اُسے بلوایا گیا تھا۔ وہ

سر جن اب تک 270 اہم اور نازک ترین کامیاب سر جریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی تاریخ کا کم عمر اور سب سے قابل سر جن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا وہ Percent 100 کامیابی کا ریکارڈ ختم ہونے والا تھا۔ وہ ایک بار پھر گہری سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اُسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس آپریشن میں کامیابی کے لئے۔



ہماری ویب میں شائع ہونے والے ناولز کے تمام جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہیں۔

ہمیں اپنی ویب نیو ایر میگزین (New Era Magazine) کیلئے لکھاریوں کی

ضرورت ہے۔ اگر آپ ہماری ویب پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل، شاعری، پوسٹ

کروانا چاہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے مندرجہ ذیل ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بھیج سکتے

ہیں۔

NEW ERA MAGAZINE.com

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

(Neramag@gmail.com)

(انشا اللہ آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر اندر ویب پر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات

کیلئے اوپر دیئے گئے رابطے کے ذرائع کا استعمال کر سکتے ہیں۔

شکریہ ادارہ: نیو ایر میگزین